دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ

جاسوسی ڈائجسٹ کراچی

اکتوبر 2018

نگرانِ اعلیٰ

معراج رسول

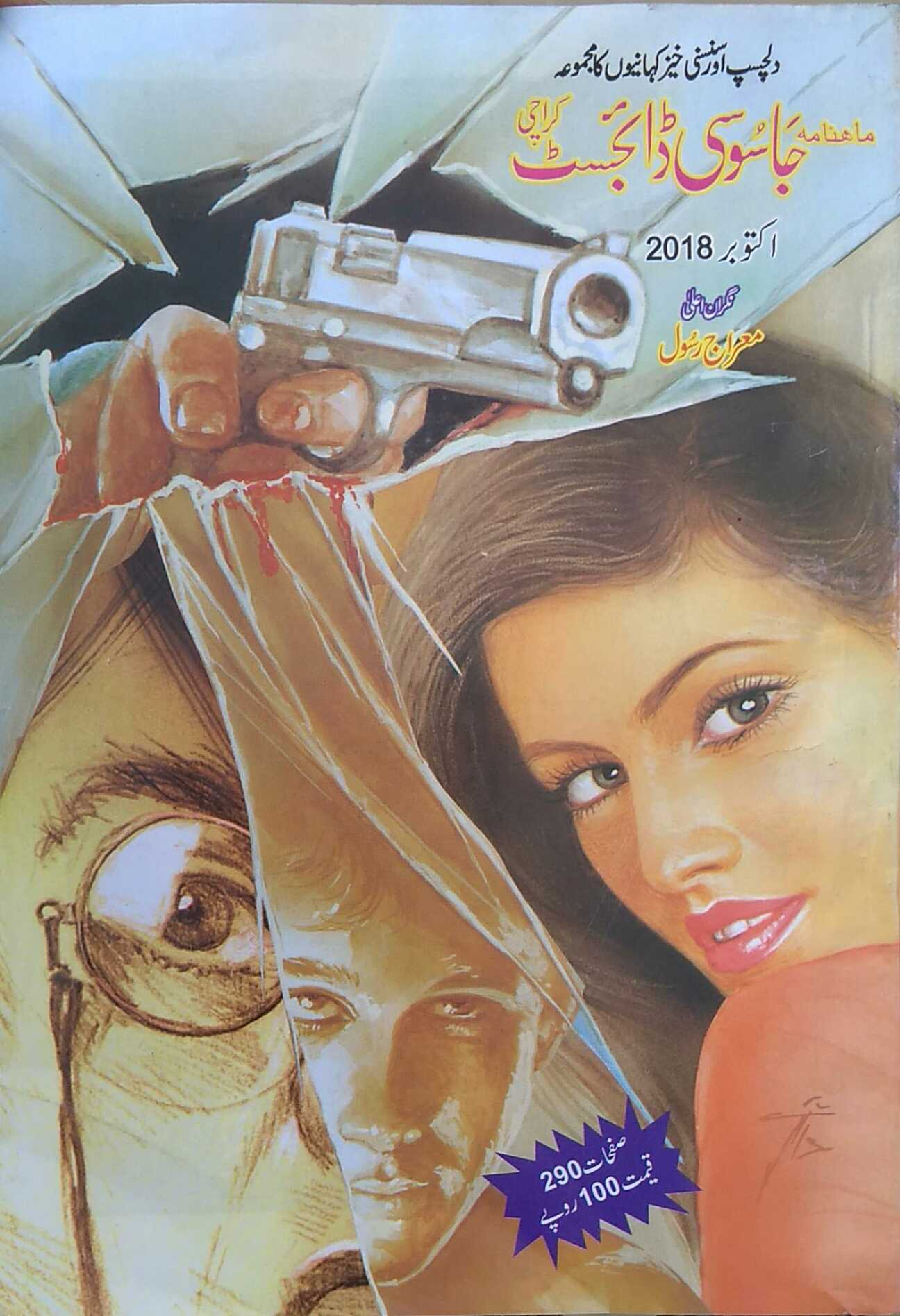

صفحات 290

قیمت 100 روپے

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

مدیر: لبنیٰ خیال
نائب مدیر: ڈاکٹر نعیم اختر

منیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269

07 **چینی، نکتہ چینی** — مدیر اعلیٰ
قارئین کی کرم فرمائیاں اور کج ادائیاں نامہ و پیام، محبتیں، عنایتیں اور شکایتیں

14 **چاہِ مکرّر** — کاشف زبیر
ان وارداتِ قلبی کا قصہ غم جو تشنۂ اظہار رہ گئے تھے

63 **اچھا آدمی** — سلیم انور
احساسات و جذبات سے لبریز حساس دل رکھنے والوں کے لیے خاص تحفہ

67 **محبت کے کئی رنگ** — منظر امام
انتقام کی راہوں پر چلنے والے ایک نرم خو شخص کا فیصلہ

81 **تنقید نگار** — جمال دستی
موسم کی خرابی جس نے قاتل کی شناخت کو آسان بنا دیا

85 **تلاش** — تنویر ریاض
معاملے کی تہ تک پہنچانے والے غیر ضروری تجسس کی کارگزاری

96 **انگارے** — طاہر جاوید مغل
سطر سطر رنگ بدلتی... ایک لہو رنگ اور دل گداز داستان

131 **مردم شناس** — زویا اعجاز
موجودہ حالات و واقعات کے آئینے میں چھپے چہروں کی رونمائی

139 **قیمتی تصویر** — عکس فاطمہ
اس مجرم کا قصہ جس کا ہر وار جداگانہ تھا......

148 **جواری** — تمکین رضا
اپنی بیٹی کی خاطر آخری فائٹ کھیلنے والے کھلاڑی کا حتمی انداز......

157 **خزانہ** — سیرینا راض
ماضی کے خزانوں میں چھپے مستقبل کے خوابوں کا تاج محل

162 **آوارہ گرد** — ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

195 **سانپ** — سرور اکرام
ایک اور دریا کا سامنا تھا... میں ایک دریا کے پار اترا تو......

211 **جلدی کا فیصلہ** — فلزا غزل
عجلت میں کیے گئے فیصلوں کے پچھتاوے......دونوں کو بہت جلدی تھی

219 **لے پالک** — نسرین منصور
ڈر......خوف......اور دہشت کا نشاں بننے والے آستین کے سانپ کا زہریلا وار

229 **گمشدہ** — ارشد بیگ
مجرموں اور قانون کے آہنی شکنجے میں پھنسے ایک گناہ گار کا قصہ بے گناہی

239 **الٹ پھیر** — محمد ذوالقرنین خان
خطرناک کھلاڑیوں سے ٹکرا جانے والے منہ زوروں کا جارحانہ انتقام

266 **آخری چال** — اسما قادری
ان سازشوں کا سنسنی خیز احوال جو نقش بر آب ثابت ہوئیں......

جلد 48 • شمارہ 10 • اکتوبر 2018 • زرِ سالانہ 1200 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 100 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون (021) 35895313 E-mail:jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پرنٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

مدیر اعلیٰ

چینی نکتہ چینی

عزیزانِ من...... السلام علیکم!

اکتوبر کا شمارہ قارئین کی نذر ہے۔ انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوئے سات سے زائد عشرے ہو گئے لیکن اس آزادی کے ثمرات آج تک عوام کو دستیاب نہیں۔ معاملات جوں کے توں ہیں بلکہ بعض شعبوں میں رجعت قہقری نظر آتی ہے۔ یہ خداداد ملک کسی گروہ کی ملکیت ہے، نہ کسی سیاسی جماعت کا اکھاڑا۔ جس مسلم لیگ نے تحریک پاکستان کی قیادت کی، وہ برسوں پہلے سیاسی بازی گری کے نتیجے میں معدوم ہو گئی۔ جماعت رہی نہ وہ مخلص رہنما رہے۔ اس مملکت کے مسائل ہمارے اور آپ کے مسائل ہیں۔ ان کو اسی جذبے سے حل کرنا ہوگا۔ اچھا اور بہتر کام کوئی بھی کرے، اس کا اعتراف کیا جانا چاہیے۔ مشہور قول ہے کہ یہ نہ دیکھو کہ کون کہہ رہا ہے، دھیان دو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اس اصول کو اپنا لیا جائے تو معاشرہ بہتری کی طرف گامزن ہو سکتا ہے۔ تحمل اور برداشت پر عمل کرنے کی عادت بہت سے سنگین مسائل کو جڑ سے ختم کر سکتی ہے۔ عہد کر لیں کہ جو کام ہم سے ہو سکتا ہے، اس کے لیے کسی دوسرے کا انتظار نہیں کریں گے بلکہ خود پیش قدمی کریں گے۔ اس عہد کے ساتھ چلتے ہیں اس محفل میں جہاں تلخ و شیریں تبصروں کے ساتھ بہت سے قارئین انتظار میں ہیں۔

ہری پور سے عبدالرزاق کی پہلی دفعہ جی داری ''جانے کتنے برس بیت گئے ڈائجسٹ پڑھتے ہوئے مگر قلم آج پہلی بار اٹھایا ہے۔ امید ہے چینی نکتہ چینی میں ہمیں بھی ایک خوبصورت سا کونا عنایت کر دیں گے۔ (یقیناً کونا کیا، پوری محفل آپ کی ہے جہاں چاہیں براجمان ہو جائیں) ستمبر کا شمارہ اور پریشان حسینہ کی حیران آنکھوں سے نظریں چراتے ہوئے فہرست پر نظر دوڑائی تو مصنفین میں کچھ جانے پہچانے نام دیکھ کر اچھا لگا۔ چینی نکتہ چینی میں ایمانے زارا شاہ براجمان نظر آئیں جس کے لیے مبارکباد۔ کوئٹہ سے سیف خان اور کلر سیداں سے عبدالودود عامر کی انٹری جاندار رہی۔ کہانیوں کی بات کی جائے تو تحریر سیلون کا سورج از امجد رئیس مغربی پلاٹ پر مبنی اس تحریر کا ٹائٹل ایک ایسے ہیرے اور اس سے جڑی روایات پر محسوس ہوا جو جس کے پاس جاتا تباہی اور بربادی اس کا مقدر بن جاتی۔ پہلے سین سے تو ہم لارا جیسی ایتھلیٹ چورنی کے گرویدہ ہو گئے اور لگا مرکزی کردار وہی ہے مگر پیٹی گورڈن نامی سیریل کلر کی انٹری نے بتایا کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ اس تحریر میں شیرن نامی خوب صورت دوشیزہ کو پولیس وومن کے روپ میں پڑھنا اچھا لگا۔ اختتام چونکا دینے والا مگر تشنہ رہا۔ WCF کیا بلا تھی۔ پیٹی گورڈن کیوں سیریل کلر بنا اور پولیس وومن شیرن سے اس کی کیا دشمنی تھی۔ اس کے بارے میں مصنف نے اسرار کا پردہ تانے رکھا۔ بحیثیت مجموعی ایک اچھی کہانی مگر بعض جگہوں پر انگریزی ناموں اور الفاظ کی بہتات اچھی نہیں لگی۔ اندھیر نگری از احمد سلیم سلیمی۔ کہانی کا آغاز بہت خوب صورت جملے سے ہوا شام یوں اتر آئی تھی جیسے کسی نوجوان بیوہ کے دل میں اداسی اتر آئی ہو اندھیر نگری نامی تحریر مصنف کی ایک اچھی کوشش تھی۔ بابر جیسے نوجوان جو منزل کی تلاش میں بھٹک رہے ہوتے ہیں انہیں چودھری احتشام جیسے وطن فروش اپنی ڈھب پر لے ہی آتے ہیں۔ بابر گمراہ ضرور ہوا مگر...... جب بات وطن فروشی کی آئی تو اس نے ضمیر کے مطابق بہترین مزاحمت کی۔ ایک مختصر اور خوبصورت کاوش۔ ناکام منصوبہ از جمال دستی۔ ایک اور مغربی پلاٹ پر مشتمل کہانی جس میں سراغ رسانی کے انداز پر...... سہولیات حاوی دکھائی دیں۔ سچ ہے کہ بعض اوقات ہم منصوبہ بناتے وقت زمینی حقائق کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اچھی اور اسمارٹ کہانی۔ شکست از اعتزاز سلیم وصلی۔ حالات حاضرہ بالخصوص کھیلوں کی بین الاقوامی سازشوں کو بے نقاب کرتی یہ تحریر۔ دہشت گردی کی منصوبہ بندی سے لے کر...... منصوبے کی ناکامی تک...... بہترین ٹمپو سے اختتام پذیر ہوئی۔ حساب برابر از منظر امام۔ ایک چلبلی کہانی جس میں چاچا شکن کی جاسوسی لبوں پر مسکراہٹ بکھیرتی چلی گئی۔ مذاق ہی مذاق میں بہت پیارا سبق دیتی کہانی کہ ہم اپنے سب سے بڑے وکیل اور دوسرے کے سب سے بڑے جج بننے کی کوشش میں اپنوں کو کھو دیتے ہیں۔ اس پیاری سی کہانی کے لیے ویلڈن۔ جھوٹ کا پول از سلیم انور۔ مارتھا کے قتل کی مختصر کہانی دلچسپی سے خالی بالکل نہیں تھی۔ آخر تک لگ یہی رہا تھا کہ مارتھا کا بوائے فرینڈ قاتل ہے مگر جینی کو بارش اور کھلی کھڑکی کی موجودگی میں خشک ٹائیلوں نے قاتل ثابت کر ہی دیا۔ ایک عمدہ کہانی۔ دھوکے باز از نرگس فاطمہ۔ کیا انتقام لیا سرینا نے ڈیلن سے کہ نہ صرف ڈیلن بلکہ سارا گروہ ہی پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔ سرینا کی مستقل مزاجی اور انتقام کی لگن ہی تھی جس نے پولیس کے لیے راہ ہموار کی۔ تحریر شکاری از زویا اعجاز۔ کیونکہ مصنفہ اب ایک منجھی ہوئی لکھاری ہیں لہٰذا زویا اعجاز کی شکاری کو تنقیدی نظر کے ساتھ پڑھنا شروع کیا اور کافی تنقیدی مواد ذہن میں آ بھی چکا تھا مگر اچانک بالی کے محنت ہونے کا علم ہونے پر ساری تنقید دھری کی دھری رہ گئی اور بیتابی سے آگے پڑھنے لگا۔ زویا اعجاز کی یہ صلاحیت اس کہانی میں بھی پسند آئی کہ ان کا فوکس اور محنت سراغ رسانی اور ٹیکنالوجی کے علاوہ انسان پر بھی ہوتا ہے۔ انسانی نفسیات ان کی تحریر میں نگینے کی طرح جڑی ہوتی ہے۔ بالی اپنے باپ کی شاندار تربیت کے بعد۔ اپنے دشمن سے انتقام لینے کے قابل بھی ہو گئی اور اس سے بھی کہیں مشکل کام...... ہمارے معاشرے میں وکیل و وکالت کی عزت بھی اسے حاصل ہو گئی۔ کہیں نہ کہیں مجھے لگتا ہے کہ کہانی کا مرکزی کردار نہ بالی کا محنت ہونا تھا نہ ہی اشرف۔ شہلا اور زین کے بے حسی پر مبنی مظالم تھے...... بلکہ مجھے جو مرکزی پوائنٹ لگا وہ راشد اور رفعت کا بطور میاں بیوی تعلق تھا...... راشد کی یہ سوچ کہ بطور شوہر اس کی محبت کا عملی اظہار بیوی کی دلداری نہیں بلکہ بیوی کی کفالت ہے۔ یہ نظریہ...... عورت کی بنیادی فطرت کے خلاف ہے...... جو اظہار کی ازلی بھوکی ہوتی ہے اور بار بار شریک حیات کی زبان سے سننا چاہتی ہے۔ راشد کی یہی غلط فہمی بعد میں رفعت کی بیزاری اور اشرف کے ہاتھوں کھلونا بننے کی وجہ بنی۔ اتنی اچھی تحریر پر بہت سی ویلڈن۔ بلائے جان از محمد فاروق انجم۔ بہت عرصے بعد خوف اور تجسس کا اتنا خوبصورت امتزاج دیکھنے کو ملا۔ بلائے جان کی صورت میں۔ رگوں میں خون منجمد کر دینے والی اس تحریر کی منظر نگاری سادہ مگر پُراثر تھی۔ انگارے اور آوارہ گرد کا کتابی شکل میں انتظار اس لیے نو کمنٹ۔''

فیصل آباد سے عائشہ مرزا کی پسند ناپسند "پہلی نظر میں ٹائٹل گرل گنجی لگی۔ غور کیا تو پتا چلا کہ گنجی نہیں ہے۔ ماتھا ایکسٹرا کشادہ ہے۔ بہرحال مجھے تو صرف آنکھیں پسند آئیں۔ ادارے سے متعلق اور خوابوں کے پورا ہونے سے متعلق پُرامید ہوں۔ صفحات میں کمی پر تو ہم پہلے ہی رو رہے ہیں اس لیے صفحات میں کمی کی گنجائش بالکل نہیں ہے۔ میرے خیال میں اس کا بہتر حل یہی ہے کہ بحران کے خاتمے تک قیمت میں مناسب اضافہ کرلیا جائے۔ آگے آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ سب سے پہلا تبصرہ ایمانے کا تھا جو نکتہ چینی کی لیڈرشپ ملنے کی خوشی میں ساتھیوں کا منہ میٹھا کروا رہی تھیں، بہت مبارک ہو۔ پیارے پاکستان کا پرچم اٹھائے روبی انصاری بھی اچھا تبصرہ فرما گئے۔ منصور اور باسط صاحبان کے تبصرے کافی سے زیادہ دلچسپ لگے، موسٹ ویلکم۔ سیف خان! میں موتی لگانے والی سوئی نہیں ہوں جو گم ہو جاؤں، بے فکر رہیں۔ خالد شیخ اور عاصم شہزاد کی اچھی اچھی باتیں اور محمد ہمایوں کا مختصر تبصرہ پڑھ کہانیوں کا رخ کیا۔ سب سے پہلے انگارے...... شاہی کی حقیقت کیا کھلی بے چارے پر آفت ہی ٹوٹ پڑی۔ میں تو بس رونے ہی لگی تھی کہ شہزادی قسطینا کی دھواں دھار انٹری پر حقیقتاً کرسی سے اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ شاہی اور ساتھیوں کی رہائی پر جان میں جان آئی۔ امجد رئیس انگلش ناول کو بھی اس خوب صورت انداز میں لکھتے ہیں کہ پڑھنے والا سحرزدہ رہ جائے۔ سیلون کا سورج بھی شاندار ناول تھا۔ پہلا رنگ زویا اعجاز کے قلم سے یقیناً ایک اہم اور سنجیدہ ٹاپک تھا۔ بالی کو جس طرح محروم کیا گیا، اس کا بہت دکھ ہوا لیکن اچھا یہ ہوا کہ اس نے اپنے ہر دشمن سے بدلہ لے لیا۔ شہلا کو جس بے دردی سے قتل کرکے اس کے اعضا کو الگ کیا۔ یہ منظر لرزا دینے والا تھا۔ باقی اختتام خوب صورت ہوا۔ دوسرا رنگ...... بلائے جان خوف اور دلچسپی سے بھرپور رہا۔ بدتمیز روبی نے اپنے شوہر کو ہارٹ اٹیک کروانے کا پورا بندوبست کر رکھا تھا۔ اگر فائزہ گھر میں نہ آتی تو مبشر تو گیا تھا، اچھی تحریر رہی۔ وصلی صاحب نے شکست میں ملک اور بیرون ملک، پیارے وطن کے خلاف کی جانے والی سازشوں پر بھرپور اور واضح روشنی ڈالی اور یہ بھی کہ وحید جیسے اچھے اور سلجھے نوجوان جب گھر بدر ہوتے ہیں تو کس طرح بغاوت پر اتر کر موت کی دلدل میں لحہ بہ لحہ گھستے چلے جاتے ہیں، بہت زیادہ اچھی تحریر تھی۔ منظر امام کے دیسی سراغ رساں نے موڈ خوشگوار کردیا اور آخر میں ایک سنجیدہ نقطہ اٹھایا جو یقیناً سب کے لیے قابلِ غور ہے۔ اندھیر نگری میں وہی ہماری مفاد پرست پولیس...... اگر پولیس ٹھیک ہوتی تو بابر کو جانوروں کی بجائے چوہدری کے خلاف ایکشن لیتی لیکن یہ بھی ثابت ہوا کہ ساری پولیس ایک جیسی نہیں ہوتی، اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کی وجہ سے دنیا کا نظام چل رہا ہے۔ خواہشوں کے اسیر زبردست تحریر رہی۔ جھوٹ کا پول بھی ٹھیک جبکہ ناکام منصوبہ انتہائی بور تھی۔"

ہری پور ہزارہ سے سویرا محبوب عباسی کی پہلی بار جاسوسی میں حاضری "جاسوسی میں نے 6 مئی 2015ء سے باقاعدہ پڑھنا شروع کیا یعنی جب انگارے شروع ہوئی۔ جاسوسی ہمارے گھر میں میرے بھائی لاتے ہیں۔ اس ماہ کا شمارہ بہت جلدی مل گیا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے مغل انکل کی انگارے پڑھی۔ قسطینا نے شاہ زیب کو بچا کے میرا دل جیت لیا۔ منظر امام کی حساب برابر بڑی اچھی اسٹوری تھی۔ ارے ابھی ٹائٹل کے بارے میں لکھنا تو بھول گئی۔ کوئی بات نہیں۔ ابھی لکھتی ہوں۔ لڑکی کی آنکھیں بڑی پیاری تھیں۔ (بس......) دھوکے باز اور بلائے جان دونوں اچھی کہانیاں تھیں۔ امید ہے آپ کو میری پہلی کاوش پسند آئے گی۔ زیادہ اچھا لکھنا نہیں آتا۔ آپ سے گزارش ہے کہ میرا خط ضرور شائع کیجیے گا۔ پلیز، پلیز، پلیز۔" (بہت بہتر)

ساہیوال سے محسن علی طالب کا اختصاریہ "ستمبر 2018ء کا ٹائٹل خوب تھا۔ چینی نکتہ چینی میں مجھے جن کے خطوط اچھے لگے، ان کے اسمائے گرامی سیف خان، فیصل مشتاق، رانا بشیر اور بہت ہی پیارے دوست عبدالجبار رومی کے تھے۔ کہانیوں میں انگارے اختتام کی جانب جاتی محسوس ہو رہی ہے۔ سجاول ایک یادگار کردار بن گیا۔ مغل صاحب نے زیادتی کی خیر...... بڑے بندے بڑی باتیں۔ آوارہ گرد میں اب جان نہیں رہی۔ اپنے امجد جاوید صاحب کی تحریر شوق سے پڑھتا ہوں شاملِ اشاعت کیا کریں۔ (کیوں نہیں، جیسے ہی کہانی موصول ہوتی ہے، لگاتے ہیں) باقی جن کی کہانیاں مجھے اچھی لگیں، ان میں ناکام منصوبہ، اندھیر نگری اور دھوکے باز تھی۔ ایک مختصر تحریر شیطانی چیلہ اس خط کے ساتھ ارسال کر رہا ہوں۔" (آپ کی کہانی سرگزشت میں بھجوادی ہے، آپ سرگزشت کے مدیر سے معلوم کرسکتے ہیں)

فیصل آباد سے منحہ رمشہ اور ربحہ گل کی مشترکہ کاوش "جاسوسی کا شمارہ 2 ستمبر کو ہی مل گیا۔ میں آپ سب کے ساتھ اپنی خوشی شیئر کرنا چاہوں گی۔ میں نے گریجویشن کے ایگزام دیے تھے جس کا رزلٹ 14 اگست کو آؤٹ ہوا۔ 14 اگست کو ہی میں اپنی سالگرہ مناتی ہوں کیونکہ میں 13 اگست کو پیدا ہوئی تھی اور میری سب سے چھوٹی بہن 12 اگست کو پیدا ہوئی تھی۔ تو ہم دونوں 14 اگست کو پاکستان کی سالگرہ کے ساتھ ہی اپنی سالگرہ مناتے ہیں تو اس بار 14 اگست کو مجھے 4 خوشیاں ملیں اور میں نے سیکنڈ ڈویژن کے ساتھ گریجویشن کرلیا۔ اس دفعہ میری بہن ربحہ گل نے بھی تبصرہ لکھنے کی ٹھانی ہے اس لیے اس بار کا تبصرہ ہم دونوں بہنوں کا مشترکہ تبصرہ ہے۔ ادارے نے جو تین آپشنز دے کر قارئین کی رائے مانگی ہے، اس میں ہماری رائے تو یہی ہے کہ اشاعت قطعی طور پر معطل نہ کی جائے ورنہ ہمارے جیسے جاسوسی ڈائجسٹ کے شوقین کہاں جائیں گے۔ نکتہ چینی میں ایمانے زارا شاہ نے سب کو بولڈ کردیا۔ مبارک ہو ایمانے۔ عائشہ مرزا آپ ایک تو میرے واپس آنے کا شکر منا رہی تھیں لیکن دوسری کون تھی؟ ایکچوئلی عائشہ، منحہ رمشہ ایک ہی شخصیت یعنی میرا پورا نام ہے۔ میں اپنے والدین کے ہاں ساڑھے پانچ برس بعد پیدا ہوئی اس لیے انہوں نے میرا نام منحہ رمشہ یعنی خوب صورت تحفہ رکھا چونکہ اس بار میری بہن ربحہ گل نے بھی انٹری دی ہے تو اب ہم فیصل آباد سے تین ہوگئے ہیں۔ باسط شہزاد بھائی میں تبصرہ تو بہت بہت لمبا لکھتی ہوں لیکن میرے تبصرے کو کٹنگ شٹنگ کرکے مختصر کردیا جاتا ہے (کرنا پڑتا ہے) سیف خان بھائی میں زیادہ سیریس نہیں ہوتی لیکن ہاں کہانی پڑھتے ہوئے ان کرداروں کے ساتھ ضرور جڑ جاتی ہوں۔ اب آتے ہیں تبصرے کی جانب۔ امجد رئیس کی سیلون کا سورج انتہائی بکواس کہانی تھی۔ اتنی بکواس انگلش کہانی میں نے آج تک نہیں پڑھی۔ (چلیں اب تو پڑھ لی نا) تنویر ریاض کی خواہشوں کا اسیر اچھی کہانی تھی۔ شکر ہے ریلی کو سب کو اینڈ میں عقل آگئی۔ اعتزاز سلیم وصلی کی شکست واقعی تلخ حقائق کی آئینہ دار، تھرل سے بھرپور شاہکار کہانی تھی۔ انسان کو بس اپنا کردار، مضبوط رکھنا چاہیے پھر چاہے معاشرہ کتنا ہی برا کیوں نہ ہو، اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ منظر امام کی حساب برابر اچھی پُرمزاح کہانی تھی۔ عکس فاطمہ کی دھوکے باز کافی اچھی کہانی تھی۔ ڈیلن جیسے دھوکے باز انسان کو آخر سیرینا نے ڈھونڈ ہی لیا ورنہ نجانے وہ کتنی لڑکیوں کی زندگی برباد کرتا۔ محمد فاروق انجم کی بلائے جان جو سرورق کی دوسری کہانی تھی، پر پتا نہیں کیوں تھی۔ مجھے بالکل پسند نہیں آئی۔ زویا اعجاز کی شکاری شاہکار کہانی لکھی ہے جو برسوں یاد رہے گی۔ آپ کی ہر کہانی ایک سے بڑھ کر ایک ہوتی ہے۔" (شکریہ!)

تحصیل علی پور سے ہارٹ کیچر کی دلداریاں "جس طرح گانے گانے کے ساتھ لکھا ہوتا ہے گانے والے کا نام ٹھیک اسی طرح گولی گولی پر لکھا ہوتا ہے گولی کھانے والے کا نام...... ماہ یوم دفاع کے شمارے کی ساکت صفحاتی اسکرین پر گن ماسٹر کی گن سے وحشیانہ رقص مرگ کرتی ہوئی گولی پر پتا نہیں کس کس مریض زندگی کا نام لکھا ہوگا، یہ تو سایۂ سرورق اول شکاری اور سایۂ سرورق ثانی بلائے جاں پر نور بصارت بکھیرنے پر ہی جانکاری ہوگی۔ بلقیس خان، دلنشیں بلوچ، بگلوں کی جوڑی مرحا گل، رمنا گل، مومنہ کشف سمیت دیگر کئی چھوکریاں غائب ہیں۔ منصور عرف من مانی صاحب مبارک ہو آپ کی تجاویز زیر غور ہیں اور اب قیامت تک بس زیر غور ہی رہیں گی۔ (آپ کیوں مرچیں چبا رہے ہیں؟) ساگری تبصرہ تراش محترمہ لبنیٰ شیریں خیال کو میں تبصرہ خراش کہتا ہوں کیونکہ ان کی ہمارے ناتواں سے نامۂ دل پر نظر کرم سے زیادہ نظر گرما گرم رہتی ہے محترمہ تراشتی کم خراشتی زیادہ ہیں۔ (لیجیے اب خوش ہوجائیں تبصرے پر خراشیں کم آئیں گی) حسب سابق آوارہ گردی کی گھونگھٹ کشائی کی۔ شہزی بقول ہماری آنکھ سے گرا پلکوں میں اٹکا جیسی صورت احوال سے دوچار ہے اس میں یقین مشکوک نہیں۔ بھٹی صاحب کے قلم کی کوکھ سے مربوط اور مضبوط کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ (شکر ہے بھٹی صاحب کو خوش ہونے کا موقع دیا) امجد رئیس کی کھوج پر دیسی کہانی سیلون کا سورج میں سیلون کے سورج کا تذکرہ بخش نام کی حد تک تھا۔ لپ اسٹک کلر کو اپنے بچوں کا جائز ہونا مشکوک تھا تو اس کا سیدھا سادہ حل ڈی این اے ٹیسٹ ہے نہ کہ قتل و غارت...... ہیلو کٹی اور ہیڈی کا جنسی گٹھ جوڑ پڑھ کر احساس تاسف اور حیرت ہوئی کہ اس مرض میں مغربی خواتین بھی مبتلا ہیں۔ اعتزاز وصلی کی شکست میں شرپسند عناصر کی شکست دیکھی۔ اسیر خواہشاں میں جرم کی دلدل میں دھیرے دھیرے دھنستے ایلی کو کنارے کا سہارا ملا تو فوراً اسے تھام کر باہر آگیا۔ سلیم احمد سلیمی کی اندھیر نگری میں لیجنڈ محمد الدین نواب کا عکس تحریر منعکس تھا۔ ویسے پراثر جملے سازی کی گئی، ہماری آنکھوں کو آپ کا انتظار رہے گا۔ منظر امام صاحب چور ہر کسی کے گھر میں نقب لگاتا ہے گو کہ بری بات ہے مگر اپنے آشیانے میں کسی بھی نقب زن کی نقب زنی کی اجازت نہیں دیتا اس طرح کی حساب کتاب میں برابری ہمیں کسی طور بھی قبول نہیں۔ انگارے میں ہانا وانی ترنچی کی طرح اپنے شکار پر جھپٹتی ہے اور شکار کر لیتی ہے اور شاہ زیب دیکھتا اور جلتا رہ جاتا ہے۔ مترجمہ عکس فاطمہ کے پردیسی ترجمے دھوکے باز میں دھوکے باز ڈیلن سیرینا کا رہا نہ کول کا۔ صنف ثالث کی مجبوریوں، محرومیوں کے موضوع پر مبنی یہ سرورق اول رہا۔ زویا اعجاز اردو گل کاری کے ہنر سے خوب ہنر آشنا ہیں۔ جے ڈی پی میں زویا قابل رشک اضافہ ہیں۔ اختتامی کہانی یعنی بلائے جاں میں جیسا سوچتے گئے، انجام تحریر تک ویسا ہی پڑھنے کو ملتا گیا۔ روبی کی بے راہ روی دیکھ کر ذرہ برابر بھی حیرانی نہیں ہوئی۔ روبی جیسی خواتین گھر والے کی تو ہوتی ہی نہیں بالآخر گھاٹ والے کی بھی نہیں رہتیں۔ جاسوسی کے ابتدائی صفحات پر جاسوسی کلاسک بھی جاسوسی کے پہلے شمارے کی ابتدائی صفحات پر شائع شدہ تحریر کا آغاز کریں۔ جاتے جاتے تمام ساتھیوں سے گزارش ہے کہ ڈیم فنڈ میں ایس ایم ایس سروس کے ذریعے ضرور اپنا حصہ شامل کریں۔ یہ صدقہ جاریہ ہے۔"

نامعلوم مقام سے مراد خان کے اندیشے، وسوسے "جاسوسی ڈائجسٹ کے ساتھ ہمارا تعلق کافی پرانا ہے۔ جے ڈی پی اب ہمیں اپنے خاندان جیسا لگتا ہے۔ اپنے خاندان کو تباہ ہوتے کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا اس لیے مجبوراً خط لکھ رہا ہوں۔ آج کل گروپ بندیاں ہوگئی ہیں۔ مخصوص لکھاریوں کو ٹارگٹ بنایا جا رہا ہے جبکہ کچھ لکھاریوں کی تشہیر ہو رہی ہے۔ ادارے تک پہنچنے کے لیے مخصوص لابی کی خوشامد ضروری ہے ورنہ نہ تو تحریر شائع ہوگی نہ تبصرہ۔ (یہ محض غلط فہمی ہے۔ ادارے تک ہر ایک رسائی رکھتا ہے۔ کسی کی سفارش پر تحریر شائع نہیں ہوتی۔ یہ محض افواہ ساز ذہنوں کی کارفرمائی ہے) ویسے بھی چند مخصوص لوگوں کے تبصرے ہر ماہ شائع ہونے

معزز قارئین کے لیے

ادارے کی روحِ رواں محترمہ عذرا رسول سے علم ہوا کہ بہت سے قارئین پرانے مصنفین اور ان کی کہانیوں کو آج بھی یاد کرتے ہیں۔ کوئی سدا نہیں رہتا۔ الیاس سیتاپوری، محی الدین نواب، اقبال کاظمی، افسر آذر، علیم الحق حقی، کاشف زبیر، مختار آزاد، سلیم فاروقی، ایم اے راحت یکے بعد دیگرے اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ ان سب مرحومین کو غریق رحمت فرمائے۔ یہ ایک بحرانی صورت حال تھی جس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے نئے مصنفین کی تلاش، تربیت اور حوصلہ افزائی ناگزیر تھی۔ ادارے نے ہر قسم کے تحفظات سے بالاتر ہوکر ہر اچھی کہانی کو پذیرائی دی۔ جن لکھنے والوں کی کہانیاں انتخاب کے معیار پر پوری نہیں اتر سکیں ان کی ناراضی قابلِ فہم ہے مگر ادارے کا طریقہ کار قطعی غیر جانب داری پر مبنی رہا اور مبنی ہے۔

احمد اقبال صاحب ڈائجسٹوں کے ایک مقبول مصنف ہیں لیکن ایک مدت سے وہ اپنی ادبی مصروفیات کے سبب کہانیاں نہیں لکھ رہے۔ ادارہ ان سے مسلسل رابطے میں ہے۔ محمود احمد مودی صاحب ایک اور ادارے سے مستقل بنیاد پر وابستہ ہیں اس لیے ہمارے پرچوں میں لکھنے سے قاصر ہیں۔ دیگر معروف قلم کاروں سے بھی نیاز مندانہ رابطہ رہتا ہے لیکن ان کی اپنی مصروفیات وعدوں اور وفا کی راہ میں حائل رہتی ہیں۔ رہا راقم الحروف...... تو جون 2006ء تک محترم قارئین سے قلم کے ذریعے رابطہ رہا۔ اب عذرا رسول صاحبہ کی ہدایت پر پہلی بار قارئین سے براہِ راست مخاطب ہوں۔ بعض ناگزیر اور ناگفتنی ذاتی وجوہ کی بنا پر ایک عشرے سے لکھنے کا سلسلہ موقوف ہے۔ ادارے سے گہری وابستگی اور ملازمت جاری ہے۔ اس دورانیے میں قلم نے جب بھی ذہن میں بنتی بگڑتی کہانیوں کا ساتھ دیا، تحریر قارئین کی نذر ہوں گی۔

(اقلیم علیم)

پر ہر کوئی سوچنے پر مجبور ہوگا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ پی ڈی ایف پر پابندی کے باوجود یہ لوگ پی ڈی ایف بنا کر اپ لوڈ کرتے رہتے ہیں۔" (ایف بی پر یہ ڈی پی کا کوئی آفیشل گروپ نہیں ہے۔ یہ آپ قارئین کا ایجاد کردہ فین کلب ہے۔ جن افراد کو شک ہے وہ ہمیں اپنا خط ڈاک کے ذریعے ارسال کریں۔ سائنس کی ایجاد کردہ اشیا انسان کو سہولت فراہم کرتی ہیں۔ ای میل کا ذریعہ بھی وقت کی بچت اور آسانی کے لیے ہے۔ کچھ لوگ اس کا بےجا استعمال کر رہے ہیں جن کا ادارے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اب ہم یہی کر سکتے ہیں کہ آپ سب محکمہ ڈاک کی خدمات سے استفادہ اٹھائیں۔ خط کے لیے اور کہانیوں کے لیے بھی)

بورے والا سے عبدالجبار رومی انصاری کی عمدہ نگاری" سرورق کی حسینہ بلوری آنکھوں سے پٹر پٹر جھانکتی صاف بے وفا لگ رہی تھی۔ طوطا چشم آنکھوں پہ بھویں ایسی تھیں جیسے الو سے مستعار لی گئی ہیں۔ دستانے پہنے پستول والا ہاتھ بھی کسی چالاک مرد کا لگتا ہے کہ انگلیوں کے نشان بھی نہ پکڑے جائیں اور بے چارے ٹائی لگے بابو کے چہرے سے ہی خوف اُمڈ رہا تھا۔ ایمانے زارا شاہ کہیں انگاروں پر پاؤں پڑتا ہے تو کہیں خواب ہی دھواں دھواں ہو جاتے ہیں کہیں آپ کے نزدیک اینٹوں کے بھٹے تو نہیں لگے ہوئے؟ اولین تبصرہ بہت عمدہ ویلڈن ایمانے۔ عائشہ مرزا برادران کو چھپکیاں مارنے لگا دیتی ہیں اور خود چھپکلیوں کے ڈر سے محفل میں آ دھمکتی ہیں اور پھر تبصرے کو بھی چار چاند لگا دیتی ہیں، ویری نائس، خاموشی توڑتے منصور مانی کی انٹری اچھی لگی۔ مدیحہ رمشہ نے بھی اچھا لکھا۔ باسط شہزاد کی امیدیں بھی رنگ لائیں، عمدہ تبصرہ۔ سیف خان سب کو آڑھے ہاتھوں لے رہے اور خود گھوم پھر کر ٹماٹر اور گوبھی خرید رہے، قلفی جما کے، عمدہ تبصرہ باقی خالد شیخ طاہری، محمد قدرت اللہ نیازی، فیصل مشتاق اور رانا بشیر احمد ایاز کے تبصرے بھی زبردست رہے۔ انگارے کی دہک تو اب زوروں پر ہے۔ شاہ زیب پولیس کے ہتھے چڑھا تو کمانڈو قسطینا کی بھی شاندار انٹری ہوئی۔ شاہ زیب کے پہلے دشمنوں میں لالہ وریام اور قیصر چوہدری بھی اپنے انجام کو پہنچے۔ جان ڈیرک کے درندے بھی آہستہ آہستہ ختم ہو رہے ہیں اور بھگوڑا ماناوانی بھی اب قسطینا کے ذریعے منظر عام پر آئے گی۔ آوارہ گرد میں کوہارا پتا نہیں کیسے بیچ کے سامنے آ گیا۔ دوسرے رنگ میں بلائے جان روبی نے اپنے محبت کرنے والے شوہر مبشر کو آخر تک خوف زدہ رکھا۔ وہ تو شکر ہے فائزہ مل گئی اور روبی اور اس کے عاشق کا پتا چلا ورنہ تو روبی بھوت پریت کا خوف دلا کر مبشر کی جان لے ہی لیتی تھی۔ عورتوں اور بچوں کے قاتل لپ اسٹک کلر گورڈن پر بھی جیسے سیلون کے سورج کی نحوست پڑ گئی تھی۔ سیلون کا سورج خوف و دہشت کے سائے میں بہترین کہانی تھی۔ شکست میں وحید نے آخر وقت میں ہزاروں لوگوں کو بچانے کا بندوبست کر دیا۔ کہانی اچھی لگی۔ ڈیلن تھامس دھوکے باز تو تھا ہی مگر ایسے دھوکوں سے خود کو نہ بچا سکا اور سرینا تو اس کے پیچھے ہی پڑ گئی اپنے جیسی بیویوں کو بچانے کے لیے سرینا نے آخر ڈیلن کو پکڑوا ہی دیا۔ دھوکے باز اچھی لگی۔ دونوں ایک ہی کشتی کے مسافر ہوتے ہیں لیکن مرد صاف بچ جاتے ہیں اور عورت زیر عتاب آ جاتی ہے اس لیے دونوں طرف حساب برابر کا ہونا چاہیے۔ چچا شکن کی رپورٹ ہر لحاظ سے عمدہ لگی۔"

اٹک سے محمد اسماعیل ساگر کی آدھی ملاقات" ستمبر 2018ء کا سرورق سادہ سا تھا۔ پہلے کی سرورق کہانیوں میں اک کہانی ہوتی تھی۔ اب وہ بات ختم ہوتی جا رہی ہے۔ کچھ ایڈونچر پن ہونا چاہیے۔ اداریے میں آپ کی باتیں فکر انگیز ہوتی ہیں۔ کہانیوں میں، میں سب سے پہلے منظر امام کو پڑھتا ہوں۔ ان کے انداز تحریر کی کیا بات ہے۔ مختصر الفاظ میں اپنی وسیع بات کو بیان کرنا یہ انتہائی قابل لوگوں کی نشانی ہوتی ہے۔ اللہ پاک ان کی صحت و عمر میں برکت عطا فرمائے۔ حساب برابر بھی ایک اچھی تحریر تھی۔ دوسرا رخ بھی مدنظر رکھنا چاہیے۔ اس کے بعد بڑھے سرورق کے رنگوں کی طرف۔ شکاری اچھی تحریر تھی۔ زویا اعجاز ماشاء اللہ اچھا لکھتی ہیں۔ اللہ پاک ان کو صحت اور درازی عمر عطا فرمائے۔ یہ ترقی کریں گی۔ جس آدمی کے ساتھ کوئی حادثہ یا ناانصافی ہوتی ہے، اس کی تکلیف وہی سمجھ سکتا ہے۔ ہر کسی کو اس کا ادراک نہیں ہوتا۔ پھر وہ شخص چاہتا ہے کہ ایسی تکلیف اور اذیت کا شکار کوئی اور نہ ہو۔ کچھ ایسا ہی بتا رہی تھیں زویا اعجاز پہلے سرورق کے رنگ میں، بلائے جان محمد فاروق انجم صاحب کی عمدہ تحریر۔ میاں بیوی کا رشتہ بہت محبت والا رشتہ ہے۔ اک دوسرے کی تکلیف کا احساس کرنے والا رشتہ ہے۔ لیکن یہ چیز آج ہم میں نظر نہیں آتی۔ ازدواجی تعلق کے متعلق اہم تحریر۔ امجد رئیس بھی انگریزی ادب کے تراجم میں مہارت رکھتے ہیں۔ اندھیر نگری نوجوان لوگ اپنے نامساعد حالات کی وجہ سے غلط لوگوں کے ہاتھ لگ جاتے ہیں۔ شکست بھی کچھ اسی قسم کی ملتی جلتی کہانی تھی۔ آگ جب اپنے گھر کی طرف بڑھتی ہے تو پھر انتہائی قدم اٹھانا ہی پڑتا ہے۔ زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی۔"

جامشورو سندھ سے خالد شیخ طاہری کا ساتھ" اچانک کوئی خوشی مل جائے تو کیا ہوتا ہے، اس کیفیت کو اس وقت محسوس کیا جب جاسوسی کو اکیس تاریخ کو بک اسٹال پر دیکھا، یعنی عید سے پہلے ہی عید ہوگئی تھی ہماری، ٹائٹل دیکھ کر شک ہوا کہ رنگ اس دفعہ بہترین ہوں گے اور ہوا بھی یہ ہی، جب کہانیوں کی فہرست میں پہنچے، زویا اعجاز اور محمد فاروق انجم کو رنگوں میں چمکتے دمکتے دیکھا۔ فہرست پر نظر ڈالتے ہوئے ہم اپنی محفل نکتہ چینی میں پہنچے تو ایمانے زارا شاہ کو دیکھا، حق بھی تھا تبصرہ بہترین جو لکھا، مبارک بہت بہت۔ تبصروں میں سارے ہی جانے پہچانے نام تھے، اپنا نام دیکھ کر خوشی ہوئی تو ہوئی اس سے بڑھ کر خوشی اس بات کی ہوئی کہ اس دفعہ تبصرے تمام ہی شاندار تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے انگارے پڑھی، مغل صاحب کو دور حاضر کا جادوگر رائٹر کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا، اس قسط میں تو مغل صاحب نے انگاروں سے تپش نکالی کہ ہم دھک سے رہ گئے، شیطانی رقص کا بھی کیا منظر تھا کہ سانسیں رکی ہوئی تھیں، یہ ہی تو کمال ہے مغل صاحب کا۔ قاری کو کہانی کے ماحول میں پہنچا دیتے ہیں، انگارے کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ پھر ہم نے زویا اعجاز کی شکاری کو پڑھا، مسلسل تیسری تحریر اور وہ بھی رنگ میں اتنی شاندار کہ پڑھ کر غائبانہ داد دی۔ بہت بہت مبارک ہو، اللہ پاک اور ترقی عطا فرمائے۔ کھیل ہی وہ واحد شعبہ ہے جس پر پوری پاکستانی قوم ایک ہو جاتی ہے، یہ ہی بات ملک دشمن نہیں چاہتے کہ پاکستانی قوم ایک ہو، اعتزاز سلیم وصلی کی شکست میں ان حقائق کو الفاظ کی صورت میں پڑھا اچھا لگا، بہترین کہانی۔ منظر امام صاحب نے اس دفعہ حساب برابر میں ہمارے معاشرے کے وہ تلخ رویے مزاح کے پہلو میں بیان کیے کہ مزہ آ گیا۔ احمد سلیم صاحب کی اندھیر نگری چھوٹی کہانیوں میں بہترین کہانی تھی، ترجمہ کہانیوں میں جھوٹ کا پول اور خواہشوں کا اسیر نے متاثر کیا، ناکام منصوبہ اور دھوکے باز قدرے بہتر رہیں، دوسرا رنگ تجسس سے بھرپور رہا، متوقع انجام لیے کہانی کو آخر تک پڑھ کر ہی دم لیا، محمد فاروق انجم کا رنگ بھی بہترین۔ امجد رئیس صاحب کا سیلون کا سورج پہلے صفحات پر

طلوع ہوا۔ رسالے کے پہلے صفحات جاسوسی کی شان ہوتے ہیں، امجد رئیس صاحب نے سیلون کا سورج سے یہ شان بڑھا دی، تھوڑا کرداروں میں الجھ سا گیا تھا مگر ایک زبردست تحریر پڑھنے کو ملی۔ تراش خراش حسب دستور لاجواب رہیں۔ سچے قاری ہونے کے ناتے آخری میں رائے لینے کے بارے میں یہ ہی کہوں گا کہ ادارے کے ہر فیصلے میں میں ادارے کے ساتھ ہوں۔"

چونیاں سے ممتاز احمد فیروز پوری کی حاضری" اس دفعہ جاسوسی 29 کو ہی حاصل کر لیا۔ ہوا یوں کہ موبائل میں بیلنس کروانے گیا تو اسٹال پر جاسوسی کا دیدار ہوا۔ فوراً جاسوسی کو خریدا اور سرورق پر نظر دوڑائی تو سرورق پر ہیرو اپنی ہیروئن سے منہ موڑے شاید ناراضی کا اظہار کر رہا تھا۔ اگست کی آخری تاریخ کو پتا چلا کہ ذاکر انکل اب اس دنیا میں نہیں رہے لیکن ان کے بنائے ہوئے سرورق جب یاد آتے ہیں تو آنکھیں بھر آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔ اشتہارات سے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور سیدھا فہرست پر جا گرے۔ ایک نظر صرف کی اور جا پہنچے چھپنی کم، نکتہ چینی زیادہ کی محفل میں۔ ادارے کی جانب سے بحران کا ذکر پڑھ کر کافی دکھ ہوا۔ میری رائے میں قیمت میں تھوڑا سا اضافہ کر دیا جائے۔ خطوط پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ اولین تبصرے پر ایمانے شاہ صاحب کو براجمان پایا۔ ہلکی سی...... مبارک باد قبول کریں۔ (ہلکی سی کیوں، بھاری کیوں نہیں؟) اس کے علاوہ خالد شیخ، عائشہ مرزا، قدرت اللہ نیازی اور عبدالودود عامر کے تبصرے اچھے لگے۔ سب سے پہلے زویا اعجاز کی شکاری پڑھی۔ ایک منفرد موضوع پر اچھی کہانی...... میں تو سمجھتا رہا کہ بالی کوئی عورت ہوگی مگر جب حقیقت پتا چلی تو حیرت ہوئی۔ سسپنس اور تھرل سے بھرپور زبردست کہانی۔ محمد فاروق انجم کا بلائے جان رنگ بہت جان دار رہا۔ روبی نے نہایت مہارت سے اپنے شوہر کو مارنے کی پلاننگ کی مگر فائزہ کی ہوشیاری سے وہ مات کھا گئی۔ اولین صفحات پر امجد رئیس انگریزی ترجمے سیلون کا سورج کے ساتھ تھے۔ قاتل اور قانون کے گرد ایک زبردست ایکشن دیکھنے کو ملا۔ شیرن نے جس طرح کیس حل کیا، وہ قابل تعریف ہے۔ مختصر کہانیوں میں اندھیر نگری سب سے اچھی لگی۔ بابر نے ضمیر کی آواز پر چوہدری احتشام کی سازش کو ناکام بنایا، وہ قابل ستائش ہے۔ اعتزاز وصلی کی شکست سوئے اتفاق سے چھ ستمبر کو پڑھی۔ دشمن ملک کی سازش کو بے نقاب کرتی ایک زبردست تحریر تھی۔ انشاء اللہ ہم ان کے عزائم کو اسی طرح خاک میں ملاتے رہیں گے۔ (آمین) منظر امام کے چچا شکن نے مردوں کو خوب ہلکے پھلکے انداز میں آئینہ دکھایا۔ دھوکے باز میں جس طرح سے سیرینا نے ہمت سے کام لیا اور اس منظم گروہ کو پکڑوایا، وہ قابل ستائش ہے۔ ناکام منصوبہ اور جھوٹ کا پول کچھ زیادہ متاثر نہ کر سکیں۔"

یو اے ای سے طلعت مسعود لکھتے ہیں" اس دفعہ جاسوسی کے ساتھ ہی ذاکر انکل کے بارے افسوسناک خبر ملی اور ان کے بے شمار شاہکار شہ پارے یاد آ گئے جن کو دیکھ دیکھ کر ہم بڑے ہوئے۔ بلاشبہ وہ ایک عہد تھے اور اپنے فن کے ذریعے وہ ہمیشہ پرستاروں کے دلوں میں رہیں گے۔ اللہ پاک ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ ٹائٹل اس بار مجموعی طور پر اچھا لگا۔ آگے بڑھے تو اداریے کے ساتھ ہی ادارے کے نوٹس کو دیکھ کر اور اس میں تیسرے آپشن اشاعت کے معطل کا دیکھ کر دھچکا لگا۔ ایسا تو ادارے کو سوچنا بھی نہیں چاہیے۔ اب تو جاسوسی، سسپنس کی اتنی یادیں ہیں کہ ان کے بغیر ادھورا محسوس ہوتا ہے اس لیے فی الحال تو قیمت میں اضافہ ہی واحد آپشن ہے۔ لیکن جدید دور میں ٹیکنالوجی کے بڑھتے ہوئے استعمال اور ہارڈ کاپی کے بجائے سافٹ میں پڑھنے کے رجحان کو دیکھتے ہوئے ای کاپی یا سافٹ کاپی کے بارے میں بھی ادارے کو غور کرنا چاہیے جہاں اپنی ویب سائٹ پر شمارہ میسر ہو۔ چھپنی کم نکتہ چینی کے جلسے کی صدارتی تقریر ایمانے زارا شاہ زور و شور سے کر رہی تھیں۔ تبصرہ اچھا تھا۔ عائشہ مرزا کا تبصرہ مزیدار رہا۔ منصور عرف مانی کی پہلی انٹری تو اچھی رہی، امید ہے ابھی حاضری لگاتے رہیں گے۔ سیف خان شاید سبزی منڈی میں بیٹھے تبصرہ لکھ رہے تھے اس لیے ہر طرف آلو، ٹینڈے ہی انہیں نظر آ رہے۔ سیف بھائی عید کے دنوں میں سبزی منڈی؟ خیر تو ہے۔ نیازی صاحب آپ سیاست میں کون سے حکیمانہ منصوبے لے کر آ رہے ہیں۔ ساگر کو کر آپ بھاگتے ہوئے تبصرہ کیوں لکھتے ہیں۔ فیصل مشتاق، رانا بشیر، منحہ رمشہ اور عبدالودود عامر بھی خوب رنگ جمائے ہوئے تھے۔ کہانیوں میں حسب روایت انگاروں کی طرف بڑھے اور اس بار پھر مغل صاحب بھرپور فارم میں تھے۔ اس بار تو جان ڈیرک اور نیکساری گینگ پر انگارے برسا دیے۔ قسطینا کی آمد تو دھماکے دار رہی لیکن شاہ زائب آخر میں پھر تاجور کی طرف منہ کر کے آہیں بھرنا شروع ہو گیا۔ شکاری معاشرے کے ایک مظلوم طبقے پر ہونے والی ناانصافیوں کی داستان۔ دوسروں پر ظلم روا رکھنے والے بھول جاتے ہیں کہ اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ اس حساس موضوع کو مصنفہ نے بہت عمدگی سے بیان کیا۔ بلائے جان بہتر رہی لیکن اگر روبی کے رویے کا تھوڑا بیک گراونڈ دے دیا جاتا تو کہانی مزید اچھی ہو جاتی۔ کیونکہ آخر میں ایک دم سے اس کے مددگار کی رونمائی عجیب سی لگی۔ شکست ہمارے ملک کے خلاف سازشوں میں مصروف دشمنوں کی چالبازیوں کو بے نقاب کر رہی تھی۔ اعتزاز سلیم وصلی کی تحریر میں پختگی آتی جا رہی ہے۔ منظر امام صاحب حساب برابر کی شکل میں حسب معمول ہلکے پھلکے انداز میں معاشرے کے دوغلے رویوں کو بیان کر رہے تھے۔ ہمارے معاشرے میں منافقت کی عمدہ مثال، جہاں اپنی آنکھ کے شہتیر کے بجائے دوسروں کا تنکا بھی نظر آ جاتا ہے۔ مختصر کہانیوں میں مجھے منظر امام کی کہانیاں سب سے زیادہ پسند ہیں۔ اندھیر نگری کا پلاٹ گو کہ پرانا تھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ایسے موضوعات ہر دور میں حسب حال نظر آتے ہیں۔ ابتدائی صفحات پر اس بار امجد رئیس سیلون کا سورج چمکا رہے تھے۔ ایک بار پھر ایکشن، تھرل سے بھرپور ناول پیش کرنے پر شکریہ...... شیرن کا کردار زبردست رہا اور مختلف سچویشنز میں امجد رئیس صاحب کے کئی تبصرے اور مکالمے کہانی کا مزہ دوبالا کر دیتے ہیں۔ امجد صاحب ابتدائی صفحات کا حق بہت عمدگی سے ادا کر رہے ہیں۔"

کوئٹہ سے سیف خان کا تجزیہ" ڈائجسٹ کے حوالے سے آج کل عمومی تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ الیکٹرونک میڈیا اور خاص کر سوشل میڈیا کے زیر اثر آ کر قارئین کا ایک وسیع حلقہ مطالعے سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ یہ تصور شاید درست بھی ہو کیونکہ اب کہانیاں اس شدت سے ٹرانس میں نہیں لیتیں جیسا کہ ایک زمانے میں ہوا کرتا تھا لیکن اس مرتبہ انگارے کی قسط نے ان تمام تاثرات کی نفی کر دی۔ کہانی پڑھتے ہوئے فون کا ہوش رہا۔ نہ ٹی وی کا۔ اس وقت نظریں چونک گئیں جب بقیہ آئندہ...... کی لائن پہ اختتام ہوا۔ میں اپنا خط اس بار اپنے محبوب رائٹر کے نام کرتا ہوں۔ اللہ آپ کو لمبی حیاتی دے کہ آپ کے قلم سے نکلی ایسی بے شمار تحریریں

قارئین کے دل و دماغ کو سیراب کرتی رہیں۔ آوارہ گرد میں شہزی میاں یاسمین خانم کے تیر نظر سے گھائل ہو ہی گئے۔ مصر کے بعد امریکا یاترا کا خیال ابھی سے قاری کو کوفت میں مبتلا کرنے کے لیے کافی ہے۔ رنگوں کے سیکشن میں اس بار زویا اعجاز ہاتھ ہلاتی نظر آئیں۔ شکاری بلاشبہ شمارے کی دوسری بہترین کہانی رہی۔ ابتدائی 8 صفحات تک سسپنس، کرائم اور ڈرامے کا اتنا شدید نقشہ کھینچا گیا تھا کہ سانس لینی بھی دشوار محسوس ہوئی۔ کلائمکس میں بالی کے حوالے سے قاری کو شدید جھٹکا دینے کے بعد کہانی آہستہ آہستہ معمول پہ آتی گئی۔ ایک عرصہ بعد جاسوسی کے مزاج کی کہانی پڑھنے کو ملی۔ دوسرے رنگ میں فاروق انجم صاحب نے اسرار و تحیر کے کئی رنگ بھرے لیکن تمام واقعات کا پول ذرا مضحکہ خیز انداز میں کھلا۔ ہلکی پھلکی بھوک میں ہلکا پھلکا ٹک، کہانی ثابت ہوئی۔ ابتدائی صفحات پر امجد رئیس صاحب کے ساتھ لپ اسٹک سیریل کلر کا پیچھا کرتے کرتے ہمیں بھی دانتوں پسینہ آگیا تھا۔ ظالم خان جاتے جاتے ہماری پیاری سی شیرن کو چاقو کا چرکا لگا ہی گیا۔ اگرچہ کرداروں کے بہتات نے دماغ گھمائے رکھا لیکن ابتدائی صفحات کا حق ادا کر دیا کہانی نے۔ اعتراز سلیم کی شکست نے سری لنکن کرکٹ ٹیم پہ حملے کی یاد تازہ کردی۔ اس موضوع پر ایک وسیع کینوس کی کہانی جمائی جاسکتی تھی۔ اعتراز کا قلم اب پختگی دکھانے لگا ہے۔ ویلڈن برادر۔"

داؤدخیل سے محمد سجاول خان کا کمال "معمول کی طرح جاسوسی کا دیدار پہلی تاریخ کے بعد ہی ہوا۔ اس بار کا سرورق تھوڑا جاندار لگا۔ حسینہ اتنی متاثر نہیں کر پائی۔ مجھے تو اس کے نقوش خاصے مردانہ لگے۔ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے مرد کافی باوقار لگ رہا تھا۔ (واقعی) مگر اسے بھی لنڈے والی شرٹ پہنادی بالکل غریبوں کا شاہ رخ لگ رہا تھا۔ سرورق سے آگے بھاگتے دوڑتے رسالے کے اندر گھسے تو سامنے لگا نوٹ دیکھ کے ٹھٹک گیا۔ پڑھ کر حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی کہ ہمارے پسندیدہ شمارے پر یہ دن بھی آنے تھے کہ اس کے بند ہونے کی نوبت تک آجائے گی۔ میری تجویز اگر مانیں تو قیمت میں اضافہ کردیں۔ چینی نکتہ چینی کی محفل میں داخل ہوئے تو کافی عرصے بعد ایمانے صاحبہ کو اول صفحے پر براجمان دیکھا۔ بہت بہت مبارک ہو۔ ہمیشہ کی طرح کھٹے میٹھے تبصرے سے محفل کو چار چاند لگا دیے۔ محفل میں مجھے کچھ نئے نام بھی نظر آئے، یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ ہر ماہ بہت سے نئے لوگ اس محفل میں شامل ہوتے جا رہے ہیں۔ جہاں پر پرانے کھلاڑیوں کے لیے تبصرے موجود تھے، وہاں کئی نئے لوگ بھی اس کار خیر میں شامل تھے۔ تبصرہ چاہے لمبا ہو یا چھوٹا تبصرہ تبصرہ، ہوتا ہے ایسا سنا ہے سائیں قائم علی شاہ سے...... مجھے تو سب کے تبصرے اعلیٰ لگے۔ سب سے پہلے اعتراز سلیم وصلی کی شکست پڑھی حالانکہ یہ الگ بات ہے کہ اس کہانی سے جلنے والوں کو شکست ہوئی ہے ان کی خود فتح ہوئی۔ کہانی بہت اچھی تھی۔ زندگی کے دو مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہوئی تحریر تھی۔ کسی کی ہار میں دوسرے کی جیت ہوتی ہے اور یہ تو صدیوں سے قدرت کا اصول رہا ہے۔ دوسرے نمبر پر زویا اعجاز کی شکاری پڑھی۔ سرورق کے رنگوں کے مزاج کے عین مطابق ایک مکمل کہانی تھی۔ کہانی کے اتار چڑھاؤ، کردار نگاری نے خاصا متاثر کیا۔ کہانی کا انجام بالکل ہی مختلف اور چونکا دینے والا تھا۔ سرورق کا دوسرا رنگ بلائے جان محمد فاروق انجم صاحب نے بہت خوبصورت لکھا۔ کہانی کا ٹیمپو تیز تھا اور بوریت سے محفوظ رکھتے ہوئے کہانی کو اچھی طرح انجام تک پہنچایا گیا ہے۔ باقی مختصر کہانیاں بھی اچھی رہیں۔" (آپ کی کہانی انشاءاللہ اگلے ماہ)

کہوٹہ سے عاصم شہزادی کی داد "چار کوششوں کے بعد ستمبر کا جاسوسی بالآخر ستائیس اگست کو ہاتھ میں آیا۔ کہانیوں اور تبصرے سے پہلے بات کروں گا اس نوٹ کی جس میں قارئین سے ادارے کی مالی حالت زار کے سدباب کے لیے مشورہ طلب کیا گیا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ چند ایک کہانیوں کو چھوڑ کر جاسوسی کی ہر کہانی باکمال ہوتی ہے۔ مگر آج کے ترقی یافتہ دور میں انسانی ترجیحات بدل چکی ہوں۔ یہ ایک کڑوی سچائی ہے کہ الیکٹرونک میڈیا نے ہمیں پرنٹ میڈیا سے خاصا دور کردیا ہے۔ اس ضمن میں یہ اب زمانے کے ساتھ چلنا ناگزیر ہے۔ ادارہ اپنی ویب سائٹ لانچ کرے۔ ویب سائٹ کو گوگل ایڈسنس سے منسلک کرکے مالی بحران پہ قابو پایا جاسکتا ہے اس سے ایک تو پی ڈی ایف مافیا کی وجہ سے ہونے والے نقصانات کو روکا جاسکتا ہے دوسرا بیرون ملک قارئین کو پرچہ باآسانی دستیاب ہوسکے گا۔ کسی بھی پراڈکٹ کے لیے ایڈورٹائزمنٹ نہایت ہی ضروری ہے۔ ادارہ فیس بک گوگل اور مختلف سائٹس پہ اپنے اشتہار چلوائے۔ یوٹیوب چینل بھی ایک اچھا اور کارآمد آپشن ہے۔ اس کے علاوہ گوگل اور ایپل پلے اسٹور پر بھی جے ڈی پی نامی ایک ایپلیکشن موجود ہونی چاہیے۔ اس سلسلے میں مزید کسی آئی ٹی ایکسپرٹ سے خدمات لی جاسکتی ہیں۔ میرا جے ڈی پی سے اتنا پرانا تعلق نہیں مگر تعلق ہے اور بہت گہرا ہے اسی محبت اور تعلق کی بنیاد پہ میری کچھ تجاویز ہیں امید ہے آپ ان پہ غور کریں گے شکریہ۔ اب بات کروں سرورق کی...... سرورق پہ نظر ڈالی بڑی بڑی آنکھوں والی ٹائٹل گرل ہمیں گھورتی نظر آئی۔ ہم نے بھی نظر بچائی اور امجد رئیس کی کہانی پر آدھمکے۔ سیلون کا سورج واقعی منحوس تھا۔ جرم نفرت تعاقب موقع پرستی تحقیقات اور ایکشن کی انگلی پکڑے آگے بڑھتی اس داستان کی ابتدا میں جتنی شدت تھی، اس کے مطابق انجام نہ ہوا۔ لارا کے دوہرے کردار نے ڈاوئنگ کو موقع فراہم کیا۔ ڈاوئنگ نے موقع پر چوکا مارا۔ اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں سے خود کو بچانے کی کوشش کی مگر کونگ کی حاضر دماغی نے سب مٹی میں ملا دیا۔ اس کے علاوہ امریکی معاشرے کی کچھ لعنتوں کو بھی مثبت انداز میں پیش کیا گیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ خواہشوں کے اسیر جرم اور تعاقب کی سڑک پر چلتی تحریر بالکل سادہ تھی۔ خواہشیں جرم نہیں مگر ان کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے وہ راستہ جس سے کسی دوسرے کا نقصان ہو جرم ہے۔ ضروری ہے کہ ریلی جیسے نوجوانوں کو خواہشات کی تکمیل کا صحیح راستہ بتایا جائے۔ اندھیر نگری، ملکی حالات، بے بسی، جرم، تلخ حقائق، کرپٹ کرتا دھرتا اور پھر بغاوت۔ سلیم صاحب نے بہترین کہانی پیش کی گو کہ منظر نگاری اور ایکشن کم تھا مگر یہ ہمارے لیے سبق آموز تھی۔ مغل صاحب اس بار تو انگارے کو آتشی عروج پر لے گئے۔ یہ قسط بھرپور سے بھی کچھ اوپر تھی۔ شاہ زیب کی غیر متوقع گرفتاری اور پھر گنجے شیطانوں کی آمد نے اس اندیشے کو جنم دیا کہ اب گئے کام سے شاہ زیب صاحب۔ مگر قسطینا کی انٹری سے شادی مرگ کی کیفیت طاری ہوگئی۔ ڈی ایس پی قیصر کا اس طرح انجام تک پہنچنا کچھ اچھا نہیں لگا مگر ہماری اور مصنف کی خواہشات میں مطابقت کبھی کبھی ہوتی ہے۔ شکست، اعتراز سلیم وصلی کی ایک بہترین تحریر تھی۔ تلخ حقائق۔ جرم، مکر و فریب اور جذبوں سے لبریز اس کہانی میں ایکشن بھرپور تھا۔ آوارہ گرد کی یہ قسط غیر متوقع ہنگاموں سے بھرپور رہی۔ کوہارا کے زندہ بچنے پر ہم دانت پیس کر رہ گئے۔ اسے اب مرجانا چاہیے تھا مگر خیر...... پروفیسر صاحب کی اس طرح ہنگامی اور غیر متوقع موت سے دل غم سے ملول ہوگیا۔ کوہارا اور شہزی کا ٹکراؤ اس بار بھی انتہائی تھا۔ کئی ایک مواقع پر ایسا لگا ان میں سے ایک تو گیا مگر پھر دونوں بچ جاتے ہیں۔ سلیم انور کی تحریر بھی اچھی رہی۔ جھوٹ کا پول حسد جرم اور پھر اس جرم کو چھپانے کے لیے جھوٹ کا سہارا مگر زیرک راوی نے سب پردے چاک کردیے۔"

ساگر تلوکر کی باتیں، میانوالی سے "جاسوسی کی دنیا کے ساتھیو۔ جاسوسی بروقت ملا تو فرحت اور مسرت ملی۔ سرورق جاسوسی کی شان شایان کے مطابق نہ تھا۔ ہوتا بھی کیسے ہر بندہ ذاکر تو نہیں بن سکتا ناں۔ ٹائٹل کو دیکھ کر نہ تو آنکھ پھڑکی نہ دل دھڑکا۔ چینی نکتہ چینی میں ایمانے اولین صفحے پر اچھل کود رہی تھیں۔ دھیان رکھیں ستمبر ہے۔ زیادہ اچھل کود اچھی نہیں۔ محترم سیف بقول شاعر آپ کو چکر آتے ہیں تو اپنا میڈیکل چیک اپ کروائیں، کہیں کوئی انہونی نہ ہو جائے۔ باسط شہزاد کب تک ہماری کارروائیوں سے بچ پاؤ گے۔ پہلے صفحات پر ناصر ملک، زویا اعجاز، کبیر عباسی اور نواب مرحوم کی غیر مطبوعہ کہانیاں بھی پیش کریں۔ (انشاءاللہ ضرور کریں گے) حساب برابر ایک دلچسپ مزے داری کہانی بہت گہرا سبق دے گئی۔ منظر امام چاقو سے گدگدی کرتے ہیں۔ (واہ کیا تشبیہ دی ہے) انگارے اس بار مار دھاڑ سنسنی خیز اور رقاص کا راز بھی کھول گئی۔ قسطینا پارٹی کی پاکستان آمد ذرا مصنوعی سی لگی۔ ہاناوانی کا کردار بھی کسی کی طرح پھیلتا جارہا ہے۔ اندھیر نگری ایک امید اور آس دلاتی تحریر تھی۔ اب تو ویسے بھی اندھیر نگری روشن نگری میں بدل رہی ہے۔ (یقیناً) شکست، محبت، جرم اور جذبات سے گندھی اچھی کہانی تھی۔ جھوٹ کا پول دو عورتوں کی روایتی رقابت کی کہانی۔ ویسے عورتیں آپس میں رقابت کیوں رکھتی ہیں۔ (ہمیں خود نہیں معلوم) بلائے جاں روبی نے چال تو اچھی چلی تھی مگر مبشر کی قسمت ساتھ دے گئی۔ روبی پر شروع سے شک تھا اور مجرم وہی نکلی۔ سو اس کہانی میں دلچسپی اور سسپنس کی بہت کمی محسوس ہوئی۔ شکاری۔ مکمل سرورق کی فٹ کہانی لگی۔ زویا اعجاز معاشرے کی بہترین جراحی کرتی ہیں۔ ان کے قلم میں گہری کاٹ ہے۔ ایک ایک فقرہ سوچ اور کھوج دیتا ہے۔ لگتا ہی نہیں کسی نئے لکھاری کی تحریر پڑھ رہے ہیں۔ زویا کا نام معیار کی ضمانت بن گیا ہے۔ انسپکٹر عامر اور سعد تو روایتی پولیس والے نکلے۔ جلدی اور مصروفیت کی وجہ سے اتنے پر ہی اکتفا کروں گا۔"

کراچی سے سعدیہ قادری کی نیک تمنائیں "چند ماہ سے میرا تبصرہ شامل نہ ہونے کی وجہ سے نکتہ چینی کی محفل سونی سونی سی لگ رہی تھی اس لیے میں نے سوچا کہ اس ماہ حاضری لگا دوں۔ یہ اداریے سے صد فیصد متفق ہوں۔ ایمانے زارا شاہ کو کرسی صدارت مبارک ہو۔ عادت کے عین مطابق سب سے پہلے انگارے پڑھی، شکر ہے اس ماہ شاہ زیب نے میل نرسنگ کا کام چھوڑ کر ایسٹرن کنگ والے کچھ کام کیے۔ ہاناوانی کا سحر اتنی جلدی اور آسانی سے ختم ہونے کی امید نہیں ہے۔ لگتا ہے ابھی مزید کئی افراد اس کے انتقام کی بھینٹ چڑھیں گے۔ سرورق کے رنگوں میں پہلے رنگ پر میری پسندیدہ زویا اعجاز ایک اہم معاشرتی مسئلے کے ساتھ موجود تھیں، بالی نے اپنے مجرموں سے تو بدلا لیا ہی مگر اس کے ایک مجرم سے قدرت نے جو انتقام لیا، وہ لاجواب تھا۔ کاش کہ ملک میں ایسا کوئی ادارہ ہو جو ایسے بچوں کی حفاظت کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو معاشرے میں باعزت زندگی گزارنے کے لائق بھی بنادے لیکن اصل مسئلہ ہمارے معاشرے کی بیمار ذہنیت ہے، یہاں پر سات آٹھ سال کے بچے بچیاں ہی محفوظ نہیں تو پھر اس طرح کے کیس تو اور بھی خطروں میں گھرے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کی عزت و عصمت کی حفاظت فرمائے آمین۔ اس کے بعد بلائے جان کی خبر لی، روبی کو اتنا اچھا شوہر اور گھر ملا پر انسان بہت ناشکرا ہے، سو اس نے بھی اپنے شوہر کی ناقدری کی اور اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ اس ماہ چونکہ تبصرہ کرنے کا ارادہ تھا اس لیے مترجم کہانیاں ناپسند ہونے کے باوجود سیلون کے سورج کا مطالعہ شروع کیا اور پھر اس میں ایسا گم ہوئی کہ مکمل کرکے ہی چھوڑا، امجد صاحب کا مخصوص انداز، اردو تراکیب کا برمحل استعمال کہانی کو چار چاند لگا گیا۔ مغربی معاشرے میں پائی جانے والی ایک عام برائی جو کہ اب پڑوسی ملک میں قانونی طور پر جائز قرار دے دی گئی ہے کو عیاں کرتی اس سال کی بہترین تحریروں میں سے ایک سیلون کا سورج رہی۔ احمد سلیم کی اندھیر نگری پڑھ کر مجھے تھوڑی پرامیدی ہوگئی کہ ہمارے پیارے وطن کی جڑیں کاٹنے والے، فرقہ واریت کا بیج بونے والے، عصبیت کو فروغ دینے والے ایک دن اپنے انجام سے دوچار ہوں گے۔ اعتراز کی شکست بھی خوب رہی، آپ کی تحریر میں روز بروز نکھار آتا جارہا ہے اور یہ بھی اچھی بات ہے کہ موضوع بھی ہر بار کچھ الگ سا ہوتا ہے، اس کہانی میں نوجوانوں کو دہشت گردوں کے ہاتھوں کھلونا بننے کی ایک اہم وجہ بتائی گئی، اکثر نوجوان گھر والوں کی بے اعتباری اور عدم توجہی کی بنا پر اس راستے کی طرف چل پڑتے ہیں جہاں سے دونوں جہاں کی ذلت و رسوائی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ منظر امام ہمیشہ کی طرح مختصر کہانی میں پر اثر سبق دے گئے، واقعی ہمیں دوسروں کی آنکھ کا تنکا بھی نظر آجاتا ہے اور اپنی آنکھ کے شہتیر سے ہم غافل رہتے ہیں۔ اب رہ گئیں چار عدد انگریزی کہانیاں جن میں سے صرف ایک پڑھنے کا ٹائم تھا سو میں نے عکس فاطمہ کو چنا۔ مغرب کی عورت بھی مشرقی عورت کی طرح محبت اور شادی کے نام پر دھوکا کھا گئی پر اس نے ہار نہ مانی اور اپنا بدلہ لے کر رہی۔ آپ نے قارئین سے جو مخلصانہ آرا مانگی ہیں اس سلسلے میں میری رائے یہ ہے کہ مترجم کہانیاں جو کہ اکثر ہی یکساں سیاق و سباق پر مشتمل ہوتی ہیں، ان کو بند کردیا جائے۔ یوں کچھ صفحات بچ جائیں گے۔ یہ میری ذاتی رائے ہے، بہت سے قارئین ایسے بھی ہوں گے جنہیں یہ کہانیاں پسند ہوں گی، لہٰذا ادارہ جو بھی فیصلہ کرے، وہ اکثریت کی رائے کو دیکھتے ہوئے کیا جائے پر خدارا اشاعت معطل کرنے والے آپشن کی طرف تو بالکل نہ دیکھیں۔ اب اجازت اس دعا کے ساتھ کہ کاغذ سستا ہوجائے اور جے ڈی پی سمیت تمام اشاعتی اداروں کی مالی مشکلات ختم ہوجائیں، آمین۔"

گوجر خان سے عرفان راجہ کی حکمرانی "کافی عرصے بعد میں محفل میں دوبارہ دستک دے رہا ہوں۔ وجہ ستمبر کا شمارہ اس بار خلاف توقع جلدی ملا، ورنہ یکم کے بعد ہی ملتا۔ فہرست سے ہوتے ہوئے محفل میں پہنچے۔ اداریے میں آپ نے ہمارے بنیادی مسائل کی منظر کشی کی۔ ادارے کے بحران کے حل کے لیے قیمت بڑھانا ہی بہتر ہے۔ مغل جی کی انگارے نے اس بار ہنگامہ خیزی کا ریکارڈ بنا دیا۔ شاہ زیب کو اس کے دشمنوں نے مشترکہ طور پر قابو کیا تو مشترکہ طور پر دوستوں نے اس کی جان چھڑائی، مغل صاحب نے حساب برابر کردیا۔ قیصر چوہدری اپنے انجام کو پہنچا۔ زویا اعجاز کی شکاری کو پڑھا۔ کہانی پسند آئی لیکن پولیس اہلکاروں کے مکالمے صورت حال سے مناسب نہیں لگے۔ فاروق انجم کی بلائے جان اتنی خاص نہیں لگی، کہانی کو بے جا طول دیا۔ امجد رئیس اولین صفحات پر براجمان تھے۔ سیلون کا سورج، لارا، بیجی اور ڈاوئنگ...... تین کردار...... تین مجرم...... ایکشن، سسپنس اور جاسوسی سے بھرپور کہانی ملی۔ شیرن عرف شہزادی نے خوب مقابلہ کیا۔ اندھیر نگری میں بابر نے معاشرتی ناہمواریوں سے تنگ آکر جرم کی راہ اپنائی لیکن آخر کار اس دلدل سے نکل آیا۔ کہانی اچھی رہی۔ منظر امام حسب معمول مزاح کے پیرائے میں ایک تلخ حقیقت کو بیان کرگئے۔ شگن چاچا نے خوب تفتیش کی۔"

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شامل اشاعت نہ ہوسکے۔

رانا بشیر احمد ایاز، احسان پور رحیم یار خان۔ شہباز اقبال، کراچی۔ شاہد حسین، حیدر آباد۔ حمیرا اقبال، میرپورخاص۔ جاوید کریم، کراچی۔

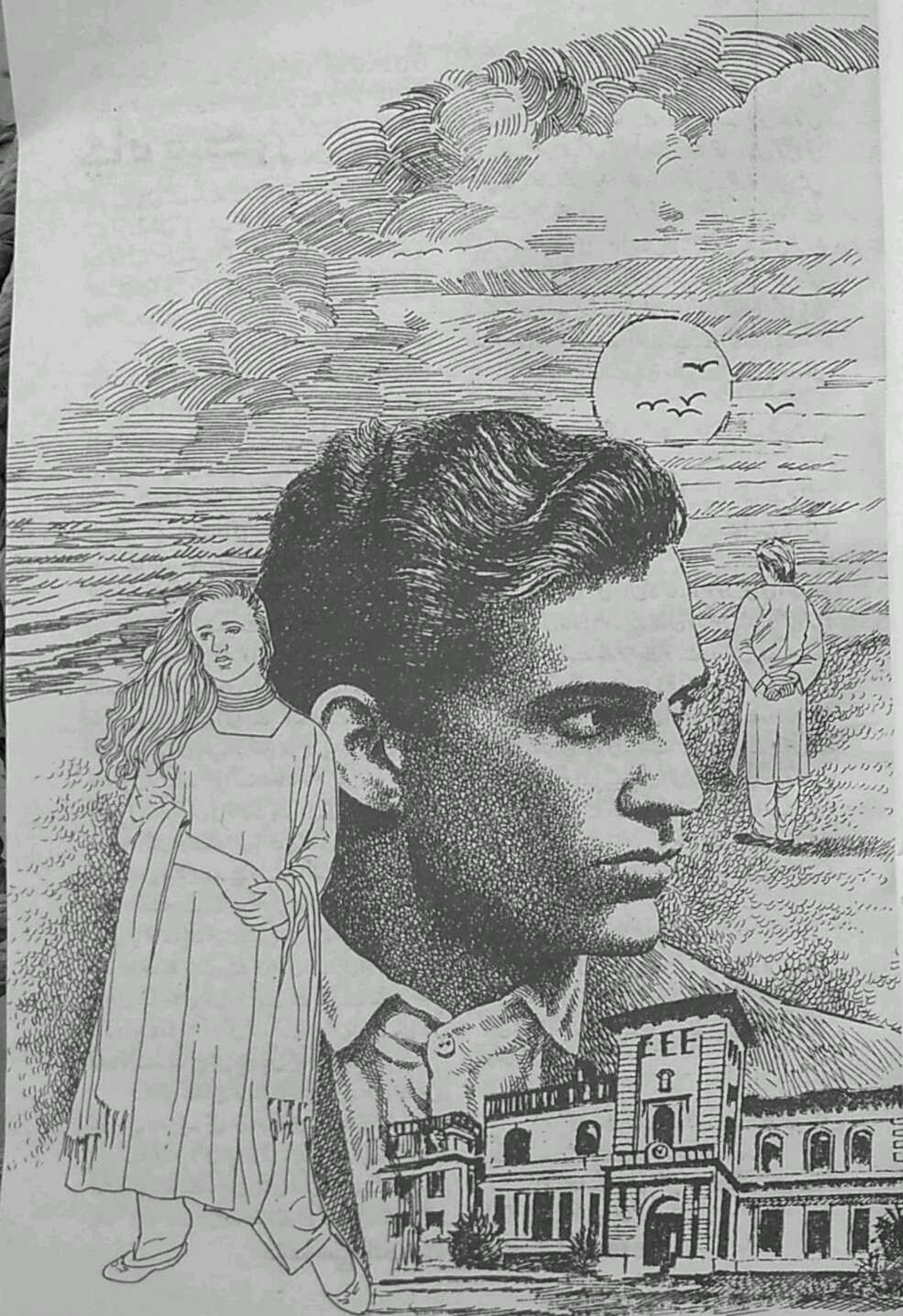

کاشف زبیر کی آخری طبع زاد پُراثر۔۔۔عبرت انگیز کہانی

چاہِ مکرر

کاشف زبیر

زندگی ہمواریوں اور ناہمواریوں سے وابستہ ہے۔۔۔نشیب و فراز ۔۔۔اس جیتی جاگتی زندگی کا حسنِ جاوداں ہے۔۔۔ہر شخص کو اپنی زندگی میں مختلف حالات و واقعات سے مستقل گزرنا پڑتا ہے۔۔۔کوئی بھی شخص ایسا نہیں جس کی زندگی ایک ہی سمت میں گزر رہی ہو۔۔۔زندگی سچ۔۔۔جھوٹ۔۔۔اچھائی۔۔۔برائی۔۔۔اونچ نیچ سے بندھی ہے۔۔۔یہ الگ بات کہ کسی کی زندگی میں ایسے حالات کا غلبہ رہتا ہے جو اس کے مزاج اور فطرت سے یکسر مختلف ہوتے ہیں۔۔۔اور وہ ہمیشہ ناخوش رہتے ہیں۔۔۔

ہر تمنّا دل سے رخصت ہو گئی
اب تو آجا کہ اب خلوت ہو گئی

محبت کے بغیر انسان ایک فرد ہے۔۔۔اس کا کوئی گھر بار نہیں۔۔۔کوئی فیملی نہیں، اس کا دوسروں کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں۔۔۔یہ بے تعلقی۔۔۔یہ نارشتے داری دراصل موت ہے۔۔۔زندگی نام ہے تعلق داری کا۔۔۔محبت سے نبھانے کا۔۔۔ایک ایسے ہی ناآسودہ شخص کی زندگی کی داستانِ حسرت۔۔۔جس کا ہر دن یاس زدہ اور سیاہ رات کے مانند تھا۔۔۔وہ ہمیشہ اپنے خاندان سے بے تعلق۔۔۔بیزار رہا۔۔۔اس کے دل کی کلی بچپن میں ہی مرجھا چکی تھی۔۔۔جو تاعمر کھِل نہ سکی۔۔۔

ان وارداتِ قلبی کا قصۂ غم جو تشنۂ اظہار رہ گئے تھے

اس نے دور سمندر میں ڈوبتے سورج کو دیکھا۔ اسے لگا جیسے وہ اس کی مایوس زندگی سے منہ چھپا کر سمندر میں اتر رہا ہو۔ وہ اس پر ترس کھا رہا تھا۔ تقریباً چوالیس برس کی عمر میں آکر اس نے جان لیا تھا کہ زندگی میں اس کے لیے کچھ نہیں رہا۔ بچپن سے آج تک جب اس کی زندگی میں کوئی اہم دوراہا آیا۔ ایک راستہ کامیابی کی طرف جاتا تھا اور دوسرا ناکامی کی طرف، تو اس نے ہمیشہ غلط راستے کا انتخاب کیا تھا...... ایسے ہی غلط موڑ طے کرتے کرتے آج آخری حد پر آکھڑا ہوا تھا۔ اب اس کے پاس کوئی اور راستہ نہیں رہا تھا......

☆☆☆

''بیٹے اٹھ جاؤ۔'' اسے ماں کی آواز آئی۔ وہ کچھ دیر کسمساتا رہا تھا۔ پھر باپ نے بھی پکارا تو وہ بادلِ ناخواستہ اٹھ گیا تھا۔ اس نے منہ بسورتے ہوئے ماں کو دیکھا اور رونے کی تیاری کرنے لگا لیکن ماں نے توجہ دیے بغیر اسے باتھ روم جانے کا حکم دیا۔ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا مگر اسے جانا تو تھا۔ وہ مجبوراً تیار ہوا اور ناشتا کر کے باپ کے ساتھ اسکول داخلہ مہم پر روانہ ہوا۔

ریحان احمد نے پہلی بار اسکول دیکھا تھا۔ بڑی سی صاف ستھری عمارت اور اس کے سامنے بڑا سا میدان تھا جس میں ہاف ٹائم میں پتلون شرٹ میں ملبوس بچے کھیل رہے تھے۔ میدان کے کناروں پر درخت لگے تھے جس کے نیچے بنچیں تھیں۔ ریحان اپنے باپ کے ہمراہ پرنسپل کے سجے کمرے میں آیا۔ جب ظفر احمد نے اسے بتایا کہ وہ اپنے بیٹے کو اس اسکول میں داخل کرانے لایا ہے تو پرنسپل نے بہ غور ریحان کا جائزہ لیا اور پھر ظفر احمد سے کہا۔ ”آپ کا بیٹا چھوٹا لگ رہا ہے، اس کی عمر کیا ہے؟“

”اس جون میں پانچ سال کا ہو جائے گا۔“ ظفر احمد نے کہا۔ ان کی حال ہی میں دوسری بیٹی ہوئی تھی اور ریحان احمد اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کی بیوی سے تین بچے بیک وقت نہیں سنبھالے جاتے تھے اس لیے اس نے شوہر سے کہا کہ وہ ریحان کو اسکول میں داخل کرا دے۔ ظفر احمد ایک سرکاری ملازم تھا، صبح جاتا تھا تو رات کو گھر آتا تھا۔ بیوی کے لیے اکیلے تین بچے سنبھالنا واقعی مسئلہ تھا۔ کوئی اور تھا نہیں اور شادی کے ایک سال بعد ہی ظفر ماں باپ کا گھر چھوڑ کر کرائے کے مکان میں اٹھ آیا تھا۔ باپ کا گھر بھی کون سا بہت بڑا تھا۔ تین کمرے تھے اور سات افراد تھے۔ شادی کے بعد ایک پورا کمرا ظفر کو دینا پڑا تو تنگی بڑھ گئی تھی۔ ان حالات میں ظفر نے محسوس کیا کہ اسے اب اپنا بندوبست کر لینا چاہیے۔ اس لیے اس نے الگ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ جب اس کے ماں باپ اور بہن بھائیوں کو اس فیصلے کا پتا چلا تو وہ خوش ہو گئے۔ ظفر الگ ہو جاتا تو گھر میں کچھ تو جگہ نکلتی۔ جگہ کی تنگی نے ردِعمل کی نوعیت بدل دی تھی۔ ممکن ہے وہ کسی بڑے گھر میں ہوتے تو اس بات پر رونا پیٹنا مچ جاتا۔ بہو کو الزام دیا جاتا کہ وہ بیٹے کو لے کر الگ ہو رہی۔

الگ ہونے کے بعد ظفر کی بیوی شبانہ نے بھی سکون کا سانس لیا تھا۔ ایک کمرے میں اس کے جہیز کا سارا سامان ٹھنسا ہوا تھا۔ اوپر سے پہلے ہی سال اولاد بھی ہو گئی۔ اب دو کمروں کے مکان میں وہ سکون سے رہ رہے تھے۔ کشادہ برآمدہ اور چھوٹا سا صحن بھی تھا۔ گرمیوں میں لائٹ چلی جاتی تو وہ مزے سے صحن میں چارپائی بچھا کر سو جاتے۔

ریحان کے ڈیڑھ سال بعد ایک بیٹی ہوئی اور مزید تین سال بعد ایک بیٹی اور ہو گئی تھی۔ ریحان .... ساڑھے چار سال کا تھا اور ابھی بچہ ہی تھا۔ تینوں بچے بیک وقت ماں کی توجہ چاہتے تھے۔ وہ پریشان ہو گئی۔ اس نے شوہر سے کہا۔ ”اس سال ہر صورت ریحان کو اسکول میں داخل کرائیں، میں تین بچے نہیں سنبھال سکتی۔“

آج سے کوئی چوالیس سال پہلے نجی اسکولوں کا رواج نہ ہونے کے برابر تھا اور جو تھے وہ بھی شہر کے پوش علاقوں میں تھے۔ ظفر احمد جس کالونی میں رہتا تھا، وہاں کوئی نجی اسکول نہیں تھا۔ تین چار سرکاری اسکول تھے اور ان میں سب سے بہتر یہی فیڈرل گورنمنٹ اسکول تھا۔ وہ اسے داخل کرانے پہلے اسی اسکول میں لایا تھا۔ ہر باپ کی طرح اس کی بھی خواہش تھی کہ اس کا بیٹا سب سے اچھے اسکول میں پڑھے لیکن جب پرنسپل کو معلوم ہوا کہ ریحان ابھی پانچ سال کا نہیں ہوا تو اس نے داخلہ دینے سے انکار کر دیا۔

”یہ ہمارا اصول ہے پانچ سال سے کم عمر بچے کو داخلہ نہیں دیتے۔“

ظفر پریشان ہو گیا۔ ”جناب صرف تین مہینے تو رہ گئے ہیں۔“

”اصول اصول ہے۔“ پرنسپل نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ”آپ اسے اگلے سال لے آیئے گا، میں داخل کر لوں گا۔“

لیکن مسئلہ تو اسی سال کا تھا۔ نومولود بچی کی وجہ سے شبانہ اس سال لازمی طور پر ریحان کو اسکول میں داخل کرانا چاہتی تھی تاکہ اسے کچھ فرصت تو ملے اور اس نے گھر سے روانگی کے وقت ظفر سے کہہ دیا تھا کہ وہ ریحان کو داخل کرا کر ہی آئے۔ خود ظفر کا بھی یہی ارادہ تھا۔ اسے روز روز دفتر سے چھٹی نہیں مل سکتی تھی۔ جب اس اسکول کے پرنسپل نے معذرت کر لی تو اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ریحان کو کسی میونسپل اسکول میں داخل کرا دے جن کو عرف عام میں پیلے اسکول کہا جاتا ہے۔ ایسے کئی اسکول موجود تھے۔ جب ظفر ریحان کو لے کر جانے لگا تو اس نے کہا۔

”ابو میں یہاں پڑھوں گا۔“

خود ظفر کی بھی یہی خواہش تھی۔ اس کا بچہ صاف ستھرے ماحول میں اور اچھے اساتذہ سے تعلیم حاصل کرے لیکن مجبوری تھی۔ اس نے کہا۔ ”بیٹے یہاں تمہارا داخلہ نہیں ہو سکتا ہے۔“

”کیوں ابو؟“

”تم ابھی پانچ سال کے نہیں ہوئے ہو اور یہاں پانچ سال سے کم عمر بچوں کو داخلہ نہیں ملتا ہے۔“

”ابو مجھے اگلے سال داخل کرا دیجیے گا۔“ اس نے التجا کی۔ ”مجھے یہ اسکول اچھا لگ رہا ہے۔“

مگر ظفر بیوی کی وجہ سے مجبور تھا۔ اس نے ریحان کو تسلی دی۔ ”بیٹے ابھی تو میں تم کو دوسرے اسکول میں داخل کرا دیتا ہوں۔ اگلے سال تم کو اسی اسکول میں داخل کرا دوں گا۔“

وہ اسے لے کر ایک پیلے اسکول میں آیا۔ ایک چھوٹی سی ٹوٹی پھوٹی عمارت میں قائم اس اسکول میں نہ تو کھیل کا میدان تھا اور نہ ہی صفائی ستھرائی تھی۔ دیواروں سے پلستر جھڑ رہا تھا اور کلاسز میں زمین پر دریوں پر بچے شلوار قمیص میں بیٹھے پڑھ رہے تھے۔ اسکول دیکھتے ہی اس نے باپ سے کہا۔ ”ابو مجھے یہاں نہیں پڑھنا ہے۔“

اس بار ظفر کو غصہ آ گیا۔ اس نے اسے جھڑک دیا۔ ”چپ رہو تم کو یہیں داخل کرانا ہے۔“

ظفر اسے ہیڈ ماسٹر کے کمرے میں لے گیا۔ اتفاق سے وہ ظفر کا واقف کار نکل آیا تھا اور اس نے فوراً ہی ... ریحان کو داخلہ دے دیا تھا۔ ظفر خوش تھا کہ اب اسے دوسرے کاموں کے لیے چکر نہیں لگانے پڑیں گے۔ وہ خوش خوش اس کا داخلہ کرا کے اسکول سے نکلا لیکن ریحان دکھی تھا، اس کا خیال تھا کہ اس کی زندگی میں یہ اولین غلط موڑ تھا۔ اس کی وجہ سے اس کی زندگی ایسے راستے پر چل پڑی جس پر ناہمواریاں بہت تھیں اور آسانیاں نہ ہونے کے برابر۔

ریحان اس داخلے سے بالکل خوش نہیں تھا۔ وہ گھر آ کر بھی رویا مگر اس کی ماں نے بھی اسے ڈانٹا کہ اسے اسکول جانا ہوگا۔ اس کے پاس اتنی سمجھ نہیں تھی ورنہ شاید وہ اپنی ماں سے وعدہ کر لیتا کہ وہ اسے تنگ نہیں کرے گا اپنی بہنوں کو سنبھالنے میں اس کا ہاتھ بٹائے گا۔ وہ اسے اس اسکول میں داخل نہ کرائے بلکہ اگلے سال جب وہ پانچ سال کا ہو چکا ہوگا تو اسے اچھے اسکول میں داخل کرا دے۔ اپنی ناسمجھی کی وجہ سے وہ نہ پڑھنے کی ضد کرتا رہا اور ماں باپ دونوں سے پٹا تھا۔ اسی دن ظفر .... اس کے یونیفارم کے لیے کپڑا لے آیا تھا۔ شبانہ نے رات میں بیٹھ کر اس کا الٹا سیدھا یونیفارم سیا اور وہ اسکول جانے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں پہلی کلاس کے لیے کتاب کاپی ہونا ضروری نہیں ہوتی تھی۔ لکڑی یا لوہے کی تختی ہوتی تھی جس پر چاک یا قلم اور انک سے لکھا جاتا تھا۔ بچوں کو عام طور سے زبانی پڑھایا جاتا تھا اور ان کا امتحان بھی زبانی ہوتا تھا۔

جب اسکول جانے کا مرحلہ آیا تو ریحان رو رو کر اسکول گیا تھا۔ ظفر صبح جاتے ہوئے اسے اسکول چھوڑ جاتا تھا۔ جہاں وہ ایک دو پیریڈ تک روتا رہتا تھا اور پھر استاد سے پٹتا تھا۔ اسکول میں کوئی خاتون ٹیچر نہیں تھی۔ سارے مرد استاد تھے۔ ان کا زیادہ وقت بچوں کو پڑھانے سے زیادہ آپس میں گپ شپ کرنے میں گزرتا تھا۔ کئی بار پٹنے کے بعد ریحان نے اسکول میں رونا تو بند کر دیا تھا لیکن جب صبح شبانہ اسے اسکول جانے کے لیے اٹھاتی تھی تب وہ ضرور رو تا سسکتا تھا۔ کبھی کبھی وہ مچل جاتا کہ اسے اسکول نہیں جانا۔ شروع میں تو شبانہ مان جاتی لیکن جب وہ ماں کو تنگ کرتا تو اسے غصہ آتا کہ اس نے اس کی چھٹی کیوں کرا دی۔

یوں روتے دھوتے اسکول جاتے ہوئے اسے ایک سال گزر گیا تھا۔ وہ امتحان پاس کر کے دوسری کلاس میں آ گیا۔ اس کے ذہن سے وہ اسکول نکلا نہیں تھا اور اسے پرنسپل کی پیش کش بھی یاد تھی۔ اس نے اپنے باپ سے کہا۔ ”ابو آپ نے کہا تھا کہ مجھے اسی اسکول میں داخل کرائیں گے۔ اب میں پانچ سال کا ہو گیا ہوں۔“

ظفر کو یاد آیا لیکن اب اس بات کو سال گزر چکا تھا اور وہ سوچنے لگا کہ ریحان اس اسکول کا عادی تو ہو گیا ہے۔ ریحان پُرامید نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”بیٹے تم کو اب وہاں داخلہ نہیں ملے گا۔“

”کیوں ابو؟“

”تم یہاں جو پڑھ رہے ہو۔“

ریحان اب کسی قدر سمجھ دار ہو چکا تھا۔ اس نے فوراً اس مسئلے کا حل پیش کیا۔ ”ابو آپ ان کو بتایئے گا نہیں کہ میں ایک سال اسکول میں پڑھ چکا ہوں۔“

”لیکن تم کو پہلی کلاس پھر سے پڑھنا پڑے گی، ایک سال ضائع ہو جائے گا۔“

شبانہ نے سنا تو اس نے مخالفت کی۔ ”کوئی ضرورت نہیں ہے، اس کا ایک سال خراب کرنے کی۔“

”شبانہ یہ ضد کر رہا ہے کہ اسی اسکول میں پڑھے گا۔“

ظفر تذبذب میں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ریحان کی کون سی بہت زیادہ عمر ہو گئی تھی۔ وہ پہلی کلاس پھر سے پڑھ لیتا تو کوئی فرق نہیں پڑتا مگر شبانہ اس کے لیے تیار نہیں تھی، اس نے کہا۔ ”کیا ضرورت ہے دونوں سرکاری اسکول ہیں ایک جیسی تعلیم دیتے ہیں۔“

شبانہ کو اس اسکول کے بارے میں پتا نہیں تھا اس لیے اس نے محض ریحان کی ضد سمجھ کر انکار کر دیا۔ ”اور ابھی تو اس کا نیا یونیفارم بنایا ہے۔ اب پھر سے بنانا پڑے گا۔

پھر فیس بھی دوبارہ سے بھرو۔"

"فیس تو تھوڑی سی ہے۔" ظفر نے کہا۔

"بس اب لڑکیوں کی فکر کریں۔ اسے جس اسکول میں داخل کرا دیا ہے وہیں ٹھیک ہے۔" شبانہ بے پروائی سے بولی۔

ریحان بچہ تھا اس کا اپنے ماں باپ پر زور نہیں تھا اور اس زمانے میں ماں باپ والدین ہی ہوتے تھے۔ آج کل کے ماں باپ کی طرح بچوں کے ہاتھ میں موم کی ناک نہیں بنے تھے۔ ان کا انداز بہت سخت ہوتا تھا اور اہم ترین معاملات میں بھی اولاد کی رائے لینا یا اس کی رائے پر عمل کرنا اپنی انا کی سبکی سمجھتے تھے۔ کم سمجھ ہونے کے باوجود ریحان نے محسوس کیا کہ اس کے ماں باپ نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ ایک اچھے اسکول میں داخل کرانے کے بجائے ایک کم تر معیار کے اسکول میں تعلیم دلا کر اس کا مستقبل تاریک کیا تھا۔

اسے تعلیم سے چڑ ہو گئی تھی۔ وہ جیسے تیسے اسکول جاتا اور کسی نہ کسی طرح پاس ہوتا رہا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ امتحان کے دنوں میں ظفر اسے خود پڑھاتا تھا۔ ورنہ وہ شاید فیل ہی ہو جاتا۔ اس کا اسکول... پانچویں تک تھا۔ جب وہ پانچویں میں آیا تو خوش تھا کہ اگلے سال اس اسکول سے اس کی جان چھوٹ جائے گی۔ مگر جب پانچویں کے امتحانات قریب آئے تو پتا چلا کہ اسکول کو مڈل تک ترقی دے دی گئی تھی اور اب اس میں پڑھنے والوں کو اگلے سال چھٹی میں داخلہ مل جائے گا۔

ریحان کو صدمہ ہوا تھا لیکن شبانہ اور ظفر خوش تھے کیونکہ ریحان کی دونوں چھوٹی بہنیں فرحی اور نعمانہ بھی اسی اسکول میں پڑھتی تھیں اور وہ صبح ریحان کے ساتھ جاتی تھیں۔ اب ریحان کو کسی اور اسکول میں داخل کرایا جاتا تو بچیوں کو لانے لے جانے کا مسئلہ بن جاتا۔ لیکن اب یہی اسکول مڈل تک ہو گیا تو ان کا مسئلہ ہی حل ہو گیا تھا۔ ان کی خوشی دیکھ کر ریحان کو ہمت ہی نہیں ہوئی کہ ان سے کسی اور اسکول میں داخل کرانے کو کہہ سکے۔ اسے لگا، یہ اسکول اس کا مقدر بن گیا۔

وہ اسی اسکول میں پڑھتا رہا جب وہ ایک کلاس پاس کر لیتا تھا تو خود بہ خود اگلی کلاس شروع ہو جاتی تھی۔ مڈل تک اسے امید تھی کہ اس کے بعد تو وہ کہیں اور پڑھ ہی لے گا۔ اسے تعلیم سے خاص دلچسپی نہیں رہی تھی بس اسے ضد سی ہو گئی تھی کہ اس نے اس اسکول کے علاوہ کہیں اور پڑھنا ہے۔ مڈل تک آتے آتے اس کی بہنیں بھی بڑی ہو گئی تھیں اور اب وہ خود سے اسکول آ جا سکتی تھیں۔ ریحان خوش تھا کہ اب اس کی جان چھوٹ جائے گی اور میٹرک میں اسے کسی اور اسکول میں پڑھنے کا موقع ملے گا۔ لیکن آٹھویں میں اس نے اساتذہ سے سنا کہ اب اسکول کو میٹرک تک توسیع دی جا رہی ہے۔ یہ سن کر ہی ریحان کا دل صدمے سے ڈوبنے لگا تھا۔

"اسکول میٹرک تک ہو گیا ہے لیکن میں یہاں نہیں پڑھوں گا۔"

"پھر کہاں پڑھو گے؟" شبانہ نے اسے گھورا۔ وہ اس کا اکلوتا بیٹا تھا لیکن وہ اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتتی تھی۔

ریحان نے کہا۔ "کسی اور اسکول سے میٹرک کروں گا۔"

"اب تمہیں اور کس اسکول میں داخلہ ملے گا۔"

"بہت سے اسکول ہیں۔" اس نے کہا۔ "کسی اچھے اسکول سے میٹرک کروں گا تو آگے اچھے کالج میں داخلہ ملے گا۔"

"اس اسکول میں تم نے کیا تیر مارا ہے جو کسی اچھے اسکول میں کچھ کر لو گے۔ وہاں بھی تم ایسے ہی مارے باندھے پڑھو گے۔"

"اس اسکول میں کوئی پڑھنے کا ماحول ہے۔" اس نے تلخی سے کہا۔ "مجھے معلوم ہے میٹرک میں بھی یہی ہو گا۔ میں سائنس لوں گا تو ان کے پاس پریکٹیکل کرانے کے لیے کچھ ہو گا نہیں۔"

"اپنے باپ سے بات کرنا۔" شبانہ نے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

ظفر ان دنوں دفتر سے بہت دیر سے آتا تھا۔ اس کا افسر سخت آدمی تھا اور وہ بے چارے ملازموں کو دفتری اوقات کے بعد بھی روک لیا کرتا تھا۔ اس وجہ سے گھر آنے پر ظفر چڑچڑا ہو رہا ہوتا تھا اور کوئی بات ہوتی تو اسے غصہ آنے میں دیر نہیں لگتی تھی۔ یہ دیکھ کر ریحان کی اس سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ لیکن جب آٹھویں کا امتحان ہو گیا تو ایک دن اس نے ہمت کر کے باپ سے بات کر لی۔ خلافِ توقع ظفر نے اس کی بات غور سے سنی اور بولا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو اس اسکول میں عام سہولتیں نہیں ہیں سائنس کے پریکٹیکل کہاں سے کرائیں گے۔"

ریحان خوش ہو گیا۔ "تو ابو میں کہیں اور داخلہ لے

لوں۔"

"ہاں کوئی اچھا اسکول دیکھو۔"

ریحان کا ایک دوست سول ایوی ایشن کے اسکول میں گیا تھا اور وہ وہاں کی بہت تعریف کرتا تھا۔ ریحان نے وہاں جا کر داخلے کی بات کی۔ اس نے آٹھویں میں خاصی محنت کی تھی اس لیے اس کے نمبر بھی اچھے آئے تھے اس لیے اسے وہاں اس شرط پر داخلہ مل گیا کہ وہ اپنے اسکول سے لیونگ سرٹیفکیٹ لے آئے۔ ریحان بہت خوش خوش واپس آیا تھا۔ اس نے باپ کو بتایا کہ اسے اچھے اسکول میں داخلہ مل گیا تھا اور اسے دو دن میں اسکول لیونگ سرٹیفکیٹ دینا تھا۔ اس کے بعد اس اسکول میں داخلے بند ہو جاتے۔ مگر جب وہ اپنے اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے پاس گیا تو اس نے اسے لیونگ سرٹیفکیٹ دینے سے انکار کر دیا۔

"نہیں برخوردار ہمارے بیچ میں لڑکے پہلے ہی کم ہیں اور ہم نے بڑی مشکل سے بورڈ کی شرط پوری کی ہے اگر ایک لڑکا مزید کم ہوا تو اس سال ہمارا اسکول میٹرک کے لیے نہیں جا پائے گا۔"

ریحان پریشان ہو گیا۔ "سر پلیز' مجھے سرٹیفکیٹ چاہیے۔ میرا ایک اچھے اسکول میں داخلہ ہو گیا ہے۔"

"تمہیں سرٹیفکیٹ نہیں مل سکتا ہے۔" اچھے اسکول کا سن کر ہیڈ ماسٹر ناراض ہو گئے۔ "اور تم جس اسکول میں اب تک پڑھتے رہے ہو، تمہارے خیال میں یہ اچھا نہیں ہے؟"

وہ گڑبڑا گیا۔ "اچھا تو ہے سر لیکن یہاں میٹرک سائنس کے پریکٹیکل کے لیے کچھ نہیں ہے۔"

"وہ بھی ہو جائے گا۔ ایک بار بورڈ کی منظوری تو آنے دو یہاں بھی سب آ جائے گا۔"

یہ سن کر ظفر بھی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ ریحان کو یہاں سے اٹھانے کا مطلب تھا کہ اس کا یہ سال ضائع ہو جاتا اور کہیں اور داخلہ ملنے کا مکان بھی باقی نہیں رہتا۔ ہیڈ ماسٹر ٹھیک کہہ رہے تھے کہ اسکول لیونگ سرٹیفکیٹ کے بغیر اسے کوئی داخلہ نہیں دے گا۔ یوں ریحان کے ہاتھ سے اچھی تعلیم کی طرف جانے کا یہ آخری موقع بھی نکل گیا تھا۔

اسے رو پیٹ کر اسی اسکول میں پڑھنا پڑا۔ میٹرک میں ریحان کا مشکل سے سی گریڈ بنا تھا اور اس گریڈ پر کسی اچھے کالج میں داخلہ محال تھا۔ اسے ایک عام سے کالج میں داخلہ ملا جس کی حالت اس کے اسکول سے بس اتنی مختلف تھی کہ اس کی عمارت بڑی اور زیادہ خستہ حال تھی۔ ماحول اسکول کی نسبت کہیں خراب تھا اور طلبہ تنظیموں نے کالج کو بدمعاشی کا اڈا بنا رکھا تھا۔ وہاں تعلیم کا ماحول ہی نہیں تھا۔

ریحان نے کامرس لی تھی کیونکہ اسے سائنس میں داخلہ نہیں ملا تھا۔ اس نے باپ سے کہا۔ "ابو کالج کا ماحول صحیح نہیں ہے اس سے اچھا ہے کہ میں گھر میں پڑھوں اور کسی کوچنگ سینٹر میں داخلہ لے لوں۔"

ظفر کو اس کی بات پر غصہ آ گیا۔ اس نے سخت لہجے میں کہا۔ "برخوردار تمہیں کالج میں داخلہ اس لیے نہیں دلایا کہ تم گھر بیٹھ کر پڑھو۔ تم روز کالج جاؤ گے۔"

اس وقت یہ رواج بھی کم تھا کہ کوئی طالب علم کالج کے بجائے گھر بیٹھ کر پڑھے۔ اب تو یہ عام سی بات ہو گئی۔ اچھے اچھے کالجوں کے طلبا کالج جانے کے بجائے کوچنگ سینٹرز کا رخ کرتے ہیں اور حاضری نہ ہونے کے باوجود سالانہ امتحان میں بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ ظفر نے اسے سختی سے کالج جانے کو کہا۔ مجبوراً وہ روز کالج جانے لگا۔

اس کالج میں آنے کے بعد ریحان کا دل تعلیم سے بالکل ہی اُچاٹ ہو گیا۔ مارے باندھے کالج آ جاتا۔ اب اس کا زیادہ وقت کلاس کے بجائے کینٹین میں گزرتا تھا۔ کچھ عرصے بعد اس کا ایک حلقۂ احباب بن گیا تھا جس میں سب عام سے لڑکے تھے۔ نکمے اور تعلیم سے جی چرانے والے، ان کا واحد مقصد تفریح تھا لیکن ان میں کوئی بھی پیسے والے گھر سے تعلق نہیں رکھتا تھا اس لیے ان کی تفریح بھی سستی ہوتی تھی۔ وہ پان وغیرہ کھاتے تھے اور گھٹیا قسم کی سگریٹ پیتے تھے۔ ریحان پان نہیں کھا سکتا تھا ورنہ گھر میں اس کی پکڑ ہو جاتی۔ البتہ وہ سگریٹ پینے لگا تھا۔ امتحان سے پہلے وہ پڑھنے کی اداکاری کرتا تھا لیکن پرچے وہ نقل کر کے ہی دیتا تھا۔ اگر نقل نہ کرتا تو لازمی فیل ہو جاتا۔ سیکنڈ ائیر میں اس کے نمبر اتنے اچھے آئے تھے کہ ظفر بھی حیران رہ گیا۔

"برخوردار یہ کیا چکر ہے تم اتنے اچھے نمبر لائے ہو' مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔"

"ابو میں نے بہت محنت کی ہے۔" اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"اچھا وہ محنت مجھے تو نظر نہیں آئی۔ سارا سال کالج سے آنے کے بعد تم کرکٹ کھیلتے رہے۔ میں نے تم سے کہا کہ کوئی کام کر لو تو تم اس کے لیے بھی تیار نہیں ہوئے۔"

"ابو کالج میں ہم دوست مل کر تیاری کرتے تھے۔" اس نے ایک جھوٹ اور بولا۔ ظفر کو یقین نہیں آیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کالج میں اور سب ہو سکتا ہے لیکن لڑکے مل کر

اسٹڈی کریں یہ ناممکن تھا۔ بہرحال ریحان اب اس عمر میں نہیں تھا کہ وہ اس پر سختی کرتا۔ البتہ اس نے اتنا کہا۔

''بیٹا زندگی میں کامیابی کے لیے کوئی شارٹ کٹ نہیں ہے۔''

اس نے ریحان سے یہ بات بہت دیر سے کہی تھی کیونکہ اب وہ محنت کا عادی نہیں رہا تھا اور آگے بڑھنے کے لیے اسے کوئی شارٹ کٹ ہی تلاش کرتا تھا۔ ورنہ اس کا سفر یہیں رک جاتا۔ ایک غلط فیصلے نے اس کے اندر وہ تلخی بھر دی تھی کہ اسے اپنی ساری زندگی بے کار نظر آتی تھی۔ وہ مایوسی کے ساتھ جوان ہوا تھا۔

ریحان نے انٹر میں اچھے نمبر حاصل کرنے کے بعد اس کالج کو خیرباد کہہ دیا اور بی کام میں داخلے کے لیے ایک اچھے کالج کا انتخاب کیا۔ جس کا ماحول بہتر تھا اور وہاں سچ مچ تعلیم دی جاتی تھی۔ بی کام کے دو سال اس نے پڑھ کر امتحان دینے کی کوشش کی لیکن آخر میں اسے نقل کا سہارا لینا ہی پڑا۔ کیونکہ اس کی بنیاد کمزور تھی۔ بہرحال جیسے تیسے اس نے بی کام کرلیا تھا۔

ظفر جس محکمے میں ملازمت کرتا تھا۔ وہاں کام سخت تھا اور کھانے پینے کے مواقع نہیں تھے۔ ظفر کا کہنا تھا کہ اسے موقع ملتا بھی تو وہ رشوت نہیں لیتا مگر ریحان کو اس پر یقین نہیں آتا تھا، وہ سوچتا تھا کہ آج کل کسے پیسہ آتا برا لگتا ہے۔ ظفر احمد کی ملازمت کے تیس سال پورے ہونے والے تھے اور اس کے بعد وہ ریٹائر ہوجاتا۔ ایک سال بعد اس کی پینشن شروع ہوجاتی تو گھر چلانا مسئلہ بن جاتا۔ وہ فکر مند تھا۔ اس نے ریحان سے کہا۔

''میں کوشش کر رہا ہوں کہ میری جگہ تمہیں لے لیا جائے۔ لیکن اس کے لیے اچھے تعلیمی گریڈ کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''میں کوشش کروں گا ابو۔'' اس نے کہا۔ پہلے سال میں اس کا اے گریڈ بنا تھا اور اس کی کوشش تھی کہ اس بار بھی اس کے اتنے مارکس آجائیں کہ اس کی فرسٹ ڈویژن برقرار رہے۔ اسے فوراً جاب مل جاتی تو وہ گھر والوں کو سپورٹ کرسکتا تھا۔ ظفر نے ساری عمر محنت کرکے دو پلاٹ لیے تھے اور اس کا ارادہ تھا کہ ایک کو بیچ کر دوسرے پر گھر بنا لے گا تاکہ کرائے کے مکان سے جان چھوٹے۔ اور ریٹائرمنٹ پر جو پیسہ ملتا، وہ اسے بچیوں کی شادی کے لیے رکھ دیتا۔ فرحی اور نعمانہ نے تو خاصا قد کاٹھ نکال لیا تھا۔ مونا بھی ساتویں کلاس میں تھی اور جب تک وہ دو بڑی بیٹیوں کی شادی سے فارغ ہوتے، وہ شادی کی عمر کو پہنچ جاتی۔

ریحان نے بی کام فائنل میں بھی اچھے نمبر لیے تھے۔ دوسری طرف ظفر کی کوششیں بھی کامیاب رہی تھیں اور اس کی ریٹائرمنٹ سے پہلے ریحان کو ملازمت بھی مل گئی تھی۔ ظفر نے ریٹائرمنٹ ہوتے ہی ایک پلاٹ فروخت کیا اور دوسرے پر مکان بنوانا شروع کردیا۔ فنڈ کی رقم اس نے انویسٹ کردی تھی۔ مکان اس رقم میں پوری طرح نہیں بنا تھا اور تین ہی کمرے بنے تھے۔ وہ بھی سادہ سے لیکن ظفر نے اس پر مزید خرچ کرنے سے انکار کردیا تھا۔ اس نے ریحان سے کہا۔

''اب جو کرنا ہے تم کو خود کرنا ہے ہم نے تم کو یہ مکان بنا کردے دیا ہے۔''

ان ہی دنوں فرحی کے لیے ایک اچھا رشتہ آیا۔ لڑکا دبئی میں کام کرتا تھا اور اچھا کما رہا تھا۔ ظفر کے جاننے والے لوگ تھے۔ لڑکا تعلیم یافتہ بھی تھا اور صورت شکل کا اچھا تھا۔ مگر اس کے گھر والے بدلے میں شادی کرنا چاہتے تھے۔ ان کی ایک لڑکی بن بیاہی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ ظفر اس کا رشتہ ریحان کے لیے لے لیں۔ ظفر نے گھر میں بات کی تو شبانہ فوراً راضی ہوگئی۔ ظفر نے دبے لفظوں میں کہا۔

''ریحان سے تو پوچھ لو معاملہ اس کا بھی ہے۔''

''اس سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔'' شبانہ بولی۔ ''اس کی شادی بھی تو ہم نے کرنی ہے تو یہاں کیا برائی ہے؟''

''برائی تو نہیں ہے مگر یہ شرط مجھے کھٹک رہی ہے۔ میں نے شکیلہ کو دیکھا تو ہے مگر شکل ذہن میں نہیں ہے۔''

''نین نقش کی اچھی ہے بس رنگت ذرا دبتی ہے۔''

''تب بھی ریحان سے پوچھ لو اور میں اتنی جلدی اس کی شادی کے حق میں نہیں ہوں۔ ابھی وہ تو ملازمت پر لگا ہے۔''

''ہم اس کی شادی کچھ عرصے بعد بھی کرسکتے ہیں ویسے بھی فرحی ابھی ایک سال کالج میں اور پڑھے گی۔ اس کے بعد ہی شادی طے کرسکتے ہیں۔''

''کچھ بھی ہو تم ریحان سے معلوم کرلو اور اس کی رضامندی لے لو۔''

جب شبانہ نے ریحان سے بات کی تو اس نے صاف انکار کردیا۔ ''میں ابھی شادی نہیں کرسکتا۔ اگر وہ لوگ مان رہے ہیں تو آپ فرحی کی کردیں۔ ورنہ اس کے لیے کوئی اور رشتہ دیکھیں۔''

''ارے واہ...... ایسے ہی انکار کردیں اتنا اچھا لڑکا ہے۔ دبئی میں کام کرتا ہے۔ نصیبوں سے ایسا رشتہ آتا ہے۔''

''اگر فرحی کے نصیب میں ہوگا تو یہاں ہوجائے گا۔''

''ریحان تجھے بہن کا خیال نہیں ہے۔'' شبانہ غصے سے بولی۔ ''معلوم ہے آج کل رشتے کتنی مشکل سے ملتے ہیں۔''

ریحان اپنے انکار پر قائم رہا۔ ''امی مجھے بھی فرحی کا خیال ہے لیکن ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ اس کے لیے رشتہ آجائے گا۔''

''رشتے تو آجائیں گے لیکن ایسا رشتہ مشکل سے آئے گا۔ ان کی لڑکی بھی اچھی ہے۔''

''امی بات اچھے بُرے کی نہیں ہے۔ بدلے کے رشتے میں گڑبڑ ہوتی ہے۔ پڑھے لکھے لوگ اسے پسند نہیں کرتے ہیں۔''

''ریحان تمہاری کہیں نہ کہیں شادی تو کرنی ہے پھر یہاں کیوں نہیں؟'' شبانہ نے پوچھا۔ ''اگر تم کوئی معقول وجہ بتاؤ تو میں انکار کرسکتی ہوں۔''

ریحان پھنس گیا تھا۔ اصل میں ملازمت کے دوران اس کی دوستی ایک لڑکے اسد سے ہوگئی تھی۔ دونوں میں لنچ کے وقفے میں سلام دعا ہوئی تھی، وہ ایک ہی ہوٹل میں کھانے کے لیے آتے تھے۔ پھر وہ ریحان کو اپنے گھر بھی لے جانے لگا تھا۔ وہیں ریحان کی ملاقات اس کی بہن سے ہوئی تھی۔ عالیہ یونیورسٹی میں پڑھ رہی تھی۔ وہ خاصی بولڈ لڑکی تھی۔ ان کے گھر کا ماحول بھی ذرا ہٹ کر تھا۔ ریحان، عالیہ سے اکیلے میں بات کرتا تھا تو کوئی اس کا بُرا نہیں مناتا تھا۔ عالیہ کا باپ کسٹم میں کام کرتا تھا۔ وہ افسر تو بڑا نہیں تھا لیکن اس نے گلشن اقبال میں اپنے گھر کے اوپر ہٰذا من فضلِ ربّی ضرور لکھا ہوا تھا۔ اسد ایک فارورڈنگ اینڈ کلیئرنگ ایجنسی میں کام کرتا تھا۔ اس کا دفتر آئی آئی چندریگر روڈ پر تھا اور ریحان کا دفتر بھی وہیں تھا۔

ریحان، عالیہ کو پسند کرتا تھا لیکن اس نے ابھی تک عالیہ پر اپنی پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا تھا اور نہ ہی عالیہ نے اس سے ایسی کوئی بات کی تھی پھر بھی اسے یقین تھا کہ وہ اسے پسند کرتی ہے۔ جب ماں نے اسے یہ بات کہی تو وہ پریشان ہوگیا کیونکہ اس نے تو ابھی عالیہ سے بات نہیں کی تھی۔ اب ضروری ہوگیا تھا کہ وہ عالیہ سے اس کا عندیہ لے لے تاکہ

ماں کو ایک جواب دے سکے۔ شبانہ نے ریحان کے ردِّعمل سے ظفر کو آگاہ کیا۔ اس نے کہا۔

''وہ ٹھیک کہہ رہا ہے، صرف فرحی نہیں ہمیں اس کے رشتے کو بھی اہمیت دینی چاہیے۔''

''لڑکوں کا کیا ہے۔'' شبانہ بے پروائی سے بولی۔

''یہی تو ہماری غلطی ہے۔ لڑکے کی شادی بھی اتنی دیکھ بھال کر کرنی چاہیے جتنی دیکھ بھال کر لڑکی کی شادی کرتے ہیں۔ غلط انتخاب کا خمیازہ صرف لڑکے کو نہیں بلکہ اس کے گھر والوں کو بھی بھگتنا پڑتا ہے۔''

ظفر نے پتے کی بات کی تھی لیکن شبانہ کا ذہن مخصوص زنانہ قسم کا تھا۔ وہ معاملات میں ایک حد سے آگے نہیں سوچ سکتی تھی اور ریحان سے اس کا رویّہ شروع سے کچھ الگ تھا۔ وہ اس کے مقابلے میں بیٹیوں کو ہمیشہ زیادہ اہمیت دیتی تھی۔ ریحان سے بھی محبت کرتی تھی لیکن اس طرح نہیں جس طرح کوئی ماں اپنے اکلوتے بیٹے سے کرتی ہے اور اس کی بات کو اہمیت دیتی ہے۔ ظفر نے اس سے کہا کہ ... جب تک ریحان اس بارے میں کوئی واضح جواب نہ دے، وہ شکیلہ کے گھر والوں سے مزید بات نہ کرے۔

''اگر ریحان نے انکار کیا تو ممکن ہے بدمزگی ہو جائے۔ ان کو حتمی جواب دینے سے پہلے یہ معاملہ سلجھا لو۔''

مگر شبانہ اپنا ذہن بنا چکی تھی اس نے ایک دن اُن لوگوں کو مدعو کرلیا۔ اگرچہ یہ باقاعدہ رشتے والی بات نہیں تھی لیکن زاہد کی ماں اور بہنوں نے فرحی کو دیکھ کر کچھ ایسے والہانہ جذبے کا اظہار کیا کہ شبانہ خوش ہوگئی۔ ہر ماں کی طرح اس کی خواہش بھی تھی کہ اس کی بیٹی کسی اچھے گھر میں جائے جہاں وہ راج کرے۔ اسے زاہد کا رشتہ پہلے سے زیادہ اچھا لگنے لگا تھا۔ ان کے جانے کے بعد اس نے ریحان سے پھر بات کی اور اس نے پھر انکار کیا تھا۔

''امی پلیز میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔''

''مگر کیوں؟''

''امی ابھی مجھے سیٹ ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔ ابھی تو میری نوکری لگی ہے اور آپ دو دو شادیاں کرنا چاہ رہی ہیں۔''

''میرے بچے دو شادیاں آسان ہوتی ہیں بہ نسبت ایک شادی کے، کھانے کا خرچ کم ہوجاتا ہے۔''

''لیکن امی دوسرے لوازمات تو درکار ہوتے ہیں۔ ابھی تو آپ نے فرحی کے لیے بھی تیاری نہیں کی ہے۔''

''فرحی کے لیے تمہارے ابو نے رقم رکھ دی ہے۔''

''اور میری شادی کے لیے رقم کہاں سے آئے گی؟''
''اس کا بندوبست بھی ہوجائے گا تم ہاں تو کرو۔''
ریحان کے لیے ہاں ہی تو مسئلہ تھا۔ وہ کسی صورت ہاں نہیں کرسکتا تھا۔ اسے شکیلہ بالکل اچھی نہیں لگی تھی اور یہ جاننے کے بعد کہ اس کا نصیب اس سے جوڑا جارہا ہے۔ وہ اس سے بالکل ہی تنفر ہوگیا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اگر درمیان میں عالیہ نہ ہوتی تو وہ فرحی کے بہتر مستقبل کا سوچ کر مان جاتا لیکن اب یہ ممکن نہیں تھا۔ کم سے کم اس کے خیال میں ممکن نہیں تھا۔ دوسری طرف شبانہ نے اپنے طور پر ساری بات سوچ لی تھی۔ اس کے خیال میں ریحان صرف مالی مشکل کی وجہ سے نہیں مان رہا تھا۔ وہ زاہد و شکیلہ کے گھر والوں سے بات کرتی کہ اس کے لیے بیک وقت دو دو شادیاں نمٹانا ذرا مشکل ہے کیونکہ فرحی کا تو سب تیار ہے۔ (یہ جھوٹ تھا) لیکن ریحان کی دلہن کے لیے تیاری کرنا تھی اور اس کے لیے مہلت درکار تھی۔ شبانہ کو اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ لوگ بیٹی کی شادی کے لیے بے تاب تھے۔ اگر وہ مان جاتے اور اس سے کہہ دیتے کہ وہ شکیلہ کے لیے کچھ نہ کریں تو وہ لوگ بری بنانے سے بچ جاتے۔ شبانہ نے یہ بات ظفر سے کہی تو اسے غصہ آگیا۔
''تمہارا دماغ درست ہے۔ تم شادی کررہی ہو یا تجارت کررہی ہو۔ اگر ہم ان رشتوں پر راضی ہوگئے تو ریحان کی بھی پوری تیاری ہوگی۔ وہ ہمارا ایک ہی تو بیٹا ہے۔ اس کے دل میں اپنی شادی کے حوالے سے ارمان نہیں ہوں گے۔''
''لیکن ہمارے پاس اتنا ہے ہی کہاں؟'' شبانہ بولی۔
''تو انتظار کرو۔ ابھی ریحان کی نوکری لگی ہے اسے جوڑنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔''
''اور اس وقت تک میں فرحی کو گھر بٹھائے رکھوں؟''
''اس کی کون سے عمر نکلی جارہی ہے؟''
''اتنے اچھے رشتے بار بار نہیں آتے۔'' شبانہ بولی۔ ''اور میں اس رشتے کو کسی صورت ہاتھ سے جانے نہیں دوں گی۔''
ظفر نے اسے افسوس سے دیکھا۔ جس کے نزدیک کسی رشتے کی اچھائی برائی صرف یہ تھی کہ لڑکے والے دولت مند تھے اور لڑکا دبئی میں کام کرتا تھا۔

☆☆☆

ریحان اپنے اندر ہمت پیدا کررہا تھا۔ وہ اور عالیہ اکیلے تھے۔ وہ عالیہ کے گھر آیا تو اسد کہیں گیا ہوا تھا اور عالیہ کی امی کی طبیعت خراب تھی۔ اس کے ابو ابھی دفتر سے نہیں آئے تھے۔ عالیہ اسے ڈرائنگ روم میں لے آئی تھی۔
''کیا پئیں گے چائے یا ٹھنڈا؟''
''کچھ نہیں۔'' ریحان نے اضطراب سے کہا۔ ''مجھے تم سے کچھ کہنا ہے؟''
''کہیے؟'' عالیہ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔
وہ بڑی دیر تک ہمت کرتا رہا اور اس دوران میں عالیہ اسے شرارت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''اب بول بھی دیجیے۔''
ریحان نے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔
''عالیہ شاید تمہیں اندازہ ہے...... کہ میرے دل میں کیا ہے؟''
''کیا ہے؟'' وہ انجان بن کر بولی۔
ریحان جھنجلا گیا۔ ''اب انجان مت بنو۔ تم جانتی ہو۔''
''کیا جانتی ہوں؟'' اس نے اسی انداز میں کہا۔
''ٹھیک ہے جب تم نہیں جانتیں تو تم سے بات کرنا بے کار ہے۔'' وہ بولا تو عالیہ سنجیدہ ہوگئی۔
''اچھا فرض کریں میں جانتی ہوں؟''
ریحان چونکا۔ ''اگر تم جانتی ہو تو تمہیں پتا ہونا چاہیے کہ میں کیا چاہتا ہوں؟''
عالیہ بولی۔ ''آپ کے جو دل میں ہے اس کا تو مجھے اندازہ ہے لیکن آپ کیا چاہتے ہیں، اس کا مجھے نہیں معلوم۔''
''عالیہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے ہمت کرکے کہہ دیا۔
''میں جانتی ہوں لیکن یہ ابھی ممکن نہیں ہے۔'' عالیہ نے شرمائے بغیر کہا وہ اسی فطرت کی لڑکی تھی۔ ریحان کی بات سن کر بھی نارمل رہی تھی۔
''مگر کیوں؟'' ریحان بے تاب ہوگیا۔
''میں ابھی گریجویشن کررہی ہوں اور میرا ارادہ ماسٹر کرنے کا ہے اور اس میں تو وقت لگے گا۔''
ریحان کی خوشی ماند پڑ گئی۔ ''عالیہ پلیز کیا ماسٹر مجھ سے زیادہ اہم ہے؟''
''ریحان ماسٹر کرنا میرا خواب ہے اور میں انکار تو نہیں کررہی ہوں۔ اگر میں آپ کے لیے اہم ہوں تو تین سال کیا آپ ساری عمر میرا انتظار کرسکتے ہیں۔''
ریحان پریشان ہوگیا۔ ''میں تو ساری عمر کرسکتا ہوں

لیکن......''
''لیکن کیا؟''
ریحان نے اسے بتایا کہ اس کی امی کس طرح عجلت میں محض بہن کی خاطر اس کا رشتہ ادلے بدلے میں کرنا چاہ رہی ہیں۔ عالیہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''واٹ نان سنس...... آج کل کے دور میں اس قسم کی جہالت پر کون عمل کرتا ہے۔''
ریحان جھینپ گیا۔ ''وہ امی ذرا پرانی سوچ کی ہیں۔''
''ان کو سمجھاؤ۔''
''وہ نہیں سمجھتی ہیں۔''
''تب میرے معاملے میں وہ کس طرح مانیں گی؟''
''میں ان کو منالوں گا مگر تمہیں کچھ لچک......''
''سوری ریحان، میں ماسٹر کا ارادہ کسی صورت نہیں بدل سکتی اگر تم اتنے دن انتظار کرسکتے ہو تو......''
ریحان ایک دوراہے پر پھنس گیا تھا۔ ایک طرف ماں کا اصرار تھا کہ وہ بہن کی خاطر قربانی دے دے اور دوسری طرف عالیہ اس کی خاطر ماسٹر کی قربانی دینے کو تیار نہیں تھی۔ اگر وہ ماں باپ کو عالیہ کے بارے میں بتا دیتا تب بھی وہ نہیں مانتے۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس کے ذہن میں ایک ہی حل آیا تھا۔ اس نے ماں کو بتانے کا فیصلہ کیا اور موقع پا کر اسے عالیہ کے بارے میں بتا دیا۔ شبانہ کا اولین ردِعمل ہی منفی تھا۔
''یہ کلموہی کون ہے؟''
''امی میرے دوست کی بہن ہے۔ مجھے اچھی لگتی ہے لیکن وہ ابھی پڑھ رہی ہے اور اس کی شادی اس کے گھر والے تین سال سے پہلے نہیں کرسکتے ....'' ریحان نے کسی قدر غلط بیانی کی۔
''ریحان میں تیری شادی وہاں نہیں کرسکتی۔''
وہ تڑپ گیا۔ ''مگر کیوں امی؟''
''کیونکہ میں نے فرحی اور تیری شادی ایک جگہ کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔''
ریحان برہم ہوگیا۔ ''میری مرضی کے بغیر۔''
''ہاں، میں تیری ماں ہوں۔'' شبانہ تیز لہجے میں بولی۔ ''اور جب فرحی سے نہیں پوچھا تو تجھ سے کیوں پوچھوں؟''
ریحان نے بے بسی سے امی دیکھا۔ ''امی خدا کے لیے...... اس کی رضامندی بھی تو لی ہوگی آپ نے تو میری بات کیوں نہیں مان رہی ہیں۔''
شبانہ نے محسوس کیا کہ ریحان شاید اپنی بات پر ڈٹ جائے اور انکار کردے اس لیے اس نے چال چلی۔ اس نے کہا۔ ''میرے بچے مجھے تیری خوشی کا خیال کیوں نہیں آئے گا۔ دیکھ نا...... زاہد دبئی میں ہے اور جب تو اس کا بہنوئی ہوجائے گا تو وہ تجھے بھی باہر بلا سکتا ہے۔''
''امی مجھے کسی سے اس لیے شادی نہیں کرنی ہے کہ اس کا بھائی مجھے باہر بلالے۔''
''لیکن مجھے تو تیری فکر ہے..... تو باہر چلا جائے گا تو تیری دو چھوٹی بہنوں کی شادی بھی آسانی سے ہوجائے گی۔''
''امی شادیاں سب کی ہوجاتی ہیں۔''
''ہاں لیکن میرے بچے دولت کی وجہ سے رشتے اچھے مل جاتے ہیں۔ آج کل تو وقت ہی ایسا ہے خالی جیب ہو تو کوئی ایک پیالی چائے کو نہیں پوچھتا ہے رشتہ تو دور کی بات ہے۔''
ریحان پھر ہچکچاہٹ کا شکار ہوگیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ ماں صرف فرحی نہیں بلکہ باقی دونوں بہنوں کے لیے بھی اسے سیڑھی بنانے کا سوچ چکی تھی اور وہ انکار کرتا تو زیادہ بڑا مجرم بن جاتا۔ دوسری طرف اسے معلوم تھا کہ اس سرکاری ملازمت میں وہ یہ سارے کام رگڑ رگڑ کر کرسکے گا۔ قرض لے گا اور ادھار کرے گا تب کہیں جا کر وہ اس قابل ہوگا کہ بہنوں کی شادیاں کرسکے۔ اس کے لیے اپنی معمولی سی خواہشوں کو مارے گا۔ شادی کے بعد بچے ہوں گے تو ان کی خواہشیں پوری نہیں کرسکے گا۔ زندگی کی گاڑی کھینچنے کے لیے وہ بیل بن جائے گا۔
ظفر کو اس کی سوچ کا اندازہ تھا۔ باپ ہمیشہ اس کی جائز باتوں پر اس کی حمایت کرتا آیا تھا لیکن بیوی کے سامنے اس کی ایک نہیں چلتی تھی۔ ریحان کو باپ سے بات کرتے ہوئے جھجک آتی تھی۔ یہ جھجک شروع سے تھی۔ ماں کو اس کی پروا کم ہی ہوتی تھی لیکن وہ اس سے ہر بات کرلیا کرتا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ نتیجہ اس کی مرضی کے مطابق نہیں نکلتا تھا۔ شبانہ اس بات سے واقف تھی اور وہ اسی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ریحان کو اپنا فیصلہ ماننے پر مجبور کررہی تھی پھر اس نے ایک وار اور کیا۔
''ٹھیک ہے میں زاہد کے گھر والوں سے بات کرنے کو تیار ہوں کہ ہم شکیلہ کا رشتہ نہیں لے سکتے ہیں۔ اگر وہ مان جاتے ہیں تو میں تمہاری شادی فرحی کے ساتھ کرنا چاہوں گی۔''

ریحان خوشی سے اچھل پڑا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ ماں اسے یہ بات کہہ سکتی ہے۔ اس نے شبانہ سے کہا۔

''امی وہ مان جائیں گے۔''

''جب وہ مان جائیں تو مجھے بتا دینا ورنہ میں جو کروں اس پر اعتراض مت کرنا۔''

''مجھے منظور ہے۔'' ریحان نے جوش سے کہا۔

شبانہ نے اس دوران میں عالیہ اور اس کے گھر والوں کے بارے میں جو جانا تھا، اس سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ لوگ اتنی جلدی شادی پر نہیں مانیں گے۔

مگر ریحان ماں کی رضامندی مل جانے کے جوش میں یہ بات بھلا بیٹھا تھا۔ اس نے اگلے دن ہی عالیہ سے بات کی لیکن عالیہ نے اس کی بات سنتے ہی جواب دیا۔ ''ریحان آپ کو کیا ہو گیا ہے میں بتا تو چکی ہوں مجھے ماسٹر کرنا ہے۔''

''کیا تمہارے نزدیک میری کوئی اہمیت نہیں ہے؟'' ریحان نے التجا کی۔

''اہمیت ہے لیکن اس کے لیے میں اپنے خواب تو نہیں چھوڑ سکتی۔''

''یعنی تمہارے لیے اپنے خواب زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔''

''دیکھیے ریحان میں آپ کو پسند کرتی ہوں۔ مگر میری شادی کا فیصلہ میرے ماں باپ کو کرنا ہے۔ اگر وہ آپ کو پسند کریں گے تو ویل اینڈ گڈ اور اگر انہوں نے آپ کے بجائے کسی اور کو پسند کر لیا تو ان کی پسند میری پسند بن جائے گی۔'' عالیہ نے اسے بلا واسطہ جتا دیا کہ اس کے نزدیک ریحان کی کیا اہمیت ہے۔

''لیکن میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔'' اس نے کہا۔

عالیہ مسکرائی۔ ''میں ایک لڑکی ہوں اور شادی کے معاملے میں اپنے ماں باپ کی مرضی کی محتاج ہوں اس لیے میں ایسا کوئی دعویٰ نہیں کر سکتی۔''

ریحان سمجھ گیا تھا، وہ بے نیل و مرام لوٹ آیا۔ جب وہ جھکا سر لے کر شبانہ کے سامنے آیا تو وہ فاتحانہ انداز میں مسکرا دی تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ بیٹا کیا جواب لے کر آیا ہے لیکن اس نے انجان بن کر پوچھا۔

''ریحان کیا جواب دیا انہوں نے؟''

ریحان نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔ ''آپ جانتی تو ہیں پھر بھی پوچھ رہی ہیں۔ آپ اپنی مرضی کرنے کے لیے آزاد ہیں۔''

''میرے بچے لعنت بھیج ان لوگوں پر، تجھے کس کی کمی ہے۔ دیکھنا شکیلہ آ کر تیری زندگی کو کیسے بہاروں سے بھر دے گی۔''

☆☆☆

ریحان کا خیال تھا کہ اس کی زندگی سے متعلق یہ دوسرا غلط فیصلہ تھا جس نے اس کی زندگی کے دھارے کو مزید غلط سمت میں ڈال دیا تھا اور تبھی اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ساری عمر شکیلہ کو وہ محبت نہیں دے گا جس کی وہ حق دار تھی۔ وہ اس کی بیوی تو بن جائے گی لیکن ساری عمر اس کی محبت کو ترستی رہے گی۔ وہ بالکل بھول گیا کہ عالیہ سے محرومی میں شکیلہ کا کوئی قصور نہیں تھا۔

جب اس نے شادی کی رات شکیلہ کا گھونگھٹ اٹھائے بنا اسے یہ بات کہہ بھی دی تو وہ حیران رہ گئی۔ ایک نئی دلہن جس کے کان کسی پیار بھری سرگوشی کے منتظر ہوتے ہیں اسے اس کا دولھا بتائے کہ وہ ساری عمر اس کی محبت سے محروم رہے گی تو اس کے دل پر کیا گزری ہو گی، یہ بات وہ دلہن ہی جان سکتی ہے۔ اس کی شرم نے اسے اجازت نہیں دی تھی کہ وہ ریحان سے پوچھ سکے کہ اس کے کس جرم کی اسے یہ سزا دی جا رہی ہے۔ اس کے بعد ریحان تو کروٹ لے کر سو گیا اور وہ ساری رات روتی رہی۔

شکیلہ کا رنگ سانولا تھا اور ریحان کے مقابلے میں زیادہ سانولا تھا لیکن اس کے نین نقش اچھے تھے۔ پھر دلہن بن کر وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ اس کی سہیلیوں نے کہا تھا۔ ''تیرا دولھا تجھے دیکھ کر پاگل ہو جائے گا۔''

لیکن پاگل ہونا تو درکنار اس نے شکیلہ کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔ صبح ریحان جاگا اور اسے نظر انداز کر کے باتھ روم میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد دوسرے لوگ کمرے میں آ گئے تو شکیلہ کو خود کو سنبھالنا پڑا۔ اپنی سرخ آنکھوں کے لیے اس نے یہ وضاحت پیش کر دی کہ اسے رات سونے کا موقع کم ملا تھا۔ یہ سن کر ریحان کی بہنیں اور کزنز معنی خیز انداز میں ہنسنے لگیں اور وہ کٹ کر رہ گئی۔ یہ لوگ نہ جانے کیا سمجھ رہے تھے۔ جب کہ ریحان نے اسے چھوا بھی نہیں تھا۔

ریحان کا رویہ دوسروں کے سامنے اس سے کسی قدر بہتر ہوتا تھا لیکن تنہائی میں وہ بالکل انجان بن جاتا تھا اور بلا ضرورت اس سے بات بھی نہیں کرتا تھا۔ شکیلہ کے ساتھ اس کے گھر والوں سے بھی ریحان کا رویہ سرد ہی تھا اگرچہ وہ ان سے بہت زیادہ رکھائی سے پیش نہیں آتا تھا۔ شاید اس لیے

کہ اس کی بہن ان کے گھر میں تھی لیکن شروع دن سے اس نے شکیلہ کے گھر والوں سے ایک فاصلہ رکھا تھا۔ شکیلہ کے مقابلے میں فرحی بہت خوش تھی کیونکہ زاہد اس سے پہلے دن سے بے پناہ محبت کرنے لگا تھا اور اس کا ہر ممکن خیال رکھتا تھا۔ سسرال والے بھی بہت اچھے تھے۔

سسرال والے تو شکیلہ کے بھی اچھے تھے۔ شبانہ، ظفر اور نعمانہ و مونا اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اس کے آگے پیچھے گھومتے تھے۔ مگر وہ جس کے نام پر اس گھر میں آئی تھی، وہ اس سے بے گانہ رہتا تھا۔ دوسروں کے سامنے وہ اس سے بات کر لیتا تھا مگر تنہائی میں وہ بھول جاتا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔ شکیلہ برداشت کر رہی تھی اور وہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ ریحان کے اس رویے کی وجہ کیا ہے۔ ایک دن اتفاق سے وہ اور ریحان گھر میں اکیلے تھے کیونکہ شبانہ، نعمانہ اور مونا محلے میں ہونے والی قرآن خوانی میں گئی ہوئی تھیں۔

''ایک بات پوچھوں؟'' شکیلہ نے دھلے ہوئے کپڑے تہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں پوچھو؟''

''کیا آپ کسی کو پسند کرتے تھے اور آپ کی شادی آپ کی مرضی کے خلاف مجھ سے کر دی گئی۔''

ریحان سگریٹ سلگاتے سلگاتے رک گیا۔ ''تم نے یہ اندازہ کیسے لگایا؟''

''اگر یہ بات نہیں ہے تو آپ کے اس رویے کی وجہ؟''

ریحان کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں ایسا ہی سمجھو۔''

''مگر اس میں میرا کیا قصور ہے؟''

''تمہارا کوئی قصور نہیں ہے جیسے میرا کوئی قصور نہیں تھا۔'' ریحان نے سرد لہجے میں کہا۔ ''لیکن مجھے اپنی بہن کی خوشیوں کے لیے قربانی دینا پڑی۔''

''آپ انکار کر سکتے تھے؟''

''فرض کر لو میں انکار کر دیتا تو کیا تمہارے گھر والے فرحی کا رشتہ کر دیتے؟''

شکیلہ ہچکچائی۔ ''نہیں...... کیونکہ امی کی ضد تھی کہ دونوں رشتے ہوں گے ورنہ ایک بھی نہیں ہو گا۔''

''تمہارے گھر والوں اور اس کے بعد میری ماں کی ضد نے مجھے مجبور کر دیا۔''

''میرا قصور؟''

''شکیلہ تمہارا قصور یہ ہے کہ تم ایک ضدی ماں کی بیٹی اور ایک ضدی ساس کی بہو ہو۔'' ریحان نے سگریٹ بجھا دی اور کھڑا ہو گیا۔ ''اگر تم اسی طرح گزارا کر سکتی ہو تو ٹھیک ہے ورنہ میں تم کو مجبور نہیں کر رہا۔''

شکیلہ نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ کو فرحی کا خیال بھی نہیں ہے؟''

ریحان باہر جاتے جاتے رک گیا۔ ''تم مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کر رہی ہو؟''

''نہیں، آپ کو یہ بتا رہی ہوں کہ اگر حالات خراب ہوئے تو اس کی زندگی پر کچھ نہ کچھ اثر پڑے گا۔''

''تم فکر مت کرو۔ یہ تمہاری اور میری ماں کا مسئلہ ہے، وہ اسے خود حل کر لیں گی۔'' ریحان کہتا ہوا باہر چلا گیا۔

شکیلہ سے اس کا رویہ کھنچا ہوا سہی لیکن فطری تقاضوں سے وہ بھی مبرا نہیں تھا اس لیے بادلِ ناخواستہ سہی لیکن شکیلہ کے پاس آ جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شادی کے ساتویں مہینے وہ امید سے ہو گئی۔ گھر والے اس خبر سے خوش ہو گئے تھے۔ اسی طرح شکیلہ کے گھر والوں کو پتا چلا تو وہ بھی خوش ہو گئے۔ کیونکہ فرحی پہلے ہی ماں بننے کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔

سوائے ریحان کے سب ہی خوش تھے۔ حالانکہ شکیلہ کو امید ہو چلی تھی کہ شاید باپ بن کر ریحان کے رویے میں کوئی تبدیلی آ جائے۔

ان ہی دنوں زاہد دبئی سے آیا ہوا تھا۔ اس نے ریحان سے کہا۔ ''یار تم اپنے کاغذات مجھے دے دو، میں کوشش کرتا ہوں کہ تمہارا دبئی کا ویزا لگ جائے۔''

خلیج کی جنگ بند ہوئے کچھ ہی عرصہ گزرا تھا اور مشرق وسطیٰ میں اس کے اثرات باقی تھے اس لیے وہاں ابھی جاب مشکل تھیں۔ زاہد ایک اچھی کمپنی میں مناسب عہدے پر تھا۔ اور وہ فرحی کو بھی لے جا چکا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ریحان یہ بات مان جائے گا لیکن اس نے انکار کر دیا۔

''نہیں زاہد میں یہیں ٹھیک ہوں۔''

''ٹھیک ہو۔'' زاہد نے حیرت سے کہا۔ ''یہاں تمہیں ملتا کیا ہے۔ وہاں تم اس سے دس گنا زیادہ کما سکتے ہو۔''

''میں نے کہہ دیا نا کہ مجھے نہیں جانا۔'' ریحان اس بار کھردرے لہجے میں بولا تو زاہد خاموش ہو گیا لیکن جب ریحان کے گھر میں اس بات کا ذکر ہوا تو شبانہ اور ظفر چونک گئے۔

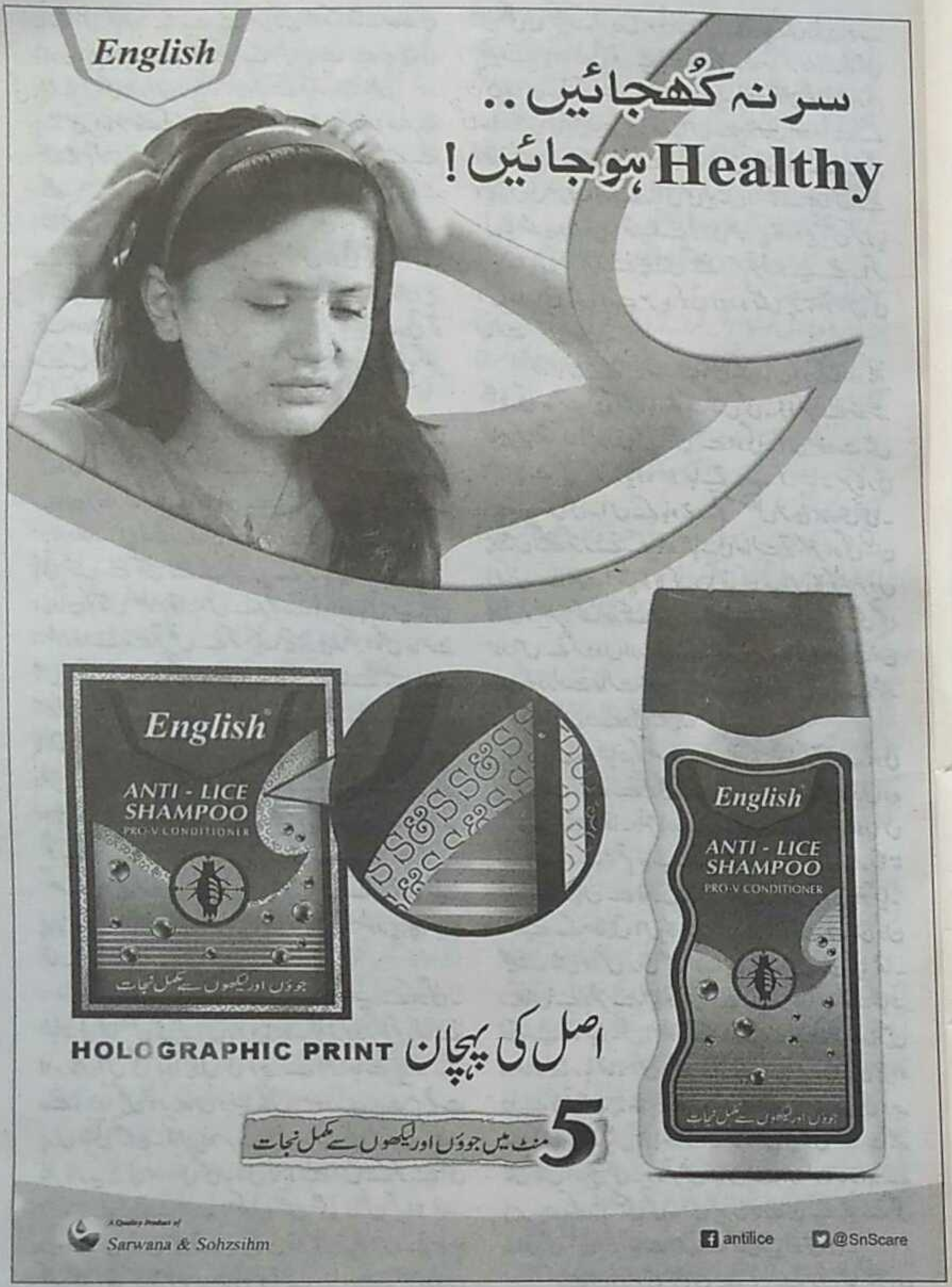

''ریحان تم پاگل ہو جو تم نے انکار کر دیا۔'' شبانہ نے اسے کہا۔ ''تم باہر چلے جاؤ گے تو ہمیں کتنی آسانی ہو جائے گی۔''

''میرا باہر جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' اس نے سرد لہجے میں کہا۔

''مگر کیوں بیٹے؟'' ظفر بولا۔ ''یہ تو چانس ہے جو ہر ایک کو نہیں ملتا۔''

''ابو...... آپ لوگ اگر نعمانہ اور مونا کی شادیوں کے لیے پریشان ہیں تو اس کے لیے میں ہوں۔ یہ میری ذمّے داری ہیں۔ چاہے میں یہاں رہ کر پوری کروں یا باہر جا کر۔''

''لیکن بیٹے باہر جاؤ گے تو تمہاری زندگی بھی بن جائے گی۔'' شبانہ بولی۔

''امی میری جتنی زندگی بن چکی ہے بس وہی کافی ہے۔ مجھے مزید زندگی بنانے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔'' ریحان نے کہا اور وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ شبانہ سنانٹے میں رہ گئی۔ اس نے ظفر کی طرف دیکھا۔

''یہ کیا کہہ گیا ہے؟''

ظفر کسی حد اس کی بات سمجھ گیا تھا۔ ذرا دیر سے سہی لیکن ریحان کے رشتے کے حوالے سے ساری باتیں اس کے علم میں آگئی تھیں۔ اس نے سرد آہ بھری۔ ''شبانہ ہم نے ہمیشہ کی طرح اس کے لیے ٹھیک نہیں کیا ہے' یہ اس کا احتجاج ہے۔''

''یعنی یہ اب بھی اس رشتے سے خوش نہیں ہے۔''

''وہ خوش ہوتا تو تم کو نظر آتا۔'' ظفر کا لہجہ کسی قدر تلخ ہو گیا۔ ''اگر ایسا سلوک تمہارا داماد تمہاری بیٹی کے ساتھ کر رہا ہوتا تو تمہیں بہت پہلے نظر آجاتا لیکن وہ بہو ہے نا۔''

شبانہ مان جانے والی عورتوں میں سے نہیں تھی۔

''ارے کیا بُرا کیا ہے ریحان نے اس کے ساتھ۔''

''وہ اس سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا ہے۔ اس کے ساتھ زبردستی تم نے کی تھی اور وہ اس کا بدلہ اس مجبور لڑکی سے لے رہا ہے۔ اسے یہ خوف بھی نہیں ہے کہ اس کی بہن شکیلہ کے بھائی کی بیوی ہے۔''

بیٹی کی بات آئی تو شبانہ ہڑ بڑا گئی۔ ''میں...... میں اُسے سمجھاؤں گی۔''

ظفر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ سمجھنے والا نہیں ہے۔ بس دعا کرو کہ باپ بن کر اس کے خیالات بدل جائیں۔ ورنہ شکیلہ کے لیے ساری عمر مشکل ہی رہے گی۔''

باپ بن کر بھی ریحان کے رویّے میں شکیلہ کے لیے کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ بیٹی کا وہ پہلے دن سے دیوانہ تھا لیکن بیوی کے لیے اس کے پاس پیار کی ایک نگاہ بھی نہیں تھی۔ اس نے بیٹی کا نام فاریہ رکھا تھا اور جب تک وہ گھر میں ہوتا، فاریہ اس کی گود میں رہتی تھی۔ راتوں کو وہ روتی تو شکیلہ سے پہلے وہ تڑپ کر اٹھ جاتا تھا۔ جب تک فاریہ نہیں سو جاتی تھی، اسے بھی نیند نہیں آتی تھی۔ کبھی کبھی شکیلہ حیران ہوتی تھی کہ بیٹی سے اتنی محبت اور بیوی کی پروا ہی نہیں۔ اس کا خیال غلط نکلا تھا کہ باپ بن کر اس کے رویّے میں شکیلہ کے لیے بہتری آئے گی۔

ان ہی دنوں نعمانہ کا ایک رشتہ آیا تھا۔ لڑکا ایک ریفائنری میں سب انجینئر تھا۔ تنخواہ اچھی تھی گھر بھی اپنا تھا اور لڑکے کے بس ماں باپ ہی تھے۔ ان لوگوں کو رشتہ اچھا لگا تھا اس لیے شبانہ نے ہاں کر دی۔ اب مسئلہ شادی کے اخراجات کا تھا۔ کچھ چیزیں تو اس نے بنالی تھیں لیکن بہت کچھ باقی تھا۔ ظفر نے کچھ رقم اسی مقصد کے لیے کہیں انویسٹ کر رکھی تھی اس نے وہ نکلوا لی۔ اس سے جہیز کی چیزیں خاصی حد تک پوری ہو گئیں۔ اب شادی کے اخراجات تھے۔ ریحان نے اس کے لیے ایک کمیٹی ڈال لی۔ یہ ایک ہزار پر پچیس ہزار کی تھی۔ لیکن پھر بھی کچھ کمی آرہی تھی۔ شکیلہ دیکھ رہی تھی، اس نے ریحان سے کہا۔

''آپ کہیں تو میں زاہد بھائی سے بات کروں۔ آخر وہ بھی نعمانہ کے بہنوئی ہیں۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' ریحان نے رکھائی سے کہا۔ ''مجھے اپنی ذمّے داری پوری کرنی آتی ہے۔''

آج سے کوئی اٹھارہ سال پہلے اتنی مہنگائی نہیں تھی لیکن پھر بھی ساڑھے پانچ ہزار میں ایک پورا گھر چلانا آسان نہیں تھا۔ ظفر کو جو پنشن ملتی تھی، وہ عام طور سے اس کی اور شبانہ کی دواؤں اور چھوٹے موٹے اخراجات میں پوری ہو جاتی تھی۔ گھر کی ساری ذمّے داری ریحان کے شانوں پر تھی۔ شکیلہ یہ بات جانتی تھی۔

''آپ کیسے کریں گے؟''

''کر لوں گا۔'' وہ جھنجلا گیا۔ ''میں کوئی پارٹ ٹائم نوکری کر لوں گا۔''

ریحان عام طور سے شام سات بجے سے پہلے گھر نہیں آتا تھا۔ آنے جانے کا راستہ بھی بہت لمبا تھا۔ اس نے بائیک کا سوچا تھا لیکن اس کے وسائل اتنے نہیں تھے کہ وہ بائیک لے سکتا۔ اگر وہ کوئی پارٹ ٹائم ملازمت کر لیتا تو

رات دس گیارہ بجے سے پہلے گھر نہیں آسکتا تھا۔ نعمانہ کی شادی کے بعد اسے واقعی گھر کے اخراجات سے پریشانی ہونے لگی تھی اور اس نے کوشش کر کے ایک میڈیکل اسٹور پر جز وقتی ملازمت کر لی تھی۔ وہ وہاں سات سے دس بجے تک کام کرتا تھا اور اس کے عوض اسے پندرہ سو روپے ملتے تھے۔ اس طرح کمیٹی کی طرف سے اسے اطمینان ہو گیا تھا۔ اضافی رقم سے اس نے ایک اور کمیٹی ڈال لی تھی تاکہ بائیک لے سکے۔ اب اسے سفر میں بہت مشکل ہوتی تھی۔ آنے جانے میں پورا ایک گھنٹے سے زیادہ وقت لگتا تھا اور پھر دیر تک اسٹاپ پر انتظار بھی کرنا پڑتا تھا۔ اگر بائیک ہوتی تو اسے صبح اتنی جلدی اٹھ کر نہیں جانا پڑتا اور شام کو جلدی گھر آکر کچھ دیر آرام کر کے تازہ دم ہو سکتا تھا۔

نعمانہ کی شادی میں زاہد نے بھی حصہ لیا تھا۔ مگر اس کی دی رقم شکیلہ نے ظفر کو دے دی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں ریحان انکار نہ کر دے۔ ظفر کے پاس اس رقم کا کچھ حصہ موجود تھا۔ اس نے ریحان سے کہا کہ وہ یہ رقم لے لے اور باقی کہیں سے کمیٹی ملنے تک قرض لے کر بائیک خرید لے۔ ریحان کو نہیں معلوم تھا۔ اس نے رقم لے لی اور باقی میڈیکل اسٹور والے سے قرض لے کر ایک سیکنڈ ہینڈ مگر اچھی حالت میں بائیک لے لی تھی۔ یوں اسے آنے جانے میں بہت سہولت ہو گئی تھی۔ اب وہ آرام سے سات بجے اٹھتا تھا اور ناشتا وغیرہ کر کے ساڑھے سات بجے گھر سے نکل جاتا تھا۔ دفتر سے پانچ بجے نکلتا تھا۔ اور ساڑھے پانچ بجے گھر میں ہوتا تھا۔ ورنہ پہلے اسے گھر آنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ فاریہ تو پہلے اس کی صورت دیکھنے کو ترس گئی تھی۔ اب اسے شام کو گھر میں دیکھ کر خوش ہو جاتی تھی پھر وہ اس کے ساتھ بائیک پر باہر کا چکر لگاتی تھی۔ اس کے بعد ریحان اسٹور پر چلا جاتا تھا۔

ابھی فاریہ دو سال کی تھی کہ شکیلہ پھر امید سے ہو گئی۔ شبانہ کی خواہش تھی کہ اس بار بیٹا ہو۔ شکیلہ کو ڈاکٹر کو دکھانے اور پھر اس کی دوائیوں کی وجہ سے اخراجات بڑھ گئے تھے۔ دوائیں تو ریحان کو میڈیکل اسٹور سے بہت کم قیمت پر مل جاتی تھیں۔ لیکن دوسرے اخراجات بھی کم نہیں تھے۔ پھر فاریہ بڑی ہو رہی تھی۔ اسی لحاظ سے اس کے خرچے بھی بڑھ رہے تھے۔ اسے اسکول میں بھی داخل کرانا تھا۔ ریحان ان دنوں کسی قدر پریشان تھا لیکن یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اصل پریشانی تو آنے والی ہے۔ جن دنوں دوسرے بچے کی ڈلیوری قریب تھی۔ ان دنوں شبانہ کے دل میں ہلکی سی تکلیف شروع ہوئی۔ اس نے توجہ نہیں دی۔ جب تکلیف زیادہ ہوئی تو محلے کے ڈاکٹر سے جا کر دوا لے آئی تھی۔ اس نے بھی شبانہ کا صحیح سے چیک اپ نہیں کیا تھا اور وہ اسے گیس کی تکلیف سمجھا تھا۔ اس کے دو دن بعد رات کے وقت شبانہ اچانک ہی بے ہوش ہو گئی اور وہ اسے لے کر اسپتال کی طرف بھاگے۔ آئی سی یو میں انکشاف ہوا کہ اسے دل کا شدید دورہ پڑا تھا۔ اسے فوری طور پر کارڈیو منتقل کر دیا گیا۔ وہاں ڈاکٹرز نے چوبیس گھنٹے اہم قرار دیے تھے۔ اگر اس دوران میں اسے مزید کوئی دورہ نہیں پڑتا تو اس کی حالت سنبھل جاتی۔

ریحان پریشان تھا۔ اسپتال میں ماں کو دیکھتا اور پھر شکیلہ کی حالت بھی اس بار ٹھیک نہیں تھی۔ ڈاکٹر نے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ ڈلیوری آپریشن سے ہو گی۔ اس صورت میں اخراجات کئی گنا زیادہ ہو جاتے جب کہ شبانہ سرکاری اسپتال میں تھی۔ اس کے باوجود رقم مستقل خرچ ہو رہی تھی۔ چوبیس گھنٹے گزرنے کے بعد شبانہ کی حالت تو بہتر ہو گئی لیکن ڈاکٹرز نے بہت احتیاط کا کہہ دیا تھا کیونکہ اس کا کولیسٹرول لیول تو خطرناک حد تک اوپر تھا ہی ساتھ ہی اسے شوگر بھی تھی اور اس نے گردوں اور دل کے افعال پر بُرا اثر ڈالا تھا۔ ان سب کو درست حالت میں رکھنے کے لیے انہوں نے بے شمار مہنگی دوائیں دے دی تھیں۔

ابھی وہ شبانہ کو گھر لائے تھے کہ شکیلہ کو تکلیف ہوئی اور ریحان اسے لے کر کلینک کی طرف بھاگا۔ ان دنوں وہ گھن چکر بنا ہوا تھا۔ دفتر اور وہاں سے اسپتال پھر گھر اور اس کے بعد پارٹ ٹائم جاب۔ اسپتال کا رات کو بھی چکر لگاتا تھا۔ اب وہاں سے فارغ ہوا تو شکیلہ کا مسئلہ شروع ہو گیا۔ اندیشے کے مطابق اس کا آپریشن ہی ہوا تھا۔ وہ تین دن کلینک میں داخل رہی تھی اور اچھا خاصا بل بن گیا تھا۔ ریحان نے دفتر سے ایڈوانس لے کر یہ بل ادا کیا تھا۔ شبانہ کے لیے وہ میڈیکل اسٹور کے مالک سے پہلے ہی دوائیں ادھار لیتا رہا تھا۔ اس ایک ہفتے میں اس پر کوئی بیس ہزار روپے کا قرض چڑھ چکا تھا۔ ابھی تو شبانہ کی بیماری کی وجہ سے اخراجات میں جو اضافہ ہوا تھا، اس کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ وہ قرض کہاں سے ادا کرتا۔ زاہد نے باہر سے کچھ رقم بھیجی تھی۔ اسی طرح ریحان کے چچا نے بھی مدد کی تھی لیکن اخراجات اس سے کہیں زیادہ ہی تھی۔

ریحان دوسری بیٹی کی پیدائش سے خوش تھا لیکن وہ اسے اتنی توجہ نہیں دے سکا جتنی اس نے فاریہ کو دی تھی۔

ماریہ بے چاری زیادہ تر ماں کے پاس رہتی تھی۔ شبانہ کو پوتے کی آرزو تھی لیکن پوتی ہوئی تو اس کا مزاج تلخ ہو گیا۔ پھر بیماری میں آدمی ویسے ہی چڑچڑا ہو جاتا ہے اس لیے اکثر شکیلہ کو جلی کٹی سنا جاتی تھی۔ وہ بے چاری چپ کر جاتی تھی۔ اس کی اپنی طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ پھر بچی کو دیکھنا ہوتا تھا۔ اس وجہ سے گھر کا سارا کام ہی مونا کرتی تھی۔ شبانہ کو اس پر بھی اعتراض ہونے لگا تھا۔

''میری بچی سارا دن لگی رہتی ہے اور بہو بیگم نے بستر سنبھال لیا ہے۔''

مونا ماں کو خاموش کرانے کی کوشش کرتی تھی۔ ''امی بھابی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ورنہ اب تک تو وہی کرتی آئی ہیں۔''

''ہاں ہاں...... پتا ہے طبیعت کا۔'' شبانہ نے بیزاری سے کہا۔ ''یہ سب ڈھکوسلے ہیں، کیا بچے ہم نے پیدا نہیں کیے۔''

''امی پلیز۔'' مونا نے ماں کی بلند آواز پر گھبرا کر کہا۔ ''بھابی سن لیں گی تو کیا سوچیں گی۔''

''کیا سوچے گی...... اس نے دیا ہی کیا ہے دو بیٹیوں کے سوا۔''

''امی وہ تو آپ کی بھی تین ہیں۔'' مونا ذرا منہ پھٹ تھی اس نے کہہ دیا۔ ''ابھی تو بھابی جوان ہیں اللہ نے چاہا تو ان کا بیٹا بھی ہو جائے گا۔''

شبانہ نے اسے گھورا۔ ''تجھے بڑی آگ لگی ہے بھابی کی۔''

مونا نے منہ بنایا۔ ''مجھے کیا...... خراب کریں گھر کا ماحول...... جب بات بھابی کے گھر پہنچے گی تو پھر اس کا خمیازہ فرحی آپی کو بھگتنا پڑے گا۔''

''خدا نہ کرے۔'' شبانہ نے جلدی سے کہا۔ ''اور وہ اس کی طرح بیٹیاں تو نہیں پیدا کیے جا رہی ہے۔ ماشا اللہ ایک بیٹا بھی ہے۔ ایک یہ ہے باپ کے سر ذمے داریاں پیدا کیے جا رہی ہے۔ کون بھرے گا ان کو۔''

شکیلہ سب سن رہی تھی اور جب شبانہ نے اس کی بیٹیوں پر بات کی تو اس سے برداشت نہیں ہو سکا۔ وہ باہر نکل آئی تھی۔ ''امی جس طرح ابو نے اپنی بیٹیوں کا کیا ہے اسی طرح ریحان بھی اپنی بیٹیوں کا کر لیں گے۔''

''اب تم مجھ سے زبان چلاؤ گی۔'' شبانہ چلا کر بولی۔

''میں زبان نہیں چلا رہی ہوں صرف آپ کو بتا رہی ہوں جس طرح آپ کی بیٹیوں کا ہو گیا اسی طرح میری بیٹیوں کا بھی ہو جائے گا اور جس طرح آپ کو اپنی بیٹیاں عزیز ہیں اسی طرح مجھے بھی اپنی بیٹیاں پیاری ہیں۔'' یہ کہہ کر شکیلہ اندر چلی گئی مگر شبانہ نے چیخنا چلّانا شروع کر دیا اور رونے پیٹنے لگی۔ اسی دوران میں اس کی طبیعت خراب ہو گئی اور وہ بے ہوش ہو گئی۔ ظفر گھر پر تھا اس نے شبانہ کو دیکھا اور اسے لے کر اسپتال روانہ ہو گیا۔ علامات واضح طور پر دل کے دورے کی تھیں۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ ایمبولینس کو کال کر کے اس کا انتظار کرتا۔ شبانہ کو ٹیکسی میں لے گیا۔ جاتے ہوئے اس نے مونا سے کہا کہ ریحان کو اطلاع کر دے۔ وہ فون پر ریحان کے دفتر کا نمبر ملانے لگی مگر وہ انگیج جا رہا تھا۔ بڑی مشکل سے نمبر ملا تو اس نے ریحان کو بتایا اور وہ اسپتال کی طرف بھاگا۔

جب ریحان اسپتال پہنچا تو اسے ظفر راہداری میں روتا نظر آ گیا تھا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ باپ کی طرف لپکا۔ ''ابو کیا ہوا، امی کیسی ہیں؟''

''وہ...... چلی گئی...... چھوڑ گئی ہمیں۔'' ظفر نے کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔ ریحان خود پر قابو پاتا اندر آیا جہاں ایک نرس شبانہ کو سفید چادر اوڑھا رہی تھی۔ ریحان نے ماں کا چہرہ دیکھا اور بے ساختہ رو دیا۔ وہ ماں سے بے تکلف رہا تھا لیکن کبھی اس کے قریب نہیں رہا تھا۔ اس کے باوجود اس کا دل صدمے سے چور ہو رہا تھا۔ وہ ماں کی لاش اور...... باپ کو گھر لے کر آیا تو وہاں بھی رونا پیٹنا مچ گیا تھا۔ خاص طور سے شکیلہ کی حالت بُری ہو گئی تھی۔ اسے رہ رہ کر خیال آرہا تھا کہ اگر وہ نہ بولتی تو شاید یہ حادثہ نہ ہوتا۔ نعمانہ فوراً آ گئی تھی لیکن فرحی کو آنے میں چوبیس گھنٹے لگے تھے اور اس وقت تک شبانہ کو دفنا دیا گیا تھا۔ سوم والے دن جب دوسرے رشتے دار چلے گئے تھے اور ساری بہنیں ایک جگہ تھیں تو مونا نے ماں کے آخری لمحات کا ذکر کرتے ہوئے بتا دیا کہ شبانہ اور شکیلہ کی آپس میں لڑائی ہوئی تھی۔ ریحان نے بھی سن لیا تھا۔ وہ غصے سے کمرے میں آیا۔ شکیلہ بچی کو فیڈ کرا رہی تھی۔

''تم نے امی سے زبان درازی کی تھی؟'' ریحان نے بنا تمہید کے پوچھا۔ ''جب ان کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔''

شکیلہ حیران ہوئی۔ ''آپ سے کس نے کہا؟''

''مجھ سے کسی نے بھی کہا ہو کیا یہ سچ نہیں ہے؟''

''نہیں بات صرف اتنی تھی کہ امی بیٹیوں کے حوالے سے مجھے سنا رہی تھیں تو میں نے ان سے کہا تھا کہ بیٹیاں تو سب کو پیاری ہوتی ہیں اور باپ خوشی سے ان کا بوجھ

اٹھاتے ہیں جس طرح ان کی بیٹیوں کو کسی نے بوجھ نہیں سمجھا اسی طرح میری بیٹیاں بھی کسی پر بوجھ نہیں ہیں۔''

شکیلہ نے صاف گوئی سے اسے سب بتادیا تھا اور یہ بھی کہہ دیا کہ اسے ابھی تک افسوس ہے اگر وہ ضبط کرتی تو شاید بات اس حد تک نہیں جاتی۔ مگر ریحان مطمئن نہیں تھا۔ اس نے شکیلہ سے کہا۔ ''میں اس بات کو بھولوں گا نہیں کہ امی کی طبیعت تمہاری زبان درازی کے بعد خراب ہوئی تھی۔''

شکیلہ کو بھی غصہ آگیا۔ ''اگر آپ میرے ساتھ مزید کوئی بُرا سلوک کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو اس بہانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

ریحان اسے گھورتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس نے بعد میں مونا سے اکیلے میں پوچھا تو اس نے شکیلہ کی سائڈ لی تھی۔ ''بھائی ان کا اتنا قصور نہیں ہے امی مستقل ان کو اور بچیوں کو غلط سنا رہی تھیں۔ آپ خود سوچیں اگر ہم بہنوں کو کوئی بُرا کہتا تو کیا امی سے برداشت ہوتا؟''

ریحان جانتا تھا کہ اس کی ماں بیٹیوں کے معاملے میں کتنی حساس تھی مگر شکیلہ کے لیے اس کے دل میں پہلے ہی بدگمانی تھی۔ اس لیے اب اس کا رویّہ شکیلہ سے مزید خراب ہوگیا۔ پھر قرض کی وجہ سے اسے پہلے سے زیادہ محنت کرنا پڑ رہی تھی۔ وہ اب چھ بجے دکان پر جاتا اور وہاں سے رات گیارہ بجے واپسی ہوتی تھی۔ وہ اتنا تھکا ہوا ہوتا تھا کہ بس کھانا کھاتا اور بستر پر لیٹ جاتا تھا۔ بچیاں اس سے بات کرنے کو ترس جاتی تھیں۔ بس چھٹی کا دن اس کا اپنا ہوتا تھا۔ اتنی محنت کے بعد بھی قرض اترنے کی رفتار بہت سست تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اسے ابھی کئی سال لگ سکتے ہیں تب کہیں جا کر اسے اس قرض سے نجات ملے گی مگر ابھی کئی امتحان باقی تھے۔

مونا گریجویشن کے آخری سال میں تھی اور ظفر اس کے لیے فکر مند تھا کہ اس کا کوئی مناسب رشتہ آجائے تو وہ اس کے فرض سے بھی سبک دوش ہوجائے۔ شبانہ کے مرنے کے بعد وہ خاموش رہنے لگا تھا اور اس کی صحت بھی گرتی جا رہی تھی۔ بچے اس کا خیال رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے لیکن اس کے اندر جینے کی امنگ ختم ہوگئی تھی۔ فرحی اور نعمانہ مونا کے رشتے کے لیے کوشش کر رہی تھیں اور پھر فرحی کے توسط سے ایک رشتہ آیا تھا۔ لڑکا انٹر پاس تھا اور اس نے الیکٹرونک کا کورس کر رکھا تھا۔ شارجہ میں ملازمت کرتا تھا اور تنخواہ اچھی تھی۔ ظفر نے جلدی میں ہاں کر دی۔ ریحان نے اسے منع بھی کیا تھا کہ اتنی جلدی نہ کرے کیونکہ ابھی اس پر پچھلا قرض بھی نہیں اترا تھا۔ مگر ظفر اس رشتے کو انکار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے ریحان سے کہا۔

''بیٹے مجھے اب اپنی زندگی کا بھروسا نہیں ہے اور میں اپنی آنکھوں کے سامنے مونا کو اس کے گھر کا دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''ابو آپ جانتے ہیں کہ مجھ پر جو پچھلا قرض تھا، وہ بھی نہیں اترا ہے۔ میں مزید... قرض نہیں لے سکتا۔'' وہ بے بسی سے بولا

''تب میں یہ مکان بیچ دیتا ہوں۔'' ظفر نے کہا۔

''کیا آپ یہ مکان بیچ دیں گے؟'' اس نے بے یقینی سے کہا۔ ''پھر ہم کہاں رہیں گے؟''

''کرائے کے مکان میں۔''

''ابو میں کرایہ کیسے دوں گا؟'' اس نے احتجاج کیا۔

''یہ میں نہیں جانتا...... میرے پاس بس ایک یہی چیز ہے اور میں اسے بیچ کر اپنی بیٹی کی شادی ضرور کروں گا۔''

ریحان باپ کے اس انداز پر حیران رہ گیا۔ پہلے ماں بیٹیوں کی خاطر اسے نظر انداز کرتی تھی اور اب یہی کام باپ کر رہا تھا۔ ظفر نے اس کے سر پر ایک تلوار لٹکا دی تھی۔ اگر وہ مونا کی شادی کے لیے کچھ نہیں کرے گا تو اس مکان سے جائے گا اور پھر اسے کرائے کا مکان لینا پڑے گا۔ اس نے باپ سے التجا کی۔ ''ابو مونا کی کون سی عمر نکلی جا رہی ہے۔ وہ ابھی بیس سال کی بھی نہیں ہوئی ہے۔''

''ہاں لیکن اتنا اچھا رشتہ بار بار نہیں آتا اور میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ میں اپنی نظر کے سامنے مونا کو اس کے گھر کا کر دینا چاہتا ہوں۔''

ریحان کے اندر موجود تلخی ابھرنے لگی تھی۔ اس کے ماں باپ کو صرف بیٹیوں کی پروا تھی اور انہوں نے ان کی خاطر ہمیشہ اسے نظر انداز کیا تھا۔ پہلے ماں نے اسے شادی پر مجبور کیا اور اب باپ اسے قرض لینے پر مجبور کر رہا تھا۔ بے گھر کرنے کی دھمکی دے کر۔ فی الحال کہیں سے قرض نہیں مل سکتا تھا اور نہ ہی وہ کمیٹی ڈال سکتا تھا کیونکہ اس کی اتنی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے ظفر سے کہا۔ ''ٹھیک ہے ابو آپ کی مرضی ...... میں کل سے کوئی کرائے کا مکان دیکھنا شروع کرتا ہوں۔''

''اس کا کرایہ کہاں سے دوگے؟'' ظفر کسی قدر فکر مند ہوگیا۔

''یہ میرا مسئلہ ہے، آپ کا نہیں۔'' ریحان کہہ کر باپ کے پاس سے اٹھ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی بات

سن کر شاید اس کا باپ پسیج جائے مگر دو دن بعد وہ سن کر حیران رہ گیا تھا کہ ظفر نے مکان کے لیے گاہک تلاش کرلیا تھا۔ پھر وہ قیمت سن کر حیران ہوا تھا۔ گاہک مکان کے صرف پانچ لاکھ دے رہا تھا جب کہ اس کی مالیت کسی طرح سات لاکھ سے کم نہیں تھی۔ اس نے ظفر سے کہا۔ ''ابو یہ قیمت بہت کم دے رہا ہے۔''

ظفر کا جواب بھی اس کے لیے غیر متوقع تھا۔ ''تم چاہتے ہو کہ میں مکان ہی نہ بیچوں۔ اس کے اس سے زیادہ نہیں ملیں گے۔''

''ابو بے شک آپ پراپرٹی والوں سے بات کریں۔'' ریحان ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھ پر اتنا بڑا الزام تو نہ لگائیں۔''

''میں نے معلوم کیا ہے۔ اس علاقے میں مکان کی مالیت اتنی ہی بنتی ہے۔'' ظفر نے جواب دیا۔

''تو کیا آپ دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں؟''

''میں بیعانہ بھی لے چکا ہوں۔'' ظفر نے انکشاف کیا۔

ریحان دکھی ہوگیا۔ اس کا باپ اسے اتنا نظر انداز کرے گا اور ایک بے بنیاد بات پر اسے الزام بھی دے گا۔ ''جیسے آپ کی مرضی۔'' اس نے کہا۔ اسی دن اس نے ایک دوست سے بات کی جو یونیورسٹی روڈ پر کسی نئے آباد ہونے والے فلیٹ میں رہ رہا تھا۔ تین کمروں کا فلیٹ اسے مناسب کرائے پر مل گیا تھا۔ یہ کسی مکان کے مقابلے میں نصف تھا۔ اتفاق سے ایک فلیٹ دوسرے فلور پر اتنے ہی کرائے میں مل گیا تھا۔ ریحان نے فوراً بات کرلی اور اسے تین مہینے کا کرایہ ایڈوانس میں دے دیا۔ جب اس نے گھر میں بتایا تو سب ہی حیران ہوئے تھے۔ ظفر نے کہا۔ ''اتنی جلدی کیوں کی ابھی تو مجھے پوری رقم بھی نہیں ملی ہے۔''

''جانا تو ہے اب جلدی یا دیر کیا اور فلیٹ بھی ہاتھ سے نکل جاتا۔'' اس نے کہا۔ ''اگلی پہلی کو شفٹ ہونا ہے۔''

شکیلہ اور مونا کو اس بات کا پتا نہیں تھا۔ انہوں نے ریحان سے پوچھا کہ مکان کیوں چھوڑ رہے ہیں۔ اس نے کہا۔ ''ابو سے پوچھو، یہ ان کا فیصلہ ہے۔''

مونا نے ظفر سے پوچھا تو اس نے کہا۔ ''بیٹے تمہاری شادی کے لیے میں نے یہ مکان بیچ دیا ہے۔''

شکیلہ اور مونا پریشان ہوگئیں۔ مونا نے کہا۔ ''کیوں ابو .... میری شادی ایسا کون سا مسئلہ ہے جس کی خاطر آپ نے اتنا بڑا قدم اٹھالیا۔''

''یہ میں بہتر سمجھتا ہوں۔'' ظفر نے رکھائی سے کہا۔ ''میں اپنی نظروں کے سامنے تمہاری شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''ابو تو اب بھائی اور آپ سب کرائے کے مکان میں رہیں گے۔''

''مونا تم بے کار کی بحث کر رہی ہو ابو فیصلہ کر چکے ہیں۔'' ریحان نے کہا۔ ''بلکہ اس مکان کا بیعانہ بھی لے چکے ہیں۔ ہمیں یہاں سے جانا ہی ہے۔''

ریحان کے خیال میں اس مکان سے نکل کر کرائے کے گھر میں اس کی زندگی کا تیسرا غلط موڑ تھا۔ اس کی زندگی میں کوئی آسانی آنے کا امکان تھا تو وہ بھی اب باقی نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

ریحان بہ مشکل بس سے اترا تھا۔ رش اتنا زیادہ تھا کہ جتنا بس میں چڑھنا دشوار تھا، اس سے کہیں زیادہ دشوار اس سے اترنا تھا۔ اس کی ایک آستین بٹن ٹوٹ جانے سے کھل گئی تھی اور جسم پسینے میں شرابور تھا۔ کچھ دیر تو وہ بس اسٹاپ پر کھڑا اپنا سانس بحال کرتا رہا۔ وہ پورے ڈیڑھ گھنٹے پہلے دفتر سے نکلا تھا اور گھر تک آتے آتے یہ وقت ہو گیا تھا۔ بائیک تین سال پہلے تیسری بیٹی کی پیدائش پر بک گئی تھی۔ بچی کو پیدائشی دل کی تکلیف تھی اور اس کے ابتدائی ٹیسٹوں میں ہی ہزاروں خرچ ہو گئے تھے۔ دفتر سے جو رقم لی، وہ خرچ ہو چکی تھی اور اب اس کے پاس دو ہی راستے تھے یا تو بائیک بیچ دیتا یا وہ پلاٹ جو یونیورسٹی کے پیچھے ایک بیابان سوسائٹی میں تھا۔ کیونکہ پلاٹ قیمتی چیز تھی، اسے امید تھی کہ کبھی یہ سوسائٹی آباد ہوگئی تو اسے یہاں گھر بنا کر رہنے کا موقع مل جائے گا اس لیے اس نے بائیک بیچ دی۔

اخراجات پھر بھی قابو میں نہیں آرہے تھے۔ بچی کے لیے ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ دس سال کی عمر میں اس کے دل کے خراب وال کا آپریشن ہوگا اور اس وقت تک اسے بہت احتیاط کرنا ہوگی۔

کیونکہ وہ یونیورسٹی کے پاس آگیا تھا اس لیے اس نے ایک اور میڈیکل اسٹور پر ملازمت کرلی جو قریب ہی تھا۔ یہاں چار گھنٹے کام کر کے اسے معقول رقم مل جاتی تھی۔ یہ بڑا میڈیکل اسٹور تھا اور ان اوقات میں رش بھی بہت رہتا تھا۔ دفتر سے گھر آنے کے بعد اسے بس اتنی مہلت ملتی تھی کہ منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلنے کے دوران میں ہی ایک

کپ چائے پی لے۔ سات بجے وہ میڈیکل اسٹور پہنچتا اور وہاں سے گیارہ بجے چھٹی ہوتی تھی۔ پھر گھر آتا اور الٹا سیدھا کھانا کھا کر بستر پر جو لیٹتا تھا تو صبح سے پہلے اس کی آنکھ نہیں کھلتی تھی۔

ظفر واقعی مونا کی شادی کے لیے جی رہا تھا۔ اس کی شادی کے چھ مہینے بعد ایک رات وہ سویا تو صبح اٹھا ہی نہیں۔ رات کسی وقت اس کا دل بہت خاموشی سے بند ہوگیا تھا۔ اسے احساس تھا کہ اس نے بیٹے کے ساتھ زیادتی کر دی ہے۔ اسی وجہ سے اس نے مکان کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم سے بچ جانے والی نوے ہزار کی رقم سے ایک دو سو گز کا پلاٹ خرید کر اسے ریحان کے نام کر دیا تھا۔

مونا کی رخصتی اور ظفر کی وفات کے بعد ریحان نے تین کمروں کا یہ فلیٹ چھوڑ کر ایک چھوٹا دو کمروں کا فلیٹ لے لیا کہ اس کا کرایہ کم تھا۔ ظفر نے اس کا قرض بھی اتار دیا تھا۔ اخراجات میں اب بھی کمی نہیں ہوئی تھی بلکہ اضافہ ہی ہوا تھا کیونکہ فاریہ اور ماریہ اسکول جانے لگی تھیں۔ ان کی فیسیں اور دوسرے اخراجات ہی کم نہیں تھے۔ اس کے باوجود ریحان کچھ عرصے والی اعصابی کشیدگی سے نکل آیا تھا۔ اس زندگی میں تھکن تو تھی لیکن پریشانی نہیں۔ وہ نا آسودہ تھا لیکن ناخوش نہیں تھا۔

شکیلہ سے اس کے تعلقات ویسے ہی تھے بلکہ ان میں مزید سرد مہری آگئی تھی۔ پہلے شکیلہ اس سے بات کرنے کی اپنی سی کوشش کرتی رہتی تھی لیکن اب اس نے بھی خود کو پیچھے ہٹا لیا تھا اور بس ایک مشینی سے انداز میں گھر اور بچیوں کو دیکھتی تھی۔ اس کے پیچھے ہٹنے میں ایک واقعے کا دخل بھی رہا تھا۔ فرحی کا شوہر زاہد ایک بار دبئی سے آیا تو بہن سے ملنے بھی آیا تھا اور اس نے محسوس کیا کہ اس کی بہن تنگی میں رہ رہی ہے۔ کرائے کا یہ فلیٹ چھوٹا بھی تھا اور گھٹا ہوا بھی تھا۔ اس نے شکیلہ سے کہا۔

''تم لوگ کسی جگہ اپنا فلیٹ کیوں نہیں لے لیتے ہو؟''

''زاہد بھائی اگر ہمارے اتنے وسائل ہوتے تو کیا ہم اس جگہ پڑے ہوتے۔'' شکیلہ نے افسردگی سے کہا۔

زاہد سوچ میں پڑ گیا۔ وہ دبئی میں ایک عام سی نوکری کرتا تھا اور اس کی تنخواہ بھی اب بہت زیادہ نہیں تھی۔ خلیج کی جنگ کے بعد سے مشرق وسطیٰ میں تنخواہیں پہلے جیسی نہیں رہی تھیں۔ پھر بھی اس نے خاصا کچھ بچا رکھا تھا، زاہد نے جھجک کر کہا۔ ''شکیلہ اگر ریحان برا نہ مانے تو وہ مجھ سے رقم لے کر فلیٹ لے لے۔''

''نہیں بھائی وہ نہیں مانیں گے۔'' شکیلہ سہم گئی۔

ریحان، شکیلہ کے گھر والوں سے بہت روکھے انداز میں پیش آتا تھا اور وہ سسرال بھی بہت کم جاتا تھا۔ مارے باندھے جانا ہی پڑ جاتا تھا تو اس کی کوشش ہوتی تھی وہاں کم سے کم رہے۔ اس وجہ سے شکیلہ کے گھر والے بھی اس کی فطرت سمجھ گئے تھے۔ وہ بھی ریحان سے ایک حد میں رہ کر ملتے تھے۔

''پھر بھی تم اس سے بات کر کے دیکھو۔ میں نے معلوم کیا ہے یہاں تین کمروں کا اچھا فلیٹ پانچ لاکھ تک میں مل سکتا ہے۔ تم دو کمروں کا کرایہ دو ہزار دے رہے ہو۔ یہ میرے اکاؤنٹ میں جمع کراتے رہنا اور جیسے جیسے ریحان کی تنخواہ بڑھے اسی لحاظ سے وہ زیادہ رقم مجھے دیتا رہے۔ مجھے امید ہے چھ سات سال میں قرض اتر جائے گا۔''

شکیلہ یہ سن کر خوش ہوگئی تھی لیکن ساتھ ہی اسے خدشہ تھا کہ ریحان نہیں مانے گا لیکن ریحان کا ردعمل اتنا شدید ہوگا یہ اس نے سوچا نہیں تھا۔ وہ شکیلہ کی بات سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گیا۔ ''تمہارے بھائی کے پاس چار پیسے ہیں تو وہ خود کو کیا سمجھتا ہے۔ کیا وہ مجھے خریدنا چاہتا ہے۔ اپنے سامنے جھکانا چاہتا ہے۔''

شکیلہ نے سہم کر کہا۔ ''بھائی نے ایسا تو کبھی نہیں سوچا۔ آپ کا ان سے دوہرا رشتہ بنتا ہے وہ آپ کے ساتھ ایسا کیوں کرنا چاہیں گے۔''

''میں اس کو منہ نہیں لگاتا نا۔'' ریحان کے لہجے میں حقارت آگئی۔ ''اس نے سوچا اس بہانے سے مجھے جھکا لے لیکن اس کا یہ خواب کبھی پورا نہیں ہوگا۔''

''میرے خدا...... آپ کیا سمجھ رہے ہیں؟'' شکیلہ پریشان ہوگئی۔ ''مجھ سے غلطی ہوئی جو میں نے آپ سے ذکر کر دیا۔''

''اپنے بھائی کو سمجھا دینا اگر اس نے آئندہ مجھے اس قسم کی کوئی پیش کش کی تو اچھا نہیں ہوگا۔''

شکیلہ نے کہنا چاہا کہ زاہد بھائی نے تو ان کے خیال سے پیش کش کی تھی لیکن ریحان کے تیور دیکھ کر وہ چپ رہی۔ ریحان نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اس نے اگلے دن دفتر سے فون کر کے زاہد کو بھی باتیں سنا ڈالیں۔ جب زاہد نے شکیلہ کے میکے آنے پر اسے بتایا کہ ریحان نے اسے کیا کہا ہے تو وہ حیران رہ گئی تھی۔ زاہد نے بدمزگی سے کہا۔

''تمہارے شوہر کو کسی قسم کی تمیز نہیں ہے۔ کیا میں نے اس کے ساتھ کوئی برائی کی تھی جو اس نے مجھے یہ سب

کہا۔''

''بھائی آپ جانتے ہیں نا۔ وہ شروع سے اس فطرت کے ہیں۔''

''اس فطرت کا نہیں ہے کیونکہ نعمانہ اور مونا کے شوہر سے صحیح سے ملتا ہے بس میں نے ہی اس کے ساتھ کچھ برا کیا ہے۔ شاید اس کی بہن سے شادی کی ہے۔'' زاہد بہت تلخ ہو رہا تھا۔ اس سے شکیلہ نے اندازہ لگایا کہ ریحان نے اسے اور بھی بہت کچھ کہا ہے۔ اس واقعے کے بعد وہ دل برداشتہ ہوگئی اور اس نے زاہد اور دوسرے گھر والوں کو منع کر دیا کہ وہ ریحان کے کسی معاملے میں دخل نہ دیں اور نہ ہی اس کی مدد کی کوئی کوشش کریں۔

اس تلخی کے بعد ریحان، شکیلہ سے پہلے سے زیادہ رکھائی سے پیش آنے لگا۔ اشد ضرورت کے بغیر اس سے براہِ راست بات بھی نہیں کرتا تھا اور اگر اسے کسی چیز کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ بلاواسطہ اسے مخاطب کرتا تھا۔ جب وہ گھر میں ہوتا تھا تو شکیلہ بھی چپ ہو جاتی تھی۔ ورنہ عام طور سے وہ بچیوں کے ساتھ ہنستی کھیلتی تھی۔

فاریہ اور ماریہ اتنی بڑی ہوگئی تھیں کہ وہ ماں اور باپ کے درمیان میں کشیدگی محسوس کر سکتی تھیں مگر تمام تر تلخیوں کے باوجود ریحان اور شکیلہ نے کبھی بچیوں کے سامنے جھگڑا نہیں کیا تھا اور کبھی ایسی نوبت آجاتی تھی تو وہ بچیوں کے سونے کا انتظار کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بچیاں کبھی نہیں جان سکیں کہ ان کے ماں باپ کے بیچ میں کیا اختلاف ہے۔ ظفر کی برسی کے بعد شکیلہ کی طبیعت ناساز تھی۔ اس نے ایک رات کھانے کے بعد دبے انداز میں ریحان سے کہا تو وہ چونک گیا۔ ''کیا پھر کوئی چکر ہے؟''

''لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔'' شکیلہ بے دلی سے بولی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس بار اسے ماں بنتا کھٹک رہا ہے۔

''ڈاکٹر کے پاس چلی جاؤ۔'' ریحان بولا۔

''آپ نہیں چلیں گے؟''

''ہمارا کوئی پہلا بچہ نہیں ہے جو میں تمہیں لے کر ڈاکٹر کے پاس دوڑا جاؤں۔''

''ڈاکٹر کے پاس تو پہلے بچے پر بھی نہیں لے کر گئے تھے۔'' شکیلہ بولی اور اس کے پاس سے اٹھ گئی۔ اگلے دن وہ ڈاکٹر کے گئی تھی۔ اس نے تصدیق کر دی کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ شروع میں اسے پتا نہیں چلا تھا کہ اس بار معاملہ مشکل ہے اور جب پہلی بار الٹرا ساؤنڈ ہوا تو اسی میں پتا چل گیا کہ بچی کے دل کی دھڑکن نارمل نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ بچی کا ایک وال خراب ہے اور امکان ہے پیدائش کے بعد سرجری کرانی پڑے گی لیکن اس کا فیصلہ دل کے ماہر ہی کریں گے۔

ریحان اور شکیلہ کے لیے یہ ایک اذیت ناک خبر تھی۔ ان کی بچی پیدا ہونے سے پہلے ہی ایک مہلک بیماری کا شکار تھی۔ اس قسم کے کیسز عام تھے اور ریحان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ دل کے اس مرض کا علاج کس قدر مہنگا ہوتا ہے۔ اس نے نوریہ کے پیدا ہونے سے پہلے کئی ماہر ڈاکٹرز سے اس بارے میں معلوم کیا تھا۔ لیکن انہوں نے بھی یہی کہا کہ جب تک بچی اس دنیا میں نہیں آجاتی، اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل تھا۔

اس بار بھی ڈلیوری آپریشن سے ہوئی تھی اور نوریہ کو اپنی زندگی کے پہلے تین ہفتے انکیوبیٹر میں گزارنے پڑے تھے کیونکہ دل کی کمزوری کی وجہ سے شروع میں اس کے پھیپھڑوں میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ از خود صحیح طریقے سے سانس لے سکتی۔

آپس کی تلخ اور کشیدہ ازدواجی زندگی کے باوجود ریحان اور شکیلہ دونوں ہی اپنی بیٹیوں سے بے انتہا پیار کرتے تھے۔ خاص طور سے نوریہ تو ان کی جان بن گئی تھی۔ وہ تھی بھی بہت پیاری بچی، بالکل کسی گڑیا کی طرح نازک اور خوب صورت سی۔ وہ بیماری کے باوجود ماں باپ کو تنگ نہیں کرتی تھی۔ اس میں حیران کن صبر اور برداشت تھی۔ جب کبھی اسے آکسیجن کی کمی سے دورہ پڑتا تھا تو وہ چیخنے چلّانے کے بجائے چپ رہتی تھی۔ اسے کھیلنا منع تھا اور نہ ہی وہ سیڑھیاں چڑھ اتر سکتی تھی۔ جب اس کی دونوں بہنیں باہر آتی جاتیں تو وہ صرف حسرت سے ان کو دیکھا کرتی تھی۔ شکیلہ نے اسے تین سال کی عمر میں سمجھا دیا تھا کہ اس کو کوئی ایسا کام نہیں کرنا ہے جس سے وہ تھک جائے۔ اور اس کی طبیعت خراب ہو جائے۔ اسے احساس تھا کہ اس کی طبیعت خراب ہوتی ہے تو اس کے ماں باپ کتنا پریشان ہو جاتے ہیں اس لیے وہ ہر ممکن احتیاط کرتی تھی۔ اسے گھر میں مصروف رکھنے کے لیے انہوں نے اسے ڈھیر سارے کھلونے لا دیے تھے اور شکیلہ اسے گھر میں پڑھاتی تھی.... فی الحال اس کے لیے اسکول جانا بھی ممکن نہیں تھا۔

ریحان کے لیے یہ ایک مشکل دور تھا۔ نوریہ کے علاج کے اخراجات وہ جیسے تیسے کر کے پورے کر ہی رہا تھا مگر ساتھ ہی اسے یہ فکر بھی تھی کہ ابھی سے اس کے آپریشن کے لیے رقم جمع کرنا شروع کر دے۔ یہ اور بات تھی کہ اس

تھے۔ انہوں نے فوری طور پر اس کی رپورٹ کی اور اگلے دن اسے معطل کر دیا تھا۔

ریحان کو لگ رہا تھا۔ اس کے چاروں طرف اندھیرا تھا۔ اس کے پاس ایک یہ نوکری تھی جس کے سہارے وہ گھر چلا رہا تھا۔ اب اس کے ہاتھ میں کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ وہ تھکا اور ٹوٹا ہوا گھر آیا تو شکیلہ نے بھی اس پر توجہ نہیں دی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اس کا دل چاہا کہ شکیلہ اس سے بات کرے اور اس سے اس کا دکھ پوچھے لیکن وہ خود اس سے یہ تعلق برسوں پہلے ختم کر چکا تھا۔ اگلے دن وہ دفتر نہیں گیا تو شکیلہ نے سرسری سے انداز میں پوچھ لیا۔

''مجھے معطل کر دیا گیا ہے۔''

شکیلہ ششدر رہ گئی تھی۔ ''مگر کیوں؟''

ریحان نے اسے دھیمے لہجے میں وجہ بتائی۔ شکیلہ سن کر چپ ہو گئی۔ وہ اسے تسلی بھی نہیں دے سکتی تھی۔ اسے اس کی عادت ہی نہیں تھی۔ اس نے بس اتنا کہا۔ ''اب کیا ہو گا؟''

ریحان کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کا کیس محکمانہ کارروائی سے گزر رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس قسم کے کیس بعض اوقات برسوں لٹکائے جاتے ہیں۔ اس کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا کہ بھاگ دوڑ کرے اور جن سے جان پہچان ہے ان کی منت سماجت کرے کہ وہ اس کی نوکری بچا لیں۔ وہ روز گھر سے نکلتا' لوگوں سے ملتا اور شام کو مایوس واپس آ جاتا کیونکہ اسے کہیں سے بھی امید افزا جواب نہیں ملتا تھا۔

گھر بیٹھ کر کھانے سے خزانہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے پاس تو کچھ بھی نہیں تھا۔ صرف میڈیکل اسٹور کی تنخواہ تھی جس سے گھر کا راشن بھی مشکل سے آتا تھا۔ شکیلہ پریشان ہو گئی اور بچے سہم گئے تھے کہ اب کیا ہو گا۔ وہ جب باہر سے آتا تھا تو سب اسے امید بھری نظروں سے دیکھتے تھے اور اس کے پاس ... بتانے کے لیے کچھ نہیں ہوتا تھا۔ وہ ان سے نظریں بھی نہیں ملا سکتا تھا۔ اس نے میڈیکل اسٹور کے مالک سے کہا کہ وہ اسے فل ٹائم رکھ لے لیکن اس نے معذرت کر لی تھی کیونکہ دوسرے وقت کے لیے اس کے پاس پہلے ہی ایک آدمی تھا اور وہ اسے نہیں نکال سکتا تھا۔

حالات بہت تیزی سے خراب ہو رہے تھے۔ اس روز گھر میں سب ہی ختم تھا اور شکیلہ نے بچوں کو مشکل سے ناشتا کرایا تھا۔ اس نے بھوک نہ ہونے کا عذر کر کے کچھ نہیں کھایا تھا۔ گھر میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے بیچ کر وہ کچھ رقم حاصل کر سکتے۔ شکیلہ اپنا سارا زیور پہلے ہی بیچ چکی تھی۔

ریحان نے بچوں کو دیکھا اور گھر سے نکل گیا۔ اس نے سوچا کہ کہاں جائے اور پھر اس نے ریل اسٹیشن کا رخ کیا اور کینٹ اسٹیشن کی طرف جانے والی ایک ٹرین میں سوار ہو گیا۔ کینٹ اسٹیشن پر اتر کر اس نے پیدل دفتر کی طرف چلنا شروع کیا اور اسے پتا نہیں چلا کہ وہ کب وہاں پہنچا تھا۔ اس کا حلیہ اتنا ابتر تھا کہ جب وہ اندر داخل ہونے لگا تو چپراسی نے اسے روک دیا۔ وہ اسے پہچان نہیں سکا تھا۔

''کہاں جاتا ہے منہ اٹھائے؟''

''رمضان میں ہوں یار۔'' ریحان نے تھکے لہجے میں کہا۔

چپراسی کا منہ کھل گیا تھا۔ ''ریحان صاحب آپ......؟''

''ہاں یار شیخ صاحب سے ملنا تھا۔''

رمضان جانتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اس نے افسردگی سے کہا۔ ''اب اس کا کیا فائدہ صاحب۔''

''کیا مطلب؟'' ریحان چونکا۔

رمضان اسے اس کے کمرے تک لایا اور کھلے دروازے سے اندر اشارہ کیا۔ ریحان کی آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا تھا۔ اس کی میز پر شیخ صاحب کا عزیز بیٹھا بلند آواز سے قہقہے مار رہا تھا اور چائے نوشی کر رہا تھا۔ ریحان کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ پھر تھکے قدموں سے باہر نکل آیا تھا۔ رمضان اسے آوازیں دیتا رہ گیا۔ باہر آ کر اس نے بلا ارادہ چلنا شروع کر دیا اور جب وہ رکا تو اس کے سامنے سمندر کا منظر تھا جس میں سورج ڈوبنے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ سورج کو تکتا رہا جو اس کی قسمت کی طرح ڈوب رہا تھا۔ سورج کو تو کل مشرق سے ابھر کر پھر آنا تھا لیکن اس کی قسمت میں پھر ابھرنا نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ کے لیے ڈوب چکی تھی۔

وہ کچھ دیر سورج کو دیکھتا رہا اور پھر نیٹی جیٹی کے پل کی اس اونچی ریلنگ پر چڑھا جو سرکار نے لوگوں کو خودکشی سے روکنے کے لیے لگائی تھی اور یہ بھول گئی تھی کہ خودکشی کرنے والے کو کوئی روک نہیں سکتا تھا بلکہ اس ریلنگ کی وجہ سے نیچے کودنے والوں کو مزید اونچائی مل گئی تھی۔ اس نے نیچے دیکھا جہاں بہت گہرائی میں سیاہ تیل زدہ پانی اسے بلا رہا تھا۔ اسے اس کی مایوس زندگی سے ہمیشہ کے لیے نجات دلانے کے لیے۔ اس نے حسرت سے سوچا۔

''میں ساری زندگی غلط فیصلوں کا شکار رہا تھا۔ ہمیشہ غلط موڑ مڑتا رہا اور ناکامیاں میرا مقدر بن گئیں۔ اب

میرے پاس سوائے مر جانے کے اور کیا بچا ہے۔''

اسے ایک عجیب سا خیال آیا۔ اگر اسے اپنی زندگی دوبارہ گزارنے کا موقع ملے اور وہ اس بار صحیح فیصلے کرے تو کیا وہ پھر ناکام ہو گا۔ نہیں وہ کامیاب ہو گا لیکن قدرت کسی کو ایک بار ہی یہ موقع دیتی ہے۔ اس نے سوچا اور نیچے چھلانگ لگا دی جہاں سیاہ پانی اس کا منتظر تھا۔ اس میں گرتے ہی تاریکیاں اسے اچک لے گئیں۔

☆☆☆

''ریحان اٹھو اسکول نہیں جانا۔'' ماں کی آواز آئی۔

وہ کسمسایا۔ ''اٹھتا ہوں امی۔''

''اٹھ جاؤ بیٹے۔'' باپ نے بھی پکارا۔ ''آج آپ کا اسکول میں داخلہ کرانا ہے۔''

وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھا اور کچھ دیر اُلجھن سے سوچتا رہا کہ وہ کہاں ہے۔ پھر اس نے اردگرد دیکھا۔ یہ اس کے چھوٹے سے گھر کا کمرا تھا۔ وہ بستر سے اٹھا اور خالی دماغ کے ساتھ کمرے سے نکل کر دائیں طرف مڑ گیا۔ فوراً ہی ماں نے اسے پکارا۔

''باورچی خانے میں کہاں جا رہے ہو؟''

اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اسے یوں لگا جیسے اسے کچھ یاد نہیں تھا' وہ کچھ... بھول گیا تھا۔ لیکن اسے کیا یاد نہیں تھا یہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اسے لگا جیسے کوئی گڑبڑ ہے اسے اپنا وجود بھی کچھ اجنبی لگ رہا تھا۔ وہ دائیں طرف مڑا اور اس نے باتھ روم کا دروازہ دیکھ لیا۔ جب تک وہ وہاں سے فارغ ہو کر آیا۔ شبانہ نے ناشتا لگا دیا تھا۔ ظفر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ انہوں نے ناشتا شروع کیا تو شبانہ نے آہستہ سے کہا۔

''آج ریحان کا لازمی داخلہ کرا کے آیئے گا۔''

''تم فکر مت کرو اسی لیے تو جا رہا ہوں۔'' ظفر نے جواب دیا۔ ریحان اُلجھے انداز میں کھا رہا تھا۔ ظفر اور شبانہ سمجھے کہ وہ شاید اسکول جانے کا سوچ کر خوف زدہ ہے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر اس نے ماں کے دیے کپڑے بدلے اور باپ کے ساتھ باہر نکل آیا۔ اسے گلی بیک وقت مانوس بھی لگی اور اجنبی بھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ جانے پہچانے راستوں پر بہت عرصے بعد قدم اٹھا رہا ہو۔

''تم فکر مت کرو، اسکول میں تم کو بہت مزہ آئے گا۔'' ظفر نے اسے تسلی دی۔

''جی ابو۔'' اس نے غیر ارادی طور پر کہا۔ ''میں دل لگا کر پڑھوں گا۔''

''شاباش بیٹے۔'' ظفر نے اس کی پشت تھپکی۔ ''میں تمہیں اس علاقے کے سب سے اچھے اسکول میں داخل کراؤں گا۔''

ظفر اسے ایف جی پبلک میں لے کر آیا۔ اسکول اسے پہلی نظر میں اچھا لگا تھا۔ اندر آتے ہی اسے لگا کہ پرنسپل اسے داخلہ دینے سے انکار کر دے گا مگر وہ یہ نہیں جان سکا کہ یہ بات اس کے ذہن میں کیسے آئی تھی اور ایسا ہی ہوا جب اسے ریحان کی عمر کا پتا چلا تو اس نے انکار کر دیا۔

''ہم پانچ سال سے کم عمر بچوں کو داخلہ نہیں دیتے ہیں۔''

''لیکن یہ چند مہینے بعد پانچ سال کا ہو جائے گا۔''

''دیکھیے یہ ہمارا اصول ہے......'' پرنسپل نے معذرت بھرے انداز میں کہا۔ ''ورنہ میں آپ کے بچے کو ضرور داخلہ دیتا۔ ایسا کریں آپ اسے اگلے سال لے آئیں۔''

ریحان کو لگا کہ اس سال اس کا یہاں داخلہ نہیں ہوا تو کبھی بھی نہیں ہو گا۔ ظفر مایوسی کے عالم میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے ریحان کا بازو پکڑا تو اس نے پرنسپل سے کہا۔ ''سر' مجھے ایک بات کہنے کی اجازت ہے۔''

پرنسپل اس کے مؤدبانہ انداز سے متاثر ہوا تھا۔ ''کہو بیٹے۔''

''سر اگر کوئی بہت ذہین ہو اور اس کی عمر پانچ سال سے ذرا کم ہو تب بھی آپ اسے داخلہ نہیں دیں گے؟''

پرنسپل سوچ میں پڑ گیا۔ ہر تعلیمی ادارے کے سربراہ کی طرح اس کی بھی یہی خواہش تھی کہ اس کے اسکول میں ذہین طالب علم آئیں۔ اس نے ہچکچا کر جواب دیا۔ ''اس صورت میں غور کیا جا سکتا ہے۔''

''سر آپ میرا ٹیسٹ لے لیں۔ اگر میں پاس نہ ہوا تو آپ مجھے داخلہ مت دیجیے گا۔'' ریحان نے اتنے اعتماد سے کہا کہ ظفر بھی حیران ہوا تھا کیونکہ اس نے ریحان کو پہلے کبھی اس انداز میں بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔

پرنسپل نے اس پانچ سال کے بچے کو دیکھا جو اتنے اعتماد سے دعویٰ کر رہا تھا۔ اس نے غور کیا اور پھر ایک ٹیچر کو بلایا۔ ''مس سارہ آپ اس بچے کا امتحان لیں اور مجھے بتائیں۔''

ریحان اس کے ساتھ دوسرے کمرے میں آیا۔ مس سارہ نے پہلے اس سے حساب کے کچھ سوال کیے۔ اس نے ٹھیک جواب دیے۔ مس سارہ کو حیرت ہوئی تھی۔ پھر اس نے کچھ مشکل سوال کیے اور ریحان نے ان کے جواب بھی

دے دیے۔ اس کے بعد اس نے اردو اور انگریزی کے بارے میں پوچھا۔ اسلامیات کی معلومات لیں۔ ایک گھنٹے تک اس کا ٹیسٹ لینے کے بعد اس نے واپس آکر پرنسپل کو رپورٹ کی۔

''سر، ریحان بہت ذہین بچہ ہے اور اس نے ان سوالوں کے جواب بھی دیے ہیں جو ہمارے ہاں سیکنڈ اور تھرڈ کے بچوں کو آتے ہیں۔''

پرنسپل متاثر ہوا لیکن اس نے خود بھی مزید سوال کر کے اپنا اطمینان کیا اور پھر ظفر کی طرف دیکھا۔ ''اس بچے کی خاطر میں اپنے اسکول کا یہ اصول توڑتا ہوں۔ ہم اسے داخلہ دے رہے ہیں۔''

ریحان خوشی سے اچھل پڑا تھا اور ظفر حیران ہوا تھا۔ داخلے کا طریقۂ کار مکمل کر کے وہ جب ریحان کے ساتھ واپس آرہا تھا تو اس نے پوچھا۔

''بیٹا کیا آپ کو آپ کی امی بھی پڑھاتی ہیں؟''

''نہیں ابو مجھے تو بس آپ پڑھاتے ہیں۔''

''پھر آپ کو ان سوالوں کے جواب کیسے آئے؟''

یہ تو خود ریحان نے بھی نہیں سوچا تھا کہ اسے ان سوالوں کے جواب کیسے آئے تھے۔ اس نے بے بسی سے باپ کی طرف دیکھا۔ ''بس ابو آگئے، مجھے نہیں پتا کیسے آئے۔''

ظفر کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے اس بات کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اسے تو بس اس بات کی خوشی تھی کہ ریحان کو اس اسکول میں داخلہ مل گیا جہاں وہ اسے داخل کرانا چاہتا تھا۔ اس نے گھر آکر شبانہ کو اس واقعے کے بارے میں بتایا لیکن اس نے ریحان کی ذہانت تو کیا اس بات میں بھی .... دلچسپی نہیں لی تھی کہ اسے ایک اچھے اسکول میں داخلہ مل گیا تھا۔ اس کے لیے سب سے بڑی خوش خبری یہ تھی کہ ریحان اسکول میں رہا کرے گا اور وہ نصف دن سکون سے گھر کے کام نمٹا سکے گی کیونکہ فرحی سکون سے رہنے والی بچی تھی اور نعمانہ تو ابھی شیر خوار تھی۔ اس کا بیشتر وقت سوتے ہوئے گزرتا تھا۔ صرف ریحان تھا جو اسے تنگ کرتا تھا۔ اس وجہ سے اس نے اصرار کر کے ریحان کو اسکول میں داخل کروایا تھا۔ ورنہ اس زمانے میں بچوں کو پانچ چھ سال کی عمر سے پہلے اسکول میں داخل نہیں کرایا جاتا تھا۔

اس اسکول کے لیے یونیفارم بازار سے بنا بنایا ملتا تھا۔ ظفر اسی روز مارکیٹ سے جا کر اس کا یونیفارم، بیگ اور چند چھوٹی موٹی چیزیں لے آیا تھا اور دو دن بعد اس نے اسکول جانا شروع کر دیا تھا۔ اسے داخلہ پہلی کلاس میں [ملا] تھا اور پہلے ہی دن اس نے خود کو کلاس کا سب سے ذہی[ن] تسلیم کروالیا تھا۔

شروع میں اس کی ٹیچرز سمجھتی تھیں کہ وہ صرف [پڑھائی] کے معاملے میں آگے ہے لیکن جب اس نے کھیلوں [میں] حصہ لیا وہاں بھی وہ اپنی عمر سے آگے ہی نظر آیا [تھا۔] کرکٹ بہت اچھی کھیلتا تھا۔ اس کے علاوہ اسے ریس [کا] شوق تھا۔ اسکول میں کلاس کے بعد وہ زیادہ تر کھیلنے میں [مصروف] رہتا تھا۔ اس پر بھی یہ عالم تھا کہ پہلی کلاس کا امتحان اس [نے] ریکارڈ نمبروں سے پاس کیا تھا۔ اس کامیابی پر اسکول [کی] طرف سے اسے شیلڈ اور ایک سال کی پروموشن ملی تھی او[ر وہ] براہِ راست تیسری کلاس میں چلا گیا تھا۔

ظفر تو اس کی اچانک ہی ذہانت پر حیران تھا۔ شبانہ [کو] بھی تعجب ہوا تھا کیونکہ بچپن سے نہ تو ریحان نے پڑھنے [میں] کوئی خاص دلچسپی لی تھی اور نہ وہ اتنا ذہین تھا کہ [کوئی] بھی چیز پہلی بار میں سیکھ جاتا۔ وہ اس کی نگرانی کرتے [ہوئے] ظفر خود اس سے سوال کرتا تھا اور ریحان اسے بھی حیر[ت] میں ڈال دیتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ایک اچھے اسکول [کی] پڑھائی کا فطری نتیجہ تھا۔ صرف تعلیم ہی نہیں دوسر[ے] معاملات میں بھی ریحان کا رویہ بہت بدل گیا تھا۔ پہلے [وہ] شبانہ کو بہت تنگ کرتا تھا لیکن اب اسکول سے آنے کے [بعد] وہ اپنی ساری چیزیں سلیقے اور صفائی سے رکھتا تھا۔ اس [نے] کمرے میں اپنے بیگ اور یونیفارم کے لیے ایک جگہ بن[ائی] تھی اور وہ سب وہیں لا کر رکھتا تھا اور صبح وہیں سے اٹھا[تا] تھا۔ اس کی کسی چیز کی تلاش میں شبانہ کو صبح دوڑنا نہیں پڑ[تا] تھا۔ کچھ عرصے بعد شبانہ بھی قائل ہو گئی کہ اچھے اسکول [کا] بچے پر واقعی بہت اثر پڑتا ہے۔ اس نے ظفر سے کہا۔

''فرحی کو بھی یہیں داخل کرائیے گا۔''

''میں نے تو پہلے ہی سوچ لیا ہے۔ اس اسکول میں ایک اور اچھی بات ہے کہ میٹرک تک ہے۔ اب یہ نہیں کہ پرائمری کے بعد داخلے کے لیے دوبارہ بھاگ دوڑ کرو۔''

ریحان اپنے کاموں میں ماں کو تنگ نہیں کرتا تھا بلکہ ساتھ ہی وہ بہت سارے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹانے ل[گا] تھا۔

ماں باپ کے مقابلے میں ریحان ایک عجیب سی کشمکش کا شکار تھا۔ اسے لگتا تھا جیسے وہ کوئی مصنوعی زندگی گزار رہا ہے۔ یہ اس کی زندگی نہیں تھی لیکن اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اسے ایسا احساس کیوں ہوتا ہے۔ وہ بہت کچھ

جانتا تھا اور یہ نہیں جانتا تھا کہ اسے یہ سب کیسے پتا تھا۔ ایک دن وہ بیٹھا ہوم ورک کر رہا تھا۔ ظفر اور شبانہ بھی پاس بیٹھے تھے۔ ان دنوں شبانہ پھر امید سے تھی۔ اس نے اس بارے میں کوئی شکایت کی تو ریحان بے ساختہ بولا۔ ''امی کچھ مہینے کی تو بات ہے پھر بے بی ہوجائے گا۔''

شبانہ چونکی۔ ''کیا...... کیا کہا تم نے؟''

ظفر بھی چونک گیا۔ ریحان نے پھر اپنی بات دہرا دی۔ اس وقت ریحان آٹھ سال کا تھا اور اتنی عمر کے بچے کو ان باتوں کا پتا نہیں ہوتا ہے۔ شبانہ نے اسے تھپڑ مارا تھا۔

''بے شرم تجھے یہ بات کس نے بتائی۔''

ظفر نے اسے گھورا۔ ''کس نے بتائی ہوگی۔ اسی گھر میں رہتا ہے۔ تم سے یا مجھ سے سن لیا ہوگا۔ یہ معصوم ہے، اس طرح مت مارو۔''

شبانہ بھی پشیمان ہو گئی، اس نے جلدی سے ریحان کو گلے سے لگا کر پیار کیا اور معذرت کی۔ ''سوری بیٹا۔''

ریحان منہ بسور رہا تھا لیکن ماں نے پیار کیا تو اس کا موڈ ٹھیک ہو گیا۔ اس کے بعد سے وہ محتاط ہو گیا۔ اس نے سوچ لیا کہ وہ کوئی بات بنا سوچے سمجھے منہ سے نہیں نکالے گا اور اس کے لیے اسے خود پر جبر کرنا پڑتا تھا کیونکہ اس کے ذہن میں ایسی سوچیں خود بہ خود آتی رہتی تھیں۔ اسے بڑوں کی بہت ساری باتوں کا جیسے خود سے علم ہو جاتا تھا۔ مگر وہ کوشش کرتا تھا کہ کسی کے سامنے کہنے سے گریز کرے۔ اس دن بھی بے ساختہ منہ سے نکل گیا تھا۔ اس کے بعد وہ محتاط رہنے لگا تھا۔ اگر اس کے ذہن میں کوئی انوکھی بات خود بہ خود آتی تھی تب بھی وہ اسے منہ سے نکالنے سے گریز کرتا تھا۔

تیسری کلاس میں اس نے پھر ریکارڈ نمبر لیے تھے اور پورے اسکول میں اول آیا تھا۔ ایک بار اسے پھر پروموشن ملی تھی اور اسے پانچویں کلاس میں داخل کیا گیا تھا۔ جب اس نے پانچویں کا امتحان بھی ریکارڈ نمبروں سے پاس کیا تو اسکول میں اس کے اعزاز میں تقریب ہوئی تھی جس میں ایک بڑے سرکاری افسر کو بہ طور مہمانِ خصوصی مدعو کیا گیا تھا۔ اس نے ریحان کو ایک ہزار روپے کا انعام دیا تھا۔ اس کی فیس پہلے ہی معاف کی جا چکی تھی اور اسکول کی طرف سے اسے ماہانہ وظیفہ ملنے لگا تھا جو اس کی تعلیمی ضروریات سے زیادہ ہی ہوتا تھا۔ اسکول کے پرنسپل نے ظفر کو مشورہ دیا۔

''آپ اس کی آگے کی تعلیم کا کوئی خصوصی بندوبست کریں یہ بہت ذہین ہے۔''

خود ظفر بھی یہی سوچ رہا تھا۔ اس نے یہ کیا کہ ریحان کو اسکالرشپ کا جو وظیفہ ملتا تھا، اسے بینک میں ایک سیونگ اکاؤنٹ کھول کر ڈالنے لگا۔ اسے امید تھی کہ جب ریحان کو اعلیٰ تعلیم کے لیے کہیں داخلے کی ضرورت پیش آئے گی تو اس رقم سے مدد ملے گی۔ ظفر کی اپنی آمدنی اتنی نہیں تھی کہ وہ اس میں سے بچت کر سکتا۔ اس نے ایک اسکیم میں دو پلاٹ لے رکھے تھے اور ان کی قسطیں بھرتا تھا۔ ریحان کے بعد فرحی بھی اسی اسکول میں داخل ہو گئی تھی۔ نعمانہ ابھی دو سال کی تھی۔

ریحان خود بھی پڑھتا تھا اور فرحی کو بھی پڑھاتا تھا۔ بھائی کی توجہ کی وجہ سے وہ بھی پڑھائی میں تیز ہو گئی تھی۔ ریحان نے ساتویں کلاس میں پھر پروموشن لی تھی اور صرف دس سال کی عمر میں آٹھویں کلاس میں آگیا تھا۔ ابھی وہ گیارہ سال کا نہیں ہوا تھا کہ اس نے آٹھویں بھی پاس کر لی تھی اور اب اسے نویں کلاس میں جانا تھا۔ نویں میں داخلے کے لیے بارہ سال کا ہونا ضروری ہے لیکن اس کے شاندار تعلیمی کیریئر کی وجہ سے اسے خاص طور سے نویں میں داخلہ مل گیا تھا۔

ریحان خوش تھا کہ اس کا کیریئر بہت اچھے انداز میں جاری ہے۔ اس میں کوئی غلط موڑ نہیں آیا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ سب ٹھیک جارہا ہے اور وہ آگے کامیاب ہوگا۔ اس نے میٹرک تیرہ سال کی عمر میں پاس کر لیا تھا۔ اگرچہ میٹرک میں اس کی اتنی اچھی پوزیشن نہیں بنی تھی۔ وہ اپنی کلاس میں سب سے زیادہ نمبر لینے والا ضرور تھا۔ بہرحال یہ کامیابی بھی کم نہیں تھی اور اسے فوراً ہی ایک معروف نجی کالج نے اپنے ہاں داخلہ دے دیا تھا اور اس نے ریحان کو تمام تر فیسوں سے مستثنیٰ قرار دیا تھا۔ ریحان نے کامرس کا شعبہ چنا تھا جب کہ ظفر کا خیال تھا کہ اسے ایف ایس سی منتخب کرنا چاہیے تھا۔ چاہے وہ ڈاکٹر بنتا یا انجینئر بنتا اس زمانے میں ذہین بچوں کے لیے یہی تعلیم کی معراج سمجھی جاتی تھی۔ کامرس کا شعبہ دوسرے نمبر پر آتا تھا۔ لیکن ریحان نے باپ سے پہلی بار اختلاف کیا تھا۔ اس نے کہا۔

''ابو آنے والے وقت میں اس تعلیم کی سب سے زیادہ اہمیت ہوگی۔''

''تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو؟'' ظفر کو غصہ آگیا۔ اس کا تیرہ سال کا بیٹا اسے بتا رہا تھا کہ اسے اس سے زیادہ پتا تھا۔ اسے غصہ تو آنا تھا۔

''نہیں ابو لیکن آپ جانتے ہیں میں تعلیم میں تیز ہوں اور میرا رجحان بھی اس طرف ہے۔ اگر میں کامرس پڑھوں گا

تو میں بہت اچھے نمبر لے سکوں گا۔ ابو میں ایم بی اے یا آئی سی ایم اے کرنا چاہتا ہوں۔''

ظفر کا غصہ یہ سن کر کسی قدر ٹھنڈا پڑ گیا۔ اسے خوشی ہوئی تھی کہ ریحان کو اپنے کیریئر کا اتنا احساس تھا۔ اس نے سوچنے کے بعد ریحان کی بات مان لی اور ساتھ ہی شرط لگا دی۔ ''اس صورت میں تم کو ہر بار فرسٹ ڈویژن لینا ہو گی۔''

''ایسا ہی ہوگا ابو۔'' اس نے خوش ہو کر کہا۔

کالج میں تعلیم کا معیار اتنا بلند تھا کہ اسے کوچنگ کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ اسکالرشپ کی وجہ سے اس کا تعلیمی بار اپنے باپ پر نہیں تھا۔ ساتھ ہی ...... کالج سے آنے کے بعد وہ ٹیوشن کرتا تھا اور اس سے اسے اتنا مل جاتا تھا کہ وہ اپنے تمام اخراجات پورے کر لیا کرتا تھا۔ بلکہ چھوٹی بہنوں کو پاکٹ منی بھی دیتا تھا۔ ظفر کے ساتھ شبانہ بھی اس سے خوش تھی اور جب لوگ اور خاص طور سے خاندان والے ریحان کی تعریف کرتے تھے تو وہ پھول جاتی تھی اور اس وقت اسے بیٹے پر بہت زیادہ فخر محسوس ہوتا تھا۔ ظفر خدا کا شکر ادا کرتا تھا کہ اس کا بیٹا ایک ہونے کو باوجود نیک تھا اور آج کل کے نوجوانوں کی طرح بگڑا نہیں تھا۔

ریحان نے کالج میں بھی اپنا تعلیمی معیار برقرار رکھا تھا۔ اسے شروع میں غیر مانوسیت کا جو احساس ہوتا تھا، وہ وقت کے ساتھ جاتا رہا تھا۔ لیکن وہ خود یا اس کے ماں باپ اس کی زندگی کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے تھے تو اسے یہ احساس ضرور ہوتا تھا کہ یہ فیصلہ اس کے حق میں اچھا ہے یا نہیں اور اگر وہ اچھا نہیں ہوتا تھا تو وہ اسے قبول کرنے سے انکار کر دیتا تھا۔

شروع میں وہ اپنی عمر سے زیادہ ذہین تھا۔ تعلیم میں بھی اور عام معاملات میں بھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اس کا ذہنی معیار عام نوجوان کے برابر ہوتا چلا گیا تھا۔ لیکن بی کام میں اس کی فرسٹ ڈویژن ضرور آئی تھی اور اس نے باپ کی شرط پوری کر دی تھی۔ اب اس کا ارادہ ایم بی اے کرنے کا تھا۔ کیونکہ اس کے نمبر اچھے تھے اس لیے اسے یونیورسٹی میں آسانی سے داخلہ مل گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ کامیابی کی طرف اس کا یہ ایک اور قدم تھا۔ اب تک تو وہ مفت میں پڑھتا آیا تھا اور اس کی تعلیم کا بوجھ ظفر پر نہیں آیا تھا۔ لیکن آئی بی اے میں تعلیم سستی نہیں تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ ٹیوشن پڑھا کر اپنا خرچ نکالے اور باپ پر بار نہیں بنے گا کیونکہ وہ پہلے ہی تین بیٹیوں کو پڑھا رہے تھے اور ان کی تعلیم مفت نہیں تھی۔ لیکن جب اس نے آئی بی اے میں داخلے اور وہاں کی فیس کے بارے میں معلوم کیا تو پریشان ہو گیا اور اس نے گھر میں بتایا تو ظفر نے پہلی بار اسے اس اکاؤنٹ کے بارے میں انکشاف کیا جس میں وہ اس کے اسکالرشپ کی رقم جمع کراتا رہا تھا۔ جب اسکالرشپ بند ہو گیا تب بھی ظفر ہر مہینے کچھ نہ کچھ رقم اس اکاؤنٹ میں ڈالتا رہا تھا تا کہ اس کی اعلیٰ تعلیم صرف رقم کی کمی سے ادھوری نہ رہ جائے۔

رقم کوئی بیس ہزار کے قریب تھی جو اس زمانے میں ایک معقول رقم تھی۔ اس کے مکمل ایم بی اے کے لیے کافی تھی۔ ریحان نے پوری جانفشانی سے پڑھنا شروع کر دیا۔ اسے معلوم تھا کہ تین سال کی یہ محنت اس کی زندگی بنا دے گی۔ اس کے بعد کی راہیں آسان ہو جائیں گی اور اسے کامیابی کے لیے بہت زیادہ تگ و دو نہیں کرنا پڑے گی۔ پہلے وہ زیادہ ٹیوشن کر رہا تھا لیکن تعلیم پر توجہ دینے کے لیے اس نے ٹیوشن کی تعداد محدود کر دی تھی اور بس اتنے بچوں کو پڑھاتا تھا کہ اس کی اپنی تعلیم میں کوئی حرج نہ ہو اور وہ گھر میں بھی وقت دے سکے۔ کیونکہ وہ اس گھر کا ایک ہی بیٹا تھا اور اس کی بہت ساری ذمّے داریاں تھیں۔

ظفر کی ریٹائرمنٹ کا وقت قریب تھا اور اس کے بعد گھر چلانے کی ذمّے داری اسی کے سر آ جاتی۔ اپنی مستقل مزاجی اور تعلیم کو اہمیت دینے کی وجہ سے وہ جلد آئی بی اے کے اساتذہ کا پسندیدہ لڑکا بن گیا تھا۔ اگرچہ وہ بہت ذہین نہیں تھا لیکن نقطے اچھے تلاش کرتا تھا اور اپنا ہوم ورک ہمیشہ مکمل رکھتا تھا۔

جن دنوں وہ پانچویں سمسٹر میں آیا تو ان ہی دنوں یونیورسٹی میں ایک لڑکی عالیہ نے بی بی اے میں داخلہ لیا تھا۔ ریحان سے اس کی ملاقات اتفاقیہ ہوئی تھی۔ ورنہ وہ اسے جانتا بھی نہیں تھا۔ وہ کینٹین کی جس میز پر بیٹھا تھا۔ وہاں عالیہ اپنے گروپ کی لڑکیوں سمیت آ گئی۔ ریحان اپنے تیار کیے ہوئے کچھ نوٹس دیکھ رہا تھا۔ عالیہ نے اس سے کہا۔

''ایکسکیوزمی آپ اُس ٹیبل پر جا سکتے ہیں۔'' عالیہ نے ایک چھوٹی ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔ ''اصل میں ہم زیادہ ہیں۔''

ریحان نے اسے دیکھا اور کھڑے ہو کر بولا۔ ''کیوں نہیں۔''

وہ اپنی چیزیں سمیٹ کر اس میز پر چلا گیا اور عالیہ اپنی ساتھیوں سمیت اس میز پر آ گئی۔ ریحان نے اپنی توجہ پھر نوٹس کی طرف کرنا چاہی لیکن نہ جانے کیوں ذہن اس لڑکی کی طرف چلا گیا۔ وہ اس کا نام بھی نہیں جانتا تھا وہ گوری اور پُرکشش لڑکی تھی۔ اس نے اپنے لائٹ براؤن بال پونی ٹیل کی صورت میں باندھ رکھے تھے۔ دلکش نقوش اور کسی قدر فٹنگ کے لباس میں اس کے متناسب خدوخال نمایاں تھے۔ وہ بلاشبہ خوب صورت لڑکی تھی۔ جب ریحان اپنی توجہ نوٹس پر مرکوز نہیں کر سکا... تو تنگ آ کر وہاں سے اٹھ گیا۔ اس کے دو دن بعد وہ آئی بی اے کی لائبریری سے نکل رہا تھا کہ اسی لڑکی سے سامنا ہو گیا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔

''ہیلو۔''

''ہیلو۔'' ریحان رک گیا۔

''پرسوں آپ نے ہمارے لیے میز خالی کر دی تھی، اس کا شکریہ کہنا تو میں بھول گئی تھی۔''

''کوئی بات نہیں، وہ کوئی اتنی خاص بات نہیں تھی مس......''

''عالیہ...... عالیہ ناز۔'' وہ بولی۔

''مجھے ریحان کہتے ہیں اگر آپ کو میری کسی مدد کی ضرورت ہو تو بلا جھجک کہہ دیجیے گا۔''

''شاید مجھے ضرورت ہے۔'' وہ بولی۔ ''اصل میں، میں نے شوق میں داخلہ تو لے لیا ہے۔ لیکن میں ایف ایس سی سے کامرس میں آئی ہوں تو مجھے بہت مشکل لگ رہا ہے۔''

''میں آپ کو گائیڈ کر سکتا ہوں۔'' ریحان نے خلوص سے کہا۔

''گائیڈ نہیں مجھے مکمل ٹیوشن کی ضرورت ہے ورنہ میں ایک عام سی اسٹوڈنٹ بن جاؤں گی اور عام اسٹوڈنٹ بننا مجھے کسی صورت گوارا نہیں ہے۔ میں نے سنا ہے آپ ٹیوشن پڑھاتے ہیں تو مجھے بھی پڑھا دیں۔''

''اصل میں میرے پاس وقت نہیں ہے۔'' ریحان نے ہچکچا کر کہا۔ وہ اس حسین لڑکی کو انکار کرتے ہوئے تذبذب کا شکار تھا۔

''پلیز۔'' وہ مچل کر بولی تو ریحان اسے دیکھتا رہ گیا اور اس لمحے اس نے پہلی بار اس کے بارے میں سوچا تھا۔ ''آئی بے فوراٹ۔''

''یہ بات نہیں ہے۔ اگر میں نے پڑھایا تو میں آپ سے کوئی معاوضہ نہیں لوں گا۔''

''کیوں نہیں لیں گے؟''

''کیونکہ آپ میری کولیگ ہیں۔''

''بس تو پھر آپ کو اب پڑھانا ہی ہو گا۔'' عالیہ نے ایسے انداز میں کہا کہ اس کے لیے انکار کرنا ممکن ہی نہیں رہا تھا۔ آخری سال میں پڑھائی ہمیشہ سخت ہوتی ہے اور اسی وجہ سے وہ باقی ٹیوشن چھوڑنے کا سوچ رہا تھا۔ لیکن اب یہ ٹیوشن سامنے آ گئی تھی جو اسے قبول کرنا ہی تھی۔ اس کے دماغ کے انکار کی اس کے دل کے اقرار کے سامنے ایک نہیں چلی تھی۔ عالیہ نے یہ بات محسوس کر لی تھی اس لیے دھونس بھی جما دی تھی۔ طے ہوا کہ ریحان یونیورسٹی سے اس کے گھر ہی جائے گا اور اسے وہاں پڑھا کر پھر گھر جایا کرے گا۔ عالیہ جلدی چلی جاتی تھی اور وہ تقریباً تین بجے نکلتا تھا۔ پہلے گھر جا کر کچھ دیر آرام کرتا تھا اور پھر چھ سے رات نو بجے تک مختلف جگہوں پر ٹیوشن پڑھاتا تھا۔ اب وہ عالیہ کے گھر جاتا تھا وہاں اسے پڑھا کر پھر گھر جاتا تھا۔

عالیہ کے گھر کا ماحول براڈ مائنڈڈ تھا اور پڑھانے کے دوران کوئی ان کے سر پر مسلط نہیں ہوتا تھا۔ اکثر عالیہ اس کے کھانے پینے کی کوئی نہ کوئی چیز تیار رکھتی تھی کیونکہ وہ یونیورسٹی سے بھوکا ہی اس کے گھر آتا تھا۔ اس نے دو تین بار منع کیا تو عالیہ نے اس سے کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں آپ کے لیے کچھ نہیں بناؤں گی لیکن پھر آپ کو ٹیوشن فیس لینا ہو گی۔''

''وہ تو میں انکار کر چکا ہوں۔''

''تب یہ قبول کرنا پڑے گا۔'' عالیہ نے کہا تو اسے اس کی بات ماننا پڑی۔ ویسے بھی وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو اپنی بات منوانا جانتی ہیں۔ دو تین بار اس نے پڑھائی کے دوران ریحان سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی تو اس نے اسے ٹوک دیا کہ وہ اس وقت اسے صرف اسٹوڈنٹ دیکھنا چاہتا ہے۔

عالیہ سمجھ گئی تھی اس لیے پڑھنے کے دوران میں وہ کوئی غیر متعلقہ بات کرنے سے گریز کرتی تھی اور جب ٹیوشن کا وقت مکمل ہو جاتا تھا تو وہ اپنی بات کرتی تھی۔ پسندیدگی کا جذبہ دونوں میں شروع سے تھا لیکن دونوں کو اسے واضح کرنے میں کچھ وقت لگا تھا۔ جن دنوں ریحان کا آخری سمسٹر شروع ہوا تو ریحان نے چھٹی لے لی۔

''اب میں پیپرز کے بعد ہی تمہیں پڑھانے آؤں گا۔''

''اتنے دن...... میں کیسے رہوں گی؟'' عالیہ نے جھجک کر کہا۔

''جیسے پہلے رہتی آئی تھیں۔'' ریحان ہنسا۔

''پہلے کی بات اور تھی' اب میں نہیں رہ سکتی۔'' عالیہ بہت بے باک ہوتے ہوئے بھی یہ بات کہتے ہوئے جھجک گئی تھی۔

''یونیورسٹی میں تو روز ملاقات ہوگی۔'' ریحان نے اسے یاد دلایا تو اسے کچھ اطمینان ہوا۔ ریحان اپنی تعلیم میں مگن ہو گیا تھا۔ اس نے ٹیوشن بھی چھوڑ دی تھیں۔ اس کی خواہش تھی کہ اس بیچ میں وہ ٹاپ کرے اس لیے وہ پوری توجہ دے رہا تھا۔ عالیہ سے یہ جدائی اسے بھی کھل رہی تھی لیکن اس نے اپنے بہتر مستقبل کے لیے اسے ضروری سمجھا تھا۔ وہ ٹاپ کرتا تو اسے جاب بھی اچھی ملتی اور وہ جلد اس قابل ہو جاتا کہ اپنے گھر والوں کو عالیہ کا ہاتھ مانگنے کے لیے بھیج سکے۔ عالیہ کھاتے پیتے گھر کی لڑکی تھی جس کی ہر خواہش اس کے ماں باپ منہ سے نکلنے سے پہلے پوری کر دیتے تھے۔

امتحانات کے بعد اسے ہوش آیا تھا۔ آخری پیپر دے کر وہ سیدھا عالیہ کے گھر گیا تھا۔ وہ اس کی منتظر تھی۔ اس روز گھر میں کوئی نہیں تھا اور وہ اس سے اس طرح ٹوٹ کر ملی کہ اگر ریحان خود کو سنبھال نہ لیتا شاید اس روز اس کے قدم بہک جاتے۔ جب عالیہ ذرا اعتدال میں آئی تو اس نے کہا۔ ''اب میں اس وقت نہیں آؤں گا جب تم گھر میں اکیلی ہو گی۔''

وہ جھینپ گئی۔ ''پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔''

عالیہ کا یہ دوسرا سال تھا اور وہ چاہتی تھی کہ ریحان ٹیوشن جاری رکھے لیکن وہ اسے بتانے آیا تھا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ عالیہ پریشان ہوگئی۔ ''مگر کیوں؟''

''کیونکہ کل سے میں ایک کمپنی میں اپرنٹس کے طور پر جا رہا ہوں۔'' ریحان نے اسے بتایا۔ ''مجھے پیپرز کے دوران ہی جاب کی پیش کش ہو گئی تھی۔''

''تو اب تم میرے پاس نہیں آؤ گے؟'' وہ بولی۔ اکیلے میں وہ اس سے اسی طرح مخاطب ہوتی تھی اور دوسروں کے سامنے آپ جناب سے بات کرتی تھی۔

''آؤں گا کیوں نہیں لیکن تم خود سوچو کہ میں فل ٹائم جاب کرنے کے بعد تمہیں پڑھانے کیسے آسکوں گا۔ اور دوسرے میں چاہتا ہوں کہ جلد از جلد کسی اچھے مقام پر پہنچ جاؤں تاکہ جب میرے گھر والے تمہارا ہاتھ مانگنے آئیں تو تمہارے گھر والوں کے پاس انکار کی کوئی وجہ نہ ہو۔''

''تم لوگ اس علاقے سے تو نکلو۔'' عالیہ بولی۔ ''وہاں کا نام سن کر ہی تاثر خراب ہو جاتا ہے۔''

''تم فکر مت کرو۔ ابو نے یونیورسٹی کے پاس ایک اچھی سوسائٹی میں دو پلاٹ لے رکھے ہیں اور ایک آدھ سال میں ہم وہاں منتقل ہو جائیں گے۔''

عالیہ خوش ہو گئی۔ ''یہ تو اچھی بات ہے، تم لوگ قریب بھی آجاؤ گے۔''

خود ریحان کا بھی یہی خیال تھا۔ اس نے عالیہ سے کہا کہ وہ اپنی توجہ تعلیم کی طرف دے تاکہ اس کا گریڈ برقرار رہے۔ اسے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازمت ملی تھی۔ اسے عارضی ملازمت بھی کہا جا سکتا تھا اور اس کا ایم بی اے کا رزلٹ آنے پر اسے پکا کر دیا جاتا۔ اسے آغاز میں بہت اچھی تنخواہ ملی تھی۔ ظفر اور شبانہ سن کر حیران ہوئے تھے کیونکہ اتنی تنخواہ تو ظفر کی تیس سال کی ملازمت کے بعد بھی نہیں ہوئی تھی۔

''ابو اس کی وجہ تعلیم ہے۔'' ریحان نے فخر سے کہا۔ ''آپ انٹر کر کے ملازمت کرنے لگے تھے لیکن میں ماسٹر کر کے آیا ہوں اور ابھی مستقل ہو جاؤں گا تو تنخواہ بھی بڑھ جائے گی۔''

ظفر کی ریٹائرمنٹ قریب تھی اور اس کی ایک سال کی چھٹی شروع ہونے والی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ اس دوران میں ہی گھر بنوا لے گا۔ ریحان نے اسے مشورہ دیا۔ ''ابو آپ اپنے فنڈ کی رقم تو کہیں انویسٹ کر دیں اور ایک پلاٹ بیچ کر دوسرے پر گھر بنا لیں۔ وہ اچھی سوسائٹی ہے اب تو وہاں آبادی بھی ہو گئی ہے۔''

''وہ ٹھیک ہے برخوردار لیکن اتنی رقم میں گھر نہیں بنے گا۔''

''ابو جیسے ہی میں مستقل ہوں گا آپ بینک سے لون لے لیجیے گا اور میں اس کی قسطیں بھرتا رہوں گا۔''

ظفر کو اس کی بات اچھی لگی تھی۔ اس نے ایک پلاٹ فروخت کیا اور دوسرے پر گھر بنوانا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی اس نے بینک سے ایک لاکھ کا لون لے لیا تھا۔ اس دوران میں ریحان کا رزلٹ آگیا تھا اور اس نے پورے آئی بی اے میں دوسری پوزیشن لی تھی۔ اس کا پہلی پوزیشن لینے کا خواب تو پورا نہیں ہوا تھا لیکن دوسری پوزیشن بھی کم نہیں ہوتی ہے۔ اسے کمپنی نے فوری طور پر مستقل کر دیا تھا اور اس کی تنخواہ میں تقریباً ڈیڑھ گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ اب وہ اس قابل تھا کہ بہ آسانی بینک کی قسط دے سکتا.....اس کے اندر اطمینان

...بڑھتا جارہا تھا کہ کامیابی کی شاہراہ پر اس کا سفر جاری ہے

اور وہ اپنے راستے سے بھٹکا نہیں ہے۔

ظفر نے مکان بہترین طریقے سے مکمل کیا تھا۔ اس نے نیچے کا پورا پورشن بنوایا تھا۔ اب گھر کے تمام مکین سہولت سے رہ سکتے تھے۔

ریحان اور عالیہ کی ملاقاتیں جاری تھیں اور اب اس کے گھر والوں نے بھی ریحان کو مستقبل کے داماد کے طور پر قبول کر لیا تھا۔ اس لیے ان کو ریحان اور عالیہ کے ملنے اور کبھی کبھی گھومنے کے لیے باہر جانے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ بائیک لینے کے بعد ریحان اکثر عالیہ کو باہر بھی لے جاتا تھا۔ اس نے اپنے گھر والوں کو ابھی تک عالیہ کے بارے میں نہیں بتایا تھا لیکن اب اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ گھر میں بات کرے گا۔ نہ جانے کیوں اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اگر اس نے ابھی بات نہیں کی تو کوئی نہ کوئی مسئلہ ہو جائے گا اور وہ عالیہ کو آسانی سے حاصل نہیں کر سکے گا۔ اس دن وہ دفتر سے آیا تو شبانہ کا موڈ اچھا ہو رہا تھا۔ اس نے خود ہی ذکر چھیڑ دیا۔

''میں چاہتی ہوں کہ فرحی کا کوئی اچھا رشتہ آجائے تو میں تیرے لیے بھی کوئی لڑکی دیکھوں اور دونوں کی ساتھ شادی کر دوں' ایک بیٹی جائے تو ایک بہو آجائے۔''

''اگر یہی کام آپ باقی دو بیٹیوں کی شادی پر بھی کریں تو اس گھر میں تین بہویں آجائیں گی۔'' اس نے شرارت سے کہا۔

''اور گھر اکھاڑا بن جائے گا۔'' چھوٹی مونا نے لقمہ دیا۔ ''بے چارے بھائی تین تین سے کیسے نمٹیں گے۔''

شبانہ نے اسے گھورا۔ ''بڑوں کی باتوں میں دخل مت دے یہاں سے جا۔''

مونا منہ بنا کر گئی تو ریحان نے موقع غنیمت جان کر ماں سے کہا۔ ''امی اگر میں آپ کو لڑکی تلاش کرنے کی زحمت سے بچا لوں تو؟''

شبانہ چونکی۔ ''کیا مطلب؟''

''امی میرے ساتھ ایک لڑکی عالیہ پڑھتی تھی۔ مجھے اچھی لگی تھی لیکن میں نے آپ سے کہا نہیں۔ اب آپ نے خود کہا ہے تو میں نے سوچا آپ کو بتا دوں۔ اسے دیکھ لیں اور مناسب سمجھیں تو......'' اس نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ ماں کی نفسیات سمجھتا تھا اگر وہ عالیہ کو براہِ راست اپنی پسند بتاتا یا اس سے کوئی تعلق ظاہر کرتا تو شبانہ بدک جاتی۔

''تو اس سے ملتا ہے۔''

''نہیں امی بس یونیورسٹی میں دو تین بار ملاقات ہوئی تھی۔ اسے مدد کی ضرورت تھی۔''

''تب کیا کہہ سکتے ہیں۔ اگر اس کا رشتہ ہو گیا ہو؟''

''امی اس کے بارے میں معلوم کر سکتا ہوں' وہ ابھی یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ میرے جاننے والے ہیں ان کے توسط سے معلوم کر لوں گا۔''

شبانہ سوچتی رہی۔ ''اچھا معلوم کر لے۔''

ریحان خوش ہو گیا۔ اس نے آدھا معرکہ سر کر لیا تھا۔ اپنی پسند بھی بتا دی تھی اور ساری بات ماں پر بھی رکھ دی تھی۔ اس نے چند دن بعد عالیہ کے گھر کا پتا اس اطلاع کے ساتھ ماں کے حوالے کر دیا کہ اس کی ابھی کہیں انگیج منٹ نہیں ہوئی تھی۔ ساتھ میں فون نمبر بھی تھا۔ شبانہ نے پہلے اس کے گھر کال کی اور اس کی ماں سے بات کی۔ عالیہ کے گھر ریحان پہلے ہی سیٹنگ کر چکا تھا اس لیے عالیہ کی امی انجان بن کر ملیں اور جب شبانہ نے رشتہ لے کر آنے کو کہا تو انہوں نے جواب دیا۔

''بہن کیوں نہیں جہاں بیری ہوتی ہے وہاں پتھر تو آتے ہیں۔''

شبانہ نے طے کر لیا کہ وہ آنے والے اتوار کو ظفر کے ساتھ عالیہ کے گھر جائے گی۔ اس نے ظفر سے بات کی تو وہ بھی خوش ہو گیا تھا۔ ''بالکل اب ریحان کمانے والا ہو گیا ہے اس کی شادی میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ ہم بھی تو پوتے پوتیاں کھلائیں۔''

''انشاءاللہ۔'' شبانہ بولی۔

آنے والے اتوار کے دن وہ عالیہ کے گھر گئے۔ ظفر اور شبانہ کے ساتھ مونا بھی گئی تھی۔ عالیہ کے گھر والے یوں ملے جیسے وہ ریحان سے واقف نہ ہوں اور ان کے طرزِ عمل اور رکھ رکھاؤ نے شبانہ کو بہت متاثر کیا تھا۔ البتہ ظفر عالیہ کے باپ احسن شاہنواز کی کسٹم کی پوسٹ جان کر بدک گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ احسن کی تنخواہ اس کی ریٹائرمنٹ والی تنخواہ سے زیادہ نہیں ہوگی لیکن گلشن اقبال میں تقریباً چار سو گز پر بنا یہ مکان اور پھر اس کی آرائش بتا رہی تھی کہ وہاں رشوت کا مال آتا تھا۔ اس نے واپس آکر ریحان سے بھی یہ بات کہہ دی۔ ''ویسے تو سب ٹھیک ہے لڑکی بہت پیاری ہے اور گھر والے بھی اخلاق کے اچھے ہیں لیکن عالیہ کا باپ کسٹم میں ہے اور یقیناً رشوت لیتا ہے۔''

''اگر وہ رشوت لیتا ہے تو اس سے ہمارا کیا تعلق ہے؟'' شبانہ نے فوراً کہا۔ اسے عالیہ کے گھر نے بہت متاثر

کیا تھا۔

''ہمارا تعلق یوں ہے کہ ان کی بیٹی ہمارے گھر آئے گی اور یاد رکھو جو اولاد حرام پر پالی گئی ہو اس سے بھلائی کی توقع نہیں کی جاسکتی ہے۔''

''ابو آپ پرانے دور کی بات کر رہے ہیں۔'' ریحان جلدی سے بولا۔ ''آج کل ان باتوں کو کون مانتا ہے۔''

''ماننے کی بات نہیں ہے۔ بیٹے یہ آزمائی ہوئی بات ہے۔ حرام کبھی گھر نہیں بساتا ہمیشہ اجاڑتا ہے۔''

''چھوڑیں جی ہمیں تو اپنے بیٹے کی خوشی دیکھنی ہے۔'' شبانہ بولی۔

''بس یہی سوچ کر چپ ہوں۔'' ظفر نے سرد آہ بھری۔

یوں عالیہ اور ریحان کا رشتہ طے پا گیا۔ عالیہ کا فائنل قریب تھا۔ طے پایا کہ اس کے بعد وہ تاریخ طے کر دیں گے۔ ریحان بہت خوش تھا۔ اس نے ایک اور کامیابی حاصل کر لی تھی۔ دوسری طرف ظفر فکر مند تھا۔ اس نے شبانہ سے کہا۔ ''تم فرحی کے لیے جلد کوئی رشتہ دیکھو بلکہ ہو سکے تو نعمانہ کے لیے بھی ابھی سے تلاش شروع کر دو۔''

''کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ فرحی تو بی اے کرنے والی ہے لیکن نعمانہ ابھی انٹر میں ہے۔''

''جب تک فرحی کی شادی سے فارغ ہوں گے، یہ بھی بی اے فائنل میں آجائے گی۔'' ظفر بولا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ ریحان کی شادی کے دو سال کے اندر یہ دو بیٹیاں تو رخصت کر دیں۔ باقی مونا بچے گی تو اس کا بھی کر دیں گے۔''

''اللہ خیر کرے ہم بیٹے کی شادی کر رہے ہیں یا اس سے ہاتھ دھو رہے ہیں۔''

''نہیں ایسی بات نہیں ہے۔'' ظفر نے اسے ٹالا۔ ''بس ایسے ہی میرے ذہن میں آگیا تو تم سے کہہ دیا۔ دیکھو نا زندگی موت کا کیا بھروسا ہم آج ہیں کل نہیں اس لیے اپنے بچوں کی خوشیاں اپنے سامنے ہی دیکھ لیں۔''

''اچھا میں دیکھتی ہوں۔'' شبانہ نے سوچتے ہوئے کہا۔

کچھ دن بعد ظفر کے توسط سے ہی فرحی کا ایک رشتہ آ گیا۔ لڑکا زاہد دبئی میں تھا۔ زاہد کے باپ نے کہا کہ وہ بیٹے اور بیٹی کا رشتہ ایک ہی جگہ کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ظفر نے اسے فوراً بتا دیا کہ یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ وہ اپنے بیٹے کا رشتہ طے کر چکے ہیں۔ اس لیے بدلے کا رشتہ تو ممکن نہیں تھا۔ ہاں وہ اپنے بیٹے کے لیے ان بیٹی کا رشتہ لینا چاہے تو بات ہو سکتی ہے۔ زاہد کی ماں بدلے میں شادی کرنا چاہ رہی تھی لیکن جب زاہد کے باپ نے اس پر زور دیا تو وہ مان گئی۔ یوں وہ فرحی کے لیے رشتہ لے کر آئے تھے۔ ان کی طرف سے ہاں ہو گئی۔ زاہد کے گھر والوں کو جلدی تھی لیکن شبانہ اور ظفر بیٹے اور بیٹی کی شادی ایک ساتھ کرنا چاہ رہے تھے۔

عالیہ کے گھر والے اتنی جلدی شادی پر رضامند نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ عالیہ بھی ایم بی اے مکمل کر لے، اس کے بعد اس کی شادی کریں۔ لیکن ابھی تو اس کا بی اے بھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ اس کا فائنل سمسٹر باقی تھا۔ ریحان نے عالیہ سے ملاقات کی۔ ''یہ کیا حرکت ہے؟'' اس نے برہمی سے کہا تو عالیہ انجان بن گئی۔

''کون سی حرکت؟''

''یہ کہ تم ابھی ایم بی اے کرو گی اور اس کے بعد تمہاری شادی کی جائے گی۔''

''ہاں تو اس میں حرج کیا ہے۔ تین سال کی تو بات ہے۔''

''عالی تین سال میرے لیے بہت بڑی مدت ہے، میں اتنا صبر نہیں کر سکتا۔''

''تو پھر کیا کیا جائے کیونکہ مجھے ایم بی اے تو کرنا ہے۔''

''تم بس بی اے کر لو کافی ہے۔''

''مجھے ایم بی اے کرنا ہے تم کیا سمجھتے ہو یہ میرے ماں باپ کی خواہش ہے۔ وہ تو چاہتے ہیں کہ ایک سال کے اندر مجھے رخصت کر دیں۔''

ریحان چونکا۔ ''تو کیا یہ تمہاری خواہش ہے؟''

''آف کورس ...... میں ایم بی اے کرنا چاہتی ہوں۔''

''لیکن اس کے لیے تین سال کی مدت چاہیے۔''

''اس مسئلے کا حل تم نکالو میں نے تم کو بتا دیا ہے۔'' وہ بے نیازی سے بولی۔ ریحان دیر تک اس کے ساتھ سر کھپاتا رہا لیکن وہ اپنی بات سے ایک انچ بھی نہیں ہٹی تھی۔ اُدھر شبانہ کو پتا چلا تو وہ غصے میں آ گئی تھی۔ اس نے ظفر سے کہا۔

''یہ کیا مذاق ہے۔ کیا ہم چار سال تک بیٹے کی شادی لٹکائے رکھیں گے۔''

لیکن ظفر سوچ رہا تھا کہ ایک طرح سے یہ اچھا ہے۔ اس نے شبانہ سے کہا۔ ''دیکھو لڑکی ان کی ہے اور ابھی وہ اس کے فیصلے کر سکتے ہیں۔''

''میں ریحان اور فرحی کی شادی ایک ساتھ کرنا چاہتی ہوں۔''

''دیکھو ابھی تم فرحی کو رخصت کر دو۔ ریحان کی شادی بعد میں دیکھی جائے گی۔''

''میں اپنے بیٹے کی شادی کہیں اور کر دوں گی۔''

''میں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔ شریف لوگ زبان دے کر واپس نہیں لیتے ہیں۔ پھر یہ ریحان کی پسند بھی ہے اور اس تاخیر میں قربانی بھی اسے دینا ہی پڑے گی۔''

ظفر کے فیصلہ کن لہجے نے شبانہ کو مجبور کر دیا کہ وہ اس معاملے میں کوئی قدم نہ اٹھائے۔ پھر اس نے غور کیا تو اسے ظفر کی بات درست لگی تھی۔ اس شادی میں تاخیر عالیہ کے گھر والوں کی طرف سے تھی اور عالیہ، ریحان کی پسند تھی۔ اس لیے ان کی ذمے داری نہیں بنتی تھی۔ شبانہ نے زاہد کے گھر والوں کو گرین سگنل دے دیا کہ وہ آ کر تاریخ دے سکتے ہیں۔ ریحان کو پتا چلا تو اس نے ماں سے کہا۔

''امی آپ نے تو کہا تھا کہ آپ میری اور فرحی کی شادی ایک ساتھ کریں گی۔''

''تو بیٹا اس میں قصور تمہارے سسرال کا ہے۔ وہ بیٹی کو بیاہنے کے بجائے پڑھانے کے شوقین ہیں۔'' شبانہ نے طنز کیا۔ ''اب میں اپنی بچی کو چار سال گھر تو بٹھائے نہیں رکھ سکتی۔''

شبانہ کی بات مدلل تھی اس لیے ریحان خاموش ہو گیا۔ اس نے خود کو تسلی دی کہ فرحی کے ساتھ نہ سہی کچھ عرصے بعد اس کی شادی ہو ہی جائے گی۔ وہ عالیہ کو منانے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ اس کے ذہن میں ایک خیال آیا تھا کہ عالیہ بی اے کے بعد شادی کر لے تو وہ شادی کے بعد اسے ایم بی اے کرا دے گا۔ آج کل عالیہ سے اسی تجویز پر بات ہو رہی تھی اور وہ کسی قدر راضی بھی تھی۔ اس دوران میں انہوں نے فرحی کی شادی کر دی تھی۔ اس کی شادی ہوتے ہی عالیہ اچانک ہی مان گئی تھی۔ ریحان خوشی سے اچھل پڑا لیکن جب اس نے ماں باپ کو بتایا تو وہ پریشان ہو گئے۔

''بیٹے ابھی تو ہم ایک شادی بھگتا کر بیٹھے ہیں۔ بار بار شادی کرنا آسان تھوڑی ہے۔'' ظفر نے کہا۔

''ابو آپ لوگوں نے بیٹی کی شادی بھی تو کی ہے پھر میری کرنے میں کیا مسئلہ ہے۔''

''تمہیں اندازہ نہیں ہے۔ شادی میں زیادہ خرچ آنے جانے والوں اور برات و ولیمے کے کھانے میں ہوتا ہے۔ یہ سب دوبارہ سے کرنا بہت مشکل ہے۔ اگر یہ لوگ فرحی کے موقع پر راضی ہو جاتے تو ہمیں صرف تمہاری تیاری کرنا پڑتی۔ اب سب نئے سرے سے کرنا ہو گا۔''

ریحان کا موڈ خراب ہو گیا تھا کہ ان لوگوں کو بیٹی کی شادی میں خرچ کرنا برا نہیں لگ رہا تھا اور بیٹے کی شادی کرتے ہوئے ان کو اخراجات کی فکر ستا رہی ہے۔ اس نے کہا۔ ''آپ لوگ شادی کی تیاری کریں اور اخراجات کی فکر مت کریں، وہ میری ذمے داری ہے۔''

''بیٹا ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ تم ہماری ذمے داری نہیں ہو۔'' ظفر نے کہنا چاہا لیکن وہ اس کی بات سنے بغیر وہاں سے اٹھ گیا تھا۔ شبانہ اور ظفر ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے تھے۔ پھر ریحان نے کسی طرح سے رقم کا بندوبست کر لیا تھا۔ اور فرحی کے چھ مہینے بعد دھوم دھام سے اس کی شادی بھی ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے لیے مکان کا اوپر کا پورا پورشن لے لیا تھا۔ دو کمروں کے علاوہ اس نے ایک لاؤنج جیسا بنا لیا اور عالیہ کا جہیز یہیں آیا تھا۔ اس کے جہیز میں ہر شے تھی بلکہ کون سی چیز تھی جو اس کے باپ نے نہیں دی تھی۔ حد یہ کہ اس نے ریحان کو سلامی میں نئے ماڈل کی نسان سنی کار دی تھی۔ دیکھنے والے عالیہ کے جہیز سے متاثر تھے۔ خاص طور سے شبانہ کے سارے شکوے دور ہو گئے تھے۔

''بہو کتنا اچھا جہیز لائی ہے۔'' اس نے ظفر سے کہا۔

''بیگم ہمیں اس کے جہیز کی نہیں، اس کے اخلاق اور خدمت گزاری کی ضرورت ہے۔ دیکھو وہ بھی لائی ہے یا نہیں۔''

مگر خدمت گزاری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ شادی کے بعد ریحان اور عالیہ دو ہفتے کے لیے ہنی مون پر روانہ ہوئے تھے اور وہاں سے واپس آئے تو عالیہ کی ایم بی اے کی کلاسز شروع ہو گئی تھیں۔ اس نے یا ریحان نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی تھی۔ اس لیے جب پہلے دن عالیہ ریحان کے ساتھ جانے کے لیے نکلنے لگی تو سب حیران رہ گئے۔ ریحان نے کھسیا کر ماں باپ کو بتایا کہ عالیہ ایم بی اے کر رہی ہے۔ ظفر نے ضبط سے کام لیا۔ اس نے کہا۔ ''بیٹا پڑھنا تو اچھی بات ہے لیکن ہم بڈھے بڑھیا اور بہنوں کو بھی اس خوشی میں شریک کر لیتے تو کیا حرج تھا۔''

''انکل آنٹی میں نے سوچا کہ آپ کو سرپرائز دوں گی۔'' عالیہ جلدی سے بولی۔

''خوش رہو بیٹے۔'' ظفر نے دعا دی۔

ریحان کو دیر ہو رہی تھی، اسے پہلے عالیہ کو چھوڑنا تھا۔ اس کے بعد وہ خود دفتر جاتا۔ اس کے بعد روز دونوں صبح ناشتا کر کے نکل جاتے تھے۔ اس کے بعد عالیہ خود آجاتی تھی۔ کبھی وہ رکشا کر لیتی تھی اور کبھی یونیورسٹی پوائنٹ سے آجاتی تھی۔ ساڑھے تین بجے گھر آ کر وہ کھانا کھا کر اپنے پورشن میں چلی جاتی اور سو جاتی یا کچھ اور کرتی رہتی تھی لیکن نیچے نہیں آتی تھی۔ جب شام کو ریحان کے آنے کا وقت ہوتا تو اٹھ کر تیار ہوتی تھی اور ریحان کے آنے کے بعد وہ دونوں کہیں گھومنے کے لیے نکل جاتے تھے۔

ظفر اور شبانہ نے اس بات کو زیادہ محسوس نہیں کیا تھا کیونکہ ابھی تو شادی کے ابتدائی دن تھے اور جوڑے ان دنوں میں گھومتے پھرتے بھی ہیں لیکن جب شادی کے چھ مہینے بعد بھی یہی روٹین برقرار رہی تو ایک دن شبانہ نے ان لوگوں کو ٹوک دیا۔

''ریحان، عالیہ کبھی تم لوگ گھر میں ہمارے پاس بھی بیٹھ جایا کرو۔''

عالیہ نے بُرا سا منہ بنایا تھا اور ریحان بولا۔ ''امی ہفتے میں تین چار بار ہی تو باہر جاتے ہیں۔ باقی دن گھر میں ہوتے ہیں۔''

''میں باہر جانے کا نہیں کہہ رہی جب گھر میں ہوتے ہو تب بھی اوپر ہی بیٹھے رہتے ہو۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ میں ریحان کو آپ لوگوں سے ملنے نہیں دیتی۔'' عالیہ تلملا کر بولی۔ ''دیکھ رہے ہیں آپ اِن کو۔'' اس نے ریحان سے کہا اور پاؤں پٹختی ہوئی اوپر واپس چلی گئی۔

ریحان نے ماں کو دیکھا۔ ''آپ نے اس کا موڈ خراب کر دیا۔''

''بیٹا تم کو بیوی کے موڈ کی اتنی پروا ہے اور ماں باپ اور بہنوں کا خیال ہی نہیں ہے۔'' شبانہ بولی۔ اسے بھی غصہ آگیا۔

''امی پلیز ابھی ہماری نئی نئی شادی ہوئی ہے اور آپ نے ٹوکنا شروع کر دیا۔'' ریحان نے تلخ لہجے میں کہا اور بیوی کے پیچھے اوپر چلا گیا۔

''شبانہ تم ان کے معاملات میں دخل مت دیا کرو۔'' ظفر نے کہا۔

''ارے واہ کیوں نہ دیا کروں، ہم نے بیٹا بیچ تو نہیں دیا ہے اسے۔''

''احمق عورت کیا تم نے اپنے بیٹے کا رویّہ نہیں دیکھا۔ شادی کے پہلے دن سے وہ ہم سے کٹ گیا ہے۔ اب وہ ہمارا برائے نام رہ گیا ہے اپنی بیوی کا ہو گیا ہے۔''

''میں نہیں مانتی۔''

''نہ مانو...... لیکن میں اسی دن سے ڈر رہا تھا۔ مال حرام انسان سے سب سے پہلے مثبت جذبات چھین لیتا ہے۔ مجھے عالیہ سے اسی بات کی توقع تھی۔ ابھی تو دیکھنا آگے کیا ہوتا ہے۔''

''کیا کہہ رہے ہیں۔'' شبانہ خوف زدہ ہو گئی۔ ''کیا وہ ہم سے ہمارا بیٹا چھین لے گی؟''

''وہ ریحان کو چھین چکی ہے۔ اسی وجہ سے میں کہہ رہا تھا کہ پہلے تم بیٹیوں کی شادی کر دو۔ نعمانہ کے لیے کوئی رشتہ تلاش کرو۔''

''ایک رشتہ تو ہے۔'' شبانہ بولی۔ ''آپ سے ذکر کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ بلّو آپا کو جانتے ہیں۔ ان کی نند اپنے بیٹے کے لیے نعمانہ کو لینا چاہتی ہے۔''

''دیکھ لو اگر تمہیں مناسب لگتا ہے تو بات آگے بڑھاتے ہیں۔''

''بات کرتی ہوں اور اب میں اس نواب زادی کی روٹی ہانڈی نہیں کروں گی۔''

''احمقانہ باتیں مت کرو۔ گھر اس کے شوہر کی تنخواہ سے چل رہا ہے اور وہ کھاتی ہی کیا۔ ناشتا ریڈی میڈ کرتی ہے اور شام کو بھی اکثر باہر ہی کھاتے ہیں۔ تمہیں صرف دوپہر کا کھانا بنانا پڑتا ہے۔''

بات شبانہ کی سمجھ میں آگئی اور وہ اس معاملے میں چپ ہو گئی لیکن عالیہ نے یہ بات سوچ لی تھی۔ اگلے مہینے سے پہلے ریحان نے شبانہ کو بتایا۔

''امی، عالیہ اپنا کچن الگ کر رہی ہے۔''

''کیوں یہاں کیا مسئلہ ہے؟''

''مسئلہ کوئی نہیں ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ گھر کا کوئی کام نہیں کرتی ہے اس لیے آپ پر اپنا اور میرا بوجھ بھی ڈالنا نہیں چاہتی ہے۔''

شبانہ نے ریحان کو کچن الگ کرنے سے روکنا چاہا لیکن وہ دونوں فیصلہ کر چکے تھے۔ اس لیے آنے والے مہینے سے عالیہ نے کھانا اوپر بنانا شروع کر دیا بلکہ کھانا بھی کیا بنتا تھا۔ صبح پہلے کی طرح ریڈی میڈ ناشتا ہوتا تھا اور دوپہر میں وہ اپنے لیے کچھ ہلکا پھلکا بنا لیتی تھی یا یونیورسٹی کینٹے سے کچھ لے کر آتی تھی۔ شام کو بھی وہ بہت کم بناتی تھی۔ زیادہ تر باہر سے آتا تھا یا وہ خود کھانے کے لیے باہر چلے جاتے تھے۔

جب ریحان نے خرچ کے لیے رقم دی تو وہ پہلے سے آدھی تھی۔ شبانہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

''بیٹا اتنے میں کیا ہو گا؟''

''امی اب اوپر کا کچن بھی تو ہے۔ اس کے اخراجات نہیں ہوں گے کیا؟'' ریحان نے بے پروائی سے کہا۔

''تم دو لوگ ہو کتنا خرچ ہو جائے گا اور زیادہ تر تو تمہارے ہاں باہر سے آتا ہے۔''

''وہ زیادہ مہنگا پڑتا ہے۔ باہر سے کھانا کون سا سستا پڑتا ہے۔''

''تو بیٹا کیا گھر میں نہیں پکتا تھا۔''

''امی اصل میں عالیہ کو وہ چیزیں کھانے کی عادت نہیں ہے جو ہمارے ہاں بنتی ہیں۔'' ریحان نے ہچکچا کر کہا۔

''جیسے تمہاری مرضی۔'' شبانہ بے دلی سے بولی۔ ''لیکن اتنے میں تو گزارا مشکل ہے۔''

''ابو کی پنشن بھی تو ہے اور پھر سرٹیفکیٹ سے جو نفع آتا ہے۔'' ریحان نے دبی زبان میں کہا۔

''ریحان تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ آدھے سرٹیفکیٹ تو فرحی اور تمہاری شادی کے لیے کیش کرا لیے تھے۔''

''میری شادی۔'' ریحان کا منہ بن گیا۔ ''اس میں آپ لوگوں نے کیا خرچ کیا؟''

''تم دو لاکھ دے کر فارغ ہو گئے تھے۔ یہ تو تمہارے ابو ہیں جنہوں نے تمام چیزیں پوری کیں۔ ان کے بھی لاکھ روپے لگے تھے۔''

''تو کیا آپ اب اس کا احسان جتائیں گی۔'' ریحان نے کہا اور پاؤں پٹختا اوپر چلا گیا۔ ظفر باہر گیا ہوا تھا وہ آیا تو شبانہ نے اسے ساری بات بتائی، وہ فکر مند ہو گیا تھا۔

''ریحان کو احساس نہیں ہے کہ ہم مشکل میں پڑ جائیں گے۔''

''اسے احساس ہوتا تو یہ بات ہی نہ کرتا، خیر اللہ مالک ہے گزارا ہو جائے گا۔''

''کیسے ہو گا؟''

''بس ہو جائے گا اب ریحان سے کچھ مت کہنا۔ مجھے لگ رہا ہے کہ عالیہ کا مقصد جھگڑا کرنا ہے اور پھر وہ ریحان کو ہم سے الگ کر دے گی۔''

شبانہ تلخ ہو رہی تھی۔ ''اگر اس نے سوچ لیا ہے تو وہ ضرور الگ ہو جائے گی۔''

''بس دعا کرو کہ اس وقت تک ہم اپنی ذمے داریوں سے سبک دوش ہو جائیں۔'' ظفر بولا۔ ''تم ریحان اور عالیہ کے چکر میں پڑنے کے بجائے نعمانہ کے رشتے کی بات آگے کرو۔''

ریحان کو دو مہینے پہلے پروموشن ملی تھی اور اس کی تنخواہ میں بھی اضافہ ہوا تھا لیکن اس نے اپنے گھر والوں کو نہیں بتایا تھا۔ اسی طرح اس نے ان کو یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ اس نے شادی کے موقع پر دو لاکھ لیے تھے۔ وہ اصل میں قرض نہیں تھا بلکہ اس کے سسر نے اسے یہ رقم دی تھی پھر سلامی میں کار دی تھی۔ وہ تو سسرال کے احسانات تلے دب گیا تھا اور اب وہ مجبور تھا کہ عالیہ کی ہر بات مانے۔ عالیہ نے اس سے کچن الگ کرنے کو کہا وہ مان گیا۔ عالیہ کے کہنے پر اس نے ماں کو دی جانے والی رقم آدھی کر دی تھی۔ اب عالیہ اس سے الگ ہونے کو کہہ رہی تھی مگر ریحان اس کے لیے تیار نہیں تھا۔

''تمہیں پتا ہے کہ آج کل کسی اچھی جگہ کے کرائے کتنے زیادہ ہو گئے ہیں۔''

''تم افورڈ تو کر سکتے ہو۔'' عالیہ مچل کر بولی۔ ''میری خاطر۔''

ریحان نے پیار سے اسے دیکھا۔ ''سب تمہارے لیے تو کر رہا ہوں۔''

''تب میری بات مان جاؤ۔''

''ابھی نہیں میری جان...... میں نے دو پلاٹ لیے ہوئے ہیں، ان کی قسطیں ادا کر رہا ہوں اور مزید ایک پلاٹ کیش پر لینے کا پروگرام ہے۔''

''کیا کرو گے اتنے پلاٹ لے کر؟''

''تمہیں نہیں پتا آنے والے وقت میں زمین سونا ہو جائے گی۔ جو پلاٹ آج پچیس ہزار کا ہے وہ دس پندرہ سال بعد پچیس لاکھ کا ہو جائے گا۔''

''اتنا فرق۔'' عالیہ حیرت سے بولی۔

''ہاں اتنا فرق آئے گا۔ آج جو زمین جائداد بنا لے گا، وہ آنے والے وقت میں کروڑ پتی ہو جائے گا۔''

عالیہ نے پھر اس سے اصرار نہیں کیا تھا لیکن وہ ایک دوسرے چکر میں لگ گئی تھی۔ اس کے باپ کا گلشن میں ہی ایک عالی شان اپارٹمنٹ تھا۔ اس نے اسے کرائے پر دے رکھا تھا۔ اب وہ اسے کرائے دار سے خالی کرا رہا تھا۔ عالیہ اس فکر میں تھی کہ باپ سے یہ فلیٹ حاصل کر لے اور ریحان سمیت وہاں منتقل ہو جائے۔ مگر ابھی فلیٹ خالی نہیں ہوا تھا۔

اس نے پہلا سمسٹر دے دیا تھا اور شادی کے ساتویں مہینے اس کی طبیعت خراب ہوئی تھی۔ اس نے زیادہ توجہ نہیں دی تھی لیکن ایک مہینے بعد وہ چونک گئی تھی۔ اس نے ریحان کو اپنا مسئلہ بتایا۔ ''مجھے لگ رہا ہے میں امید سے ہوں۔''

''سچ۔'' ریحان خوش ہو گیا۔

عالیہ نے منہ بنایا تھا۔ ''میں نے کیا کہا تھا جب تک میں ایم بی اے نہیں کر لیتی ایسا کوئی چکر نہیں ہوگا۔''

''لیکن اب تو ہو گیا ہے۔''

''میں ابارشن کروا لوں گی۔'' عالیہ بولی تو ریحان پریشان ہو گیا کیونکہ اسے بچے کی خواہش تھی۔ وہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا اور اس نے بتایا کہ عالیہ دو مہینے کی امید سے ہے اس وقت بچہ ضائع کرنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ عالیہ کی جان کو تو خطرہ نہیں تھا لیکن اسے اندرونی پیچیدگیوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا۔ ڈاکٹر نے ابارشن نہ کروانے کا مشورہ دیا جو عالیہ نے بادلِ ناخواستہ قبول کر لیا تھا۔ شبانہ اور ظفر کو پتا چلا تو وہ بھی خوش ہو گئے۔ ان کو پتا نہیں تھا کہ عالیہ الگ ہونے کا سوچ رہی تھی۔ ریحان نے اسے سمجھایا۔

''ابھی الگ ہونے کا مت سوچو کیونکہ تمہیں امی کی مدد کی ضرورت ہے اور جب بچہ ہو جائے گا تو اسے سنبھالنے کے لیے ان کی مدد کی زیادہ ضرورت ہوگی۔''

عالیہ مجبوری میں یہ بات بھی مان گئی۔ وہ اس حالت میں بھی یونیورسٹی جاتی تھی اور اس نے شبانہ کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا کہ وہ فی الحال پڑھائی چھوڑ دے۔ صبح تو ریحان اسے چھوڑ جاتا تھا لیکن واپسی میں اسے مشکل ہوتی تھی۔ اس حالت میں بسوں میں آنا پڑتا تھا کیونکہ رکشے میں بیٹھنا منع تھا۔ ریحان نے اس مشکل کا حل یہ نکالا کہ کار اس کے حوالے کر دی اور خود حسبِ سابق بائیک پر جانے لگا۔

نعمانہ کے رشتے کی بات طے ہو گئی تھی اور اس کے گریجویشن کے بعد شادی طے پائی تھی۔ ابھی وہ فائنل میں آئی تھی۔ لیکن شبانہ نے ابھی سے اس کے لیے چیزیں بنانا شروع کر دی تھیں۔ وہ انتظار کر رہی تھی کہ کب ریحان اور عالیہ اس معاملے میں دلچسپی لیتے ہیں لیکن ان کی طرف مکمل خاموشی تھی۔ ایک دن شبانہ نے ریحان کو دفتر سے آنے کے بعد اوپر جاتے ہوئے روک لیا۔ ''بیٹے، نیچے تمہارے ماں باپ اور بہنیں بھی رہتی ہیں کبھی دو گھڑی ہمارے پاس بھی رک جایا کرو۔''

''بس ان طنزیہ باتوں کی وجہ سے میرا دل نہیں کرتا ہے۔'' وہ اکھڑے لہجے میں بولا۔

''چلو بات نہ کرو لیکن تمہیں یہ تو معلوم ہے کہ نعمانہ کا رشتہ طے کر دیا ہے اور اب اس کے لیے تیاری کر رہی ہوں۔''

''جی معلوم ہے۔''

''تو بڑے بھائی ہونے کی حیثیت سے......''

''امی ابھی تو میں وہ قرض بھی ادا نہیں کر سکا ہوں جو میں نے اپنی شادی پر لیا تھا۔'' اس نے ماں کی بات کاٹ کر کہا۔ ''فی الحال تو میں کچھ نہیں کر سکتا۔''

شبانہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ''تو تم کچھ نہیں کرو گے؟''

''امی میں اپنی پوزیشن بتا چکا ہوں۔ دو سال سے پہلے میں کہیں سے قرض بھی نہیں لے سکتا۔ میں بہت ٹائٹ ہوں۔''

''اپنی بیوی کے لیے تو تم ٹائٹ نہیں ہو۔'' شبانہ کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

''امی پلیز...... ہر بات میں عالیہ کو مت لے آیا کریں۔''

شبانہ پریشان ہو گئی۔ ''ریحان تم اپنے ماں باپ کی قربانیوں کا یہ صلہ دے رہے ہو؟''

''قربانیاں۔'' ریحان نے تلخی سے کہا۔ ''کون سی قربانیاں...... میں نے تعلیم اپنے بل بوتے پر حاصل کی، اس میں آپ لوگوں کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ میری ترقی میں آپ لوگوں کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ تو کون سی قربانیوں کی بات کر رہی ہیں۔''

شبانہ کا ضبط جواب دے گیا۔ ''تم جس گھر میں رہ رہے ہو وہ تمہارے باپ کا ہے۔''

ریحان ہنسا۔ ''اچھا کیا آپ نے یاد دلا دیا کہ یہ گھر میرا نہیں ہے۔ فکر مت کریں جلد آپ کا یہ احسان بھی اتار دوں گا۔''

اس دوران میں ظفر وہاں آ گیا تھا۔ اس نے ریحان کی بات سن کر برہمی سے کہا۔ ''یہ تم اپنی ماں سے کس لہجے میں بات کر رہے ہو؟''

''یہ تو ان سے پوچھیں، ان کا کہنا ہے کہ آپ نے مجھے اس گھر میں رکھ کر احسان کیا ہے۔''

''بکواس مت کرو بدتمیز۔'' شبانہ نے اسے تھپڑ مار دیا۔ ''اپنی ماں پر غلط الزام لگاتے ہو۔''

ریحان نے ایک نظر ماں باپ کو دیکھا اور اوپر چلا گیا۔ ظفر نے سر تھام لیا۔ ''شبانہ یہ تم نے کیا کیا ہے؟ جوان

بیٹے کے ساتھ ایسا کرتے ہیں۔''

''آپ جوان بیٹے کی باتیں سنیں۔ شادی کیا ہوئی ہے ماں باپ بہنوں سب کی ذمے داری سے ہاتھ جھاڑ دیا ہے۔ کہہ رہا ہے کہ نعمانہ کی شادی میں وہ کچھ نہیں کرے گا کیونکہ ابھی اس کا قرض نہیں اترا ہے۔''

ظفر بھی چند لمحے کے لیے ساکت رہ گیا۔ پھر اس نے شانے جھٹکے۔ ''اس سے مت الجھو، اللہ بہتر کرنے والا ہے۔''

''ہم نعمانہ کی شادی کس طرح کریں گے؟''

''میرے پاس جو آخری سرٹیفکیٹ ہیں وہ بیچ دوں گا۔''

''اس سے ہو جائے گا۔''

''ہم ذرا سادگی سے بھی شادی کر سکتے ہیں۔'' ظفر بولا۔ ''ضروری نہیں ہے زیادہ دھوم دھڑکا کیا جائے۔''

''اور اس کے بعد ہم کیا کریں گے؟''

''میں نے کہا نا اللہ مالک ہے۔ تم فکر مت کرو۔''

اوپر عالیہ نے شبانہ کے چلّانے کی آواز سن لی تھی۔ کچھ دیر بعد ریحان لال چہرہ لیے اوپر آیا اور اس نے آتے ہی کہا۔ ''عالی اب ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ اگر تمہارے پاپا کا فلیٹ خالی نہیں ہوا ہے تو ہم کہیں اور شفٹ ہو جاتے ہیں۔''

عالیہ کھل اٹھی تھی۔ اپنی حالت کے باوجود اس کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ کسی طرح سسرال سے الگ ہو جائے۔ ''فلیٹ تو دو مہینے ہوا خالی ہے۔ وہ تو تم نے منع کر دیا تھا۔ میں ابھی پاپا سے بات کرتی ہوں۔''

عالیہ نے اپنے باپ سے بات کی اور اس نے فوراً فلیٹ اسے دینے کی ہامی بھر لی لیکن کچھ چھوٹے موٹے کام تھے ان کو ایک ہفتہ لگ جاتا۔ عالیہ نے ریحان کو بتایا تو اس نے کہا۔ ''بس ہم ایک ہفتے بعد یہاں سے جا رہے ہیں۔''

''آخر ہوا کیا ہے؟''

ریحان نے اسے بتایا تو وہ بولی۔ ''تم نے کیا ٹھیکا لے رکھا ہے کہ گھر بھی چلاؤ۔ اپنی شادی بھی خود کرو اور بہنوں کی شادی بھی تمہاری ذمے داری بنا دی جائے۔''

''امی کا خیال ہے وہ اس گھر میں رکھ کر مجھ پر احسان کر رہی ہیں۔''

''یہ گھر۔'' عالیہ نے حقارت سے کہا۔ ''پاپا کا فلیٹ اس پورے گھر سے بڑا ہے۔ ہمیں تو وہاں کے لیے اور سامان لینا ہوگا۔''

''تم فکر مت کرو سب ہو جائے گا بس ایک بار یہاں سے جان چھوٹ جائے۔''

اس ایک ہفتے تک ریحان نے کسی سے بات نہیں کی تھی۔ جب اسے فلیٹ کی چابی مل گئی تو وہ ماں باپ کو یہ بتانے آیا تھا کہ وہ اور عالیہ یہاں سے جا رہے تھے۔ شبانہ پریشان ہو گئی۔ ''کہاں جا رہے ہو؟''

''کہیں بھی جا رہے ہوں، آپ کو کیا بس آپ کے گھر سے جا رہے ہیں۔ کیا یہ کافی نہیں ہے؟''

''بیٹے اگر تمہاری امی نے کچھ کہہ دیا تو اسے اتنا سیریس لینے کی کیا بات ہے، یہ تمہاری ماں ہیں۔'' ظفر نے نرمی سے کہا۔

''سوری ابو، امی نے جو کہا ہے اس نے میرا دل توڑ دیا ہے۔'' ریحان نے اکھڑے لہجے میں کہا۔ ''آپ دونوں کے لیے بس بیٹیاں ہی سب کچھ ہیں اور میری اس گھر میں یہ حیثیت ہے کہ مجھے رکھ کر احسان کیا جا رہا ہے۔ میں آج آپ کا یہ احسان اتار کر جا رہا ہوں۔''

ظفر اور شبانہ نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ تو طے کر چکا تھا۔ ان کو نہیں پتا تھا کہ وہ اپنے سسر کے فلیٹ میں جا رہا ہے۔ وہ تو پریشان تھے کہ مالی لحاظ سے ٹائٹ ہونے کے باوجود اسے اب کرایہ بھی دینا ہوگا۔ ظفر نے اس حد تک کہا کہ وہ اس سے کچھ نہیں چاہتے۔ وہ جو مہینے کا دیتا ہے بے شک وہ بھی نہ دے، مگر گھر چھوڑ کر نہ جائے۔ ریحان ان کی باتیں سنے بغیر ہی وہاں سے چلا گیا تھا۔ اسی روز وہ ٹرک اور مزدور لایا اور سارا سامان ٹرک پر لوڈ کرا کر چلا گیا۔ عالیہ پہلے ہی دو دن سے ماں باپ کے گھر تھی۔ اس روز ظفر کو لگ رہا تھا کہ ان کے گھر کوئی میت ہو گئی ہے۔ جب جوان بیٹا گھر چھوڑ کر چلا جائے تو شاید ایسا ہی ماتمی ماحول بنتا ہے۔ شبانہ اپنے کمرے میں منہ لپیٹے پڑی تھی اور لڑکیاں اپنے کمرے میں آنسو بہا رہی تھیں۔

ریحان اور عالیہ اس لگژری قسم کے فلیٹ میں آ کر بہت خوش تھے۔ طبیعت کی خرابی کے باوجود عالیہ، ریحان کے ساتھ... جا کر مزید فرنیچر لے کر آئی تھی اور یہ خاصا مہنگا پڑا تھا لیکن عالیہ کی خوشی کی خاطر ریحان نے لے لیا۔ ریحان نے اس کے لیے ایک کل وقتی ملازمہ کا بندوبست کر دیا تھا جو صفائی ستھرائی اور کپڑے دھونے سے لے کر کچن میں چھوٹی موٹی چیزیں بھی بنا لیا کرتی تھی۔ کبھی عالیہ کا موڈ ہوتا تو وہ کھانا بنا لیتی ورنہ باہر سے ہی آتا تھا۔

تھکن اور کمزوری کے باوجود وہ باقاعدگی سے

یونیورسٹی جارہی تھی۔ ایک دن وہاں اس کی طبیعت زیادہ ہی خراب ہوگئی تھی تو اس کے ساتھ پڑھنے والا ایک لڑکا وقار اسے اس کی گاڑی میں ہی گھر لے آیا تھا۔ وہ کسی مل اونر کا اکلوتا بیٹا تھا اور اس کی ماں نے اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر جانے کی اجازت دینے سے انکار کردیا تھا۔ اس لیے وہ آئی بی اے میں پڑھ رہا تھا۔ عالیہ کمزوری سے چل بھی نہیں پا رہی تھی اور وقار اسے تقریباً اٹھا کر اس کے فلیٹ تک لایا تھا۔ ملازمہ نے دروازہ کھولا تو عالیہ کو ایک اجنبی کی بانہوں میں جھولتے دیکھ کر حیران ہوئی تھی، وقار نے شائستگی سے کہا۔

''مسز ریحان کی طبیعت خراب تھی، میں ان کو چھوڑنے آیا ہوں۔''

ملازمہ عالیہ کو سہارا دے کر اندر لے آئی اور وقار دروازے سے چلا گیا۔ شام کو ریحان آیا تو ملازمہ نے اسے اطلاع دینے والے انداز میں یہ خبر سنائی تھی۔ مگر اس نے کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ وہ تو عالیہ کی طبیعت خرابی کا سن کر پریشان ہوگیا۔ عالیہ ابھی بھی سو رہی تھی۔ ریحان اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا — اس نے کہا کہ عالیہ کو آرام کی اشد ضرورت ہے۔ وہ اسی طرح باقاعدگی سے یونیورسٹی جاتی رہی تو اپنا کیس بگاڑ لے گی۔ ڈاکٹر نے اسے دو ہفتے کا بیڈ ریسٹ لکھ دیا۔ عالیہ نے گھر آنے کے بعد کہا کہ وہ یونیورسٹی جائے گی کیونکہ اس کا دوسرا سمسٹر اہم موقع پر تھا اور وہ کلاسز نہیں لیتی تو اس کے نمبر بہت کم آتے۔

''ابھی تم صرف آنے والے بچّے کی فکر کرو۔'' ریحان نے کہا۔ ''تعلیم مکمل کرنے کے لیے عمر پڑی ہے۔''

''اسی وجہ سے میں پہلے ایم بی اے مکمل کرنا چاہتی تھی۔'' عالیہ بولی۔

عالیہ بُری طرح جھنجلائی ہوئی تھی کیونکہ یہ بچہ اس کی مرضی کے بغیر ہی آگیا تھا اور اب وہ اسے پیدا کرنے پر مجبور تھی۔ ڈلیوری کا وقت دوسرے سمسٹر کے پیپرز کے فوراً بعد تھا۔ ریحان نے کہا کہ وہ اسے پڑھا دیا کرے گا۔ فلیٹ میں آنے کے بعد وہ دو تین بار ہی باپ کے گھر گیا تھا اور اس نے ایک بار بھی ان لوگوں کو یہاں آنے کو نہیں کہا تھا۔ شبانہ نے دو تین بار عالیہ سے ملنے اور اسے دیکھنے کی خواہش کی تھی لیکن وہ ٹال گیا تھا۔ تیسری بار وہ گیا تو اس نے شبانہ کو دو ہزار روپے دیے۔ اس نے لینے سے انکار کردیا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے بیٹے۔''

''امی رکھ لیں آپ کو گھر کا خرچ چلانے میں مشکل ہو گی۔''

''بیٹا ہم مشکلات کا سامنا کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ تمہارے ابو نے ایک پارٹ ٹائم جاب کرلی ہے۔ مونا بھی ایک اسکول میں پڑھا رہی ہے۔'' شبانہ نے نرمی سے کہا۔

''اچھا مجھے معلوم ہی نہیں ہے۔'' ریحان حیران ہوا۔

''یہ ہمارے مسئلے ہیں۔ تمہیں پریشان کرنا بے کار تھا۔'' شبانہ نے کہا تو وہ کچھ شرمندہ ہوا لیکن اصرار کے باوجود شبانہ نے اس سے رقم لینے سے انکار کردیا۔ چلتے وقت اس نے عالیہ کو لانے کو کہا تھا تو ریحان نے بتایا۔

''اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آج کل یونیورسٹی بھی نہیں جارہی ہے۔''

اس روز ریحان کے ضمیر پر کچھ بوجھ آیا تھا لیکن وہ کامیابی کی جس شاہراہ پر سرپٹ سفر کررہا تھا وہاں اس قسم کے بوجھ زیادہ دیر نہیں اٹھائے جاتے ہیں...... وہ کمپنی میں جونیئر ایگزیکٹو میں آگیا تھا اور اب اس کی نظر سینئر ایگزیکٹوز پر تھی۔ اس نے ابھی سے اپنے مالکان سے بہت اچھے تعلقات قائم کرلیے تھے۔ اسے امید تھی کہ جیسے ہی کوئی اوپر کی پوسٹ سے فارغ ہوگا اسے ہی جگہ ملے گی۔ کچھ عرصے بعد عالیہ نے ایک بیٹی کو جنم دیا تو اس کی دنیا مکمل ہوگئی تھی اور پھر اسے دوسرے رشتوں کا خیال بھی نہیں رہا تھا۔ فاریہ میں اس کی جان تھی۔ جب کہ عالیہ کو اس کی اتنی پروا نہیں تھی۔ وہ فاریہ کی پیدائش کے ایک ہفتے بعد ہی یونیورسٹی جانے لگی تھی۔ اس نے آخری دنوں میں بہت مشکل سے پیپرز دیے تھے۔ اس بار اس کے نمبرز کچھ کم آئے تھے اور وہ اگلے سمسٹرز میں اس کی تلافی کرنا چاہتی تھی۔ صبح سے شام تک ملازمہ ہی بچی کو دیکھتی تھی کیونکہ یونیورسٹی سے آکر وہ فاریہ کو پیار کرکے آرام کرتی اور شام کو اپنے اسائنمنٹ دیکھتی تھی۔ جب کہ ریحان دفتر سے آتے ہی سیدھا فاریہ کی طرف لپکتا تھا۔ اس کے بعد وہ سوتے وقت تک اس کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ ملازمہ چلی جاتی تھی اس لیے فاریہ کی دیکھ بھال بھی ریحان کرتا تھا اور عالیہ نے اس کی کوئی ذمّے داری لینے سے صاف انکار کردیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنی ساری توجہ اپنی تعلیم پر لگانا چاہتی ہے۔ یہ پہلا موقع تھا جب ریحان اور عالیہ میں اختلاف ہوا تھا۔ ریحان نے اس سے کہا۔

''عالی یہ ہماری بچی ہے اور دنیا کی کسی بھی چیز سے زیادہ اہم ہے۔''

''اچھا...!'' عالیہ نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ ''تب تم ملازمت چھوڑ دو اور سارا دن اس کے ساتھ رہا کرو۔''

''کیسی باتیں کررہی ہو، میں جاب چھوڑ دوں تو گھر کیسے چلے گا؟''

''فرض کرو تم اکیلے اسے سنبھالنے والے ہوتے تو کیا کرتے؟''

''میں ملازمہ رکھ لیتا۔''

''اب میں نے رکھ لی تو کیا بُرا کیا؟'' عالیہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

ریحان اسے قائل نہیں کرسکا تھا۔ جب فاریہ رات کو اٹھ کر روتی تو ریحان ہی اسے دیکھتا تھا۔ کئی بار رات بھر جاگنے کی وجہ سے اگلے دن دفتر میں وہ کام میں غلطیاں کرتا رہا تھا۔ عالیہ سے کہنا فضول تھا اور رات کے لیے کوئی ملازمہ مل نہیں سکتی تھی جو بچی کو دیکھتی اس لیے یہ فریضہ ریحان کو ہی انجام دینا پڑتا تھا۔

ظفر نے ایک اسٹیٹ ایجنسی میں جاب کرلی تھی۔ ایجنسی ان کے علاقے میں تھی اور ظفر کا کام حساب کتاب دیکھنا تھا۔ وہ شام کو جاتا اور رات کو آجاتا تھا۔ کام خاص نہیں تھا اور معاوضہ بھی صرف دو ہزار روپے تھا لیکن اس رقم سے اس کے کئی مسائل حل ہوجاتے تھے۔ مونا نے انٹر کے بعد ایک اسکول میں جاب کرلی تھی اسے بھی دو ہزار مل جاتے تھے۔ پھر ظفر کی پنشن تھی ان کا کسی نہ کسی طرح گزارا ہوجاتا تھا۔ پھر ظفر نے اوپر والے پورشن کی سیڑھیوں کا راستہ الگ کردیا اور اسے کرائے پر اٹھا دیا۔ ذرا پوش اور صاف ستھرا علاقہ ہونے کی وجہ سے اسے اچھا کرایہ مل رہا تھا۔

نعمانہ کا جہاں رشتہ طے کیا تھا، اس کے بی اے فائنل کے پیپرز کے بعد ظفر اور شبانہ نے نعمانہ کی تاریخ رکھنے کے لیے لڑکے والوں کو بلا لیا تھا۔ ریحان کو بھی بتایا تھا لیکن جس روز لڑکے والے آئے تھے، اس روز صرف ریحان آیا اور وہ بھی رات نو بجے جب تاریخ رکھی جاچکی تھی۔ اس نے ظفر کو بتایا کہ فاریہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے اسے ذرا دیر ہوگئی۔ وہ روکھے پھیکے انداز میں لڑکے کے گھر والوں سے ملا اور ان کے جاتے ہی خود بھی روانہ ہوگیا۔ فاریہ کی طبیعت کا سن کر ظفر اور شبانہ بھی بے قرار ہوگئے تھے۔ وہ اگلے روز خود اس کے فلیٹ پہنچ گئے تھے۔ اس سے پہلے بھی وہ فاریہ کے لیے اسی طرح بن بلائے وہاں پہنچ گئے تھے اور عالیہ نے ان سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کی تھی۔ وہ کچھ دیر بیٹھ کر آگئے تھے۔ اس روز تو عالیہ نے کمرے سے نکلنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ انہوں نے ملازمہ سے بلوا کر فاریہ کو دیکھا اور اپنے آنسو ضبط کرتے وہاں سے نکل آئے۔ ظفر نے راستے میں کہا۔

''اب میں اس گھر میں کبھی نہیں آؤں گا۔''

''میں بھی نہیں آؤں گی۔'' شبانہ رونے لگی تھی۔ پوتی کی محبت میں وہ چلے جاتے تھے لیکن اب قوتِ برداشت جواب دے گئی تھی۔ شبانہ گھر آکر عالیہ کو برا بھلا کہہ رہی تھی تو ظفر نے اسے ٹوکا۔

''اسے بُرا کہنے کا فائدہ؟ اصل میں تو ہمارا بیٹا ہی قصوروار ہے۔''

''ہاں یہ بھی تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' شبانہ نے سرد آہ بھری۔

ریحان کا جو طرزِ عمل تھا، اس کے بعد ان کو نعمانہ کی شادی کے سلسلے میں اس سے جو ذرا سی امید تھی اب وہ بھی نہیں رہی تھی۔ ظفر کے پاس دو لاکھ کے سرٹیفکیٹ تھے۔ اس نے وہی کیش کرالیے اور اس سے نعمانہ کے لیے ضروری چیزیں لے لی تھیں۔ اٹھارہ سال پہلے اتنی مہنگائی تو نہیں تھی لیکن شادی کے لیے دو لاکھ کی رقم بہت زیادہ بھی نہیں تھی۔ یہ تو نعمانہ کے جہیز میں ہی خرچ ہوگئی تھی اور اب ظفر پریشان تھا کہ برات اور دوسرے خرچے کیسے پورے کرے گا۔ جگہ تو اسے ایجنسی کے ساتھ والے لان کی صورت میں مل گئی تھی۔ لان بھی ایجنسی کے مالک کا تھا اس لیے اس نے مفت میں دے دیا تھا لیکن کھانے کا انتظام تو کرنا تھا۔ اس موقع پر زاہد آگے آیا۔ وہ اور فرحی دبئی سے آئے ہوئے تھے۔ جب فرحی کو پتا چلا کہ اس کے ماں باپ کس مشکل میں ہیں اور ریحان کچھ نہیں کررہا ہے تو اس نے شوہر سے بات کی اور کھانے کی ذمّے داری زاہد نے اٹھا لی۔ ۔۔۔ یوں ایک بڑا مسئلہ حل ہوگیا۔ ریحان اور عالیہ شادی کی تمام تقریبات میں مہمانوں کی طرح شریک رہے تھے۔ ریحان نے دس ہزار روپے باپ کو دینے کی کوشش کی تو وہ اس نے ریحان کے منہ پر مار دیے تھے۔

''اپنے پاس رکھو، کاش میں تم سے سارے تعلق توڑ سکتا لیکن مجبور ہوں، بہت سارے لوگوں کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔'' ظفر نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''اب مہربانی کرکے اپنی صورت مت دکھانا۔''

ریحان روپے اور اپنا سا منہ لے کر وہاں سے چلا آیا تھا۔ یہ ولیمے سے اگلے دن کی بات تھی۔ عالیہ کو پتا چلا تو اس نے طنز کیا۔ ''اور کرو ان سے ہمدردی یہ اس قابل بھی نہیں ہیں۔''

مگر ریحان کو احساس تھا کہ اس نے ماں باپ کے

ساتھ زیادتی کی ہے۔ جب انہیں اس کی مدد کی ضرورت تھی تو وہ خود میں مگن رہا تھا اور اس نے ان کی پروا بھی نہیں کی تھی۔ وہ ان کو لاکھ روپے تک آسانی سے دے سکتا تھا لیکن اس نے خودغرضی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اسے پشیمانی تو ہوئی تھی لیکن زیادہ نہیں کیونکہ ان دنوں وہ دفتر میں اپنی پوزیشن بہتر بنانے کے لیے جوڑ توڑ میں مصروف تھا اس لیے جلد وہ سب بھول گیا تھا۔

عالیہ دوسرے سال میں تھی اور اس کی بیرونی مصروفیات بڑھ گئی تھیں کیونکہ اس نے ایک بزنس سوشل سرکل بھی جوائن کرلیا تھا اور اس کی شامیں اب اس سرکل کے کلب میں گزرتی تھیں۔ ریحان کو دفتر کی جانب سے کار مل گئی تھی اس لیے عالیہ کے جہیز کی کار اب مستقل طور پر اس کے استعمال میں رہتی تھی۔ یونیورسٹی سے آکر وہ کچھ دیر گھر میں ٹھہرتی اور پھر تیار ہوکر نکل جاتی تھی۔ اس کی واپسی رات آٹھ نو بجے سے پہلے نہیں ہوتی تھی۔ اگر کلب میں کوئی فنکشن ہوتا تھا تو وہ بارہ ایک بجے واپس آتی تھی۔ شام کو ریحان واپس آتا تو وہ اسے شاذ ہی گھر میں ملتی تھی۔ ریحان اس بات کو محسوس تو کرتا تھا لیکن وہ عالیہ کو ٹوک نہیں سکتا تھا۔ اس نے خود شروع سے عالیہ کو چھوٹ دی ہوئی تھی اور اب وہ اس سے یہ چھوٹ واپس نہیں لے سکتا تھا۔ عالیہ نے اسے بتادیا تھا کہ ایم بی اے مکمل ہوتے ہی وہ جاب کرلے گی اور پھر وہ دونوں مل کر اپنے مستقبل کے لیے کمائیں گے۔ عالیہ کے منصوبے یہیں تک محدود نہیں تھے۔ وہ خود بزنس کرنا چاہتی تھی لیکن اس سے پہلے کاروباری دنیا میں لائن اور تعلقات بنانا چاہتی تھی۔ ریحان نے اسے یاد دلایا۔

''بزنس کے لیے بہت بڑی رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''رقم بھی ہوجائے گی۔ تم دیکھنا بس مجھے اس شعبے میں آنے تو دو۔ پاپا نے اتنا کمایا ہے کس لیے ہم دو ہی تو اولادیں ہیں اُن کی۔''

یہ خیال تو ریحان کو بھی آیا تھا لیکن وہ ملازمت میں ہی خوش تھا اور اس کی اُڑان اتنی اونچی نہیں تھی۔ اس کے مقابلے میں عالیہ ابھی سے بہت اونچے خیالات رکھتی تھی جب کہ وہ عملی میدان میں بھی نہیں آئی تھی۔ فاریہ سال سے اوپر کی ہونے کو آئی تھی اور وہ مکمل طور پر ملازمہ کے رحم و کرم پر تھی۔ عالیہ یہ بھی نہیں دیکھتی تھی کہ ملازمہ اس کی دیکھ بھال کس طرح کررہی ہے۔ اس وجہ سے وہ بھی فاریہ کو اتنی توجہ نہیں دیتی تھی۔ اس کی خوراک اور صفائی ستھرائی کا خیال نہیں رکھتی تھی۔ ہاں جب ریحان گھر میں ہوتا تو ملازمہ فاریہ کا خاص خیال رکھتی تھی کیونکہ ریحان اسے چیک کرتا تھا۔ مگر اسے اندازہ تھا کہ ملازمہ اپنا کام صحیح طریقے سے نہیں کررہی ہے۔ وہ جب دفتر سے آتا تھا تو کبھی کبھی فاریہ اسے گندی حالت میں اور بھوکی ملتی تھی۔ ریحان کی مجبوری تھی کہ وہ ملازمہ کو نکال نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ بھروسے کی تھی۔ اس وجہ سے جیسے تیسے گاڑی چل رہی تھی۔ عالیہ کے عزائم ایسے تھے جن میں بچے رکاوٹ ہوسکتے تھے۔ اس لیے اس نے فی الحال مزید کسی بچے کو پیدا کرنے سے انکار کردیا تھا۔

لیکن دوسری بار بھی اسے تاخیر سے پتا چلا تھا۔ ان دنوں وہ ایم بی اے فائنل کے بعد سوشل کلب میں مصروف تھی۔ اسے دو اور افراد کے ساتھ کلب کوری آرگنائز کرنے کا ٹھیکا ملا تھا۔ ایک دن وہ آئی تو اسے چکر آرہے تھے۔ اس نے ریحان کو بتایا اور اس کی وجہ تھکن کو قرار دیا۔ مگر ایک ہفتے بعد وہ صبح غسل کے دوران بے ہوش ہوگئی تھی تو ریحان نے جلدی سے ڈاکٹر کو بلایا اور اس نے کہا کہ وہ شاید امید سے ہے اس لیے اسے کسی لیڈی ڈاکٹر کو دکھائے۔ ریحان یہ سن کر خوش ہوگیا لیکن عالیہ پریشان ہوگئی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر نے بھی تصدیق کی اور بتایا کہ وہ دو مہینے کے حمل سے تھی۔

عالیہ نے واپسی پر ریحان سے کہا۔

''میں کسی صورت اس بچے کو پیدا نہیں کروں گی۔''

''تو کیا ابارشن کراؤ گی؟''

''ہاں میں اس سے چھٹکارا حاصل کروں گی۔ اپنے کیریئر کے آغاز میں ہوں، بچے پیدا کرنے لگ گئی تو کام کیا کروں گی۔''

''عالی بچے تو زندگی کا لازمی حصہ ہوتے ہیں۔'' ریحان نے دبی زبان میں کہا۔

''ہاں ہوتے ہیں تو ایک ہے تو۔'' وہ بیزاری سے بولی۔

ریحان نے اس کی مخالفت کی تھی لیکن عالیہ سوچ چکی تھی۔ اس نے کسی جاننے والی ڈاکٹر سے خاموشی سے اپائنٹ منٹ لیا اور ایک دن جا کر اپنا ابارشن کرالیا۔ پھر اس نے کلینک سے ریحان کو کال کی کہ اسے آکر لے جائے۔ ریحان نے سوچا نہیں تھا کہ وہ اس طرح خاموشی سے یہ کام کرالے گی۔ وہ اسے گھر لایا اور ان کی ازدواجی زندگی کا پہلا سنجیدہ جھگڑا ہوا تھا۔ دونوں کی کئی دن تک بات چیت بند رہی تھی۔

ریحان نے پہلی بار محسوس کیا تھا کہ اس کی زندگی اب اتنی بھی کامیاب نہیں تھی جتنی کہ وہ سوچتا آیا تھا۔ اتنی بھی ہموار نہیں تھی۔ اس پر گڑھے اور ٹیلے تھے۔ وہ اپنی بیوی کا اسیر بن کر رہ گیا تھا۔ وہ جیسا چاہتی تھی ویسا ہوتا تھا اور جیسا ریحان چاہتا تھا ویسا نہیں ہوتا تھا۔ اس کی وجہ سے ریحان اپنے ماں باپ اور بہنوں سے دور ہوگیا تھا۔ اس نے ان کی مدد سے ہاتھ کھینچ لیے تھے۔ انہیں بے یار و مددگار چھوڑ دیا تھا لیکن یہ خیالات بس عارضی طور پر اس پر حاوی آئے تھے۔ پھر وہ اپنی جاب اور زندگی میں مگن ہوگیا تھا۔ اپنی کوشش سے وہ سینئر ایگزیکٹوز میں شامل ہوگیا تھا اور اب اس کی نظر کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز پر تھی۔ ایک طرف ریحان ملازمت میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا تو دوسری طرف وہ اپنی اضافی آمدنی زمین اور جائداد میں انویسٹ کررہا تھا۔ جہاں اسے کوئی زمین یا مکان مارکیٹ سے کم قیمت پر نظر آتا... تو وہ اسے خریدنے میں دیر نہیں لگاتا تھا۔

ظفر کے گھر میں اب تین ہی افراد تھے لیکن مہنگائی اس طرح بڑھ رہی تھی کہ تین افراد کا گزارا بھی مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ کرائے، پنشن اور جز وقتی ملازمت کی تنخواہ نے اس کا بھرم قائم رکھا تھا۔ ان ہی دنوں شبانہ کو دل میں تکلیف ہوئی تھی اور جب اس نے توجہ نہیں دی۔ کسی اسپیشلسٹ کو دکھانے کے بجائے وہ ایک مقامی ڈاکٹر سے دوا لے آئی تھی۔ نتیجے میں اسے ایک دن دل کا دورہ پڑا تھا اور وہ آئی سی یو میں جا پہنچی تھی۔ ریحان کو اطلاع ملی تو وہ بھاگا آیا تھا۔ کچھ بھی ہو شبانہ اس کی ماں تھی اور اس کی حالت دیکھ کر وہ فکر مند ہوگیا تھا۔ اسے ملازمت کے ساتھ میڈیکل بھی ملا ہوا تھا۔ جس میں ایمرجنسی مکمل طور پر شامل تھی۔ اس نے شبانہ کو ایک اچھے اسپتال میں منتقل کرایا جہاں اس کی بہتر دیکھ بھال ہوسکتی تھی۔ وہاں چوبیس گھنٹے گزرنے کے بعد شبانہ کی حالت بہتر ہوگئی تھی اور ایک ہفتے بعد وہ اسپتال سے گھر آگئی تھی لیکن ڈاکٹر نے خبردار کردیا تھا کہ دوسرا دورہ خطرناک ہوسکتا تھا اور شبانہ کو اب احتیاط کے ساتھ دوا کا مستقل استعمال بھی کرنا تھا۔ یہ دوائیں خاصی مہنگی تھیں۔ ریحان نے دوائیں اپنے ذمّے لے لی تھیں۔

جب عالیہ کو اس بات کا پتا چلا تو اس نے بُرا منایا تھا۔

''تمہیں کیا ضرورت ہے یہ ذمے داری اٹھانے کی۔''

''عالی وہ میری ماں ہیں۔''

''ٹھیک ہے لیکن تم نے اپنا کام کردیا ہے۔ یہ چار لاکھ کا بل تمہاری کمپنی نے پے کیا ہے۔ اب باقی یہ خود کریں۔''

''میں ذمّے داری لے چکا ہوں۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''تم پہلے میری ذمّے داری تو پوری کرو۔'' عالیہ زہریلے لہجے میں بولی۔ ''تم نے میرے لیے کیا کیا ہے۔ چار سال سے کہیں لے کر نہیں گئے۔''

''میں تمہارے لیے تو سب کرتا ہوں۔'' وہ دفاعی انداز میں بولا۔

''میرے لیے میرے باپ نے سب کیا ہے۔ یہ گھر، یہ گاڑی اسی نے دی ہے۔ وہ آج بھی مجھے دس ہزار پاکٹ منی دیتا ہے۔ تم دو ٹائم کھلا کر سمجھتے ہو کہ تم نے مجھ پر احسان کیا ہے۔''

ریحان سر جھکا کر سن رہا تھا کیونکہ وہ سچ کہہ رہی تھی۔ وہ اس کے باپ کے دیے فلیٹ میں رہ رہا تھا اور عالیہ کے زیرِ استعمال گاڑی بھی اس کے باپ نے دی تھی۔ اس روز عالیہ نے اسے بتایا کہ اسے ایک فرم میں جاب کی پیش کش ہوئی ہے اور وہ آنے والی پہلی سے جاب پر جارہی ہے۔ اس نے ریحان سے کہا۔ ''ممکن ہے، ہمیں یہ جگہ چھوڑنی پڑے۔''

وہ پریشان ہوگیا۔ ''کیوں؟''

''کیونکہ یہ جگہ میرے آفس سے دور ہے۔ مجھے کلفٹن جانا ہوگا۔ ہم وہیں کوئی اپارٹمنٹ دیکھ لیں گے۔''

ریحان کے ہوش اُڑ گئے تھے کیونکہ کلفٹن میں اپارٹمنٹ کا مطلب تھا بھاری بھرکم کرایہ اور وہ کہاں سے اتنا کرایہ دیتا۔ وہ تو بہت ہوشیاری سے اپنی اضافی آمدنی زمین اور جائداد میں لگا رہا تھا۔ اس نے عالیہ سے کہا۔

''وہاں کا کرایہ معلوم ہے۔''

''مجھے تو معلوم ہے تمہیں بھی معلوم ہونا چاہیے۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''بہت دن مفت میں عیش کرلیا۔''

عالیہ کسی کام میں تاخیر نہیں کرتی تھی جیسے ہی اسے جاب ملی اس نے کلفٹن کے ایک لگژری کمپلیکس میں اپارٹمنٹ تلاش کرلیا۔ دو بیڈز کے اس اپارٹمنٹ کا کرایہ بارہ ہزار روپے تھے اور دو ہزار مینٹی نینس کے الگ سے دینا پڑتے تھے۔ ریحان نے احتجاج کیا لیکن عالیہ نے اس کی ایک نہیں سنی تھی۔ ریحان کو یہ فلیٹ لینا ہی پڑا تھا اور اس کی وجہ سے وہ ماں کی دوائیں بند کرنے پر مجبور ہوگیا۔ جب وہ دوائیں دینے نہیں گیا تو مونا نے اسے کال کی۔

''بھائی آپ اس بار امی کی دوائیں نہیں لائے۔''

''مونا اصل میں آج کل میرا ہاتھ تنگ ہے تو میں اب امی کے لیے دوائیں نہیں لاسکوں گا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''امی ابو سے میری طرف سے معذرت کرلینا۔'' اس نے کہا اور مونا کی مزید کوئی بات سنے بغیر لائن کاٹ دی۔ اس کے ضمیر نے ملامت تو کیا تھا لیکن اس نے خود کو تسلی دے لی تھی کہ وہ مجبور تھا۔ اب اسے کرایہ بھی دینا پڑتا تھا اور اسی لحاظ سے بلز بھی ادا کرنے پڑتے تھے۔

مونا نے ظفر کو یہ بات بتائی تھی اور ماں سے چھپالی تھی۔ ظفر سرد آہ بھر کر رہ گیا۔ ''اس سے مجھے ایسی ہی توقع تھی۔''

''امی کی دواؤں کا کیا ہوگا؟''

''میں کچھ کرتا ہوں۔'' ظفر نے کہا۔ لیکن اس کی اتنی حیثیت نہیں تھی کہ وہ ماہانہ سات آٹھ ہزار روپے کی دوائیں لے سکتا۔ اثاثے کے نام پر اس کے پاس یہ مکان رہ گیا تھا۔ اس نے مونا کو تسلی دی تھی لیکن خود اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ شبانہ کے لیے دوائیں کہاں سے لائے۔ اسے اور مونا کو پتا نہیں تھا کہ اتفاق سے شبانہ نے ان کی باتیں سن لی تھیں۔ یہ سن کر اس کے دل میں جیسے سوئی اتر گئی تھی کہ ریحان نے اس کی دواؤں کا خرچ مزید اٹھانے سے انکار کر دیا ہے۔ اس کے سینے میں درد ہونے لگا تھا اور پھر یہ درد بڑھتا چلا گیا تھا۔ رات اسے کسی وقت شدید ہارٹ اٹیک ہوا اور ظفر اسے اسپتال لے کر بھاگا تھا۔ مونا نے دل نہ چاہتے ہوئے بھی ریحان کو اطلاع کر دی تھی اور وہ بھی کارڈیو کی طرف روانہ ہوگیا۔

جب ریحان آئی سی یو میں داخل ہوا تو ظفر اسے دیوار سے سر لگائے روتا نظر آیا۔ وہ اس کی طرف لپکا۔ ''ابو! امی کہاں ہیں؟''

''وہ چلی گئی۔'' ظفر نے روتے ہوئے کہا۔ پھر رک کر بولا۔ ''تم فکر مت کرو اب اسے تمہاری دواؤں کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

ریحان ڈر رہا تھا کہ باپ اسے پھر بے عزت کرے گا لیکن ظفر صدمے سے نڈھال تھا۔ اس نے ریحان سے کچھ نہیں کہا۔ شبانہ کی تدفین کے بعد وہ دو دن باپ اور بہن کے پاس رہا تھا۔ دونوں اس سے بات نہیں کر رہے تھے لیکن اسے جانے کو بھی نہیں کہا تھا۔ وہ فاریہ کو لے آیا تھا شاید اس کی وجہ سے بھی ظفر نے اس سے سخت رویہ نہیں رکھا تھا۔ چوتھے دن وہ فاریہ کو لے کر گھر آگیا۔

عالیہ صرف پہلے دن آئی تھی اور اس کے بعد اس نے آنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اس نے ریحان سے کہہ دیا تھا کہ اس کی نئی نئی جاب ہے اور وہ دفتر سے زیادہ دن غیر حاضر نہیں رہ سکتی تھی۔ جب ریحان آیا تو عالیہ غائب تھی یہی نہیں بلکہ وہ اس ساری رات بھی غائب رہی تھی۔ بڑی مشکل سے ریحان کو اس کے ایک کولیگ نے بتایا کہ عالیہ دفتر والوں کے ساتھ ایک فارم ہاؤس پکنک پر گئی تھی جس میں نائٹ اسٹے بھی شامل تھا۔ اگلے دن وہ آئی تو بہت خوش تھی۔ ریحان اسے سرزنش کیا کرتا اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ اس سے کہہ سکتا کہ وہ اسے بتا کر تو جاتی۔ عالیہ نے بھی کوئی وضاحت نہیں کی تھی اور اس کے بعد یہ اس کا معمول بن گیا تھا۔ اس کی جاب کیا لگی تھی۔ اس کے پر لگ گئے تھے اور وہ اُڑی اُڑی پھرتی تھی۔

فاریہ چار سال کی ہو رہی تھی۔ ریحان نے اسے ایک اچھے اسکول میں داخل کرا دیا۔ فاریہ وہاں دوپہر دو بجے تک پڑھتی تھی۔ اس کے بعد وہ گھر آجاتی جہاں ملازمہ موجود ہوتی تھی... ریحان شام چھ سات بجے تک آجاتا تھا لیکن عالیہ کی آمد کبھی نو دس بجے سے پہلے نہیں ہوتی تھی اور کبھی تو بارہ بج جاتے تھے۔ ریحان کو فاریہ پر ترس آتا تھا لیکن وہ مجبور تھا۔ چھ سات بجے سے پہلے دفتر سے نہیں آسکتا تھا۔ پھر اس کی دوسری مصروفیات بھی تھیں۔ اس نے کلفٹن میں تعمیر ہونے والے ایک لگژری اپارٹمنٹ میں دو بیڈز کا فلیٹ بک کرالیا تھا۔ تاکہ کرائے سے اس کی جان چھوٹے۔ اس کی ایک تہائی تنخواہ کرائے میں چلی جاتی تھی اور وہ بچت نہیں کر پاتا تھا۔

ظفر اپنے بیٹے کی فطرت جان گیا تھا اس لیے اس کی خواہش تھی کہ مرنے سے پہلے وہ مونا کو اس کے گھر کا کر جائے۔ وہ پرائیویٹ طور پر بی اے کر چکی تھی اور اسے ایک بہتر اسکول میں ملازمت مل گئی تھی۔ پھر اس نے پرائیویٹ ہی ماسٹر بھی کرلیا۔ اس کی عمر چوبیس کے قریب ہو رہی تھی۔ ظفر اس کے لیے کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اپنی دونوں بیٹیوں کو کہہ دیا کہ وہ مونا کے لیے کوئی مناسب رشتہ تلاش کریں۔ ان کو بھی اس کی فکر تھی۔ پھر فرحی کے توسط سے ایک انجینئر لڑکے کا رشتہ آیا تھا وہ شارجہ میں تھا اور زاہد سے اس کی دوستی تھی۔ ظفر خوش ہوگیا تھا۔ اس نے فوراً رشتہ قبول کر لیا۔ لڑکے کا گھرانا بھی شارجہ میں ہی تھا۔ وہ لوگ آئے اور مونا کو پسند کرلیا۔ کیونکہ دونوں طرف سے جلدی تھی اس لیے۔ ظفر نے دو مہینے بعد کی تاریخ دے دی۔ اس سے پہلے وہ اپنا مکان خاموشی سے فروخت کر چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ مونا

کے علم میں یہ بات آئی تو وہ اسے کبھی ایسا کرنے نہیں دے گی۔ اس کے پاس بیٹی کی شادی کرنے کے لیے یہی ایک چیز رہ گئی تھی۔ جب تک مونا کو پتا چلا وہ بیعانہ بھی لے چکا تھا۔ مونا فکر مند ہوگئی۔

''ابو مکان بیچ دیا اب آپ کہاں رہیں گے؟''

''اللہ مالک ہے بیٹے۔'' ویسے میں نے پاس ہی مین روڈ کے ساتھ ایک فلیٹ بک کرالیا ہے۔ وہ ایک آدھ سال میں مکمل ہو جائے گا تب تک کہیں کرائے پر گزارا کرلوں گا۔''

ظفر نے مکان دس لاکھ میں بیچا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ اس میں سے نصف وہ مونا کی شادی میں لگا دے گا۔ اس نے ریحان کو شادی سے ایک ہفتہ پہلے بتایا تھا۔

''تمہاری بہن کی شادی ہے اگر موڈ ہو تو آجانا۔''

''آپ نے مجھے بتایا نہیں۔'' ریحان تیز لہجے میں بولا۔

''کیا تم اس کا حق رکھتے ہو۔'' ظفر نے کہا اور اس کا جواب سنے بغیر فون بند کر دیا۔

عالیہ نے سنا تو اس نے انکار کر دیا۔ ''میں تو نہیں جاؤں گی اس طرح تو لوگ غیروں کو بھی نہیں بلاتے ہیں۔''

عالیہ کے بھڑکانے میں آکر ریحان بھی مشتعل ہوگیا تھا۔ وہ بھول گیا تھا کہ خود اس کا رویہ اپنے ماں باپ کے ساتھ کیسا رہا تھا۔ ''ان لوگوں نے مجھے خود سے الگ کر دیا ہے۔''

''بس تو پھر کوئی ضرورت نہیں شادی میں جانے کی۔'' عالیہ نے فیصلہ کر دیا۔ اگرچہ ریحان شادی میں جانا چاہتا تھا لیکن عالیہ کی باتوں میں آکر اس نے بھی جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور جب وہ مونا کی شادی میں نہیں آیا تو سب ہی حیران رہ گئے تھے۔ فرحی اور نعمانہ تو اتنے غصے میں آگئیں کہ شادی کے گھر سے ریحان کے پاس لڑنے کے لیے جا رہی تھیں لیکن ظفر نے ان کو روک لیا۔

''کوئی فائدہ نہیں ہے سمجھ لو کہ تمہارا کوئی بھائی تھا ہی نہیں۔''

ظفر نے جس کو مکان فروخت کیا تھا، اس نے ظفر کو شادی تک اسی مکان میں رکنے کی مہلت دی تھی اس لیے فرحی اور نعمانہ کو بھی پتا نہیں چلا کہ اس نے مکان بیچ دیا ہے۔ مونا کی رخصتی کے بعد اس نے کرائے پر ایک چھوٹا فلیٹ لے لیا اور وہاں منتقل ہوگیا۔ جو فلیٹ بک کرایا تھا، وہ ابھی تکمیل کے مراحل میں تھا۔ ریحان کو اب باپ اور بہنوں کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ وہ بچ بچ ان کی زندگی سے خارج ہو چکا تھا۔ ان دنوں وہ اپنے بک کرائے اپارٹمنٹ کی ادائیگی کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ اس نے کمپنی سے رقم لے کر فلیٹ کی فل کیش ادائیگی کر دی تھی اس طرح اسے کئی لاکھ روپے کی بچت ہوگئی تھی کیونکہ کمپنی نے ڈسکاؤنٹ دیا تھا اور وہ بینک لون سے بھی بچ گیا تھا۔ جو دو گنے سے بھی زیادہ ادا کرنا پڑتا اور وہ بھی پندرہ سال تک۔ اب وہ پانچ سال میں کمپنی کا قرض اتار سکتا تھا۔

فاریہ اب بڑی ہو رہی تھی۔ اسے ماں باپ کی دیکھ بھال کی اتنی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ اسکول سے آکر خود اپنے کام کر لیتی تھی اس لیے ریحان کو یہ فکر نہیں رہی تھی۔ عالیہ کو تو روزِ اول سے نہیں تھی۔ اس کی ساری تگ و دو اس پر تھی کہ کسی طرح بزنس وومین بن جائے اور جاب کے چوتھے سال وہ اس کمپنی کے ڈائریکٹرز میں شامل ہو چکی تھی۔ ریحان حیران تھا کیونکہ اس نے نہ تو کوئی انویسٹ منٹ کی تھی اور نہ کمپنی کے لیے کوئی ایسا کام کیا تھا جس پر اسے ڈائریکٹرز میں شامل کیا تھا۔ ریحان نے اس سے پوچھا تو اس نے بے پروائی سے کہا۔

''اصل کام پی آر کا ہے۔''

''کس سے؟'' ریحان نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ اس کے علم میں تھا کہ عالیہ ان دنوں اپنی کمپنی کے مالک اسلم خان کے ساتھ کچھ زیادہ ہی نظر آرہی تھی بلکہ اس نے اپنے دو کولیگز کو باتوں میں عالیہ کو مسز خان کہتے سنا تھا۔ یہ بات اس نے اتفاق سے سن لی تھی۔

''آف کورس اسلم خان سے۔'' عالیہ نے اسی ہٹ دھرمی سے کہا۔ ''میں اس سے تعلقات نہیں بڑھاتی تو اس پوزیشن پر کیسے آتی۔''

''کس قسم کے تعلقات؟''

''اگر تمہارے ذہن میں کوئی خاص مردانہ کیڑا کلبلا رہا ہے تو اسے نکال دو۔ ہی از جسٹ مائی گڈ فرینڈ۔''

ریحان نے اسے بدمزگی سے دیکھا۔ ''لوگ تو کچھ اور کہہ رہے ہیں۔''

''لوگ جائیں جہنم میں۔ اگر تم ان کی بات کا یقین کرتے ہو تو تم بھی جہنم میں جاؤ۔'' عالیہ مشتعل ہوگئی۔ اس کے چلانے کی آوازیں سن کر فاریہ وہاں آگئی۔ دس سال کی عمر میں وہ خاصی سمجھدار تھی۔ اس نے ماں باپ کو دیکھا۔ ''ماما، پاپا آپ کیوں لڑ رہے ہیں؟''

''اپنے باپ سے پوچھو اس کا خیال ہے میں

دوسرے مردوں سے تعلقات رکھتی ہوں۔'' عالیہ نے بنا سوچے سمجھے کہا۔

''عالی۔'' ریحان چلّایا۔ ''تمہارا دماغ درست ہے۔''

عالیہ پاؤں پٹختی وہاں سے چلی گئی۔ فاریہ سوالیہ نظروں سے باپ کو دیکھ رہی تھی۔ ''پاپا، ماما کیا کہہ رہی تھیں؟''

''تم ان کی باتوں پر توجہ مت دو۔'' ریحان نے اس کا سر تھپکا۔ ریحان اور عالیہ میں کئی دن تک بات چیت بند رہی تھی پھر رفتہ رفتہ ان کے تعلقات معمول پر آ گئے۔ ان ہی دنوں عالیہ پھر امید سے ہوئی تھی اور اس بار اس نے بچے کو جنم دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ ریحان خوش ہو گیا۔

''ہمارے ہاں ایک سے دو بچے ہوں تو فاریہ کی تنہائی بھی ختم ہو جائے گی۔''

''تمہیں فاریہ کا خیال ہے، میرا نہیں ہے۔'' عالیہ نے خفگی سے کہا۔ ''ساری مصیبت تو مجھے اٹھانی پڑے گی۔''

''یہ کام اچھے موقع پر ہو گیا۔'' ریحان بولا۔ ''آج کل تم بھی فارغ ہو اور پھر ہم عمر کے اس دور میں ہیں جہاں چند سال بعد ماں باپ بننے کا امکان ختم ہو جائے گا۔''

''یہی سوچ کر میں نے بھی اس بار ابارشن نہیں کرایا۔''

ریحان کی ترقی کا سفر جاری تھا۔ اس کا فلیٹ مل گیا تو وہاں منتقل ہو گیا تھا لیکن کچھ عرصے بعد ہی عالیہ نے ڈیفنس میں ایک بنگلا لینے کا فیصلہ کیا، یہ زیادہ بڑا نہیں تھا شاید ڈھائی سو گز کا تھا لیکن اس فلیٹ کے مقابلے میں تو بہت بڑا تھا۔ اس بنگلے کی خریداری میں کچھ رقم کم پڑ رہی تھی اس لیے ریحان نے فلیٹ بیچ دیا۔ عالیہ بہت خوش تھی کیونکہ یہ بنگلا اس کے نام تھا۔ یہیں ان کی دوسری بیٹی ماریہ پیدا ہوئی تھی۔ مگر ابھی وہ لیبر روم میں تھی کہ کیس کرنے والی ڈاکٹر نے آ کر کہا۔ ''آپ کی بچی نارمل نہیں ہے مسٹر ریحان، میرا خیال ہے اس کے دل کے ساتھ مسئلہ ہے۔ کیا آپ لوگوں نے پیدائش سے پہلے چیک نہیں کرایا تھا؟''

''نہیں ایسا تو کچھ نہیں کرایا تھا۔'' وہ پریشان ہو گیا۔

''بچی بہت کمزور ہے فی الحال اسے انکیوبیٹر میں رکھنا ہوگا۔''

جب ریحان نے پہلی بار ننھی سی جان کو انکیوبیٹر کے شیشے کے پیچھے سے دیکھا تو وہ رو دیا تھا۔ اسے پہلی بار پتا چلا کہ اولاد کا درد کیا ہوتا ہے اور اولاد کو ذرا سی تکلیف ہو تو محبت کرنے والے ماں باپ پر کیا گزرتی ہے۔ اور جب ماں باپ کو اولاد تکلیف دے تو ان کے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ وہ اسی شہر میں رہتا تھا اور اسے پتا چل ہی گیا تھا۔ ظفر ایک فلیٹ میں زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔ کچھ عرصے پہلے تک وہ ایک چھوٹی سی دکان چلا رہا تھا لیکن اب بڑھاپے کی وجہ سے ہمت نہیں رہی تھی اس لیے دکان کسی کو دے دی تھی اور خود زیادہ تر گھر پر رہتا تھا۔ ریحان کئی بار اس جگہ سے گزرا تھا لیکن اس کی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ باپ سے ملے۔

لیکن اس روز جب اس نے ننھی ماریہ کو دیکھا اور پھر اپنا دکھ دیکھا تو اسے شدت سے باپ کی یاد آئی۔ وہ اسپتال سے نکل کر روانہ ہوا تو اس نے کچھ دیر بعد خود کو اس فلیٹ کے سامنے پایا جہاں اس کا باپ رہتا تھا۔ وہ کار سے اتر کر اوپر آیا۔ اس نے فلیٹ کا دروازہ بجایا۔ اندر سے کوئی جواب نہیں ملا تو اس نے دروازہ دھکیلا۔ وہ کھلا تھا۔ ریحان ہچکچاتے ہوئے اندر آیا۔ اس نے آواز دی۔

''ابو...... آپ کہاں ہیں؟''

لیکن جواب نہیں ملا۔ اس کے بجائے تیز تیز سانسوں کی آواز آئی تھی۔ وہ اندر آیا۔ دوسرے کمرے میں ظفر بستر پر لیٹا تھا اور اس کا چہرہ راکھ جیسا ہو رہا تھا۔ اس کی سانس بے پناہ تیز تھی۔ ریحان اس کی طرف لپکا۔

''ابو آپ کو کیا ہوا...... ابو آنکھیں کھولیں۔ میں آیا ہوں آپ کا بیٹا۔''

اس کی آواز پر ظفر کی آنکھوں میں حرکت ہوئی تھی اور اس نے بہ مشکل آنکھیں کھول دیں۔ کچھ دیر وہ بے تاثر انداز میں ریحان کو دیکھتا رہا تھا پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں ہمیشہ کے لیے۔ ریحان رونے لگا اسے اپنے باپ سے معافی مانگنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ اس نے بہنوں کو اطلاع دی اور وہ اپنے شوہروں سمیت آ گئیں۔ انہوں نے آ کر ریحان کو تمام چیزوں سے بے دخل کر دیا۔ فرحی نے اس سے کہا۔ ''ابو نے آپ کو اپنے جنازے پر آنے سے منع کیا تھا۔ ان کی روح کو بھی تکلیف ہوگی۔''

''امید ہے کہ آپ ابو کو مرنے کے بعد تکلیف نہیں دیں گے۔'' نغمانہ نے تلخ لہجے میں کہا۔ وہ میت سے دور کر دیا گیا تھا اور جنازے میں بھی وہ اسی طرح دور دور رہا تھا۔ اسے اپنے باپ کی قبر پر مٹی ڈالنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ باپ کو دفنانے کے بعد وہ کسی ہارے ہوئے جواری کی طرف خالی ہاتھ گھر لوٹ آیا تھا۔ عالیہ اسپتال سے آ گئی تھی اور سخت مشتعل تھی کہ وہ دو دن سے کہاں تھا اس نے اپنی بیوی اور بچی کی کوئی خبر نہیں لی تھی۔ جب ریحان نے اسے اپنے باپ

کے مرنے کی خبر سنائی تب بھی اس کا غصہ کم نہیں ہوا تھا۔ ''باپ مرا تھا یا تم مر گئے تھے جو اطلاع بھی نہیں کر سکتے تھے۔''

''بکواس مت کرو۔'' ریحان نے بے ساختہ ہاتھ گھما دیا۔ اس نے پہلی بار عالیہ پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ اس نے ششدر لہجے میں کہا۔

''تم نے مجھے مارا ہے؟''

''تم اس سے بھی زیادہ کی مستحق ہو میرے گھر کو تباہ کرنے والی عورت۔'' ریحان بولا۔

''یاد رکھنا میں تم کو معاف نہیں کروں گی۔'' عالیہ نے اسے دھمکی دی۔

''تو کیا تم نے ابھی کوئی کسر چھوڑ دی ہے۔'' ریحان چیخا۔

بچی کے مسئلے کی وجہ سے ان کے درمیان بات آگے نہیں بڑھی تھی۔ ماریہ کے دل میں پیدائشی سوراخ تھا۔ اور .... دس سال کی عمر میں آپریشن کر کے اس مسئلے کو ٹھیک کیا جا سکتا تھا۔ تب تک ماریہ کو بہت احتیاط سے رکھنا تھا بالکل کانچ کی کسی گڑیا کی طرح۔ مگر عالیہ نے اس سے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ بچی کے لیے نرس رکھ سکتی تھی لیکن خود اسے وقت نہیں دے سکتی۔

''یہ فاریہ نہیں ہے جو ملازمہ نے پال لی تھی۔ یہ دل کی مریض ہے معمولی سی غفلت اس کی جان لے لے گی۔''

''تب ایسا کرو تم جاب چھوڑ کر گھر بیٹھو اور اس کی دیکھ بھال کرو۔ ویسے بھی تمہاری تنخواہ ہی کیا ہے۔'' عالیہ کا لہجہ حقارت آمیز ہو گیا۔ ''جہاں تک گھر کا تعلق ہے تو وہ میں چلا لوں گی۔''

عالیہ اب بزنس وومین تھی اور اس کی آمدنی کا ریحان کو اندازہ نہیں تھا مگر اس نے حال میں بیس لاکھ کی نئی کار لی تھی جب کہ ان کو اس بنگلے میں آئے زیادہ وقت نہیں ہوا تھا۔ ریحان، ماریہ کو کسی ملازمہ یا نرس پر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ لیکن اس کی جاب کی مجبوری بھی تھی۔ بے شک اس کی تنخواہ عالیہ کی آمدنی کے مقابلے میں کم تھی لیکن وہ کماتا تو تھا۔ پھر ماریہ ابھی چھوٹی تھی اس لیے ریحان نے اس کے لیے ایک نرس رکھ لی جو دن کے اوقات میں اس کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ فاریہ دو بجے اسکول سے آ جاتی تھی۔ وہ بھی ماریہ کی دیکھ بھال نہ سہی لیکن یہ تو دیکھ سکتی تھی کہ وہ کیسی کنڈیشن میں تھی۔

ماریہ رفتہ رفتہ چلنے پھرنے کی عمر کو پہنچی تو نرس کے لیے اسے سنبھالنا مسئلہ ہو گیا تھا۔ وہ اسے ... ڈانٹ کر ایک جگہ بٹھا دیتی تھی اور کبھی کبھی ماریہ ڈر کر رونے لگتی تو اسے دورہ پڑ جاتا تھا۔ دوسری بار جب ریحان اسے اسپتال لے کر آیا تو ڈاکٹر نے اسے صاف کہہ دیا۔ ''اگر آپ اپنی بچی کی زندگی .... چاہتے ہیں تو اسے خود توجہ دینا ہوگی۔''

بچی اب پرورش کے مرحلے میں تھی اور اس وقت اسے صرف محبت کرنے والے ماں باپ ہی سنبھال سکتے تھے۔ اس کی بیماری کو دیکھتے ہوئے اس کے ذہن کی نشوونما کرنی تھی اور اس کو نفسیاتی ہونے سے بچانا تھا۔ ریحان نے اس مسئلے پر سوچا اور اسے سوائے اس کے کوئی اور حل نظر نہیں آیا تھا کہ جاب چھوڑ دے۔ اسے کمانا بھی تھا۔ اسے ایک خیال آیا کہ وہ کیوں نا پراپرٹی کا کام شروع کر دے کیونکہ اس میں اسے

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

مرزا ثمر عباس 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں
35802552-35386783-35804200
ای میل: jdpgroup@hotmail.com

پورا وقت گھر سے باہر نہیں رہنا پڑتا اور وہ ماریہ کو وقت دے سکتا تھا۔

ریحان نے کوئی درجن سے بھی زیادہ پلاٹ اور جائدادیں حاصل کر رکھی تھیں۔ اتفاق سے ان ہی دنوں زمین اور جائداد کی قیمت میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا تھا۔ ریحان کے پاس سرمایہ نہیں تھا اس لیے وہ اپنے پلاٹوں اور مکانات کو ہی رول کرنے لگا۔ وہ کوئی ایک جائداد بیچ کر اس سے کم قیمت جگہ پر ویسی ہی کوئی زمین یا جائداد لے لیتا تھا۔ قیمت میں فرق اس کی بچت بن جاتا تھا۔ اخراجات کے بعد جو رقم بچ جاتی تھی وہ اسے بھی کہیں انویسٹ کر دیتا تھا۔ بڑے کھلاڑیوں کے مقابلے میں وہ ایک چھوٹا کھلاڑی تھا اس لیے اسے بہت محتاط رہ کر اپنے پتے کھیلنا پڑ رہے تھے۔ اس کے باوجود پہلے سال میں اس نے نہ صرف اپنی پراپرٹی دوگنی کر لی تھی بلکہ ہر مہینے اوسطاً دو لاکھ روپے بھی کمائے تھے۔

ان ہی دنوں اس کی ملاقات اپنے کالج کے زمانے کے دوست ارشاد سے ہوئی۔ وہ خود بھی پراپرٹی کا کام کرنے لگا تھا اور اس نے ریحان سے حساب کتاب پوچھا اور جب ریحان نے بتایا تو وہ ہنسا تھا۔ ”بس ڈھائی تین لاکھ روپے مہینے کے......؟ دوست آج کل لوگ کروڑوں کما رہے ہیں اور یہ بڑے لوگ نہیں ہیں میرے تمہارے جیسے لوگ ہیں۔“

ریحان نے بے یقینی سے کہا۔ ”کروڑوں روپے ماہانہ......“

”اس سے بھی زیادہ۔“ وہ بولا۔ ”میں خود ایسے ہی ایک چکر میں لگا ہوں لیکن میں یہ کام اکیلے نہیں کر سکتا...... مجھے ایک پارٹنر کی ضرورت ہے۔ تم چاہو تو میرے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ ایک سال کی کہانی ہے کم سے کم دو کروڑ روپے کما سکتے ہو۔“

ریحان کو دلچسپی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”کام کیا ہے؟“

”شہر کے وسط اور نواح میں بہت ساری سرکاری زمین برسوں سے بے کار پڑی ہے۔ اگر حکومت چاہتی تو یہ زمین پلاٹ بنا کر مستحق لوگوں کو دیتی تو یہاں بہت اچھی آبادیاں وجود میں آجاتیں لیکن نامعلوم وجوہات کی بنا پر اس قیمتی زمین کو ایسے ہی چھوڑ دیا گیا اور رفتہ رفتہ اس پر قبضہ مافیا حاوی ہوتی چلی گئی۔ ان لوگوں نے یہاں لوگوں کو بسایا اور پھر ان علاقوں میں پانی، بجلی اور گیس کے کنکشن بھی حاصل کر لیے گئے۔ پندرہ بیس سال گزرنے کے بعد یہ آبادیاں لیز بھی ہو گئیں۔ لیکن نہ تو ان میں ٹاؤن پلاننگ ہے اور نہ ہی یہاں عوامی ادارے اور جگہیں ہیں جیسے پارک اور کھیلوں کے میدان وغیرہ۔ بہت ساری آبادیاں نچلے طبقے اور جرائم پیشہ عناصر کا گڑھ بن گئی ہیں اور اکثر میں عوامی سہولتوں کا فقدان ہے۔

ارشاد نے شہر کی مرکزی شاہراہ سے ذرا دور ایک ایسی ہی زمین پر نظر رکھی تھی اور اس کی کوشش تھی کہ اس پر قبضہ کر لے۔ ان دنوں مارکیٹ جس طرح چڑھی ہوئی تھی لوگ چاند اور مریخ پر بھی زمین خریدنے کو تیار تھے۔ ارشاد کے پاس آدمیوں کی کمی نہیں تھی لیکن اسے ایک انویسٹر کی ضرورت تھی جو شروع میں رقم لگا سکے۔ ریحان کو ارشاد کا منصوبہ اچھا لگا تھا اور اس کے خیال میں اس سے کسی کو نقصان نہیں ہو رہا تھا اس لیے یہ کام جائز تھا۔ وہ ارشاد کے ساتھ شامل ہو گیا۔ انہوں نے زمین پر قبضہ کر کے پہلے اس کے گرد چار دیواری بنائی اور پھر اندر پلاٹ بنا کر بیچنے لگے۔ قبضہ کی زمین میں پلاٹ ہمیشہ چھوٹے رکھے جاتے ہیں کیونکہ یہاں غریب طبقے کے لوگ آتے ہیں جو لیز اور اچھی سوسائٹی میں زمین لینے کی سکت نہیں رکھتے...... ریحان نے اسے تجویز دی کہ وہ زمین کو باقاعدہ پلاٹ بنا کر بیچیں اور پلاٹ کا سائز بھی مخصوص کر دیں۔ انہوں نے زمین پر پلاٹ بنا کر بیچنا شروع کر دیے اور چند مہینے کے اندر ساری زمین بک ہو گئی تھی۔ شروع میں انہوں نے اسی گز کا پلاٹ لاکھ کا بیچا لیکن جیسے جیسے قیمت بڑھتی رہی آخر کے پلاٹ انہوں نے پانچ لاکھ کے بھی بیچے تھے۔ ارشاد نے چالاکی دکھائی تھی اور زیادہ حصہ اس نے لیا لیکن ریحان کو بھی تقریباً۔ دو کروڑ روپے ملے تھے اور وہ اپنی اس کامیابی پر مسرور تھا۔

ارشاد نے ایک اور زمین تاڑ رکھی تھی لیکن اس سے پہلے وہ کچھ کرتا اچانک ہی مارکیٹ ٹھنڈی پڑنے لگی... ریحان نے اسی وقت بھانپ لیا کہ مارکیٹ اب ٹھنڈی پڑتی جائے گی۔ اس نے فوراً اپنی بیشتر غیر محفوظ زمین اور جائداد بیچ دی تھی۔ اس نے بس ایک بنگلا اور ایک پلاٹ اپنے پاس رکھا تھا جس کی حقیقی ویلیو تھی اور وہ اسے کبھی بھی کیش کرا سکتا تھا۔ اس کے پاس بہت بڑی رقم آگئی۔ اس نے کبھی سوچا نہیں کہ اس نے یہ رقم کس طرح کمائی ہے۔

ان دنوں وہ گھر میں تھا تو اس نے سوچا کہ ماریہ کا کوئی نہ کوئی علاج تو ہوگا۔ اس کی بچی چھ سال کی ہونے کے باوجود گھر میں قید تھی۔ وہ نہ اسکول جا سکتی تھی اور نہ عام بچوں کی طرح کھیل کود سکتی تھی۔ اسے گھر میں پڑھانے کے لیے ایک ٹیچر آتی تھی۔ تعلیم کے معاملے میں ماریہ بہت ذہین تھی

اور اس نے اتنا کچھ سیکھ لیا تھا جو عام طور سے دوسری کلاس کے بچوں کو آتا ہے۔

ریحان نے انٹرنیٹ پر سرچ کیا تو اسے پتا چلا کہ سنگاپور میں ہارٹ کے ماہرین نے ایسے بچوں کے لیے ایک نیا طریقہ نکالا تھا جن کے دل میں سوراخ ہوتا ہے، ان کا آپریشن اس طرح کیا جاتا ہے کہ وہ دس سال کی عمر سے پہلے ہی صحت یاب ہو جاتے ہیں۔ اس نے اس اسپتال سے رابطہ کیا جہاں یہ آپریشن ہو رہے تھے اور ان میں کامیابی کی شرح ستر فی صد تھی۔ اس سے ماریہ کی رپورٹس مانگی گئیں۔ اس نے رپورٹس بھیج دیں اور ماہرین نے ماریہ کو آپریشن کے لیے موزوں قرار دے دیا۔ یہ ایک آپریشن نہیں تھا بلکہ چھ مہینے کے دوران میں ماریہ کے ہر مہینے بعد ایک آپریشن کیا جانا تھا اور اس دوران میں وہ مسلسل انتہائی نگہداشت کے شعبے میں رہتی۔ کیونکہ یہ انتہائی مہنگا طریقہ تھا۔ ریحان اتنی بڑی رقم کا سن کر پریشان ہوا تھا لیکن اس کی بچی کو صحت مل جاتی تو وہ اس کے لیے بھی تیار تھا۔ اس نے عالیہ سے کہا تو وہ بگڑ گئی۔

”تمہارا دماغ درست ہے۔ دو کروڑ روپے کا مطلب سمجھتے ہو؟“

”ہاں ......میری بچی کی صحت کے مقابلے میں دو روپے بھی نہیں ہیں۔“

”تو جاؤ یہ .... دو روپے کہیں سے کر کے اس کا علاج کرا لو۔“ عالیہ رکھائی سے بولی۔ ”میرے پاس اتنی فالتو رقم نہیں ہے۔“

ریحان نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”عالی یہ تمہاری بچی ہے۔“

”ہاں مجھے معلوم ہے لیکن یہ ابھی ٹھیک ہے کوئی ایمرجنسی تو نہیں ہے۔ دس سال کی عمر میں اس کا آپریشن ہو جائے گا اور یہ ٹھیک ہو جائے گی۔“

”ابھی اس میں چار سال باقی ہیں۔ کیا چار سال تک یہ قید زندگی گزارتی رہے گی۔ عالی کیا اس کا دل کھیلنے کودنے اور اسکول جا کر پڑھنے کو نہیں چاہتا ہوگا۔“

”ہوگا بابا......تم بلاوجہ جذباتی ہو رہے ہو۔ وہ اس زندگی کی عادی ہے اور چار سال بھی گزر جائیں گے۔ جو کام دس لاکھ سے بھی کم رقم میں ہو سکتا ہے اس کے لیے دو کروڑ خرچ کرنا کون سی عقل مندی ہے؟“

”بات رقم کی نہیں ہے، ہماری بچی کی خوشی اور صحت کی ہے۔“

”تو کر لو، تمہیں منع کس نے کیا ہے۔ پراپرٹی کے کام میں تم نے بھی کمایا ہے۔“

یہ درست تھا ریحان کے پاس کوئی ڈیڑھ کروڑ کی رقم تھی اور اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی ستر لاکھ روپے کی جائداد تھی۔ وہ اسے بھی بیچ دیتا تو اسے مطلوبہ رقم مل جاتی۔ اس نے سوچ کر کہا۔ ”ٹھیک ہے میں خود ماریہ کا آپریشن کراؤں گا۔“

”یہ تم نے اچھا فیصلہ کیا ہے اور تم کوئی احسان نہیں کر رہے ہو، تم اس کے باپ ہو۔“

جب عالیہ نے یہ جملہ کہا تو ریحان کو اپنے الفاظ یاد آ گئے جو اس نے اپنی ماں سے کہے تھے۔ اسے حیرت ہوئی وقت کتنی جلدی آدمی کو آئینہ دکھا دیتا ہے۔ اس نے ماریہ کو باہر لے جانے کی تگ و دو شروع کر دی۔

وہ ماریہ کو لے کر سنگاپور روانہ ہو گیا تھا۔ وہاں اسپتال میں ماریہ کے لیے ایک الگ کمرا تھا۔ وہاں جانے والے ہر فرد کو ایک مخصوص لباس پہن کر جانا ہوتا تھا کیونکہ ماریہ کو انفیکشن سے بچانا تھا۔ ریحان نے اپنے لیے ایک کمرے کا فلیٹ لے لیا تھا کیونکہ چھ مہینے تک مستقل ہوٹل میں رہنا اسے بہت مہنگا پڑ سکتا تھا۔ سنگاپور میں انڈیا پاکستان کے بے شمار لوگ ہیں انہوں نے وہاں ہوٹل بھی کھول رکھے ہیں۔ ریحان کا کھانا پینا ایسے ہی ہوٹلوں میں ہوتا تھا۔ دوسرا ابھی کوئی مسئلہ نہیں تھا بس ایک ہی دُھن تھی کہ کسی طرح ماریہ ٹھیک ہو جائے۔

ڈاکٹرز نے ماریہ کا پہلا آپریشن ایک ہفتے میں کر دیا تھا۔ ریحان نے اس کے علاج کی ساری رقم پیشگی جمع کرا دی تھی۔ پہلا آپریشن کامیاب رہا تھا۔ ریحان روز دن میں دو بار ماریہ کو دیکھنے آتا تھا۔ ڈاکٹرز نے اسے ایک گھنٹے سے زیادہ بیٹھنے کی اجازت نہیں دی تھی کیونکہ ماریہ کو آرام کی ضرورت تھی اور وہ صرف جاگنے اور بولنے سے بھی تھک جاتی اس لیے اسے زیادہ تر مسکن دواؤں کے زیر اثر رکھا جاتا تھا۔

ایک مہینے بعد اس کا دوسرا آپریشن بھی ہو گیا تھا۔ اس دوران میں عالیہ نے اس سے تین بار رابطہ کیا تھا اور سرسری سے انداز میں ماریہ کی خیریت دریافت کی تھی۔ ریحان کو اب احساس ہوتا تھا کہ اس نے کس بے حس اور خود غرض عورت کے لیے اپنے گھر والوں کو چھوڑا تھا۔ اسے اپنی بچی کی بھی پروا نہیں تھی۔ جبکہ ماریہ سے جب بھی بات ہوتی، ماں کے بارے میں ضرور پوچھتی تھی۔ ریحان اس سے جھوٹ کہتا تھا کہ اس کی ممی کا فون آیا تھا لیکن وہ سو رہی تھی۔ دوسرے آپریشن کے بعد ماریہ کو ماں زیادہ یاد آنے لگی تھی۔ ایک بار

ریحان نے بڑی کوشش کے بعد ماریہ کی ماں سے بات کرا دی۔ اصل میں عالیہ اس کی کال ہی ریسیو نہیں کرتی تھی۔ اس نے ماریہ سے بھی بہت بیزاری سے بات کی تھی۔ ماریہ نے ماں کی بے رخی اتنی محسوس کی کہ اس کی آنکھ میں آنسو آ گئے تھے۔ اس کے دل کی دھڑکن بدل گئی تھی اور ڈاکٹرز کو اسے ہنگامی ٹریٹ منٹ دینا پڑی تھی۔

تیسرے آپریشن کے بعد ڈاکٹرز نے امید ظاہر کی تھی کہ اب ماریہ صحت یاب ہو جائے گی اور چھٹے آپریشن کے بعد اس کے دل کا سوراخ مکمل طور پر بند ہو جائے گا۔ اس کے بعد وہ ایک عام بچی کی طرح زندگی گزار سکے گی۔ ان دنوں ماریہ اس سے سوال کرنے لگی تھی۔ گھر کے بارے میں ماں اور بہن کے بارے میں۔ پھر اس نے ریحان سے اس کے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے بارے میں پوچھا۔ ریحان اسے بتاتا رہا۔ ماریہ حیران ہوئی تھی کہ اس کی تین پھپھیاں بھی تھیں۔ وہ بڑی ذہانت سے ریحان سے اگلواتی رہی تھی کہ وہ لوگ ان سے الگ کیوں تھے۔ جب ریحان بتاتا تو وہ چپ ہو کر سوچنے لگتی تھی۔ ریحان کو اس کے اس انداز سے خوف آتا تھا۔ وہ کسی بڑی اور سمجھدار لڑکی کی طرح سوچتی تھی۔ اس کے ذہن میں نہ جانے کیسی کیسی سوچیں آتی تھیں۔ جب اس کا پانچواں آپریشن بھی ہو گیا تھا تو ایک دن اس نے باپ سے کہا۔

''پاپا میں واپس نہیں جانا چاہتی۔''

ریحان اس کے لہجے سے خوف زدہ ہو گیا۔ ''کیوں بیٹا...... ہم اپنے ملک واپس جائیں گے۔''

''پاپا وہاں ممی ہوں گی اور مجھے ممی کے ساتھ نہیں رہنا۔''

''وہ تمہاری ماں ہیں۔''

ماریہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''وہ میری کچھ نہیں ہیں۔ انہوں نے کبھی مجھے کال نہیں کی۔''

ریحان اس کا دکھ سمجھ رہا تھا لیکن یہ اس نے سوچا نہیں تھا کہ ماریہ کی بات درست ثابت ہو گی۔ چھٹے اور آخری آپریشن کے دوران اچانک اس کے دل نے دھڑکنا چھوڑ دیا۔ ڈاکٹرز نے ہر ممکن کوشش کی لیکن دل دوبارہ نہیں دھڑکا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دل نے کیوں کام بند کیا کیونکہ بہ ظاہر کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ آدھے گھنٹے بعد انہوں نے ہار مان لی۔ آپریشن روم میں لگی شیشے کی دیوار کے پار سے ریحان یہ سب دیکھ رہا تھا اور جب ڈاکٹرز نے ہار مان کر ماریہ کو سفید چادر سے ڈھک دیا تو اسے لگا جیسے اس سے جینے کا آخری سہارا بھی چھن گیا ہے۔

سرجن نے آ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ وہ اسے تسلی دے رہا تھا۔ ''مجھے افسوس ہے۔''

''نہیں ایسی بات نہیں ہے اسے سنگاپور پسند آ گیا تھا اور وہ یہیں رہنا چاہتی تھی۔'' ریحان بولا۔ ''میں اسے یہیں چھوڑ کر جاؤں گا۔''

اس نے عالیہ کو اطلاع کر دی تھی لیکن اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ ماریہ کو یہیں دفنا کر آ رہا ہے۔ اس نے ماریہ کو سنگاپور میں مسلمانوں کے قبرستان میں دفنا دیا تھا اور خالی ہاتھ واپس آیا۔ عالیہ نے کوئی خاص ردعمل نہیں دکھایا تھا۔ اس نے سرسری سے انداز میں پوچھا تھا اور پھر اپنی باتیں سنانے لگی تھی۔ ریحان بے خیالی میں سنتا رہا۔ پھر اس نے چونک کر عالیہ سے پوچھا۔ ''فاریہ کہاں ہے؟ میں کل سے آیا ہوا ہوں اور وہ مجھے ایک دفعہ بھی نظر نہیں آئی۔''

''ہو گی اپنے فرینڈز کے ساتھ۔''

''کیا مطلب، یہ اس کے فرینڈز کہاں سے آ گئے؟''

عالیہ ہنسی۔ ''ریحان صاحب آنکھیں کھولیں۔ اب فاریہ جوان ہو گئی ہے اور ظاہر ہے اس کی ایکٹیوٹیز بھی جوان لڑکیوں والی ہوں گی۔''

''جوان لڑکیوں والی۔'' ریحان نے زیرِ لب دہرایا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ جس سوسائٹی کا حصہ تھے وہاں جوان لڑکیوں کی کیا سرگرمیاں تھیں۔ وہ آزادانہ لڑکوں کے ساتھ گھومتی تھیں۔ راتوں کو دیر سے گھر آتی تھیں۔ یقیناً فاریہ کے بھی یہی معمولات ہوں گے۔

اگلے دن اس نے فاریہ کو دیکھا تو وہ ہنستے کھلکھلاتے اس کے گلے لگ گئی۔ ''پاپا کیسے ہیں آپ؟''

''ٹھیک ہوں، تم نے ماریہ کا نہیں پوچھا۔''

''پاپا وہ تو اب ماضی کی بات ہو گئی ہے۔ اس کی ڈیتھ کا سن کر میں بہت روئی تھی۔'' اس نے کہا۔ وہ تیار ہو کر کہیں جا رہی تھی۔

''تم کہاں جا رہی ہو؟''

فاریہ ایک لمحے کو گڑبڑائی پھر اس نے کہا۔ ''پاپا فرینڈز گیدرنگ ہے۔ اس میں جا رہی ہوں۔''

نہ جانے کیوں ریحان کو لگا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ وہ کہیں اور جا رہی تھی۔ وہ جب ہاتھ ہلاتی باہر نکلی تو اس کے جانے کے چند لمحے بعد ریحان بھی اٹھا اور اس کے پیچھے نکل گیا۔ فاریہ کے پاس اپنی کار تھی۔ وہ کار میں روانہ ہوئی تو ریحان اپنی کار میں اس کے پیچھے تھا۔ مین روڈ تک آتے

ہوئے وہ محتاط رہا تھا۔ اس کے بعد وہ آرام سے فاریہ کا تعاقب کرتا رہا۔ وہ سی ویو کی طرف جا رہی تھی۔ کوئی نصف گھنٹے بعد فاریہ کی کار ایک بڑے سے احاطے میں داخل ہوئی تھی۔ ریحان نے کار اندر لے جانے کے بجائے ایک طرف روک دی اور اتر کر گیٹ کی طرف بڑھا۔ وہاں موجود گارڈ نے اسے روک لیا۔ ''سر پاس پلیز۔''

ریحان سمجھ گیا کہ یہ کوئی مخصوص جگہ تھی جہاں پاس کے بغیر داخلہ ممکن نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ ''میں ممبر شپ لینے آیا ہوں۔''

گارڈ نے سوچا اور اسے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ ''دائیں طرف آفس ہے سر وہاں چلے جایئے گا۔''

لیکن ریحان دفتر میں جانے کے لیے نہیں آیا تھا۔ گارڈ کے سامنے وہ دفتر میں داخل ہوا تھا۔ جیسے ہی گارڈ گیٹ سے باہر ہوا وہ بھی باہر آ گیا اور اس نے احاطے میں ذرا دور نظر آنے والی عمارت کا رخ کیا۔ لیکن فاریہ اسے پہلے ہی نظر آ گئی تھی وہ نہ ہونے کے برابر لباس میں سوئمنگ پول میں تھی اور ایک لڑکے نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال رکھا تھا۔ دونوں کے ہاتھ میں ارغونی کے جام تھے۔ فاریہ نے کچھ کہا تو لڑکے نے قہقہہ لگایا اور فاریہ کے ہونٹوں کی طرف جھک گیا۔ ذرا دور سے ریحان پھٹی پھٹی نظروں سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اس کی بیٹی جسے وہ معصوم سمجھتا آیا تھا، اس وقت ... مجسم بے حیائی بنی ہوئی تھی۔

ریحان پلٹ کر اندھا دھند وہاں سے چل پڑا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں جا رہا تھا۔ وہ ساری عمر جن چیزوں کو کامیابی سمجھتا رہا تھا، وہ اصل میں اس کی ناکامی تھی۔ وہ جسے زندگی کا حاصل سمجھتا رہا تھا اصل میں وہی اس کا خسارہ تھا۔ اس نے پایا تھا صرف کھونے کے لیے تھا۔ اب اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ اس کے پیروں سے پانی ٹکرایا تو وہ چونکا تھا۔ اسے معلوم نہیں ہوا تھا کہ وہ کب سمندر تک آ گیا تھا۔ دور سورج غروب ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ چونکا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے اس نے یہ منظر پہلے بھی دیکھا ہے۔ وہ آگے بڑھنے لگا پانی اس کے پیروں تک آ گیا تھا۔

''یہ میری کامیابی ہے یا میری ناکامی ہے۔'' اس نے بے خیالی سے سوچا۔ ''اپنی مرضی سے زندگی گزار کر بھی میں نے کیا پایا؟''

یہ سوچ آتے ہی وہ چونک گیا تھا پھر اسے سب یاد آنے لگا۔ اس کی ناکام اور مایوس زندگی جس میں اس نے صرف تلخیاں محسوس کی تھیں، انجام کار حالات نے اسے وہاں پہنچا دیا جہاں اس کے پاس سوائے خودکشی کے اور کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا۔ اس نے سمندر میں ڈوب کر مرنا چاہا تھا اور مرنے سے پہلے اس نے سوچا تھا کہ اگر اسے ایک موقع اور ملتا تو وہ اس زندگی کو کس طرح گزارتا۔ اس نے حیرت سے سوچا تو کیا یہ اسے موقع ملا تھا؟ اللہ نے اسے ایک چانس دیا تھا کہ وہ زندگی کو ایک بار اپنی مرضی سے گزار کر دیکھ لے۔

اس نے پہلے کے مقابلے میں بہترین تعلیم حاصل کی۔ اس نے پہلے کے مقابلے میں اپنی پسند کی شادی کی۔ اپنی پسند کا ذریعۂ روزگار تلاش کیا، پہلے کے مقابلے میں بہت دولت کمائی۔ اپنی من مانی کی اور جو چاہا حاصل کر لیا۔ اس بار وہ اپنی بچی کا علاج کرانے سے معذور نہیں تھا اور اسے سنگاپور تک لے کر گیا۔

مگر اس کی مرضی کے باوجود نتیجہ کیا نکلا، اس کے ماں باپ اس سے ناراض اس دنیا سے چلے گئے۔ تین بہنیں اپنے اکلوتے بھائی کا نام بھی لینے کی روادار نہیں ہیں۔ اگر وہ ان سے ملنا چاہے گا تو وہ انکار کر دیں گی۔ اس نے جس من پسند عورت سے شادی کی، اس نے اسے گھر والوں سے دور کر دیا۔ اسے خودغرض بنا دیا۔ اس نے دولت کی خاطر رشتوں کو نظر انداز کیا اور جس کی خاطر سب سے منہ موڑا اسے ریحان کی کبھی پروا نہیں رہی تھی۔

عالیہ اس کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ اس کی اولاد اس کی نہیں رہی۔ ایک ماں کے نقش قدم پر چل نکلی اور ایک ریحان کی تمام تر کوشش کے باوجود دنیا سے منہ موڑ گئی۔ اس کے مقدر کی تیسری اولاد کو اس کی بیوی نے دنیا میں آنے سے پہلے خود اپنے ہاتھ سے ختم کر دیا۔ جس دولت کو وہ کامیابی کی معراج سمجھتا رہا تھا اور جسے کمانے کے لیے اس نے کتنی تگ و دو کی تھی، وہ یوں اس کے ہاتھ سے نکل گئی جیسے پانی بند مٹھی سے نکل جاتا ہے۔ اب اس کے پاس کچھ باقی نہیں رہا تھا۔

راستہ مختلف تھا لیکن اس کی منزل وہی تھی۔ اس کے سامنے وسیع سمندر تھا اور اس بار پچھتاوا شدید تھا۔ پچھلی بار وہ مرنے پر مجبور تھا تو اس بار اسے موت محبوب لگ رہی تھی جو اسے دنیا کی ساری پریشانیوں اور غموں سے نجات دلانے والی تھی۔ اس کا ذہن ماضی اور حال کے موازنے کے دوران خود بہ خود نفع نقصان کا حساب لگاتا جا رہا تھا۔ پچھلی بار وہ ذاتی خسارے سے دوچار ہوا تھا لیکن اس نے رشتوں کو نہیں کھویا تھا۔ اس کے ماں باپ اس سے راضی خوشی اس دنیا سے گئے تھے۔ اس کی بیوی شاید اس سے نفرت کرتی تھی لیکن وہ اس کی وفادار تھی۔ اس کی بچیاں غریب اور زندگی کی آسائشوں کو

ترستی تھیں لیکن وہ باحیا اور اپنے باپ کی عزت کا پاس رکھنے والی تھیں۔ اس کی بہنیں اس سے پیار کرتی تھیں۔ لوگ اس کے عزم و حوصلے اور مشکلات میں اس کی راست بازی پر اس کی ثابت قدمی کی مثال دیتے تھے۔ اب اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ نہ دنیا اور نہ دنیا والے، اس نے سب گنوا دیا تھا۔ اب صرف ایک زندگی بچی تھی جو کسی بوجھ کی طرح تھی۔ اس نے زور آور لہروں کی طرف دیکھا اور سوچا۔ ''مجھے یہ بوجھ بھی اتار دینا چاہیے۔''

وہ لہروں میں آگے کی طرف بڑھنے لگا جو زور میں اسے پیچھے دھکیل رہی تھیں۔ شاید سمندر بھی اسے قبول کرنے کو تیار نہیں تھا لیکن وہ واپس جانے کے لیے نہیں آیا تھا۔ پانی اب اس کے سینے تک آ رہا تھا۔ اس نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے خود کو پانی کے سپرد کر دیا، اس بار کسی قدر مزاحمت کے ساتھ سہی لیکن لہروں نے اسے قبول کر لیا۔ ڈوبنے سے پہلے اسے ایک خیال آیا کہ اگر اسے اختیار دیا جائے تو وہ کون سی زندگی قبول کرے گا۔ تاریک ہوتے ذہن نے اس کا جواب دیا تھا۔

''اپنی پہلی زندگی جو اس کے معبود نے اس کے لیے چنی تھی۔''

☆☆☆

اُسے آوازیں آ رہی تھیں۔ ''ریحان...... آنکھیں کھولو...... ابو میری طرف دیکھیں...... بھائی پلیز اٹھ جائیں نا۔''

اس نے بہ مشکل آنکھیں کھولیں۔ اس کے چاروں طرف اس کے پیاروں کے چہرے تھے۔ شکیلہ، اس کی بچیاں، اس کی بہنیں اور بہنوئی سب موجود تھے۔ اسے لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ اس نے تو یہ سب گنوا دیا تھا بلکہ جو اس نے اپنی خواہش سے پایا تھا، وہ بھی گنوا دیا تھا۔ وہ خالی ہاتھ سمندر میں ڈوبنے گیا تھا۔ پھر اسے یہ سب کیسے واپس مل گیا۔ کیا اس نے بے ہوشی کے دوران کوئی خواب دیکھا تھا۔

''میں کہاں ہوں؟'' اس نے بے ساختہ پوچھا۔

''اسپتال میں۔'' شکیلہ نے بھیگی آواز میں کہا۔ ''آپ نے ایسا کیوں کیا؟''

''میں نے ایسا کیوں کیا؟'' وہ بے خیالی میں بولا۔

''میں مرجانا چاہتا تھا۔ میرے پاس رہا ہی کیا تھا۔''

''ایسا کیوں کہتے ہیں۔'' شکیلہ تڑپ کر بولی۔ ''آپ مجھے اپنا نہیں سمجھتے لیکن یہ بچیاں تو آپ کی ہیں۔''

''بھائی ہم سب آپ کے ہیں۔'' مونا بولی۔ وہ اس سے بہت پیار کرتی تھی۔ اس وقت بھی رو رو کر اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

''تم نے شاید ہمیں اپنا نہیں سمجھا۔'' زاہد آگے آ کر بولا۔ ''لیکن ہم تمہیں بھائیوں کی طرح سمجھتے ہیں اور کسی مشکل وقت میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑیں گے، تمہاری پریشانیاں ہماری پریشانیاں ہیں۔''

سب اسے یقین دلا رہے تھے۔ وہ اکیلا نہیں تھا اور اس نے کچھ نہیں کھویا تھا۔ شکیلہ اسے بتا رہی تھی کہ نوریہ کو کل ہی ایک ڈاکٹر کو دکھایا ہے اور اس نے بتایا کہ اس کے دل کی حالت اتنی بہتر ہو رہی ہے کہ اسے دواؤں کی زیادہ ضرورت نہیں اور چند سال بعد آپریشن سے اس کا یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل ہو جائے گا۔ فاریہ اس سے لپٹ گئی تھی۔

''ابو ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔ ہمیں بس آپ کی ضرورت ہے۔''

زاہد اور دوسرے بہنوئی اسے بتا رہے تھے کہ ایک نوکری نہ رہی تو کیا ہوا ایک در بند کرنے والا ستّر در کھولتا ہے۔ زاہد نے کہا وہ واپس جاتے ہی اس کے لیے جاب تلاش کرے گا اور اسے ہر صورت اس کے پاس دبئی آنا ہو گا۔ شکیلہ اسے کہہ رہی تھی کہ وہ اس سے محبت نہیں کرتا تو کیا ہوا، وہ اس کے سر کا سائبان اور اس کی بچیوں کا باپ تو ہے۔ اسے ریحان کی ہمیشہ ضرورت رہے گی۔

ریحان نے آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن آنسو کوشش کے باوجود نہیں رکے تھے۔ اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے تھے۔ وہ اپنے رب کا نافرمان اور ناشکر گزار بندہ تھا۔ جسے اپنے رب پر ایمان تو تھا لیکن اعتبار نہیں تھا۔ اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کی خواہش میں وہ یہ بھول گیا تھا کہ کاتبِ تقدیر اللہ ہی ہے اور وہ اس کی مرضی سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتا۔

''اے اللہ مجھے معاف فرما، میری توبہ قبول فرما اور مجھے اپنی رضا میں راضی رہنے کی توفیق عطا فرما۔''

دعا مانگ کر اس کے دل کا بوجھ یک دم ہلکا ہو گیا تھا اسے لگا اس کے رب نے اسے معاف کر دیا ہے۔ اس نے آنکھیں کھول کر مسکرا کر اپنے پیاروں کو دیکھا جو اسے مسکراتے دیکھ کر کھل اٹھے تھے۔ اس بار اس نے خود کو خدا کا شکر ادا کرنے سے عاجز پایا تھا۔ اس نے کچھ نہیں کھویا تھا، پایا ہی پایا تھا۔

اچھا آدمی

سلیم انور

دنیا والوں کی نظر میں آدمی چاہے کتنا ہی برا ہو... کم از کم اپنی نظر میں اس کی عزت ہونی چاہیے... مشکل اور دگرگوں حالات سے نبرد آزما ایک قرض دار کی روداد... ایک خوب صورت اور دیرپا تصور نے اس کی مشکل گھڑیوں کو سہل بنا دیا...

احساسات و جذبات سے لبریز حساس دل رکھنے والوں کے لیے خاص تحفہ......

''میں دو قسم کے لوگوں سے کاروبار کیا کرتا ہوں، مسٹر قلاش۔'' بھاری سود وصول کرنے والے قرض خواہ نے کہا۔ ''ایک قسم وہ کہ ان پر جو کچھ واجب الادا ہوتا ہے، اس کی ادائیگی کرتے ہیں اور دوسری وہ جو چیختے چلّاتے ہوئے مرجاتے ہیں۔ کیا تمہارے پاس میری رقم تیار ہے؟''

سود خور آیا اور خوفناک دھمکیاں دے کر لوٹ گیا۔

اگلے روز دبیر کی کھوپڑی کے ایک گہرے گھاؤ سے خون بہتا ہوا اس کی قمیص کو تر اور اس کے چھوٹے سے ہارڈ

ویئر اسٹور کے زرد فرش کو رنگین کر رہا تھا۔ زخمی ہونے کے باوجود دبیر کا ذہن کچھ اور سوچ رہا تھا۔ دبیر کے پاس کام پر پہننے کے لیے صرف چار اچھی قمیصیں باقی رہ گئی تھیں۔ اب صرف تین باقی رہ جاتیں۔

اس سے ایک نہیں بلکہ حقیقت میں دو غلطیاں سرزد ہو چکی تھیں اور اب وہ ایک اور غلطی کرنے جا رہا تھا۔

''تم ٹھیک تو ہو؟'' دراز قامت شخص نے پوچھا۔ ''کیا ہوا ہے؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' دبیر نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں اب بھی اس کے دور دراز آبائی وطن کی زبان کا عنصر موجود تھا۔ ''مجھے...... مجھے لوٹ لیا گیا ہے۔ میرے اسٹور میں ڈکیتی ہوئی ہے۔''

'اوہ! یہ میں نے غلط کہہ دیا، دبیر نے سوچا۔ مجھے یہ کہنا چاہیے تھا کہ میں پھسل کر گر پڑا تھا یا شیلف کے اوپر سے کوئی شے میرے سر پر آن پڑی تھی۔

''بیٹھ جاؤ!'' دراز قامت شخص نے کہا۔ ''میں ایمبولینس کے لیے فون کر رہا ہوں۔''

''نہیں، پلیز نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ٹھیک ہوں۔'' دبیر کے لہجے میں التجا تھی۔

جب پولیس آئی تو دبیر نے ان سے وہی جھوٹ بول دیا جو وہ بھاری سود وصول کرنے والے قرض خواہ سے کہنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ قرض خواہ کو آج ہی آنا تھا۔ دبیر نے پولیس کو بتایا کہ ایک ڈاکو اس کی تمام کی تمام رقم لوٹ کر لے گیا ہے۔ اس کے سر کا گھاؤ اس واردات کا ٹھوس ثبوت ہے۔

بعد میں اس نے قرض خواہ کو بھی یہی بتانے کا منصوبہ بنایا تھا کہ اس نے قرض کی قسط کی رقم تیار رکھی ہوئی تھی اور ادائیگی کا منتظر تھا کہ ڈاکو آ گیا اور سب کچھ لوٹ کر لے گیا۔

لیکن دبیر ابھی خود کو زخمی کرنے کی تدبیر سوچ ہی رہا تھا کہ اس کا سر زوردار انداز میں ایک آہنی شیلف سے ٹکرا گیا اور نکیلے کونے نے اس کی کھوپڑی میں ایک گہرا گھاؤ لگا دیا۔ اور اسی لمحے وہ دراز قامت گاہک اس کے اسٹور میں داخل ہوا۔ اس کے اسٹور میں گاہکوں کی آمد نہ ہونے کے برابر تھی اور وہ گاہک بھی عین اسی غلط وقت پر وارد ہوا تھا۔

''تمہارا کہنا ہے کہ وہ ڈاکو یہاں اس کاؤنٹر پر آیا تھا؟'' پولیس کے سراغ رساں نے اس سے چبھتا ہوا سوال کیا۔ بہ ظاہر وہ پاورڈرلز کو دیکھ رہا تھا۔

دبیر کا سر چکرا رہا تھا۔ بہت زیادہ جھوٹ بو... کچھ یاد رکھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

''ہاں۔''

''سو تمہیں اسے اچھی طرح سے دیکھنے کا موقع... تھا۔ لیکن تمہارا کہنا ہے کہ تم اس کا حلیہ بیان نہیں کر... سراغ رساں نے کہا۔

''معاف کرنا، کیا کہا؟''

''ویل، ڈاکو عین اس جگہ یہاں کھڑا ہوا تھا جہاں تم... کھڑے ہوئے تھے۔ اگر وہ خود کو ایک گاہک ظاہر کر... تھا تو اس نے اپنا چہرہ ڈھانپا ہوا نہیں ہوگا اور نہ ہی... ماسک پہنا ہوا ہوگا اور پھر اس نے تمہارے سر پر ضرب... دی۔ سو تم نے اسے بہت قریب سے دیکھا ہوگا۔ اس... چہرے کو بغور دیکھ لیا ہوگا؟'' سراغ رساں کی تفتیش ج... تھی۔

''میرا خیال ہے، اس وقت میرا سر......''

''میں سمجھ رہا ہوں۔ تم اطمینان سے سوچ کر بتاؤ... دیکھنے میں کیسا تھا؟''

دبیر کے ذہن میں اس وقت اپنے ہم وطن اور... کے دوست امروز کا خیال آیا۔ وہ سوچنے لگا کہ امروز... نوجوان اب دیکھنے میں کیسا لگتا ہوگا۔

''مجھے اب کچھ کچھ یاد آ رہا ہے۔'' دبیر نے کہا۔... نے اپنے ذہن میں جوان امروز کے بننے والے خا... بیان کرنا شروع کر دیا جو کہ اب حقیقت میں نہ صرف عم... کئی برس بڑا ہو چکا تھا بلکہ نصفِ دنیا پار کے فاصلے پ... تھا۔

☆☆☆

قرض خواہ دوبارہ آ گیا۔ دبیر کی ڈکیتی کی داستان... کر اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور اس کے پیٹ... ایک گھونسا جڑ دیا۔ اس نے دبیر سے کہا کہ وہ قسط کی رقم... دن کے اندر اندر بندوبست کر دے ورنہ وہ اسے قتل کر د... گا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اس پر اس کے اسٹور میں ہی موجود... ڈرل میں سے کوئی ایک اس پر استعمال کر ڈالے اور ا... گھائل کر دے۔

ساتھ ہی اس نے اپنی دو انگلیاں بلند کر دیں... ''تمہارے پاس دو دن کی مہلت اور ہے۔'' اس نے تر... لہجے میں دبیر سے کہا۔

☆☆☆

دو دن بعد فون کی گھنٹی بجی۔ فون پولیس کے سراغ رساں کا تھا۔

''ہم نے ڈاکو کو پکڑ لیا ہے، مسٹر دبیر! وہ بالکل وہی شخص ہے جس کا حلیہ تم نے بیان کیا تھا اور ہم نے اس سے وہ رقم بھی برآمد کر لی ہے جو اس نے تم سے لوٹی تھی۔''

پولیس کی خبر نے دبیر کو بالکل ہی بوکھلا دیا۔

دبیر، پولیس اسٹیشن پر جائزہ لینے والے شیشے کی اوٹ سے اس نوجوان کو دیکھ رہا تھا جسے پولیس نے حراست میں لیا تھا۔ وہ نوجوان امروز سے مشابہ نظر آ رہا تھا لیکن وہ امروز نہیں تھا، ہرگز نہیں۔

''تم خوش قسمت ہو۔'' پولیس سراغ رساں نے کہا۔ ''ہم معمول کے مطابق ٹریفک کو چیک کر رہے تھے لیکن یہ شخص صاف صاف گفتگو کرنے سے گریزاں تھا۔ جرمانے کے ایک ٹکٹ کی عدم ادائیگی کے متعلق بھی اس نے پہلو تہی کی کوشش کی۔ اس کی مشکوک حرکتوں کی وجہ سے جب ٹریفک افسر نے اس کی کار کی تلاشی لی تو اس کی سیٹ کے نیچے سے ایک بڑی رقم ملی جو اس نے چھپائی ہوئی تھی۔ تب اس ٹریفک افسر نے ہیڈ آفس سے رابطہ کیا اور اس کے بارے میں معلومات فراہم کیں تو اس کا حلیہ ڈاکو کے بیان کردہ حلیے سے مطابقت رکھتا تھا۔ یہی وہ ڈاکو ہے اور اسی نے تمہارے اسٹور کو لوٹا تھا۔''

''میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔'' دبیر نے جواب دیا۔ ''ہوسکتا ہے کہ یہ وہ آدمی نہ ہو اور تم نے غلط آدمی پکڑ لیا ہو۔ وہ رقم بھی اس کی ذاتی ہوسکتی ہے۔''

''تم بالکل اسی کی طرح باتیں کر رہے ہو۔ اس کا بھی یہی کہنا ہے کہ رقم اس کی اپنی ہے جو اس نے اِدھر اُدھر کے کاموں سے کمائی ہے۔ اس کے ویزے کی معیاد بھی ختم ہو چکی ہے۔ اس کے پاس ورک پرمٹ بھی نہیں ہے اور وہ اپنی کار میں رہتا ہے۔ وہ رقم اس لیے بچا رہا ہے کہ یہاں اپنے قیام کے کاغذات درست اور مکمل کر سکے اور کلیرنس حاصل کر لے۔ پھر وہ کسی تعلیمی ادارے میں داخلہ لے کر تجارت کے مضمون میں ڈگری لینا چاہتا ہے تاکہ اپنے کاروبار کا آغاز کر سکے۔ یہ تمام باتیں خود اس نے ہمیں بتائی ہیں۔''

دبیر کو اب اس نوجوان میں اپنے بچپن کے دوست امروز کے بجائے خود اپنا آپ دکھائی دے رہا تھا۔ کئی برس پہلے کی اپنی جدوجہد، اپنے ارادے، اپنا عزم...... سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگا۔

ایک چراغ اور بجھا......!

ابھی ہم شاہد حسین، محی الدین نواب، کاشف زبیر، سلیم فاروقی، ایم اے راحت اور مختار آزاد کے غم سے ابھر بھی نہیں پائے تھے کہ ایک اور غم ناک خبر آ گئی۔ 31 اگست 2018ء کو صبح ہی صبح لاہور سے کال آئی کہ ذاکر حسین آرٹسٹ بھی ہمارا ساتھ چھوڑ گئے۔ ذاکر حسین عرصہ دراز سے صاحب فراش تھے۔ اس دوران میں ان سے گفتگو کا سلسلہ جاری و ساری تھا لیکن یہ وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اس طرح اچانک روٹھ جائیں گے۔ وہ ڈائجسٹوں کی دنیا کے بے تاج بادشاہ کہلانے کے مستحق تھے۔ رنگوں اور برش سے کھیلنے والی انگلیوں میں ہمہ وقت ایک سگریٹ سلگتی رہتی تھی۔ ان کے تخلیق کردہ حسین چہرے سرورق کی جان ہوا کرتے تھے۔ ادارہ ایک ایسے فنکار سے محروم ہو گیا ہے...... جس کی جگہ کوئی تصویر ساز پُر نہیں کر سکتا۔

تمام قارئین سے التماس ہے کہ وہ ایک بار سورۂ فاتحہ اور تین بار سورۂ اخلاص..... پڑھ کر ایصالِ ثواب کریں۔

☆☆☆

''ہوسکتا ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے، وہ سچ ہو۔'' دبیر نے سراغ رساں سے کہا۔

''نہیں۔ یہ وہی ڈاکو ہے۔ میری بات پر یقین کرو۔ میں ایسے تمام بہانے، تمام جھوٹ، بدنصیبی کی تمام داستانیں بارہا سن چکا ہوں جو ایسے تیز طرار اور ہر ڈھب سے کام نکالنے والے تخلیق کرتے رہتے ہیں۔'' سراغ رساں نے یہ کہہ کر دبیر کے چہرے پر نظریں جمادیں۔ پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔ ''ہمیں تمہارا تعاون درکار ہے، مسٹر دبیر! اب ہی تمہیں تمہاری رقم واپس مل سکتی ہے۔ تمہیں اپنی رقم واپس چاہیے نا؟ ٹھیک ہے؟''

''مجھے اپنی رقم کی اشد ضرورت ہے۔ کب ملے گی؟''

''مقدمے کے بعد۔''

''میں اب بھی اس کے وہی ڈاکو ہونے کے بارے میں پریقین نہیں ہوں۔'' دبیر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''دیکھو، یہی وہ ڈاکو ہے۔ تمہارے تعاون کرنے سے یہ جیل چلا جائے گا۔ اس کے بغیر وہ یہ رقم لے کر یہاں سے چلتا بنے گا اور تم دیکھتے رہ جاؤ گے۔ سو تم وہی کرو جو درست ہے۔''

''میں یقینی طور پر وہی کروں گا۔'' دبیر نے طوعاً و کرہاً جواب دیا۔

☆☆☆

دبیر سوچ میں ڈوبا ہوا اپنے اسٹور کی جانب چل دیا۔ وہ ایک اچھا آدمی بننا چاہتا تھا...... وہ ایک اچھا آدمی تھا۔ وہ یہ بات اچھی طرح سے جانتا تھا۔ اچھا آدمی ہونے کے ناتے وہ اپنی فیملی کا بہتر طور پر خیال رکھنے کی کوشش کررہا تھا لیکن جب اسے اپنے کاروبار کے لیے رقم کی ضرورت پڑی تو بینک والوں نے انکار کردیا۔ ان کا کہنا تھا کہ گو وہ اس دکان کا تیس سال سے مالک ہے لیکن دکان بے حد چھوٹی، پرانی اور سب سے الگ تھلگ ویرانے میں ہے اس لیے مقابلے بازی کے اس جدید دور میں اور بڑے بڑے ڈسکاؤنٹ اسٹورز کی موجودگی میں اس کا قائم رہنا ممکن نہیں ہے۔

قرض کے تحفظ کی خاطر اس نے بینکوں کو اپنے اسٹور کو رہن رکھنے اور اپنی زندگی کی بیمہ پالیسی کی ضمانت دینے کی پیشکش کی لیکن انہوں نے اسے ناکافی قرار دے دیا اور اس کی قرض کی درخواست رد کردی۔

دبیر ایک اچھا آدمی تھا...... ایک فیملی مین تھا لیکن بینک والوں کی نظر میں ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی نہ ہی اس شخص کی نگاہ میں ان باتوں کی کوئی اہمیت بالآخر دبیر کو قرض دینے پر راضی ہوگیا تھا اور پھر وہ قسطیں وصول کرتا رہا اور کبھی مطمئن نہ ہو پایا۔ وہ اب اپنی اصل رقم سے کہیں زیادہ رقم وصول کرچکا تھا اور رقوم کا مطالبہ کرتا رہتا تھا۔

دبیر نے اپنے اسٹور کا تالا کھولا اور اندر داخل ہو اسٹور میں رکھی چیزوں کی مختلف مہک اس کی حسِ شامہ ٹکرائی۔ لکڑی کی خوشبو اور قسم قسم کے اوزاروں کی دمک اسے بھلی لگنے لگی۔

دبیر کے اسٹور میں آنے کے پندرہ منٹ بعد سو بھی وارد ہوگیا۔ اس نے اسٹور میں قدم رکھنے کے بعد سے تالا لگادیا۔

پھر تین گھنٹے بعد وہ وہاں سے نکل گیا۔ اس جانے کے بعد دبیر چھوٹے سے کسٹمر سروس کاؤنٹر پیچھے فرش پر ہاتھ پیر پھیلائے آخری سانسیں لے رہا سود خور نے دروازہ بند کرکے، اس کے منہ میں حلق کپڑا ٹھونس کر اس پر بے پناہ تشدد کیا تھا۔ دبیر کو معلوم کہ وہ زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکے گا۔ وہ اس کے کی ایک کھلی واردات تھی۔ پولیس سے انشورنس کمپنی تک کوئی بھی اس قتل پر شبہ نہیں کرسکتا تھا۔ وہ ایک شریف اچھا آدمی تھا...... وہ مر رہا تھا اور اسے پورا یقین تھا کہ کے ناگہانی قتل کے بعد گرفتار نوجوان کی شناخت کا ق ٹھپ ہوجائے گا۔ وہ اپنی پس انداز کی ہوئی رقم سمیت آزاد ہوجائے گا۔ دوسری طرف اس کے اہلِ خانہ کو ا کی بیمہ پالیسی سے خطیر رقم مل جائے گی، جو ایک مد تک ان کی گزر اوقات کے لیے کافی ہوگی۔ اس رقم مناسب سرمایہ کاری کرلی گئی تو ان کی پوری عمر بھی سکو سے گزر جائے گی۔

''میں اچھا آدمی تھا...... اور اب بھی ہوں۔'' ا کے ڈوبتے ہوئے ذہن میں خیال اُبھرا۔ ''میرے قتل سے بھی دہرا فیض حاصل ہوا ہے......''

اس کا دماغ موت کی اندھی وادیوں میں ڈوبتا چلا گیا...... وہ لہولہان اور شکستہ تھا مگر اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ثبت ہوکر رہ گئی تھی۔ اچھا آدمی ہونے کا احساس مرتے دم تک شاید اس کے دل و دماغ پر چھایا رہا تھا۔ اب وہ سکون سے مرسکتا تھا۔

محبت کے کئی رنگ

منظر امام

دوستی کا رشتہ انمول ہی نہیں ناقابلِ فراموش بھی ہوتا ہے... بعض دوست ہزاروں میل کی دوری پر چلے جاتے ہیں... مگر اپنی نیک نیتی... اخلاص اور اخلاقی خوبیوں کے باعث ہمیشہ یاد رہتے ہیں... اور اپنی قربت کا احساس دلاتے رہتے ہیں... چند دوستوں کی ایسی ہی کہانی... جس میں وقت اور موسم نے ہوس کی آمیزش کردی تھی... دوستی کا رشتہ لمحوں میں تار تار ہو چکا تھا...

انتقام کی راہوں پر چلنے والے ایک نرم خو شخص کا فیصلہ......

وہ ایک نوجوان ہی تھا لیکن... جو کچھ بھی کہہ رہا تھا وہ دین کی سمجھ سے باہر تھا۔ وہ نوجوان پڑھا لکھا بھی معلوم ہوتا تھا۔

دین اس وقت اپنی چلم سلگا کر لمبے لمبے کش لے رہا تھا۔ ساتھ میں کھانستا بھی جاتا۔

اسے وہ زمانہ یاد آرہا تھا جب مدنا پور کا یہ قبرستان آنے جانے والوں سے آباد رہتا تھا۔ لوگ فاتحہ خوانی کے لیے اپنے پیاروں کی قبروں پر آیا کرتے تھے۔ خاص طور پر

''ہو سکتا ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے، وہ سچ ہو۔'' دبیر نے سراغ رساں سے کہا۔

''نہیں۔ یہ وہی ڈاکو ہے۔ میری بات پر یقین کرو۔ میں ایسے تمام بہانے، تمام جھوٹ، بدنصیبی کی تمام داستانیں بارہا سن چکا ہوں جو ایسے تیز طرار اور ہر ڈھب سے کام نکالنے والے تخلیق کرتے رہتے ہیں۔'' سراغ رساں نے یہ کہہ کر دبیر کے چہرے پر نظریں جمادیں۔ پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔ ''ہمیں تمہارا تعاون درکار ہے، مسٹر دبیر! اب ہی تمہیں تمہاری رقم واپس مل سکتی ہے۔ تمہیں اپنی رقم واپس چاہیے نا؟ ٹھیک ہے؟''

''مجھے اپنی رقم کی اشد ضرورت ہے۔ کب ملے گی؟''

''مقدمے کے بعد۔''

''میں اب بھی اس کے وہی ڈاکو ہونے کے بارے میں پریقین نہیں ہوں۔'' دبیر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''دیکھو، یہی وہ ڈاکو ہے۔ تمہارے تعاون کرنے سے یہ جیل چلا جائے گا۔ اس کے بغیر وہ یہ رقم لے کر یہاں سے چلتا بنے گا اور تم دیکھتے رہ جاؤ گے۔ سو تم وہی کرو جو درست ہے۔''

''میں یقینی طور پر وہی کروں گا۔'' دبیر نے طوعاً کرہاً جواب دیا۔

☆☆☆

دبیر سوچ میں ڈوبا ہوا اپنے اسٹور کی جانب چل دیا۔ وہ ایک اچھا آدمی بنا چاہتا تھا...... وہ ایک اچھا آدمی تھا۔ وہ یہ بات اچھی طرح سے جانتا تھا۔ اچھا آدمی ہونے کے ناتے وہ اپنی فیملی کا بہتر طور پر خیال رکھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن جب اسے اپنے کاروبار کے لیے رقم کی ضرورت پڑی تو بینک والوں نے انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ گو وہ اس دکان کا تیس سال سے مالک ہے لیکن دکان بے حد چھوٹی، پرانی اور سب سے الگ تھلگ ویرانے میں ہے اس لیے مقابلے بازی کے اس جدید دور میں اور بڑے بڑے ڈسکاؤنٹ اسٹورز کی موجودگی میں اس کا قائم رہنا ممکن نہیں ہے۔

قرض کے تحفظ کی خاطر اس نے بینکوں کو اپنے اسٹور کو رہن رکھنے اور اپنی زندگی کی بیمہ پالیسی کی ضمانت دینے کی پیشکش کی لیکن انہوں نے اسے ناکافی قرار دے دیا اور اس کی قرض کی درخواست رد کر دی۔

دبیر ایک اچھا آدمی تھا...... ایک فیملی مین تھا لیکن بینک والوں کی نظر میں ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی نہ ہی اس شخص کی نگاہ میں ان باتوں کی کوئی اہمیت بالآخر دبیر کو قرض دینے پر راضی ہو گیا تھا اور پھر وہ قسطیں وصول کرتا رہا اور کبھی مطمئن نہ ہو پایا۔ وہ اب اپنی اصل رقم سے کہیں زیادہ رقم وصول کر چکا تھا اور رقوم کا مطالبہ کرتا رہتا تھا۔

دبیر نے اپنے اسٹور کا تالا کھولا اور اندر داخل ہو اسٹور میں رکھی چیزوں کی مختلف مہک اس کی حسِ شا ٹکرائی۔ لکڑی کی خوشبو اور قسم قسم کے اوزاروں کی دمک اسے بھلی لگنے لگی۔

دبیر کے اسٹور میں آنے کے پندرہ منٹ بعد سو بھی وارد ہو گیا۔ اس نے اسٹور میں قدم رکھنے کے بعد سے تالا لگا دیا۔

پھر تین گھنٹے بعد وہ وہاں سے نکل گیا۔ اس جانے کے بعد دبیر چھوٹے سے کسٹمر سروس کاؤنٹر پیچھے فرش پر ہاتھ پیر پھیلائے آخری سانسیں لے رہا سود خور نے دروازہ بند کر کے، اس کے منہ میں حلق کپڑا ٹھونس کر اس پر بے پناہ تشدد کیا تھا۔ دبیر کو معلو کہ وہ زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکے گا۔ وہ اس کے کی ایک کھلی واردات تھی۔ پولیس سے انشورنس کمپنی کوئی بھی اس قتل پر شبہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ایک شریف اچھا آدمی تھا...... وہ مر رہا تھا اور اسے پورا یقین تھا کہ کے ناگہانی قتل کے بعد گرفتار نوجوان کی شناخت کا ٹھپ ہو جائے گا۔ وہ اپنی پس انداز کی ہوئی رقم سمیت آزاد ہو جائے گا۔ دوسری طرف اس کے اہلِ خانہ کو کی بیمہ پالیسی سے خطیر رقم مل جائے گی، جو ایک مد تک ان کی گزر اوقات کے لیے کافی ہوگی۔ اس رقم مناسب سرمایہ کاری کر لی گئی تو ان کی پوری عمر بھی سکو سے گزر جائے گی۔

''میں اچھا آدمی تھا...... اور اب بھی ہوں۔'' کے ڈوبتے ہوئے ذہن میں خیال اُبھرا۔ ''میرے قتل بھی دہرا فیض حاصل ہوا ہے......''

اس کا دماغ موت کی اندھی وادیوں میں ڈوبتا گیا...... وہ لہولہان اور شکستہ تھا مگر اس کے ہونٹوں پر ہلکی مسکراہٹ ثبت ہو کر رہ گئی تھی۔ اچھا آدمی ہونے کا احسا مرتے دم تک شاید اس کے دل و دماغ پر چھایا رہا تھا۔ اب وہ سکون سے مر سکتا تھا۔

محبت کے کئی رنگ

منظر امام

دوستی کا رشتہ انمول ہی نہیں ناقابلِ فراموش بھی ہوتا ہے... بعض دوست ہزاروں میل کی دوری پر چلے جاتے ہیں... مگر اپنی نیک نیتی... اخلاص اور اخلاقی خوبیوں کے باعث ہمیشہ یاد رہتے ہیں... اور اپنی قربت کا احساس دلاتے رہتے ہیں... چند دوستوں کی ایسی ہی کہانی... جس میں وقت اور موسم نے ہوس کی آمیزش کر دی تھی... دوستی کا رشتہ لمحوں میں تار تار ہو چکا تھا...

انتقام کی راہوں پر چلنے والے ایک نرم خو شخص کا فیصلہ......

وہ ایک نوجوان ہی تھا لیکن... جو کچھ بھی کہہ رہا تھا وہ دین کی سمجھ سے باہر تھا۔ وہ نوجوان پڑھا لکھا بھی معلوم ہوتا تھا۔

دین اس وقت اپنی چلم سلگا کر لمبے لمبے کش لے رہا تھا۔ ساتھ میں کھانستا بھی جاتا۔

اسے وہ زمانہ یاد آ رہا تھا جب مدناپور کا یہ قبرستان آنے جانے والوں سے آباد رہتا تھا۔ لوگ فاتحہ خوانی کے لیے اپنے پیاروں کی قبروں پر آیا کرتے تھے۔ خاص طور پر

"تہواروں کے موقعوں پر یہاں بہت رونق ہو جاتی تھی۔ اس وقت اس کو پیسے بھی بہت ملا کرتے۔

دین ان کے کہنے پر قبروں پر پانی ڈال دیا کرتا جس کے عوض اسے پیسے مل جاتے تھے۔

خود اس کا کوئی نہیں تھا۔ اس کی جھونپڑی اسی قبرستان کے احاطے میں تھی۔ وہ اکیلا ہی رہتا تھا۔ بہت پہلے اس کی بیوی بھی تھی اور ایک بچہ بھی۔ لیکن ان دونوں کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کی بھی کیا زندگی ہوتی تھی۔

دین کا باپ بھی گورکن ہی تھا۔ وہ کسی اور قبرستان میں تھا۔ وہیں دین پیدا ہوا تھا۔ اس کے باپ ہی نے اسے یہ کام سکھایا تھا پھر جب وہ بڑا ہوا تو اس کے باپ نے میونسپلٹی والوں سے کہہ کر دین کو اس قبرستان میں لگوا دیا۔

اس کے بعد دین کے ماں باپ نے دین کی شادی کر دی۔ وہ بھی کسی گورکن ہی کی بیٹی تھی۔

کچھ دنوں کے بعد اس کے ماں باپ مر گئے۔ ایک بچہ پیدا ہوا۔ چار سال کے بعد وہ بھی مر گیا۔ پھر اس کی بیوی بھی مر گئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے لاشوں کو دفن کرتے کرتے وہ خود بھی موت کا گاہک بن گیا ہو۔ موت، موت اور موت۔ ماں کی موت۔ باپ کی موت۔ بیوی بچے کی موت۔ اور اب وہ صرف اکیلا ہی زندگی گزار رہا تھا۔ کوئی ساتھی نہیں، کوئی دیکھنے والا نہیں۔

ایک ہُو کا سا سناٹا۔ کبھی کبھی اس کا دل چاہتا کہ وہ خود بھی کسی قبر میں جا کر لیٹ جائے۔ اس کی تنہائی اس دن دور ہو گئی جب وہ آدمی اس کے پاس آ گیا۔ وہ ایک جوان آدمی تھا۔

وہ نوجوان دین کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ دین اس وقت مٹی کے ایک ٹیلے پر بیٹھا چلم پی رہا تھا۔

"کیسے ہو چاچا؟" اس نے دین سے پوچھا۔

"ٹھیک ہی ہوں۔" دین نے جواب دیا۔ "کون سی قبر ہے؟" اس نے پوچھا۔

"وہ سامنے والی۔" اس آدمی نے ایک قبر کی طرف اشارہ کر دیا۔

"پانی ڈال دوں؟" دین نے پوچھا۔

"نہیں چاچا۔ اس وقت میں کسی اور کام سے تمہارے پاس آیا ہوں۔"

"بتاؤ، کیا کام ہے؟" دین نے پوچھا۔

"چاچا، میں یہ چاہتا ہوں کہ تم دن میں دو بار اس قبر پر پانی ڈال دیا کرو۔" اس نوجوان نے کہا۔

"دن میں دو بار؟" دین نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں چاچا، میں تم کو پیسے دے دیا کروں گا۔" اس نے کہا۔ "میں ہر دوسرے تیسرے دن آیا کروں گا اور قبرستان کی چہار دیواری کے ساتھ پھولوں والے بھی ہوتے ہیں۔ تم ان سے پھول لے کر ڈال دیا کرنا۔ ایسا لگے کہ قبر تازہ ہے۔ جیسے اس کی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ یہ لاوارث نہیں ہے۔ میں اس کے بھی پیسے دوں گا بلکہ ابھی کچھ لے لو۔" اس نے اپنی جیب سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر دین کے حوالے کر دیا۔ "یہ رکھ لو۔ بعد میں اور دے دوں گا۔"

"بہت مہربانی صاحب۔" دین کی بتیسی نکل آئی تھی۔ "اب وہی ہوگا جو آپ کہیں گے۔"

"ٹھیک ہے، میں چلتا ہوں۔" وہ نوجوان دین کو ہدایت دے کر قبرستان سے باہر آ گیا۔ اس کی گاڑی گیٹ کے باہر ہی کھڑی تھی۔ اس وقت اس کے چہرے پر بلا کا کرب تھا۔ آنکھوں میں نمی تھی۔ اس نے اپنی آستین سے آنکھوں کی نمی پونچھی اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔

☆☆☆

کمال بہت پریشان تھا۔ اس کی پریشانی کی نوعیت مختلف تھی۔ اس کو کسی نے فون کیا تھا۔ وہ فون کسی پبلک کال سینٹر سے کیا گیا تھا۔ کسی نے کہا۔ "کیا درندے صرف جانوروں میں ہوتے ہیں؟"

"کیا؟" کمال یہ سُن کر کچھ پریشان ہو گیا۔ "کیا کہہ رہے ہو؟ کون ہو تم؟"

"میں صرف یہ پوچھ رہا ہوں کہ کیا درندے صرف جانوروں میں ہوتے ہیں؟" دوسری طرف سے وہی سوال دہرایا گیا۔

کمال نے کچھ اور پوچھنا چاہا لیکن فون بند ہو گیا۔ اس فون کو ٹریس بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ کال سینٹر سے آیا تھا لینڈ نمبر تھا۔ دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے چونکا دیا۔ اس کی سیکریٹری اندر آنے کے لیے اجازت طلب کر رہی تھی۔

"آ جاؤ۔" کمال نے آواز دی۔

اس کی سیکریٹری صوفیہ لہراتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ اس نے کمال کو پریشان دیکھ کر پوچھا۔ "خیریت تو ہے سر، کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں؟"

"ہاں۔" کمال نے ایک گہری سانس لی۔ "تم میری ایک بات کا جواب دو۔"

"پوچھیں سر؟"

"کیا درندے صرف جانوروں میں ہوتے ہیں؟"

"جی......!" صوفیہ حیرت زدہ رہ گئی۔ اس کا باس ایک سنجیدہ انسان تھا۔ اس نے کبھی بے تکی بات نہیں کی ہوگی لیکن آج اس کا یہ سوال بے تُکا تھا۔

"جواب دو۔ کیا درندے صرف جانوروں میں ہوتے ہیں؟"

"یس سر، جانوروں میں ہی ہوتے ہیں۔"

"تو پھر وہ مجھ سے بار بار کیوں پوچھتا ہے؟"

"کون پوچھتا ہے سر؟"

"میں نہیں جانتا کہ وہ کون ہے لیکن اس نے فون کر کر کے میرا دماغ خراب کر دیا ہے۔ میں نے اس کی کالز کو ٹریس کرنے کی بھی کوشش کی ہے لیکن وہ کسی پبلک کال سینٹر سے کال کرتا ہے۔ وہ صرف ایک سوال پوچھتا ہے۔ یہ بتاؤ کیا درندے صرف جانوروں میں ہوتے ہیں؟"

"ہوسکتا ہے کہ آپ کا کوئی بے تکلف دوست ہو جو یونہی آپ کو پریشان کر رہا ہو۔" صوفیہ نے کہا۔

"ناممکن۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میرا کوئی دوست ایسا نہیں ہے۔ سب ذمے دار قسم کے کاروباری لوگ ہیں، سب باشعور ہیں۔"

صوفیہ خاموش رہ گئی۔ وہ کمال کے ہر دوست کو اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ سب مہذب لوگ تھے۔ سب کے سب کاروباری۔ پیسے والے۔ ایسے لوگ جن کے پاس اس قسم کے مذاق کی فرصت نہیں ہوتی۔

"اس کا فون رات کو آتا ہے۔" کمال نے بتایا۔ "اور ہر بار کسی نئے نمبر سے۔ اسی لیے میں کسی نمبر کو بلاک بھی نہیں کروا سکتا۔"

"یہ مجبوری تو ہے۔ آپ کے تو کام کے فون آتے ہیں۔"

"ظاہر ہے، میں ایک بزنس مین ہوں۔ میرا حلقۂ احباب بھی بہت وسیع ہے۔ میں تو اُلجھن میں مبتلا ہو گیا ہوں۔"

"فکر نہ کریں، ہوسکتا ہے کہ یہ صرف مذاق ہی ہو۔"

"ایک بات یاد رکھو صوفیہ۔ اس قسم کی باتیں ابتدا میں مذاق ہی لگتی ہیں لیکن بعد میں بہت خطرناک ہو جاتی ہیں۔"

"آواز پہچانتے ہیں سر؟" صوفیہ نے پوچھا۔

"اگر آواز... پہچان لیتا تو پھر پرابلم کیا تھی۔ خیر آج میں راشد کے پاس جا رہا ہوں۔ اسے بتانا ضروری ہو گیا ہے۔"

صوفیہ، راشد کو بھی جانتی تھی، وہ ایس پی سٹی تھا۔

"ضرور جائیں سر۔ وہ پولیس آفیسر ہیں شاید ان کے پاس اس مسئلے کا کوئی حل ہو۔" صوفیہ کے کمرے سے جانے کے بعد کمال نے اپنے دوست راشد کو فون کیا۔ اتفاق سے راشد آفس ہی میں تھا۔

"یار مجھے تم سے ابھی ملنا ہے۔" کمال نے کہا۔

"تو آ جاؤ، میں آفس ہی میں بیٹھا ہوں۔"

کمال کچھ ہی دیر بعد راشد کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

"کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے نا، پریشان سے دکھائی دے رہے ہو؟"

"ایک بات بتاؤ۔ اگر کوئی تم سے یہ پوچھے کہ کیا درندے صرف جانوروں میں ہوتے ہیں؟"

"کہنا کیا ہے، ہنس کر ٹال دوں گا لیکن کون پوچھے گا؟"

"مجھ سے پوچھا جا رہا ہے۔" کمال نے بتایا۔ کمال نے اب تک ملنے والے فون کی تفصیل بتا دی۔ راشد نے بہت سنجیدگی سے سب سنا تھا۔

"یار! اس کے دو پہلو ہیں، ایک تو یہ ہے کہ وہ کون ہے جو اس قسم کا مذاق تمہارے ساتھ کر رہا ہے اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ معاملہ کچھ سیریس ہے۔ کیونکہ وہ نمبر بدل بدل کر فون کر رہا ہے اور تم کہتے ہو کہ پبلک کال آفس سے اس کے فون آیا کرتے ہیں۔"

"ہاں، یہی تو پریشانی کی بات ہے۔"

"لیکن یہ کیا بات ہوئی کہ کیا درندے صرف جانوروں میں ہوتے ہیں؟"

"اصل بات تو یہی ہے۔" کمال نے کہا۔ "یاد کرو، اب سے بیس پچیس سال پہلے کی وہ رات جب ہم دوست ایک طوفانی رات میں ایک شیڈ میں تھے اور ہمارے ساتھ نیلما بھی تھی۔ یاد آیا کون نیلما؟"

"یار میں بھول گیا ہوں، خدا کے لیے یاد مت دلاؤ۔"

"حوالے کے لیے یاد دلا رہا ہوں، شاید اسی طرح کوئی سراغ مل جائے۔"

☆☆☆

وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی، نیلما۔ وہ پانچ دوستوں کا ایک گروپ تھا۔ راشد، کمال، فیصل، جنید اور ندیم۔ نیلما،

ندیم کی محبوبہ تھی۔ ان دونوں کے درمیان بہت محبت تھی۔ وہ ایک دوسرے پر جان دیتے تھے۔ وہ سب تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ نیلما بھی اسی یونیورسٹی میں تھی۔

نیلما ایک کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی تھی۔ یوں تو اس گروپ میں سب ہی خوش حال فیملی کے لڑکے تھے۔ لیکن نیلما صرف ندیم کی تھی۔ اس کی ساری توجہ ندیم ہی کی طرف ہوتی تھی۔ جبکہ ندیم کی مالی حالت بہت کمزور تھی۔ اس کا باپ ایک سرکاری ریٹائرڈ شخص تھا۔ پورے گھر کا گزارا اس کی پنشن پر ہوتا تھا۔ ندیم شام کے بعد ٹیوشن بھی پڑھاتا تھا۔

کمال ایک بڑے بزنس مین کا بیٹا تھا۔ اس کو بزنس وراثت میں ملنے والا تھا۔ راشد ایک پولیس آفیسر کا بیٹا تھا۔ اس نے بھی اپنا مقصد یہی بنا رکھا تھا کہ وہ پولیس آفیسر بنے گا۔ فیصل اور جنید کے گھرانے بھی ایسے ہی تھے۔ خوش حال۔ سوائے ندیم کے۔

نیلما کبھی کبھی اس گروپ میں آ کر بیٹھ جاتی۔ اس وقت سب اسے چھیڑا کرتے تھے۔ ''یار نیلما تم نے اس بے چارے ندیم میں کیا دیکھا جو اس کے پیچھے پڑی ہو۔''

''وہ بات دیکھی جو تم میں نہیں ہے۔'' نیلما ہنس کر جواب دیتی۔

''یار اس بے چارے کو کوئی کام کرنے دو۔ تمہارے عشق میں تو ناکارہ ہو کر رہ جائے گا۔''

ندیم سب کی باتیں سن کر مسکراتا رہتا۔ پھر کبھی کبھی بول پڑتا۔ ''یار تم لوگ چاہے لاکھ بھڑکا لو۔ لیکن نیلما مجھ سے الگ نہیں جا سکتی۔''

''محبت میں بلیک میلنگ نہیں چلتی۔''

وہ زمانہ بھی بہت خوب صورت تھا۔ وہ سب ایک ساتھ ہی ہوا کرتے تھے۔ اگرچہ سب کے ڈپارٹمنٹ الگ الگ تھے پھر بھی وہ ساتھ ہی دیکھے جاتے۔ ایک بار انہوں نے ایک فارم ہاؤس میں پکنک کا پروگرام بنایا۔

وہ فارم ہاؤس فیصل کے باپ کا تھا۔ شہر سے پچاس میل کے فاصلے پر۔ نیلما نے بھی ساتھ چلنے کی ضد کی تھی۔ ''فارم ہاؤس کے آس پاس کا ماحول، کھیتیاں۔ سکون سناٹا۔ یہ سب میرے خوابوں میں آیا کرتا ہے۔''

ندیم نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''نیلما! مسئلہ یہ ہے کہ ہم مرد حضرات جا رہے ہیں۔ تمہارا ساتھ جانا مناسب نہیں ہے۔''

''تو کیا ہوا، یہ مرد حضرات میرے لیے غیر تو نہیں ہیں نا۔''

دوسروں نے بھی سفارش کی۔ ندیم نے اجاز[ت] دے دی تھی۔

لیکن ہوا یہ کہ عین وقت پر خود ندیم بیمار پڑ گیا۔ ا[س کو] بہت تیز بخار تھا۔ نیلما بہت مایوس ہو گئی تھی۔ اس وقت [ندیم] نے اپنے دوستوں سے کہا۔ ''یار تم لوگ نیلما کو اپنے سا[تھ] لے جاؤ۔''

''یار یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''ہو سکتا ہے، تم لوگ اس کے لیے اجنبی نہیں ہو۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن ایک اکیلی لڑکی کا ہمارے ساتھ جانا مناسب نہیں ہے۔''

''کیا کیا جائے۔ یہ اس کی برسوں کی خواہش ہے۔'' ندیم نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تم سب مل کر اس کی حفاظ[ت] کر سکتے ہو۔''

نیلم نے پہلے تو ندیم کے بغیر جانے سے منع کر دیا۔ پھر ندیم کے سمجھانے پر وہ ان چاروں کے ساتھ ہو لی تھی۔

بہت پُرفضا مقام تھا۔ نیلما کو اس بات پر افسوس ہو[رہا] تھا کہ وہ اب سے پہلے اس طرف کیوں نہیں آئی تھی اور [شہر] سے زیادہ فاصلہ بھی نہیں تھا۔ صرف دو گھنٹے کی ڈرائیو پر فارم ہاؤس پہنچ گئے تھے۔

فارم ہاؤس بھی بہت زبردست تھا۔ فیصل نے نی[لما] کے لیے ایک علیحدہ کمرا ٹھیک کروا دیا تھا۔

دوپہر میں آرام کرتے رہے۔ شام سے پہلے اچانک بادل گھر آئے، موسم اور بھی رنگین ہو گیا۔

فارم ہاؤس کے ملازم نے شام کی چائے کمرے میں لا کر دے دی تھی۔ نیلما سب کے لیے چائے بنا رہی تھی۔ اس وقت اسے ندیم کی یاد آ رہی تھی۔

جنید نے کہا۔ ''یار سچ پوچھو تو ندیم نے ہمارے ساتھ نہ آ کر حماقت کی ہے۔ اتنا خوب صورت موسم، اتنا حسین ماحول، کہاں دیکھنے کو ملتا ہے پھر نیلما جیسی لڑکی کا ساتھ۔ اُف، اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو بسترِ مرگ سے بھی اٹھ کر چلا آتا۔''

''یہ بات تو ہے۔'' راشد نے تائید کی۔ ''تم لوگوں کو یاد ہے۔ ندیم اکثر ہم سے ایک سوال پوچھا کرتا ہے کہ کیا درندے صرف جانوروں میں ہوتے ہیں؟''

''ہاں، یاد ہے۔'' کمال مسکرا دیا۔ ''اگر وہ اس وقت یہاں ہوتا تو میں اس سے یہی کہتا کہ ہاں صرف جانوروں میں اور وہ نیلما جیسی لڑکی کو چھوڑ کر بستر پر لیٹ گیا۔''

''اب تم لوگ میری تعریف ہی کرتے رہو گے یا باہر بھی چلو گے؟'' نیلما نے کہا۔

''باہر کہاں؟''

''دیکھو بوندا باندی شروع ہو گئی ہے۔'' نیلما نے کہا۔ ''موسم اور بھی خوب صورت ہو گیا ہے۔ فارم ہاؤس کے چاروں طرف ہریالی چھائی ہوئی ہے۔ چلو باہر نکلتے ہیں۔''

سب کو یہ تجویز پسند آئی تھی۔ سب فارم ہاؤس سے باہر آ گئے۔ فیصل ان کی رہبری کر رہا تھا۔ اس خوب صورت موسم کا لطف اٹھاتے ہوئے وہ فارم ہاؤس سے بہت فاصلے پر نکل آئے تھے۔ اچانک موسم کے تیور خطرناک ہو گئے۔ اب تک بوندا باندی ہی ہو رہی تھی لیکن اب اچانک انتہائی گرج اور چمک کے ساتھ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ اتنی تیز بارش کہ انہیں سنبھلنے کا موقع بھی نہیں مل سکا۔

''کچھ فاصلے پر ایک شیڈ ہے۔'' فیصل نے بتایا۔ ''ہم وہاں پناہ لے سکتے ہیں، فارم ہاؤس تو بہت دور ہے۔''

وہ سب شیڈ کی طرف چل پڑے۔ سب کے سب بُری طرح بھیگ گئے تھے۔ نیلما کے کپڑے اس کے جسم سے چپک گئے تھے۔ اس کا حسن اور بھی دوبالا ہو گیا تھا۔ وہ سب شیڈ میں داخل ہو گئے۔

وہ ایک بڑا شیڈ تھا۔ کسی زمانے میں استعمال میں بھی آتا ہو گا لیکن اب ویران پڑا ہوا تھا۔

کمال کی نگاہیں نیلما پر جم کر رہ گئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں اس موسم نے ہوس بھر دی تھی۔ ایسی ہی کیفیت دوسروں کی تھی۔

اس وقت پہلی بار ان سب سے نیلما کو خوف محسوس ہوا۔ وہ کیوں آئی تھی۔ ندیم تو اسے منع کر رہا تھا۔ وہ چاہے لاکھ دوست سہی لیکن سب کے سب جوان تھے اور یہ موسم بھی ایسا تھا جو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم کر دیتا ہے پھر سب سے پہلا قدم کمال ہی نے اٹھایا تھا۔ اس نے جذبات سے لرزتا ہوا ہاتھ نیلما کے کندھے پر رکھ دیا۔

نیلما نے چیخ کر اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

لیکن ان سب پر شیطان غالب آ چکا تھا۔ راشد نے آگے بڑھ کر اسے قابو میں کر لیا۔ پھر سب اسے گھسیٹتے ہوئے شیڈ میں لے آئے۔

☆☆☆

بہت تیز بارش تھی۔ ندیم کو نہ جانے کیوں کچھ بے چینی سی ہو رہی تھی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی سانحہ ہونے والا ہے۔ کبھی کبھی کوئی حس انسان کو

خبردار کر دیتی ہے۔ نیلما دوستوں کے ساتھ گئی ہوئی تھی۔ کل رات تک اس سے فون پر باتیں ہوتی رہی تھیں۔ لیکن صبح سے اس کا نمبر نہیں مل رہا تھا۔ دوسروں کے نمبر بھی آف تھے یا سگنل نہیں مل رہے تھے۔ بارش بھی تو بہت تیز تھی۔ ایسی بارشیں ذرا کم ہی ہوا کرتی ہیں۔ اس نے سوچا کہ وہ ابھی فیصل کے فارم ہاؤس کی طرف نکل جائے۔ سخت بخار کے باوجود۔ اس کی بے چینی نیلما کی وجہ سے تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے ساتھ کچھ ہو گیا ہو۔ وہ کم بخت تو اس کا فون بھی نہیں اٹھا رہا تھا۔ اسے فیصل کے فارم ہاؤس کا لینڈ نمبر بھی نہیں معلوم تھا۔ بارش تھی کہ رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ ٹی وی بتا رہا تھا کہ شانتی نگر کے پاس بند ٹوٹ گیا ہے جس سے آس پاس کے کئی گوٹھ زیرِ آب آ گئے ہیں۔ ندیم کو بس اتنا معلوم تھا کہ فیصل کا فارم ہاؤس شانتی نگر ہی کے پاس تھا، خدا خیر کرے۔

☆☆☆

سب ختم ہو گیا تھا۔ ساری مروتیں، دوستیاں، برسوں کا ساتھ۔ کسی کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔ صرف ایک چیز رہ گئی تھی۔ رقصِ ابلیس، جس میں وہ سب مگن ہو گئے تھے اور نیلما ایک طرف پڑی سسک رہی تھی۔

اس کا لباس تار تار ہو چکا تھا۔ اس کی روح تار تار ہو چکی تھی۔ اس کا جسم پامال کر دیا گیا تھا اور پامال کرنے والے کون تھے۔ اس کے دوست جو اس کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے، اس کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔

جن سے برسوں کا ناتا تھا۔ وہ سب شیطان بن گئے تھے۔ ان کا کھیل ختم ہو گیا تھا۔ نشہ اُتر چکا تھا اور نیلما ایک طرف بے ہوش پڑی تھی۔ وہ سب سر جھکائے اس کے پاس بیٹھے تھے۔ ان سب کو احساس تھا کہ جو کچھ ہوا بہت برا ہوا ہے۔

''یار بہت بُرا ہوا۔'' فیصل نے کہا۔ ''نہ جانے کیا ہو گیا تھا ہم کو؟''

''اب جو ہونے والا ہے وہ اور بھی بُرا ہے۔'' راشد نے کہا۔ ''جب یہ واپس شہر جائے گی۔ جب ندیم سے ملے گی تو اس کے بعد کیا ہو گا؟''

''کیا ضروری ہے کہ یہ شہر واپس جا سکے۔'' کمال نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' سب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''دیکھو، ہم سب سے بہت بڑی غلطی ہو چکی ہے۔

خدا ہمارے اس گناہ کو معاف کرے۔"

"لیکن ہمارا یہ جرم چھپے گا کیسے؟"

"اس وقت کی خبر یہ ہے کہ قریبی ندی میں زور کا سیلاب آیا ہوا ہے۔" کمال نے کہا۔

"تو پھر؟"

"پھر یہ کہ تم سب سمجھ دار ہو کہ اب کیا کرنا ہے۔ ایک گناہ کر چکے ہیں، اب اس کو چھپانا ضروری ہے۔"

سب نے نیلما کی طرف دیکھا جو فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ سب کانپ کر رہ گئے تھے۔

☆☆☆

جب نیلما کی لاش ندی سے ملی تو اس وقت تک اس خوب صورت سراپا... کا حلیہ بگڑ چکا تھا۔ زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے۔

ندیم کی تو دنیا ہی اجڑ چکی تھی۔ وہ اپنے دوستوں میں سب سے غریب تھا۔ اس کے پاس دولت صرف ایک تھی۔ نیلما اور اس کی محبت۔

بہت ہی دردناک کہانی بتائی تھی ان چاروں نے۔

وہ کھیتوں کے درمیان ہنستے بولتے ہوئے جا رہے تھے۔ نیلما کو سب سے زیادہ افسوس اس بات کا تھا کہ ندیم اس پکنک میں شامل نہیں تھا۔ وہ راستے بھر ندیم ہی کا ذکر کرتی رہی تھی۔ سارے دوست اس کا مذاق بھی اڑاتے رہے تھے۔

پھر یہ ہوا کہ اچانک بارش شروع ہوگئی۔ وہ سب کے سب اس بارش کو انجوائے کرتے ہوئے چلتے رہے۔ کیونکہ موسم بہت خوب صورت ہوگیا تھا لیکن جلد ہی اس بارش نے بھیانک صورت اختیار کرلی اور انتہائی تیز ہوگئی۔ اب سب نے قریب ہی اس شیڈ کی طرف دوڑ لگادی۔ لیکن اچانک بند ٹوٹ گیا اور سیلابی ریلا تباہیاں مچاتا ہوا در آیا۔ وہ چاروں طرف سے پانی میں گھر گئے۔ پانی کا بہاؤ اتنا شدید تھا کہ ان کے قدم اکھڑنے لگے۔

سب نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ شیڈ سامنے ہی نظر آرہا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ شیڈ تک پہنچ سکتے، ایک تیز ریلا سب کو بہا کرلے گیا۔ نیلما پانی میں غوطے کھانے لگی۔ سب نے اس کو بچانے کی کوشش کی لیکن وہ بہاؤ کے ساتھ بہتی ہوئی نہ جانے کہاں نکل گئی اور دوسرے دن جب پانی اترا تو اس کی لاش دریافت ہوئی۔

یہ وہ بیان تھا جو سب نے دیا اور اسے تسلیم بھی کرلیا گیا۔

لیکن ندیم کی بے قراری نہیں جاتی تھی۔ اس کی زند[گی]
اس سے دور چلی گئی تھی۔

پولیس نے رسمی کارروائی کے بعد لاش لواحقین [کے]
حوالے کردی۔ نیلما کا قصہ ختم ہوگیا تھا۔

لیکن ندیم کے لیے قصہ ختم نہیں ہوا تھا۔ اس [کے]
ذہن میں کچھ کھٹک رہا تھا۔ نیلم بہت اچھی تیراک بھی تھی۔
اتنی آسانی سے نہیں مر سکتی تھی پھر صرف وہی کیوں مر گئی۔
دوسرے کیوں سلامت رہے تھے۔ ان کو کیوں کچھ نہیں ہو[ا]
تھا۔

اس نے ان مقامی لوگوں سے پوچھ گچھ کی جنہوں [نے]
نیلما کی لاش دریافت کی تھی۔ کسی سے کوئی خاص بات معلو[م]
نہیں ہوسکی۔ لیکن ایک اور بات جو کھٹک رہی تھی وہ یہ تھی کہ
آخر اس کی لاش کا پوسٹ مارٹم کیوں نہیں کرایا گیا؟

پوسٹ مارٹم تو ضروری ہوتا ہے پھر اس کی لاش بغی[ر]
پوسٹ مارٹم کے کیوں دفنا دی گئی۔

اس نے یہی سوال اپنے دوستوں سے بھی کیا لیکن
سب کا ایک ہی جواب تھا۔ وہ بے چاری تو مر ہی چکی تھی پھ[ر]
اس کی لاش کی بے حرمتی سے کیا فائدہ تھا؟ سب کا ایک ہی
جواب۔ سب ایک ہی زبان بول رہے تھے۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود ندیم کو چین نہیں تھا۔
کچھ نہ کچھ ضرور تھا جو اس کے ذہن میں کھٹک رہا تھا۔

پھر ایک دن نیلما کی لاش دریافت کرنے والوں میں
سے ایک نے اپنے شبہے کا اظہار کر ہی دیا۔ "خدا جانے
صاحب، میں جو کہوں گا، وہ اچھا ہوگا یا بُرا ہوگا۔"

"نہیں بھائی، جو تمہارا دل اور ضمیر کہتا ہے وہ کہہ
دو۔"

"صاحب، اس بے چاری کے بدن پر نوچ کھسوٹ
کے اثرات تھے۔" اس نے بتایا۔

"نوچ کھسوٹ کے؟" ندیم نے حیرت سے پوچھا۔

"جی صاحب، جیسے اس بے چاری کے ساتھ......
اب کیا بتاؤں؟"

"میں سمجھ گیا تم کیا کہنا چاہتے ہو۔" ندیم نے ایک
گہری سانس لی۔ "لیکن تم نے یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائ[ی]
تھی؟"

"کیا کرتا بتا کر۔ سب ایک ہی جیسا بیان دے رہے
تھے۔ میں غریب آدمی ہوں۔ ان چکروں میں پڑوں گا تو
اپنی مزدوری سے بھی جاؤں گا۔"

ندیم کے لیے اتنا اشارہ کافی تھا۔ اس کے خیال [کے]

تقویت مل گئی تھی۔ وہ اپنی موت نہیں مری تھی۔ بدن پر نوچ کھسوٹ کے نشانات یہی بتا رہے تھے لیکن یہ سب کیسے ہو سکتا تھا۔ وہ سب تو اس کے دوست تھے اور نیلما کے بھی۔ وہ سب پر بھروسا کرتی تھی۔ تو کیا سب نے مل کر اس کے اور نیلما کے اعتماد کی دھجیاں اڑائی تھیں۔ یہ کیسے ہوگیا تھا۔ سب کے سب مجرم اور مکار تھے۔ اس کی نیلما کے قاتل تھے۔ سب نے مل کر اسے بے عزت کیا تھا۔

☆☆☆

پھر وقت گزرتا چلا گیا۔ سب دوستوں کو اتنا ہی معلوم ہو سکا تھا کہ ندیم دلبرداشتہ ہو کر کہیں چلا گیا ہے۔ نہ جانے کہاں؟

اس کا کہیں پتا نہیں چل سکا تھا۔ اس کے والدین کو بھی نہیں معلوم تھا۔ وہ بھی اس کی وجہ سے بے حال ہو کر رہ گئے تھے۔ ندیم کا پھر پتا ہی نہیں چل سکا۔ بہت دنوں کے بعد اس کے مرنے کی خبر آگئی۔

وہ ٹرین حادثے میں مرا تھا۔ ٹرین کراچی سے اسلام آباد جا رہی تھی۔ راستے میں اس کی دو بوگیوں میں اچانک آگ بھڑک اٹھی تھی۔ لوگوں نے کود کود کر جانیں بچائی تھیں لیکن کچھ بدقسمت بوگیوں میں پھنس کر رہ گئے تھے۔ ان میں ایک ندیم بھی تھا۔ اس کی جلی ہوئی لاش کی شناخت اس طرح ہوئی تھی کہ اس کی جیب سے اس کا جلا ہوا شناختی کارڈ برآمد ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی خاص چیز نہیں تھی۔ اگر ہو بھی تو جلنے کے باعث شناخت نہیں ہوسکی تھی۔

یہ سب دوست بہت دنوں کے بعد ایک بار پھر اکٹھا ہوئے تھے۔ وقت نے ان سب کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ ان کے خوب صورت اور صحت مند نقوش مرجھا کر رہ گئے تھے۔ یہ سب جنید کے گھر جمع ہوئے تھے۔

"آخر اس بے چارے کا پتا چل ہی گیا۔" جنید نے کہا۔

"ہاں یار۔" فیصل نے ایک گہری سانس لی۔ "ذرا سی دیر میں کیا سے کیا ہوگیا تھا۔ نہ جانے ہم اتنے بے رحم کیوں ہوگئے تھے؟ اس وقت تو ہم سب ایک ایسی رو میں بہے جا رہے تھے کہ ہم نے دوستی اور رشتوں کی بھی پروا نہیں کی تھی۔"

"ہاں یار، مجھے بھی اس بات کا اعتراف ہے کہ ہم وحشی بن گئے تھے۔ نہ جانے کیسا جنون سوار ہوگیا تھا۔"

"اور ہم نے شیطان کے بہکاوے میں آکر عمر بھر کا پچھتاوا مول لے لیا۔"

"اور اب اس کا سراغ ملا ہے جو اپنے دل میں نہ جانے کیسی حسرتیں لے کر دنیا سے گیا ہے۔"

"یار! وہ ہمارا اچھا دوست تھا۔" کمال رونے لگا۔ "ہم نے کیا کر دیا اس کے ساتھ۔ کم از کم میں تو خود کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔ کیونکہ پہل میں نے ہی کی تھی۔"

"نہیں اس کے لیے صرف تم اپنے آپ کو قصوروار نہیں ٹھہرا سکتے۔" فیصل نے کہا۔ "کیونکہ اس وقت ہم سب کی یہی کیفیت تھی۔ شیطان ہم سب پر غالب آچکا تھا۔ اگر تم پہل نہیں کرتے تو ہم میں سے کوئی اور بھی کر سکتا تھا۔"

"فیصل ٹھیک کہتا ہے۔" جنید نے تائید کی۔ "جو ہو گیا، وہ ہو گیا۔ ہمیں اس کی مغفرت کی دعائیں کرنی چاہئیں۔ اس کے ساتھ ہی اپنے اس گناہ کی توبہ کرتے رہنا چاہیے۔"

وہ سب بوجھل دلوں کے ساتھ اس گھر سے روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

کمال اس شام ایک پارٹی میں تھا جب اسے نیلما دکھائی دی تھی۔ وہ اپنے کاروباری ساتھیوں کے ساتھ ایک جگہ کھڑا تھا جب اس نے نیلما کو دیکھا۔ وہ اس سے کچھ فاصلے پر تھی۔ کمال اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

وہ نیلما ہی تھی۔ وہ اسے زندگی بھر نہیں بھول سکتا تھا۔ وہ اسی طرح خوب صورت تھی جس طرح پہلے ہوا کرتی تھی۔

وہی مسکراہٹ، ویسا ہی انداز اور جب اس نے کمال کو دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اتنا ہی نہیں اس نے شناسائی کے اظہار کے لیے کمال کی طرف دیکھ کر اپنا ہاتھ بھی ہلا دیا تھا۔

"کیا بات ہے؟" اس کے پاس کھڑے ہوئے ایک دوست نے پوچھا۔ "تمہیں اتنے پسینے کیوں آرہے ہیں؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں، ہاں، طبیعت ٹھیک ہے...... وہ...... لڑکی۔" اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن کہا نہیں گیا۔

"کون لڑکی؟ کیا ہوا ہے؟"

"وہ لڑکی...... وہ......" کمال نے اشارہ کیا۔ "وہ......" لیکن نیلما اب وہاں نہیں تھی۔

"بتا بھائی، کیا ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں، میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی۔" اس نے کہا۔ "میں جانا چاہتا ہوں۔"

"گاڑی تو چلا لوگے نا؟"

''ہاں، ہاں، چلا لوں گا۔''

وہ سب سے اجازت لے کر ہال سے باہر آ گیا۔ اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ اس نے جو کچھ دیکھا وہ حیرت انگیز تھا۔ وہ نیلما ہی تھی۔ اس کو پہچاننے میں وہ دھوکا نہیں کھا سکتا تھا اور اس نے بھی کمال کو پہچان کر اس کی طرف ہاتھ ہلایا تھا لیکن یہ کیسے ممکن تھا۔ نیلما لوٹ کر کیسے آ سکتی تھی۔ اس کو تو منوں مٹی کے نیچے دبا دیا گیا تھا۔ وہ مر چکی تھی۔ اس کے سامنے ہی مری تھی۔ وہ سب مل کر اس کی لاش اٹھا کر شہر لائے تھے پھر وہ زندہ ہو کر واپس کیسے آ گئی تھی؟

اور وہ نیلما پارکنگ کے پاس ہی کھڑی تھی جیسے اسی کا انتظار کر رہی ہو۔ خوف کی ایک لہر سی کمال کے بدن میں اترتی چلی گئی۔ وہ نیلما ہی تھی۔ اس کے کھڑے رہنے کا انداز وہی تھا جو اس کے ساتھ مخصوص تھا۔ وہ بائیں پیر پر زور دے کر ذرا سا جھک کر کھڑی ہوتی۔ اس انداز میں بھی ایک دلکشی پائی جاتی تھی۔

اس وقت بھی وہ اسی انداز سے کھڑی تھی۔ اس نے کمال کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ کمال کے بدن پر پسینے آ گئے۔ ذرا سی دیر میں وہ پسینے سے بھیگ گیا تھا۔

نیلما ایک بڑی سی کوسٹر کے پیچھے چلی گئی۔ کمال جی کڑا کر کے اس سمت بڑھا۔ لیکن وہ اب غائب ہو چکی تھی۔ اس کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔

کمال کو یاد نہیں کہ وہ کس طرح گھر واپس آیا تھا۔

☆☆☆

جنید کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ ایک سینی پلیکس میں ایک انگریزی فلم دیکھنے گیا تھا۔

اس کو ہالی ووڈ کی ہارر فلمیں بہت اچھی لگتی تھیں۔ اس کے دوست اس کا مذاق بھی اڑایا کرتے تھے کہ تم نے یہ کیا بچوں والا شوق پال رکھا ہے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ہارر فلموں ہی میں ہالی ووڈ کی ٹیکنالوجی کا کمال دیکھنے میں آتا ہے۔

اس دن بھی وہ ایک مووی دیکھنے گیا تھا۔ اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہی اسے احساس ہوا کہ کوئی اور بھی اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا ہے۔ وہ کوئی لڑکی تھی جس نے ایسا پرفیوم لگا رکھا تھا کہ جنید متوجہ ہوئے بغیر رہ نہیں سکا تھا۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ وہ نیلما تھی۔ وہی اسٹائل، وہی چہرہ۔ وہی بالوں کا انداز، سب کچھ وہی۔

جنید اسے اتفاق سمجھ کر نظر انداز بھی کر سکتا تھا۔ دنیا میں ایک جیسی صورت کے بہت لوگ ہوتے ہیں۔ ہو سکتا تھا کہ یہ لڑکی نیلما کی ہم شکل ہو۔ لیکن اس نے جب مسکرا کر جنید کی طرف دیکھا اور سرگوشی کی تو جنید کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے کہا تھا۔ ''کوئی ضروری نہیں ہے کہ مرنے والا مر ہی گیا ہو، وہ زندہ بھی ہو سکتا ہے۔''

جنید کانپ کر رہ گیا۔

وہ ہنس رہی تھی پھر وہ اچانک اپنی سیٹ سے اٹھی اور ہال سے باہر نکل گئی۔ جنید میں اس کا تعاقب کرنے کی بھی ہمت نہیں رہی تھی۔ وہ نیلما ہی تھی۔

جنید کے لیے اب ہال میں بیٹھے رہنا محال ہو گیا تھا۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس کے اعصاب اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ وہ اپنی سیٹ سے اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا ہال سے باہر آ گیا۔ ہال کے باہر کی تازہ ہوا نے اس کے اعصاب پر اچھا اثر ڈالا تھا۔

وہ ہال سے نکل کر سامنے والے ایک ریستوران میں بیٹھ گیا۔ اسے چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ چائے کی پیالی پکڑتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ جو کچھ اس نے دیکھا تھا وہ انتہائی حیرت انگیز اور خوف زدہ کرنے والا تھا۔ چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے اس کے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ نمبر انجانا تھا۔ شاید کسی پبلک کال آفس کا نمبر تھا۔

اس نے کال وصول کر لی۔ دوسری طرف سے کوئی اس سے پوچھ رہا تھا۔ ''یہ بتاؤ، کیا درندے صرف جانوروں میں ہوتے ہیں؟''

''کون ہو تم؟'' جنید چلایا۔

لیکن دوسری طرف سے سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ ذرا سی دیر میں دو قیامتیں گزر گئی تھیں۔ ایک نیلما کا نظر آنا۔ پھر یہ فون۔ اسے یاد تھا کہ یہ سوال اکثر ندیم کیا کرتا تھا۔ وہ ندیم جو مر چکا تھا۔

اگر یہ سب واہمہ تھا تو اتنا مضبوط واہمہ؟

بڑی مشکل سے وہ ڈرائیو کرتا ہوا گھر تک واپس آیا تھا۔ کمال اس کے انتظار میں اس کے گھر پر ہی بیٹھا تھا۔

جنید کو دیکھتے ہی وہ کھڑا ہو گیا۔ وہ بہت بے تاب نظر آ رہا تھا۔ ''یار! وہ...... نیلما زندہ ہے۔'' اس نے کہا۔

''میں بھی تمہیں یہی بتانے والا تھا۔'' جنید نڈھال سا ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ ''میں اپنی گاڑی پارک کر رہا تھا کہ وہ اچانک سامنے آ گئی۔'' کمال بتا رہا تھا۔ ''میں اسے دیکھ کر بوکھلا گیا تھا۔ خدا کی قسم وہی تھی۔ وہی آنکھیں۔ وہی چہرہ۔ وہی انداز۔ چلو مان لیا کہ شاید وہ نہ ہو۔ اسی جیسی کوئی

اور ہو۔ لیکن گاڑی کی کھڑکی کے پاس آ کر اس کا یہ کہنا کہ کیا درندے صرف جانوروں میں ہوتے ہیں؟ اس کے بعد مجھے ہوش کہاں رہتا تھا۔ میں نہ جانے کس طرح گاڑی دوڑاتا ہوا تمہارے پاس آیا ہوں یہ میرا دل ہی جانتا ہے۔''

''کچھ ایسی ہی کیفیت میری بھی ہے۔'' جنید نے کہا۔ ''میں مووی دیکھنے گیا تھا۔ وہ میرے برابر کی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے مجھے مخاطب کیا۔ اس کے بعد مجھے ہوش کہاں رہتا تھا۔''

''یار یہ سب کیا ہے۔ یہ جملہ ندیم کہا کرتا تھا۔ اب دنیا میں نہ تو نیلما رہی اور نہ ہی ندیم رہا۔ پھر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ کیا ان کی روحیں انتقام لینے ہمارے پاس آ رہی ہیں۔''

''لیکن مجھے ایسی باتوں پر یقین نہیں ہے۔''

''یقین تو مجھے بھی نہیں ہے لیکن جو کچھ سامنے ہے، اس کو بھی نہیں جھٹلا سکتے اور یہ واہمہ بھی نہیں ہے۔ وہ ایک ٹھوس حقیقت کی طرح میری گاڑی کے سامنے آئی تھی۔''

''ہم پانچ تھے۔'' جنید کہہ رہا تھا۔ ''میں، تم، راشد، فیصل اور ندیم۔ ندیم کو تو بیچ سے ہٹا دو۔ کیونکہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ رہ گئے ہم چار۔ نیلما کی روح یا اسے جو بھی سمجھا جائے ہم میں سے دو کے سامنے آ چکی ہے۔ یعنی میرے اور تمہارے۔ اب رہ جاتے ہیں کمال اور راشد۔ پتا نہیں ان دونوں کی کیا پوزیشن ہے؟''

''میں ان دونوں کو فون کر کے بلا رہا ہوں۔'' کمال نے کہا۔ ''پھر ہم سب مل کر سوچیں گے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔''

☆☆☆

ریل کے سفر میں ندیم کو نیلما مل گئی تھی۔

ہو بہو نیلما۔ وہی خدوخال، وہی۔ قد۔ وہی رنگت۔ سنہری سی۔ وہی انداز۔ سب کچھ وہی۔

نیلما کی موت کے بعد ندیم خود بھی مر کر رہ گیا تھا۔ زندگی سے اسے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اب وہ آوارہ گرد سا ہو گیا تھا۔ بھٹکتا رہتا۔ اسے اس بات کا یقین تو ہو گیا تھا کہ اس کے دوستوں ہی نے اس کی نیلما کو مارا ہے۔ نہ صرف مارا ہے بلکہ اس کی بے حرمتی بھی کی تھی۔ ''دیکھا جو تیر کھا کے کمین گاہ کی طرف...... اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی۔'' اس کا بھی یہی حال ہو رہا تھا۔ وہ اپنا اور نیلما کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔

لیکن کس طرح۔ اس نے اپنے دفتر سے چھٹی لے لی تھی اور ایک شہر سے دوسرے شہر بھٹکتا پھرتا تھا۔ بس یونہی۔ بغیر کسی منزل کے۔ اس کے سامنے صرف راستے ہوتے تھے۔ اور وہ ان راستوں پر چلتا جاتا تھا۔

وہ اس ٹرین سے لاہور جا رہا تھا۔ بس یونہی۔ بغیر کسی مقصد کے۔ اپنے آپ کو بہلانے کے لیے۔ اس نے اپنے دفتر سے چھٹی لے رکھی تھی۔ اس نے بتا دیا تھا کہ وہ ابھی اس قابل ہی نہیں کہ کوئی کام کر سکے۔

کراچی کے کینٹ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ہی وہ اسے دکھائی دے گئی تھی۔ وہ نیلما تو نہیں تھی۔ ندیم یہ اچھی طرح جانتا تھا لیکن وہ نیلما ہی کی طرح تھی۔ بالکل ویسی ہی۔ ''محبوب کا ملنا تو قیامت ہی ہے لیکن ہم صورت محبوب کا ملنا بھی قیامت سے کم نہیں۔

وہ اس کے پاس... جم کر رہ گیا تھا۔ اس کی نگاہیں اسی پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھیں۔ وہ اکیلی نہیں تھی، اس کے ساتھ اس کے گھر والے بھی تھے۔ وہ اکیلی ہی جا رہی تھی۔ گھر والے اسے پہنچانے آئے تھے۔ مگر وہ اسے سمجھا رہے تھے کہ راستے میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ کسی سے بات چیت مت کرنا۔ کوئی عورت کھانے پینے کو دے تو مت لینا۔ گاڑی رکنے پر کسی اسٹیشن پر اترنا نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

وہ ہنس رہی تھی۔ ''مما...... میں کوئی بچی نہیں رہی۔''

''میرے خدا!'' ندیم نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس لڑکی کی آواز بھی بالکل نیلما ہی کی طرح تھی۔ نیلما اگر دوسرا جنم لیتی تو ایسی ہی ہوتی۔

ندیم دیوانوں کی طرح اسے دیکھتا رہا تھا۔ اس نے بھی ندیم کی اس محویت کا نوٹس لیا تھا اور برا سا منہ بنا کر اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا تھا۔

پھر ٹرین اپنے وقت پر روانہ ہو گئی۔ وہ لڑکی اس کے برابر والے ڈبے میں تھی۔ وہ عورتوں کا ڈبا تھا۔ ندیم اس کے تصور ہی میں کھویا رہا تھا۔ خدا نے اس کو ایک دوسری نیلما کی جھلک دکھلا دی تھی۔ نہ جانے زندگی میں کیا کیا ہوتا ہے۔

ٹرین چلتی رہی اور وہ سوچتا رہا۔ نیلما کو یاد کر کے اس کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے تھے۔ کتنی محبت کرنے والی لڑکی تھی۔ اس کی ذرا ذرا سی باتوں کا خیال رکھا کرتی۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ ندیم مالی طور پر بہت کمزور ہے۔ اس کے باوجود اس نے ندیم کا انتخاب کر لیا تھا۔

سارے دوست اسی لیے مذاق اڑایا کرتے تھے لیکن وہ بے چاری نہیں جانتی تھی کہ ان دوستوں کے مذاق میں ان کی ہوس پوشیدہ ہے اور آخر کار اس کا مظاہرہ کر ہی

دیا۔ اس کی عزت کو پامال کرنے کے بعد ماردیا اس کو۔

ندیم اپنے خیالوں میں تھا کہ کسی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ ''تھوڑا سا آگے ہو جائیں گے بھائی۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

ندیم نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بھی ایک جوان آدمی تھا۔ ندیم ہی کی عمر کا۔ ندیم نے محسوس کیا کہ اس کی جسامت بھی اسی کی طرح تھی۔

''کیوں نہیں؟'' ندیم خوش اخلاقی سے بولا اور اس کے بیٹھنے کی جگہ بنادی۔

اور اسی وقت ایک زبردست جھٹکا لگا ایک قیامت تھی...... ٹرین ٹکرا گئی تھی۔ اتنی شدید ٹکر تھی کہ ٹرین کی بوگیوں میں آگ لگ گئی تھی۔

... بوگی بھی آگ کی لپیٹ میں آگئی تھی۔ ساتھ والی بوگی بھی جل رہی تھی۔ اس وقت ندم کو خود سے زیادہ ... بوگی میں بیٹھی ہوئی اس لڑکی کا خیال تھا جو اس کی نیلما کی صورت کی تھی۔ نیلما ایک بار پھر آفت میں گھر چکی تھی۔

جو آدمی اس کے برابر آکر بیٹھ گیا تھا، اوپر کی برتھ ٹوٹ کر اس پر آگری تھی۔ اس برتھ پر بہت وزنی سامان بھرا ہوا تھا۔ وہ بے چارہ اس بوجھ تلے دب کر جان کی بازی ہار چکا تھا۔

بوگی کے دوسرے لوگ جان بچانے کے لیے چھلانگیں مار کر نیچے اتر چکے تھے۔ ندیم خود بھی باہر کی طرف لپکا اور اچانک ایک خیال، ایک اسکیم اس کے ذہن میں آگئی۔ نیلما کی ہم شکل اس کے ساتھ والے ڈبے میں تھی۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔ ہر طرف چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔ ندیم اپنے ڈبے سے باہر آگیا۔ برابر کے ڈبے کی عورتیں اپنے ڈبے سے باہر آچکی تھیں۔

اور ان میں وہ لڑکی بھی تھی۔ ندیم تیزی سے اس کے پاس پہنچا۔ ''گھبرائیں نہیں خدا نے آپ کو بچا لیا ہے۔ میں آپ کو جانتا ہوں۔''

''مجھے جانتے ہیں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔ ''کون ہیں آپ؟''

''اس وقت تفصیل نہیں بتا سکتا۔ آپ مجھ پر بھروسا کریں۔ اس وقت افراتفری مچی ہوئی ہے۔ آپ ویٹنگ روم میں جاکر بیٹھ جائیں۔ میں ابھی آتا ہوں۔ میرے ڈبے میں میرے ضروری کاغذات رہ گئے ہیں۔ وہ لے کر آتا ہوں۔ جائیں ویٹنگ روم میں، پلیز۔''

وہ لڑکی اس وقت اتنی بوکھلائی ہوئی تھی کہ وہ کچھ کہہ بھی نہیں سکی۔ وہ سیدھی ویٹنگ روم کی طرف چلی گئی۔

ندیم کے ڈبے کی آگ اس وقت ہلکی ہو چکی تھی۔ ویسے بھی اس ڈبے میں اتنی آگ نہیں لگی تھی۔ البتہ دھواں پھیلا ہوا تھا۔ کسی نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔ وہ دوبارہ ڈبے میں داخل ہو گیا۔

اس شخص کی لاش اسی طرح پڑی ہوئی تھی۔ ''معاف کرنا دوست۔ میں تم کو اپنے آپ میں بدل رہا ہوں۔''

لاش کا چہرہ پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ اوپر والی پوری برتھ کا وزن اس پر آگرا تھا۔ چہرہ کچل کر رہ گیا تھا۔

اس نے جلدی جلدی اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ ایک جیب میں اس کا شناختی کارڈ تھا۔ جسے نکال کر اس نے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اپنا شناختی کارڈ نکال کر مرنے والے کی جیب میں رکھ دیا۔ اس کی جیبوں میں کچھ کاغذات بھی تھے۔ وہ بھی اس نے اپنی جیبوں میں ٹھونس لیے۔

باہر اسی طرح افراتفری مچی ہوئی تھی۔ لوگ دوڑتے پھر رہے تھے۔ ریسکیو والے بھی آچکے تھے۔ ڈبوں کی آگ بجھائی جا چکی تھی۔ لاشیں نکالی جا رہی تھیں۔ زخمیوں کو اسپتال پہنچایا جا رہا تھا۔

ویٹنگ روم کے پاس پہنچ کر اس نے شناختی کارڈ دیکھا۔ مرنے والے کا نام فیاض تھا۔ کراچی ہی کا پتا تھا۔ کارڈ جیب میں رکھ کر وہ ویٹنگ روم میں داخل ہو گیا۔ وہ لڑکی ایک کرسی پر سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ ندیم اس کے پاس پہنچ گیا۔

''پریشان نہ ہوں۔'' ندیم نے کہا۔ ''میں آگیا ہوں۔''

لڑکی اس کی آواز سُن کر کھڑی ہو گئی۔ وہ بہت پریشان تھی۔

''تم اپنے گھر والوں کو فون کر کے بتا دو۔'' ندیم نے کہا۔ ''انہیں تسلی دے دو کہ تم محفوظ ہو۔''

''می...... میرا موبائل کہیں گر گیا ہے۔'' لڑکی نے کہا۔

''خوش قسمتی سے میرا موبائل محفوظ ہے۔'' ندیم نے اپنی جیب سے موبائل نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''یہ لو اس سے فون کرلو۔ اطمینان رکھو میں ایک شریف آدمی ہوں اور تم اطمینان سے بات کرو، میں ابھی آیا۔''

ندیم نے ایک بار پھر اس ڈبے کا رخ کیا۔ اسے یاد آیا کہ مرنے والے کے پاس ایک بریف کیس بھی تھا۔ ہو سکتا تھا اس بریف کیس میں کچھ ایسی چیزیں بھی ہوں جس

سے اس کی شخصیت کو سمجھنے میں آسانی ہو جائے۔

پلیٹ فارم پر افراتفری مچی ہوئی تھی۔ لوگ ایک دوسرے کو پکارتے پھر رہے تھے۔ کسی کی طرف کسی کا دھیان نہیں تھا۔ اس کے ڈبے کی آگ بجھ چکی تھی۔ وہ پھر ڈبے میں داخل ہو گیا۔ وہ لاش اسی طرح پڑی ہوئی تھی۔ اس نے بریف کیس اٹھا لیا۔ اس کا لاک کھلا ہوا تھا اور اس میں بڑے بڑے نوٹوں کی گڈیاں بھری ہوئی تھیں۔

ندیم کا دل دھڑکا تھا۔ اس کے اندازے کے مطابق لاکھوں روپے تھے۔ اس نے بریف کیس بند کیا اور دوبارہ لڑکی کے پاس آگیا۔

گھر والوں کو فون کرتے ہوئے وہ لڑکی بری طرح رو رہی تھی۔ بہت دیر تک باتیں کرنے کے بعد اس نے ندیم کا موبائل واپس کر دیا۔ ''آپ کا بہت شکریہ۔''

''شکریے کی کوئی بات نہیں ہے۔'' ندیم نے کہا۔ ''تم کراچی واپس چلی جاؤ۔''

''ہاں، گھر والے بھی یہی کہہ رہے ہیں۔'' لڑکی نے کہا۔

''تو چلو، میں بھی واپس جا رہا ہوں۔ اب آگے جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔''

☆☆☆

فیصل اور راشد کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ انجانا فون۔ اس کے بعد نیلما کا نظر آنا، نہ جانے کیا ہو رہا تھا یہ سب۔

راشد کو نیلما اس وقت نظر آئی تھی جب وہ اپنی گاڑی اسٹارٹ کر رہا تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ ہنس رہی تھی۔ وہ نیلما ہی تھی۔

اسی وقت اس کے موبائل کی گھنٹی بھی بج اٹھی تھی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں فون اپنے کان سے لگا لیا تھا۔ دوسری طرف سے کوئی کہہ رہا تھا۔ ''یار بتا بھی دو۔ کیا درندے صرف جانوروں میں ہوتے ہیں؟''

''ک...... کون ہو تم؟''

''ہم سب واپس آچکے ہیں۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''میں بھی اور نیلما بھی۔ میں تمہارا دوست ندیم بول رہا ہوں۔ اب تو پہچان لیا نا؟''

راشد پسینے سے بھیگ گیا تھا۔ سامنے نیلما کھڑی تھی۔ وہ جو مر چکی تھی اور فون پر ندیم بول رہا تھا جو مر چکا تھا۔

اس نے بوکھلا کر فیصل کو فون کیا۔ ''فیصل...... وہ...... وہ...... نیلما میرے سامنے کھڑی ہے اور اس ندیم کا فون آرہا ہے۔ دونوں مر چکے ہیں لیکن میرے سامنے ہیں۔''

''کہاں ہو تم؟''

''زنجبار کی پارکنگ میں۔'' اس نے بتایا۔

زنجبار ایک نیا ہوٹل تھا۔ راشد نے اس کے کھانوں کی تعریف سنی تھی۔ وہ لنچ کے لیے گیا تھا۔

''بس جلدی سے نکل آؤ۔'' فیصل نے کہا۔ ''خود پر قابو رکھنا۔''

راشد نے گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی لیکن اس کے اعصاب قابو میں نہیں رہے تھے۔ ایک زوردار دھماکے کے ساتھ اس کی گاڑی سامنے والی دیوار سے جا ٹکرائی تھی۔ شیشے ٹوٹ کر اس کے بدن میں اتر گئے تھے، وہ مر چکا تھا۔

☆☆☆

اب ان دونوں کے درمیان اچھی خاصی دوستی ہو چکی تھی۔

اس لڑکی کا نام مائرہ تھا۔ ندیم نے اس کو کراچی اس کے گھر پہنچا دیا تھا۔ اس کے گھر والے اس کو لپٹا کر روتے رہے تھے۔

مائرہ نے اپنے گھر والوں کو ندیم کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔ ''اگر یہ فیاض صاحب میرا ساتھ نہیں دیتے تو نہ جانے میرا کیا حشر ہوتا؟'' (ندیم نے اپنا نام فیاض ہی بتایا تھا)

مائرہ کے گھر والے ندیم کا شکریہ ادا کرتے رہے تھے۔

ندیم کے لیے اپنے آپ کو دنیا سے چھپائے رکھنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ ایک تنہا انسان تھا۔ اس نے اپنی زندگی بہت کسمپرسی میں گزاری تھی۔ والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ بھائی بہن سے بھی محروم تھا۔ اس کی زندگی میں خوشی کی صرف ایک بات تھی۔ نیلما کی محبت۔ اس کے علاوہ اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔

نیلما کے مر جانے کے بعد کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ وہ زندہ ہے یا نہیں۔ بس ایک حسرت تھی۔ نیلما کے قاتلوں سے انتقام۔ اس کے علاوہ اس کی زندگی میں اور کچھ بھی نہیں رہا تھا۔

وہ مر چکا تھا لیکن فیاض کی صورت میں زندہ تھا۔ یہ اتفاق تھا کہ فیاض کی زندگی بھی کم وبیش ندیم ہی جیسی تھی۔ وہی محرومیاں، وہی حسرتیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس نے ایک بار شادی کی تھی لیکن اس کی بیوی اسے چھوڑ چکی تھی (یہ سب اسے بعد میں معلوم ہوا تھا۔ اس بریف کیس میں اتنی

لاکھ روپے تھے۔ مرنے والا اتنی بڑی رقم لے کر سفر کر رہا تھا۔

مائرہ اس سے اب اکثر ملا کرتی تھی۔ ندیم نے اس کا بھروسا حاصل کر لیا تھا۔ مائرہ کے گھر والے بھی ندیم کو پسند کرنے لگے تھے۔

ایک دن اس نے مائرہ سے کہا۔ ''تمہیں یاد ہے، پہلی بار میں نے تمہیں پلیٹ فارم پر گھر والوں کے ساتھ دیکھا تھا اور میں تمہیں دیکھ کر بے خود ہو گیا تھا۔''

''ہاں، یاد ہے مجھے...... اور مجھے آپ کا اس طرح دیکھتے رہنا بہت بُرا لگا تھا۔''

''جانتی ہو، اس وقت میرے دل کی کیا کیفیت تھی؟ میرے ہوش اڑ گئے تھے۔ میں پاگل ہو گیا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ جا کر تم سے لپٹ جاؤں۔ تم کو اپنے سینے سے لگا لوں۔ اتنا پیار کروں کہ تم بھی پریشان ہو جاؤ۔''

''یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟'' مائرہ نے خفگی کا اظہار کیا۔

''تم ایسے نہیں سمجھو گی۔'' ندیم نے اپنی جیب سے ایک تصویر نکال کر مائرہ کے سامنے کر دی۔ وہ تصویر اس کی اور نیلما کی تھی۔ دونوں ایک ساتھ کھڑے تھے۔ مائرہ اس تصویر کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔

''یہ...... یہ تو میری تصویر ہے۔'' اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''نہیں، یہ تم نہیں ہو۔'' ندیم نے ایک گہری سانس لی۔ ''یہ میری زندگی ہے۔ اب تک میری زندگی ہے۔ اس کو یاد کیے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔''

اس نے مائرہ کو سب کچھ بتا دیا۔ ساری کہانی سنا دی۔ کس طرح اس نے نیلما سے ٹوٹ کر محبت کی تھی اور اس کی محبت بھی کتنی شدید تھی۔ پھر اس کے ساتھ کیا ہوا۔

''مائرہ! میں اسی لیے تمہیں دیکھ کر پاگل سا ہو گیا تھا۔'' اس نے کہا۔ ''تم میری کیفیت سمجھ سکتی ہو۔ پھر خدا نے میری نیلما تمہاری شکل میں میرے سامنے کر دی۔ تم مل گئیں اور میں پھر سے جی اٹھا۔''

''مجھے اس بے چاری پر افسوس ہو رہا ہے۔'' مائرہ نے کہا۔ ''کیسے کمینے لوگ ہوتے ہیں۔''

''ہاں، کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو بظاہر بہت کلچرڈ ہوتے ہیں۔ بہت مہذب ہوتے ہیں لیکن ان کے اندر ایک شیطان چھپا ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے میرے دوست بھی ایسے نکلے۔ وہ سب کے سب اس طوفانی بارش میں شیطان بن گئے تھے۔ قانون نے تو انہیں کوئی سزا نہیں دی لیکن میں دینا چاہتا ہوں۔ میں انہیں ماروں گا نہیں لیکن اتنا خوف زدہ کر دوں گا کہ وہ ڈر ڈر کر مر جائیں۔ اس کی ابتدا تو میں نے کر دی ہے۔''

''وہ کس طرح؟''

''میں انہیں گمنام فون کیا کرتا ہوں۔ ایک سوال کرتا ہوں کہ کیا درندے صرف جانوروں میں ہوتے ہیں؟''

''میں نہیں سمجھی۔''

''یہ جملہ میں اپنے دوستوں میں بیٹھ کر کہا کرتا تھا۔ اس کی کوئی لاجک نہیں ہے۔ بس یونہی۔ اس کے بعد میں نے اب فون پر یہی کہنا شروع کر دیا۔ اور وہ بُری طرح خوف زدہ ہوتے چلے گئے۔''

''کیوں؟ وہ کیوں خوف زدہ ہوئے؟ وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ آپ کہہ رہے ہیں؟''

''نہیں مائرہ، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ میں مر چکا ہوں۔'' ندیم نے کہا۔ ''اب میری بھٹکتی ہوئی روح یہ سوال کر رہی ہے۔''

''لیکن کیوں؟ وہ یہ کیوں سمجھنے لگے؟''

''میرا خیال ہے تم سے میں کچھ چھپا نہیں سکتا۔'' ندیم نے ایک گہری سانس لی۔ ''تمہیں سب کچھ بتانا پڑے گا۔''

اس نے اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے بارے میں بتا دیا۔ جب ٹرین کا حادثہ ہوا تھا اور اس نے ایک مرے ہوئے انسان کی شناخت اختیار کر لی تھی۔ اس دوران مائرہ حیرت سے سنتی رہی تھی۔ ''میرا خدا مجھے معاف کرے مائرہ۔ میں ان بدبختوں سے انتقام کی خواہش میں اتنا گر گیا ہوں کہ میں نے ایک مرے ہوئے انسان کو دھوکا دیا ہے۔ اس کا نام اور شناخت اختیار کر لی ہے۔''

''میں تو حیران ہوئی جا رہی ہوں۔'' مائرہ نے کہا۔ ''ایسا لگتا ہے جیسے کوئی فلم دیکھ رہی ہوں یا کوئی ناول پڑھ رہی ہوں۔''

''زندگی اسی کا نام ہے مائرہ۔ قدم قدم پر حیران کرتی رہتی ہے۔''

''اگر تم نے کسی اور کی شخصیت اختیار کر رکھی ہے تو تمہارا اصل نام کیا ہے؟'' مائرہ نے پوچھا۔

''ندیم۔'' اس نے بتایا۔ ''جبکہ فیاض مرنے والے کا نام تھا۔''

''خدا جانے اس بے چارے کے گھر والوں پر کیا گزر رہی ہوگی؟ وہ تو اسے تلاش ہی کرتے رہ جائیں گے۔''

''نہیں، اس کی تلاش کسی کو نہیں ہو گی۔'' ندیم نے کہا۔ ''میں جب اپنے ضمیر کی آواز کے سامنے بے بس ہو گیا تو اس کے شناختی کارڈ کے ایڈریس پر پہنچ گیا۔ وہ ایک اکیلا انسان تھا۔ اس کا کوئی نہیں تھا۔ ایک بینک میں جاب کرتا تھا۔ کیشیر تھا۔ میں نے بینک جا کر بھی اس کے بارے میں معلوم کیا۔ اس نے اپنے بینک سے ایک بڑی رقم کا غبن کیا تھا۔ وہی لے کر بھاگ رہا تھا۔ بینک کو بھی اس کی تلاش ہے جبکہ اس کی لاش لاوارث قرار دے کر دفنا دی گئی ہے۔''

بہت دیر تک سناٹا رہا۔ مائرہ کشمکش میں مبتلا رہی تھی پھر اس نے سوال کیا۔ ''کیا تمہیں اس کی لاش کے پاس سے بینک کے روپے بھی ملے؟'' اس نے پوچھا۔

''مائرہ! میں تم سے کچھ نہیں چھپا رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''اتفاق سے مجھے کچھ نہیں ملا۔'' ایسا کہتے ہوئے وہ اپنے آپ کو چور محسوس کر رہا تھا۔

''اب تم نے کیا سوچا ہے؟'' مائرہ نے بتایا۔

''میری زندگی کا اب ایک ہی مقصد ہے۔ ان دوست نما دشمنوں کی بربادی۔'' ندیم نے کہا۔ ''میری موت کی خبر سن کر وہ بہت خوش ہو رہے ہوں گے لیکن میں ڈرا ڈرا کر ان کا جینا حرام کر دوں گا۔''

''کیا تم ان دوستوں کے سامنے نہیں آؤ گے؟'' مائرہ نے پوچھا۔

''نہیں ان کے لیے میرا مرا ہوا ہونا ہی بہتر ہے۔ ورنہ میری ساری اسکیم دھری رہ جائے گی۔''

''کیا تم ان پر جسمانی حملہ بھی کرو گے؟'' مائرہ نے پوچھا۔

''ہرگز نہیں۔ کیونکہ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ میں صرف انہیں خوف زدہ ہی کروں گا۔''

''کیا مرنے والی نیلما بالکل میری طرح تھی؟'' مائرہ نے پوچھا۔

''تم اس کی تصویر دیکھ ہی چکی ہو۔''

''تو پھر میں بھی اس مشن میں تمہارا ساتھ دوں گی۔'' مائرہ نے کہا۔ ''مجھے بھی ان کم بختوں پر غصہ آ رہا ہے۔''

☆☆☆

راشد کی موت نے ان سب کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اب وہ تین رہ گئے تھے۔ کمال، فیصل اور جنید۔

تینوں کمال کے گھر جمع ہوئے تھے۔

''یارو کیا موت ہوئی ہے، راشد کی۔'' فیصل نے کہا۔ ''اس کا تعلق چونکہ پولیس سے تھا۔ اسی لیے پولیس ایکسیڈنٹ کی وجوہات کا پتا چلانے کی سر توڑ کوشش کر رہی

ہے۔ ابھی تک صرف یہ بات سامنے آئی ہے کہ اس کی گاڑی قابو سے باہر ہو گئی تھی، وہ کنٹرول نہیں رکھ سکا تھا۔''

''میں نے جب یہ خبر سنی تو دہل کر رہ گیا۔'' جنید نے بتایا۔

''خدا اس کو معاف کرے۔'' کمال نے کہا۔

''میں ایک بات بتاؤں۔ راشد کا ایکسیڈنٹ صرف ایکسیڈنٹ نہیں ہے بلکہ کچھ اور ہے۔'' فیصل نے کہا۔

''کیا مطلب اور کیا ہو سکتا ہے؟''

''قتل۔ اس کو نیلما کی روح نے مارا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ اس کی گاڑی کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس وقت وہ بہت بری طرح خوف زدہ تھا۔ وہ مجھے بار بار فون کر کے بتا رہا تھا لیکن میں اس کی کیا مدد کر سکتا تھا۔ اس کو تسلی دیتا رہا۔ اس کا حوصلہ بڑھاتا رہا۔ لیکن لگتا ہے کہ وہ ہمت ہار گیا تھا اور اسی میں اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔''

''اوہ گاڈ!'' کمال نے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ ''مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے۔ سب سے پہلے میں نے ہی اس کو پکڑا تھا۔ میں نے ہی، میں نے ہی۔'' وہ لرزنے لگا۔

''حوصلہ رکھ یار۔'' جنید نے کہا۔ ''یہ سوچ کہ اب کیا ہو گا؟''

''کیوں نہ ہم کسی عامل سے رجوع کریں۔'' جنید نے کہا۔

''اول تو اس دور میں ایسی باتوں پر کوئی یقین نہیں کرے گا۔'' کمال نے کہا۔ ''اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہمیں اس عامل کو سب کچھ بتانا ہو گا اور ہم یہ نہیں کر سکتے۔''

''تو پھر کیا کریں؟''

''ایک بات میرے ذہن میں آ رہی ہے۔'' فیصل نے کہا۔ ''ہمیں اس کی قبر کھول کر دیکھنی چاہیے۔ اگر اس کی لاش قبر میں موجود ہے تو پھر یہ کوئی اور چکر ہے اور اگر لاش غائب ہے تو پھر سوچنا ہو گا۔''

''یہ مشورہ مناسب نہیں ہے۔'' جنید نے کہا۔ ''کوئی قبر اس طرح نہیں کھولی جا سکتی۔ اس کے لیے مجسٹریٹ کی اجازت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مضبوط جواز ہوتا ہے۔''

''تو پھر کیا کیا جائے؟ ایسا لگتا ہے کہ وہ ہم میں سے کسی کو بھی نہیں چھوڑے گی۔ سب اسی طرح ڈر ڈر کر مر جائیں گے۔''

''دیکھتے رہو، ایک راستہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم تینوں اس کی قبر پر جا کر معافی مانگیں۔ اس سے کہیں کہ خدا کے

لیے ہمیں معاف کر دو۔ ہم تم سے شرمندہ ہیں۔ ہم نے بہت بڑا گناہ کیا تھا۔ اس کی سزا ہم بھگت چکے ہیں۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، وہ سن لے گی؟'' جنید نے پوچھا۔

''ہاں، میں نے سنا ہے کہ جس کی موت ان حالات میں ہو ان کی روحیں بھٹکتی رہتی ہیں۔''

☆☆☆

''ہم بہت کامیاب جا رہے ہیں۔'' ندیم نے کہا۔

''تم بہت کامیابی کے ساتھ اپنا کردار ادا کر رہی ہو۔''

''ایسے لوگ اندر سے بزدل ہوتے ہیں ندیم۔'' مائرہ برا سا منہ بنا کر بولی۔ ''یہ صرف کمزور عورتوں ہی پر ستم کر سکتے ہیں۔ جب میں ان کے سامنے آتی ہوں تو ان کے چہرے دیکھنے والے ہوتے ہیں۔ ان کے مکروہ چہرے اور بھی مکروہ ہو جاتے ہیں۔''

''اب سوچ رہا ہوں کہ آگے کیا کیا جائے؟'' ندیم نے کہا۔

''کیوں، ابھی تو وہ تینوں باقی ہیں۔''

''لیکن میں کچھ اور سوچنے لگا ہوں۔''

''وہ کیا؟''

''میں تمہیں بار بار خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا۔'' ندیم نے کہا۔ ''ان کم بختوں کو ان کے حال پر چھوڑ دوں، خدا خود ہی انصاف کر دے گا......اور......''

''اور کیا؟''

''یہاں سے چلا جاؤں۔''

''کہاں؟''

''ایک نئی زندگی کی طرف۔ ایک نئے شہر میں جا کر کوئی چھوٹا موٹا کاروبار سیٹ کر لوں۔ ماضی کو فراموش کر دوں۔ بھول جاؤں سب کچھ۔''

''ہاں ندیم، میرا خیال ہے کہ یہ بہتر ہوگا۔ خدا پر چھوڑ دو۔ وہی انصاف کرنے والا ہے۔''

''کیا نئی زندگی کے نئے سفر میں تم میرا ساتھ دو گی؟'' ندیم نے پوچھا۔

''کیوں نہیں؟'' مائرہ نے شرما کر گردن جھکا لی۔ ''میرے گھر والے بھی تمہیں پسند کرنے لگے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' ندیم مسکرا دیا۔ ''میں کل ہی تمہارے گھر والوں سے مل کر معاملات طے کر لیتا ہوں۔''

''اب تم میرا ایک مشورہ مان لو۔'' مائرہ نے کہا۔

''وہ کیا؟''

''جب تمہیں ایک نئے شہر جا کر نئی زندگی شروع کرنی ہے اور ان کم بختوں کو بھول جانا ہے تو پھر اپنا نام بھی اختیار کر لو۔ مرنے والے فیاض کو بھی بھول جاؤ۔ تم ندیم ہو اور ندیم ہی رہو۔''

''مائرہ تم نے یہ بہت اچھا مشورہ دیا ہے۔ میرے دل پر بھی ایک بوجھ تھا، اب اتر گیا ہے۔''

''میری ایک خواہش ہے کہ ہم دونوں نئی زندگی شروع کرنے سے پہلے ایک بار اس مظلومہ کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھ لیں۔''

''مائرہ! میں تو ہر دوسرے دن جاتا ہوں۔''

''میں بھی تمہارے ساتھ جانا چاہتی ہوں۔'' مائرہ نے کہا۔ ''اس سے اجازت لینا چاہتی ہوں۔ اس سے وعدہ کرنا چاہتی ہوں کہ جس طرح تم نے ندیم سے پیار کیا تھا۔ میں ویسا تو نہیں کر سکتی پھر بھی ان کا خیال رکھنے کی پوری کوشش کروں گی۔''

ندیم نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ''مائرہ تم بہت اچھی ہو، اب میں تم سے ایک اعتراف بھی کرنا چاہتا ہوں۔''

''میں سمجھتی ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ تم مرنے والے فیاض کی غبن کی ہوئی رقم کی بات کرو گے؟''

''ہاں۔'' ندیم حیران ہو گیا تھا۔ ''لیکن تمہیں کیسے اندازہ ہوا؟''

''جب تم پہلی بار میرے پاس آئے تھے تو تمہارے پاس کوئی بریف کیس نہیں تھا پھر جب تم ڈبے میں دوبارہ جا کر واپس آئے تو ایک بریف کیس تمہارے پاس تھا۔ پھر یہ پتا چلا کہ اس فیاض نے بینک سے غبن کیا تھا تو میں سمجھ گئی کہ اس بریف کیس میں وہی رقم تھی۔''

''تم بالکل ٹھیک سمجھیں مائرہ، وہ پیسے بھی میرے دل پر بوجھ ہیں۔''

''تو پھر اتار پھینکو اس بوجھ کو۔ کسی طرح بینک کو پیسے واپس کر دو۔ ان سے کچھ بھی کہہ سکتے ہو اور جہاں تک ہمارا سوال ہے تو تمہاری نیلما ابھی تک تمہارے پاس ہے۔ وہ تم سے دور نہیں گئی۔ ہم دونوں مل کر نئی زندگی کی خوب صورت ابتدا خدشوں اور خوف سے بالاتر ہو کر کر سکتے ہیں۔''

ندیم نے مسکرا کر مائرہ کی طرف دیکھا۔ خدا نے اسے دوسری نیلما دے دی تھی۔

کام کے آغاز سے پہلے سب کچھ بے حد آسان لگ رہا ہوتا ہے... مگر جیسے جیسے عملی کارروائی شروع ہوتی ہے... اعصاب کا تناؤ شروع ہو جاتا ہے۔ شوبز کی دنیا سے تعلق رکھنے والے افراد کے اعصاب شکن لمحات... ہر فرد قتل کی واردات میں ملوث نظر آتا تھا۔

موسم کی خرابی جس نے قاتل کی شناخت کو آسان بنا دیا......

تنقید نگار

جمال دستی

سراغ رساں ابی ایڈمز حسین و جمیل جینا گراہم کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ خوبرو حسینہ سچ بول رہی تھی یا اداکاری کر رہی تھی۔

''گزشتہ شام کے اخبار میں ٹام ہیریسن نے اپنے تبصرے میں تمہارے بُرے طریقے سے بخیے ادھیڑے تھے۔'' ابی ایڈمز نے کہا۔

یہ سن کر تھیٹر کی اداکارہ نے شانے اچکائے اور کہا۔ ''تو پھر۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے میں نے قتل کیا ہے۔ اس نے میرے ساتھی اداکار ٹونی ایشر اور 'دی پرپل پیشنز' کے رائٹر ڈائریکٹر برائن وین پر بھی کی تنقید کی ہے۔''

''اس کی بیوی کا کہنا ہے کہ تم نے اس کے شوہر کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کی بھی کوشش کی تھی پھر جب اس نے انکار کر دیا تو تم نے اس سے انتقام لینے کی قسم کھائی تھی۔''

'کلارا ہیریسن جھوٹی ہے۔ کیا میں تمہیں ایسی عورت دکھائی دیتی ہوں کہ جو مردوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے بھیک مانگتی پھرے؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ خود مجھے پا لینے کی تمنا

رکھتا تھا۔ جب اس نے اپنی آرزو کا اظہار کیا تو میں نے اسے چلتا ہو جانے کو کہا تھا۔"

"اس کی بیوی نے یہ بھی بتایا ہے کہ آج صبح ساڑھے آٹھ بجے کے لگ بھگ جب وہ سودا سلف لینے کے بعد گھر واپس پہنچی تو اس نے تمہیں اپنے گھر کے پاس منڈلاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور پھر چند منٹ بعد جب وہ اپنے کچن میں داخل ہوئی تو اسے پتا چلا کہ اس کا شوہر بدستور ابھی تک گھر میں موجود ہے اور اس کا قتل ہو چکا ہے۔"

"ساڑھے آٹھ بجے صبح؟ ہاں، میں اس وقت باہر چہل قدمی کر رہی تھی۔" جینا گراہم نے جواب دیا۔

"بارش میں؟"

"مجھے بارش میں چہل قدمی کرنے سے سکون ملتا ہے اور میرے پاس چھتری بھی تھی لیکن میں ٹام ہیریسن کے مکان پر نہیں رکی تھی اور نہ ہی اسے میں نے قتل کیا ہے۔ اگر تمہیں اس کے قاتل کی تلاش ہے تو میرا مشورہ ہے کہ تم اس کی بیوی کلارا کو چیک کرو۔"

"ہاں۔" سراغ رساں ایبی ایڈمز نے جائے واردات سے روانہ ہوتے وقت گاڑی چلاتے ہوئے سوچا۔ قاتلہ تنقید نگار کی بیوی بھی ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس نے اپنے شوہر کی توجہ حاصل کرنے کے مقابلے میں جینا گراہم کو اپنی رقیب سمجھا ہو اور اسے اپنے گھر کے اطراف منڈلاتا دیکھ کر اشتعال آ گیا ہو یا ہو سکتا ہے کہ کلارا ہیریسن کا ایک اور مقصد ہو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی اور کے ساتھ معاشقہ لڑا رہی ہو۔ اس لیے کہ اپنے شوہر کی موت پر وہ بہت زیادہ غم زدہ اور شکستہ دل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کی سڈول ٹانگیں اور چمکیلی گھونگریالی زلفیں بہت سے مردوں کے جذبات بھڑکا سکتی ہیں۔

لیکن پھر وہ کیسا پانی تھا... ہیریسن کے فرنٹ ہال کے سامنے جمع تھا؟ اس پانی کی مقدار اتنی تھی جیسے کسی چھتری سے ٹپکنے والے پانی کی ہوتی ہے۔ شاید وہ جینا گراہم کی چھتری سے ٹپکنے والا پانی ہو؟

پانچ منٹ بعد سراغ رساں ایبی ایڈمز نے اپنی کار ایک چھوٹے سے گھر کے سامنے جنگلے کے پاس روک دی۔ اس کی نظریں مکان کے ڈرائیو وے میں پارک سرخ رنگ کی پورشے اور سفید کورویٹ کا جائزہ لے رہی تھیں۔

اتنے میں مکان کے ٹیرس سے شارٹس میں ملبوس کسرتی جسم والے ایک دبلے پتلے شخص نے بلند آواز سے اسے پکارا۔

"کسی کی تلاش ہے؟"

"ہاں، برائن وین کی تلاش ہے۔" سراغ رساں نے جواب دیا۔

"وہ تمہارے سامنے موجود ہے۔" برائن... نیچے اتر آیا۔

ایبی ایڈمز نے اسے اپنا شناختی بیج دکھایا اور بولا۔ "میں 'دی کوریئر' کے فائن آرٹس تنقید نگار ٹام ہیریسن کے قتل کی تحقیقات کر رہا ہوں۔"

"تم مذاق تو نہیں کر رہے؟"

"میں پوری طرح سنجیدہ ہوں۔"

"ویل، اس بوندا باندی سے نکل کر یہاں اندر آ جاؤ اور مجھے اس بارے میں بتاؤ۔" ساتھ ہی برائن وین نے پلٹ کر داخلی دروازے میں منہ ڈالتے ہوئے آواز لگائی۔ "ٹونی، یہاں باہر آؤ۔ کسی نے اس دہشت ناک ہیریسن کو مار ڈالا ہے۔"

"اسے کس نے گولی ماری ہے؟" سیاہ بالوں والے چھ فٹ کے دراز قامت ٹونی ایشر نے دروازے پر آ کر پوچھا۔ وہ ایک وجیہہ شخص تھا جس کے دونوں رخساروں پر ڈمپلز نمایاں تھے۔ اس اداکار پر نظر پڑتے ہی سراغ رساں ایبی کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ عورتیں اس پر اتنی جلدی فریفتہ کیوں ہو جاتی ہیں۔

"ٹام ہیریسن کو گولی نہیں ماری گئی ہے۔" ایبی ایڈمز نے بتایا۔ "اس کی کھوپڑی پر دھاتی پائپ کے ٹکڑے سے ضرب لگائی گئی ہے۔"

"واؤ! بالکل ایسے ہی جیسے ہمارے ڈرامے 'پرپل پیشنز' میں ہے۔" ٹونی ایشر نے کہا۔

"تمہارا کیا مطلب ہے؟ اس میں کیا ہوتا ہے؟" سراغ رساں نے وضاحت طلب کی۔

"میں اس ڈرامے میں جینا گراہم کو آخر میں اسی طرح قتل کر دیتا ہوں بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ میرا کردار جینا گراہم کے کردار کو قتل کر دیتا ہے۔ یہ حقیقت میں خاصا دھچکا پہنچانے والا انجام ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہاں موجود ڈرامے کا رائٹر ڈائریکٹر برائن وین اس وقت خاصے خون کرنے والے موڈ میں تھا جب اس نے یہ انجام تحریر کیا تھا۔"

"یہی وہ واحد انجام تھا جو یہاں فٹ آ رہا تھا۔" برائن وین نے جواب دیا۔ "لیکن اب......" یہ کہتے ہوئے اس کی تیوریوں پر بل نمایاں ہو گئے۔ "میرا یقیناً یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ آج صبح کوئی جنونی ٹام ہیریسن کے گھر چلا جائے اور اس منظر کی نقل کرتے ہوئے اسے حقیقت کا روپ دے دے۔"

"ہاں۔" ٹونی ایشر نے کہا۔ "اس بات نے تمہیں سب سے اہم مشتبہ کر دیا ہے۔"

براؤن وین نے تیوریاں چڑھالیں۔

''میں تو بس مذاق کر رہا تھا۔'' ٹونی ایشر نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''حقیقت میں بیوی ہی نمبر ون مشکوک ہوتی ہے کیوں آفیسر؟''

''یہ اشاروں کا کھیل نہیں ہے، ٹونی۔'' اس سے قبل کہ سراغ رساں کوئی جواب دیتا، براؤن پھٹ پڑا۔ ''میرے پاس جائے واردات سے عدم موجودگی کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ میں پوری صبح گھر ہی میں موجود تھا لیکن اس بات کو ثابت نہیں کر سکتا۔ اور میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ تمہارے پاس بھی اپنی عدم موجودگی کا کوئی ثبوت نہیں ہوگا۔''

یہ سن کر ٹونی نے آنکھیں میچتے ہوئے کہا۔ ''ہوا یوں تھا کہ میری اس ماہ کی محبوبہ سات بجے کے لگ بھگ اپنے کام پر روانہ ہوگئی تھی جبکہ میں مزید ایک گھنٹے تک سوتا رہا تھا۔ پھر میں نے اٹھ کر غسل کیا، ناشتا کیا، پھر اپنی کیفین تیار کی......''

''اور غالباً اس دوران میں تم نے 'دی کوریئر' میں ڈرامے 'پرپل پیشنز' پر ٹام ہیریسن کا تبصرہ بھی پڑھ لیا ہوگا؟'' ایبی نے پوچھا۔

''میں یہ بات مانتا ہوں۔ ہاں، میں نے وہ فضول بکواس پڑھ لی تھی لیکن اگر تمہارا خیال ہے کہ اسے پڑھ کر میں غصے سے مغلوب ہو کر آپے سے باہر ہو گیا ہوں گا...... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''تم یہاں کب پہنچے ہو؟''

''دس منٹ پہلے...... یا شاید پندرہ منٹ ہو چکے ہوں۔'' اداکار نے اپنی کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی اور تیوریاں چڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ نامعقول گھڑی پھر بند ہوگئی ہے۔ کیا تم میں سے کوئی بتا سکتا ہے کہ کیا وقت ہوا ہے؟''

''پونے دس بجے ہیں۔'' براؤن نے بتایا پھر ایبی ایڈمز کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میری اور ٹونی کی جمنازیم میں دس بجے کی ہینڈ بال کورٹ میں ریزرویشن ہے۔ سو اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو ہم......''

''ٹھیک ہے۔ البتہ ہو سکتا ہے کہ بعد میں مجھے چند سوالات پوچھنے کی ضرورت پیش آجائے۔''

سراغ رساں ایبی ایڈمز ان دونوں کو اپنی اپنی کاروں میں سوار ہوتے دیکھتا رہا۔ ٹونی پورشے میں اور براؤن کورویٹ میں وہاں سے روانہ ہوگئے۔ ایبی ایڈمز اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔ پھر اچانک پلٹ کر گیلے ڈرائیو وے پر نظریں جمادیں۔

ان دونوں میں سے ایک نے کیا کہا تھا؟

وہ بات اہمیت رکھتی تھی۔ وہ کیا بات تھی......؟

پھر سراغ رساں کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔

ہاں، ایبی ایڈمز کی آنکھوں کے سامنے ان چاروں مشتبہ افراد کے چہرے گردش کرنے لگے۔ ان چاروں میں سے ایک نے آج صبح اس سے جھوٹ بولا ہے اور وہ اس بات کو ثابت کر سکتا ہے۔ بس اسے تھوڑے سے ثبوت کی اور ضرورت ہے۔

☆☆☆

کئی گھنٹوں بعد سراغ رساں ایبی ایڈمز پولیس اسٹیشن کے جرح کرنے والے کمرے میں موجود تھا۔ اس کے مقابل میز کی دوسری جانب اس کا سب سے اہم مشتبہ فرد بیٹھا ہوا تھا۔

''ہمیں تمہاری رہائش گاہ سے ایک چھتری ملی ہے جس کے ہینڈل پر خون کا دھبا پایا گیا ہے۔ میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ ٹام ہیریسن کے خون کا دھبا ہے۔ یہ دھبا اس وقت پڑا ہوگا جب اس کے قتل کا ارتکاب کرنے کے بعد چھتری کو واپس اپنی کار میں لے گئے ہوگے۔''

رائٹر ہدایت کار براؤن نے یہ سُن کر اپنا سر جھکا لیا۔

وہ ایک ہولناک آدمی تھا۔ وہ کسی کے متعلق کبھی کوئی اچھی بات منہ سے نہیں نکالتا تھا اور کلارا کے ساتھ نہایت بیدردی سے پیش آتا تھا۔ حتیٰ کہ اس پر تشدد بھی کرتا تھا۔''

سراغ رساں اسے خاموش نظروں سے دیکھتا رہا۔

''لیکن تمہیں مجھ پر شبہ کیوں کر ہوا؟'' براؤن نے جاننا چاہا۔

''دو باتوں پر۔'' ایبی نے تمہیں جگایا۔

''کون سی دو باتیں؟''

''پہلی بات تو یہ کہ میں نے یہ بالکل بھی نہیں بتایا تھا کہ قتل کب اور کس جگہ ہوا تھا...... لیکن اس کے باوجود تم نے یہ بات کہی تھی کہ تمہارا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ کوئی تمہارے ڈرامے کے سین کی نقل کرتے ہوئے آج صبح ٹام ہیریسن کے گھر جا کر اسے ٹھکانے لگا دے۔'' سراغ رساں نے جواب دیا۔

''اور دوسری بات؟''

''وہ یہ ہے کہ جب تم اور ٹونی ایشر جمنازیم جانے کے لیے روانہ ہوئے تھے تو میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ تمہارا ڈرائیو وے گیلا ہو رہا تھا۔''

''تو پھر؟''

''تو پھر یہ کہ اگر تم نے اس بارے میں سچ کہا تھا کہ تم آج صبح کہیں نہیں گئے تھے تو پھر تمہاری کار کے نیچے جہاں وہ کھڑی ہوئی تھی، کنکریٹ کا ڈرائیو وے خشک ہونا چاہیے تھا......'' ایبی نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے اپنی بات ختم کی۔

تلاش

تنویر ریاض

چھوٹی چھوٹی عادتیں بعض اوقات بڑی کارآمد ثابت ہوتی ہیں... روزمرّہ کے معمولاتِ زندگی نبھانے والی ایک ایسی ہی عورت کی عادات... وہ باریک بیں ہونے کے ساتھ ساتھ مشاہداتی طبیعت کی مالک تھی... مستقل نظر آنے والے چہرے اس کی یادداشت کے خانے میں براجمان ہو جاتے تھے... ایک عورت کی غیر حاضری نے اسے تجسس اور فکرمندی میں مبتلا کر دیا تھا...

معاملے کی تہ تک پہنچانے والے غیر ضروری تجسس کی کارگزاری......

کرکٹ نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر کچن کی کھڑکی میں اپنا سر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ وہی شخص تھا؟''

''کار وہی تھی۔'' ایڈم نے جواب دیا۔ ''میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا کیونکہ وہ پہلے کی طرح بل بورڈ کی دوسری جانب کھڑا اس عورت کا انتظار کر رہا تھا۔''

''وہ گلی پار کر کے کس جانب گئے تھے؟''

''میرا خیال ہے کہ میں یہاں سے دیکھ کر یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ تم اس معاملے میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہی

ہو؟''

''مجھے صرف یہ جاننے کا تجسس ہے کہ اس نے کس قسم کے آدمی سے تعلق استوار کیا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ اس کی عمر پچاس کے قریب ہے اور اچانک ہی اسے ایک بوائے فرینڈ مل گیا......''

''اچانک سے تمہاری کیا مراد ہے؟ تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ اس نے اس سے پہلے چار یا پانچ شادیاں نہیں کیں؟''

''میں صرف وہی جانتی ہوں جو دیکھ رہی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ کھڑکی سے ہٹ گئی کیونکہ بیرونی دروازے کی گھنٹی نے کسی گاہک کے آنے کی اطلاع دی تھی۔

☆☆☆

سراغ رساں سارجنٹ فرنز ڈولنگر کبھی کبھی رینو میں لنچ کرنے آیا کرتا تھا۔ اسے یہاں کے سینڈوچز بہت پسند تھے جن کی وجہ سے وہ قلبِ شہر کے شمالی کنارے پر واقع اس ریستوران میں بار بار آنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ ریستوران کے مالک ایڈم ونڈ شیلڈ کے لیے ڈولنگر کی سرپرستی باعثِ اطمینان تھی کیونکہ ڈولنگر کی موجودگی میں اسے تحفظ کا احساس ہوتا گو کہ ڈولنگر عموماً سادہ لباس میں ہوتا لیکن ضرورت پڑنے پر وہ اپنا ریوالور استعمال کرسکتا تھا۔

ونڈ شیلڈ کی پارٹنر اور کل وقتی مددگار ٹینا جارج تھی جو کرکٹ کے نام سے پہچانی جاتی تھی۔ وہ ہمیشہ ڈولنگر کے سینڈوچ میں اضافی کریم لگاتی۔ اس لیے نہیں کہ وہ پولیس والا تھا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے ڈولنگر کی تھوڑی میں پڑنے والے گڑھے اور سر میں نمودار ہونے والا گنج پن اچھا لگتا تھا۔

اس دن کاروبار مندا تھا کیونکہ شدید سردی کی وجہ سے گاہکوں کی آمدورفت برائے نام تھی۔ باہر کا درجۂ حرارت زیرو ڈگری کے قریب تھا۔ لنچ کا وقت گزر چکا تھا اور اب کسی گاہک کے آنے کی توقع باقی نہیں رہی تھی۔ ڈولنگر حسبِ معمول چیز کیک کے پتلے پتلے ٹکڑے مزے لے کر نگل رہا تھا جب ایڈم اس کے پاس آ کر بولا۔

''کیا تم نے کبھی لوسی کو یہاں دیکھا ہے؟''

''کون لوسی؟''

''میں بھی اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ اس کی عمر چالیس سے زیادہ ہے۔ دبلی پتلی، سادہ نقوش، قدرے شرمیلی...... وہ یہاں ہفتے میں کم از کم ایک مرتبہ لنچ کرنے آیا کرتی تھی۔''

ڈولنگر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اگر میں نے کبھی اسے دیکھا بھی ہو تو مجھے یاد نہیں رہا۔ کیا ہوا؟ کوئی خاص بات؟''

کرکٹ بھی ان کی گفتگو میں شامل ہو گئی۔ اس نے کہا۔ ''وہ گزشتہ تین ہفتوں سے نہیں آرہی۔ اس لیے ہمیں تجسس ہو رہا ہے کہ اس کے ساتھ کوئی حادثہ تو پیش نہیں آیا؟''

''ممکن ہے کہ سردی کی وجہ سے وہ نہ آرہی ہو۔''

''ہم یہاں پانچ سال سے ہیں۔'' ایڈم نے کہا۔ ''اور ہم نے دیکھا ہے کہ سردی ہو یا گرمی، وہ ہفتے میں کم از کم ایک مرتبہ باقاعدگی سے آتی تھی لیکن اب وہ اچانک ہی غائب ہو گئی۔''

ڈولنگر نے کھانے پر سے اپنی توجہ ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''اس کے نہ آنے کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ممکن ہے کہ اس نے کسی اور جگہ ملازمت کر لی ہو۔ یہاں سے کہیں اور چلی گئی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بیمار ہو گئی ہو یا اس نے شادی کر لی ہو۔''

''ہاں، یہ ممکن ہے۔ آخری... بار جب وہ یہاں آئی تو اس نے دو آدمیوں کا کھانا لیا جبکہ ایک شخص گلی کے باہر کھڑی نیلے رنگ کی سیڈان میں اس کا انتظار کرتا تھا۔''

''یہی تمہارے سوال کا جواب ہے اور وہ اس وقت ہنی مون منا رہی ہے۔ وہ جہاں کہیں بھی ہے، میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ جگہ یہاں کے مقابلے میں گرم ہوگی۔''

ایڈم کسی گاہک سے بل وصول کرنے کیش رجسٹر کی طرف گیا تو کرکٹ بولی۔ ''کاش مجھے اس پر یقین آجائے۔ وہ ہمیشہ سے ہی بہت غیر محفوظ دکھائی دیتی تھی۔ میں صرف یہی امید کرسکتی ہوں کہ اس نے کسی غلط آدمی سے تعلق نہ قائم کر لیا ہو۔''

''اس سے پہلے وہ ہمیشہ اکیلی آتی تھی؟''

''ہاں ہمیشہ۔ وہ بیرونی دروازے سے آتی اور کاؤنٹر پر بیٹھ کر سینڈوچ، سلاد، چپس اور سوڈا منگواتی۔ ایک مرتبہ اس نے سلاد کے بجائے آلو کے سوپ کا آرڈر دیا تھا۔''

''کیا اسے کھانے کی جلدی ہوتی تھی جیسے اسے لنچ بریک ختم ہونے سے پہلے کام پر واپس پہنچنا ہو؟''

''نہیں۔''

''کیا وہ دوسرے گاہکوں سے بات کرتی تھی؟''

''ہم نے اسے کسی سے بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ بہت کم بولتی تھی۔''

''وہ آدمی دیکھنے میں کیسا لگتا تھا؟''

''ہم نے کبھی اسے غور سے نہیں دیکھا۔''

''اس کی کوئی ایک بات تو تمہارے ذہن میں ہوگی۔ مثلاً یہ کہ وہ لمبا چوڑا تھا یا چھوٹے قد کا، بوڑھا تھا یا جوان۔ گنجا تھا یا اس نے بیس بال کیپ پہن رکھی تھی۔ آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ، کانوں میں بالیاں، کوئی زخم کا نشان، ٹیٹو، جسم کا کوئی عضو غائب وغیرہ وغیرہ......؟''

ایڈم واپس آگیا تھا۔ وہ ڈولنگر کے برابر والے اسٹول پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''وہ تمہارے جتنا لمبا چوڑا تو نہیں البتہ اس کے قریب قریب کہہ سکتے ہیں۔ اس نے ہیٹ یا دھوپ کا چشمہ نہیں پہن رکھا تھا۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا کیونکہ میں نے اسے ہمیشہ کچن کی کھڑکی سے ہی دیکھا اور کار پر سیاہ شیشے لگے ہوئے تھے۔''

ریستوران اس وقت خالی ہو چکا تھا۔ ڈولنگر کے پاس بھی کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ اس لیے وہ ان سے سوالات پوچھتا رہا۔ کیونکہ یہ اچھے اور مخلص لوگ تھے اور یہ ایک پولیس کیس بن سکتا تھا۔ ویسے بھی باہر بہت سردی تھی اور کرکٹ تازہ کافی بنا رہی تھی اس لیے اس نے وہاں مزید کچھ دیر بیٹھنے کو ترجیح دی۔

ڈولنگر نے جیب سے نوٹ بک نکالی اور بولا۔ ''مجھے اس کار کے بارے میں مزید کچھ بتاؤ۔''

''مجھے ماڈل اور میک کا تو پتا نہیں۔ البتہ وہ ایک بڑی نیلے رنگ کی کار تھی۔ شاید وہ چند سال پرانی ہو لیکن دیکھنے میں لگتا تھا کہ اسے دوبارہ اسمبل کیا گیا ہے۔''

''یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی حال ہی میں سروس کروائی گئی ہو۔ تم نے اس کی نمبر پلیٹ نہیں دیکھی؟''

''نہیں، مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کس ریاست میں رجسٹرڈ تھی۔''

''میرا خیال ہے کہ لوسی نے کریڈٹ کارڈ کے ذریعے ادائیگی نہیں کی ہوگی ورنہ تمہیں اس کا پورا نام اور پتا معلوم ہو جاتا۔''

''ہاں، ہم صرف اس کا پہلا نام جانتے ہیں جو اس کے نیم ٹیگ پر درج تھا۔''

''وہ عام طور پر کس لباس میں ہوتی تھی؟ کوئی یونیفارم؟''

''میں بتاتی ہوں۔'' کرکٹ نے کافی بناتے ہوئے کہا۔ ''وہ دفتر میں کام کرنے والا لباس پہنتی تھی۔ سیاہ یا نیوی بلیو پتلون، سفید بلاؤز، چپٹی ایڑی کے جوتے اور چھوٹا سا شولڈر بیگ۔ اس کے پیسے ایک بٹوے میں ہوتے تھے۔ وہ نیل پالش نہیں لگاتی تھی اور نہ ہی آنکھوں کا میک اپ کرتی تھی۔ میں نے اسے کبھی انگوٹھی یا بالیاں پہنے نہیں دیکھا البتہ عام لڑکیوں کی طرح اس کے ہونٹوں پر ہلکی لپ اسٹک ضرور نظر آتی۔''

''وہ عام طور پر کھانے میں کیا لے جاتی تھی؟''

''دو برگر اور دو عدد ڈائٹ سوڈا۔'' کرکٹ نے جواب دیا۔

☆☆☆

ہیڈ کوارٹر واپس آنے کے بعد ڈولنگر نے گزشتہ ماہ کے دوران لاپتا افراد کی فہرست دیکھی لیکن اس میں لوسی کا نام نہیں تھا۔ اس نے وقتی طور پر اس معاملے کو التوا میں ڈال دیا اور موسم بہتر ہونے کا انتظار کرنے لگا لیکن پانچ دن گزرنے کے بعد بھی صورتِ حال تبدیل نہیں ہوئی اور سڑکوں پر سناٹا چھایا رہا جس کی وجہ سے جرائم پیشہ عناصر بھی باہر نہیں آئے۔ اس لیے ڈولنگر کے پاس فرصت ہی فرصت تھی۔ گھروں میں چھوٹے موٹے جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ ان سے نمٹنے کے لیے گشت کرنے والے سپاہی کافی تھے۔ اس فرصت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈولنگر نے پوری سنجیدگی سے لوسی کے کیس کو حل کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس نے چند بنیادی مفروضوں سے اپنے کام کا آغاز کیا کیونکہ اس کے گلے میں نام کا ٹیگ لٹکا ہوا تھا۔ اس لیے عین ممکن ہے کہ وہ کسی دکان میں سیلز یا سروس کی ملازمت کرتی ہو۔ وہ ہمیشہ مرکزی دروازے سے ریستوران میں داخل ہوتی تھی۔ اس لیے ممکن ہے کہ جس جگہ وہ کام کرتی تھی، وہ ریستوران سے چند قدم کے فاصلے پر بارہویں اسٹریٹ کے جنوب میں کہیں واقع ہو اور اس کے لیے پیدل چل کر آنا ہی بہتر تھا کیونکہ دوپہر کے اوقات میں ریستوران کے باہر گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ ملنا تقریباً ناممکن تھا۔

ڈولنگر خود بھی کسی پٹرول مین رہ چکا تھا۔ اس زمانے میں اس نے سٹی ڈائریکٹری اور زرد صفحات کی مدد سے درجنوں علاقوں کے نقشے تیار کیے تھے۔ گو کہ اب ان میں تھوڑی بہت تبدیلی آچکی تھی کیونکہ بہت سے چھوٹے کاروباری ادارے بند ہو چکے تھے یا کسی دوسری جگہ منتقل ہو گئے لیکن آدھ گھنٹے کے اندر وہ ایک ایسی جگہوں کی فہرست بنانے میں کامیاب ہو گیا جہاں لوسی کے کام کرنے کا امکان تھا۔ اس نے باری باری وہاں فون کرنا شروع کردیے۔

ان میں سے دو ادارے گزشتہ برس کے دوران بند

ہو چکے تھے حالانکہ زرد صفحات میں ان کی موجودگی ظاہر ہو رہی تھی۔ پھر اس نے ایک بیوٹی کلینک، ایک لانڈری اور بیکری کا نمبر ملایا لیکن ریکارڈنگ سے معلوم ہوا کہ اب یہ نمبر کسی کے استعمال میں نہیں ہیں۔ اس نے بقیہ سترہ جگہوں پر فون کر کے لوسی کے بارے میں معلوم کرنا چاہا لیکن سب نے یہی بتایا کہ اس نے غلط نمبر ڈائل کیا ہے پھر اس نے ایک اسٹیشنری اسٹور کو فون کیا جس کا نمبر سٹی ڈائریکٹری اور زرد صفحات دونوں جگہ موجود تھا لیکن وہاں سے بھی یہی پیغام ملا کہ یہ نمبر کسی کے استعمال میں نہیں ہے۔

آرمسٹیٹ اسٹیشنری اینڈ آفس سپلائز، اس ریستوران سے آدھے بلاک کے فاصلے پر تھا اور کرکٹ نے لوسی کا جو حلیہ بیان کیا وہ اسٹیشنری اسٹور کی کلرک کے عین مطابق تھا۔ اس ادارے کی اپنی ویب سائٹ تھی جس میں اس کے چودہ اسٹوروں کی فہرست موجود تھی اور ان میں یہ اسٹور بھی شامل تھا۔

ڈولنگر نے ہیڈ آفس فون کیا تو اس کا رابطہ جیک زینگل نامی سیلز منیجر سے ہو گیا جس نے بتایا کہ کاروبار کی صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے آفس سپلائی شاخ کی تنظیم نو کی گئی ہے اور کچھ اسٹور بند کر دیے گئے ہیں۔

''آج کل کاغذ کا استعمال کم ہوتا جا رہا ہے اور سب کچھ آن لائن ہو گیا ہے۔ اگر یہی حال رہا تو کچھ عرصے بعد لوگ اسٹال سے اخبار خریدنا بند کر دیں گے۔ اب قلبِ شہر میں واقع کسی آفس سپلائی اسٹور کے لیے کرایہ نکالنا بھی ممکن نہیں رہا۔ اسٹیشنری آئٹم کی فروخت برائے نام رہ گئی ہے۔ بڑے ادارے اپنی ضرورت کا سامان ہول سیل یا آن لائن اسٹور سے خرید لیتے ہیں۔ اس لیے مزید نقصان سے بچنے کے لیے ہمیں کچھ اسٹور بند کرنا پڑے۔''

''کیا تمہارے پاس ان لوگوں کے بارے میں کچھ معلومات ہیں جو اس اسٹور پر کام کرتے تھے؟''

''میرے کمپیوٹر سے کچھ بنیادی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔ ہم نے لیز کے ختم ہونے پر اکتیس دسمبر کو یہ اسٹور بند کر کے اسٹاف کو بشمول منیجر ایم جے کورنی فارغ کر دیا۔ یہ جگہ راجر ولیم کی ملکیت ہے۔ میں تمہیں ان دونوں کا پتا اور فون نمبر دے سکتا ہوں۔''

ڈولنگر نے ایم جے کورنی کے اپارٹمنٹ سونوما بلیوارڈ .... فون کیا لیکن اسے ایک بار پھر وہی ریکارڈنگ سننے کو ملی کہ یہ نمبر کسی کے استعمال میں نہیں ہے۔ مقامی فون کمپنی کے پاس کورنی کا نیا نمبر نہیں تھا۔ راجر ولیم کا نمبر ملانے سے پہلے ڈولنگر نے یہ یاد کرنے کی کوشش کی کہ اسے یہ نام کیوں جانا پہچانا لگ رہا ہے۔

وہ آنکھیں بند کیے اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا جب اس کا سپروائزر لیفٹیننٹ اوبرن دفتر میں داخل ہوا۔ ''کیا کر رہے ہو فرٹز؟ کیا آنکھیں بند کر کے کسی مزید ارڈش کا خواب دیکھ رہے ہو؟''

''یہ راجر ولیم کون ہے؟'' ڈولنگر نے پوچھا۔

''ہمیشہ سے ہی ایک بدنام شخص رہا ہے۔ اس کا تعلق پراپرٹی کے کاروبار سے تھا۔ اب اس نے کیا کر دیا؟''

ڈولنگر نے اسے لوسی کی گمشدگی اور اب تک اس نے اس سلسلے میں جو کوشش کی تھی، اس کے بارے میں بتا دیا۔ اوبرن نے اپنے جسم کو فالتو کپڑوں کے بوجھ سے آزاد کیا اور اسے اس میٹنگ کی تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا جو وہ ابھی ابھی اٹینڈ کر کے آیا تھا۔

''آج پھر وہ یوٹیلٹی بلز کے معاملے پر بحث کر رہے تھے۔ میں ایک گھنٹے تک ان چار لوگوں کی بے معنی گفتگو سنتا رہا۔ جو یہ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ باتھ روم میں موشن ڈیٹکٹر لگانا سستا پڑے گا یا انہیں چوبیس گھنٹے جلتا چھوڑ دیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ ان میں سے کسی نے بھی اپنی پوری زندگی میں ایک بلب بھی تبدیل نہیں کیا ہوگا۔''

ڈولنگر نے بڑے تحمل سے اوبرن کی آہ وزاری سنی اور اس کے ساتھ ساتھ وہ کمپیوٹر پر قانون نافذ کرنے والے ادارے کا ڈیٹا دیکھتا رہا جس سے اسے راجر ولیم کے بارے میں مزید معلومات حاصل ہوئیں۔ اس کی عمر چھپن برس تھی اور وہ دو ماہ پہلے پانچ سال کی قید کاٹنے کے بعد جیل سے رہا ہوا تھا۔ اسے سرقہ اور فراڈ کے الزام میں نو سال کی سزا سنائی گئی تھی۔ البتہ اس نے جو رقم چوری اور فراڈ سے حاصل کی اس کا بیشتر حصہ برآمد نہ ہو سکا۔

جیک زینگل نے اسے ولیم کا جو پتا بتایا، وہ ایک پوسٹ باکس تھا۔ لہٰذا ڈولنگر نے اس کا فون ملایا۔ ''تم کس سے بات کرنا چاہ رہے ہو؟'' ایک عورت نے تلخ لہجے میں پوچھا۔ وہ کوئی بیزار قسم کی ٹیلی فون آپریٹر لگ رہی تھی۔

''میں نے راجر ولیم کے لیے فون کیا ہے۔ کیا اس سے بات ہو سکتی ہے؟''

''نہیں، مسٹر ولیم اگلے ہفتے تک شہر سے باہر رہیں گے۔ اگر ان کے لیے کوئی پیغام ہو تو بتا دو۔''

ڈولنگر نے ہوا میں تیر چلایا۔ ''کیا تم لوسی بول رہی ہو؟''

''نہیں جناب، میں نیوکاسل انٹرپرائز سے آپریٹر بول رہی ہوں۔''

''کیا کوئی ایسی جگہ ہے جہاں میں اگلے ہفتے سے قبل مسٹر ولیم سے ملاقات کر سکوں؟''

''مجھے افسوس ہے جناب، میرے پاس اس بارے میں کوئی اطلاع نہیں ہے۔ آپ ان کے لیے وائس میل میسج چھوڑ سکتے ہیں لیکن وہ بھی انہیں اگلے ہفتے سے پہلے نہیں ملے گا۔''

ڈولنگر نے پیغام بھیجنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اوبرن اپنی ای میلز دیکھنے کے ساتھ ڈولنگر کی گفتگو بھی سن رہا تھا۔ اس نے اسکرین پر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔ ''پیرول آفیسر سے رابطہ کرو۔''

ڈولنگر نے فوراً ہی سارجنٹ مارک ڈورمر کو فون کیا جو فائدہ مند رہا۔ ڈورمر کے پاس ولیم کا موجودہ پتا تھا۔ وہ لیمرٹ اسٹریٹ پر اٹھارویں بلاک میں رہائش پذیر تھا۔ سارجنٹ نے اس کا وہی نمبر بتایا جو تھوڑی دیر پہلے ڈولنگر نے ملایا تھا۔ ولیم کے پاس آٹھ سال پرانی لنکن سیڈان تھی جو اس نے جیل جانے سے پہلے خریدی تھی۔ ڈولنگر نے سوچا کہ کرکٹ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ لوسی نے کسی بدمعاش سے تعلقات قائم کر رکھے تھے۔

''جہاں تک ہمارے علم میں ہے۔'' ڈورمر نے کہا۔ ''اس نے ابھی تک اپنے پرانے ساتھیوں سے رابطے بحال نہیں کیے ہیں اور نہ ہی مال مسروقہ نکالنے کی کوشش کی۔ ہمارے ایک آدمی نے گزشتہ ہفتے دو مرتبہ اس کا تعاقب کیا تھا لیکن ہمارے پاس اتنی نفری نہیں کہ اس کی ہر حرکت پر نظر رکھ سکیں اور نہ ہی ہمیں اس کا فون ٹیپ کرنے کا اختیار ہے۔ اگر یہ شخص تمہارے ریڈار پر ہے تو میں اس کی وجہ جاننا چاہوں گا۔''

''کوئی خاص بات نہیں۔'' ڈولنگر نے کہا۔ ''نیوکاسل انٹرپرائز سے اس کا کیا تعلق ہے؟''

''یہ اس کی کمپنی کا نام ہے۔ وہ پورے ملک میں بحال شدہ تجارتی اور رہائشی جائداد خریدتا ہے اور انہیں رنگ روغن کر کے کرائے یا لیز پر دے دیتا ہے۔ گزشتہ پانچ سال سے وہ ایک سیل فون کے ذریعے سلاخوں کے پیچھے سے یہ کاروبار کر رہا ہے حالانکہ جیل میں سیل فون کا استعمال ممنوع ہے۔''

''گویا جیل میں رہ کر بھی اس کا کاروبار پھل پھول رہا ہے؟''

''نہیں، اس کا کہنا ہے کہ اس کاروبار میں بہت معمولی منافع ہے اور اس سے ایک خاندان کے روزمرہ اخراجات بھی پورے نہیں ہو سکتے۔ یہ بات اس نے پانچ سال پہلے اپنے دفاع میں کہی تھی جب اس پر دو لاکھ ڈالر چوری کرنے کا الزام عائد کیا گیا تھا۔''

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس وقت وہ شہر سے باہر گیا ہوا ہے؟''

''یہ بات میرے علم میں نہیں۔ تاہم اس کے شہر سے باہر جانے پر کوئی پابندی نہیں بشرطیکہ وہ ہر جمعے کو مجھ سے ملنے کے لیے آتا رہے۔''

''کیا تمہارے پاس لوسی نام کی کسی عورت کے بارے میں معلومات ہیں جو ولیم سے رابطے میں ہے؟''

''نہیں، جہاں تک میں جانتا ہوں۔ وہ غیر شادی شدہ ہے اور غیر عورتوں سے اس کے تعلقات میرا سردرد نہیں، جب تک وہ عورتیں اس کے حملوں سے محفوظ ہیں۔''

ڈولنگر نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ وہ اس سے دوبارہ رابطہ کرے گا۔ جب ان کی گفتگو ختم ہوئی تو اوبرن نے کہا۔ ''کیا تمہیں لوسی کا پورا نام معلوم ہے؟''

''ابھی تک تو نہیں۔''

''کیا تمہیں یقین ہے کہ اسٹیشنری اسٹور خالی ہو گیا ہے یا وہ اس وقت بھی وہاں سامان پیک کر رہی ہوگی۔''

''یہ دیکھنے کے لیے ہمیں خود وہاں جانا ہوگا۔''

دن کے سوا تین بجے اندرونِ شہر ٹریفک کچھ کم تھا۔ انہیں اسٹیشنری اسٹور کے بالکل سامنے گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ مل گئی۔ اسٹور کا دروازہ مقفل تھا اور اس کے شیشے پر اندر کی جانب CLOSED کا سائن بورڈ ٹیپ سے چپکا دیا گیا تھا۔ اسٹور کے اندر اندھیرا تھا اور ایسی کوئی علامت نظر نہیں آئی جس سے ظاہر ہوتا کہ یہ جگہ کرائے کے لیے دستیاب ہے۔

وہ اسٹیشنری اسٹور ایک الیکٹرانکس کی دکان اور بیکری کے درمیان واقع تھا۔ الیکٹرانکس کی دکان پر بیٹھنے والے شخص کو صرف اتنا معلوم تھا کہ اس کے برابر میں ایک اسٹیشنری اسٹور ہے لیکن وہ وہاں.. کام کرنے والوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا اور نہ ہی اسے یہ معلوم تھا کہ اسٹیشنری اسٹور بند ہو چکا ہے۔ اس کے برعکس کینڈی شاپ کی ادھیڑ عمر مالکن نے پڑوسیوں کے کاروبار کی ناکامی پر گہرے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''وہ اس کاروبار کو نہیں چلا سکے۔ آخر میں وہاں

صرف لوسی اور ڈورا ہی رہ گئی تھیں۔“

”کیا تمہیں لوسی کا پورا نام معلوم ہے؟“

”ہاں، لوسی کورنی۔“

ڈولنگر کو یاد آگیا کہ جیک زینگل کے ریکارڈ کے مطابق اسٹور منیجر کا نام ایم جے کورنی تھا۔

”کیا وہ شادی شدہ ہے؟“ ڈولنگر نے پوچھا۔

”مجھے اس بارے میں شبہ ہے۔ بہر حال وہ انگوٹھی نہیں پہنتی تھی اور نہ ہی اس نے کبھی اپنے شوہر کا تذکرہ کیا۔“ اس نے گہری سانس لی اور سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”میں سوچ رہی ہوں کہ اب اس جگہ کون سا کاروبار شروع ہوگا۔“

ڈولنگر نے اس کا شکریہ ادا کیا اور رخصت ہونے سے پہلے دو پونڈ کا کیک خرید لیا۔ جب وہ کار کی طرف واپس جا رہے تھے تو اوبرن نے کہا۔ ”تمہیں یہاں سے اسٹیشنری اسٹور کا صرف سامنے والا حصہ نظر آرہا ہے، اس کے عقبی حصے میں بھی بہت کچھ ہوگا۔ مثلاً دفتر، اسٹور اور باتھ روم وغیرہ۔“

ڈولنگر کار گلی میں لے گیا اور اوبرن نے اسٹیشنری اسٹور کا عقبی دروازہ چیک کرنے کے لیے کار سے باہر قدم رکھا۔ وہ دروازہ صرف ہاتھ لگانے سے ہی کھل گیا کیونکہ اس کا تالا پہلے ہی توڑا جا چکا تھا۔ اندر اندھیرا تھا۔ اوبرن نے دروازہ دوبارہ بند کر دیا۔ وہ واپس اپنی کار کی طرف آئے اور ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر کو اس ظاہری نقب زنی کی اطلاع دینے کے ساتھ ہی ثبوتوں کے ماہر کو بھی بھیجنے کی درخواست کی۔ اس کے بعد اوبرن نے ڈیٹا بیس پر ایم جے کورنی کو چیک کرنا شروع کر دیا۔ تین منٹ بعد ہی اس کے اسمارٹ فون پر مونیکا جون کورنی کی تصویر نمودار ہوئی۔ اس کی عمر 46 سال اور وہ سونوما بلیوارڈ میں رہائش پذیر تھی۔

”یہ فون مجھے دے دو۔“ ڈولنگر نے کوٹ کے بٹن بند کیے اور کالر اوپر کرتے ہوئے بولا۔ ”میں اسے لے کر ریستوران جا رہا ہوں تاکہ یقین ہو جائے کہ یہ لوسی ہی ہے۔“

”سردی بہت ہے۔ تم تھوڑا سا انتظار کیوں نہیں کر لیتے؟“

”کوئی بات نہیں، میں تمہارے لیے بھی گرم گرم کافی لیتا آؤں گا۔“

ڈولنگر کے جاتے ہی ایک پٹرول کار وہاں آگئی۔ اس کے پیچھے فارنسک لیبارٹری کی وین بھی تھی۔ ایک مسلح پولیس آفیسر ٹارچ سمیت محتاط انداز میں عقبی دروازے کی جانب بڑھا۔ لیفٹیننٹ کیسرل اور اوبرن بھی اس کے ساتھ تھے جبکہ ایک پٹرول مین ان کے پیچھے چل رہا تھا۔

اسٹیشنری اسٹور کا عقبی نصف حصہ چار اسٹور روم اور ایک باتھ روم پر مشتمل تھا۔ وہاں سے تمام سامان اور فرنیچر ہٹایا جا چکا تھا۔ عقبی دیوار میں ایک سیف کے سائز کے برابر خلا نظر آیا۔ اس کی ظاہری حالت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ جیسے وہاں سے کوئی چیز زبردستی نکالی گئی ہو۔ اس کے کناروں کا پلاسٹر اکھڑا ہوا تھا اور گلاس وول کے ٹکڑے لٹک رہے تھے۔ ہال کے وسط میں ایک فٹ چوڑا مٹی کا دھبا نظر آرہا تھا اور ٹارچ کی روشنی میں دیکھنے پر اس میں خون کی آمیزش نظر آئی۔

کیسرل نے اس جگہ کی تصویریں لینا شروع کر دیں۔ اس وقت تک ڈولنگر بھی کافی لے کر آگیا تھا۔ کیسرل نے تصدیق کی کہ فرش پر پڑے ہوئے مواد میں انسانی خون شامل ہے۔

ڈولنگر نے اوبرن کو فون واپس کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ لوسی ہی ہے۔ کرکٹ اور ایڈم کو اس کا سو فیصد یقین ہے۔ اندر کیا ہو رہا ہے؟“

اوبرن نے اسے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ”اب ہمیں ولیم کے گھر جانا چاہیے۔“

راجر ولیم نے جیل سے رہا ہونے کے بعد ہمبرٹ اسٹریٹ پر واقع ایک اپارٹمنٹ میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ یہ عمارت انیسویں صدی کے آخر میں تعمیر کی گئی تھی اور شروع میں یہاں زیادہ تر ڈاکٹرز کے کلینک تھے لیکن بعد میں انہیں اسٹوڈیو اپارٹمنٹ میں تبدیل کر دیا گیا اور یہ اعلیٰ درجے کی سنگل فیملی رہائش کے لیے موزوں ترین سمجھے جاتے تھے۔

انہوں نے اپنی گاڑی سڑک کے برابر میں ایسی جگہ کھڑی کی جو کسی زمانے میں شاندار بیرونی احاطہ تھا لیکن اب اسے کنکریٹ کا فرش ڈال کر پختہ کر دیا گیا تھا۔ ولیم کا اپارٹمنٹ گراؤنڈ فلور پر تھا۔ پہلی گھنٹی پر کوئی جواب نہیں آیا۔ اوبرن نے بیرونی دروازے پر دستک دی اور اسے ایک گھنٹے میں دوسری بار ایک غیر مقفل دروازے سے واسطہ پڑا لیکن یہاں تالے کو نقصان نہیں پہنچایا گیا تھا۔ اس نے دروازہ کھول کر بہ آوازِ بلند کہا۔ ”پولیس...... یہاں کوئی ہے؟“

اندر سے کسی آٹومیٹک ہتھیار کے ذریعے فائرنگ شروع ہو گئی اور بیس سال کی ملازمت کے دوران پہلی بار

اعشاریہ پینتالیس کی دو گولیاں اس کے سینے میں اتر گئیں۔ وہ پیچھے کی جانب لڑکھڑایا۔ اس کے سینے کی ہڈی میں اٹھنے والی تکلیف انسانی برداشت سے باہر تھی۔ وہ فراموشی کے عالم میں زمین پر گر پڑا۔

جب اسے ہوش آیا تو اس نے سرخ بالوں اور سرخ چہرے والے کیپٹن زوسکی کو اپنے اسٹریچر کے گرد منڈلاتے دیکھا۔ اس نے کبھی زوسکی کے ساتھ کام نہیں کیا تھا بلکہ شاید وہ اس سے کبھی ملا بھی نہیں تھا لیکن کسی نہ کسی طرح وہ اسے جانتا تھا۔ لیکن یہ وہ زوسکی نہیں بلکہ اسپتال کا بے ہوش کرنے والا ڈاکٹر گریگ زوسکی تھا۔

”اوکے دوست، بات کرنے کی کوشش مت کرو۔ تمہاری تکلیف کتنی شدید ہے۔ لاؤ میں تمہاری انگلیاں دیکھتا ہوں۔“

اوبرن نے اپنی تمام انگلیاں اس کے سامنے کر دیں۔ ”ابھی معلوم ہو جاتا ہے۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”اپنے ساتھی کو ایک محبت نامہ لکھو۔“

یہ کہہ کر اس نے ایک کلپ بورڈ اور پنسل اوبرن کے حوالے کی اور خود کمرے سے باہر چلا گیا۔ عین اسی وقت ڈولنگر وہاں آگیا۔ اس کا شیو بڑھا ہوا تھا اور دایاں بازو ایک پٹی میں جھول رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”کیسا محسوس کر رہے ہو؟“

اوبرن کے بائیں بازو میں خون چڑھ رہا تھا اور دائیں بازو میں کیتھیٹر لگا ہوا تھا۔ اس نے کلپ بورڈ پر لکھا۔ ”آج کیا دن ہے؟“

”بدھ، تمہارا تقریباً چار گھنٹے کا آپریشن ہوا ہے۔ تمہارے والدین سارا دن یہاں رہے۔ وہ دس منٹ پہلے ڈنر کے لیے گئے ہیں۔“

اوبرن کا دماغ ابھی تک بے ہوشی کی دوا کے زیرِ اثر تھا۔ اس نے کہا۔ ”کون سے رشتے دار؟“

”تمہارے خاندان میں کتنے لوگ ہیں۔ تمہاری ماں، باپ، بھائی اور بہن، سمجھ گئے۔“

”لوسی کا پتا چلا؟“

”نہیں۔“

”اور ولیم؟“

”وہ بھی ابھی تک مفرور ہے۔ جب فائرنگ رکی تو تمہیں یہاں لانا میری پہلی ترجیح تھی اور پولیس کے وہاں پہنچنے تک اپارٹمنٹ خالی ہو چکا تھا۔“

”تمہیں کہاں چوٹ لگی؟“

”میرے کندھے پر زخم آیا ہے لیکن میرا اندازہ ہے کہ زیادہ گہرا نہیں ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ میں ابھی تک زندہ ہوں۔“

جمعرات کی صبح ڈاکٹر زوسکی نے اس کے جسم سے غیر متعلق ٹیوبیں نکال دیں اور ایک نرس نے اسے گرم چائے کے علاوہ ٹھنڈا لیمن کسٹرڈ دیا۔ کچھ دیر بعد اس کے والدین بھی آگئے۔ ان کے پاس بدھ کی شام کے اخبارات کی پانچ کاپیاں تھیں جس کے پہلے صفحے پر اس کے بارے میں خبر نمایاں طور پر شائع ہوئی تھی جبکہ آخری صفحے پر اس کی مختصر سوانح حیات اور اس کی چار سال پرانی تصویر لگائی تھی جب وہ سارجنٹ تھا۔

دوپہر میں ڈولنگر دو آدمیوں کا کھانا ایک بڑے سے کاغذ کے تھیلے میں لے کر آگیا۔ اس نے شاید پہلے ہی یہ بھانپ لیا تھا کہ اوبرن کے حصے کا کھانا بھی اسے ہی نمٹانا ہوگا۔ کھانے کے دوران اس نے اوبرن کو کیس کی تازہ ترین صورتِ حال کے بارے میں بتایا۔ لوسی اور راجر ولیم کے ٹھکانے کا کچھ پتا نہیں چل سکا تھا۔ جس اپارٹمنٹ سے اوبرن اور ڈولنگر پر فائرنگ کی گئی۔ وہ ولیم کی ملکیت تھا۔

لوسی کے بارے میں مزید معلومات حاصل کی گئیں تو پتا چلا کہ اس نے مارکیٹنگ میں ڈگری حاصل کی ہے اور اس کا ماضی بے داغ ہے۔ اس نے سونوما بلیوارڈ میں واقع اپنا اپارٹمنٹ نومبر کے آخری ہفتے میں خالی کر دیا تھا۔ اس کے نام پر گزشتہ پانچ سال کے دوران کوئی نمبر پلیٹ جاری نہیں ہوئی۔

اس نے گفتگو کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ”لہٰذا ہم ایک ایسے قتل کی تحقیقات کر رہے ہیں جس میں ابھی تک لاش نہیں ملی اور ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ اگر مل بھی گئی تو وہ لاش کس کی ہوگی۔ درحقیقت ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ ایسی کوئی لاش ہے بھی یا......“

”فرنز۔“ اوبرن نے نقاہت سے کہا۔ ”مجھے نہیں معلوم کہ میرے جسم میں جو سیال مادہ جا رہا ہے، اس سے مجھے کتنی تقویت ملے گی تاہم فی الحال میں نے لوسی کے بارے میں دو اندازے قائم کیے ہیں۔“

”کیا دو سے زیادہ کی بھی گنجائش ہے؟“ ڈولنگر نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

”ہم یہ فرض کر رہے ہیں کہ لوسی نے حال ہی میں ولیم سے ملنا شروع کیا تھا کیونکہ ریستوران کے مالک اور اس کے معاون کا یہی بیان ہے لیکن ولیم پانچ سال پہلے جیل چلا

گیا تھا اور اس کے بہت بعد میں لوسی کورنی نے اس ریستوران میں لنچ کرنا شروع کیا۔ وہ اس اسٹیشنری اسٹور کی منیجر تھی جس کی عمارت کا مالک ولیم ہے۔ اس لیے وہ یقیناً برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ولیم کے جیل جانے سے پہلے ہی ان کے درمیان تعلقات قائم ہو چکے ہوں۔‘‘

’’ہوسکتا ہے۔‘‘ ڈولنگر نے تائید کرتے ہوئے کہا۔

’’ان پانچ سالوں کے دوران ولیم جیل کی سلاخوں کے پیچھے رہا لیکن اس کا کاروبار چلتا رہا۔ اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ اس کے پاس جیل میں سیل فون کی سہولت تھی جس کے ذریعے وہ اپنے کاروباری معاملات طے کرتا تھا لیکن اس کے باوجود اسے باہر کی دنیا میں کسی ایسے شخص کی ضرورت تھی جو اس کے کاروبار کی تشہیر کرسکے۔ گاہکوں کو خالی مکانات دکھائے اور ان کی مرمت، رنگ و روغن اور تزئین و آرائش کے لیے ٹھیکے داروں کی خدمات حاصل کرسکے تو وہ لوسی کیوں نہیں ہوسکتی؟‘‘

’’بالکل۔‘‘ ڈولنگر نے کہا...... ’’اگر وہ اس کی لنکن چلاتی رہی جب وہ جیل میں تھا تو اس سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ اس کے پاس اپنی کار کیوں نہیں تھی۔‘‘

’’دوسری بات۔‘‘ اوبرن نے آہستہ سے اپنی پوزیشن بدلتے ہوئے کہا۔ ’’ولیم کے بارے میں یقین سے کہا جاتا ہے کہ اس نے چوری شدہ رقم کا بنڈل کہیں چھپا رکھا ہے۔ کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ اس نے یہ رقم اسٹیشنری اسٹور کی دیوار کے پیچھے رکھی ہو جہاں سے کسی نے حال ہی میں کوئی الماری یا سیف الگ کیا ہے۔‘‘

’’تمہارا خیال ہے کہ اس سے پہلے ہی کوئی وہ رقم نکال کرلے گیا؟‘‘

’’ایک منٹ۔‘‘ اوبرن نے کہا۔ ’’فرض کرو اس نے لوسی کو نہیں بتایا کہ اسٹور کی دیوار میں کیا چھپایا گیا ہے۔ کمپنی اسٹور بند کردیتی ہے اور لوسی کی ملازمت بھی ختم ہوجاتی ہے لیکن اس سے پہلے اسے اسٹور کے لیے کرائے دار تلاش کرنا ہے۔ وہ اخبار میں اشتہار دینا چاہتی ہے لیکن ولیم منع کردیتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ نیا کرایہ دار اسٹور کی ازسرِنو تزئین و آرائش کرے گا اور اس دوران اسے پوشیدہ رقم مل سکتی ہے۔‘‘

’’کیا تم نے یہ سب کچھ خواب میں دیکھا ہے یا رات بھر ٹی وی پر جاسوسی شو دیکھتے رہے؟‘‘

’’ولیم پیرول پر رہا ہونے والا تھا لیکن اسے اندیشہ تھا کہ اس کے باہر آنے سے پہلے ہی معاملات تیزی سے آگے بڑھ سکتے ہیں لہٰذا اسے لوسی کو بتانا پڑا کہ وہ اسٹور کو کرائے پر دینا کیوں نہیں چاہتا۔‘‘

’’اب تیسری بات۔ لوسی نے اپنے طور پر لوٹ کا مال برآمد کرلیا اور جب ولیم جیل سے باہر آیا تو انہوں نے اپنا سفر وہیں سے شروع کیا جہاں سے چھوڑا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب لوسی نے اپنا اپارٹمنٹ چھوڑا۔ آخری دنوں میں ولیم اسٹیشنری اسٹور سے دور رہا کیونکہ اسے شبہ تھا کہ اس کی نگرانی ہورہی ہے۔ یہ صورتِ حال لوسی کے لیے تسلی بخش تھی لیکن وہ جانتی ہے کہ جلد یا بدیر اسے مالِ غنیمت کے ساتھ روپوش ہونا پڑے گا یا وہ ولیم کو غائب کردے گی۔‘‘

ان کی گفتگو کا سلسلہ ایک نرس کے آنے سے منقطع ہو گیا جس نے بستر کے سرہانے لگے ہوئے اسکرین سے ڈ... نوٹ کیا اور چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد ڈولنگر نے کہا۔

’’جو کچھ میں سوچ رہا ہوں، اگر ایسا ہی ہے تو و... واپس نہیں آئے گا۔‘‘

’’بالکل صحیح کیونکہ وہ شہر سے باہر گیا ہی نہیں تھا... سوموار کے دن کسی وقت غالباً رات میں خالی اسٹور سے اپ... رقم نکالنے کے لیے اوزاروں سمیت گیا، جب اس نے دیکھ... کہ لوسی نے تالے تبدیل کردیے ہیں تو اسے نقب زنی کر... پڑی اور جب اس نے دیکھا کہ رقم غائب ہے تو ان کے درمیان جھگڑا ہوا اور لوسی نے اسے ہمیشہ کے لیے خاموش... دیا۔‘‘

’’تمہارا مطلب ہے کہ وہ رات کے وقت وہ... موجود تھی۔ اعشاریہ پینتالیس کے ریوالور سمیت؟‘‘

’’تم نے جب منگل کے روز ولیم نے ہمبرٹ اسٹری... والے اپارٹمنٹ فون کیا تو لوسی وہاں چھپی ہوئی تھی۔ اسے... کسی طرح یہ معلوم ہوگیا کہ یہ فون کسی پولیس والے کا... وہ غالباً سہ پہر میں وہاں سے رقم سمیت نکلنے کی تیاری کر... تھی جب ہم نے اس کے دروازے پر دستک دی۔‘‘

’’اگر وہ ہمیں اندر آنے دیتی تو اس رقم کے سا... ساتھ وہ اپنی آزادی سے بھی محروم ہوجاتی۔ ولیم کا کانٹا... پہلے ہی نکال چکی تھی۔ اس لیے اپنے آپ کو بچانے کے... دو پولیس والوں کی جان لینا اس کے لیے کوئی بڑی بات نہ... تھی۔‘‘

’’اب بھی ایک یا دو باتیں حل طلب ہیں۔‘‘ ڈو... بولا۔ ’’منگل والے دن کیسرل اسٹیشنری اسٹور میں فون...

منی کی تصویریں اتارنے کے بعد ولیم کے اپارٹمنٹ گیا جہاں ہم دونوں تقریباً ضائع ہوچکے تھے۔ اس نے وہاں بھی کارروائی کی۔ اسے بہت سا خون اور اعشاریہ پینتالیس کے خالی کارتوس ملے لیکن مجھے یقین ہے کہ اسے کوئی ایسی نشانی نہیں ملی جس سے ظاہر ہوتا کہ ولیم کے علاوہ بھی وہاں کوئی رہ رہا تھا۔‘‘

’’ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی وہ اپنا سارا سامان کار میں رکھ چکی تھی۔ دوسرا مسئلہ کیا ہے؟‘‘

’’اس نے لاش کا کیا کیا؟‘‘

’’اسے بھی کار کی ڈکی میں رکھ دیا۔ کیا کوئی اس کار کو تلاش کررہا ہے؟‘‘

’’ریاست کی تمام پٹرول کاروں کو اس کی تفصیل اور رجسٹریشن نمبر بتادیا گیا ہے۔‘‘

لمحہ بھر توقف کرنے کے بعد ڈولنگر نے کہا۔ ’’کیا تم یہ محسوس نہیں کرتے کہ اس کے برعکس بھی ہوسکتا ہے۔ یعنی یہ کہ اسٹور میں لوسی کو گولی لگی ہو اور ولیم اس کی لاش کو ڈکی میں بند کرکے یہاں سے میلوں دور چلا گیا ہو؟‘‘

’’یقیناً، البتہ ایسی صورت میں وہ پیرول کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوگا اور اس کی ساری زندگی بھاگتے ہوئے گزرے گی۔‘‘ اوبرن نے آہستہ سے پہلو بدلا اور بولا۔ ’’ایک اور بات، یہ بھی ممکن ہے کہ لوسی نے ابھی شہر نہ چھوڑا ہو۔ معلوم کرو کہ ولیم کا کوئی اور مکان کرائے کے لیے خالی ہے۔‘‘

☆☆☆

جب ولیم کے مکان سے فائرنگ شروع ہوئی تو ڈولنگر تھوڑا سا دائیں جانب اوبرن کے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ اوبرن کے سینے میں دو گولیاں لگیں جبکہ ایک گولی ڈولنگر کے دائیں کندھے کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ اس کی ہڈی تو محفوظ رہی تاہم مسلز کو نقصان پہنچا۔ وہ طبی رخصت پر ہونے کے باوجود لوسی اور ولیم کو تلاش کرنے کے لیے سراغ رساں لیفٹیننٹ ویکوف کے ساتھ کام کررہا تھا۔

جمعرات کی سہ پہر ہیڈکوارٹر میں بالکل غیر متوقع طور پر لوسی کورنی کی آمد ہوئی اور اس نے استقبالیہ کلرک سے کہا۔ ’’مجھے معلوم ہوا ہے کہ پولیس میری تلاش میں ہے۔‘‘

ہیڈکوارٹر میں کھلبلی مچ گئی۔ تمام تکلفات کو بالائے طاق رکھ کر ویکوف اسے اپنے دفتر میں لے گیا۔ اس سے کوٹ اتارنے کے لیے کہا اور اس کا ڈرائیونگ لائسنس مانگا۔ اسے دیکھ کر ڈولنگر سوچنے لگا کہ ایسی سنجیدہ اور متین عورت وہ نہیں ہوسکتی جس نے پرسوں ہم پر حملہ کیا تھا۔

’’آج کل میں اخبار میں صرف وہ کالم پڑھتی ہوں جس میں مدد کی درخواست کی جاتی ہے۔‘‘ لوسی نے کہا۔ ’’میری گیارہ سالہ بھتیجی نے آئی پیڈ پر میرے بارے میں کچھ دیکھا اور اپنی ماں کو بتایا لہٰذا میں یہاں چلی آئی۔‘‘

ڈولنگر یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ جس ہچکچاہٹ، شرمیلی اور دھیمی آواز میں بات کررہی تھی۔ وہ اس آپریٹر سے بالکل مختلف تھی جس سے اس نے منگل کے روز گفتگو کی تھی۔

ویکوف نے اپنے کمپیوٹر اسکرین پر ایک فائل کھولی اور اس کا ڈرائیونگ لائسنس دیکھتے ہوئے بولا۔ ’’کیا تم ہمیں اپنا موجودہ پتا بتاسکتی ہو؟‘‘

اس نے شمالی مضافات کا ایک پتا بتاتے ہوئے کہا۔ ’’یہ میرا عارضی پتا ہے۔ میں ان دنوں اپنے بھائی کے پاس ٹھہری ہوئی ہوں اور مجھے دوسری ملازمت کی تلاش ہے۔ غالباً تمہیں معلوم ہوگا کہ جس اسٹور میں، میں آٹھ سال سے ملازمت کررہی تھی۔ وہ بند ہوگیا ہے۔‘‘

ویکوف نے اس کا جواب اپنے کمپیوٹر میں ٹائپ کیا اور بولا۔ ’’تمہارے بھائی کا نام؟‘‘

’’کین کورنی۔ وہ وکیل ہے۔‘‘

’’تم کتنے عرصے سے اس کے ساتھ رہ رہی ہو؟‘‘

’’میں نے نومبر کے آخری ہفتے میں اپنا اپارٹمنٹ خالی کردیا تھا جب یہ یقین ہوگیا کہ اسٹور بند ہونے والا ہے۔ میرے پاس کار نہیں ہے۔‘‘

’’دسمبر کے مہینے میں تم اپنے کام پر کس طرح جاتی رہیں؟‘‘

’’کین صبح میں اندرونِ شہر جاتے ہوئے مجھے اسٹور پر چھوڑ دیا کرتا تھا۔‘‘

’’تمہارے بھائی کے پاس کون سی کار ہے؟‘‘ ڈولنگر نے پوچھا۔

’’نیلے رنگ کی کیڈی لک البتہ مجھے اس کا ماڈل معلوم نہیں۔‘‘

’’کیا وہ کبھی تمہیں لنچ کے لیے لے کر گیا؟‘‘

’’ہاں، ہفتے میں دو مرتبہ۔‘‘

’’تم رینو ڈیلی بھی جاتی تھیں؟‘‘

’’ہاں۔‘‘

ویکوف نے کہا۔ ’’تمہیں معلوم ہوگا کہ ہم راجر ولیم کو بھی ڈھونڈنے کی کوشش کررہے ہیں۔‘‘

''ہاں، میں جانتی ہوں۔ وہ اس اسٹور کا مالک ہے جہاں میں کام کرتی تھی لیکن میں اس سے کبھی نہیں ملی۔ مجھے تو یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ ان تمام برسوں میں وہ جیل میں رہا۔''

''جب میں نے دو دن پہلے اس کے نمبر پر فون کیا تو ایک آپریٹر سے بات ہوئی تھی۔''

''وہ ڈورا سیمنز ہو گی۔ وہ اسٹیشنری اسٹور میں پارٹ ٹائم کلرک اور بک کیپر کے طور پر کام کرتی تھی لیکن وہ مسٹر ولیم کے لیے بھی کام کرتی ہے۔''

''کس حیثیت میں؟'' ویکوف نے پوچھا۔

''میں یقین سے نہیں کہہ سکتی۔ ڈورا بہت پرائیویٹ ہے کیونکہ وہ بہت سی باتیں چھپاتی ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ مسٹر ولیم کی طرف سے معاہدے کرتی تھی کیونکہ وہ ہمیشہ اسٹور کے پچھلے حصے میں بنے ہوئے دفتر میں کاغذات رکھتی تھی۔''

''کیا اس دفتر میں کوئی سیف بھی تھا؟'' ڈولنگر نے پوچھا۔

''ہاں، وہاں ہم ہر رات کو نقد رقم رکھتے تھے۔ اس کا کچھ حصہ دیوار میں نصب تھا لیکن کرسمس کے بعد جو لوگ فرنیچر اٹھانے آئے وہ اسے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔''

''کیا ڈورا کو سیف کا کمبی نیشن معلوم تھا؟''

''ہاں، بالکل۔''

ویکوف نے کمپیوٹر کا مانیٹر گھمایا تا کہ لوسی، ڈورا سیمنز کا چہرہ دیکھ سکے۔ لوسی نے کہا۔ ''ہاں یہی ہے۔''

''اس کے پاس کون سی کار ہے؟''

''ایک گہرے نیلے رنگ کی بڑی لنکن سیڈان۔''

ایسی کوئی گاڑی اس کے نام پر رجسٹرڈ نہیں تھی۔

ویکوف چاہتا تھا کہ لوسی نے جو معلومات فراہم کی ہیں، ان کی تصدیق ہونے تک اسے اپنی تحویل میں رکھے لیکن ڈولنگر نے اس کی مخالفت کی۔ ڈورا سیمنز کے پتے پر فون کیا گیا لیکن وہاں سے کوئی جواب نہیں ملا۔ ویکوف نے ایک پٹرول کار اس کے گھر بھیجی لیکن سختی سے تاکید کر دی کہ کسی بھی حال میں گھر میں داخل ہونے کی کوشش نہ کی جائے۔ پبلک سیفٹی ریکارڈ سے سیمنز کے بارے میں کوئی معلومات نہیں ملیں۔ ویکوف نے تفصیلی چھان بین کے احکامات صادر کر دیے۔

ڈولنگر نے اپنے طور پر فیصلہ کیا کہ اوبرن کو صرف یہ بتانے کے لیے نیند سے نہ بیدار کیا جائے کہ لوسی مل گئی ہے۔ اس نے کمپیوٹر پر ان مکانات کی فہرست مرتب کرنا شروع کر دی جو نیو کاسل انٹرپرائز کی ملکیت تھے۔ وہ یہ کام بائیں ہاتھ سے کر رہا تھا۔ کیونکہ دائیں ہاتھ کی معمولی حرکت سے اس کے کندھے میں درد شروع ہو جاتا تھا۔

پٹرول کار نے رپورٹ دی کہ سیمنز کے مکان میں کسی غیر معمولی سرگرمی کی علامت نظر نہیں آئی اور نہ ہی مکان کے سامنے یا عقب میں کوئی نیلے رنگ کی لنکن کار کھڑی ہوئی تھی۔

ڈولنگر ڈیوٹی ختم کر کے گھر آیا تو بہت تھکا ہوا تھا۔ وہ اگر چاہتا تو درد کی گولی لے کر کچھ دیر آرام کر سکتا تھا لیکن اس جیسے شخص کے لیے ذہنی یا جسمانی طور پر فارغ رہنا ممکن نہیں تھا لہٰذا اس نے گولی واپس دراز میں رکھی اور شہر کا نقشہ دیکھنے لگا۔ ابھی سورج ڈوبنے میں ایک گھنٹا باقی تھا۔ اس نے وہ نقشہ اور ولیم کے خالی مکانوں کی فہرست پکڑی اور دوبارہ کار لے کر نکل گیا۔

وہ پوری توجہ اور دھیان سے فہرست میں دیے گئے مکانوں کو دیکھتا ہوا جا رہا تھا۔ وہ سب مکان خالی تھے اور وہاں کسی کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آئے اور نہ ہی کوئی گاڑی کھڑی ہوئی دکھائی دی۔ اس کے باوجود وہ ہر مکان یا اپارٹمنٹ کے سامنے گاڑی کی رفتار کم کرتا اور اپنے ڈیجیٹل کیمرے سے ان کی چند تصویریں اتار لیتا۔

اندرونِ شہر کے مشرق میں اسمال وڈ کا علاقہ تھا۔ جہاں چھوٹے کم قیمت مکانات تھے۔ یہاں انتہائی ضرورت مند لوگ ہی مکان کرائے پر لیتے اور مالی حالات بہتر ہونے پر کسی دوسری جگہ منتقل ہو جاتے۔ ایسا ہی ایک خالی مکان ڈولنگر کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ کیونکہ اس کی دو کھڑکیوں سے روشنی باہر آ رہی تھی۔ اس کے برابر والی گلی سے گزرتے ہوئے ڈولنگر کی نظر نیلے رنگ کی لنکن سیڈان پر گئی جو راجر ولیم کے نام پر رجسٹرڈ تھی اور مکان کے عقبی صحن میں کھڑی ہوئی تھی۔

اس نے اپنی کار دو گلیاں چھوڑ کر کھڑی کی اور ویکوف کو پیغام کے ساتھ نیلے رنگ کی کار کی تصویر بھی بھیج دی جس میں اس کے پیچھے کی نمبر پلیٹ نظر آ رہی تھی۔ ویکوف نے جوابی پیغام بھیجا۔ ''اطلاع دینے کا شکریہ۔ اب تم فوراً وہاں سے چلے جاؤ کیونکہ تم طبی رخصت پر ہو اور کام کرنے کے قابل نہیں ہو۔ اگر میں نے اس علاقے میں تمہارا سایہ بھی دیکھ لیا تو تمہارا دوسرا بازو بھی بیکار ہو جائے گا۔''

ڈولنگر اپنی کار میں بیٹھا رہا۔ اس نے انجن بند نہیں کیا اور سردی سے بچنے کے لیے شیشے چڑھا لیے۔ شام کے

سائے گہرے ہونے لگے اور سڑکوں کی روشنیاں جل اٹھیں۔ اس نے کار میں لگا پولیس ریڈیو آن کر دیا جس سے پتا چلا کہ چار پٹرول کاریں لبرٹی ڈرائیو پر جمع ہو رہی ہیں۔ یہ سڑک اسمال وڈ کو اندرونِ شہر سے ملاتی تھی۔

کافی دیر بعد ایک پبلک سیفٹی کار خاموشی سے اگلے چوک میں داخل ہوئی۔ اس نے اپنی کار کے عقبی شیشے میں دیکھا کہ ایک بلاک کے فاصلے پر ایک ایمبولینس اس کے عقب میں آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ دفعتاً پورا علاقہ روشنیوں میں نہا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ویکوف کی آواز فضا میں گونجی جو میگا فون پر پولیس کی کارروائی شروع ہونے کا اعلان کر رہا تھا۔

پڑوس میں رہنے والوں نے کھڑکیوں سے جھانکنا شروع کر دیا اور کچھ منچلے گھروں سے باہر نکل آئے لیکن پولیس والوں نے انہیں واپس بھیج دیا۔ کار میں بیٹھے ہوئے ڈولنگر کو بھی اپنے پہچان لیے جانے کا ڈر تھا۔ وہ ہڈ اور مفلر کے ذریعے اپنا چہرہ چھپا سکتا تھا لیکن اس کا قد کاٹھ اور چال جانی پہچانی تھی۔

اس نے کھڑکی کا شیشہ اتار کر صورتِ حال کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ اسے ایک تنہا اور بکھرے بالوں والی عورت فٹ پاتھ کے ساتھ تیزی سے جاتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ لمحہ بہ لمحہ جائے وقوعہ سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ ڈولنگر نے اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے گلووباکس کھول کر اس میں سے اپنا سروس ریوالور نکالا۔ اسے بخوبی اندازہ تھا کہ ڈورا سیمنز نے بھی اپنے کوٹ کی جیب میں رکھے ہوئے ہتھیار کو مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے۔

جب ڈولنگر نے کار سے اتر کر اس کا تعاقب شروع کیا تو وہ اس سے تیس قدم آگے تھی۔ ناہموار فٹ پاتھ پر ڈولنگر کے قدموں کی چاپ سن کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ڈولنگر نے چلاتے ہوئے کہا۔ ''پولیس...... وہیں رک جاؤ۔''

ڈولنگر کے ہتھیار کا رخ زمین کی طرف تھا اور اس اندھیرے میں اس کے لیے بائیں ہاتھ سے نشانہ لینا ممکن نہیں تھا لیکن اگر وہ ایک بار پھر اپنے ریوالور کا رخ اس کی جانب کرتی تو پھر اسے بھی اپنے دفاع میں گولی چلانا پڑتی۔ اچانک ہی وہ گھومی اور اس نے پے در پے دو فائر کر دیے لیکن اندھیرے کی وجہ سے اس کا نشانہ خطا گیا۔

ڈولنگر کو شبہ ہوا کہ اب اس کے ریوالور کا میگزین خالی ہو گیا ہے لیکن اس کے باوجود وہ کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ ایک گھٹنے کے بل جھکا اور بے ڈھنگے پن سے ایک فائر کر دیا۔ گولی ڈورا کے سر پر سے گزرتی ہوئی ایک کھمبے سے جا ٹکرائی۔ فائر کی آوازیں سن کر مختلف سمتوں سے باوردی پولیس والے دوڑتے ہوئے آئے اور ڈورا کو گھیرے میں لے لیا۔

اس کارروائی کے مکمل ہونے کے بعد وہ اسپتال پہنچا تو اوبرن اپنے بستر پہ بیٹھا رات کا کھانا کھا رہا تھا۔ ''کھیل ختم ہو گیا لیفٹیننٹ۔'' ڈولنگر نے اعلان کیا۔ ''تم نے ٹھیک کہا تھا، راجر ولیم کی قمیص میں تین سوراخ تھے اور لاش اس کی کار کی ڈکی میں بند تھی۔''

''وہ کار کہاں کھڑی ہوئی تھی؟''

''اسمال وڈ کے ایک مکان کے عقبی صحن میں۔ وہ بھی ولیم کی ملکیت ہے اور ان دنوں اس میں کوئی کرائے دار نہیں ہے۔''

''انہوں نے لوسی کو بھی پکڑ لیا ہو گا؟''

''نہیں لوسی نہیں بلکہ ڈورا سیمنز۔''

اس کے بعد ڈولنگر نے اسے پوری کہانی سنائی اور بتایا کہ لوسی جس آدمی کے ساتھ ریستوران آتی تھی، وہ ولیم نہیں بلکہ اس کا بھائی تھا جب اسٹیشنری اسٹور بند ہو گیا تو اس نے بھی ریستوران آنا چھوڑ دیا اور دوسری ملازمت ڈھونڈنے میں لگ گئی۔ اس کے نہ آنے پر ریستوران والوں کو تشویش ہوئی اور وہ سمجھے کہ اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے۔ پھر اس کی اور ولیم کی تلاش شروع ہوئی۔ اس کے بعد کڑی سے کڑی ملتی چلی گئی اور اس کہانی کا اختتام لوسی کے بجائے ڈورا سیمنز پر ہوا۔

عدالت میں ڈورا نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ اس نے اپنی جان بچانے کے لیے ولیم پر گولی چلائی کیونکہ جب اسے معلوم ہوا کہ اس کی رقم غائب ہے تو وہ لوہے کی سلاخ سے اس کے سر پر ضرب لگانے کے لیے آگے بڑھ رہا تھا۔ تاہم گرینڈ جیوری نے اس بنا پر اس کا موقف مسترد کر دیا کہ گولیوں سے اس کی قمیص کے پیچھے سوراخ ہوئے تھے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو سامنے سے نہیں بلکہ عقب سے گولی ماری گئی تھی۔

اوبرن نے ایک طویل سانس لی اور سوچنے لگا کہ اگر ڈولنگر ریستوران والوں کی باتوں میں آ کر لوسی کی تلاش شروع نہ کرتا تو وہ کبھی ڈورا تک نہیں پہنچ پاتے۔ بعض اوقات غیر ضروری تجسس بھی کسی معاملے کی تہ تک پہنچنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

انگارے

چالیسویں قسط

طاہر جاوید مغل

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خود غرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں دردمند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کررہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیرداری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اثرورسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا مگر وہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

سطر سطر رنگ بدلتی... ایک لہو رنگ اور دل گداز داستان...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ڈنمارک سے پاکستان کسی کی تلاش میں آیا تھا مگر یہ تلاش شروع ہونے سے پہلے ہی ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس نے میری زندگی کو تہ و بالا کر دیا۔ میں نے سرِ راہ ایک زخمی کو اٹھا کر اسپتال پہنچایا۔ مقامی پولیس نے مددگار کے بجائے مجرم ٹھہرایا اور یہیں سے ناانصافی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے مجھے شکیل داراب اور لالہ نظام جیسے خطرناک لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ یہ لوگ ایک قبضہ گروپ کے سرغنہ تھے جو رہائشی کالونیاں بنانے کے لیے چھوٹے زمینداروں اور کاشت کاروں کو ان کی زمینوں سے محروم کر رہا تھا۔ میرے چچا حفیظ سے بھی زبردستی ان کی آبائی زمین ہتھیانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ چچا کا بیٹا ولید اس جبر کو برداشت نہ کر سکا اور شکیل داراب کے دستِ راست انسپکٹر قیصر چودھری کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ اس جرأت کی سزا اسے یہ ملی کہ ان کی حویلی کو اس کی ماں اور بہن فائزہ سمیت جلا کر راکھ کر دیا گیا اور وہ خود دہشت گرد قرار پا کر جیل پہنچ گیا۔ انسپکٹر قیصر اور لالہ نظام جیسے سفاک لوگ میرے تعاقب میں تھے، وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ میں MMA کا یورپی چیمپئن تھا، وسطی یورپ کے کئی بڑے بڑے گینگسٹر میرے ہاتھوں ذلت اٹھا چکے تھے۔ میں اپنی پچھلی زندگی سے بھاگ آیا تھا لیکن وطن پہنچتے ہی یہ زندگی پھر مجھے آواز دینے لگی۔ میں یہاں سے بیزار ہو کے واپس ڈنمارک جا رہا تھا کہ ایک انہونی ہوئی۔ وہ جادوئی حسن رکھنے والی لڑکی مجھے نظر آ گئی جس کی تلاش میں میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا نام تاجور تھا اور وہ اپنے گاؤں چاند گڑھی میں نہایت پریشان کن حالات کا شکار تھی۔ میں اس کے گاؤں جا پہنچا اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور کی حیثیت سے اس کے والد کے پاس ملازم ہو گیا۔ انیق بطور مددگار میرے ساتھ تھا۔ تاجور کا غنڈا صفت منگیتر اسحاق اپنے ہمنواؤں زمیندار عالمگیر اور پیر ولایت کے ساتھ مل کر تاجور اور اس کے والد دین محمد کے گرد گھیرا تنگ کر رہا تھا۔ مقامی مسجد کے امام مولوی فدا کی موت میں بھی اسی زمیندار کا ہاتھ تھا۔ مولوی جی کی بیٹی زینب ایک عجیب بیماری کا شکار تھی۔ وہ زمیندار عالمگیر کے گھر میں ٹھیک رہتی لیکن جب اسے وہاں سے لایا جاتا تو اس کی حالت غیر ہونے لگتی۔ اسی دوران میں ایک خطرناک ڈاکو سجاول نے گاؤں پر حملہ کیا۔ حملے میں عالمگیر کا چھوٹا بھائی مارا گیا۔ میں تاجور کو حملہ آوروں سے بچا کر ایک محفوظ جگہ لے گیا۔ ہم دونوں نے کچھ وقت گزارا۔ واپس آنے کے بعد میں نے بھیس بدل کر مولوی فدا سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عالمگیر وغیرہ نے زینب کو جان بوجھ کر بیمار کر رکھا ہے اور یوں مولوی صاحب کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی بچی کی جان بچانے کے لیے اسحاق کی حمایت کریں۔ مولوی صاحب کو قتل کر دیا گیا۔ ایک گھناؤنی درگاہ کے خاتمے کے بعد ہم گھروں کی جانب گامزن تھے کہ میں اور تاجور سجاول ڈاکو کے ڈیرے جا پہنچے۔ یہاں سجاول کی ماں (ماؤ جی نے) مجھے اپنا ہونے والا جوائی سمجھا۔ جس کی پوتی مہناز عرف مانی سے میری بات طے تھی۔ یوں سجاول سے ہماری جان بچ گئی۔ سجاول کے ساتھ میرا مقابلہ طے پا چکا تھا کہ میرا ذہن ماضی میں بھٹک گیا۔ جب میں ڈنمارک میں تھا تو ایک کمزور پاکستانی کو گورے اور انڈین غنڈوں سے بچاتے ہوئے خود ایک طوفان کی لپیٹ میں آ گیا۔ وہ غنڈے ٹیکساری گینگ کے لوگ تھے جس کا سرغنہ جان ڈیرک تھا۔ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے انہوں نے میری یونیورسٹی دوست ڈیزی کے ساتھ اجتماعی کھیل کھیلا پھر ڈیزی غائب ہو گئی۔ اس واقعے کے بعد میری زندگی میں ایک انقلاب آ گیا پھر میرا رجحان مارشل آرٹ کی طرف ہو گیا اور ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے MMA کی فائٹس میں تہلکہ مچاتا رہا اور دوسری طرف اسکائی ماسک کی اوٹ میں ٹیکساری گینگ کے غنڈوں سے برسرِ پیکار رہا۔ اسی مارشل آرٹ کی بدولت میں نے سجاول سے مقابلہ کیا اور سخت مقابلے کے بعد برابری کی بنیاد پر ہار مان کے سجاول کا دل جیت لیا۔ سجاول سے کہہ کر میں نے انیق کو بلوالیا۔ سجاول ایک حسین دوشیزہ سنبل کو نو بیاہتا دلہن کی طرح سجا سنوار کر ریان فردوس (وڈے صاحب) کی خدمت میں تحفے کے طور پر پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں، انیق اور جاناں ساتھ تھے۔ ہم ریان فردوس کے محل نما بنگلے پارا ہاؤس پہنچے۔ وڈا صاحب اپنے دو بیٹوں کے ہمراہ برونائی سے پاکستان شفٹ ہوا تھا۔ برونائی میں اس کی خاندانی دشمنی چل رہی تھی۔ سجاول کو پارا ہاؤس میں کلیدی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ پارا ہاؤس میں کوئی بڑا چکر چل رہا تھا۔ کھوج لگانے پر پتا چلا کہ بڑے صاحب کے دونوں بیٹوں میں زہریلا عنصر پایا جاتا ہے۔ زینب والا معاملہ بھی اسی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اسی وجہ سے زینب کو بھی اغوا کر لیا گیا۔ ابراہیم اور کمال احمد کے لیے جو لڑکیاں تیار کی گئی تھیں، وہ پارا ہاؤس پہنچ چکی تھیں۔ ایک تقریب میں دونوں لڑکیوں کی رونمائی کی گئی تو ان میں ایک زینب تھی۔ ابراہیم نے مجھ پر اور سجاول پر اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ ابراہیم نے بتایا کہ دونوں بھائیوں میں زہریلا پن موجود ہے اسی لیے ان کے لیے ایسی لڑکیاں ڈھونڈی گئی ہیں۔ میں نے ابراہیم کو آگاہ کیا کہ زینب پوری طرح محفوظ نہیں ہے اور شادی کی صورت میں اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ یہ سن کر ابراہیم پریشان ہو گیا۔ ادھر آقا جان جو پارا ہاؤس کا کرتا دھرتا تھا، دھماکے کو گونج اٹھے۔ میرے کہنے پر ابراہیم نے زینب کا خون ٹیسٹ کرایا تو حقیقت کھل کر سامنے آ گئی۔ اس تمام قتل و غارت میں آقا جان ملوث تھا مگر کوئی اس پر شک کرنے کو تیار نہ تھا۔ ثاقب کی موت کے بعد برونائی میں مخالفین نے بڑی کارروائی کر کے وڈے صاحب کے برادرِ نسبتی کو مار ڈالا تھا۔ بڑی بیگم صاحبہ کا رو رو کر برا حال تھا، ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے میں اور سجاول وڈے صاحب کے ساتھ برونائی جانے کے لیے تیار تھے۔ برونائی جانے سے پہلے میں ایک نظر تاجور کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک طویل فاصلہ طے کر کے میں تاجور کی ایک جھلک ہی دیکھ پایا تھا کہ گاؤں کے چند لڑکوں نے مجھے گھیر لیا۔ میرے سامنے وہ بچے تھے۔ اپنی ہار کے بعد ایک دلیر لڑکا میرے گلے کا ہار بن گیا اور میرا پیچھا کرتا ہوا پارا ہاؤس تک آ گیا۔ سیف عرف سیفی کی گتھی نکالنے کے لیے ہم اسے اپنے ساتھ برونائی لے آئے تھے۔ یہاں حالات بہت خراب تھے۔ ریان فردوس کا بیٹا رائے زل مخالف پارٹی بن چکا تھا۔ امریکن ایجنسی کے ساتھ مل کے پورے علاقے پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ فردوس بھیجی قسطینا کمانڈر اور جی دار آفیسر تھی۔ وہ ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے مجھے جان گئی تھی۔ میں کئی مہم میں اس کے ہمراہ رہا۔ ریان فردوس کی پہلی بیوی اور اس کے بیٹے کی شورشیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ مجھے شروع ہی سے آقا جان پر شک تھا۔ اور اس کی سرگرمیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ رائے زل اور امریکن ایجنسی کی قوت نے محل پر دھاوا بول دیا تھا۔ افراتفری اور قتل و غارت گری نے اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ اس حملے میں ریان فردوس اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ اب ریاست پر کلی طور پر رائے زل کا قبضہ ہو چکا تھا۔ ہم سب بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ آقا جان اور رائے زل کے کارندے ہماری تلاش میں تھے۔ ابراہیم اور زینب کا برا حال تھا۔ میری ذات ان کے لیے بہت بڑا سہارا تھی۔ کمال اس جنگ میں جان سے دھو بیٹھا تھا۔ ہم زیرِ زمین مقید تھے۔ مگر انتقام رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ جس لانچ میں ہم یہاں آئے تھے وہ ابھی تک باہر موجود تھی۔ آقا جان کے آدمیوں سے بچنے کے لیے اسے ٹھکانے لگانا ضروری تھا۔ بن مشہد اور تبارک زیرِ زمین بنکر سے باہر نکل گئے۔ مگر باہر سخت پہرا تھا...... تبارک پھسل کر ایک کھائی میں گر جاتا ہے۔ میں اور سیف اسے ڈھونڈنے جاتے ہیں مگر ایجنسی کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ بے تحاشا تشدد سہنے کے باوجود ہم قسطینا اور ابراہیم کا پتا نہیں بتاتے...... سیف کی حالت بری تھی۔ مجھے اس کو اپنے ہاتھ سے زہر دے کے اذیت کم کرنا پڑی۔ مگر میرا اپنا حال بہت بُرا تھا۔ امریکی لونگ نے تشدد کی انتہا کر دی تھی۔ جاماجی کے حالات روز بروز بدتر ہو رہے تھے۔ میں رائے زل کی قید سے رہائی پا چکا تھا۔ عوام کا سمندر میرے لیے بے چین تھا۔ وہ مجھے اپنا سربراہ مان چکے تھے۔ وہ آزادی کے لیے سر پر کفن باندھ چکے تھے۔ ہمارے قافلے کا رخ اب ڈی پیلس کی جانب تھا۔ پال کی مدد سے پوری ٹیم اور عوام کا سمندر ڈی پیلس کی جانب گامزن تھا۔ ہر طرف گولیاں شیلنگ اور دھواں دھار لڑائی تھی۔ بالآخر پسپی ہوئی عوام نے اپنے جوش، جذبے اور جنون سے کام لے کر رائے زل کے ساتھیوں کا خاتمہ کر دیا۔ اب تخت کے حق دار قسطینا اور ابراہیم تھے۔ وطن آنے کے بعد تاجور اپنے گھر چلی گئی اور میں داؤد بھاؤ کے پاس تھا لیکن وطن آتے ہی اس دشمن نے مجھے ڈھونڈ ہی لیا جس سے میں چھپتا پھر رہا تھا۔ ٹیکساری گینگ پاکستان آ چکا تھا ہر طرف قتل و غارت گری پھیلا رہے تھے...... ڈیتھ اسکواڈ کے کارندے میری تلاش میں کئی معصوم لوگوں کی جان لے چکے تھے۔ اب ان کا خاتمہ ضروری ہو گیا تھا میں اور انیق نے ان کے ٹھکانے کا کھوج لگایا اور بہت ہوشیاری سے ان کے جشن والے دن رنگ میں بھنگ ڈال دیا۔ ادھر جاماجی سے خورسنہ آ چکی تھی اور سجاول کو اپنا حتمی فیصلہ سنانا چاہتی تھی۔ ڈیتھ اسکواڈ کا خاتمہ بے حد ضروری تھا۔ میں نے انیق کے ساتھ مل کر ان کے ٹھکانے کو تباہ کر دیا اور خود بھی بمشکل یعنی جان بچا پایا۔ اس مقام پر زبردست بلاسٹ ہوا اور مجھے بھی مردہ سمجھ لیا گیا۔ ٹیکساری گینگ سے بچنے کا ایک ہی طریقہ سمجھ میں آیا کہ میں سب کی نظروں میں مردہ رہوں۔ اپنے چہرے پر سرجری کے ذریعے تبدیلیاں کروا کے میں اپنوں میں اجنبی بن گیا تھا۔ سیف کے گھر اور تاجور تک رسائی کے بعد میں مطمئن تھا مگر تاجور کی شادی داراب فیملی میں طے پا چکی تھی۔ تاجور کے بغیر میری زندگی ادھوری تھی، میں اسے ساتھ لے آیا تھا مگر اچانک انیق کی آمد ہوئی، اس نے سیف کے حوالے سے غلط باتیں کر کے تاجور کا دل متنفر کر دیا۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ میں انیق کی اس حرکت پر مشتعل تھا۔ وہ بیاہ کے داراب ہاؤس جا چکی تھی۔ بالآخر ہم نے انیق کی دشمنی کا کھوج لگایا۔ وہ ہاناوانی کے کالے علم کی زد میں تھا۔ ہاناوانی اپنے بیٹے کی موت کا بدلہ ہم سب سے لینا چاہتی تھی۔ اس نے سجاول کے ہاتھوں انیق کا قتل کروایا۔ سجاول نے اس کی انتقامی کارروائی سے بچنے کے لیے اپنی آنکھوں اور کانوں کو قربان کر دیا تھا۔ ہاناوانی کے دہشت ناک حملے جاری تھے۔ اب وہ پرندوں کے ذریعے ہمیں نیست و نابود کر دینا چاہتی تھی۔ مجھے اور رضوان کو پولیس پکڑ کر لے جاتی ہے۔ انسپکٹر قیصر جو ہمارا ازلی دشمن تھا۔ ایک بار پھر اس کے عتاب کا شکار ہو چکے تھے۔ اور اس کے بعد ڈیتھ اسکواڈ کا ہولناک شکنجہ ہمارے گرد تنگ ہو گیا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

یہ ایک پُرسکون بارڈر ایریا تھا۔ پہلوان حشمت بھی فخر کو لے کر یہاں پہنچ چکا تھا۔ فخر اور پہلوان حشمت میری بدلی ہوئی صورت کو دیکھ کر ازحد حیران ہوئے تھے۔ خاص طور سے پہلوان کو تو بالکل ہی یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اپنی اصل شکل صورت میں واپس آ چکا ہوں۔ وہ ہوائی چیزوں سے اتنا ڈرا ہوا تھا کہ ہر بات میں خوف اور اسرار کا پہلو ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''کچھ سمجھ میں نہیں آوت کہ کون اپنا ہے اور کون بیگانہ۔ کبھی کبھی تو اپنے اوپر بھی شک ہونے لگت ہے کہ میں بھی حشمت ہوں یا نہیں۔ عجب الجھن ہے۔

کرے کوئی بھرے کوئی
مجرم کوئی ڈرے کوئی
چور چالاکو ہوتا ہے
پلس ہتھے چڑھے کوئی ''

فخر نے کہا۔ ''آپ پہلوان حشمت ہی ہو جی۔ ورنہ اتنا اچھا شعر آپ کیسے بولتے۔ آپ کا ہر شعر اور محاورہ انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ بیٹھتا ہے۔''

''تم لوگوں کو مذاق سوجھت ہے۔ سچ کہتے ہیں کہ عقل بڑی کہ گائے۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ عقل ہو تو فکر ہی فکر

اور عقل نا ہیں تو موج ہی موج۔ میں حیران ہوں کہ اتنے سنگین حالات میں بھی تم لوگ ہنس بول رہے ہو؟''

''زندگی اسی کا نام ہے پہلوان جی...... یہ دکھوں اور پریشانیوں کے اندر سے اپنے راستے ڈھونڈتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''لیکن یہ صرف دکھوں اور پریشانیوں کا معاملہ نا ہیں ہے۔ یہاں کالا علم چل رہا ہے بلکہ شاید اس سے بھی آگے کی کوئی چیز ہے۔ میں تو اب یہی کہوت ہوں پیر شاناں والے، سے رابطہ کرنا چاہیے۔ وہ بد ارواح اور آسیب وغیرہ کے سلسلے میں بڑے کامل سمجھے جاوت ہیں۔ تم لوگوں کی عقل کام کیوں نا ہیں کر رہی۔ ایک بندریا قاتل جانور کا روپ دھار لیوت ہے۔ خوب صورت پالتو طوطے انسانوں پر ٹوٹ پڑت ہیں۔ چمگادڑیں ایک بارونق علاقے میں حملہ کرت ہیں اور لوگوں کو جان کے لالے پڑ جاوت ہیں۔'' پہلوان کی تقریر ایک بار شروع ہوئی تو پھر لمبی ہوتی چلی گئی۔

درحقیقت اس ساری صورتِ حال کو لوگ دو مختلف طریقوں سے دیکھ رہے تھے۔ کچھ لوگ تو اسے سراسر جادو ٹونے اور بھوت پریت سے جوڑ رہے تھے۔ ان میں پہلوان حشمت اور فیض محمد جیسے بہت سے لوگ شامل تھے۔ سجاول کے قریباً تمام ساتھی اسے ایک آسیبی عمل ہی سمجھ رہے تھے اور خوف کے عالم میں منظر سے غائب نظر آتے تھے۔ دوسرے وہ لوگ تھے جو اسے سراسر اہمیت ہی نہیں دے رہے تھے۔ وہ اس سارے معاملے کو نارمل گردان رہے تھے۔ ان میں زیادہ تر پڑھے لکھے لوگ تھے۔ میڈیا بھی اس ساری صورتِ حال میں ''لاجک'' اور وجہ ڈھونڈ رہا تھا۔

ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے فارم ہاؤس کا ایک ملازم کہیں سے انگلش کا تازہ اخبار ڈھونڈ کر لایا تھا (انگلش کا اخبار قسطینا کے لیے منگوایا گیا تھا) اس اخبار میں ایک خبر دارج داراب کے حوالے سے بھی تھی۔ اخباری نمائندے نے دارج سے اس غیر معمولی واقعے کے بارے میں پوچھا تھا جس میں چمگادڑوں نے اس کی قیام گاہ پر حملہ کیا تھا اور کھڑکیوں وغیرہ کو شدید نقصان پہنچانے کے علاوہ ایک پالتو کتے کو بھی ہلاک کر دیا تھا۔

اس خبر کے ساتھ دارج کی تصویر بھی شائع ہوئی تھی جس میں وہ ٹانگوں پر کمبل رکھے وہیل چیئر پر بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے جواب میں سخت برہمی کا اظہار کیا تھا اور کہا تھا...... یہ سب کیا بکواس ہے۔ جس کے منہ میں جو آتا ہے، وہ بول رہا ہے۔ یہ اکیسویں صدی ہے۔ قبل از تاریخ کا زمانہ نہیں ہے۔ اس سائنسی دور میں ایسی بے سروپا باتیں کر[نے] [اور] سننے والے پرلے درجے کے احمق ہی ہو سکتے [ہیں۔] صرف ایک ناخوشگوار واقعہ تھا اور معمول سے ہٹ کر [ہونے کی وجہ سے] لیے اسے اتنی تشہیر مل گئی ہے۔ ایسے واقعات اس سے [پہلے] بھی ہو چکے ہیں۔ ابھی پچھلے برس خوشاب کے علاقے [میں] کسی جگہ اسی طرح چمگادڑوں نے حملہ کیا تھا اور کچھ لو[گوں کو] شدید زخمی کر دیا تھا۔ اس قسم کے واقعات ہوتے [رہتے] ہیں۔ بعض اوقات پرندے اور جانور کسی خاص کیفیت [میں] ہوتے ہیں اور مختلف ردِعمل ظاہر کرتے ہیں۔ میرے [خیال] میں تو وہ مادہ بندر والا واقعہ بھی اسی قسم کا ہے۔

اخباری نمائندے نے جب دارج سے ہاناوانی [کی] پُراسرار شخصیت اور اس کی یہاں موجودگی کے بارے [میں] پوچھا تو وہ پھر غصے میں آیا۔ اس نے کہا۔ ''یہ بالکل [بے] سروپا باتیں ہیں۔ کم از کم میں تو ان کو نہیں مان سکتا۔ میڈ[یا کو] بھی اس سلسلے میں بہت مرچ مسالا نہیں لگانا چاہیے۔''

نمائندے نے کہا۔ ''مگر جناب! آپ کے [کزن] کزن شکیل داراب صاحب اس سلسلے میں بیان دے [چکے] ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ کسی حد تک ہاناوانی کو جانتے ہیں۔ وہ واقعی ایک مختلف عورت ہے اور اس کے پاس کچھ [خاص] صلاحیتیں ہیں۔''

اس موقع پر دارج نے نمائندے کو شٹ اَپ [کال] دے کر خاموش کرا دیا...... اور کہا کہ وہ ان باتوں کو اہ[میت] نہیں دیتا اور نہ اس سلسلے میں کوئی بحث کرنا چاہتا ہے۔

اسی صفحے پر نیچے ایک کالم کے باکس میں ایک [اور] چھوٹی سی خبر موجود تھی۔ جانوروں کے ایک ماہر ڈاکٹر نے [کہا] تھا کہ دارج داراب صاحب کی قیام گاہ سے جو دو [مردہ] چمگادڑیں ملی ہیں، ان کا تفصیلی معائنہ کیا گیا ہے۔ بظاہر [ان] میں دیوانے پن کی کوئی علامت نظر نہیں آتی۔ مجموعی طور [پر] بھی وہ بالکل نارمل ہیں لیکن یہ بات معمول سے ہٹ کر ہے کہ انہوں نے ایک جھنڈ کی صورت میں ایک رہائشی علاقے میں کسی پر حملہ کیا۔

قسطینا بھی یہ خبر تفصیل سے پڑھ چکی تھی، وہ بولی۔ ''شاہ زائب! تمہارے پاس تاجور کا فون نمبر تو یقیناً ہوگا۔ [تم] کسی بھی طرح اس سے رابطہ کرو اور اسے سمجھاؤ کہ اس کے لیے کتنا بڑا خطرہ موجود ہے۔''

''میرے پاس اس کا فون نمبر نہیں قسطینا...... اور اگر ہوتا بھی تو شاید میں اس کو کال نہ کرتا۔''

''کیا کالج کے لڑکوں جیسی باتیں کر رہے ہو شاہ

زائب! تم سمجھتے کیوں نہیں۔ تاجور اور اس کا خاوند اپنی بے پروائی کی وجہ سے بہت نقصان اٹھا سکتے ہیں...... ان کو تو اب کچھ دن تک گھر میں بالکل بند رہنا چاہیے اور اردگرد سیکیورٹی ہونی چاہیے۔ اگر تاجور کا فون نمبر نہیں ہے تو اس کے خاوند سے بات کروا یا پھر مجھے بتاؤ، میں بات کرتی ہوں اس سے۔ وہ تو انگلش سمجھ لیتا ہوگا۔''

''وہ سمجھ لیتا ہے انگلش بلکہ اب تو تاجور کو بھی انگلش سکھائی جا رہی ہے مگر بات پھر وہیں پر آجاتی ہے قسطینا۔ ہمارا مشورہ کوئی نہیں سنے گا اور وہ خبیث دارج تو بالکل نہیں...... ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے ایک اور بات کا پتا چلا ہے۔''

قسطینا سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے اسے بتایا۔ ''داؤد بھاؤ کا فون آیا تھا، اس نے اطلاع دی ہے کہ چند دن پہلے دارج کی ریڑھ کی ہڈی کا ایک چھوٹا سا آپریشن ہو چکا ہے...... اور اب وہ واپس اسلام آباد جا رہا ہے اور خاص بات یہ ہے کہ موٹروے کے ذریعے جا رہا ہے۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟'' قسطینا نے حیران ہو کر کہا۔

''تفصیل داؤد بھاؤ کو بھی معلوم نہیں۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ ساری حقیقت معلوم کرے۔''

''تو پوچھو ناں مسٹر داؤد کو فون کر کے۔'' قسطینا نے بے چین لہجے میں کہا۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ دن کے دو بج چکے تھے۔ اس وقت داؤد بھاؤ کو فون کیا جا سکتا تھا۔ میں نے اس کا خاص نمبر ملایا۔ فوراً ہی کال ریسیو ہو گئی اور بھاؤ کی پاٹ دار آواز آئی۔ ''ہیلو شاہی! میں تمہیں فون کرنے ہی والا تھا۔ دارج کل صبح آٹھ بجے لاہور سے روانہ ہوگا۔ تین چار گاڑیوں کا قافلہ ہوگا۔ سیکیورٹی کے لوگ بھی ہوں گے۔''

''لیکن اس کی جان کیوں شکنجے میں آئی ہوئی ہے۔ کیا ضرورت پڑی ہے اس کو بائی روڈ جانے کی؟''

''وہ موٹروے پر سفر کرتے ہوئے کلر کہار کے آس پاس کہیں رکنا چاہتا ہے۔ وہاں کوئی معدنی چشمہ ہے جس کا پانی سردیوں میں بھی گرم ہی ہوتا ہے۔ فالج کے مریض وہاں جاتے ہیں اور اپنے پاؤں وغیرہ ڈبو کر وہاں بیٹھتے ہیں......''

''یہ سب کچھ آپ کو کیسے پتا چلا ہے؟'' میں نے بھاؤ سے پوچھا۔

''وہی تمہارا پرانا یار سعید کھوکھر...... دارج کا میڈیکل اٹینڈنٹ۔ وہ بھی ساتھ ہی ہوگا۔''

اب ساری بات میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''داؤد بھاؤ! یہ کھوتے کا بچہ دارج بڑی غلطی کر رہا ہے۔ قسطینا اور فارس کا خیال بھی یہی ہے کہ اس وقت اسے اور تاجور کو شدید خطرہ ہے۔ ان لوگوں کو چند دن کے لیے بالکل روپوش ہونا چاہیے۔''

''اب میں اس سلسلے میں کیا کہوں۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے خود بھی اس سچویشن کی سمجھ نہیں آ رہی۔ اس ہپناٹزم، مسمریزم اور ٹیلی پیتھی پر زیادہ یقین نہیں ہے مجھے۔ لیکن جو کچھ تم لوگ کہہ رہے ہو اس کو بھی ایک دم جھٹلایا تو نہیں جا سکتا۔''

میں نے بھاؤ سے سجاول کا حال دریافت کیا اور کچھ مزید ڈسکشن کے بعد کال ختم کر دی۔ یہ ساری گفتگو قسطینا کی سمجھ میں نہیں آئی تھی وہ بس خاموش بیٹھی اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہی تھی۔ میں نے اسے بھاؤ سے اپنی گفتگو کے بارے میں بتایا تو وہ زیادہ بے چین نظر آنے لگی۔ کچھ دیر گہری سوچ میں گم رہنے کے بعد بولی۔ ''شاہ زائب! یہ دارج اپنے لیے اور تاجور کے لیے بہت بڑا خطرہ مول لے رہا ہے۔ ہمیں اس کو روکنا چاہیے۔''

''ہم کیسے روک سکتے ہیں۔ یہ تو پھر سیدھا سیدھا ٹکراؤ ہوگا۔''

''تو پھر ہمیں اتنا تو کرنا چاہیے کہ تاجور کو تنہا نہ چھوڑیں۔''

''قسطینا! آپ کا مطلب ہے کہ ہم لاہور سے اسلام آباد تک ان لوگوں کے ساتھ رہیں؟''

''بالکل...... میں یہی کہنا چاہ رہی ہوں بلکہ ہمیں اسلام آباد پہنچ کر بھی ان کے آس پاس ہی رہنا چاہیے۔ ہاناوانی کی خصلت کو جتنا میں جانتی ہوں شاید کوئی اور نہ جانتا ہو۔ وہ اپنے ٹارگٹ کا پیچھا قبر تک کرتی ہے...... اور اسے قبر تک پہنچانے میں تاخیر کو گناہ سمجھتی ہے۔ وہ بہت جلد دوبارہ وار کرے گی۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ وہ تاجور کو ٹارگٹ بنا چکی ہے؟''

''اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں شاہ زائب!...... وہ جانتی ہے کہ تاجور کہاں ہے...... وہ اس کے ہر پل کی خبر رکھ رہی ہوگی اور مجھے یقین ہے کہ تمہارے زندہ رہنے کی خبر بھی اس تک ضرور پہنچ چکی ہوگی۔ وہ تمہارا کھوج لگانے کی بھی پوری کوشش کر رہی ہوگی۔''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''وہ میرا کھوج لگا سکے یا نہیں، لیکن میں اس کا کھوج ضرور لگا لوں گا۔''

☆☆☆

یہ ایک چمکیلی صبح تھی۔ نو بجے کا وقت تھا۔ ہم لاہور سے اسلام آباد جانے والی موٹروے M2 پر سفر کر رہے تھے۔ یہ داؤد بھاؤ کی ہی فراہم کردہ ایک اسٹیشن وین تھی۔ اس میں میرے اور فخر کے علاوہ قسطینا، فارس جان اور قسطینا کے دو عدد جنگجو گارڈز شامل تھے۔ ایک لینڈ کروزر جیپ ہمارے پیچھے آ رہی تھی۔ اس میں بھی قسطینا کے گارڈز تھے۔ ناوان اور کوتاہ قد بنارس بھی اس میں سوار تھے۔ رضوان کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ ہمارے ساتھ سفر کر سکتا، لہٰذا اسے وہیں راوی فارم میں دو ڈاکٹرز کی زیرِ نگرانی رہنے دیا گیا تھا۔ پہلوان جی اس کے پاس تھے۔

دارج داراب اور اس کا پروٹوکول قافلہ ہم سے آگے تھا۔ درمیانی فاصلہ کم و بیش سو میٹر کا تھا۔ اس خیال سے کہ قافلے والوں کو شک نہ گزرے، کبھی ہم اپنی لگژری اسٹیشن وین کو پیچھے لے جاتے تھے اور لینڈ کروزر آگے آ جاتی تھی، کبھی لینڈ کروزر پیچھے چلی جاتی تھی۔

کلر کہار انٹرچینج سے ہم نے موٹروے چھوڑ دی۔ چند میل کا مزید فاصلہ طے کر کے گاڑیاں شمال کی جانب ایک بغلی سڑک پر مڑ گئیں۔ اب تعاقب جاری رکھنا ایک مشکل کام تھا۔ دارج کے قافلے کی پچھلی گاڑی کے سواروں کو ہماری اسٹیشن وین یا جیپ پر شک ہو سکتا تھا۔ ہم نے اپنی اسٹیشن وین کی رفتار بہت دھیمی کر دی اور فاصلہ بڑھا دیا۔ ہمیں یہ خطرہ ہرگز نہیں تھا کہ دارج اور اس کے قافلے کی گاڑیاں ہماری نظروں سے اوجھل ہو جائیں گی۔ وہ اوجھل ہو بھی جاتیں تو ہمیں معلوم تھا کہ ان کو کس رخ پر جانا ہے۔ معدنی چشمے والے مقام کا پتا ہمیں تھا اور اس کی لوکیشن نقشے پر بھی ہم نے ٹریس کر رکھی تھی۔

مگر چشمے تک پہنچنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ جو کچھ ہوا، وہ اتنا اچانک تھا کہ کچھ دیر کے لیے ہم سب سکتہ زدہ رہ گئے۔

''اوہ مائی گاڈ...... اوہ مائی گاڈ۔'' قسطینا سراسیمگی کے عالم میں پکاری۔ ''میں نے کہا تھا ناں...... کہا تھا ناں میں نے۔''

فخر نے بھی سرسراتی آواز میں کہا۔ ''یقین نہیں آ رہا۔ شاکنگ، ویری شاکنگ۔''

میں حیرت زدہ نظروں سے نیلگوں آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک ایک طرف سے پرندوں کا ایک جھنڈ نمودار ہوا تھا۔ یہ وہی درجنوں طوطے تھے جن کی ... خیزی ہم اس سے پہلے ''کالا شاہ کاکو'' کے قریب دیکھ ... تھے۔ وہ کسی گائیڈڈ میزائل کی طرح اس بغیر چھت کی ... پر جھپٹے جو دارج کے قافلے میں سب سے آگے جا رہی ... گاڑی میں دارج کے نصف درجن مسلح گارڈز مو... تھے۔ پرندوں کا حملہ اتنا اچانک تھا کہ گاڑی ڈرائیور ... کنٹرول میں نہیں رہ سکی۔ وہ بری طرح دائیں بائیں ... اور پھر ایک تنگ پل کے جنگلے سے جا ٹکرائی۔ پیچھے آنے ... جیپ بھی سنبھلتے سنبھلتے خوفناک آواز سے ڈبل کیبن پک ... سے ٹکرا گئی۔

اس کے عقب میں وہ جہازی سائز کی لگژری جیپ ... جس میں دارج اپنی وہیل چیئر سمیت سوار ہو جاتا تھا۔ جیپ کے ڈرائیور نے خود کو تصادم سے بچایا اور رکنے کے بجائے گاڑی کو تیزی سے پل پر چڑھا دیا۔ وہ سیدھا نکلتا چلا گیا۔ ایک اور پروٹوکول گاڑی اس کے عقب میں تھی۔ وہ بھی سیدھی نکلی۔ ہم بھی اُن کے پیچھے گئے۔ پرندوں کا جھنڈ پوری وحشت سے ان کا پیچھا کر رہا تھا۔ یہ سب کچھ اتنا ناگہانی اور تحیر خیز تھا کہ نگاہوں پر بھروسا نہیں ہو پا رہا تھا۔ پھر ہم نے دیکھا کہ دارج کی جیپ کے عقب میں چلنے والی حفاظتی گاڑی میں سے ایک آٹومیٹک رائفل باہر جھانکنے لگی۔ یہ رائفل گاڑی کی کھڑکی کھول کر باہر نکالی گئی تھی۔ مقصد یقیناً یہی تھا کہ اوپر منڈلاتے ہوئے مشتعل پرندوں کو نشانہ بنایا جائے۔

''یہ غلطی کر رہے ہیں۔'' قسطینا نے ہراساں لہجے میں کہا۔ ''ان کو کھڑکی نہیں کھولنی چاہیے۔''

ابھی قسطینا کا فقرہ بمشکل مکمل ہی ہوا تھا کہ آٹومیٹک رائفل کی خوفناک تڑتڑ گونجی۔ چلتی گاڑی میں سے پرندوں کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے شہد کی مکھیوں پر فائرنگ کی جائے۔ ممکن ہے کہ ایک دو پرندے نشانہ بھی بنے ہوں لیکن مجموعی طور پر کوئی فرق نہیں پڑا۔ جھنڈ اسی رفتار سے دارج والی جیپ کا پیچھا کرتا رہا لیکن فائرنگ کا ایک نقصان ہوا اور یہ وہی نقصان تھا جس کا اندیشہ ابھی قسطینا نے ظاہر کیا تھا۔ تین چار پرندے دفعتاً کھلی کھڑکی کے اندر گھس گئے۔ سیکیورٹی کی یہ گاڑی بُری طرح لہرانے لگی۔

''یہ بڑا گڑبڑ ہو گیا ہے۔'' فارس جان بڑبڑایا۔

اس وقت گاڑیوں کی رفتار اسّی نوّے کلومیٹر فی گھنٹا سے کم نہیں تھی اور یہ کم چوڑائی والی ایک ذیلی سڑک تھی۔

یکایک لہراتی ہوئی گاڑی بالکل آؤٹ آف کنٹرول ہوئی اور گھوم کر ایک تناور درخت سے جا ٹکرائی۔ یہ بڑا زوردار تصادم تھا۔ گاڑی نے دو تین پلٹیاں کھائیں اور پھر دھماکے سے آگ پکڑ لی۔ میں نے دارج کے دو باوردی گارڈز کو دیکھا وہ شعلوں میں لپٹے، خودرو جھاڑیوں میں گرے تھے۔ گاڑی کا ایک پہیا گاڑی سے جدا ہو کر برق رفتاری سے لمبی گھاس میں اوجھل ہو رہا تھا۔

ہماری وین فخر چلا رہا تھا۔ اس کا پاؤں جیسے بے ساختہ ایکسلیریٹر سے اٹھ گیا۔ ''نہیں فخر، گاڑی نہیں روکنی۔'' میں نے پکار کر کہا۔

اس نے پھر گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ دارج والی جیپ حتی الامکان رفتار سے اس شکستہ سڑک پر اُڑی جا رہی تھی اور طوطوں کا جھنڈ ان کے تعاقب میں تھا۔ وہ دیوانہ وار جیپ سے ٹکرا رہے تھے، پیچھے ہٹ رہے تھے پھر ٹکرا رہے تھے۔ جیپ کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ ڈرائیور بدحواس ہو چکا ہے اور اب وہ بھی گاڑی کو کہیں دے مارے گا اور یہی وہ گاڑی تھی جس میں دارج اور اس کی دبنگ والدہ کے علاوہ تاجور بھی سوار تھی۔ یہ پرندے اسی کو نشانہ بنانا چاہ رہے تھے۔ مجھے لگا کہ میری پیشانی پر پسینا آ گیا ہے۔ ایسی صورتِ حال سے شاید میرے کسی ہم سفر کو واسطہ نہیں پڑا تھا۔ ان پرندوں پر گولیوں کی بوچھاڑ بھی کر دی جاتی تو کوئی خاص فائدہ ہونے والا نہیں تھا...... الٹا نقصان یہ ہو سکتا تھا کہ جیپ کا ٹائر برسٹ ہو جاتا یا اس کے سواروں میں سے کسی کو نقصان پہنچ جاتا۔ کچھ دیر لہرانے کے بعد دارج کی جیپ اب کچھ سنبھلی ہوئی نظر آئی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ پرندوں کی تعداد چند دن پہلے پیش آنے والے واقعے سے کافی زیادہ ہے۔

فخر نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ ڈرائیور نے اب خود کو سنبھال لیا ہے۔''

''لیکن اس طرح کہاں تک جائیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ پرندے شہد کی مکھیوں سے زیادہ خطرناک لگ رہے ہیں۔''

قسطینا نے دعائیہ انداز میں کہا۔ ''اللہ کرے یہ لوگ کھڑکی کھولنے کی غلطی نہ کریں۔ ورنہ یہ نوچ کھائیں گے ان کو۔''

دارج والی جیپ اب ایک اور سڑک پر مڑ گئی تھی۔ یہ بالکل ویران جگہ تھی۔ چھوٹے چھوٹے ٹیلے بھی نظر آ رہے تھے۔ شکستہ سڑک کی وجہ سے گاڑیاں بُری طرح اچھل رہی تھیں۔ ہماری دوسری گاڑی جو ایک لینڈ کروزر تھی اب عقب میں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ناوان اور بنارس بھی اس میں سوار تھے۔ پتا نہیں وہ کیوں پیچھے رہ گئی تھی۔

ہم اب پل سے سات آٹھ کلومیٹر آگے آ چکے تھے لیکن جنونی پرندے مسلسل تعاقب میں تھے۔ ویران شکستہ سڑک کے کنارے نانک چندی اینٹوں کی ایک پرانی عمارت نظر آئی۔ اس کے احاطے میں ایک ٹوٹا پھوٹا مندر بھی دکھائی دے رہا تھا۔ دارج کے ڈرائیور نے شاید کسی کی ہدایت پر ہی گاڑی عمارت کے پھاٹک سے ٹکرائی اور اسے توڑتا ہوا اندر گھس گیا۔ ہم بھی اس کے پیچھے ہی گئے۔ عمارت کا احاطہ وسیع تھا۔ ڈرائیور جیپ کو سیدھا ڈیوڑھی سے گزار کر اندرونی حصے کی طرف لے گیا اور برآمدے کے ایک ستون سے ٹکراتا ہوا کسی کمرے کے دروازے کے سامنے رک گیا۔

یہ سب کچھ یقیناً پریشانی اور بدحواسی کے عالم میں ہی ہوا تھا۔ یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ ان خون آشام پرندوں سے کیسے چھٹکارا پایا جائے۔ غالباً ان لوگوں کا خیال تھا کہ یہاں کسی بند کمرے میں گھسنے کا موقع مل جائے گا یا اور کسی طرح کی مدد میسر آ جائے گی۔

پھاٹک سے ٹکرانے کے بعد کوئی مسئلہ ہوا تھا اور جیپ کے بونٹ کی طرف سے ہلکا دھواں اٹھنا شروع ہو گیا تھا۔ پرندے بدستور جیپ پر جھپٹ رہے تھے۔ جیپ کے شیشے ''ٹنٹڈ'' تھے لہٰذا اندر کے حالات کا کچھ علم نہیں تھا، نہ ہی اندر کی آوازیں باہر سنائی دے رہی تھیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ پرندے ابھی تک ہماری طرف متوجہ نہیں ہوئے تھے۔ ہم ان کے لیے جیسے یہاں موجود ہی نہیں تھے۔

''دھواں بڑھتا جا رہا ہے۔'' فخر نے کہا۔

''آگ بھی لگ سکتی ہے۔'' قسطینا نے پریشان لہجے میں تائید کی۔

میرے اندر تہلکہ سا مچا ہوا تھا۔ گاڑی کے اندر وہ ہستی تھی جو میری رگوں میں خون کی طرح دوڑتی تھی اور دل میں دھڑکن کی طرح بستی تھی۔ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو؟ باہر خون آشام پرندے تھے جو دارج اور تاجور وغیرہ کو باہر نہیں آنے دے رہے تھے۔ اندر آگ کا خطرہ تھا۔

دھواں اور بڑھ گیا تھا۔ بونٹ تھوڑا اوپر اٹھ چکا تھا اور اس میں سے سیاہ مرغولے نکل رہے تھے۔ ''ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔'' میں نے نشست کے نیچے سے ٹرپل ٹو رائفل

نکالتے ہوئے کہا۔
''یہ بہت خطرناک ہے۔'' قسطینا چلّا اُٹھی اور اس نے میرا بازو مضبوطی سے تھام لیا۔
خوشنما طوطے عفریتوں کا روپ دھار چکے تھے۔ وہ نہ صرف جیپ پر جھپٹ رہے تھے بلکہ باریک تیز آوازیں بھی نکال رہے تھے۔ میں نے ان چھوٹے طوطوں کی دلکش آواز کئی بار سُنی ہوئی تھی لیکن اس وقت ان آوازوں میں دلکشی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ یہ آوازیں بہت بدلی ہوئی تھیں۔ ان میں ایک طرح کا جارحانہ پن تھا۔ لگتا تھا کہ یہ ان کی آوازیں ہی نہیں ہیں۔
''میرا خیال ہے کہ پرندے دھوئیں سے گھبرا رہے ہیں۔'' فخر نے ونڈ اسکرین سے باہر بغور دیکھتے ہوئے کہا۔
وہ درست کہہ رہا تھا۔ تیزی سے نکلنے اور پھیلنے والے گاڑھے دھوئیں نے پرندوں کو ان کے ٹارگٹ سے دور ہٹا دیا تھا مگر وہ چکر اسی عمارت کے اردگرد رہے تھے۔ ''یہ ایک اچھا موقع ہے۔'' میں نے کہا اور تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔
قسطینا بھی کہاں رکنے والی تھی۔ وہ تیزی سے میرے پیچھے آئی۔ اس کے ہاتھ میں مشین پسٹل تھا۔ فارس جان نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ ہم دارج داراب کی جیپ کی طرف لپکے۔ گاڑھے سیاہ دھوئیں سے بچنے کے لیے ہم نے اپنے سانس سینوں میں روک لیے تھے۔ میں نے جیپ کے اگلے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ وہ کھل گیا۔ مجھے اندرونی روشنی میں سب سے پہل دارج کی دہشت زدہ شکل نظر آئی۔ وہ اپنی وہیل چیئر پر تھا۔ یہی وہ شخص تھا جس نے صرف ایک دن قبل خونی پرندوں اور چمگادڑوں سے متعلق ساری اطلاعات کو لغو اور بکواس قرار دیا تھا اور اس حوالے سے کسی بھی طرح کے اسرار کو رد کیا تھا۔ آج اس کے چہرے پر حیرت کی یلغار تھی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے تاجور کی ہراساں صورت نظر آئی۔ وہ میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔
''باہر نکلو...... جلدی کرو۔'' یہ دارج کی دبنگ والدہ کی آواز تھی جو ایک درمیانی نشست سے بولی تھی پھر وہ بے طرح کھانسنے لگی۔ دروازہ کھلنے سے دھواں گاڑی میں داخل ہونا شروع ہو گیا تھا۔ جیپ کے دروازے کے ساتھ ہی ایک آہنی سلائڈ کا انتظام کیا گیا تھا۔ دارج کی وہیل چیئر اس پر رینگ کر باہر آگئی۔ دارج کی خوف زدہ نظریں اوپر اٹھی ہوئی تھیں اور وہ چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ یقیناً پرندوں کی دہشت اس پر بھی پوری طرح سوار ہو چکی تھی۔ تاجور بھی بُری طرح کھانستی ہوئی باہر آئی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے باہر نکالا۔ قسطینا نے اسے اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے لیا۔
سعید کھوکھر نے چلّا کر تنومند گارڈ آدم خان سے کہا۔ ''سر کو کرسی پر سے اٹھا لو۔''
اس نے درست مشورہ دیا تھا۔ آگے سیڑھیاں تھیں۔ ہم دارج کو تیزی سے اندر نہیں لے جا سکتے تھے۔ گرانڈیل آدم خان نے کوشش کر کے فربہ اندام دارج کو اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا۔ قسطینا نے تاجور کو پوری طرح اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ وہ اسے لے کر اندر کی طرف لپکی۔ پرندے جیسے تڑپ تڑپ کر اس کی طرف آرہے تھے۔ لیکن دھوئیں نے انہیں تاجور تک پہنچنے سے روک لیا تھا۔ میں نے ٹرپل ٹو رائفل کو بیرل کی طرف سے پکڑ کر چاروں طرف گھمایا اور پرندوں کو قریب آنے سے روکا۔ ہم سب تیزی سے اندر داخل ہوئے لیکن یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ اس بڑے ہال کمرے کی چھت سرے سے موجود ہی نہیں تھی۔ اوپر نیلا آسمان نظر آرہا تھا۔
''وہ دروازہ ہے۔'' میں نے ایک طرف اشارہ کیا۔
ہم اس دوسرے دروازے کی طرف لپکے۔ میں نے ٹانگ رسید کر کے اسے کھولا۔ آگے تاریک سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ فوری طور پر ہمارے پیشِ نظر اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ کسی بند کمرے میں گھس جائیں۔ ہم سب بُری طرح کھانستے ہوئے سیڑھیوں پر اترے اور اپنے عقب میں دروازہ دھماکے سے بند کر دیا۔ ایک طوطا اندر گھسنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ نامانوس آواز کے ساتھ تاجور اور قسطینا پر جھپٹا۔ فارس جان نے اسے خالی ہاتھوں سے دبوچ لیا۔ اس چھوٹے سے پرندے میں اضافی طاقت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بُری طرح مچل رہا تھا۔ اس نے فارس کی انگلیوں پر شدت سے کاٹا۔ نتیجے میں فارس نے اسے گھما کر دیوار سے دے مارا۔ وہ بے سدھ ہو کر نیچے گر گیا۔ تین مزید زینے اتر کر ہم ایک تاریک ہال کمرے میں پہنچے۔ ہمارے سیل فونز کی ٹارچیں روشن ہو گئیں۔ اس جگہ کا منظر چونکا دینے والا تھا۔ یہاں پتھر کی تین چار بوسیدہ مورتیاں موجود تھیں۔ ان میں سے دو مورتیوں پر جیسے برش اور رنگ کی مدد سے بڑے بڑے سیاہ کراس لگا دیے گئے تھے۔ ان مورتیوں کے ہونٹوں پر ٹیپ چڑھا کر انہیں اچھی طرح بند کر دیا گیا تھا۔ ایک دیوار پر ہندی میں کچھ لکھا گیا تھا اور اس تحریر پر بھی بڑے بڑے سیاہ کراس لگائے گئے تھے۔ چھت کی ایک بہت بڑی گھنٹی اس ہال کمرے کی چھت سے جھول رہی تھی۔ یہاں دو بغلی دروازے بھی نظر آرہے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ اس تہ خانے میں اور کمرے بھی ہیں۔ دارج کی دبنگ والدہ کا بلڈ پریشر بھی ایک دم شدت اختیار کر گیا تھا۔ وہ کھینچ کھینچ کر سانس لے رہی تھی۔ میڈیکل اٹینڈنٹ سعید کھوکھر اسے فوراً ساتھ والے کمرے میں لے گیا اور ایک بستر پر لٹا دیا۔ وہاں سے مٹی کے تیل سے روشن ہونے والے دو لیمپ بھی مل گئے۔ اس نے ایک لیمپ باہر اور دوسرا کمرے میں روشن کر دیا۔
ایک چھوٹے کمرے میں پرانی طرز کا کچھ فرنیچر بھی دکھائی دیا۔ یہ اتنا صاف نہیں تھا لیکن زیادہ گرد آلود بھی نہیں تھا۔ اس فرنیچر اور دیگر چیزوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ کبھی کبھی یہاں کوئی آتا رہتا ہے...... یا پھر یہ تھا کہ تہ خانہ چاروں طرف سے بند ہونے کی وجہ سے گرد و غبار یہاں کم ہی پہنچتا تھا۔ گرانڈیل آدم خان نے دارج داراب کو ایک قدیم طرز کے صوفے پر بٹھا دیا اور اسے ایک بڑے تکیے کے ساتھ سہارا بھی دیا۔
دارج اب بھی بُری طرح کھانستا جا رہا تھا۔ دھواں شاید اس کے پھیپھڑوں میں بھر گیا تھا۔ تاجور کی اپنی آنکھوں سے بھی پانی بہہ رہا تھا۔ تاہم وہ دارج کے قریب بیٹھ گئی اور اس کا گریبان کھول کر اس کے سینے پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ دارج کی سانس میں قدرے بہتری آئی لیکن اس کی جھلاہٹ بدستور موجود تھی۔ اس نے تاجور کا ہاتھ جھٹک دیا اور پانی مانگا۔
آدم خان اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ یہاں پانی کہاں ہو سکتا تھا۔ تاجور نے جلدی سے اپنے شولڈر بیگ میں ہاتھ ڈالا اور پانی کی چھوٹی بوتل اور ڈسپوزیبل گلاس نکال لیا۔ پانی کے چند گھونٹ لے کر دارج کی حالت قدرے بہتر ہوئی۔ تہ خانے کے بیرونی دروازے کی طرف سے ابھی تک پرندوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ وہ جنونی انداز میں دروازے سے ٹکرا رہے تھے۔
میں نے دیکھا کہ دارج کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی ہیں۔ اس کی آنکھوں میں جیسے خون اترا ہوا تھا۔ وہ میری طرف انگلی اٹھا کر زہریلے لہجے میں بولا۔ ''میں جانتا ہوں۔ یہ سب کچھ تمہارا کیا دھرا ہے...... یہ تمہاری سازش ہے۔ تم پرلے درجے کے جھوٹے دغاباز ہو۔ اپنے مرنے کا ڈراما کر کے لوگوں کو اور قانون کو دھوکا دیتے رہے ہو۔ ہماری جڑیں کاٹتے رہے ہو۔ تم غداروں سے ملے ہوئے ہو۔'' اس نے فرطِ غضب میں مجھ پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔

''زبان سنبھال کر بات کرو دارج، ورنہ گالیاں دینا مجھے بھی آتا ہے اور یہ تمہارا دولت خانہ نہیں ہے جہاں تمہارے پالتو تمہارے اردگرد ہوتے ہیں۔''
وہ اور بھڑک اٹھا۔ اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ دہاڑ کر بولا۔ ''میں تمہاری آنکھیں نکلوا کر تمہارے ہاتھ پر رکھ دوں گا۔ تمہارے گندے دماغ میں جو کیڑے چل رہے ہیں، وہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم...... تم...... ایک شادی شدہ عورت کے پیچھے پڑے ہوئے ہو۔ ایک بے حیا، بے غیرت کی طرح اس کا گھر برباد کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ بھیس بدل بدل کر اس سے ملنے کی کوشش کرتے ہو، اس کے گھر میں گھستے ہو، ہر جگہ اس کا پیچھا کرتے ہو۔ تمہیں تو چوراہے پر لٹا کر جوتے مارنے چاہئیں۔ اسی جگہ سنگسار کر دینا چاہیے تمہیں۔'' اس نے ایک بار پھر مجھ پر گالیوں کی بوچھاڑ کی۔ اس کے گلے کی رگیں پھول گئی تھیں اور چہرہ سرخ ہوتا جا رہا تھا۔
تاجور روہانسی آواز میں منمنائی۔ ''پلیز دارج! آپ کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔''
اس نے تاجور کو سر کے بالوں سے پکڑ کر آگے پیچھے جھلایا اور پھر دھکا دے کر دور ہٹا دیا۔ وہ جیسے اپنے حواس میں ہی نہیں تھا۔ گرجا۔ ''تم جاؤ دوسرے کمرے میں۔ ہٹ جاؤ اس شیطان کے سامنے سے۔''
تاجور بے چارگی کی تصویر نظر آئی۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ابھی ایک مصیبت پوری طرح ٹلی بھی نہیں تھی کہ یہ دوسری کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی دروازے کی طرف گئی۔
اس موقع پر قسطینا سے برداشت نہیں ہوا۔ اس نے دارج سے مخاطب ہو کر انگلش میں کہا۔ ''مسٹر دارج! خواتین سے بات کرنے کا ڈھنگ سیکھو۔ یہ کیا طریقہ ہے، سب کے سامنے بیوی کی بے عزتی کر رہے ہو۔''
''شٹ اَپ...... یو شٹ اَپ...... تمہارے بارے میں بھی اچھی طرح جانتا ہوں میں...... اسی حرامی شاہ زیب کی رکھیل بنی رہی ہے تو بھی... اب اس کے ساتھ شادی شادی کھیلتی پھر رہی ہے......''
قسطینا کا چہرہ انگارے کی طرح دہک اٹھا۔ ''شٹ اپ یو باسٹرڈ...... شٹ اپ۔'' وہ چنگھاڑی اور بے ساختہ چند قدم اٹھا کر دارج کی طرف گئی۔
آدم خاں راستے میں آگیا۔ اپنی نہایت بھاری

پھر کم آواز میں بولا۔ ''بس میم صاحب بس...... زیادہ ٹاپنے کی کوشش نہیں کرنی۔'' اس کا لہجہ خطرناک تھا۔

فارس جان جلدی سے آگے بڑھا لیکن میں نے اسے روک لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس نازک موقع پر بات بڑھ جائے۔ قسطینا کے دو جنگجو محافظ جو ہمارے ساتھ ہی اندر آگئے تھے، قسطینا کے حکم پر ایک طرف خاموش بیٹھے تھے۔ باہر ابھی تک پرندوں کا شور تھا اور یقیناً باہر کھڑی دارج کی گاڑی سے ابھی دھوئیں کے مرغولے نکل رہے تھے۔ وہ کسی بھی وقت آگ پکڑ سکتی تھی۔

قسطینا نے آدم خاں کو دھکا دے کر پیچھے ہٹایا تو وہ سرسراتی آواز میں بولا۔ ''عورت ذات پر ہاتھ نہیں اٹھاتا، ورنہ ابھی اسی جگہ تجھے ننگی لاش کی شکل دے دیتا۔''

''اوئے حرام کے تخم، اُدھر آ، میں تیری انتڑیاں نکال کر تیرے ہاتھ میں دوں۔'' فارس نے آدم کو للکارا اور پھر اس کی طرف بڑھنے کی کوشش کی۔ میں نے دوبارہ اسے روک لیا۔

بلند آوازیں سن کر دارج کی ہٹی کٹی والدہ بھی ساتھ والے کمرے سے نکل آئی اور دہائی دینا شروع کر دی۔ اس کے آنے پر آدم خاں، غضب ناک انداز میں قسطینا اور فارس کو گھورتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ دارج مسلسل اول فول بول رہا تھا۔ اس کی والدہ اپنی حالت بھول کر اسے سنبھالنے اور ''کول ڈاؤن'' کرنے میں لگ گئی۔ میں نے بھی فی الحال دارج کے سامنے سے ہٹ جانا بہتر سمجھا...... میں قسطینا اور فارس کو لے کر تہ خانے کی نیم تاریک سیڑھیوں کی طرف آگیا۔ یہاں کا منظر ابھی تک ناقابلِ یقین اور نہایت ''الارمنگ'' تھا۔ سیڑھیوں کے نچلے سرے پر موجود دروازے کے نیچے قریباً ایک انچ کی درز موجود تھی۔ اس درز میں کوئی ایک درجن طوطوں نے اپنی چونچیں گھسا رکھی تھیں۔ وہ اندر گھسنے کے لیے پھڑپھڑا رہے تھے اور دروازے سے ٹکرا رہے تھے۔

میں نے کہا۔ ''فارس ایک بات نوٹ کی تم نے؟ اب دھواں نہیں ہے۔''

''ہاں آپ ٹھیک کہتا ہے۔'' وہ بولا۔ ''اگر دھواں ہوتا تو اب بھی اس درز کے نیچے سے اندر آرہا ہوتا۔''

''لیکن، تھوڑی بہت بُو تو موجود ہے۔'' قسطینا نے کہا۔

''یہ اسی دھوئیں کی ہے جو شروع میں اندر آیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ دارج کی گاڑی پکڑنے سے بچ گئی ہے۔'' فارس جان نے خیال ظاہر کیا۔

''ہاں، ان جدید گاڑیوں میں ایسے سسٹم ہوتے ہیں جو ایسے حادثوں کی شکل میں، اندرونی حصوں کو محفوظ رکھتے ہیں۔'' قسطینا نے کہا۔

''یہ سب کچھ کسی ہارر فلم جیسا لگ رہا ہے۔ اپنے حواس پر یقین نہیں ہو پارہا۔'' فارن جان بولا۔ وہ قسطینا کی موجودگی میں انگلش میں ہی بات کرتا تھا۔

میرا دھیان پھر بنارس اور تاوان والی گاڑی کی طرف چلا گیا۔ میں اور قسطینا تقریباً ایک ساتھ بول اٹھے۔ ''وہ دوسری گاڑی پتا نہیں کہاں رہ گئی؟''

فارس جان بولا۔ ''ممکن ہے کہ وہ سیدھا آگے نکل گئے ہوں اور مڑے نہ ہوں۔''

''نہیں فارس۔'' قسطینا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ میں نے پل والے ایکسیڈنٹ کے بعد انہیں نہیں دیکھا۔''

''پھر تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پل پر دارج کے گارڈز نے گاڑی پر فائرنگ کی ہو۔ اس کا ٹائر وغیرہ برسٹ کر دیا ہو۔'' میں نے خیال ظاہر کیا۔

قسطینا نے اپنے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے اپنی پینٹ کی بیلٹ میں پھنسائے اور پُرتفکر لہجے میں بولی۔ ''یہاں سے کیسے نکلیں گے۔ یہ پرندے تو ہمیں گھیر کر بیٹھ گئے ہیں۔''

''مجھے بھی لگ رہا ہے کہ ان کے جانے کے لیے لمبا انتظار کرنا پڑے گا۔'' میں نے کہا۔

تہ خانے کے بغلی کمرے سے ایک بار پھر دارج کے گرجنے برسنے کی مدھم آوازیں آنے لگیں۔ پتا نہیں کہ اب وہ کس کے لتے لے رہا تھا۔

فارس جان کی آنکھوں میں اب تک خون کی سرخی موجود تھی۔ دارج نے جو گندی زبان قسطینا کے بارے میں استعمال کی تھی، اس نے یقیناً اس کا خون کھولا دیا تھا۔ وہ سنگین لہجے میں بولا۔ ''اگر یہ حرام زادہ اپنی گندی بکواس سے باز نہیں آیا تو میں ضرور اس کا قاتل قرار پاؤں گا۔ جو شخص اپنی بیوی کے بارے میں اس طرح کا رویہ رکھ سکتا ہے، دوسری خواتین کے ضمن میں اس سے خیر کی کیا امید ہو سکتی ہے۔''

''نہیں فارس، آپ اس سلسلے میں کوئی جھگڑا مول نہیں لیں گے۔ ہم پہلے ہی کئی خطروں میں گھرے ہوئے

JBD

جہانگیر بکس 91

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

آخری معرکہ -/550

اندھیری رات کے مسافر -/475
اندلس میں مسلمانوں کی آخری سلطنت غرناطہ کی تباہی کی داستان

ثقافت کی تلاش -/300

قیصر و کسریٰ -/625
اسلام کے ابتدائی نقوش کی داستان

اور تلوار ٹوٹ گئی -/550
شیر میسور (ٹیپو سلطان شہید) کی داستان شجاعت

گمشدہ قافلے -/500

داستانِ مجاہد -/300

پردیسی درخت -/450

یوسف بن تاشفین -/500
گمنام سپاہی کی داستان

معظم علی -/475
آزادی و حریت کے ایک مجاہد معظم علی کی داستان شجاعت

خاک اور خون -/550
تقسیم برصغیر کے پس منظر میں داستان خونچکاں

کلیسا اور آگ -/450
غرناطہ اور اندلس میں مسلمانوں کی شکست کی داستان

قافلۂ حجاز -/599
راہِ حق کے مسافروں کی ایک بے مثال داستان

محمد بن قاسم -/425
عالم اسلام کے 17 سالہ ہیرو کی تاریخی داستان

پورس کے ہاتھی -/300
1965ء کی جنگ کے پس منظر میں

انسان اور دیوتا -/450

پاکستان سے دیارِ حرم تک -/300

آخری چٹان -/450

سو سال بعد -/225

سفید جزیرہ -/325
بحر الکاہل کے کسی نامعلوم جزیرے کی داستان

شاہین -/475
اندلس میں مسلمانوں کے نشیب و فراز کی کہانی

سبق آموز کُتب سلسلہ
دو رنگی طباعت اور تصویری خاکوں سے مُزین

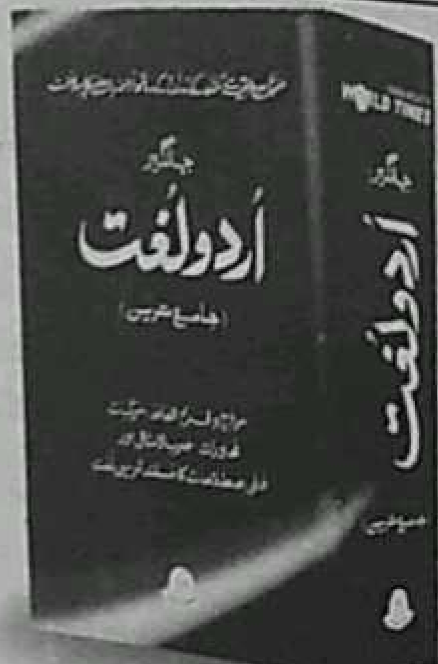

اقوالِ حضرت علی المرتضیٰؓ -/165
اقوالِ آئمہ کرامؒ -/165
حکایاتِ گلستانِ سعدیؒ -/195
اقوالِ شیخ سعدیؒ -/140
حکایاتِ رومیؒ -/180
دلچسپ و عجیب حقائق -/170
حکایاتِ بوستانِ سعدیؒ -/199
دلچسپ و حیرت انگیز باتیں -/150
ایمان افروز و سبق آموز سچے واقعات -/180
بڑے لوگوں کے روشن واقعات -/165

جہانگیر
اُردو لُغت
(جامع ترین)

جہانگیر بک ڈپو
022-2780128 042-37220879
042-35757086 051-5539609
021-32765086

ہیں۔'' قسطینا نے اس کا بازو تھامتے ہوئے پُرزور لہجے میں کہا۔

فخر بھی اس گفتگو میں شریک ہونے کے لیے سیڑھیوں کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے میرے خیال کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ دارج داراب ایک اہم شخصیت ہے۔ اس کی اچانک گمشدگی پورے علاقے کی پولیس کو حرکت میں لے آئے گی۔ ہم امید کر سکتے ہیں کہ جلد ہی کچھ لوگ دارج کو تلاش کرتے ہوئے یہاں پہنچ جائیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اب تک فون وغیرہ بھی کر چکا ہو۔''

''نہیں، فون اس تہ خانے میں کام نہیں کر رہے۔'' میں نے فخر کو اطلاع دی۔

''ہاں میرا بھی نہیں کر رہا۔'' فارس جان نے کہا۔

''پھر بھی میرا اندازہ ہے کہ دارج کو ڈھونڈنا اس کے محافظوں کے لیے بہت زیادہ دشوار ثابت نہیں ہوگا۔ جس پل کے پاس گاڑیاں آپس میں ٹکرائی ہیں اور الٹی ہیں وہ یہاں سے آٹھ نو کلو میٹر ہوگا۔ ہمیں اس پل کے آس پاس ضرور تلاش کیا جائے گا...... پھر تلاش کا دائرہ وسیع کر دیا جائے گا۔''

میں نے ایک بار پھر اپنے سیل فون پر بنارس اور داؤد بھاؤ سے رابطہ کرنا چاہا، یہ دونوں کوششیں ہی ناکام ہوئیں۔ یہاں سگنلز نہ ہونے کے برابر تھے۔

دروازے سے باہر جنونی طوطوں کا ہجوم تھا۔ ان کی آوازیں اصل آوازوں سے بہت مختلف تھیں...... اور یقیناً یہ اسی خوفناک ٹرانس کی وجہ سے تھا جس نے انہیں اپنے حصار میں جکڑا ہوا تھا۔ فارس جان نے اپنے موبائل فون کی ٹارچ کی روشنی فرش پر پھینکی، وہاں وہ مردہ طوطا نظر آیا جسے اس نے تاجور پر حملہ کرنے سے روکا تھا اور دیوار سے دے مارا تھا۔

ہم نے وہ طوطا اٹھا کر دیکھا۔ مردہ حالت میں بھی اس کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں اور ان میں ایک عجیب سی سرخی محسوس ہوتی تھی۔ یکایک میں چونک گیا۔ آہنی دروازے کی دوسری جانب طوطوں کے شور کے علاوہ ایک اور آواز بھی سنائی دی۔ میں نے ٹھٹکی نظروں سے دیکھا، دروازے کی نچلی درز میں طوطوں کی چونچوں کے علاوہ ایک اور شے بھی نظر آ رہی تھی۔ یہ تیز نکیلے ناخن تھے اور یہ ناخن جیسے بے ساختہ، حرکت کر رہے تھے اور فرش کو کھرچنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ یہ کسی بڑے جانور کے ناخن تھے پھر میرے بدن میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ یہ لوسی کے ناخن تھے...... ہاں یہ اسی کے تھے۔ طوطوں کے شور کے درمیان جو نامانوس سی خرخر سنائی دے رہی تھی، وہ بھی لوسی ہی کی تھی۔

فخر نے ہراساں نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''لگتا ہے کہ وہ بھی یہاں پہنچ گئی ہے۔''

''کس کی بات کر رہے ہیں؟'' فارس جان نے مجھ سے پوچھا۔

''وہی مادہ بندر لوسی...... یہ دیکھو...... یہ اسی کا پنجہ ہے۔''

اب فارس اور قسطینا وغیرہ نے بھی یہ ناخن دیکھ لیے تھے۔ ''اوہ گاڈ۔'' قسطینا کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا اور وہ زیادہ بے چین نظر آنے لگی۔

میں نے دروازے کے نٹ بولٹ اور قبضوں وغیرہ پر روشنی ڈالی اور ان کے مضبوط ہونے کا اطمینان کیا۔ تب ہم سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئے۔ اپاہج دارج کو اس کی دبنگ والدہ نے کچھ ''شانت'' کیا تھا اور اسے اپنے ساتھ دائیں جانب والے کمرے میں لے گئی تھی۔ تاجور بھی یقیناً وہیں تھی۔ ہم نے تہ خانے کے ہال کا تفصیلی جائزہ لیا۔ یہاں موجود جن مورتیوں پر کراس کے سیاہ نشان لگائے گئے تھے، وہ عریاں مناظر پیش کر رہی تھیں۔ ایک مورتی میں ایک چوڑے چکلے نیم عریاں راکھشس کی آغوش میں ایک عریاں عورت موجود تھی۔ اسی طرح کی ایک دوسری مورتی میں ایک پہلوان نما شخص جس کا بالائی دھڑ شیر کا تھا ایک جواں سال عورت کو اپنے پنجوں میں دبوچے بیٹھا تھا۔ رقاصہ عورت کی ساڑی اس کے جسم سے ڈھلکی ہوئی تھی اور اتنی صفائی سے بنائی گئی تھی کہ پتھر کی ہونے کے باوجود اس کی ہر ہر سلوٹ دکھائی دے رہی تھی۔ اس مورتی پر بھی کراس کا سیاہ نشان لگا ہوا تھا۔

اس ہال کمرے میں صرف دو مورتیاں تھیں جن پر نشان نہیں لگائے گئے تھے اور یہ رام کرشن کی مورتیاں تھیں۔ ان کے گلے میں شاید کئی ماہ پرانے پھولوں کے ہار تھے جو اب سوکھ کر جھڑ رہے تھے۔

''یہ سب کیا ہے؟'' قسطینا نے حیران ہو کر پوچھا۔

''دیکھنے میں تو مندر لگتا ہے لیکن یہ مندر ہے نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟'' قسطینا نے پوچھا۔

میں نے ایک دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ دیکھیں، یہاں کیا لکھا ہے...... راکھشس دوارا۔ مطلب شیطان کا مسکن......''

''وہ دیکھیں...... وہاں بھی مورتیاں ہیں...... چھوٹے سائز کی۔'' فخر نے اوپر ایک بڑے طاق کی طرف اشارہ کیا۔

ہال کمرے کی چھت سے تھوڑا نیچے لکڑی کے دو مستطیل طاق موجود تھے۔ یہ قریباً ایک فٹ ضرب ڈھائی فٹ کے ہوں گے۔ ان میں بھی وہی شخص نظر آتا تھا جس کا اوپر کا دھڑ دھاری دار ٹائیگر کا اور نچلا کسی شہ زور پہلوان کا تھا۔ ایک منظر میں وہ اپنے دونوں ہاتھوں میں دو چمک دار کٹاریں تھامے کھڑا تھا، اس کی آنکھوں میں شعلے رقصاں تھے۔ دوسرے منظر میں وہ ایک اونچے سنگھاسن پر بیٹھا تھا۔ اس کے پاؤں تلے ایک جوان عورت تھی۔ جیسے وہ عورت نہ ہو کوئی ہرن یا بارہ سنگھا ہو جس کو شکار کر کے شکاری نے اس کے ساتھ تصویر بنوائی ہو۔ ان ساری مورتیوں پر بھی چھوٹے چھوٹے سیاہ کراس لگے ہوئے تھے۔

☆☆☆

اجاڑ علاقے کے اس ویران ''مندر'' کے تہ خانے میں ہمیں ایک رات گزر چکی تھی۔ حیرت کی بات تھی کہ ابھی تک کوئی ہماری مدد کو نہیں پہنچ سکا تھا اور حیرت کی دوسری بات یہ تھی کہ خونخوار پرندے اور مادہ بندر لوسی ابھی تک تہ خانے سے اوپر جانے والی سیڑھیوں پر موجود تھے۔ اگر ہمارے اور ان کے درمیان تہ خانے کا اندرونی دروازہ نہ ہوتا تو پتا نہیں... اب تک کیا کچھ ہو چکا ہوتا۔

بظاہر یہی لگ رہا تھا کہ ''ہماری تلاش میں نکلنے والے'' اس ایریا میں ابھی تک آئے ہی نہیں۔ کیونکہ وہ آئے ہوتے تو انہیں دور سے ہی اس شکستہ مندر کا کھلا ہوا پھاٹک نظر آ جاتا اور شاید ہماری دونوں گاڑیاں بھی دکھائی دے جاتیں۔ یعنی ایک دارج داراب والی جہازی جیپ اور دوسری ہماری اسٹیشن ویگن۔ لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ ہوا یا کسی اور وجہ سے پھاٹک بند ہو گیا ہو اور احاطے کا سارا منظر اوجھل ہو گیا ہو۔ ایسی صورت میں بھی یہ سوال تو ذہن میں ضرور پیدا ہوتا تھا کہ ہمیں تلاش کرنے والے ابھی تک اس مندر کے احاطے میں کیوں نہیں جھانک سکے۔ یہاں اس تہ خانے میں موجود قریباً ہر شخص کے پاس موبائل فون موجود تھا لیکن سگنل نہ ہونے کی وجہ سے یہ سب فونز بیکار تھے۔

خوش قسمتی سے دارج کا میڈیکل ہیلپر اپنا وہ بڑا شولڈر بیگ ساتھ لانے میں کامیاب ہو گیا تھا جس میں دارج کی دوائیں اور ڈائپرز اور دیگر لوازمات شامل تھے۔ دارج کی والدہ مسز یاسمین داراب کے بیگ میں کچھ بسکٹس اور چاکلیٹس وغیرہ موجود تھیں جن سے دارج وغیرہ نے بھی اپنا کام چلایا۔ باقیوں کے لیے اس تہ خانے میں کھانے کے لیے بھنے ہوئے چنوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ یہ ڈیڑھ دو کلو چنے پلاسٹک کے بند پیکٹوں میں ایک الماری کے اندر ملے تھے اور کھانے کے قابل تھے۔ یہیں سے ہی ہمیں پانی کی تین چار سربمہر بوتلیں بھی مل گئیں۔ تہ خانے میں ہال کمرے سمیت کُل چار کمرے تھے۔ ان میں دو بوسیدہ واش رومز بھی تھے۔ بہر حال ان کے زنگ آلود نلکوں میں سے تھوڑا بہت پانی آتا تھا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ گاہے بگاہے دو تین افراد یہاں آتے ہیں اور شاید ایک دو روز قیام بھی کرتے ہیں۔ لیکن اب فرش اور دیگر اشیا پر پڑی ہوئی گرد دیکھ کر تو یہی پتا چلتا تھا کہ شاید پانچ چھ ہفتوں سے کوئی اس تہ خانے میں نہیں اترا۔

یہ صبح کے آٹھ بجے کا وقت تھا۔ اچانک دارج کی گھن گرج نے ہم سب کو پھر چونکا دیا۔ اس بار وہ براہِ راست تاجور کے لتے لے رہا تھا۔ بند دروازے کے پیچھے سے اس کی کرخت آواز ابھری اور ہال کمرے تک سنائی دی۔ ''بند کرو یہ بکواس...... تمہاری عقل تو ٹھکانے پر نہیں ہے، میری ٹھکانے پر رہنے دو۔ میں سب جانتا ہوں۔ اتنا چُوچا نہیں ہوں۔ یہ سب تمہاری وجہ سے ہو رہا ہے...... تمہارے پیچھے پڑے ہوئے ہیں یہ لوگ۔ اور خاص طور سے وہ حرامی شاہی۔ یہ سب ڈرامے تم تک پہنچنے کے لیے ہو رہے ہیں۔''

جواب میں تاجور نے دھیمی آواز میں کچھ کہا ہوگا جو ہمارے کانوں تک نہیں پہنچ سکا۔ حسبِ توقع دارج اور بھڑک اٹھا...... بلند آواز میں چنگھاڑا۔ ''ہونے دو میری بے عزتی جو ہوتی ہے...... اب اس میں کسر ہی کیا رہ گئی ہے۔ ساری دنیا کے سامنے ننگا ہو رہا ہوں میں...... ٹھیک ہے ہوتا ہوں تو ہونے دو۔ جب تک برداشت ہے، برداشت کروں گا۔ جب نہیں ہوگا تو گولی مار دوں گا تجھے اور خود کو بھی...... سنا، گولی مار دوں گا۔'' وہ اتنے زور سے بولا کہ اسے کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔

چند سیکنڈ بعد حالت قدرے سنبھلی تو اسی گھن گرج کے ساتھ بولا۔ ''اور یہ جو باتیں ہو رہی ہیں ناں کالے علم کی اور سفید علم کی، میں نہیں مانتا ان کو...... یہ سارا ڈھونگ ہے ان سؤروں کا۔ یہ ان کی سدھائی ہوئی بندریا ہے...... اور پرندوں کو بھی سدھا لیتے ہیں اس طرح کے لوگ۔ یہ سب ڈھونگی ہیں اور سب سے بڑا ڈھونگی وہ شاہی ہے۔ کبھی چاند گڑھی میں ٹریکٹر ڈرائیور بنتا ہے، کبھی سکھیرا میں کار ڈرائیور

بنتا ہے...... اور تو اور ہمارے گھر میں گھسا ہے وہ باسٹرڈ چاند کھوکھر بن کر، گھسا ہے یا نہیں......؟"

جواب میں شاید تاجور نے پھر عاجزی سے کچھ کہا تھا۔ جواب میں طمانچے کی زوردار آواز باہر تک آئی۔ پھر وہ پھنکارا۔ "آگے سے جواب دیتی ہے۔ تیری یہ مجال...... تیری یہ مجال۔" موقع محل دیکھے بغیر وہ خبیث اپنی منکوحہ بیوی سے ناروا سلوک کر رہا تھا۔

قسطینا بپھر کر اپنی جگہ سے اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ اس نے دروازے کو دھکا دیا اور وہ کھل گیا۔ بڑا تکلیف دہ منظر تھا۔ صوفے پر بیٹھے بیٹھے دارج نے تاجور کی گردن اپنے بازو کے شکنجے میں جکڑی ہوئی تھی اور دوسرے ہاتھ سے اس کے بال پکڑے ہوئے تھے۔ تاجور کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ سرخ چہرے کے ساتھ کھینچ کھینچ کر سانس لے رہی تھی۔

ہم آناً فاناً دروازے کے سامنے نظر آئے تو دارج نے تاجور کو چھوڑ دیا۔ وہ بُری طرح کھانستی ہوئی صوفے پر ایک طرف سمٹ گئی۔ دارج، قسطینا کو دیکھ کر گرجا۔ "تمہارے ہوش تو ٹھکانے پر ہیں؟ اس طرح کیوں گھسی ہو، ہمارے کمرے میں؟"

"یہ تمہارے گھر کا بیڈ روم نہیں ہے۔" قسطینا بھی ترکی بہ ترکی بولی۔ "یہاں ہم سب اکٹھے پھنسے ہوئے ہیں اور تم سے بڑا بے وقوف، بے شرم اور کون ہوگا۔ سب کی موجودگی میں اپنی بیوی کے ساتھ اس طرح کا سلوک کر رہے ہو؟"

دارج نے اپنا مُکا زور سے صوفے کے چوبی ہتھے پر مارا اور گرجا۔ "چلے جاؤ تم لوگ یہاں سے۔ یہ ہم میاں بیوی کا ذاتی معاملہ ہے۔" اس کے بالائی جسم میں جیسے زلزلہ برپا تھا۔ زیریں جسم مردہ ہونے کے باوجود اس کا بالائی جسم نہ صرف پوری طرح صحت مند بلکہ پُرزور بھی تھا۔

اس سے پہلے کہ قسطینا اسے کوئی کرارا سا جواب دیتی، ایک طرف سے لمبا تڑنگا آدم خاں تند بگولے کی طرح برآمد ہوا اور سیدھا قسطینا کی طرف آیا۔ اس کے لمبے بال چوڑے چکلے چہرے پر جھول رہے تھے۔ "سر کے کمرے سے نکل جاؤ میڈم ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔" اس نے قسطینا کو باقاعدہ باہر کی طرف دھکیلا۔

قسطینا جو کل سے بھری ہوئی تھی، مزید برداشت نہ کر پائی، اس نے ایک تھپڑ گھما کر آدم خاں کے چہرے پر دے مارا۔

یکا یک کمرے میں بھونچال سا آ گیا۔ آدم خاں نے قسطینا پر جھپٹنا چاہا مگر قسطینا نے اس کے پیٹ میں ٹانگ رسید کر کے اسے دور ہٹا دیا، آدم خاں کا پارا آسمان کو چھو گیا۔ یہی وقت تھا جب فارس جان تڑپ کر قسطینا اور آدم خاں کے درمیان آیا۔ آدم خاں نے ایک بھاری بھرکم گالی بک کر فارس جان کا گریبان دبوچا، دوسرا ہاتھ اس نے زوردار گھونسا رسید کرنے کے لیے ہی اٹھایا تھا مگر اسے بروقت قسطینا نے دبوچ لیا۔

وہ چلّائی۔ "پیچھے ہٹ جائیں فارس۔ میں اس کی مردانگی نکالتی ہوں۔ میں نمٹوں گی اس باسٹرڈ سے...... ابھی نمٹوں گی......" قسطینا کا چہرہ لال بھبوکا تھا اور آنکھوں میں شعلے ناچ رہے تھے۔

میں بھی آگے بڑھتے بڑھتے رک گیا۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ اب قسطینا اپنی سی کر کے رہے گی۔ اس آدم خاں کی اکڑ خانی سب کو کھٹک رہی تھی۔ یقیناً اسے اپنے کھلے ہوئے جسم اور اپنے مسلز پر بہت ناز تھا۔ اگر وہ ایک لڑکی سے شکست کھا جاتا تو اس کے لیے ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ قسطینا اسے زیر کر سکتی ہے۔

ہال کمرے کے اندرونی دروازے کے سامنے آناً فاناً آدم خاں اور قسطینا میں رن پڑ گیا۔ فارس جان نے ایک بار پھر آگے بڑھنا چاہا مگر میں نے اسے روک دیا۔ "میرا خیال ہے وہ کر لے گی۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

قسطینا کے دو زوردار ہاتھ کھانے کے بعد آدم خاں نے فراموش کر دیا تھا کہ وہ ایک "غیور مرد" ہے...... اور عورت ذات پر ہاتھ اٹھانا اپنی توہین سمجھتا ہے۔ پندرہ بیس سیکنڈ کے اندر ہی وہ جان گیا تھا کہ وہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے۔ اگر وہ ذرا بھی ڈھیلا پڑا تو وہ اس کی ساری اکڑ خانی ناک منہ کے رستے نکال باہر کرے گی۔ وہ گالیاں بک رہا تھا اور جھپٹ جھپٹ کر قسطینا کی طرف آ رہا تھا۔ قسطینا نے اس کے کئی وار بڑی صفائی سے بچائے اور جواب میں اسے جچی تلی ضربات رسید کیں۔ اس کے اندر کی جنگجو لڑکی پوری طرح بیدار تھی اور یہ کوئی عام لڑکی نہیں تھی، یہ جاماجی کی آرمڈ فورس کی جواں سال کمانڈر تھی۔ ایک موقع پر گرانڈیل آدم خاں کے ہاتھوں میں قسطینا کے بال آ گئے مگر یہ بوائے کٹ بال تھے۔ وہ ان پر زیادہ دیر اپنی گرفت قائم نہ رکھ سکا۔ قسطینا نے اسے طوفانی انداز میں دھکیل کر ایک پتھریلی مورتی سے جا ٹکرایا...... آدم خاں کی پشت پر شدید چوٹ لگی۔ قسطینا کے بال اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئے۔ قسطینا

نے ایک خطرناک کِک اس کی چھاتی پر پسلیوں کے درمیان رسید کی۔ وہ ایک واش روم کے دروازے سے ٹکرایا...... اور اس کی چولیں ہلا ڈالیں۔ واش روم کے اندر سے دارج کی دبنگ والدہ اپنے کپڑے سنبھالتی اور دہائی دیتی ہوئی باہر نکلی۔ وہ انگارا چہرے کے ساتھ چلّانے لگی۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا قیامت مچائی ہوئی ہے۔ میں ایک ایک کو جیل میں سڑا دوں گی۔ حشر کرا دوں گی تم سب کا......"

اس نے لپک کر قسطینا کو آدم خاں سے پیچھے ہٹانے کی کوشش کی۔ قسطینا نے اسے بھی دھکا دے کر دور ہٹایا اور گرانڈیل آدم خاں کو اڑنگا لگا کر فرش پر پٹخ دیا۔ آدم خاں کی ناک واضح طور پر بائیں جانب مڑ چکی تھی۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ چکی ہے۔ اس کے ہونٹ اور چوڑی ٹھوڑی خون سے رنگین ہو چکے تھے۔ اس کی آنکھوں میں حیرت لشکارے مار رہی تھی، اسے جیسے یقین نہیں ہو پا رہا تھا کہ وہ جس عورت ذات پر ہاتھ اٹھانا اپنی توہین سمجھتا ہے، وہ مار مار کر اس کا بھرکس نکال رہی ہے۔

اندر صوفے پر دارج اچھل رہا تھا اور دہاڑ رہا تھا۔ "مہنگا پڑے گا۔ بہت مہنگا پڑے گا تم لوگوں کو۔ تم داراب فیملی سے ٹکر لے رہے ہو۔ کمینو موت کی بھیک مانگتے پھرو گے۔"

اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ اُڑ کر قسطینا پر جا پڑتا اور اسے اپنے سب سے وفادار غلام کی ہڈیوں کا سرمہ بنانے سے روک دیتا۔

قسطینا نے واقعی اس کا جسمانی ریمانڈ لے لیا تھا۔ وہ اتنے تواتر سے اس پر مُکے اور ٹھوکریں برسا رہی تھی کہ قوی ہیکل آدم خاں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنے جسم کے کون سے حصے کو بچائے اور کون سے حصے کو قسطینا کی مہلک ضربات کے لیے کھلا چھوڑ دے۔ اس کی بائیں کلائی ٹوٹ چکی تھی۔ ایک پاؤں کا پنجہ بھی بے طرح زخمی تھا۔ وہ اوندھے منہ واش روم کے اندر گرا۔ اس کا چہرہ بدبودار پاٹ سے بس چند انچ کے فاصلے پر تھا۔ ہانپتی ہوئی قسطینا نے اس کی گردن کے پچھلے حصے پر پاؤں رکھ دیا۔ وہ پھنکاری۔ "جان سے مار دوں گی تجھے۔"

اس کی انگلش آدم خاں کی سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ بس خون تھوک کر رہ گیا۔ بہرحال اس کا انداز اب بھی خطرناک تھا۔ موقع ملتے ہی وہ کوئی اوچھی حرکت کر سکتا تھا۔ اس کے پاس کوئی آتشیں ہتھیار نہیں تھا ورنہ شاید وہ اب تک قسطینا کو شوٹ کر چکا ہوتا۔ میں نے فخر سے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اس ارنے بھینسے کے ہاتھ پاؤں باندھ دینے چاہئیں، کہیں یہ پھر مشکل پیدا نہ کرے۔"

فخر نے میری تائید کی۔ سن کی ایک رسی مل گئی۔ آدم خاں کی دونوں ٹانگیں باندھ دی گئیں اور ایک ہاتھ بھی پشت کی طرف موڑ کر اسی رسی سے جکڑ دیا گیا۔ دوسرے ہاتھ کی کلائی ویسے ہی ٹوٹ چکی تھی۔ دارج اور اس کی والدہ مسلسل واویلا کر رہے تھے۔ دارج میری طرف دیکھ رہا تھا اور خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ وہ اپنی ہر مصیبت اور ذلت کا ذمے دار مجھے ہی سمجھ رہا تھا۔ طیش کے ساتھ ساتھ دارج کی آنکھوں میں ایک طرح کی حیرت بھی جھلک دکھا رہی تھی۔ غالباً اسے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کے فولادی باڈی گارڈ اور بے مثال جاں نثار آدم خاں کو ایک لڑکی نے چکنا چور کر ڈالا ہے۔

قسطینا کا چہرہ غصے سے سرخ تھا۔ وہ دارج کے عین سامنے پہنچی اور اس کی جانب انگلی اٹھا کر بولی۔ "دیکھو مسٹر دارج! میں ایک بار پھر تمہیں بتا رہی ہوں، یہ تمہارا گھر نہیں ہے اور نہ یہ تمہارا بیڈ روم ہے۔ یہاں اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھو ورنہ سب کے لیے مشکل ہوگی اور سب سے زیادہ تمہارے لیے ہوگی۔" اس کے ساتھ ہی اس نے صوفے پر پڑا ہوا دارج کا فون اٹھا کر قبضے میں لے لیا۔

دارج نے غصے کے عالم میں کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن اس کی والدہ یاسمین بیگم نے اس کے کندھے تھام کر اسے روک دیا۔ "تمہیں میری قسم دارج، چپ رہو...... اس وقت چپ رہو۔ ہم سب اس وقت مصیبت میں ہیں۔"

"یہ مصیبت بھی ان کی لائی ہوئی ہے۔" دارج پھنکارا۔ "یہ سب ڈرامے ہو رہے ہیں۔ یہ پالتو پرندے ہیں ان کے...... ان کو کسی طرح ٹرینڈ کیا ہوا ہے...... ہم احمق الو کے پٹھے نہیں ہیں جو ان کی باتوں میں آئیں گے۔"

"اچھا جو بھی ہے دارج، پلیز اب چپ رہو۔" اس کی دبنگ ماں نے باقاعدہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ پھر اس نے اپنی بہو تاجور کو تحکمانہ انداز میں اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر کمرے اور ہال کا درمیانی دروازہ بند کر دیا۔

یہی وقت تھا جب فخر کی پکارتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "شاہ زیب! یہ دیکھو اس کمرے میں... ایک روشن دان بھی ہے۔"

میں اور قسطینا وغیرہ اُس دوسرے کمرے میں پہنچے۔ چھت کے بالکل پاس ایک مستطیل روشن دان تھا۔ نہ

خانوں میں عموماً ایسے روشن دان رکھے جاتے ہیں۔ یہ زیادہ تر باہر کے صحن یا برآمدے وغیرہ کے لیول پر ہوتے ہیں تاکہ روشنی اور ہوا کی آمدورفت ہو سکے۔ یہ بھی ایک ایسا ہی روزن تھا۔ اس میں زنگ آلود گول سلاخیں تھیں اور باہر کی طرف جالی لگی ہوئی تھی۔ روشن دان میں جو سب سے پریشان کن منظر دکھائی دیا، وہ خونخوار لوسی کا تھا۔ وہ روشن دان سے لگی خاموش بیٹھی تھی اور اپنی سرخ آنکھوں کے ساتھ ہمیں دیکھ رہی تھی۔ کسی وقت وہ اپنے سفید دانتوں کی نمائش کرتی تھی اور اپنے پنجے کو روزن کی جالی پر رگڑتی تھی۔ دیگر افراد بھی یہ منظر دیکھنے کے لیے کمرے میں آ گئے۔

''یہ کیسے پہنچی یہاں؟'' فخر نے حیرت سے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''یعنی ہم لاہور سے کافی دور آ چکے ہیں اور یہ آخری مرتبہ لاہور میں دیکھی گئی تھی۔''

''یہ طوطے بھی تو یہاں پہنچ گئے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''یہ تو چلو اُڑ کر آ گئے...... لیکن یہ کیسے آئی؟''

''اس نے بھی کوئی حل نکال لیا ہو گا۔ یہ ایک طاقتور ٹرانس میں ہے...... اپنے ٹارگٹ تک پہنچنے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہے۔''

''مثلاً کیا؟'' فخر نے پوچھا۔

''مثلاً یہ کہ...... کسی مسافر بس کی چھت پر چڑھ گئی ہو یا اس طرح کا کوئی اور ذریعہ...... خیر یہ غیر اہم باتیں ہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیا یہ ہاناوانی اور اس کے ساتھیوں کو ہماری اس پناہ گاہ تک پہنچا سکتی ہے؟''

قسطینا کسی بہت گہری سوچ میں نظر آتی تھی، وہ بولی۔ ''جہاں تک میں سمجھتی ہوں اور جانتی ہوں...... ہاناوانی کے ٹرانس میں آنے والے جانور بس اتنا ہی کام کر سکتے ہیں جتنی ان کو انسٹرکشن دی جاتی ہے۔ ان جانوروں کی انسٹرکشن ہمیں ٹارگٹ کرنا ہے۔ انہوں نے ہمیں دیکھا ہے اور ہمارے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ اب ہم جب تک ان کی نالج میں رہیں گے، یہ ہمارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ یہ اسی وقت ہاناوانی کے پاس واپس جائیں گے جب اپنے ٹارگٹ کو ختم کر دیں گے یا پھر وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو جائے گا۔''

اسی دوران میں ایک بار پھر دارج کے بلند آواز میں بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس مرتبہ پتا نہیں وہ کس پر برس رہا تھا۔ غالباً سعید کھوکھر کی کم بختی آئی ہوئی تھی۔ دو منٹ بعد تاجور اپنے کمرے سے باہر آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک شاپر تھا جسے وہ ڈسٹ بن (پلاسٹک کے ایک ڈبے) میں پھینکنے آئی تھی۔ ہم نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ جونہی لوسی کی نظر تاجور پر پڑی، وہ جو اَب تک خاموش بیٹھی تھی، ایک دم بھڑک اٹھی۔ اس نے چلّانا شروع کیا اور دیوانہ وار روزن پر حملہ آور ہوئی۔ وہ جیسے ہر رکاوٹ توڑ کر اندر گھس آنا چاہتی تھی۔ وہ روزن کی آہنی جالی کو اپنے دانتوں اور پنجوں سے اُدھیڑنا چاہ رہی تھی۔ وہ آہنی سلاخوں کی وجہ سے خود تو اندر نہیں گھس سکتی تھی لیکن اگر وہ جالی کو نقصان پہنچا دیتی تو خون آشام طوطوں کو راہ مل سکتی تھی۔ چند سیکنڈ میں دو چار طوطے بھی جالی سے ٹکرانا شروع ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کی تعداد بڑھ گئی۔

ان مناظر کو دیکھ کر تاجور کا رنگ ہلدی ہو گیا۔ وہ شاپر ڈسٹ بن میں پھینک کر جلدی سے باہر چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی لوسی کی جارحیت ماند پڑ گئی۔ پرندے بھی کچھ دیر جالی کے اردگرد پھڑپھڑاتے رہے پھر تہ خانے کے زیریں دروازے کی طرف چلے گئے۔

''اوہ گاڈ۔'' قسطینا نے طویل سانس لی پھر دھیمی آواز میں مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''اس کا مطلب ہے...... فی الوقت تاجور ہی ان کا ٹارگٹ ہے۔ ابھی ان پرندوں اور لوسی کو تمہارے یا ہمارے حوالے سے کوئی انسٹرکشن نہیں دی گئی ہے۔''

''ایسا ہی لگ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

قسطینا نے کچھ توقف کیا پھر پُرسوچ لہجے میں بولی۔ ''اس کا مطلب ہے کہ اگر ہم یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں تو ہم پر حملہ نہیں ہو گا۔''

''اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا قسطینا! ویسے آپ نے دیکھا ہی تھا جب آپ تاجور کو اپنی اوٹ میں لے کر سیڑھیاں اتری تھیں، یہ طوطا اندر آنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔'' میں نے ڈسٹ بن میں پڑے مردہ طوطے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ میری بات سمجھ کر بولی۔ ''ہاں اس طوطے نے مجھ پر بھی حملہ کیا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ تاجور میری آڑ میں تھی۔ ہو سکتا ہے کہ جب تاجور ہمارے ساتھ نہ ہو، ہم یہاں سے نکل سکیں۔'' اپنی بات مکمل کر کے قسطینا سوالیہ نظروں سے اپنے شوہر فارس جان کی طرف دیکھنے لگی۔

وہ خاموش رہا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ تردید کر رہا ہے نہ تائید۔

فخر نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''دوپہر کے بارہ بج چکے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ہمیں یہاں بند ہوئے چوبیس

گھنٹے ہو چکے ہیں۔ حیرانی کی بات ہے کہ ان چوبیس گھنٹوں میں کوئی ہم تک نہیں پہنچ سکا۔''

ایک جانب لوہے کی ایک پرانی سیڑھی رکھی تھی۔ میں یہ چھوٹی سی سیڑھی دیوار سے لگا کر روزن تک پہنچا۔ باہر کا منظر دکھائی دیا۔ لوسی چند فٹ کے فاصلے پر خاموش بیٹھی تھی لیکن دیکھ روزن کی طرف ہی رہی تھی۔ دو تین پرندے بھی روزن کے اردگرد چکرا رہے تھے۔ اس شکستہ مندر کی چھوٹی سی ڈیوڑھی دکھائی دیتی تھی یا پھر احاطے کا کچھ حصہ۔ مجھے اپنی اسٹیشن وین کے عقبی پہیے اور دو کھڑکیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں جس پھاٹک سے ٹکرا کر ہم اندر آئے تھے، وہ ہوا کی وجہ سے یا پھر خود ہی بند ہو چکا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر آس پاس سے کوئی گزرے گا بھی تو اسے احاطے میں کھڑی دو گاڑیاں نظر نہیں آئیں گی۔

''کچھ دکھائی دیا؟'' فخر نے نیچے سے پوچھا۔

''ہاں...... پھاٹک بند ہو چکا ہے۔ لگتا ہے کہ کل رات بارش بھی ہوئی ہے...... کئی جگہ پانی کھڑا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ دونوں گاڑیوں کے ٹائروں کے نشان بھی مٹ گئے ہوں گے۔'' فخر نے کہا۔

''لگ تو یہی رہا ہے...... مگر یہ بالکل کوئی جنگل تو نہیں ہے۔ پل کے اردگرد اگر پندرہ سولہ کلومیٹر قطر کے ایریا میں بھی ہمیں ڈھونڈا جائے تو کسی کو اس احاطے تک پہنچنا چاہیے۔''

اچانک میرے ذہن میں آیا کہ میں اس روزن کے پاس سے اپنا موبائل فون ٹرائی کروں۔ وہیں سیڑھی پر کھڑے کھڑے میں نے بابار داؤد بھاؤ کے خاص نمبر پر ٹرائی کیا مگر جواب وہی آیا۔ ''فی الحال آپ کے مطلوبہ نمبر سے رابطہ ممکن نہیں۔ کچھ دیر بعد کوشش کیجیے۔''

میں نے موبائل کی اسکرین دیکھی، سگنل کی انڈیکیشن کی صرف ایک لائن کسی وقت ایک سیکنڈ کے لیے ابھرتی تھی اور غائب ہو جاتی تھی۔

ایک دم لوسی اپنی جگہ سے اٹھی اور دو قدم چل کر روزن کے کچھ اور قریب آ گئی۔ وہ جیسے اپنی جبلّت کے تحت مجھے پہچاننے اور سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ تاہم یوں لگتا تھا کہ ٹرانس اتنا پاورفل ہے کہ اس نے ایک خاص مقصد کے سوا سب کچھ اس کے ذہن سے محو کر رکھا ہے۔

لوسی ہمیشہ کی طرح ایک پھول دار فراک اور نیلی نیکر میں تھی۔ اس نیکر کے ایک سوراخ سے اس کی طویل دم باہر نکلی ہوئی تھی۔ کچھ دن پہلے اس کی گردن پر ایک کٹ لگا کر ہم نے ایک ٹرانسمیٹر اس کے جسم میں رکھا تھا۔ بعدازاں وہ ٹرانسمیٹر ہاناوانی کے لوگوں نے نکال لیا تھا۔ اب گردن پر ایک چھوٹے سے زخم کے آثار تھے لیکن وہ بھی کافی حد تک اس کے گولڈن بالوں میں چھپ گئے تھے۔

میں نے سوچا کسی وقت لوسی کی حیثیت ایک خوشنما پالتو جانور کی تھی۔ جاماجی میں خانساماں ازمیر طیب اسے کندھوں پر اٹھائے اٹھائے پھرتا تھا۔ اس کی اٹھکیلیاں ازمیر کے علاوہ دوسرے دیکھنے والوں کو بھی نہال کر دیتی تھیں اور پھر یہی وفادار لوسی تھی جو اپنی جان کی پروا کیے بغیر ہیلی کاپٹر پر جست لگا گئی تھی اور ازمیر طیب کے قاتل آقا جان کو ہیلی کاپٹر سے کھینچ کر چھت پر لا پھینکا تھا۔ آقا جان کے فرار کی کوشش لوسی کی وجہ سے ہی ناکام ہوئی اور وہ اپنے انجام کو پہنچا۔ اپنے اسی جرم کی سزا میں یہ باوفا لوسی اب ہاناوانی کے مہلک شکنجے میں تھی اور ہمارے خون کی پیاسی ہو رہی تھی۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے قسطینا نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ لوسی کو شوٹ کر دیا جائے مگر مجھے ہمت نہیں ہوئی تھی کہ میں اس تجویز کی حمایت کروں۔ میں نے ٹال مٹول سے کام لیا تھا۔ اب بھی بھرا ہوا بریٹا پسٹل میری شرٹ کے نیچے موجود تھا مگر ابھی میں لوسی کو کچھ اور وقت دینا چاہتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ کسی طرح اس منحوس شکنجے سے نکل آتی جس نے اسے جکڑ رکھا تھا۔

میں سیڑھی سے نیچے اترا تو فارس جان باہر کا منظر دیکھنے کے لیے اوپر چڑھ گیا۔ اس کے بعد قسطینا اپنی باری کی منتظر تھی۔

ہال کمرے کے گوشے سے کراہنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہ آدم خاں تھا۔ چوٹیں اب ٹھنڈی ہو کر اسے اذیت میں مبتلا کر رہی تھیں۔ اس کی ناک خوفناک انداز میں بائیں طرف مڑ چکی تھی اور کلائی ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح جھول رہی تھی۔ ''میڈیکل اٹینڈنٹ'' سعید کھوکھر نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر میڈم کی اجازت ہو تو اس...... آدم خاں کو میڈیکل ایڈ دے دوں؟'' میڈم سے اس کی مراد قسطینا ہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''بالکل طبی امداد دو لیکن یہاں کوئی بھی کسی طرح کی کوئی چالاکی نہ دکھائے، ورنہ کام بگڑ جائے گا۔''

میں نے یہ الفاظ بلند آواز میں کہے تھے تاکہ دارج اور اس کی والدہ یاسمین بیگم تک بھی پہنچ جائیں۔

آدم خاں کی گن تو باہر جیپ میں ہی رہ گئی تھی، کیونکہ کل اسے افراتفری میں دارج کو گود میں اٹھا کر تہ خانے میں لانا پڑا تھا۔ باقی دارج یا یاسمین بیگم کے پاس کسی طرح کا آتشیں ہتھیار نہیں تھا۔ ان چاروں کے سیل فونز کچھ دیر پہلے ہی قسطینا نے اپنی تحویل میں لے لیے تھے۔

☆☆☆

یہ اس پرانے مندر میں ہماری دوسری رات تھی بلکہ شاید اسے مندر کہنا بھی درست نہیں تھا۔ یہ تو راکھشس دوارا تھا۔ یہ راکھشس دوارا کیوں تھا؟ کچھ مورتیوں پر سیاہ کراس کیوں لگے ہوئے تھے؟ یہاں گاہے بگاہے کون آتا تھا، اس بارے میں کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔

مضروب آدم خاں کی حالت بُری تھی تاہم اس نے خود کو سنبھالا ہوا تھا۔ دوسری طرف یاسمین بیگم نے بھی ہاتھ پاؤں جوڑ کر اپنے شعلہ صفت فرزند دارج کو کسی حد تک سنبھال رکھا تھا۔ میرا دھیان بار بار یونس پمپ والا کی موت کی طرف چلا جاتا تھا۔ اس نے ہاناوانی کے آسیبی جبر کا شکار ہو کر ایک ایسی عزیزہ پر مجرمانہ حملہ کیا تھا جس کی وہ دل و جان سے عزت کرتا تھا۔ اب پتا نہیں کہ وہ پروین نامی خاتون کس حال میں تھی...... پھر میری سوچ کا دھارا خورسنہ اور اس کے بچے کی طرف مڑ گیا۔ سجاول کے بعد ان دونوں کو بھی شدید خطرات لاحق تھے۔ بہرحال مجھے فیض محمد سے امید تھی کہ وہ ان کی حفاظت کا حق ادا کرے گا۔ یہ رات کے دس بجے کا عمل تھا، ہم نے خشک چنوں سے پیٹ پوجا کی تھی اور کفایت شعاری کے ساتھ تھوڑا تھوڑا پانی پی کر ان چنوں کو گلے سے نیچے اتارا تھا۔ رات کے سناٹے میں بس کسی وقت آوارہ کتوں کی صدا سنائی دیتی تھی اور پھر خاموشی چھا جاتی تھی۔ ہم بہت کان لگا کر سنتے رہے تھے کہ کہیں کسی ٹریکٹر، انجن یا گاڑی وغیرہ کی آواز سنائی دے لیکن مایوسی ہوئی تھی۔

ہم نے دونوں لیمپس کی لو بہت کم کر رکھی تھی تاکہ تیل کی بچت ہو سکے۔ اس کم روشنی میں ہال کمرے کا منظر زیادہ پُراسرار دکھائی دے رہا تھا۔ مورتیوں کے طویل سائے، پیتل کے بہت بڑے گھنٹے کا سایہ جو آہستہ آہستہ جھولتا بھی تھا۔ فخر ساتھ والے کمرے میں لوہے کی سیڑھی پر چڑھا ہوا تھا اور اپنے موبائل فون کے ذریعے کال کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پچھلے چھتیس گھنٹوں میں ہم ایسی درجنوں کوششیں کر چکے تھے مگر کامیابی کوئی نہیں ہوئی تھی۔ ہماری نارسائی بھی وہیں رہی تھیں اور ہمارے گرد موت کا حصار بھی وہی رہا تھا۔

اب بھی فخر ناکام ہو کر روزن سے لگی سیڑھی سے اتر آیا۔ وہ میرے اور قسطینا کے قریب آن کھڑا ہوا۔ قسطینا نے اپنے ہاتھوں میں پکڑا ہوا لیمپ تھوڑا سا اونچا کیا اور ایک قدِ آدم مورتی کو دھیان سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”شاہ زائب! تم نے بھی نوٹ کیا ہوگا صرف ان مورتیوں پر نشان لگے ہیں جو بے ہودہ ہیں اور ان میں سے زیادہ مورتیوں میں یہی مجسمہ نظر آتا ہے جس کا اوپر کا دھڑ ٹائیگر کا ہے۔ مطلب یہ کہ یہی راکھشس ہے۔“

مگر سوال یہ ہے کہ پھر ان مورتیوں کو اس جگہ سے نکال کیوں نہیں دیا گیا...... ہوسکتا ہے کہ ان مورتیوں کی وجہ سے ہی آس پاس کے لوگوں میں ہراس پیدا ہوگیا ہو اور وہ اس طرف آنے سے کتراتے ہوں۔ ورنہ یہ علاقہ اتنا بھی غیر آباد نہیں ہے۔“

قسطینا نے بڑے دھیان سے سیاہ نشانات کو دیکھا اور بولی۔ ”مجھے لگتا ہے کہ یہ نشانات خون سے لگائے گئے ہیں جو بعد میں خشک ہو کر سیاہی مائل ہو گیا ہے۔“

میڈیکل ہیلپر سعید کھوکھر بھی قریب آگیا۔ اس کے پاس ایک چھوٹی ٹارچ بھی تھی۔ اس نے نشانات کو دھیان سے دیکھنے کے بعد قسطینا کے خیال کی تصدیق کی۔

ابھی ہم بات ہی کر رہے تھے کہ ایک زوردار آواز نے ہم سب کو اچھلنے پر مجبور کر دیا۔ ہم کو یہی لگا کہ تہ خانے کی چھت شیشے کی ہے اور چھناکے سے ٹوٹ کر ہم پر آن گری ہے۔ لیکن یہ آواز گھنگروؤں کی تھی اور اتنی بلند تھی کہ کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی کسی عورت کے رونے اور چلانے کی آوازیں آئیں۔ جیسے وہ کسی پیارے کی لاش پر بین کر رہی ہو۔

تاجور اور اس کی دبنگ ساس یاسمین بیگم دہشت کے عالم میں پکارتی ہوئی کمرے سے نکل آئیں۔ سعید کھوکھر ”ہلدی چہرے“ کے ساتھ ان کے عقب میں تھا۔ ہم سب چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ ہولناک آوازیں دیواروں اور فرش کے اندر سے پھوٹ رہی ہیں۔

پھر ایک اور کام ہوا۔ دودھیا روشنی کے جھماکے ہونے لگے۔ یہ جھماکے تہ خانے کے اندر نہیں باہر ہو رہے تھے۔ دروازے کی نچلی درز اور روشن دان کی طرف سے ان جھماکوں کا پتا چل رہا تھا۔

”یہ سب کیا ہے؟“ قسطینا نے حیران نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”جو کچھ ہے آپ کے سامنے ہی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

دودھیا روشنی کے جھماکوں کا عکس ہال کمرے کی مورتوں پر بھی پڑ رہا تھا۔ یہ عکس ماحول کو اور بھی سنسنی خیز بنا رہا تھا۔ مجھ جیسا حقیقت پسند شخص کسی غیر منطقی اور ماورائی صورتِ حال کو تو ہرگز نہیں مان سکتا تھا۔ اس کے پیچھے کوئی انسانی ذہن ہی کارفرما تھا۔

میں نے قسطینا اور فارس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”لگتا ہے کہ کوئی اس جگہ کو جان بوجھ کر آسیب زدہ بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ یہ آوازیں...... ٹیپ ریکارڈر وغیرہ کی ہیں؟“ قسطینا نے پوچھا۔

”عین ممکن ہے۔ ہوسکتا ہے کہ...... ان کو پاورفل اسپیکرز کے ذریعے اتنی زیادہ فریکوئنسی دی گئی ہو۔“

”لیکن اسپیکرز کہاں ہیں؟“ فخر نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

گھنگروؤں کی زوردار جھنکار اور عورتوں کی نوحہ گری جاری تھی۔ دودھیا جھماکے اس ساری سچویشن کو مزید ہیجان خیز بنا رہے تھے۔

یاسمین بیگم اور سعید کھوکھر کا خاص طور پر بُرا حال تھا۔ سعید تو لگتا تھا کہ بے ہوش ہو کر گر جائے گا۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ آرٹی فیشل آوازیں ہیں۔ کچھ لوگ ڈراما کر رہے ہیں...... اور کچھ نہیں ہے یہاں۔“

فخر نے سیڑھی روشن دان کے پاس سے اٹھائی اور روشن دان کی دائیں جانب لگا کر اوپر چڑھ گیا۔ یہاں لکڑی کا ایک باکس سا تھا، جیسے فالتو اشیا رکھنے کے لیے چھوٹی سی الماری بنائی گئی ہو۔ میں نے سعید سے ٹارچ لے کر روشنی باکس پر ڈالی۔ چند سیکنڈ کے اندر فخر نے اس مقفل باکس کا دروازہ توڑ کر اسے کھول لیا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ آوازوں کا ماخذ یہی ہے۔ یہ اندازہ درست نکلا۔ اندر ایک جہازی سائز کا ”ایمپلی فائر“ موجود تھا۔

”اس کے تار کھینچ دو۔“ میں نے کہا۔

فخر نے تار کھینچ دیے۔ ایمپلی فائر خاموش ہو گیا لیکن آوازیں بدستور بلند ہوتی رہیں۔ فارس جان بولا۔ ”لگتا ہے کہ یہ دوسرا ایمپلی فائر ہے جو تہ خانے سے باہر انسٹال کیا گیا ہے۔“

وہ درست کہہ رہا تھا اب آوازیں تہ خانے کے باہر سے آرہی تھیں۔ یہ اتنی بلند تھیں کہ رات کے اس سناٹے میں شاید دو تین کلومیٹر تک سنی جاتی ہوں۔ اچانک یہ آوازیں بند ہو گئیں اور اس کے ساتھ ہی روشنی کے جھماکے بھی ختم ہو گئے۔ ایک بار پھر چاروں طرف پہلے جیسا گمبھیر سناٹا چھا گیا۔ اس سناٹے میں بس آوارہ کتوں کا دور افتادہ شور تھا یا پھر ہمارے محاصر پرندوں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی تھی۔

اندر کمرے میں دارج گرج برس رہا تھا۔ وہ وہی بات دہرا رہا تھا۔ ”یہ سب ناٹک ہے۔ ڈرامے بازی ہے۔ یہ حرام زادے ہم کو چغد سمجھ رہے ہیں، ہم بھی اسی دنیا میں رہتے ہیں۔ کہیں جنگلوں سے نہیں نکلے ہیں......“ وہ مغلظات بکنے لگا۔ اس کی والدہ اسے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگی۔ دارج کے زیادہ تر غصے کا رخ میری طرف ہی تھا۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ سب میرا ہی بچھایا ہوا جال ہے اور میں یہ سب کچھ داراباؤں سے اپنی پرانی دشمنی چکانے کے لیے اور تاجور تک پہنچنے کے لیے کر رہا ہوں۔ بیماری نے اس کے حواس خراب کر دیے تھے اور وہ بس ایک ہی رخ پر سوچتا جا رہا تھا۔

بہرحال ایمپلی فائر برآمد ہونے کے بعد یہاں موجود ہر فرد کو یقین ہو گیا تھا کہ اچانک جو آوازیں بلند ہوئی ہیں اور جو جھماکے ہوئے ہیں، وہ سراسر کوئی پلاننگ ہے۔ شاید کچھ لوگ کسی خاص مقصد کے لیے علاقے کے مکینوں کو اس شکستہ عمارت سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔ ایک مرتبہ انیق نے ہی مجھے بتایا تھا کہ اس قسم کی صورتِ حال اکثر دیہاتی علاقوں میں پیش آتی ہے۔ جرائم پیشہ لوگ کسی قبرستان، کسی عمارت یا درختوں کے جھنڈ کو آسیب زدگی کا رنگ دے دیتے ہیں اور اپنے مذموم مقاصد کے لیے راہ ہموار کرتے ہیں۔ سادہ لوح لوگ ان کے جھانسے میں آجاتے ہیں۔

اگر یہاں بھی کوئی ایسی ہی سچویشن تھی تو سوچنے کی بات یہ تھی کہ وہ کون لوگ ہیں جو اس جگہ کو استعمال کر رہے ہیں۔ ایک الماری سے شراب کی دو خالی بوتلیں اور ماچس کی ڈبیا ملی تھیں۔ روغنی نان کے کچھ سوکھے ہوئے ٹکڑے، ایک ٹوٹی ہوئی زنانہ چپل، ایک کمبل، اس طرح کی کچھ اور اشیا بھی یہاں موجود تھیں۔

رات کا باقی حصہ نسبتاً پُرسکون گزرا۔ تاریک خاموشی میں بس کسی وقت لوسی کی غصیلی آواز ابھرتی تھی اور پتا چلتا تھا کہ وہ دروازے پر اپنے پنجوں کو رگڑ رہی ہے یا پھر روزن کی جالی پر اپنے ناخن آزما رہی ہے۔ کسی وقت جنونی پرندوں کی پھڑپھڑاہٹ بھی سنائی دے جاتی تھی۔ قسطینا کے دونوں محافظ پہرا دینے والے انداز میں دروازے کے

پاس موجود تھے۔

دو ڈھائی بجے کے لگ بھگ مجھے نیند آ گئی۔ میں وہیں نخر کے پاس ہال کمرے میں ایک چٹائی پر لیٹ گیا۔ فارس جان اور قسطینا ساتھ والے چھوٹے کمرے میں لیٹے ہوئے تھے۔ قسطینا اپنے ساتھی ناوان کی طرف سے سخت پریشان تھی۔ ابھی تک باہر کی کوئی خبر ہم تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ اب دو تین موبائلز کی چارجنگ بھی ختم ہو چکی تھی۔

یہ رات کا پچھلا پہر تھا جب کسی نے میرے پاؤں کا انگوٹھا ہلا کر مجھے جگایا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا۔ لیمپ کی روشنی نہ ہونے کے برابر تھی۔ پھر بھی مجھے تاجور کے دلکش چہرے پر جھولتی ہوئی دو لٹیں نظر آ ہی گئیں۔ میں نے ارد گرد دیکھا۔ سب سو رہے تھے۔ کمرے میں سے دارج کی فربہ اندام والدہ کے خراٹوں کی مدھم آواز سنائی دے رہی تھی۔ یقیناً دارج بھی سو رہا تھا۔ زخمی آدم بھی مدھم خراٹے لے رہا تھا اور اس کے خراٹوں کی آواز سے پتا چلتا تھا کہ وہ تکلیف میں ہے۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''کیا بات ہے تاجور؟'' میں نے سرگوشی کی۔

''میں بات کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ بھی بہت مدھم آواز میں بولی اور مڑ کر تہ خانے کے اس تاریک گوشے کی طرف چل دی جو سیڑھیوں کے نیچے واقع تھا۔ میں بھی ننگے پاؤں اس کے پیچھے گیا۔ ساتھ ساتھ میں محتاط نظروں سے دائیں بائیں بھی دیکھ رہا تھا۔ وہ سیڑھیوں کے نیچے پہنچ کر مڑی اور دلدوز آواز میں بولی۔ ''شاہ زیب! پلیز مجھ پر رحم کریں۔ آپ جانتے نہیں کہ دارج کتنی زیادہ ٹینشن میں ہیں۔''

''میں نے کیا کیا ہے تاجور؟''

''لیکن قسطینا نے تو کیا ہے۔ آدم کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس پر دارج کو بے حد غصہ ہے۔ وہ بہت زیادہ تیخ ہو گئے ہیں۔ مسلسل بول رہے ہیں اور گالیاں دے رہے ہیں۔'' وہ سسک پڑی۔

وہ کہہ نہیں رہی تھی مگر اس کی گفتگو کا مطلب یہی تھا کہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کا سارا غصہ خود اس پر نکلے گا۔ وہ بہت زیادہ ڈری ہوئی تھی۔

''تم کیا چاہتی ہو تاجور؟''

''قسطینا اور آپ ایسی کوئی بات نہ کریں جس سے دارج کا غصہ بڑھ جائے۔ پلیز، آپ کسی طرح قسطینا سے کہیں کہ وہ...... دارج سے معافی مانگ لے۔ کل وہ بہت زیادہ سخت بولی ہے دارج سے۔ پلیز آپ قسطینا سے کہیں۔'' تاجور نے میرے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے۔

میں اس کا چہرہ دیکھ کر لرز گیا۔ دنیا جہان کا خوف سمٹ آیا تھا اس کی آنکھوں میں۔ یوں لگتا تھا کہ دارج کا خوف ایک عفریت کی طرح اس کے دل و دماغ پر سوار ہو چکا ہے۔ وہ کیوں ہو گئی تھی ایسی؟ میں نے بے حد کرب کے ساتھ سوچا۔

اس نے ایسے انداز میں التجا کی تھی کہ میں گنگ سا ہو کر رہ گیا۔ میں بس اتنا کہہ سکا۔ ''اچھا...... میں کوشش کروں گا۔''

وہ جانے کے لیے مڑنا چاہتی تھی۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ''تاجور! دارج نے اپنی من مانی کی ہے۔ وہ بغیر کسی احتیاطی تدبیر کے لاہور سے موٹر وے پر چل پڑا...... اور پھر وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ یہ کوئی جادو ٹونا یا کالا علم یا اس طرح کی کوئی اور چیز نہیں ہے۔ یہ ہپناسز ہے، جسے عام زبان میں ہپناٹزم کہتے ہیں۔ ایک خاص عورت کے دماغ میں پہنچ کر یہ ہپناٹزم بہت خطرناک صورت اختیار کر گیا ہے۔ تمہیں معلوم ہی ہے۔ یہ خاص عورت ہاناوانی ہے اور اس وقت...... ہم سب کے لیے زبردست خطرہ ہے۔''

اس نے اپنا نچلا ہونٹ ہولے سے دانتوں میں دبایا۔ اپنی لٹوں کو پیشانی سے پیچھے ہٹایا اور میری طرف دیکھے بغیر بولی۔ ''کل سعید اور فارس جان بات کر رہے تھے۔ میرے کان میں بھی کچھ لفظ پڑ گئے۔ وہ میری بات کر رہے تھے...... اور کہہ رہے تھے کہ سب سے زیادہ خطرہ مجھے ہے۔ اور یہ...... پرندے...... میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔''

مجھے فارس اور سعید پر غصہ آیا۔ ان کو بات کرتے ہوئے احتیاط سے کام لینا چاہیے تھا۔ میں نے کہا۔ ''اگر انہوں نے ایسا کہا ہے تو بالکل بیکار کی بات کی ہے۔ مت ماری گئی ہے اُن کی۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ مجھ سے، قسطینا سے اور فارس سے زیادہ ہاناوانی کا دشمن اور کون ہو سکتا ہے۔ ہمیں چھوڑ کر وہ تمہارے پیچھے کیوں پڑے گی۔''

''لیکن...... کل...... جب میں شاپر لے کر ڈسٹ بن کی طرف گئی تھی......'' یکایک تاجور کو اپنی بات ادھوری چھوڑنا پڑی۔

کمرے کے اندر سے دارج کی بھاری بھرکم کھانسی سنائی دی تھی۔ پھر وہ بھرائی ہوئی آواز میں کچھ بولنے لگا۔ شاید سعید کھوکھر کو بلا رہا تھا۔

تاجور نے لرز کر کہا۔ ''اچھا، میں چلتی ہوں...... اور

پلیز، جو کچھ میں نے کہا ہے، وہ یاد رکھیے گا۔''

وہ چلی گئی۔ میں اسے کیسے بتاتا۔ وہ اپنے بے مثل ہونٹوں سے جو لفظ بھی ادا کرتی ہے، وہ میرے حافظے پر نقش ہو جاتا ہے۔ میں چاہوں بھی تو اس کے لفظوں اور اس کی کہی ہوئی باتوں کو بھول نہیں سکتا۔

تاجور کمرے میں جا چکی تھی، دروازہ بند ہو گیا۔ سعید کھوکھر اپنی ڈیوٹی سے بالکل بے خبر سو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد بند دروازے کے پیچھے سے دارج کے گرجنے برسنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ساری باتیں تو سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں لیکن اس طرح کے الفاظ میرے کانوں تک ضرور پہنچ رہے تھے...... بکواس بند کرو...... اس کو نیچے رکھو...... وہ لے کر آؤ، اُلو کی پٹھی...... جو میں کہہ رہا ہوں، وہ کرو......

میرا خون کھولنے لگا لیکن میں بے بس تھا۔ جب وہ اسے دل و جان سے شوہر سمجھتی ہے اور اس کے خلاف کچھ بھی سننے کی روادار نہیں تھی تو میں کیا کر سکتا تھا...... کوئی بھی کیا کر سکتا تھا؟ چند روز پہلے جب ہم لاہور میں تھے، میں نے یہ اُڑتی اُڑتی بات بھی سنی تھی کہ تاجور شاید ''امید'' سے ہے...... اور لاہور آنے کے بعد دارج کی حالت میں کافی بہتری آئی ہے لیکن اس امر کی تصدیق ابھی تک نہیں ہو سکی تھی۔ آدم خان اسے جس طرح گود میں اٹھا کر یہاں تہ خانے میں لایا تھا، اس سے تو بہتری کا تاثر نہیں ملتا تھا۔ بہرطور اس موقع پر یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

''چلو جلدی کرو۔'' اندر سے دارج کی دہاڑ ابھری۔

چند سیکنڈ بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور تاجور بوکھلائی ہوئی باہر نکلی۔ لیمپ کے پاس سے اس نے جھاڑ پونچھ والا ایک کپڑا اٹھایا اور جلدی سے اندر چلی گئی۔ شاید اندر دارج نے کوئی برتن وغیرہ الٹ دیا تھا۔

میں لیٹ گیا مگر سینے میں دھواں سا بھرا ہوا تھا۔ میں نے کہیں سنا تھا کہ کبھی کبھی انسان اپنے حالات کا بدلہ اپنے آپ سے لینے لگتا ہے۔ خود کو سزا دیتا ہے...... اور اس میں راحت محسوس کرتا ہے۔ شاید تاجور بھی ایسا ہی کر رہی تھی۔ والد نے غلامی کا جو طوق، دارج کی صورت، اس کے گلے میں ڈال دیا تھا، وہ اسے اٹھائے پھر رہی تھی۔ اس طوق کے علاوہ بھی کچھ وزنی زنجیریں اس نے خود پہن لی تھیں۔ زخمی ہو رہی تھی، ذلت سہہ رہی تھی مگر چلتی جا رہی تھی۔ کل سہ پہر جب سعید کھوکھر، دارج کا ڈائپر بدلنے اور منہ ہاتھ صاف کرنے کے بعد کمرے سے باہر نکلا تھا تو ایک سیکنڈ کے لیے میری نگاہ کمرے کے اندر گئی تھی۔ میں دیکھ کر رنجور دل مسوس کر رہ گیا تھا کہ دارج پاؤں لٹکائے، چوڑا ہو کر صوفے پر بیٹھا ہوا تھا اور تاجور فرش پر بیٹھی اس کے پاؤں دھو رہی تھی۔

ایکا ایکی مجھے اپنے خیالوں سے چونکنا پڑا۔ چھوٹے سے وقفے کے بعد ایک بار پھر بند کمرے میں سے دارج کے مسلسل بولنے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ میں دروازے کے بالکل نزدیک چلا گیا اور سننے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ قسطینا کو ہی لتاڑ رہا تھا۔ ''اس نے آدم کو مارا ہے۔ میری نظروں کے سامنے مارا ہے۔ میں اس کو بخشوں گا نہیں۔ سرِعام اس کی مٹی پلید کرواؤں گا۔ اس کی نسلیں یاد رکھیں گی۔'' وہ غصے سے جیسے پھٹا پڑ رہا تھا۔

تب ایک بار پھر وہ تاجور کے درپے ہو گیا۔ وہ نسبتاً دھیمی لیکن کرخت آواز میں تاجور کو لعنت ملامت کر رہا تھا۔ بہت دھیمی آواز بمشکل میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ ''تو جو کچھ بھی کہتی رہ لیکن اس خبیث نے تجھے دل سے نہیں نکالا۔ تو اب بھی اس کی معشوقہ ہے۔ وہ تیرے لیے ہی بھیس بدل کر ہماری کوٹھی میں گھسا تھا اور تو جانتی تھی سب کچھ...... جانتی تھی ناں؟'' وہ پھنکارا۔

وہ بھیگی آواز میں بولی۔ ''میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میں جانتی تھی لیکن اس کا آنا مجھے بھی اتنا ہی بُرا لگا جتنا آپ کو لگا ہو گا۔''

''پھر وہی بکواس کر رہی ہے۔'' وہ دانت پیس کر بولا۔ ''تیرا فرض بنتا تھا کہ پہلے دن مجھے بتاتی...... پہلے دن...... پہلی گھڑی۔''

''میں ڈرتی تھی دارج...... آپ کے غصے سے ڈرتی تھی۔ میں سچ کہتی ہوں، اگر وہ ایک دو دن مزید وہاں سے نہ جاتا تو میں آپ کو سب کچھ بتا دیتی۔''

''یہ صفائیاں میرا دکھ دور نہیں کر سکتیں۔ اگر تو نے پہلے روز مجھے بتایا ہوتا تو اس باسٹرڈ کی لاش کے ٹکڑے کر کے گٹر میں ڈال دیے ہوتے ہم نے۔ اب ہمارے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اس لیے ہو رہا ہے کہ تیری وجہ سے وہ زندہ ہے۔ ہمارے آس پاس تماشے لگا رہا ہے۔''

جواب میں تاجور نے منمنا کر کچھ کہا جو سنائی نہیں دیا۔ تاہم اس کے جواب میں دارج پھر پوری شدت سے بھڑک اٹھا۔ وہ اس پر بے طرح گرجنے برسنے لگا۔ اس کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ پھر اس نے شاید حسبِ عادت تاجور کے بال مٹھی میں لے لیے تھے یا اس کی گردن بازو کے شکنجے میں جکڑ لی تھی۔ اس کی ہلکی کراہیں میرے کانوں

تک پہنچیں۔ جی چاہا کہ دروازہ توڑ کر اندر گھس جاؤں اور اسی جگہ اس منحوس شخص کو شوٹ کر دوں۔ لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تاجور کا شوہر تھا اور وہ اس کو اپنا شوہر مانتی تھی۔ شاید وہ بھی اسی ''زریں قول'' پر کاربند تھی جس میں بڑے بوڑھے رخصتی کے وقت بیٹیوں سے کہتے ہیں کہ اب جس گھر میں تمہاری ڈولی جا رہی ہے، وہاں سے تمہارا جنازہ ہی نکلنا چاہیے اور اکثر جنازہ نکلنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ جسمانی جنازہ نہ نکلے لیکن خوشیوں کا جنازہ تو نکل ہی جاتا ہے۔

میرے سینے میں گھٹن بڑھنے لگی۔ دارج کی ماں ہال کمرے میں ہی ایک چوبی تخت پر گدا بچھا کر سوئی ہوئی تھی۔ میں نے اسے جھنجوڑا تو اس کے خراٹے تھم گئے۔ پھر اس نے اپنے چربی دار جسم کو ہلکورا دیا اور جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''کون ہے؟ کیا ہوا؟'' اس نے اپنا بھاڑ سا منہ کھول کر کہا۔

میں نے دارج کے کمرے کے بند دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ کیسی آوازیں ہیں؟'' میں نے انجان بن کر کہا۔

دارج کی والدہ یاسمین بیگم چند سیکنڈ تک سنتی رہی، پھر بڑبڑاتی ہوئی اور اپنے جسم کو جھلاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ دروازے تک پہنچی اور دھیمی آواز میں دروازہ کھٹکھٹایا۔ ''دارج...... دارج...... تاجور...... دروازہ کھولو۔''

اندر صورتِ حال جوں کی توں رہی۔ دارج مسلسل گرج رہا تھا۔ یاسمین بیگم نے ذرا گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''دارج نہ کرو...... چھوڑ دو اسے...... یہ ٹھیک نہیں...... دروازہ کھولنے دو اسے۔''

شاید دارج کی مشتعل کھوپڑی میں بھی یہ بات آ گئی۔ کچھ دیر بعد دروازے پر کھٹ پٹ ہوئی اور تاجور نے دروازہ کھول دیا۔ مجھے اس کی پنک قمیص کی ایک جھلک ہی نظر آئی۔ یاسمین بیگم اندر چلی گئی۔ دروازہ دوبارہ بند ہو گیا لیکن میں پھر صبح تک سو نہیں سکا۔

☆☆☆

ہم زیادہ دیر یہاں بند رہ کر مزید خطروں کو دعوت نہیں دے سکتے تھے۔ صبح سویرے پہلے میں نے اور قسطینا نے مشورہ کیا تھا، پھر باقیوں کو بھی اس مشورے میں شریک کر لیا تھا۔ فیصلہ یہی ہوا تھا کہ ہم یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں۔ بے شک پرندوں کا محاصرہ موجود تھا اور لوسی بھی اردگرد منڈلا رہی تھی مگر ایک بات کافی حد تک کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ فی الوقت پرندوں اور لوسی کا ٹارگٹ تاجور ہی تھی۔ وہ تاجور کی جھلک دیکھ کر زیادہ مشتعل ہو جاتے تھے اور بے چینی ظاہر کرتے تھے۔ ایسی صورت میں یہ عین ممکن تھا کہ اگر تاجور باقی لوگوں کے ساتھ یہیں رہتی اور ہم میں سے دو تین افراد مسلح ہو کر باہر نکلتے تو اپنی اسٹیشن وین تک پہنچ جاتے۔ اس کے بعد آگے کا سوچا جا سکتا تھا۔

ایک بار پھر یہی سوال ہم سب کے ذہنوں میں ابھرتا تھا کہ ہمیں اب تک ڈھونڈا کیوں نہیں جا سکا تھا۔ اگر پہلوان حشمت ہمارے ساتھ یہاں ہوتا تو وہ اس صورتِ حال پر یقیناً یہی کہتا کہ یہ سب کالے جادو اور آسیب کا چکر ہے۔ یہ مندر باہر سے کسی کو نظر ہی نا ہیں آتا ہووے گا۔

بلکہ میرا تو خیال تھا کہ پہلوان حشمت نے کل رات کو ہی اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دینا تھی جس طرح اچانک قیامت کا شور بلند ہوا تھا اور دودھیا جھماکوں نے قرب و جوار کو روشن کیا تھا۔ پہلوان کی حرکتِ قلب کا بند ہونا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ مشورے کے دوران میں، میں نے کہا۔ ''یقینی بات ہے کہ ہماری تلاش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی جا رہی ہو گی۔ انسپکٹر قیصر چوہدری کی موت کا واقعہ ہی چھوٹا نہیں تھا، اب خیر سے دارج اور اس کی والدہ اوجھل ہو گئی ہیں۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' قسطینا نے پوچھا۔

''ہمیں رات ہونے کا انتظار کر لینا چاہیے۔ داؤد بھاؤ بھی ہماری مدد رات کے اندھیرے میں ہی کر سکتا ہے۔''

''لیکن اس سے پہلے تو یہ مسئلہ ہے کہ مسٹر داؤد سے رابطہ ہو۔''

''وہ تو ہو جائے گا قسطینا، تہ خانے سے نکلتے ہی ہمارے موبائل فون کام کرنا شروع کر دیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ داؤد بھاؤ اپنے مقامی کارندوں کو حرکت میں لے آئے گا اور وہ کسی بھیس میں ہم تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔''

یکا یک سعید کے چلّانے کی آواز آئی۔ وہ ہمیں پکار رہا تھا۔ ہم میٹنگ ادھوری چھوڑ کر اس کی طرف لپکے۔ وہ روشن دان کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ لوسی وہاں موجود تھی۔ شاید اب اسے ٹرانس کے علاوہ بھوک بھی بے قرار کر رہی تھی۔ وہ جارحانہ آوازیں نکال رہی تھی اور پنجوں سے آہنی جالی کو بُری طرح کھرچ رہی تھی۔

''یہ دیکھیں...... یہ کیا کیا ہے اس نے؟'' سعید ہراساں لہجے میں بولا۔ ساتھ ہی اس نے اپنی ٹارچ کی روشنی روزن پر پھینکی۔

لوسی کی پے درپے ضربوں سے روزن کی بیرونی جالی ایک جگہ سے اُدھڑنا شروع ہو گئی تھی۔ ''اوہ گاڈ! یہ تو بہت خطرناک ہے۔ پرندے یہاں سے اندر آ جائیں گے۔'' قسطینا بولی۔

''بالکل......'' فارس جان نے کہا۔ ''تھوڑی سی جگہ بھی بن گئی تو وہ اندر گھسنا شروع ہو جائیں گے۔''

فخر نے لوہے کی زنگ آلود سیڑھی کو روزن کی طرف کیا اور اس کی ضربات سے لوسی کو ڈرانے کی کوشش کی مگر وہ ڈرنے کے بجائے مزید مشتعل ہو گئی۔ وہ زیادہ شدت کے ساتھ جالی سے کھینچا تانی کرنے لگی۔ کچھ طوطے بھی نامانوس آوازیں نکالتے ہوئے اس کے اردگرد چکرا رہے تھے۔

میں نے ایک بار پھر لوسی کی طرف دیکھا۔ پھول دار فراک، نیلی نیکر...... وہ بھی ایک چنچل بچے کی طرح نظر آیا کرتی تھی۔ ازمیر طیب کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر کھاتی تھی۔ اس کی گود میں بیٹھ کر گاڑی کا اسٹیئرنگ گھماتی تھی۔ اس کے اشارے پر پارک میں قلابازیاں لگاتی تھی اور رقص کرتی تھی۔ وہ دشمن نہیں تھی مگر دشمن بن چکی تھی۔ میں سیڑھی کی طرف گیا۔ میں نے بریٹا پسٹل سے تین گولیاں لوسی کے جسم میں اتار دیں۔ ایک گولی عین اس کی چنچل آنکھوں کے درمیان لگی...... اور اس نے اس کی موت آسان کر دی۔ وہ لڑھک کر پیچھے گئی اور اینٹھ کر ساکت ہو گئی۔ فائرنگ کی پُرشور آواز نے طوطوں کو تتر بتر کر دیا اور وہ بلندی پر جا کر ہوا میں چکرانے لگے۔ ''معاف کرنا لوسی...... اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔'' میں نے دل ہی دل میں کہا اور بریٹا پسٹل پھر اپنی شرٹ کے نیچے لگا لیا۔

سب ہی کچھ دیر کے لیے گم صم ہو گئے تھے۔ فخر نے سیڑھی پر چڑھ کر جالی کو دیکھا۔ ابھی تک تو اتنا راستہ نہیں بنا تھا کہ کوئی پرندہ اندر آ سکتا لیکن اگر تھوڑی دیر مزید گزر جاتی تو ٹھیک ٹھاک راستہ بن جانا تھا۔

فخر نے روزن کے باہر پڑی لوسی کی طرف دیکھا۔ پھولدار فراک خون سے سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ آہ بھر کر بولا۔ ''ہاناوانی کا ایک اور شکار۔''

قسطینا کا چہرہ بھی سرخ ہو رہا تھا۔ وہ مستحکم لہجے میں بولی۔ ''وہ ایک ایک کو نشانہ بنا رہی ہے۔ ہم اسے مزید وقت نہیں دے سکتے۔ اندھیرا ہوتے ہی ہمیں ہر صورت یہاں سے نکلنا ہو گا۔''

☆☆☆

شام کے سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ ایک پُرخطر رات سر پر تھی۔ ہمارے پاس صرف دو موبائل فونز ایسے تھے جن میں کچھ چارجنگ ابھی باقی تھی۔ اور باہر نکلنے کے بعد ان کے ذریعے کسی سے رابطہ کیا جا سکتا تھا۔ بند کمرے سے گاہے بگاہے دارج کی کرخت آواز ابھرتی تھی۔ وہ جیسے ہر کسی پر بھرا بیٹھا تھا اور خاص طور سے تاجور پر۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے سعید کھوکھر کو بھی بے نقط سنا ڈالی تھیں۔

تاجور کمرے سے نکلی تو ایک لمحے کے لیے اس کی نظریں میری نظروں سے ملیں...... اس کی آنکھیں مسلسل رونے سے سوجی ہوئی تھیں۔ اس نے جیسے خاموشی کی زبان میں مجھے رات والی بات یاد دلائی۔

میں اٹھ کر ہال کمرے میں ٹہلنے لگا۔ میں قسطینا کے مزاج کو اچھی طرح سمجھتا تھا، یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ دارج جیسے شخص سے معافی مانگتی یا معذرت کرتی۔ وہ تو اس بدتہذیب کو غائبانہ صلواتیں سنا رہی تھی، اور حیران تھی کہ تاجور اس جنگلی کے ساتھ کیسے نبھا رہی ہے۔ دوسری طرف یہ بھی حقیقت تھی کہ آتش مزاج دارج کا پارا ڈاؤن کیے جانے کی فوری ضرورت تھی۔ وہ تاجور کے لیے سانس لینا مشکل کر رہا تھا۔

میرے دل سے آواز آئی۔ ''شاہ زیب! تم پیار نہیں عشق کرتے ہو تاجور سے اور عشق میں اپنی کوئی ہستی تو رہتی ہی نہیں ہے اور پھر جب ہستی ہی نہیں تو اونچ نیچ اور انا کا کیا مطلب...... یہ وقت ٹالنے کے لیے تم خود دارج سے معذرت کیوں نہیں کر لیتے؟''

میں نے کافی دیر اس بارے میں سوچا، پھر فیصلے پر پہنچ گیا۔ شام کے سات بجے تھے۔ دارج کی والدہ بلڈ پریشر کی دوا کھا کر سو رہی تھی۔ سعید ابھی ابھی دارج کے کپڑے تبدیل کروا کے باہر نکلا تھا۔ میں نے دروازے پر ''ناک'' کی اور پھر اسے تھوڑا سا کھول دیا۔ سامنے ہی دارج کی پائنتی کی طرف تاجور نظر آئی۔ وہ اس کے پاؤں کے ناخن تراش رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

میں نے کہا۔ ''ایکسکیوزمی، اگر زحمت نہ ہو تو آپ ذرا باہر آ جائیں۔ میں دارج صاحب سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

دارج نے مجھے گھورا پھر غصے سے بولا۔ ''مجھے کوئی بات نہیں کرنی تم سے۔ تم بہروپیے ہو۔ تم نے ہماری زندگی کو عذاب بنا رکھا ہے۔ چلے جاؤ یہاں سے۔ میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔''

میں نے کہا۔ ”لیکن جو بات میں کرنا چاہ رہا ہوں، وہ بہت اہم ہے۔ اس میں ہم سب کا فائدہ ہے دارج صاحب۔“

”یہ آج دارج صاحب کیوں کہنے لگے تم۔ اسی طرح بلاؤ جس طرح پہلے بلاتے رہے ہو۔ تمہاری ”تو تڑاں“ میں بھولا نہیں ہوں۔“

”اسی حوالے سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا اور پھر دوبارہ تاجور کی طرف دیکھ کر گزارش کی کہ وہ ذرا دیر کے لیے باہر آجائے۔

تاجور نے سوالیہ نظروں سے دارج کی طرف دیکھا۔ اس نے ذرا توقف کے بعد اشارے سے کہا کہ وہ باہر چلی جائے۔

تاجور کے جانے کے بعد میں دارج کے بستر کے سامنے سنگل صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کے کمرے میں دواؤں کی بُو تھی اور اس کی ٹانگیں جو بالائی جسم کے مقابلے میں کافی دبلی نظر آتی تھیں کمبل میں لپٹی تھیں۔ وہ نیم دراز تھا۔

میں نے کہا۔ ”دارج! میری بات تحمل سے سن لینا، بعد میں جو جی میں آئے کہہ لینا۔“ وہ بس مجھے گھورتا رہا۔ اس کی گھنی مونچھوں کے بالوں میں جیسے ایک ارتعاش سا تھا۔ میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”پہلی بات تو یہ کہ...... ایک غلط فہمی اپنے دل سے نکال دو...... بالکل نکال دو...... اس مادہ بندر اور طوطوں وغیرہ کے یہاں موجود ہونے میں میرا یا میرے کسی ساتھی کا کوئی کردار نہیں ہے۔ ہم تو خود اس مصیبت سے چھپتے پھرتے ہیں۔ میرا سب سے قریبی ساتھی انیق مارا جا چکا ہے۔ کالا شاہ کاکو کے علاقے میں ان پرندوں نے ہمارا پیچھا کیا۔ اس سے پہلے لاہور کے ہوٹل میں، یہ مادہ بندر لوسی ہم پر حملہ آور ہوئی، ہم زخمی ہوئے اور اب تم نے بھی دیکھ لیا ہوگا، ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے لوسی کو اپنے ہاتھوں سے گولی ماری ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ ان جانوروں کو ہم نے ”ٹرینڈ“ کیا ہوا ہے تو وہ سراسر غلطی پر ہے۔“

”تم زیادہ تقریر مت کرو۔ بتاؤ کہنا کیا چاہتے ہو؟“

”میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس وقت ایک اتفاق نے ہم سب کو ایک ہی کشتی کا سوار بنا دیا ہے...... اور یہ کشتی مشکل میں ہے۔ اگر ہم ایک دوسرے سے جھگڑیں گے تو یہ مشکل اور بھی بڑھ جائے گی۔“

”میں کسی حرامزادے سے نہیں جھگڑ رہا۔ یہ تمہاری وہی غیر ملکی سٹورنی ہے جس نے آدم سے جھگڑا مول لیا، اس کو زخمی کیا اور وہ اب کسی غنڈی کی طرح سینہ تان کر یہاں دندناتی پھر رہی ہے۔ میں اس کی یہ اکڑی ہوئی گردن توڑ کر نہ رکھ دوں تو میرا نام بدل دینا۔“

میں نے تحمل سے کہا۔ ”میں یہی بات تم سے کرنے آیا ہوں۔ اس واقعے کا مجھے بھی بہت افسوس ہے اور خود قسطینا کو بھی۔ شاید تمہیں پتا ہی ہوگا کہ وہ جاماجی کی آرمڈ فورسز کی کمانڈر ہے۔ اپنے لوگوں میں اس کا ایک مقام اور دبدبہ ہے۔ جب آدم خاں نے اس کو دھکا دیا تو وہ برداشت نہ کر سکی۔ اب اسے بھی پچھتاوا ہے لیکن جو کچھ بھی ہے اس کی حیثیت یہاں شاہی مہمان کی سی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اسے مزید شرمندہ ہونا پڑے۔ اس کی طرف سے میں تم سے معافی مانگتا ہوں اور یہ وعدہ بھی کرتا ہوں کہ دوبارہ اس طرح کا واقعہ نہیں ہوگا۔“

”دوبارہ اب کیا ہونا ہے۔“ وہ پھنکارا۔ ”آدم کے ہاتھ پاؤں توڑ کر تو پھینک دیا ہے تم لوگوں نے۔“

”جو کچھ بھی ہوا ہے، میں اس کے لیے پھر تم سے سوری بولتا ہوں۔ جہاں تک آدم کی بات ہے تم سعید کھوکھر سے پوچھ سکتے ہو۔ اسے فوری طبی امداد دی گئی ہے۔ ہر طرح اس کا خیال رکھا جا رہا ہے۔ ہاتھ پاؤں صرف اس لیے باندھے گئے ہیں کہ کہیں وہ غصے میں کسی پر جھپٹ نہ پڑے، اگر وہ......“

”یہ طوطا مینا کی کہانی مجھ کو نہ سناؤ۔“ وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”میں اس ذلیل کے سلوک کو کبھی بھول نہیں سکتا۔ وہ خود آ کر میرے پاؤں کو ہاتھ لگائے تو بھی بھول نہیں سکتا...... لیکن اس موقع پر میں بات کو بڑھانا نہیں چاہتا...... اس سفید سٹورنی سے کہو ہمارے موبائل فون ہمیں واپس کرے...... اور بہتر ہے کہ ہماری نظروں سے بھی دور رہے۔“

”ٹھیک ہے میں موبائل واپس لا دیتا ہوں...... اس کے علاوہ ایک بار پھر کہتا ہوں کہ کم از کم یہ غلط فہمی اپنے ذہن سے نکال دو کہ یہاں جو سچویشن بنی ہوئی ہے، اس میں میرا یا میرے ساتھیوں کا کوئی کردار ہے۔“

”تمہارا کردار کیا ہے اور کہاں کہاں ہے اس بارے میں مجھ سے میری زبان نہ ہی کھلواؤ تو اچھا ہے۔ تم نے کھلی جنگ کی ہے میرے ساتھ۔ جب تم ہمارے ارد گرد ہوگے، یہ جنگ جاری رہے گی بلکہ اور بھڑکتی جائے گی۔ بہرحال اس کا فیصلہ تو باہر جا کر ہونا ہے۔“

میں نے دارج کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس بارے میں بھی جمع خاطر رکھو۔ میں تمہاری زندگی میں کسی بھی طرح کی مداخلت نہیں کرنا چاہتا۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں سے نکلنے کے بعد تم اور تمہارے اہلِ خانہ کبھی میری شکل بھی نہ دیکھیں لیکن ایک بات تم سے ضرور کہنا چاہتا ہوں...... جاماجی کی بدنام ترین عورت ہانا وانی یہاں پاکستان میں موجود ہے۔ اس کی ایک ”ہٹ لسٹ“ ہے۔ اور اس ہٹ لسٹ سے تمہیں اور تمہاری مسز کو بھی اسی طرح خطرہ ہے جس طرح مجھے اور میرے ساتھیوں کو ہے۔ تمہیں ہر طرح سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔“

”اس ہمدردی اور زبردست خیر خواہی کا بہت بہت شکریہ۔“ دارج نے معنی خیز، زہرناک لہجے میں کہا اور اپنا بازو موڑ کر آنکھوں پر رکھ لیا۔ اس کا مطلب تھا کہ اب میں یہاں سے جا سکتا ہوں۔

”او کے۔“ میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

باہر آ کر میں نے قسطینا سے وہ تینوں موبائل فون لیے جو کل اس نے طیش کی حالت میں اپنے قبضے میں لیے تھے۔ ان میں دارج کا موبائل فون بھی تھا۔ اس کی قیمت دو ڈھائی لاکھ سے کم تو نہیں ہوگی۔ ان میں دارج کی والدہ اور تاجور کے موبائل فونز بھی تھے۔ میں نے یہ تینوں موبائل فونز سعید کے ہاتھ دارج کو بھجوا دیے۔ ظاہر ہے کہ اس تہ خانے میں یہ موبائل فونز بھی ہمارے موبائلز کی طرح بیکار تھے۔

قسطینا سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کیا بات ہوئی اُس سے؟“

”کچھ زیادہ نہیں قسطینا، اس بندے کی ذہنی صحت ٹھیک نہیں ہے۔ کسی وقت بالکل دیوانوں جیسی باتیں کرتا ہے۔ اس کا زیادہ تر غصہ تاجور پر ہی اترتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کم از کم جب تک ہم یہاں ہیں کوئی بدمزگی نہ ہو۔“

میں نے مختصراً قسطینا کو بتایا کہ دارج سے کیا باتیں ہوئی ہیں۔ بس اس میں سے معافی والی بات حذف کر دی۔

قسطینا گمبھیر لہجے میں بولی۔ ”شاہ زائب! میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تاجور یہاں اتنے بڑے عذاب میں مبتلا ہے۔ یہ شخص، شوہر تو کیا انسان کہلانے کے قابل بھی نہیں ہے۔ یہ بے چاری کس طرح پھنس گئی اس کے چنگل میں؟“

”بس جو ہونا تھا، وہ ہو گیا۔ ہمارے ہاں یہ مقولہ ہے کہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں، اس رشتے میں زیادہ کردار تاجور کے والد چوہدری دین محمد نے ہی ادا کیا ہے۔ وہ ایک طرح سے ضد میں آگئے تھے اور اس ضد کی ایک وجہ مستقبل کا خوف بھی ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنے طاقتور خانوادے کے لوگوں نے تاجور کا رشتہ مانگا تھا۔ دارج کی والدہ، رشتے داروں کی پوری پلٹن کے ساتھ بڑی بڑی گاڑیوں میں سکھیر اگاؤں کے مسلسل پھیرے لگاتی رہی۔“

قسطینا افسردہ انداز میں بولی۔ ”شاہ زائب! کیا اس وقت تمہارے ذہن میں نہیں آیا کہ تمہارے مرنے کی خبر ہر جگہ پھیل گئی ہے...... اور تاجور بھی یہی سمجھتی ہوگی کہ خدانخواستہ اب تم دنیا میں نہیں رہے ہو۔ کیا تم کو تاجور کی یہ غلط فہمی دور نہیں کرنی چاہیے تھی؟“

”بس حالات ہی ایسے تھے...... کہ میں تاجور تک نہ پہنچ سکا۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

میں نے یہ بات قسطینا سے پھر چھپا لی کہ تاجور کو میرے زندہ ہونے کا پتا چل چکا تھا، اس کے باوجود وہ سیف کی موت کے حوالے سے شبہے کا شکار ہوئی اور مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ درحقیقت میں نے یہ بات آج تک کسی کو بھی نہیں بتائی تھی...... اور نہ کبھی بتانا چاہتا تھا۔

قسطینا نے کہا۔ ”یہ شخص تو اس بے چاری کی زندگی جہنم بنا ڈالے گا۔ دیکھو، ابھی بدبخت بستر پر پڑا ہوا ہے، اگر ٹھیک ہو گیا تو کیا طوفان نہیں اٹھائے گا۔ شاہ زائب! ہمیں...... مدد کرنی چاہیے تاجور کی...... اسے اس بندے سے نجات دلانی چاہیے۔“

”مدد اس کی کی جاتی ہے قسطینا جو خود کو مصیبت میں سمجھتا ہو۔ وہ تو خود کو مصیبت میں سمجھتی ہی نہیں۔ دل و جان سے اس کو اپنا مجازی خدا مان کر بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کے خلاف چھوٹی سی بات بھی سننا پسند نہیں کرتی۔“

قسطینا نے آہ بھری۔ ”عورتوں کا یہی رویّہ ہے جو اکثر انہیں مردوں کے پاؤں کی جوتی بنا دیتا ہے۔ وہ اپنی زندگی برباد کرتی ہیں اور ان بچوں کی بھی جو اس مرد کے ذریعے ان کی کوکھ سے پیدا ہوتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے شاہ زائب! مجھ سے تو یہ سچویشن بالکل برداشت نہیں ہو رہی۔ تم کو بُرا لگے یا اچھا، لیکن میں تاجور کو سمجھانے کی کوشش ضرور کروں گی۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ کوئی بچے کی زنجیر بھی نہیں ہے۔ ابھی وہ بہت کچھ سوچ سکتی ہے۔“

میں نے قسطینا کو یہ نہیں بتایا کہ تاجور کے ”امید“ سے ہونے کے بارے میں بھی کچھ کہا جا رہا ہے۔ (ابھی اس بارے میں مجھے خود بھی حتمی طور پر کچھ پتا نہیں تھا)

اب اس شکستہ عمارت سے باہر نکلنے کا مرحلہ تھا۔ پرندے جوں کے توں وہاں موجود تھے۔ یہ شک بھی مسلسل موجود تھا کہ اس مرتبہ ان کی تعداد زیادہ ہے۔ قسطینا کے مزاج میں مہم جوئی بدرجہ اتم موجود تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ اور

فارس جان بھی میرے ساتھ باہر نکلیں۔ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''قسطینا! میرے خیال میں یہاں آپ کی ضرورت زیادہ ہے۔ آپ کی موجودگی میں تاجور کو بہت حوصلہ رہتا ہے۔''

''لیکن میں سمجھتی ہوں کہ تم ہمیشہ کی طرح خطرناک کام اپنے ذمے لینا چاہ رہے ہو۔''

''اس لیے لینا چاہ رہا ہوں کہ میں اور فخر یہاں کے ماحول اور لوگوں کو آپ سے بہتر سمجھتے ہیں۔ تاہم ضرورت پڑی تو ہم آپ کو باہر بلانے میں دیر نہیں کریں گے۔''

''تم کیا سمجھتے ہو شاہ زائب! اگر تاجور تمہارے ساتھ نہیں ہوگی تو یہ بپنا ٹائز ڈ طوطے تم پر حملہ نہیں کریں گے؟''

''یہ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن مجھے لگتا ہے کہ یہ اتنے مشتعل نہیں ہوں گے جتنے تاجور کو دیکھنے کے بعد ہوتے ہیں۔''

اچانک مجھے خاموش ہونا پڑا۔ قسطینا اور فارس وغیرہ بھی چونک گئے تھے۔ ہمیں ایک آواز سنائی دی تھی، جو اس سے پہلے ابھی تک ہم نے یہاں نہیں سنی تھی۔ یہ آواز درمیانی کمرے کے پاس سیڑھیوں کے قریب سے آئی تھی۔ اس نیم تاریک حصے میں لوہے کا ایک کھڑکی نما دروازہ تھا۔ کئی دیگر اشیا کی طرح اسے بھی زنگ لگا ہوا تھا۔ ہم نے ایک دو بار اسے کھولنے کی کوشش کی تھی لیکن یوں محسوس ہوا تھا کہ وہ جام ہے پھر اس کے سامنے ایک چٹائی بچھا کر زخمی آدم خاں کو ڈال دیا گیا تھا اور اس کھڑکی نما دروازے کی طرف سے توجہ ہٹ گئی تھی۔ اب یہ مدھم سی آواز اسی دروازے کے عقب سے ابھری تھی مگر یہ آواز دروازے کے پاس سے نہیں آئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ دروازے کے پیچھے کافی دور سے آئی ہے۔

''یہ کیا چکر ہے؟'' فارس جان نے سرسراتی آواز میں کہا۔

''یہ تو لگ رہا ہے کہ یہاں کوئی راستہ ہے۔'' میں نے بھی دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

ہم آدم خاں کو پھلانگ کر دروازے کے پاس پہنچے اور اس سے کان لگائے...... آواز یقیناً اسی دروازے کے عقب سے آرہی تھی اور کافی دور سے آرہی تھی۔ یہ کھٹ پٹ کی صدا تھی۔

''ایسا لگتا ہے، کوئی اس طرف آرہا ہے۔ یا شاید ایک سے زیادہ لوگ ہیں......'' میں نے خیال ظاہر کیا۔

پندرہ بیس سیکنڈ میں آہٹیں زیادہ واضح ہو گئیں۔ آواز گونجتی ہوئی محسوس ہوتی تھی جیسے کوئی طویل راہداری یا سرنگ ہو۔ ایک دم میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا میں نے قسطینا اور فارس سے کہا۔ ''میرا خیال ہے، ہمیں یہاں سے ہٹ جانا چاہیے جو آرہا ہے، اسے آنے دینا چاہیے۔''

فخر نے بھی میرے اس خیال کی تائید کی۔ ہم تہ خانے کے عقبی کمرے کی طرف بڑھے، یہی وہ کمرا تھا جو دارج نے سنبھالا ہوا تھا۔ دارج کی والدہ یاسمین بیگم دروازے میں کھڑی متجسس نظروں سے ہماری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ ''کیا ہوا؟'' اس نے حیرت آمیز خوف کے ساتھ پوچھا۔

''لگتا ہے کہ کچھ لوگ اس دروازے کی طرف آرہے ہیں۔'' میں نے مختصر جواب دیا اور سعید کھوکھر کو اشارہ کیا کہ وہ آدم خاں کو اس کی جگہ سے اٹھائے۔ آدم خاں دردکش گولیاں کھا کر غنودگی کی حالت میں سیڑھیوں کے نیچے ہی پڑا تھا۔ ہم نے پہلے آدم خاں کو اٹھایا پھر دونوں طرف سے سہارا دے کر چلایا اور دارج والے کمرے میں لے آئے...... آدم خاں کے پاؤں کا پنجہ بُری طرح زخمی تھا۔

اس دوران میں قسطینا اور فارس جان نے تیزی سے ہاتھ چلائے اور تہ خانے کے اندر سے ایسی وہ تمام اشیا ہٹا لیں جو ہماری یہاں موجودگی کی طرف اشارہ کرسکتی تھیں۔ آدم خان کو دارج والے کمرے میں لٹانے کے بعد میں نے اور فخر نے بھی قسطینا وغیرہ کا ساتھ دیا...... اور تہ خانے میں اپنی موجودگی کے نمایاں شواہد ختم کردیے۔

دارج کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ وہ اس بات پر پیچ و تاب کھا رہا تھا کہ ہم نے اس کی اجازت کے بغیر زخمی آدم خاں کو اس کے کمرے کے فرش پر لٹا دیا ہے اور مختلف اشیا سمیٹ کر کمرے میں لے آئے ہیں۔

وہ تڑخ کر بولا۔ ''کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے تم لوگوں پر...... جو حرامزادہ آرہا ہے یہاں...... اُسے آنے دو......''

میں نے اسے سمجھایا کہ ہم کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ پہلے ہمیں دیکھنا ہوگا کہ کون آرہا ہے۔ اور کیا وہ ایک ہے، یا ایک سے زیادہ ہیں۔ میں نے دروازہ اندر سے لاک کردیا اور وہاں موجود لیمپ بھی بجھا دیا۔ کمرے میں تاریکی پھیل گئی۔ سرنگ نما راستے سے ابھرنے والی آہٹیں اب کھڑکی نما آہنی دروازے کے بالکل قریب پہنچ چکی تھیں۔ ہم سب نے دم سادھ لیے۔ پوری توجہ آوازوں کی

طرف تھی۔ ڈری سہمی ہوئی تاجور اپنی ساس کے پہلو میں کھڑی تھی۔ چند لمحوں بعد یوں محسوس ہوا کہ آہٹیں معدوم ہوگئی ہیں۔

قسطینا سرگوشی میں بولی۔ ''ہو سکتا ہے کہ وہ کسی اور طرف چلا گیا ہو۔''

ابھی اس کا فقرہ مکمل ہوا ہی تھا کہ قفل میں چابی گھومنے کی مدھم آواز سنائی دی اور پھر ایک چرچراہٹ کے ساتھ آہنی دروازہ کھل گیا۔ اس کے ساتھ ہی احساس ہوا کہ ہمارے کمرے سے باہر روشنی موجود ہے۔ میں نے کی ہول سے آنکھ لگائی۔ نگاہ سیدھی اسی کھڑکی نما دروازے پر پڑی جو ہماری کوشش کے باوجود ٹس سے مس نہیں ہوا تھا۔ اب قفل کھلنے کے بعد وہ بہ آسانی کھل گیا تھا۔ مجھے کمرے میں ایک عجیب سا ہیولا نظر آیا۔ یہ جس شخص کا ہیولا تھا اس کا قد چھ فٹ کے لگ بھگ تھا اس کے ہاتھ میں ایک پورٹ ایبل لائٹ تھی۔ روشنی کا زاویہ تھوڑا سا تبدیل ہوا تو مجھے اس شخص کا حلیہ بھی دکھائی دیا۔ اس کے گھونگرالے لیکن بوسیدہ بال شانوں تک پہنچ رہے تھے۔ ناک اونچی اور لمبی تھی۔ نیم گرم موسم کے باوجود اس نے بھاری کوٹ پہن رکھا تھا...... نیچے سیاہ رنگ کی گرد آلود پینٹ تھی۔ استخوانی، لمبوترے چہرے والے اس شخص کی عمر تیس کے لگ بھگ نظر آتی تھی۔

اس نے پورٹ ایبل لائٹ کو چاروں طرف گھما کر جائزہ لیا، پھر لائٹ کو ایک طرف رکھ دیا اور ذرا اچھل کر کرشن کی مورتی کے پاس بوسیدہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ اب اس کا چہرہ زیادہ وضاحت سے میرے سامنے آیا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں نشے کی دھند سی بھری تھی۔ وہ اپنے حلیے سے بے پروا ایک سنکی سا شخص دکھائی دیا۔

قسطینا نے میرے کان میں سرگوشی کی اور اس کے سانس کی گرم ہوا میرے چہرے سے ٹکرائی۔ ''کون ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''آپ بھی دیکھ لیں۔''

قسطینا نے اپنے گھٹنے فرش پر ٹکا کر آنکھ کی ہول سے لگائی۔ باہر بیٹھے شخص نے جو پورٹ ایبل لائٹ ہال کمرے میں رکھی تھی اس کی کچھ روشنی ہمارے کمرے کے دروازے کی نچلی درز سے جھلک دکھا رہی تھی۔ ''کیا کر رہا ہے؟'' میں نے قسطینا سے پوچھا۔

''کاغذ پر رکھ کر کچھ سونگھ رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ہیروئن ہے...... یا اس جیسا کوئی نشہ۔''

''کوئی اسلحہ وغیرہ تو نظر نہیں آرہا؟'' فارس نے پوچھا۔

''بھاری کوٹ پہنا ہوا ہے، کچھ کہا نہیں جاسکتا۔'' قسطینا نے جوابی سرگوشی کی۔ پھر ذرا توقف سے بولی۔ ''ویسے مجھے لگتا ہے کہ کوئی اور بھی یہاں آئے گا۔ یہ اپنی گھڑی دیکھ رہا ہے۔''

مجھے بھی یہی اندیشہ تھا کہ یہ اکیلا نہیں ہوگا۔ شاید یہاں مزید آمد بھی ہوگی۔ قسطینا نے چابی کے سوراخ سے آنکھ ہٹائی تو فخر نے لگالی۔ ہماری ذرا سی آہٹ بھی اس شخص کو ہماری طرف متوجہ کرسکتی تھی اور فی الحال یہ ہرگز ہمارے حق میں نہیں تھا کہ وہ ہماری طرف متوجہ ہو جاتا۔ یوں لگتا تھا کہ نشے کی وجہ سے اس شخص کی حسیات کند ہیں۔ ورنہ ہماری موجودگی کی دو تین چھوٹی نشانیاں اب بھی اس کے آس پاس موجود تھیں۔

''وہ کھڑا ہو رہا ہے۔'' فخر نے مدھم سرگوشی کی۔

چند لمحے بعد اندازہ ہوا کہ اس نے ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھولا ہے اور اندر گیا ہے۔ پانچ دس سیکنڈ مزید گزرے، پھر ساتھ والے باتھ روم میں پانی گرنے اور کلیاں وغیرہ کرنے کی آوازیں آئیں پھر وہ باہر آگیا۔ یہ نازک موقع تھا وہ ہمارے والے کمرے کی طرف بھی آسکتا تھا...... اور اس کمرے کا دروازہ ہم نے اندر سے لاک کر رکھا تھا۔

پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ اس نے اپنی ترنگ میں کچھ گنگناتے ہوئے ہمارے والے کمرے کا دروازہ کھولنا چاہا۔ دو تین بار زور سے ہینڈل گھما کر دروازے کو دھکا دیا۔ وہ نہیں کھلا۔ اس نے دروازے کو ٹانگ ماری اور بڑبڑاتا ہوا ہال کمرے کی طرف چلا گیا۔ اس نے اس بات پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی کہ دروازہ کیوں نہیں کھلا۔ شاید اس نے سمجھا ہو کہ دروازہ جام ہے۔ اب اس کی آواز ہال کمرے کی طرف سے آرہی تھی۔ مختلف اشیا کو الٹ پلٹ رہا تھا۔

فخر نے سرگوشی کی۔ ''میرا تو خیال ہے کہ اس کو ابھی چھاپ لیا جائے، پھر پوچھا جائے کہ اور کون یہاں تشریف لانے والا ہے۔''

''لیکن اس میں خطرہ ہے کہ آنے والا یا آنے والے بدک جائیں۔'' قسطینا نے مستحکم لہجے میں رائے دی۔

''لیکن، یہ آیا کہاں سے ہے؟ کیا کوئی سرنگ اس مندر تک آتی ہے؟'' فارس جان نے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کوئی سرگوشی کرتا۔

سعید کو اچانک کھانسی آ گئی۔ اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر آواز دبانے کی کوشش کی تھی، پھر بھی اچھی خاصی آواز ہمارے کانوں تک پہنچی تھی۔

''سعید واش روم میں چلے جاؤ۔'' میں نے اسے دھکیلا۔

وہ منہ دبائے دبائے واش روم میں چلا گیا اور دروازہ بند کر لیا۔ فارس جان نے کی ہول سے آنکھ لگا رکھی تھی۔ قسطینا نے پوچھا۔ ''کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟''

''لگتا ہے کہ بچ بچاؤ ہو گیا ہے، آواز باہر نہیں گئی۔'' وہ دھیمی آواز میں بولا۔

یہی وقت تھا جب ہمیں ایک بار پھر کھڑکی نما دروازے کی طرف سے مدھم آہٹیں سنائی دینے لگیں۔ وہی گونجتی ہوئی سی آہٹیں جیسے کوئی کسی سرنگ میں چلتا ہوا آ رہا ہو۔ قریباً ایک منٹ بعد یہ چاپ جیسی آوازیں نمایاں ہو گئیں۔

میں نے کی ہول سے آنکھ لگائی۔ اندر آنے والی ایک جواں سال عورت تھی جس نے خود کو خانہ بدوشوں جیسی ایک بوسیدہ چادر میں چھپایا ہوا تھا۔ گھونگھٹ میں سے اس کا چہرہ واضح طور پر دکھائی نہیں دیا۔ اس کی جوتی بھی عام سی تھی۔ اندر آتے ہی جواں سال عورت نے آہنی چادر کا دروازہ اندر سے بولٹ کر دیا۔ پھر اس نے اپنی بوسیدہ، طویل چادر اتار کر ایک طرف رکھ دی۔ وہ صرف چادر اور جوتی کی حد تک ہی خانہ بدوش تھی۔ اس نے بڑا امیرانہ لباس پہن رکھا تھا۔ اس کی شکل بھی ہرگز خانہ بدوشوں جیسی نہیں تھی۔ ستواں ناک، بھرے بھرے گلابی رخسار، گداز ہونٹوں پر ہلکے رنگ کی لپ اسٹک، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور ریشمی بالوں کے نیچے جھمکے چمکتے ہوئے۔

لمبے گھونگرالے بالوں والا بے تابی سے آگے بڑھا اور اس نے جواں سال لڑکی کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ ''یہاں تو پریم کہانی شروع ہو گئی ہے۔'' میں نے فخر سے کہا جس نے اپنا سر میرے سر سے جوڑ رکھا تھا۔

''اتنی دیر کر دی؟'' خبطی نظر آنے والے شخص نے شکوہ کناں لہجے میں امیرانہ خدوخال والی لڑکی سے کہا۔

''کسی دن اتنی دیر ہو جانی ہے کہ پھر تمہیں میری لاش ملنے کی خبر ہی ملے گی۔'' لڑکی عجیب افسردہ لہجے میں بولی۔ گھونگرالے بالوں والے کے لیے اس کے اندر کوئی گرمجوشی نظر نہیں آتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کسی مجبوری کے تحت اس سے ملنے آئی ہے۔ وہ اس خبطی شخص کو انو کہہ کر بلا رہی تھی اور وہ اسے مدھو بالا کہہ رہا تھا۔ فدویانہ لہجے میں بولا ''جب تم لاش بننے کی بات کرتی ہو تو مجھے لگتا ہے کہ میں خود لاش بن گیا ہوں۔ تمہارے بغیر جی نہیں سکتا ہوں میں۔''

اس نے مدھو بالا کو کھینچ کر سینے سے لگا لیا اور اپنے پیار کا عملی مظاہرہ کرنے لگا...... کچھ دیر بعد لڑکی نے خود کو بمشکل اس کی بانہوں سے نکالا اور ایک مورتی کے چبوترے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''میرا گھر سے نکلنا روز بروز دشوار ہو رہا ہے جس دن ملکو جی کو پتا چل گیا کہ میں تم سے ملنے آتی ہوں وہ اسی وقت اور اسی جگہ میرے ٹوٹے کر دیں گے۔''

''کبھی پتا نہیں چلے گا میری جان۔'' وہ مدھو بالا کے ہاتھ اور گھٹنے چومتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو کیسا انتظام کیا ہے۔ کوئی پھڑک بھی نہیں سکتا اِس طرف۔ دن کے وقت بھی لوگ یہاں سے فاصلہ رکھ کر گزرتے ہیں۔ رات کی تو بات ہی اور ہے۔''

''لیکن مجھے گھر سے نکلتے اور سرنگ میں جاتے وقت تو کوئی دیکھ ہی سکتا ہے۔''

''کوئی نہیں دیکھے گا میری جند جان۔ اگر کوئی دیکھے گا بھی تو یہی سمجھے گا کہ کوئی چنگڑی جھاڑیوں کی طرف جا رہی ہے، باقی رہا ملکو جی...... تو وہ تو اپنی پہلی بیوی کے ساتھ لپٹ کر سویا رہتا ہے...... بلکہ اب بھی سویا ہوگا۔''

مدھو بالا نے کہا۔ ''نہیں ایسی بات نہیں انو! وہ بیمار ہے اس لیے ملکو جی اس کے پاس سوتے ہیں۔''

انو یعنی انور نے ذرا پیچھے ہٹ کر غور سے مدھو بالا کا سرخ وسپید چہرہ دیکھا اور بولا۔ ''کیا بات ہے مدھو! تمہاری سوچ ملکو کے بارے میں کچھ کچھ بدلتی جا رہی ہے۔''

''کچھ کچھ نہیں...... کافی زیادہ...... مجھے لگتا ہے کہ میں اپنے شوہر سے بہت زیادتی کر رہی ہوں۔ ہم بہت دور نکل گئے ہیں انو، اب ہمیں واپس آنا پڑے گا۔''

''سیدھی طرح کیوں نہیں کہتی ہو کہ مر جاؤ انو! میں تو کہتا ہوں کہ کہہ دو۔ اور پھر دیکھو کہ انو ایسا کرتا ہے یا نہیں؟'' اس نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک گراری دار چاقو نکالا اور اسے مدھو کے ہاتھ میں زبردستی تھمانے کی کوشش کی۔ ''واپسی کی باتیں کرنے سے بہتر ہے کہ مجھے اس سے مار دو۔ ابھی اسی وقت مار دو۔''

جب مدھو نامی اس لڑکی نے چاقو نہیں تھاما تو اس نے جوش اور وحشت کے عالم میں وہی چاقو اپنی کلائی میں اتار لیا۔ چاقو اندر تک دھنس گیا اور اس کی نوک دوسری طرف

سے نظر آنے لگی۔ لڑکی چلا کر رہ گئی۔ زخمی کلائی سے خون کے قطرے گر رہے تھے لیکن جب انو نے چاقو کلائی میں سے کھینچا تو خون کی دھاری بہہ نکلی۔ لڑکی نے جلدی سے الماری کے اندر سے ایک کپڑا نکالا، اسے پٹی کی صورت میں پھاڑا اور انو کی زخمی کلائی پر باندھ دیا۔ انو کے چہرے پر تکلیف کے کوئی آثار نہیں تھے۔ غالباً نشے نے اس کی برداشت میں غیر معمولی اضافہ کر رکھا تھا۔ لڑکی اب ڈری گئی تھی۔ اس لیے جذباتی انداز میں جب انو نے اسے دوبارہ بانہوں میں لیا تو وہ زیادہ مزاحمت نہیں کر سکی۔ اس کی خوب صورت کلائیوں میں بھاری طلائی چوڑیاں دمک رہی تھیں۔ گلے میں بھی سونے کی وزنی چین تھی جس میں دل کی شکل کا لاکٹ پرویا گیا تھا۔

کچھ ہی دیر میں ہال کمرے کا منظر نہایت رومان انگیز ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ مدھو نامی اس لڑکی نے پہلے اپنے جھمکے اتارے، پھر اپنے بال قیمتی کلپ سے آزاد کیے پھر خود کو بے لباس کرنے میں مصروف ہو گئی۔ جیسے وہ جانتی ہو کہ یہ ناخوشگوار فریضہ اسے انجام دینا ہی دینا ہے۔ وہ اپنے چہرے کو نارمل رکھنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن دھیان سے دیکھنے پر اس کا اندرونی اضطراب اس کی آنکھوں میں جھلک دکھاتا تھا۔

ابھی وہ اپنے بالائی لباس سے ہی مصروف تھی۔ میں نے کی ہول سے آنکھ ہٹائی اور فخر سے مخاطب ہو کر سرگوشی کی۔ ''میرا خیال ہے کہ اب ہمیں مداخلت کرنی چاہیے۔''

فارس اور فخر نے کی ہول سے کچھ نہیں دیکھا تھا لیکن آوازوں سے ہی انہیں اندر کے ''سنسنی خیز'' ماحول کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اندر والے ہرگز نہیں جانتے تھے کہ ان سے فقط چند فٹ کے فاصلے پر بند کمرے میں کئی افراد موجود ہیں اور ان کی ہر حرکت دیکھ اور سن رہے ہیں۔

میں نے اپنا بریٹا پسٹل نکالا اور تیزی سے دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ مدھو نامی وہ لڑکی خوف زدہ انداز میں چلائی۔ اس نے لپک کر خانہ بدوشوں والی وہ بوسیدہ چادر پکڑی جو ابھی تھوڑی دیر پہلے اتاری تھی اور اپنا بالائی جسم ڈھانپ لیا۔

اسی اثنا میں انو نامی اس شخص نے اپنا ہاتھ کوٹ کی اندرونی جیب کی طرف بڑھایا۔ یقیناً وہی چاقو نکالنا چاہتا تھا جس سے اس نے اپنی کلائی زخمی کی تھی۔ ''خبردار!'' میں نے بلند آواز سے کہا۔ ''گولی مار دوں گا۔''

وہ ٹھٹک کر رک گیا اور ہاتھ نیچے لٹکا دیا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں حیرت اور ہراس کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ یوں اچانک اس کی رنگین تنہائی درہم برہم ہو گی۔ بند کمرے کا دروازہ کھلے گا اور چار پانچ افراد اس کے سامنے آن کھڑے ہوں گے۔

''کون ہو تم؟'' وہ بمشکل بول پایا۔

''اصل بھوت۔'' فخر نے کہا۔ ''ہم یہ دیکھنے آئے ہیں کہ ایک ناہنجار، نقلی بھوت نے کس طرح ایک اچھے بھلے مندر کو ''بھوت بنگلا'' بنا رکھا ہے۔''

''تت...... تم یہاں گھسے کیسے ہو؟''

''اصلی بھوتوں کو کہیں گھسنے کے لیے رستے کی ضرورت نہیں ہوتی۔'' فخر نے اطمینان سے جواب دیا اور پھر اس سے کہا کہ وہ چند قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو اور اپنا کوٹ اتار کر فرش پر ڈال دے۔

مدھو نامی وہ لڑکی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ یقیناً اس کی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہاں ''چور کو مور'' کس طرح پڑ گئے ہیں۔ اس کی طرف ہماری توجہ کم تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اسے یہ غلط فہمی ہوئی کہ وہ یہاں سے فرار ہو سکتی ہے۔ وہ کھڑکی نما دروازے کے پاس ہی موجود تھی۔ اچانک اس نے دروازہ کھولا اور بھاگنے کی کوشش کی۔ میں نے لپک کر اسے اپنے ایک بازو میں جکڑ لیا۔ اس نے ہاتھ گھمایا اور میں نے اس کے ناخنوں سے اپنا چہرہ بمشکل بچایا۔ انو کو یہ موقع مناسب محسوس ہوا اور اس نے تڑپ کر قسطینا کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں وہی کھلا ہوا چاقو تھا۔ اس نے قسطینا کو یرغمال بنانے کی کوشش کی تھی۔ اس کا اقدام تو درست تھا لیکن انتخاب غلط تھا۔ اس جیسے پانچ چھ بھی مل کر آ جاتے تو شاید قسطینا پر ہاتھ نہ ڈال سکتے۔ جونہی وہ قسطینا کے عقب میں پہنچا، زمین اس کے پاؤں کے نیچے سے نکل گئی۔ قسطینا نے اسے گھما کر دیوار سے دے مارا تھا۔ چاقو اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور وہ اوندھے منہ ایک مورتی کے قدموں میں گرا۔ فارس جان نے اس کی گردن پر پاؤں رکھ دیا۔ دوسری طرف لڑکی بھی میری گرفت میں پوری طرح بے بس تھی۔

قریباً دس منٹ بعد انو دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ فارس جان نے پشت پر باندھ دیے تھے۔ ویسے یہ احتیاطاً ہی تھا، اس کا دم خم تو پہلے دو منٹ میں ہی رخصت ہو گیا تھا۔ وہ جو اس مندر کی خاموش گہرائی میں کچھ بہت ''جذبات انگیز'' گھڑیاں گزارنے والا تھا، اب زرد چہرے اور سکڑے ہوئے جسم کے ساتھ چپ

بھاپ بیٹھا تھا۔ اس کی تلاشی میں جو ذاتی اشیا برآمد ہوئی تھیں، ان میں ایک سستا سا موبائل فون بھی تھا لیکن یہ سستا موبائل فون ہمارے لیے بے حد اہم تھا (ہمارے اپنے موبائل فونز کی تمام چارجنگ اب ختم ہوچکی تھی) انو کے اس موبائل فون کے ذریعے ہم باہر نکلنے کے بعد اپنے ساتھیوں سے رابطہ کر سکتے تھے۔ لڑکی مدھو کے بارے میں ہمارا خیال یہ تھا کہ وہ شاید ہندو ہے لیکن وہ بھی مسلمان ہی تھی۔ اس کا اصل نام مدیحہ تھا جو بگڑ کر مدو بنا اور پھر انور کی ''عشق بازی'' نے اسے مدھو بالا بنا دیا۔ اب یہ مدو یا مدھو بالا بھی قسطینا کی نگرانی میں ڈری سہمی بیٹھی تھی اور اٹک اٹک کر ہمارے سوالوں کے جواب دے رہی تھی۔

جس راستے سے مدھو اندر آئی تھی، وہ بھی ہم نے دیکھ لیا تھا اور حیرت کا شکار ہوئے تھے۔ ہمارے قیافے کے عین مطابق یہ ایک قدیم سرنگ تھی اور اس کی لمبائی کم و بیش ایک فرلانگ تھی۔ یہ حیران کن لمبائی تھی، تاہم کشادگی کے لحاظ سے سرنگ متاثر کن نہیں تھی۔ یہ بمشکل پانچ فٹ قطر کی ہوگی اور اس میں جھک کر چلنا پڑتا تھا۔

میں نے مدھو سے پوچھا۔ ''سرنگ کا داخلی دروازہ کس جگہ پر ہے؟''

وہ ہاتھوں کی حنائی انگلیاں مروڑتے ہوئے بولی۔ ''وہ بھی ایک چھوٹا سا کھنڈر ہے۔ کہتے ہیں کہ پچھلے وقتوں میں وہاں کوئی شمشان گھاٹ تھا۔ وہاں چھوٹی اینٹوں کی بنی ہوئی ایک کال کوٹھری ہے۔ وہیں پر اس کا دروازہ ہے۔''

''تو جب تم اپنے گھر سے نکل کر اس کال کوٹھری میں گھستی ہو تو کوئی دیکھتا نہیں؟''

''نہیں۔'' اس نے مختصر جواب دیا اور خاموش ہو گئی۔ پھر چند سیکنڈ بعد بات کو مکمل کرتے ہوئے بولی۔ ''اس نے وہاں بھی کچھ کیا ہوا ہے۔ کال کوٹھری کے پاس سے رات کو آوازیں آتی ہیں اور روشنی چمکتی ہے۔ ڈر کے مارے وہاں بھی کوئی نہیں آتا۔''

یہ پوری بات اب ہماری سمجھ میں آرہی تھی جس طرح یہاں اس مندر سے خوفناک آوازیں بلند ہوتی تھیں، وہاں شمشان گھاٹ کی کسی کوٹھری سے بھی آوازیں آتی تھیں اور روشنی کے جھماکے ہوتے تھے۔ دونوں جگہوں کے درمیان یہ قریباً ایک فرلانگ لمبی سرنگ تھی۔

''یہ ملکو جی کون ہے؟ تمہارے شوہر کا نام تو نہیں؟'' فخر نے پوچھا۔

ذرا تذبذب کے بعد مدھو نے اثبات میں سر ہلایا۔

''پچھلے سال ہماری شادی ہوئی تھی۔''

''شادی شدہ ہونے کے باوجود تم اپنے اس پرانے شناسا سے ملنے آتی ہو؟'' فارس جان نے کڑے لہجے میں پوچھا۔

وہ ایک بار پھر آنسو بہانے لگی اور ہم سے التجا کرنے لگی کہ ہم اسے یہاں سے جانے دیں۔ اس کے گھر والوں کو پتا چل گیا تو اس کے لیے قیامت آجائے گی۔

فارس جان نے نشئی انور عرف انو کے کولہے پر ٹھوکر رسید کی اور کہا۔ ''اوئے خدائی خوار! تم کیوں مجبور کرتا تھا اس لڑکی کو اس طرح سے۔ تمہارا اپنا بھی تو کوئی ماں بہن ہوگا؟''

انو نے اپنے چہرے پر جھولتے ہوئے بالوں کے عقب سے فارس جان کو گھورا اور عجیب لہجے میں بولا۔ ''میں اس کو مجبور نہیں کرتا۔ میری محبت اس کو مجبور کرتی ہے۔ یہ جانتی ہے کہ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہوں گا۔''

''اموشنل بلیک میلنگ۔'' فخر نے میری طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

سنکی مزاج انو نے ایک بار پھر واویلا شروع کر دیا۔ خود کو زخمی کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ فارس جان نے تین چار دو ہتڑ اس کے سر پر رسید کیے اور چیخ کر کہا۔ ''تم ذرا چھری تلے سانس لو۔ ام تھوڑی دیر میں تمہیں پوت (فوت) ہونے کا بڑا آسان موقع پر اہم کرے گا پھر دیکھے گا کہ تم اس موقع سے پائدہ اٹھاتا ہے یا نہیں۔''

فارس جان کے غصیلے انداز نے انو کو کچھ ٹھنڈا کر دیا۔ کچھ دیر بعد وہ ہمارے سوالوں کے جواب بھی دینے لگا۔ اس سے اور امیرانہ خدوخال والی مدیحہ عرف مدھو سے جو کچھ معلوم ہوا اس کا خلاصہ یوں ہے۔

انور عرف انو ایک الیکٹریشن تھا۔ آج سے تین چار سال پہلے وہ اچھا بھلا خوبرو جوان تھا۔ مدیحہ ایک مقامی زمیندار کی بیٹی تھی۔ قصبے میں شادی بیاہ کے موقعوں پر انو ہی لائٹنگ وغیرہ کا انتظام کرتا تھا۔ مدیحہ کی ایک سہیلی کی شادی کے موقع پر انو حویلی میں لائٹنگ کرنے کے لیے آیا۔ وہیں پر مدیحہ عرف مدھو سے اس کی نگاہ لڑ گئی۔ وہ کھاتے پیتے گھرانے کی تھی، انو قصبے میں ایک معمولی دکان چلاتا تھا مگر قانون کی طرح شاید جوانی بھی اندھی ہوتی ہے۔ وہ جب اپنے راستے چنتی ہے تو ساری مصلحتیں بالائے طاق رکھ دیتی ہے۔ انو اور مدھو کے سلسلے میں بھی یہی کچھ ہوا۔ تمام رکاوٹوں اور پابندیوں کے باوجود ان کا تعلق آگے بڑھتا رہا۔ موقع

ملنے پر وہ ایک دوسرے سے ملتے بھی رہے اور عہد و پیماں کرتے رہے۔ لیکن آخر وہی ہوا جو ایسے موقعوں پر اکثر ہو جاتا ہے۔ سماج دیوار بنا، انو کوشش کے باوجود اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہوسکا اور وہ ترقی نہ کرسکا جو کرنا چاہتا تھا۔ مدھو کی شادی قریبی قصبے کی ایک ہم پلہ فیملی میں ہوگئی، اور دونوں پریمی دکھ کے آنسو بہا کر رہ گئے۔

بات یہیں تک رہ جاتی تو ٹھیک تھی، مگر انو نے شادی کے بعد بھی مدھو کی تمنا کو خیر باد نہیں کہا۔ اس نے خود کو ہیروئن اور راکٹس کے نشے میں ڈبو دیا اور مجنوں بن کر گلیوں میں پھرنے لگا۔ دوسری طرف مدھو کو بھی اپنی ازدواجی زندگی میں وہ توجہ اور راحت نہ مل سکی جس کی وہ آرزو رکھتی تھی۔ اس پر اور اس کے گھر والوں پر یہ انکشاف ہوا کہ مدھو کا خاوند ملکو پہلے سے شادی شدہ تھا اور اس کی ایک بیوی موجود تھی۔ یہ وہ حالات تھے جن میں انو اور مدھو کے تعلق کے بجھے ہوئے چراغ میں پھر سے روشنی پیدا ہونا شروع ہو گئی۔ مدھو سے انو کی بربادی دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ اس نے ایک موقع نکالا اور انو سے مل کر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ان کی اس ملاقات نے اس کہانی کا دوسرا باب شروع کر دیا۔ ان کے درمیان پھر سے کبھی کبھی موبائل فون پر رابطہ ہونے لگا۔ اس کے بعد دو تین خفیہ ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ انو کی نیم دیوانگی اور غیر معمولی جذباتیت مدھو کو اپنے ساتھ بہا کر لے گئی۔ مدھو کے نہ چاہنے کے باوجود انور عرف انو سے اس کا ناجائز تعلق پیدا ہو گیا۔ انو چاہتا تھا کہ مدھو سے مستقل طور پر اپنی رنگین ملاقاتیں جاری رکھنے کے لیے اسے ایک نہایت محفوظ ٹھکانا میسر آجائے۔ وہ ایک ماسٹر الیکٹریشن تھا۔ وہ اس شکستہ مندر اور یہاں موجود سرنگ سے بھی اچھی طرح آگاہ تھا۔ سرنگ کے دوسرے سرے سے قصبے اور مدھو کے سسرالی گھر کا فاصلہ دو سو میٹر سے زیادہ نہیں تھا۔ انو کو یہ بھی معلوم تھا کہ اس کے علاقے کے لوگ کتنے توہم پرست ہیں۔ اس نے ایک پلان بنایا اور اس مندر کے تین چار گوشوں میں بڑی پاور کے ''ایمپلی فائرز'' نصب کر دیے۔ اس کے علاوہ کچھ ایسی لائٹس بھی یہاں بڑی صفائی سے چھپا دیں جن کے دودھیا جھماکے دور سے دیکھے جا سکتے تھے۔ اس سسٹم کو دو پاورفل بیٹریوں کے ساتھ منسلک کر دیا اور ایک ٹائمر بھی لگا دیا، جو ہر چوتھے پانچویں روز اس سسٹم کو آن کرتا تھا...... اس کے نتیجے میں آوازیں اور روشنی پیدا ہوتی تھی۔ یہی کچھ چھوٹے پیمانے پر شمشان گھاٹ والی کال کوٹھری میں بھی نصب تھا۔ علاقے کے لوگ واقعی اپنی توہم پرستی اور سادہ لوحی میں حد سے گزرے ہوئے تھے۔ وہ ان دونوں جگہوں کو پہلے ہی شک کی نظروں سے دیکھتے تھے، اب بالکل ہی آسیب زدہ سمجھ چکے تھے...... یہاں تک کہ اس خوف زدگی کا شکار مقامی پولیس اہلکار بھی تھے...... شروع میں ہم یہ سمجھے تھے کہ شاید کسی جرائم پیشہ گروہ نے اس مندر کو آسیب زدہ بنا رکھا ہے لیکن یہ ایک رومانی کہانی کے تانے بانے نکلے تھے۔

قسطینا بے حد ہمدردی کی نگاہوں سے مدھو کو دیکھ رہی تھی۔ تاجور کی بھی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔ وہ بھی کافی حد تک جان چکی تھی کہ اگر ہماری مداخلت نہ ہوتی تو یہاں کس طرح کی ''واہیاتی'' وجود میں آنا تھی۔ قسطینا نے مجھ سے کہا کہ میں اس لڑکی سے موجودہ صورتِ حال کے بارے میں پوچھوں۔ اس میں کس حد تک اس کی مرضی شامل ہے۔

میں جانتا تھا کہ مدیحہ عرف مدھو اس سنکی انو کے سامنے ٹھیک سے کوئی جواب بھی نہیں دے سکے گی۔ میں اُسے ساتھ والے کمرے میں لے گیا۔ قسطینا بھی ساتھ ہی آئی۔ میں نے مدھو سے پوچھا۔ ''تم کسی اچھے گھرانے سے لگتی ہو۔ کیوں اس خبطی کے پیچھے اپنی ازدواجی زندگی برباد کر رہی ہو۔ یہ محبت نہیں ہوس ہے اور اس ہوس کاری میں تم اس شخص کا ساتھ دے رہی ہو۔''

''میں نہیں دے رہی ساتھ...... میں نہیں دے رہی۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔ ''شروع میں مجھ سے...... غلطی ضرور ہوئی ہے...... میں مانتی ہوں اپنی غلطی...... لیکن اب حالات بدل گئے ہیں۔ میں سمجھ گئی ہوں کہ...... میرا شوہر...... بُرا نہیں تھا...... اس کی کچھ...... مجبوریاں تھیں...... دوسری طرف...... یہ بھی سمجھ گئی ہوں کہ...... یہ اسی طرح مجھے اپنے مرنے کی دھمکیاں دیتا رہے گا...... اور...... اور مجھے خراب کرتا رہے گا۔''

''کیا دھمکیاں دیتا ہے یہ؟''

''یہی کہ اگر میں نے اس سے ملنا چھوڑ دیا تو وہ میرے گھر کے سامنے خود کو آگ لگا کر مر جائے گا۔ اور ساری دنیا کو بتائے گا کہ کیوں مر رہا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ابھی تم نے بتایا ہے کہ تمہارا شوہر اتنا برا نہیں تھا، جتنا تم اسے سمجھتی رہی ہو۔ اس کا کیا مطلب ہے؟''

اس نے جواب میں جو کچھ بتایا اس سے پتا چلا کہ کچھ باتیں آہستہ آہستہ کھلی ہیں۔ اس کے شوہر (ملکو جی) کی پہلی بیوی شادی کے وقت بھی بیمار تھی۔ خاندانی دباؤ کی وجہ سے

اس کے شوہر کو یہ شادی کرنا پڑی تھی۔ تب خیال تھا کہ شاید اس کی حالت بہتر ہو جائے گی مگر شادی کے بعد وہ مزید بیمار ہو گئی۔ اس نے زیادہ وقت لاہور کے ایک اسپتال میں ہی گزارا اور ملکو ایک شوہر کی حیثیت سے تین سال تک اس کی تیمارداری کرتا رہا۔ اب اپنی بوڑھی اور قریب المرگ والدہ کی شدید خواہش پر ملکو احمد نے یہ دوسری شادی کی تھی۔

قسطینا نے میرے ذریعے مدھو سے یہ سوال کیا کہ یہ انو کیا شروع سے نشے باز تھا یا اب اس لت کا شکار ہوا ہے؟

مدھو بولی۔ ''جس طرح آہستہ آہستہ میرے شوہر کا رویہ مجھ سے اچھا ہوتا گیا ہے اور مجھے ان کی مجبوریوں کا بھی پتا چلتا گیا ہے...... اسی طرح آہستہ آہستہ انو کا رویہ مجھ سے خراب ہوتا گیا ہے اور مجھے یہ بھی پتا چلتا گیا ہے کہ یہ بُری طرح نشے میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہ پاؤڈر کے علاوہ نشے کے راکٹ بھی کھاتا ہے...... م...... میں...... مجبور ہو کے اس کے پاس آتی ہوں۔ اب مجھے...... اس سے ڈر لگنے لگا ہے۔'' وہ سسک اٹھی۔

''گھبراؤ نہیں۔ ہم تمہارا یہ ڈر ختم کر دیں گے۔'' میں نے اسے تسلی دی پھر میری نگاہ ہال کمرے کی ان مورتیوں پر پڑی جن پر کراس کے سیاہ نشان لگائے گئے تھے۔

میں نے اس بارے میں مدھو سے پوچھا تو وہ بولی۔

''یہ بھی اسی چالباز کے ڈرامے ہیں۔ جب مندر سے عورتوں کے رونے اور بین کرنے کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں تو ایک روز یہ ایک سادھو کو لے کر یہاں آیا۔ قصبے کے کچھ لوگ بھی ساتھ تھے۔ سادھو نے کچھ مورتیوں پر کالے نشان لگا دیے۔ سادھو کا خیال تھا کہ شاید یہ آوازیں ان مورتیوں کی وجہ سے آتی ہیں۔ سادھو نے کہا کہ اب یہ رام دوارا نہیں راکھشس دوارا بن چکا ہے۔ عام لوگوں کو یہاں سے دور رہنا چاہیے۔ یہی چاہتا تھا انو بھی۔'' مدھو نے سر جھکا کر کہا اور اس کی آنکھوں سے دو موٹے آنسو ڈھلک کر اس کی جھولی میں آن گرے۔

ہم نے باہمی مشورہ کیا۔ یہ جگہ چھوڑنے سے پہلے ہم اس پھنسی ہوئی شادی شدہ لڑکی کی مصیبت آسان کرنا چاہتے تھے۔ ایک طریقہ تو یہ تھا کہ آدم خاں کی طرح اس انو کو بھی اپنے ساتھ ہی لے جائیں اور پھر اس کے بارے میں اطمینان سے سوچا جائے۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ اسے بُری طرح خوف زدہ کر کے یہ باور کرا دیا جائے کہ اگر اب اس نے مدیحہ کی زندگی میں کسی طرح کی مداخلت کی تو اس کا حشر ہم خراب کر دیں گے۔ آخری صورت...... یقیناً آخری ہی تھی کہ اسے گولی مار کر ٹھنڈا کر دیا جاتا۔

بہرطور ان تینوں صورتوں کی نوبت نہیں آئی... جس کا ہم نے سوچا بھی نہیں تھا۔ تیس بتیس سالہ انو توقع سے زیادہ غصیلا اور پھرتیلا نکلا۔ جونہی اس نے... دھیان بٹا ہوا دیکھا، وہ تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھا... راستے میں سعید کھوکھر تھا۔ اس نے اپنے سر کی طوفانی... سعید کے چہرے پر لگائی اور ادھ کھلے دروازے سے... سرنگ میں داخل ہو گیا۔

''رک جاؤ...... رک جاؤ......'' میں اور فخر ایک... چلّائے اور اس کے پیچھے لپکے۔

ہمیں جھک کر بھاگنا پڑ رہا تھا، وہ بھی جھک کر... رہا تھا۔ وہ ہمیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے ہاتھ... تک پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ رک جاؤ...... نہیں تو... مار دیں گے۔'' میں نے اسے آخری وارننگ دی اور... نکال لیا۔

گونجتی آوازوں سے پتا چل رہا تھا کہ وہ... بھاگ رہا ہے۔ اس کا مدھم سا ہیولا بھی دکھائی دے رہا... وہ دوسرے دروازے تک پہنچ جاتا تو پھر اسے ڈھو... مشکل تھا۔ میں نے پسٹل سیدھا کیا اور بھاگتے ہو... اندازے سے اس کی ٹانگوں کو نشانہ بنایا۔ میں نے اوپر... تین فائر کیے۔ اس کے گرنے کی آواز آئی اور کربناک... سنائی دی۔ ہم جھک کر دوڑتے ہوئے اس کے پاس پہنچے... ٹارچ کی روشنی میں سرنگ کے اندر ہی چند زینے نظر آ... ان زینوں سے آگے سرنگ آٹھ دس فٹ مزید گہرائی... چلی گئی تھی۔ بھاگتے بھاگتے انو ان زینوں سے لڑھکا تو... فخر نے ٹارچ کی روشنی اس کے چہرے پر ڈالی۔ اس کا... اور پیشانی بُری طرح زخمی تھے۔ لمبے بال بھی خون میں... ہوئے تھے۔ ایک لمحے میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کا... اس کی کھوپڑی سے باہر آ گیا ہے۔ وہ مر چکا تھا۔ ہاتھ... بندھے ہونے کی وجہ سے وہ گرتے وقت اپنا چہرہ نہیں بچا... تھا اور چوٹ غیر معمولی شدت اختیار کر گئی تھی۔

سرنگ میں گونجتی ہوئی آوازوں سے پتا چلتا تھا کہ فارس اور قسطینا وغیرہ بھی ہمارے پیچھے آ رہے ہیں۔

''کمال ہے شاہ زیب! تم سے ایسی توقع نہیں تھی۔'' فخر نے ٹارچ کا روشن دائرہ انو کے جسم پر سرکاتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''تم نے تین فائر کیے اور ایک بھی محترم انو صاحب کو نہیں لگا۔''

''ٹھیک کہہ رہا تھا۔ نیم تاریکی میں چلائی ہوئی گولیوں میں سے کسی نے بھی انو کے جسم کو نہیں چھوا تھا۔ وہ گرنے اور سر پر چوٹ لگنے کی وجہ سے مرا تھا۔

میں نے کہا۔ ''چلو یہ بھی ٹھیک ہی ہوا۔ اس کی لاش کا بندوبست نہیں کرنا پڑے گا۔ یہی سمجھا جائے گا کہ یہ جانتے بوجھتے اس خطرناک جگہ میں گھسا اور بھوتوں کی مجلسِ عاملہ نے اسے موت کی سزا سنا دی۔''

وہ بولا۔ ''میرے ساتھ رہنے کا یہ فائدہ ہوا ہے کہ تمہاری حسِ ظرافت خطرناک موقعوں پر بھی پھڑک اٹھتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ تمہاری وجہ سے نہیں، یہ پہلوان خشت کی صحبت کا نتیجہ ہے۔ اس کے دو غلے محاوروں اور گلابی اردو والے شعروں نے کافی افاقہ دیا ہے میری سنجیدگی کو۔''

اسی دوران میں قسطینا اور سعید کھوکھر بھی وہاں پہنچ گئے۔ فارس جان نے اچھا کیا تھا کہ وہاں مندر کے ہال کمرے میں دارج، تاجور اور آدم خاں وغیرہ کے پاس ہی رہا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں سعید کا چہرہ زخمی نظر آیا۔ دانتوں سے بھی خون رس رہا تھا۔ یہ اس ٹکر کا نتیجہ تھا جو انو نے بھاگتے وقت سعید کے چہرے پر رسید کی تھی۔ انو کی بے حرکت لاش نے سب کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ میں نے قسطینا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''اس لڑکی کو انو کے مرنے کی خبر نہیں ملنی چاہیے۔ بہت ڈر جائے گی۔ فی الحال اسے یہی بتاتے ہیں کہ وہ بچ کر بھاگ گیا ہے۔ اسے تسلی دے کر واپس بھیج دیتے ہیں۔''

''لیکن وہ یہیں سے تو گزر کر جائے گی۔'' قسطینا نے کہا۔ ''اس کی لاش کو دائیں بائیں کر دیا جائے۔''

ہم نے لاش کو اٹھا کر ایک سائڈ پر کر دیا اور اوپر کچھ خشک جھاڑ جھنکاڑ ڈال دیے۔ ویسے بھی اسے اندھیرے سے گزر کر جانا تھا، وہ لاش نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ہم نے سعید کھوکھر کو بھی یہ بات اچھی طرح سمجھا دی کہ مدھو نامی اس لڑکی کو انو کی اس ناگہانی موت سے بے خبر رکھنا ہے۔

☆☆☆

یہ رات کے قریباً دو بجے کا عمل تھا، مدھو سرنگ کے راستے کال کوٹھری میں پہنچ گئی تھی اور وہاں سے واپس اپنی حویلی میں چلی گئی تھی۔ انور اور مدھو کی یہ کہانی جتنی تیزی سے ہمارے سامنے آئی تھی اتنی ہی تیزی سے اپنا سفر ختم کر کے اپنے اختتام کو پہنچ گئی تھی، میں دل میں دعا کر رہا تھا کہ یہ واقعی اپنے اختتام کو پہنچ گئی ہو اور مدھو اس کے ''آفٹر شاکس'' سے محفوظ رہے۔ امید یہی تھی کہ اگر وہ خود اپنی زبان نہیں کھولے گی تو اس کی پردہ داری برقرار رہے گی۔ مندر میں مدھو کی آمد کے جو چھوٹے موٹے آثار نظر آئے، وہ میں نے ختم کر دیے تھے...... فخر نے انو کی لاش اٹھا کر مندر کے ہال کمرے میں اس طرح ڈال دی کہ اس کا سر ایک مورتی کے قدموں میں رکھ دیا۔ یہ وہی مورتی تھی جس میں ایک ہوس کار نے ایک دوشیزہ کو اپنے پنجوں میں جکڑ رکھا تھا۔ اس کا بالائی دھڑ ٹائیگر کا اور نچلا انسان کا تھا۔ اس کے جسم پر سیاہ کراس تھا اور منہ پر ٹیپ چڑھی ہوئی تھی۔

اب ہم یہاں سے نکلنے کے لیے تیار تھے۔ امید یہی تھی کہ شکستہ مندر سے باہر مسلسل ہمارا پہرا دینے والے خونی پرندے اس بدلی ہوئی صورتِ حال سے بے خبر رہیں گے اور ہم شمشان گھاٹ کی جانب سے راہِ فرار اختیار کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ پھر بھی اندیشے ہم سب کے ذہنوں میں موجود تھے۔ انور اور مدھو سے سوال جواب کرتے ہوئے ہم نے ان سے باہر کے حالات کے بارے میں بھی پوچھ گچھ کی تھی۔ ان کے جوابات سے اس بات کی تصدیق ہوئی تھی کہ علاقے میں پولیس کی نقل و حرکت بہت بڑھی ہوئی ہے۔ کچھ ایسے لوگوں کو ڈھونڈا جا رہا ہے جو ایک وین اور ایک بڑی جیپ میں یہاں آئے تھے اور اب مل نہیں رہے۔ مقامی پولیس نے اس سلسلے میں کچھ مشکوک لوگوں کو گرفتار بھی کر رکھا تھا۔ ہمیں باہر نکلنے کی پلاننگ کرتے ہوئے دیکھا تو دارج کی والدہ نے کہا۔ ''سب سے اہم مسئلہ تو یہ ہے کہ گھاٹ کی طرف ہمارے پاس کوئی سواری نہیں ہے۔ تم سب کو پتا ہے کہ دارج چل نہیں سکتا۔ آدم خاں بھی زخمی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''آپ ذرا حوصلہ رکھو۔ ہمارا ایسا کوئی پروگرام نہیں کہ سرنگ سے نکل کر بھاگ کھڑے ہوں گے۔ ہم سب باہر نہیں نکل رہے۔ پہلے ہم میں سے دو بندے باہر نکلیں گے، انو والے موبائل فون کے ذریعے داؤد بھاؤ وغیرہ سے رابطے کی کوشش کریں گے۔ رابطہ ہو جانے پر باقی کا طریقہ کار طے کیا جائے گا۔''

''اور پہلے باہر کون کون نکلے گا؟'' دارج نے ہمیشہ کی طرح بگڑے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''یہ تمہارے نہیں، ہمارے سوچنے کی بات ہے اور بے فکر رہو کہ ہم تمہیں یا تمہارے آدم خاں کو کسی طرح کی چالاکی کا کوئی موقع نہیں دیں گے۔'' فارس جان نے اسے بہ زبان انگلش کڑے لہجے میں جواب دیا۔

دارج کا رنگ سرخ اور اس کے پہلو میں کھڑی تاجور کا

زرد ہو گیا لیکن اس سے پہلے کہ دارج پھر گرجنا برسنا شروع کر دیتا۔ میں نے اسے سنبھال لیا۔ اس کا بالائی دھڑ غصے کی وجہ سے بے ساختہ بل کھاتا جا رہا تھا۔ یہ وہ شخص تھا جس کے ایک اشارے پر درجنوں خادم پیشہ حرکت میں آجاتے تھے۔ آج وہ یہاں سے ہلنے کے لیے بھی ہماری مدد کا محتاج تھا۔

قسطینا بھی میرے اور فخر کے ساتھ باہر جانا چاہتی تھی۔ میں نے سمجھانے والے انداز میں اس سے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ آپ کو بہت جلد یہاں ایڈونچر کے بہت سے مواقع ملنے والے ہیں۔ فی الحال ہم دونوں کو جانے دیجیے۔ آپ یہاں رک کر اس آدم خاں پر نظر رکھیے۔''

اس نے اپنے بوائے کٹ بالوں میں انگلیاں چلا کر انہیں پیشانی سے پیچھے ہٹایا اور ''اوکے'' کہہ کر ایک طرف بیٹھ گئی۔ اس کے دونوں محافظ بس اسی کی زبان سمجھتے تھے اور ہمہ وقت اس کے اشارے کے منتظر رہتے تھے۔

فارس اور سعید ہمارے ساتھ چل پڑے۔ ان کو سرنگ سے باہر نہیں نکلنا تھا، اس کے دہانے یعنی داخلی دروازے کے قریب کھڑے ہو کر ہماری طرف سے کسی بھی اطلاع کا انتظار کرنا تھا۔ ہم ٹارچ کی روشنی کا سہارا لے کر اس تنگ سرنگ میں آگے بڑھنے لگے۔ یہ نانک چندی اینٹوں سے بنائی گئی تھی۔ بے شک یہ قدیم سرنگ تھی مگر سیوریج کے کسی بڑے پائپ کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ کہیں کہیں جالے لگے ہوئے تھے اور اینٹیں اکھڑی ہوئی تھیں۔ ہم اس جگہ سے آگے بڑھ گئے جہاں انور عرف انو گر کر راہی عدم ہوا تھا۔ کم و بیش ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کر کے ہم نے دس بارہ زینے طے کیے اور شمشان گھاٹ والے دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔

میں نے اپنا پستول ہاتھ میں لے لیا تھا۔ فخر بھی چھوٹی نال والی آٹومیٹک گن کے ساتھ پوری طرح الرٹ تھا۔ ہم نے کال کوٹھری والا دروازہ کھولا اور باہر نکل آئے۔ آج کئی روز بعد کھلی ہوا میں سانس لینے کا موقع ملا تھا۔ تاریک آسمان پر ستاروں کے جھرمٹ تھے اور ان کی مدھم روشنی میں اس بالکل مختصر سے کھنڈر کے خدوخال نظر آتے تھے۔ یہ ساری جگہ لمبی جنگلی گھاس اور جھاڑیوں میں چھپی ہوئی تھی۔ میں اور فخر مسلسل آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ہمیں جو سب سے پہلا خطرہ درپیش تھا، وہ یہی تھا کہ مندر کی طرف موجود جنونی پرندے پرواز کرتے ہوئے اس کھنڈر کی طرف آجائیں اور ہم پر جھپٹ پڑیں۔

ہم تین چار منٹ تک پوری طرح الرٹ ...

ہمارے کسی اندیشے نے حقیقت کا روپ نہیں دھارا ...

دیکھو شاہ زیب۔'' فخر نے ایک جانب اشارہ کیا۔

کچھ گھنی جھاڑیوں کے اندر سے چند روشنیاں ...

آرہی تھیں۔ یہ اسی قصبے کے مکانات تھے، جہاں سے ...

کر مدھو، اپنے پرانے عاشق انو سے ملنے آتی تھی ...

سے قصبے کا فاصلہ ڈیڑھ دو سو میٹر سے زیادہ نہیں تھا۔

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ انو والا موبائل ...

کیا۔ اسکرین پر سگنل نمودار ہو گئے۔ یہ بہت خوش ...

تھا۔ سب سے پہلے میں نے داؤد بھاؤ کا پرائیویٹ ...

ڈائل کیا...... بیل جانا شروع ہو گئی۔ یہ ہمارے ...

بڑے اہم لمحات تھے۔ بیل جاتی رہی لیکن کال ریسیو ...

ہو سکی۔ داؤد بھاؤ رات دیر تک جاگتا تھا لیکن اب ...

بج چکے تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ فون کو ''سائلنٹ'' ...

کر کے سو گیا ہے۔ ''دوبارہ ٹرائی کرو۔'' فخر نے ...

سے کہا۔ میری طرح اس کی نگاہیں بھی مسلسل قرب ...

کا جائزہ لے رہی تھیں۔

میں نے دوبارہ ٹرائی کیا...... اور پھر تیسری ...

چوتھی بار بھی کال ریسیو نہیں ہو سکی۔ داؤد بھاؤ ...

کارندوں میں سے صرف بنارس کا نمبر مجھے زبانی یاد ...

''کیا خیال ہے فخر، بنارس کے نمبر پر کوشش کریں؟'' ...

نے مشورہ طلب کیا۔

فخر نے میری بات کی تائید کی۔ میں نے دھڑکتے ...

کے ساتھ بنارس کا نمبر ڈائل کیا۔ بیل جانا شروع ہوئی اور ...

کوتاہ قد بنارس کی بوجھل آواز کانوں سے ٹکرائی۔ ''ہیلو کون؟'' ...

شکر کا مقام تھا کہ وہ زندہ تھا اور ہماری کال بھی ریسیو ...

کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''بنارس! میں شاہ زیب بول ...

ہوں...... تمہارے پاس کوئی اور تو موجود نہیں؟''

''اوہ گاڈ...... اوہ گاڈ...... یہ آپ ہیں؟'' بنارس ...

آواز لرز اٹھی۔ اس میں خوشی کی جھلک تھی۔ بظاہر تو ہم ...

ساتھیوں سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے لیکن ...

ہمیں معلوم نہیں تھا کہ بنارس کو کال کر کے ہم نے کتنی بڑی ...

غلطی کی ہے۔ اس غلطی کا نتیجہ بے حد سنگینی کے ساتھ ہمارے ...

سامنے آنے والا تھا۔

خونریزی اور بربریت کے خلاف
صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ
باقی واقعات آیندہ ماہ پڑھیے

موجودہ حالات وواقعات کے آئینے میں چھپے چہروں کی رونمائی......

کچھ مردم شناس ایسے ہوتے ہیں جو پہلی نظر میں بھانپ لیتے ہیں کہ ان سے آشنائی خطرے سے خالی نہ ہو گی... ایک ایسے ہی شخص کی کہانی جس کے اندر انسان سے محبت اور ہمدردی کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود تھا... وہ انسان کے اندر اُتر کر اس کے باطن میں گردش کرتے جذبات سمجھنے کی صلاحیت رکھتا تھا... اور پھر قدرت نے اسے ایک ایسا موقع فراہم کر دیا کہ وہ اپنی محبت... ہمدردی کا عملی ثبوت دے سکے...

مردم شناس

زویا اعجاز

امیر حسین کی مضطرب نگاہیں اس اجنبی پر یک ٹک مرکوز تھیں۔ وہ شخص آج دوسری مرتبہ یہاں آیا تھا۔ لگ بھگ چھ فٹ قد، بھاری بھرکم جسامت، صاف رنگت اور چہرے پر ہلکی سی داڑھی۔ اس کا ہر انداز بہت منظم اور پُرسکون دکھائی دیتا تھا لیکن جانے کیوں اسے دیکھ کر امیر کے ...... دل و دماغ میں بگولے سے اٹھنے لگتے تھے۔

''الٰہی خیر! اسے سامنے پا کر میرا دل کیوں ہولنے لگتا ہے؟'' امیر نے بے چینی سے ہاتھ مسلے۔

''سوچ کیا رہا ہے امیرے؟ یہ معاملہ تجھے ہی دیکھنا ہو گا۔'' اس کے ذہن میں ایک سرگوشی ابھری۔

''ہاں تو میں کب انکار کر رہا ہوں؟ اگر یہ کسی غلط ارادے سے یہاں آتا ہے تو میں اسے کبھی کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔'' امیر نے خود کلامی کی اور اپنا بکھرا ہوا سامان سمیٹنے لگا۔ اس عمل میں بمشکل دو سے تین منٹ صرف ہوئے ہوں گے لیکن اس لحاتی غفلت میں وہ شخص نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ امیر حسین اس کے غیاب پر پریشانی میں مبتلا ہو گیا۔

''یہ کدھر اُڈاری بھر گیا ہے؟'' وہ جھنجلا گیا۔

''کیا ہوا ابا؟ کہیں کوئی سانپ تو نہیں دیکھ بیٹھا؟'' اس کے قریب ہی ایک باریک سی آواز ابھری۔

''ہاں رانی! میں نے ایک بہت بڑا موذی سانپ دیکھا ہے۔ اگر اسے پکڑا نہ گیا تو بہت نقصان پہنچائے گا۔'' امیر حسین نے اپنی نو سالہ بیٹی سے کہا۔

''میں چاچے جھورے کو بلا کر لاؤں کیا؟'' رانی نے باپ کی پریشانی اور تناؤ دیکھ کر اپنی ذہنی بساط کے مطابق مشورہ دیا۔

''اونہیں پاغلے! جھورے کا یہاں بھلا کیا کام؟'' امیر نے کوفت سے پیشانی پر ہاتھ مارا۔ جھورا دراصل ایک مقامی سپیرا تھا جو سانپوں کے تماشے دکھانے کے علاوہ خطرناک اور موذی حشرات قید کرنے کا بھی ماہر تھا۔

''ابا! ایک طرف تو کہتا ہے کہ سانپ دیکھا ہے...... پھر کہتا ہے کہ جھورے کا کیا کام؟ سچ بتا! کہیں تو نے پھر سے بھرا ہوا سگریٹ تو نہیں پی لیا؟'' رانی باپ کی ذہنی صحت کی جانب سے مشکوک ہو گئی۔

''اپنی سائنس مت لڑا! میری بات غور سے سن! ابھی ادھر سے نیلی قمیص اور خاکی پتلون والا آدمی اندر کی طرف گیا ہے۔ کیا تو نے اسے دیکھا ہے؟''

''ہاں ابا! وہی ناں جس کے سر پر نیلی ٹوپی بھی تھی۔''

''بالکل وہی! کس طرف جاتے دیکھا ہے تو نے اُسے؟'' وہ پُرجوش ہوا۔

''جھیل کی طرف جا رہا تھا وہ۔''

''تو فوراً اس کے پیچھے چلی جا۔ میں بھی تھوڑی دیر میں وہاں پہنچتا ہوں۔'' اس کے حکم پر رانی ذرا جھجی اور پھر بھاگتے ہوئے اسی جانب چل پڑی۔ امیر حسین خواہش کے باوجود رانی کی رفتار کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ کچھ روز پہلے اس کے پاؤں میں موچ آنے سے سوجن ہو گئی تھی۔ وہ علاقے کے مشہور جراح سے مرہم پٹی کروا رہا تھا تاہم بڑھاپے میں اس چوٹ کے بعد پہلے جیسی چابکدستی قائم رہنا کافی مشکل... اس نے دائیں پاؤں پر ہی وزن ڈالتے ہوئے دھیرے دھیرے جھیل کی طرف جانے کا ارادہ کر لیا۔

امیر حسین پیشے کے اعتبار سے ایک غبارہ فروش تھا... کے علاوہ وہ لکڑی کے تختے پر غبارے باندھ کر شوقین بچوں کے ذوق کو تسکین دیا کرتا تھا۔ یہ کام ابھی... جاری تھا لیکن بڑھتی عمر کے باعث اس میں گلی کوچوں... پھرنے کی سکت نہ رہی تھی۔ ایک قریبی دوست کی سفارش... مدد سے اسے شہر کے مشہور پارک میں جگہ مل گئی تھی۔ ... گرمی اور لو کے تھپیڑے کھا کر مارے مارے پھرنے... نسبت یہاں سکون تھا۔ تا حدِ نگاہ ہریالی آنکھوں کو تراوت... تھی۔ اس وسیع و عریض پارک میں ایک جانب تو بچوں... بڑوں کے لیے مختلف انواع کے جھولے تھے تو دوسری... میں ایک شاندار جاگنگ ٹریک تھا جہاں صبح و شام کے اوقات... میں وزن کم کرنے کے شائق مرد و زن جاگنگ کے لیے... کرتے تھے۔ تیسری سمت ایک پہاڑی تھی جس میں سیڑھیاں... تراش کر اوپر پہنچنے کا رستہ بھی بنایا گیا تھا۔ سبزہ، شہ... درخت، پھولوں، خاموش و پُرسکون ماحول اور کچھ جھاڑیوں... وجہ سے یہ جگہ نوجوانوں کے لیے بہت 'پسندیدہ' تھی۔ ... سمت میں پتھروں کو مخصوص انداز میں تراش کر ایک آبشار... کی گئی تھی۔ اپنی انہی خوبیوں کے باعث یہ عوام کے پسندیدہ... ترین تفریحی مقامات میں سے ایک تھا۔ یہاں ہجوم کا تناسب... موسم سے مشروط رہتا تھا۔ عموماً اتوار کو مختلف فیملیز گروپ... صورت میں سیر و تفریح کے لیے آیا کرتیں۔ عام دنوں... اسکولوں کے بچے تفریحی دوروں کے لیے آتے تھے۔ ... یونیفارمز میں ملبوس یہ شرارتی بچے اسے بہت اچھے لگتے... امیر حسین نے ان کے مزاج اور خواہشات کو بھانپتے ہوئے... ایک پمپ خرید لیا تھا جس کی مدد سے مختلف کارٹونز کی شکل... گیندوں اور غباروں میں ہوا بھر کر وہ مخصوص نرخوں... فروخت کر دیتا۔ معصوم فرشتوں جیسے بچے جب اپنی میٹھی آوازوں... میں اسے مخاطب کرتے تو اس کی روح تک سرشار ہو جاتی۔ ... امیر خندہ پیشانی سے ان کی خواہشات پوری کرتا۔ اپنی گدلی... آنکھوں سے ماضی کے مناظر اردگرد رقصاں دیکھتا جب... انہی بچوں کی عمر میں ایک ڈنڈے پر اپنی سانسوں سے... پھلائے گئے غبارے لٹکا کر گلی گلی گھوما کرتا تھا۔ تیسری... جماعت سے اسکول چھوڑنے کے بعد اس کی زندگی میں محنت... مشقت کا موسم مستقل ٹھہر چکا تھا۔

غربت اور جدوجہد میں جینے والے امیر حسین کی شادی

...ہوئی تھی۔ رانی اس کی چھوٹی اولاد تھی جو ...ین ملک سے ہوئی تھی... ہاتھوں سے بنائے گئے دیدہ زیب پنکھے وہیں گھوم پھر ...کے ہاتھوں... کیا کرتی۔ اس کا بڑا بیٹا سلطان اسی پارک کی کینٹین ...ملازم تھا۔ کینٹین کے باہر ایک مخصوص رقبے پر پلاسٹک کی کرسیاں اور میزیں رکھ دی گئی تھیں جہاں اکثر من چلے بیٹھ کر کھانا پینا پسند کرتے تھے لیکن سلطان کا اصل 'کرائی ٹیریا' پارک میں ہی گھوم پھر کر آرڈر لیتا تھا۔ درختوں کے جھنڈ، جھیل کنارے اور پہاڑی پر جھاڑیوں میں دنیا کی رسموں اور ...وقت چھپ کر آئے رومان میں مصروف جوڑے ... فرائز یا بوتل کا آرڈر ضرور دیا کرتے۔ اپنی ساتھی کی نظروں میں معتبر ٹھہرنے کے لیے سلطان کو تھوڑی بہت ٹپ ...مل جایا کرتی تھی۔ امیر حسین اور اس کے خاندان کی زندگی ...ہموار دھارے میں بہہ رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اسی طرح محنت اور بچت کرتے ہوئے وہ دونوں باپ بیٹا اپنا ...چائے خانہ یا ایسی ہی کوئی چھوٹی موٹی کینٹین کھول لیں گے اور کرائے کے گھر سے نجات حاصل کر کے دو کمروں کا ہی سہی ذاتی مکان خرید لیں گے۔

اسی سوچ اور ارادے نے اسے ایسی صورتِ حال میں ...کر دیا جس کے نتیجے میں وہ آج اس سنسنی میں مبتلا ہو رہا تھا۔

☆☆☆

اس روز موسم بہت خوشگوار تھا۔ کچھ دیر قبل بادلوں نے تپتے آسمان کو اپنی ٹھنڈی آغوش میں لے لیا تھا۔ نصف گھنٹا برسنے والی بارش نے موسم میں نئے رنگ بھر دیے تھے۔ پارک میں من چلوں اور بچوں کا ہجوم دھیرے دھیرے بڑھ رہا تھا۔ اس کی بے تاب نظریں ...کو تلاش کرنے لگیں۔ اسے یکدم ہی رانی کی فکر ستانے لگی تھی۔

''یہ تو نے کیا کر دیا امیرے؟ تو نے اپنی پھول سی بچی اس اجنبی کے پیچھے روانہ کر دی۔ آج کل تو ویسے ہی بچوں کے ساتھ اتنے حادثات ہو رہے ہیں۔'' تیز سیٹی نما سرگوشی نے اس کے اعصاب جھنجوڑ دیے اور وہ بے اختیار اپنی جیب تھپتھپا کر اپنے دیسی ساختہ پستول کا لمس محسوس کرنے لگا۔

''ایسا کچھ نہیں ہو سکتا۔ رانی کو میں نے ایسی کسی بھی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیار کیا ہوا ہے۔ وہ کبھی کسی کے لیے آسان شکار ثابت نہیں ہو گی۔'' اس نے حسبِ سابق بڑبڑاتے ہوئے خود کو تسلی دی لیکن اس کے باوجود دل مٹھی میں بھنچا جا رہا تھا۔

یہ جان لیوا کشمکش کچھ دیر یونہی جاری رہی اور پھر بالآخر رانی پر نظر پڑتے ہی اس کی جان میں جان آ گئی۔

''کہاں رہ گئی تھی تو؟ میں کب سے تجھے ڈھونڈ رہا ہوں۔'' وہ چلّایا۔

''لے ابا! تُو نے خود ہی تو مجھے یہاں بھیجا تھا۔'' رانی نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

''وہ بندہ ملا یا نہیں؟ اور تیرا سامان کہاں ہے؟'' امیر حسین کو یکدم خیال آیا کہ رانی کے دستی پنکھے اس کے ہاتھ میں موجود نہیں ہیں۔

''وہ تو اسی نے خرید لیے۔''

''کیا؟ سارے کے سارے......'' اسے تعجب ہوا۔

''ہاں ابا! وہ کہہ رہا تھا کہ بجلی تو ہمارے حکمرانوں کی غیرت کی طرح ہے۔ چلی جائے تو آنے کا نام ہی نہیں لیتی...... اس لیے یہ 'ہمت فینز' گھر کے سبھی بندوں کو دے دوں گا۔'' رانی نے اس کا بیان من و عن دہرایا جن میں سے اکثر الفاظ کے مطالب ہی سے وہ لاعلم تھی۔

''ہمم...... یعنی میرا اندازہ ٹھیک تھا...... یہ کوئی باغی شخص ہے۔'' امیر نے کہا۔ اس کی مردم شناسی کسی بہت بڑی گڑبڑ... کا اشارہ کر رہی تھی۔ سنسنی اور جوش سے اسے اپنے وجود میں چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہونے لگیں۔

''میں جاؤں اب ابا؟'' رانی بے تابی سے بولی۔

''اور کچھ کہہ رہا تھا وہ؟'' امیر حسین کو احساس تھا کہ اس کی سست روی کے باعث یہاں پہنچنے میں خاصی تاخیر ہوئی ہے۔ رانی کی اجنبی سے اور بھی کوئی بات چیت ضرور ہوئی ہو گی۔ وہ اسی معلومات کی روشنی میں اس کے کردار کا کوئی خاکہ مزید واضح کرنا چاہتا تھا۔

''میرا نام پوچھ رہا تھا...... میں نے سلطان بھائی کے ساتھ تیرا اور اماں کا نام بھی بتا دیا تو ہنستے ہوئے کہنے لگا، کیا اعلیٰ شاہی خاندان ہے بھئی تم لوگوں کا؟''

''اب کہاں ہے وہ؟'' امیر نے اپنا غصہ اور ناگواری ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔

''جھولوں کی طرف گیا ہے۔'' وہ عجلت میں کہتی آگے بڑھ گئی۔ اسے غالباً ماں کے پاس پہنچ کر پانچ سو کا نوٹ تھمانے کی جلدی تھی۔

رانی کے جاتے ہی امیر اپنی مخصوص غیر متوازن چال چلتا ہوا پارک کی اس سمت بڑھ گیا جہاں مختلف جھولے نصب کیے گئے تھے۔ یہاں 'آسمانی جھولا' سب سے زیادہ مقبول تھا۔ اجنبی شخص اسے وہیں ایک بینچ پر بیٹھا نظر آ گیا۔ امیر کا

سامان اور حلیہ ہی اس کے لیے بہترین آڑ تھی۔ وہ غیر محسوس طریقے سے چلتا ہوا اس کے قریب جا پہنچا۔ اجنبی نے اس کی جانب بالکل کوئی دھیان نہ دیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں غرق دکھائی دے رہا تھا۔ امیر حسین اپنی 'کیڈو' چال چلتا ہوا دائیں سمت پر واقع ایک سلائڈ کی آڑ میں اس پر نظریں جمائے کھڑا ہوگیا۔ اجنبی کے کپڑے سادہ اور صاف ستھرے لیکن کثرتِ استعمال سے اپنا رنگ کافی حد تک کھو چکے تھے۔ بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔ کنگھی کیے جانے کے باوجود ان میں ایک بے ترتیبی نمایاں تھی۔ اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے تھے۔ ہونٹوں کی سیاہی واضح طور پر بتاتی تھی کہ وہ کثرتِ سگریٹ نوشی کا بھی شکار ہے۔

اجنبی کچھ دیر جھولے پر ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا اور پھر رخ بدل کر اپنے موبائل پر مختلف زاویوں سے سیلفیز بنانے میں مصروف ہوگیا۔ اس کے ہر ایک انداز میں بے نیازی تھی لیکن امیر حسین واضح طور پر دیکھ سکتا تھا کہ ان سیلفیز میں وہ خود سے زیادہ جھولوں کی تصاویر محفوظ کر رہا تھا۔ چند منٹ اسی مشغلے میں مصروف رہنے کے بعد اس نے موبائل اپنے کان سے لگا لیا۔

یہ لمحات امیر حسین کے لیے بہت اہم تھے۔ اس کا مکمل وجود ہی سماعت بن کر اجنبی کی جانب متوجہ ہو چکا تھا جو اَب نہایت انہماک اور بے فکری سے موبائل پر محوِ گفتگو تھا۔

''اتنے روز کی محنت بالآخر رنگ لے ہی آئی ہے۔ تصویریں بھیج دی ہیں میں نے۔ چیک کر لینا۔'' اس کی آواز اور لہجہ بوجھل لیکن پُرجوش تھے۔

''ہاں! میں ساٹھ، ستر فیصد تک مطمئن ہو چکا ہوں۔ آدھے گھنٹے بعد میں یہاں سے نکل آؤں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ اصل کام تو اس آدھے گھنٹے کے بعد ہی ہوگا۔'' اجنبی نے سرشاری سے کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔

امیر حسین کے دل و دماغ میں ایک قیامت برپا ہو چکی تھی۔ یہ شخص اتنے دنوں سے آخر کس بات کی معلومات اکٹھی کر رہا تھا؟ وہ کیا کرنے کا ارادہ لے کر یہاں آتا تھا؟ اس کا انداز اور اطمینان دیکھ کر امیر کا بدن کپکپانے لگا تھا۔ اس کا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ یہ شخص کسی تخریب کار گروہ سے ہی تعلق رکھتا تھا۔ ملک میں اسکول اور کالجوں کے بعد تفریحی مقامات پر حملے کرنے میں بھی تیزی سے اضافہ ہوا تھا۔ اجنبی بھی یقیناً انہی لوگوں میں سے ایک تھا جنہیں عوام میں دہشت، بے چینی اور موت بانٹنے کے لیے ایک ہرکارہ بنایا گیا تھا۔ پل بھر میں ہی اس کی نظروں میں خونچکاں مناظر گھوم گئے جس میں بچوں کے پھول جیسے وجود اپنے ہی لہو میں ... ادھڑے اعضا کے ساتھ بکھرے پڑے تھے۔ ... نازک صورتِ حال جان لینے کے بعد قرار اور سکون ... کے بس میں نہ تھا۔ آج اسے شدت سے مبشر رضا کی ... کی افادیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔

امیر نے اسی پل مبشر کو اطلاع دینے کا فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

مبشر رضا سے امیر حسین کی ملاقات چھ ماہ پہلے ... پارک میں ہوئی تھی۔

وہ ایک پولیس انسپکٹر تھا اور بھکاریوں کے گروہ ... گرفتاری کے لیے اپنی مختصر ٹیم کے ساتھ وہاں آیا تھا۔ ... پیشہ ور بھکاریوں نے اس جگہ کو اپنا ٹھکانا بنا لیا تھا۔ وہ بھیک مانگنے کی آڑ میں سیر و تفریح کے لیے آئے ہوئے افراد کی ... اشیا پر ہاتھ صاف کر دیتے تھے لیکن اب تو گویا حد ہی ہو ... تھی۔ پارک میں آئی ایک بارہ سالہ لڑکی کو پہاڑی کی ... لے جا کر زیادتی کی ناکام کوشش پر اس خاندان کے ... نے پولیس میں شکایت درج کروا دی تھی۔ پولیس اہلکار ... انہیں دھکیلتے ہوئے مرکزی گیٹ کی طرف لے جا رہے تھے۔ امیر حسین بھی وہیں موجود یہ کارروائی دیکھ رہا تھا۔

''بہت شکریہ صاحب! ہم ان موذیوں سے واقعی ... تنگ تھے۔'' اس نے اپنے پاس کھڑے مبشر سے مخاطب ہو ... کہا۔

''تم یہیں کام کرتے ہو کیا؟'' اس نے سینے پر ... باندھتے ہوئے پوچھا۔

''جی ہاں! میرا بیٹا اور بیٹی بھی یہاں میرے ساتھ ... ہوتے ہیں۔''

''اگر تم ان سے اتنا ہی تنگ تھے تو براہِ راست ہم ... اطلاع کیوں نہ دی؟'' مبشر نے متانت سے کہا۔

''صاحب جی! بس وہ......'' امیر حسین خفت سے بات ... مکمل ہی نہ کر سکا۔

''سمجھ گیا...... تم بھی یقیناً پولیس کے بارے میں منفی ... تاثر رکھنے والوں میں سے ہو۔'' وہ بے چارگی سے ہنس دیا۔ ''لیکن قصور تمہارا بھی نہیں...... ایک عمومی تاثر کے تحت ہمیں ... 'ولن' بنا دیا گیا ہے حالانکہ ہم بھی عوام کا درد دور کرنے کے لیے اپنی جان خطروں میں جھونک دیتے ہیں۔ اب ذرا تصور کرو! اس بچی کی جگہ وہ بھکاری تمہاری بیٹی کو نشانہ بنانے کی کوشش کرتا تو کیا ہوتا؟''

''معافی چاہتا ہوں جی! خاموش رہ کر واقعی بہت غلطی ... کر رہا تھا۔'' مبشر کی بات پر وہ لرز کر رہ گیا۔

مبشر مسکرایا اور اسے لیے ایک بینچ پر چلا آیا۔

''یہ پارک اپنے رقبہ، جغرافیہ اور تفریحی لحاظ سے جس قدر شاہکار ہے، مجرمانہ ذہنیت رکھنے والوں کے لیے بھی اتنا ہی پسندیدہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آئندہ یہاں کوئی بھی غیر معمولی سرگرمی محسوس ہو تو تم مجھے فوراً اطلاع دو۔'' اس نے اپنا نمبر نوٹ کرواتے ہوئے امیر سے کہا۔

''صاحب! یہ بڑی ذمے داری ہے۔ پتا نہیں میں نبھا سکوں گا کہ نہیں؟'' وہ ہچکچایا۔

''بالکل نبھا سکو گے! تم یوں سمجھ لو کہ یہ ایک جز وقتی نوکری ہے جس کے لیے میں تمہیں انعام و کرام سے بھی نوازتا رہوں گا۔''

''مجھے انعام کا لالچ نہیں ہے جی۔ اگر میری مدد سے یہاں جرائم ختم ہوتے ہیں تو اس سے اچھی بات کیا ہوگی بھلا؟'' اس نے خلوصِ دل سے کہا۔

''بس تو پھر ٹھیک ہے۔ تم آج سے میرے لیے کام کرو گے۔'' مبشر کے پُراعتماد اور اپنائیت بھرے انداز پر وہ مزید مزاحمت نہ کر سکا اور اس کے لیے 'مخبر' بننے کی حامی بھر لی۔

اس روز کے بعد امیر حسین کی ذات میں کافی اعتماد پیدا ہوگیا تھا۔ اس نے ہی مخبری کرتے ہوئے پارک میں شام کے بعد ڈیرا جما لینے والے منشیات کے رسیا افراد کے خلاف کریک ڈاؤن کروایا اور کچھ ہفتوں بعد ہی ان 'جوڑوں' کے خلاف شکایت درج کروا دی جو پہاڑی اور جھاڑیوں کی آڑ میں اکثر نازیبا حرکات میں مشغول پائے جاتے تھے۔ ان کارروائیوں کے بعد پارک کا ماحول بے انتہا پُرسکون اور تفریح کے دلدادہ افراد کی آمد و رفت میں بہت اضافہ ہونے لگا تھا۔ یہ امن اور سکون ہی شاید کسی گروہ کو نہیں بھایا اور آج یہاں کی مصروف ترین جگہ پر وہ اجنبی بدامنی پیدا کرنے چلا آیا تھا۔

انہی خیالات میں غلطاں امیر حسین نے اپنی قمیص کی جیب سے ایک سستا سا موبائل فون نکالا اور مبشر کا نمبر ملا لیا۔

''ہاں بھئی جوان! سب خیریت تو ہے؟'' اس نے اپنے مخصوص ملائم انداز میں امیر کو مخاطب کیا۔ مبشر کا یہ اندازِ تخاطب ہمیشہ ہی اس کی چھاتی فخر سے چوڑی کر دیا کرتا تھا لیکن آج اسے ہیجان کے سوا کوئی بھی جذبہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

''صاحب جی! آپ جہاں بھی ہیں پہلی فرصت میں یہاں پہنچ جائیں ورنہ بہت بڑی قیامت آجائے گی۔''

''حوصلہ رکھو جوان! ایسا کیا ہوگیا ہے آخر؟''

اقوالِ زریں

☆ انسان موت کو برحق سمجھتے ہیں لیکن عاقبت کا سودا نہیں کرتے بلکہ دنیا کی خواہش اور دولت جمع کرتے ہیں۔

☆ انسان رسولِ خدا کو پہچانتے ہیں مگر اس کی اطاعت نہیں کرتے۔

☆ اللہ تعالیٰ کو جانتے ہیں مگر اس کی اطاعت نہیں کرتے۔

☆ قرآن مجید پڑھتے ہیں مگر اس پر عمل نہیں کرتے۔

☆ شیطان کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں لیکن اس سے بھاگتے نہیں بلکہ اس سے دوستی کرتے ہیں۔

☆ جانتے ہیں کہ دوزخ گناہ گاروں کے لیے ہے مگر اس سے ڈرتے نہیں۔

☆ انسان جانتے ہیں کہ نماز کے سوا اور کچھ نہیں مگر پڑھتے نہیں۔

☆ انسان اللہ تعالیٰ کو جانتے ہیں مگر اس کی عبادت نہیں کرتے۔

☆ انسان جانتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نبی برحق ہیں مگر ان کی سنت پر عمل پیرا نہیں۔

☆ جو عہد کرتے ہیں پورا نہیں کرتے۔

☆ جانتے ہیں کہ رشوت ایک برائی ہے مگر اس سے کام لیتے ہیں۔

☆ جانتے ہیں کہ شراب ناپاک ہے مگر اسے پاک سمجھ کر پیتے ہیں۔

☆ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک لحظہ میں اس دنیا کی کایا پلٹ سکتا ہے مگر اس کی کوئی فرمان روائی نہیں کرتا۔ پھر دعائیں کس طرح قبول ہوں۔

ملک محمد عثمان گنی کھوکھر، کھیوڑا

''یہاں ایک ایسا شخص موجود ہے جو کوئی تخریب کاری کرنے کے چکروں میں ہے۔''

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟ وہ کسی ڈیوائس کے ساتھ اندر آ کیسے گیا؟''

''میں نے آپ کو پچھلی بار بھی بتایا تھا کہ گیٹ پر سیکیورٹی کے نام پر دو مریل سے گارڈز اپنی جگہ لیکن بارشوں نے دو، تین جگہوں سے دیواروں میں کھپے ڈال دیے ہیں جس کے بعد دو نمبری کام پھر سے شروع ہو گئے ہیں۔ یہ

بھی وہیں سے آیا ہو گا۔ میں نے اسے پہلے بھی دیکھا تھا یہاں...... مگر آج اس کے تیور خطرناک نظر آ رہے ہیں۔"

"تم فکر نہ کرو۔ میں اس وقت ایک ٹیم کے ساتھ راؤنڈ پر ہوں لیکن تھانے اطلاع کر کے اہلکار تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ تم اپنی جگہ چوکس رہو۔"

"ٹھیک ہے صاحب! میں اس مردود پر نظر رکھتا ہوں۔" امیر نے سکون کا سانس لیا۔

"گڈ! ریوالور ہے ناں اس وقت تمہارے پاس ابھی؟" مبشر نے پوچھا۔ امیر حسین کے پاس ایک لائسنس شدہ ریوالور تو عہدِ شباب سے ہی موجود تھا۔ اپنی ٹیم کا رکن بنانے کے بعد مبشر نے اسے سائلنسر بھی فراہم کر دیا تھا۔

"جی! موجود ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم اُسے ایک لمحے کے لیے بھی نظر سے اوجھل مت ہونے دینا۔ کسی بھی ہنگامی صورت میں گولی چلا دینا۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔" اس نے تاکید کی اور اپنے اہلکار جلد از جلد بھیجنے کی یقین دہانی کرواتے ہوئے فون بند کر دیا۔

امیر حسین کی توجہ ایک بار پھر اس اجنبی کی جانب مرکوز ہو گئی۔ وہ سات، آٹھ سال کے دو لڑکوں کے ساتھ فٹ بال کھیلنے میں مصروف ہو گیا تھا لیکن امیر کو اس کی نگاہوں کی گہری تپش اور بے چینی میں ایک طوفان پنہاں نظر آ رہا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اجنبی کسی بھی لمحے عفریت کی طرح اپنا منہ کھولے گا اور آگ کی لپٹوں سے پارک کی گہما گہمی، زندگی کی رونقیں اور خوشیوں بھرے چہروں کو جلا کر بھسم کر دے گا۔ امیر حسین نے زندگی بھر کبھی اتنا خوف محسوس نہیں کیا تھا۔ اس روز اس نے جانا کہ موت کو اپنے سامنے دیکھنے کے بعد زندگی کی چاہت کس بُری طرح کسک میں مبتلا کرتی ہے۔ دس منٹ کے اس دورانیے میں، بچپن میں یاد کی جانے والی قرآنی آیات کا ورد کرتے ہوئے اس کے ہر ایک رونگیں سے اس اجنبی کے لیے بددعائیں برآمد ہو رہی تھیں۔

وقت نہایت سست روی سے گزر رہا تھا۔ پولیس اہلکار اب تک نہیں پہنچے تھے اور ابھی مزید جانے کتنی دیر اسے انتظار کرنا تھا۔ بے تحاشا دھڑکتے دل اور بلند ہوتے فشارِ خون سے نبرد آزما ہوتے اسے یقین تھا کہ مبشر رضا اپنے بندوں کو جلد ہی یہاں بھیج دے گا لیکن تقدیر اس روز عجیب اٹکھیلیوں کے موڈ میں تھی۔ اسی پل چند خواتین اور بچے اس سمت آتے نظر آئے۔ امیر حسین ان میں سے اکثریت کا چہرہ شناس تھا۔ یہ لوگ اکثر و بیشتر یہاں آیا کرتے تھے۔ تشویش کی بات تو یہ تھی کہ ان کا رخ جھیل کی طرف تھا۔ اس سے بھی زیادہ ہولناک انکشاف یہ تھا کہ انہیں دیکھتے ہی اجنبی کے بدن میں مزید چستی اور تناؤ کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ وہ بچوں کے ساتھ اس مخصوص قطعہ پر اس کی بھاگ دوڑ جاری تھی۔ نووارد افراد سے چند میٹر پیچھے نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کا ایک گروہ بھی اسی سمت آتا دکھائی دے رہا تھا۔ امیر حسین کو اپنی سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ بازی اس کے ہاتھ سے نکل رہی تھی۔ اس کی تمام تر کوشش اور خلوص ناکام ہو گیا تھا۔ ایک بار اس کے ذہن میں اپنے پستول سے اسے نشانہ بنانے کا خیال بھی آیا لیکن اس میں قباحت یہ تھی کہ وہ حرکت میں تھا اور کامل نشانہ باندھنے تک امیر کے ہاتھ میں ہتھیار دیکھ کر ہجوم میں سے کوئی فرد واویلا شروع کر دیتا تو خطرہ انتہائی حد تک جا پہنچتا۔

ان تمام تر عوامل کا جائزہ لیتے امیر حسین نے کرب سے اپنی آنکھیں میچ لیں۔

"الٰہی! میں کیا کروں؟ ان بے گناہوں کی جان کیسے بچاؤں؟" اس کے تڑپتے دل سے صدا بلند ہوئی۔

☆☆☆

ٹین کی چھت والے اس کمرے کی فضا بہت بوجھل تھی۔

مبشر رضا ایک پرانی چارپائی پر بچھے بدرنگ بستر پر بیٹھا تھا۔ وہ اس وقت یونیفارم میں تھا۔ اس کی ٹوپی ٹانگوں پر دھری تھی۔ اسے زندگی میں کبھی بھی ایسی دشوار صورتِ حال کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ اس کے الفاظ روٹھ کر کہیں دور جا چکے تھے اور زبان گنگ تھی۔

کچھ لمحات یونہی خاموشی سے سرک گئے۔ اس سناٹے کو بالآخر ملکہ کی آمد نے ختم کیا۔ وہ چینی کے پرانے لیکن صاف ستھرے کپ میں مبشر کے لیے چائے لائی تھی۔

"اس کی کیا ضرورت تھی بھلا؟" اس نے دھیرے سے کہا۔ ملکہ کی خمیدہ کمر اور ویران آنکھیں دیکھ کر اس کے دل پر عجیب سا بوجھ دھر آیا تھا۔

"پی لو صاحب! مہمانوں کی تواضع تو سنتِ رسولؐ ہے۔" ملکہ نے سادگی سے کہا۔

مبشر نے خاموشی سے کپ تھام لیا اور افسردگی و اضطراب سے اس کے کناروں پر انگلی پھیرنے لگا۔

"تم چائے نہیں پیو گے امیر حسین؟" اس نے اپنے سامنے دوسری چارپائی پر سر نہوڑائے بیٹھے امیر کو مخاطب کیا۔

"نہیں صاحب امیر! آج روزہ ہے۔"

"روزہ...... مگر وہ کس حساب سے؟" مبشر کو اچنبھا ہوا۔

امیر حسین کو اس کی ناسمجھی پر کوئی حیرانی تو نہ ہوئی لیکن ذہن میں وہ جان لیوا لمحات ایک بار پھر پوری شدت سے اجاگر ہو گئے جب وہ سلائڈ کی آڑ میں نصرتِ الٰہی کے لیے دعاگو تھا۔

"الٰہی! میں کیا کروں؟ ان بے گناہوں کی جان کیسے بچاؤں؟ اگر اس صورتِ حال کو قابو کرنے میں کامیاب رہا تو میں دس نفلی روزے رکھوں گا، اپنے حبیبؐ کے صدقے میری مدد فرما۔" اس کے تڑپتے دل سے صدائیں بلند ہوتی رہیں۔

اس کشمکش اور انتظار میں پچیس منٹ بیت چکے تھے۔ وہ اس دوران دو بار مبشر کو فون ملا چکا تھا لیکن رابطے میں کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ زیرِ لب دعائیں مانگتا وہ نہایت وحشت زدہ ہو چکا تھا۔ اسی لمحے اسے اپنے پاس ایک جھنجلائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"ابا! تو یہاں کس کے ساتھ لکن مٹی کھیل رہا ہے؟ کب سے ڈھونڈ رہا ہوں تجھے۔" سلطان ہاتھ میں پانچ سو کا نوٹ پکڑے اس سے مخاطب تھا۔ وہ غالباً 'آرڈرز' لینے کے لیے نکلا تھا۔

"کیوں ڈھونڈ رہا ہے مجھے؟" امیر حیران ہوا۔

"یہ رانی کس کو پنکھے فروخت کر کے گئی ہے؟ اُلو کی پٹھی! نقلی نوٹ لے کے وہاں کینٹین پر برگر کھانے پہنچی ہوئی تھی۔ اتنا مذاق بنایا سب نے میرا۔ اوپر سے غلطی ماننے کے بجائے کہتی ہے کہ ابا کو پتا ہے۔ اس نے دیکھا تھا یہ نوٹ۔" چودہ سالہ سلطان کی آنکھوں میں کئی سوال اور شکوے تھے۔ وہ اپنی عزتِ نفس کے معاملے میں بچپن ہی سے بہت حساس تھا۔

"ہاں! میں نے دیکھا تھا۔" اس نے بے دھیانی میں جواب دیا۔ نگاہیں اب بھی اجنبی کی حرکات پر مرکوز تھیں۔

"صدقے جاؤں میں تیرے ابا! تجھے بھی احساس نہیں ہوا کہ وہ جعلی نوٹ تھا۔ مذاق تو رہا ایک طرف۔ پوری دیہاڑی کا نقصان کروا دیا ہے تم دونوں بیوقوفوں نے۔" سلطان ہمیشہ ہی سے معاشی معاملات کے بارے میں 'بنیا' تھا۔ "خدا جانے اپنے کس ماموں، چاچے کو بیچ آئی ہے پنکھے؟"

"وہ نیلی ٹوپی والا بندہ دیکھ رہا ہے؟" امیر نے نگاہ سے اشارہ کیا۔

"وہ جو بچوں کے ساتھ فٹ بال کھیل رہا ہے؟" سلطان نے فوراً اشارہ بھانپ لیا۔

"ہاں! وہی...... اسی نے دیا تھا یہ نوٹ رانی کو۔"

"اس کی تو ایسی کی تیسی! اس کا تو پیو بھی بھرے گا ہمارا نقصان۔" وہ پاؤں پٹختا اجنبی کی طرف بڑھ گیا۔ امیر حسین خالی خالی نظروں سے اسے جاتا دیکھتا رہا۔ اسے اپنا جسم بے جان ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ سلطان اس سے بحث میں اُلجھ گیا تھا۔ امیر نے موبائل پر نگاہ دوڑائی۔ اٹھائیس منٹ بیت چکے تھے۔ اس نے خوفزدہ نظروں سے آسمان کی جانب دیکھا اور شدتِ کرب سے آنکھیں میچ لیں۔ دوسری جانب سلطان اور اجنبی کے تاثرات بہت درشت ہو چکے تھے۔ اس فاصلے سے امیر کو ان کی گفتگو بالکل سنائی نہ دے رہی تھی۔ اس کے لیے یہ لمحات بے حد قیمتی تھے۔ اس نے میکانکی انداز میں اپنی جیب سے ریوالور نکالا اور اجنبی کا نشانہ لے لیا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ باقی نہ تھا۔ امیر حسین کو اپنے نشانے پر مکمل اعتماد تھا لیکن وہ ایک بات فراموش کر گیا کہ تقدیر آج اسے چٹکیاں بھرنے پر تلی ہے۔

اگلے چند سیکنڈز میں دو واقعات بڑی سرعت سے رونما ہوئے تھے۔ اجنبی نے سلطان کے ہاتھ سے نوٹ کھینچ کر زمین پر پھینکا اور اسے تھپڑ دے مارا۔ اس جارحیت پر سلطان نے بھی تمام تر اخلاقیات اور پیشہ ورانہ فرائض بھلا دیے اور اسے دھکیلتا ہوا ایک جانب لے جانے لگا۔ یہ ایک قاتل لمحہ تھا۔ اسی پل امیر حسین نے اجنبی کی ران کا نشانہ لے کر لبلبی دبائی تھی لیکن اب اسے دھکیل کر وہاں سلطان آ چکا تھا۔ امیر حسین کی چلائی گئی گولی اجنبی کی ران کے بجائے سلطان کے پہلو میں جا لگی۔ امیر کی بصارت پتھرا گئی۔ وہ قیامت خیز گھڑیاں تھیں۔ اجنبی بدک کر بھاگنے کے لیے پر تولنے لگا لیکن اپنے لرزتے وجود پر قابو پاتے ہوئے اس نیم مردہ باپ نے مزید دو فائر کر دیے۔ اجنبی کی پیشانی اور گردن میں رنگین سوراخ ہو چکے تھے۔ آناً فاناً وہاں ایک کہرام برپا ہو گیا۔ امیر حسین گھٹنوں کے بل زمین بوس ہو گیا۔ اس کی تڑپ اور کراہیں دھرتی کا کلیجا شق کر رہی تھیں۔

موبائل کے وقت کے مطابق 'انتیس' منٹ بیت چکے تھے۔

☆☆☆

"تمہاری دلیری اور فرض شناسی نے ہمارے محکمے کو ہلا کے رکھ دیا ہے امیر!" مبشر نے کپ ایک جانب رکھتے ہوئے کہا۔

"مہربانی ان کی...... ورنہ میری کیا اوقات!"

"تم جانتے ہو کہ ماہرین کی مکمل چھان بین کے بعد علم

ہوا ہے کہ وہ شخص تین مختلف جگہوں پر موبائل نما ڈیوائسز نصب کر چکا تھا۔ اس کو اپنے موبائل سے ہی وہ تینوں دھماکے کرنے تھے اور اگر تم اسے گولی نہ مارتے تو شاید وہاں ایک قیامت برپا ہو جاتی۔'' مبشر کے انکشاف پر وہ خاموشی سے اپنی انگلیاں مسلتا رہا۔ وہ اسے اپنا سینہ کیسے چاک کر کے دکھاتا کہ قیامت تو بیت چکی تھی۔

''تمہیں اس پر شک کیسے ہوا؟ کیا اسے ڈیوائس رکھتے ہوئے دیکھا تھا؟'' اس نے ایک اور سوال کیا۔

''نہیں! میں نے صرف اتنا دیکھا تھا کہ اس شخص کی آنکھوں میں کسی بچے، خاتون، پرندے، ہریالی یا موسم کے لیے کوئی جذبہ نہیں تھا۔ یہ سبھی رب سوہنے کی بنائی گئی ایسی چیزیں ہیں کہ کسی نہ کسی طریقے سے انسان کی نظروں یا انداز میں نرماہٹ پیدا کر دیتی ہیں۔ وہ ان جذبوں سے واقف نہیں تھا تو اس کا یہی مطلب تھا کہ ان کا دشمن تھا۔'' امیر حسین کی سادہ سی توجیہہ نے مبشر کے وجود پر زوردار کوڑا رسید کیا۔ وہ اس سارے معاملے میں اب تک اپنی کوتاہی کا اعتراف کر ہی نہ پایا تھا۔

ملک میں بڑھتے ہوئے تخریب کارانہ واقعات نے عوام میں حد درجہ بے چینی اور شکوک پیدا کر رکھے تھے۔ اس ضمن میں ان کا 'احساسِ ذمے داری' بھی بعض اوقات محکمے کے لیے ایک امتحان بن جاتا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا تھا کہ عوامی اور تفریحی مقامات پر اپنی پیشہ وارانہ گفتگو میں مصروف افراد کو تخریب کاروں کا سہولت کار سمجھ لیا گیا۔ ایسے دو واقعات تو خود مبشر کے ساتھ بھی ہو چکے تھے۔

گزشتہ ہفتہ ایسے ہی کسی پارک سے امیر جیسے ایک مخبر کی اطلاع پر وہ ایک شخص کو گرفتار کر کے لائے تھے جو موبائل فون پر کسی سے بحث کر رہا تھا کہ اگلا قتل وہ جھولے کا 'سیفٹی کیچ' ہٹا دینے سے کرے گا۔ جب ساتھی لڑکا نیچے گر کر حادثے کا تاثر دے گا تو وہاں 'بلاسٹ' کر دیا جائے گا۔ اس اطلاع نے حقیقتاً پولیس اہلکاروں کی سٹی گم کر دی تھی۔ افراتفری، خوف، انتشار کی ملی جلی کیفیات سے گزرتے اس شخص کی گرفتاری کے بعد انکشاف ہوا کہ مذکورہ شخص ایک 'رائٹر' تھا جو فون پر اپنے نئے قسط وار ناول کے سلسلے میں ایڈیٹر کے ساتھ تبادلہ خیال کر رہا تھا۔ امیر حسین کی جانب سے ملنے والی خبر پر اس نے سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ کچھ دیر گزرنے کے بعد امیر کو خود ہی اپنی 'غلط فہمی' کا اندازہ ہو جائے گا۔ اسے گولی چلا دینے کا حکم دے کر وہ یہی ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ اس اطلاع کے بارے میں بہت سنجیدہ ہے لیکن حقیقت تو یہ تھی کہ وہ سابقہ

ہزیمت کے باعث امیر کی اس خبر پر جھنجلاہٹ اور کوفت میں مبتلا ہو کر اس غیر ذمے دارانہ اور غیر پیشہ وارانہ حرکت کا ارتکاب کر گیا تھا۔ اس کی یہی لاشعوری خطا آج اس گھرانے کے لیے دائمی روگ بن گئی تھی۔

''صاحب کے لیے کھانا لگا دے ملکہ!'' مبشر کو امیر کی آواز نے خیالات سے چونکا دیا۔

''نہیں! ان تکلفات میں مت پڑو...... میں بس چلتا ہوں۔'' اس نے بوجھل انداز میں کہا اور جیب سے ایک چیک نکال کر اسے تھما دیا۔

''یہ کیا ہے صاحب؟'' امیر نے حیرت و ناگواری سے پوچھا۔

''اس تخریب کار کے خاتمے پر سرکار کی طرف سے تمہارا انعام ہے۔'' مبشر نے جواز تراشا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اس نے اپنے اکاؤنٹ سے مخصوص رقم نکالی تھی۔ وہ ایک متمول خاندان کا سپوت تھا لہٰذا مال و زر کی کوئی پریشانی نہ تھی۔

''کتنا انعام لائے ہو صاحب؟ لاکھ...... دو لاکھ...... پانچ لاکھ...... یوں کہو ناں میرے بیٹے کی موت کا تاوان دینے آئے ہو۔''

''ایسا کچھ نہیں ہے یار!'' مبشر کو ایک اور کوڑا لگا۔

''ایسا ہی تو ہے صاحب! بوڑھے والدین کے لیے اکلوتے بیٹے سے جڑے خواب اور ارمانوں کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا۔'' اس بار ضرب ملکہ کے الفاظ نے لگائی تھی۔

''تم لوگ غلط سمجھ رہے ہو...... میں تو صرف تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔ اس رقم سے کوئی چھوٹی موٹی دکان کھول لینا۔ تمہارے بڑھاپے کے لیے سہارا مل جائے گا۔''

''یعنی آپ سوچ رہے ہیں کہ امیر حسین انتہائی بزدل ہے۔ وہ دوبارہ اس پارک کا رخ کر کے محنت کرنے کے قابل نہیں رہے گا۔ جاؤ صاحب! اپنی سرکار کو بتا دو کہ ابھی میرے پاس اپنے فرض کی راہ میں قربان کرنے کے لیے 'رانی' ہی نہیں اپنی جان بھی موجود ہے۔ اس وطن کا ہر بچہ میرا سلطان ہے، ہر بچی میری رانی ہے...... یہ دھرتی میری ماں ہے۔ میں اس کی حفاظت کے لیے کسی بھی وقت، کچھ بھی قربان کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' اس کے حلق میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

''ملکہ! صاحب کے لیے کھانا لے آؤ...... میں ذرا نماز پڑھ لوں۔'' وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

مبشر رضا کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ اب کبھی بھی انسانیت اور اپنی پیشہ وارانہ اخلاقیات سے نظریں نہیں ملا پائے گا۔

قیمتی تصویر

عکس فاطمہ

محبت کو گلے کا ہار بنانے والے سمجھتے ہیں کہ دوسرا فریق بھی یہی کرے گا... جبکہ لمحوں میں محبتیں بدلنے والے جفاگزیدہ ہوتے ہیں... ان میں وفا کم بہت ہی کم ہوتی ہے... مگر کیا کیجیے محبوب کو انہی جفا پیشوں کے پاس آکے قرار ملتا ہے... سکون ملتا ہے... تصویروں میں پناہ لینے والے ایک محبت گزیدہ کا ماجرا...

اس مجرم کا قصہ جس کا ہر وار جداگانہ تھا......

این کے جانے کے بعد پیٹر کئی روز تک دفتر نہیں گیا۔ اس نے فون کر کے بتا دیا تھا کہ اسے فلو ہو گیا ہے۔ این کے خیال سے پیچھا چھڑانے کا یہی ایک طریقہ تھا کہ وہ اپنے بستر میں سوتا رہے لیکن اس کے باوجود وہ خوابوں میں چلی آتی۔ وہ اس کے ساتھ قہقہے لگاتا اور اس کے کندھوں پر سے نقلی فر کا کوٹ کھینچتا۔ این نے اسے پہلی ملاقات میں ہی بتا دیا تھا۔ ''میں نے کبھی بھی اصلی فر کا کوٹ نہیں پہنا۔ یہ کتنا بڑا ظلم ہے۔''

اس نے سوچا کہ وہ خود بھی تو ظالم تھی۔ اس نے کتنی آسانی سے کہہ دیا کہ وہ سائمن کے ساتھ جا رہی ہے۔

''لیکن کتنے دنوں کے لیے؟ تم واپس کب آؤ گی؟''

''اوہ ڈارلنگ۔'' اس نے کہا تھا۔ ''مجھے افسوس ہے۔ اگر تم نے پہلے اندازہ لگا لیا ہوتا تو اتنے پریشان نہ ہوتے۔''

اس کے لیے واقعی یہ پریشانی کی بات تھی۔ وہ ایک ہفتے تک لحاف اوڑھے لیٹا رہا۔ ضرورت محسوس ہونے پر باتھ روم جاتا اور جو کچھ کچن میں ہوتا اس سے اپنا گزارہ کر لیتا۔ دروازے پر ڈاک جمع ہوتی رہی۔ ان کے یہاں دودھ اور اخبار والا نہیں آتا تھا۔ وہ سپر مارکیٹ سے دودھ کا کارٹن لے کر آتے اور خبروں کے لیے ٹی وی یا انٹرنیٹ کا سہارا لیتے۔

ایک ہفتے بعد وہ بستر سے اٹھا اور اس نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ اس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا اور اس کا وزن بھی کم ہو گیا تھا۔ پرانے لحاف کی۔۔ بو اسے ناگوار لگ رہی تھی۔ لہٰذا اس نے اسے ڈسٹ بن میں پھینک دیا اور امیزن کو فون کر کے نئے لحاف کا آرڈر دے دیا۔ اس نے ایک ہفتے کے دوران جمع ہونے والی ڈاک دیکھی۔ اس میں کوئی کام کی چیز نہیں تھی۔ البتہ اس نے بلوں کی ادائیگی کر دی۔ اس میں این کا کوئی خط نہیں تھا جبکہ پیٹر کا خیال تھا کہ وہ کم از کم اسے یہ بتانے کے لیے ضرور خط لکھے گی کہ وہ اس کے کپڑوں کا کیا کرے جو وہ فلیٹ میں چھوڑ گئی تھی۔ اس نے انہیں پیک کیا اور چیریٹی شاپ میں دے آیا۔ البتہ وہ اپنا نقلی فر کا کوٹ ساتھ لے گئی تھی۔

ایک ہفتے بعد جب وہ دفتر گیا تو مارگریٹ اسے دیکھتے ہی بولی۔ ''لڑکے، تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے؟'' دوسرے ساتھی بھی اسے دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے لیکن اس نے ان کی کسی بات پر دھیان نہیں دیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا پھر ایک دن اس نے مارگریٹ کو فر کے دستانے پہنے دیکھا تو اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ جب اس نے انہیں این کے بارے میں بتایا تو اس کے ساتھیوں نے اسے آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ جب وہ دفتر سے نکل رہا تھا تو اس کے کانوں میں مارگریٹ کی آواز آئی جو اکاؤنٹس کلرک سے کہہ رہی تھی۔ ''میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ شخص کسی بات کو اتنا زیادہ محسوس کر سکتا ہے۔''

''جانے والے کا غم ابھی تازہ ہے۔'' نوجوان ہنری نے جواب دیا۔

نومبر کا مہینا آ گیا اور وہ ابھی تک بے دلی سے دوائیں لے رہا تھا گو کہ ان سے اس کی طبیعت کچھ بہتر ہو گئی تھی۔ اس کی زندگی بالکل میکانیکی انداز میں گزر رہی تھی۔ مارگریٹ کی دو تین کالز کے سوا اس کے ٹیلی فون کی گھنٹی بھی نہیں بجی۔ اس نے شطرنج کلب کی رکنیت بھی منسوخ کر دی تھی جہاں وہ کبھی کبھار کھیلنے چلا جاتا تھا۔ اس کے قریب ترین پڑوسی ایک میل کے فاصلے پر تھے لیکن پیٹر اور این ان سے بہت ملتے تھے۔ پیٹر کے بینک اکاؤنٹ میں اس کی فوری ضروریات کی تکمیل کے لیے کافی رقم موجود تھی۔ اس کی آمد و رفت صرف بینک اور سپر مارکیٹ تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ صحیح معنوں میں گوشہ نشین ہو کر رہ گیا تھا۔

پھر اس کے معالج نے اسے چھٹیوں پر جانے کا مشورہ دیا تاکہ اس کے روزمرہ معمولات میں کچھ تبدیلی آئے۔ اس نے برائٹن، میں بکنگ کروالی گو کہ یہ موسم تعطیلات گزارنے کے لیے مناسب نہیں تھا اور وہ ویسے بھی اپنی مرضی کے خلاف چھٹیوں پر جا رہا تھا لیکن اسے ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید اس طرح اسے اپنی الجھنوں سے نجات مل جائے۔

ابھی وہ برائٹن میں ہی تھا کہ اس کی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی آئی۔ اس روز وہ ایک سڑک سے گزر رہا تھا کہ اس کی نظر ایک دکان پر گئی جس کے باہر بہت سے ڈبے رکھے ہوئے تھے اور ہر ڈبا بلیک اینڈ وائٹ تصویروں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ انہیں غور سے دیکھنے لگا اور اسے کچھ منقش تصویریں پسند آ گئیں۔ ان پر بڑی مہارت سے کندہ کاری کے ذریعے ماحول کا نقشہ کھینچا گیا تھا۔ اس نے کچھ تصویریں خریدیں لیکن اسے مزید تصویروں کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ آہستہ آہستہ اپنے ذخیرے میں اضافہ کرے گا۔

چھٹیاں ختم ہونے کے بعد وہ پوری دلجمعی سے دفتر میں کام کرنے لگا۔ اب اسے پہلے سے زیادہ پیسوں کی ضرورت تھی۔ اگر اس کا کوئی ساتھی چھٹی کے بعد اسے ڈرنک کی دعوت دیتا تو وہ نرمی سے انکار کر دیتا۔ اس کی شام اپنی قیمتی منقش تصویروں کے ساتھ گزرتی گو کہ این نے کبھی اسے فون نہیں کیا لیکن وہ اپنے آپ سے کہتا رہتا تھا کہ اس نے این کو بھلایا نہیں ہے۔

پیٹر کا ذوق اب مکمل طور پر تبدیل ہو چکا تھا اور وہ اپنے ذخیرے میں زیادہ سے زیادہ اضافے کے لیے کوشاں تھا۔ اسے جہاں سے بھی کوئی اچھی کندہ کی ہوئی تصویر ملتی

وہ اسے خرید لیتا۔ اس طرح ایک سال گزر گیا۔ نومبر کے آخر میں کرسمس کے موقع پر کتابوں اور تصویروں کے میلے لگ گئے تو وہ اچھی تصویروں کی تلاش میں وہاں جانے لگا۔ ان میلوں میں بڑے بڑے ڈیلرز نے تصویریں رکھی تھیں۔ ایسے ہی ایک اسٹال پر اس کی نظر ایک فولڈر پر گئی جس کا عنوان تھا۔ ''سیزنز۔''

اس کی ایک چھوٹی سی کندہ کی ہوئی تصویر میں ایک عورت فر کا کوٹ پہنے ہوئے کھڑی تھی اور پس منظر میں ایک شہر نظر آ رہا تھا جو غالباً لندن تھا۔ جسے اس نے دریائے ٹیمز کی وجہ سے پہچانا۔ اس عورت کا پورا جسم فر کے کوٹ میں چھپا ہوا تھا تاہم اس کے جسمانی خطوط واضح تھے۔ کسی ماہر فنکار نے اتنی نفاست سے کندہ کاری کی تھی کہ ایک ایک نقش نمایاں ہو گیا تھا۔ پیٹر اس منقش تصویر کو دیکھ کر مبہوت رہ گیا اور اسے یہ پریشانی لاحق ہو گئی کہ کیا وہ اس شاہکار تصویر کو خرید سکے گا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے دکان دار سے اس کی قیمت پوچھی۔

''یہ تصویر موسم سرما سے متعلق ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''فولڈر کے عنوان کے لحاظ سے اس میں چاروں موسموں کی تصویریں ہونی چاہیے تھیں لیکن ہمارے پاس اس سیٹ کی بھی ایک تصویر ہے۔ اس لیے اس میں کچھ رعایت ہو سکتی ہے۔''

اس نے جو قیمت بتائی، وہ پیٹر کے لیے قابل قبول تھی۔ اس کے لیے اسے آئندہ چند ماہ کچھ بچت کرنا پڑتی۔ اس نے اپنا کریڈٹ کارڈ دکان دار کو پکڑا دیا۔ اس نے وہ تصویر لفافے میں رکھی اور اسے دیتے ہوئے بولا۔ ''اب اس کا خیال رکھنا۔''

''تم نے یہ کیوں کہا؟'' پیٹر چونکتے ہوئے بولا۔

''کوئی خاص وجہ نہیں۔'' دکان دار نے کہا۔ ''لیکن اس تصویر میں جو عورت ہے، اس میں ایک خاص کشش ہے جو دیکھنے والوں کو اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو گے۔''

پیٹر اس چھوٹی سی تصویر کو اپنی بغل میں دبا کر چل دیا۔ اسے گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ نہ جانے وہ اتنا کیوں گھبرایا ہوا تھا۔ شاید اسے ڈر تھا کہ راستے میں کوئی اس سے یہ تصویر نہ چھین لے۔ گھر پہنچ کر وہ کافی دیر تک اس تصویر کو حیرت کے عالم میں دیکھتا رہا۔ گو کہ کندہ کاری بہت چھوٹی تھی۔ شاید اس کا سائز دس ضرب آٹھ ہو گا۔ لیکن بنانے والے نے اس میں چھوٹی سی چھوٹی تفصیل بھی شامل کر دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جب بھی اس تصویر کو دیکھتا، اس میں ہر بار ایک نئی بات نظر آتی۔ اس عورت کے چہرے کا بیشتر حصہ نقاب کی وجہ سے ڈھکا ہوا تھا۔ شاید اس نے یخ بستہ ہواؤں سے بچنے کے لیے ایسا کیا ہو جو اس کے نازک گالوں کو نقصان پہنچا سکتی تھی۔ اس نے فر کا ہڈ اور گرم کپڑے کا لبادہ پہن رکھا تھا۔ پیروں میں اونچی ایڑی والے جوتے تھے اور وہ پورے اعتماد سے کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ پیٹر اپنے آپ کو اسے چھونے سے نہ روک سکا۔ ہر بار وہ آنکھیں بند کر کے فر کی گرمائش اور نرمی محسوس کرتا۔ اس کی انگلیاں کاغذ کے کینوس پر حرکت کر رہی تھیں اور اسے مایوسی کا احساس ہو رہا تھا۔

اس نئے مشغلے کی وجہ سے اس کی سماجی زندگی میں بھی تبدیلی آئی۔ ایک دن وہ کتابوں کی دکان کے باہر رکھے ہوئے ڈبوں میں اپنے مطلب کی تصویریں دیکھ رہا تھا کہ اچانک ہی بارش شروع ہو گئی۔ دکان کا مالک دوڑتا ہوا باہر آیا تاکہ ڈبوں کو اندر لے جا سکے۔ پیٹر نے اس کام میں اس کی مدد کی اور تمام ڈبے محفوظ جگہ پر رکھوا دیے۔ اس کے بعد وہ دکان کا دروازہ کھول کر باہر جانے لگا لیکن دکان کے مالک نے اسے روک لیا اور بولا۔ ''اس بارش میں کہاں جاؤ گے۔ بارش رکنے کا انتظار کر لو۔ تب تک ہم چائے پیتے ہیں۔''

چائے کے بعد باتوں کا دور چلا اور پیٹر کو اپنے نئے دوست گیری کے بارے میں تین باتیں معلوم ہوئیں۔ پہلی یہ کہ اسے کندہ کاری کے بارے میں بہت معلومات تھیں۔ دوسرے اسے شطرنج کھیلنا پسند تھا اور تیسرے وہ پیٹر کے گھر کے بہت قریب رہتا تھا۔

اسی ملاقات میں یہ طے ہو گیا کہ وہ دونوں وقتاً فوقتاً شطرنج کھیلا کریں گے۔ اس کے کچھ دن بعد ہی جب تھامس گیری، پیٹر سے ملنے اس کے گھر گیا تو اس کی نظر سٹنگ روم میں اس منقش تصویر پر گئی۔ این کے جانے کے بعد پیٹر نے گھر کی تزئین و آرائش پر کوئی توجہ نہیں دی تھی اور این نے سٹنگ روم کی دیواروں پر جو وال پیپر لگائے تھے، ان کا رنگ بھی مدھم ہو گیا تھا۔ تاہم پیٹر نے شطرنج کھیلنے کے لیے نیا بلب لگا دیا تھا تاکہ وہ کمرا معمول کے مقابلے میں زیادہ روشن رہے۔

''سردی بڑھتی جا رہی ہے۔'' گیری نے کہا۔ پھر وہ رک کر کمرے کی دیواروں کو دیکھنے لگا جہاں پیٹر نے چند تصویریں آویزاں کر رکھی تھیں۔

اس نے سوچا کہ وہ خود بھی تو ظالم تھی۔ اس نے کتنی آسانی سے کہہ دیا کہ وہ سائمن کے ساتھ جا رہی ہے۔

''لیکن کتنے دنوں کے لیے؟ تم واپس کب آؤ گی؟''

''اوہ ڈارلنگ۔'' اس نے کہا تھا۔ ''مجھے افسوس ہے۔ اگر تم نے پہلے اندازہ لگا لیا ہوتا تو اتنے پریشان نہ ہوتے۔''

اس کے لیے واقعی یہ پریشانی کی بات تھی۔ وہ ایک ہفتے تک لحاف اوڑھے لیٹا رہا۔ ضرورت محسوس ہونے پر باتھ روم جاتا اور جو کچھ کچن میں ہوتا اس سے اپنا گزارہ کر لیتا۔ دروازے پر ڈاک جمع ہوتی رہی۔ ان کے یہاں دودھ اور اخبار والا نہیں آتا تھا۔ وہ سپر مارکیٹ سے دودھ کا کارٹن لے کر آتے اور خبروں کے لیے ٹی وی یا انٹرنیٹ کا سہارا لیتے۔

ایک ہفتے بعد وہ بستر سے اٹھا اور اس نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ اس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا اور اس کا وزن بھی کم ہو گیا تھا۔ پرانے لحاف کی بُو اسے ناگوار لگ رہی تھی۔ لہٰذا اس نے اسے ڈسٹ بن میں پھینک دیا اور ایمیزن کو فون کر کے نئے لحاف کا آرڈر دے دیا۔ اس نے ایک ہفتے کے دوران جمع ہونے والی ڈاک دیکھی۔ اس میں کوئی کام کی چیز نہیں تھی۔ البتہ اس نے بلوں کی ادائیگی کر دی۔ اس میں این کا کوئی خط نہیں تھا جبکہ پیٹر کا خیال تھا کہ وہ کم از کم اسے یہ بتانے کے لیے ضرور خط لکھے گی کہ وہ اس کے کپڑوں کا کیا کرے جو وہ فلیٹ میں چھوڑ گئی تھی۔ اس نے انہیں پیک کیا اور چیریٹی شاپ میں دے آیا۔ البتہ وہ اپنا نقلی فر کا کوٹ ساتھ لے گئی تھی۔

ایک ہفتے بعد جب وہ دفتر گیا تو مارگریٹ اسے دیکھتے ہی بولی۔ ''لڑکے، تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے؟'' دوسرے ساتھی بھی اسے دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے لیکن اس نے ان کی کسی بات پر دھیان نہیں دیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا پھر ایک دن اس نے مارگریٹ کو فر کے دستانے پہنے دیکھا تو اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ جب اس نے انہیں این کے بارے میں بتایا تو اس کے ساتھیوں نے اسے آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ جب وہ دفتر سے نکل رہا تھا تو اس کے کانوں میں مارگریٹ کی آواز آئی جو اکاؤنٹس کلرک سے کہہ رہی تھی۔ ''میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ شخص کسی بات کو اتنا زیادہ محسوس کر سکتا ہے۔''

''جانے والے کا غم ابھی تازہ ہے۔'' نوجوان ہنری نے جواب دیا۔

نومبر کا مہینا آ گیا اور وہ ابھی تک بے دلی سے دوائیں لے رہا تھا گوکہ ان سے اس کی طبیعت کچھ بہتر ہوئی تھی۔ اس کی زندگی بالکل میکانیکی انداز میں گزر رہی تھی۔ مارگریٹ کی دو تین کالز کے سوا اس کے ٹیلی فون کی گھنٹی کبھی نہیں بجی۔ اس نے شطرنج کلب کی رکنیت بھی منسوخ کر دی تھی جہاں وہ کبھی کبھار کھیلنے چلا جاتا تھا۔ اس کے قریب ترین پڑوسی ایک میل کے فاصلے پر تھے لیکن پیٹر اور این ان سے بہت ملتے تھے۔ پیٹر کے بینک اکاؤنٹ میں اس کی فوری ضروریات کی تکمیل کے لیے کافی رقم موجود تھی۔ اس کی آمد و رفت صرف بینک اور سپر مارکیٹ تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ صحیح معنوں میں گوشہ نشین ہو کر رہ گیا تھا۔

پھر اس کے معالج نے اسے چھٹیوں پر جانے کا مشورہ دیا تاکہ اس کے روزمرہ معمولات میں کچھ تبدیلی آئے۔ اس نے برائٹن، میں بکنگ کروا لی گوکہ یہ موسم تعطیلات گزارنے کے لیے مناسب نہیں تھا اور وہ ویسے بھی اپنی مرضی کے خلاف چھٹیوں پر جا رہا تھا لیکن اسے ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید اس طرح اسے اپنی الجھنوں سے نجات مل جائے۔

ابھی وہ برائٹن میں ہی تھا کہ اس کی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی آئی۔ اس روز وہ ایک سڑک سے گزر رہا تھا کہ اس کی نظر ایک دکان پر گئی جس کے باہر بہت سے ڈبے رکھے ہوئے تھے اور ہر ڈبا بلیک اینڈ وائٹ تصویروں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ انہیں غور سے دیکھنے لگا اور اسے کچھ منقش تصویریں پسند آ گئیں۔ ان پر بڑی مہارت سے کندہ کاری کے ذریعے ماحول کا نقشہ کھینچا گیا تھا۔ اس نے کچھ تصویریں خریدیں لیکن اسے مزید تصویروں کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ آہستہ آہستہ اپنے ذخیرے میں اضافہ کرے گا۔

چھٹیاں ختم ہونے کے بعد وہ پوری دلجمعی سے دفتر میں کام کرنے لگا۔ اب اسے پہلے سے زیادہ پیسوں کی ضرورت تھی۔ اگر اس کا کوئی ساتھی چھٹی کے بعد اسے ڈرنک کی دعوت دیتا تو وہ نرمی سے انکار کر دیتا۔ اس کی شام اپنی قیمتی منقش تصویروں کے ساتھ گزرتی گوکہ این نے کبھی اسے فون نہیں کیا لیکن وہ اپنے آپ سے کہتا رہتا تھا کہ اس نے این کو بھلایا نہیں ہے۔

پیٹر کا ذوق اب مکمل طور پر تبدیل ہو چکا تھا اور وہ اپنے ذخیرے میں زیادہ سے زیادہ اضافے کے لیے کوشاں تھا۔ اسے جہاں سے بھی کوئی اچھی کندہ کی ہوئی تصویر ملتی

وہ اسے خرید لیتا۔ اس طرح ایک سال گزر گیا۔ نومبر کے آخر میں کرسمس کے موقع پر کتابوں اور تصویروں کے میلے لگے تو وہ اچھی تصویروں کی تلاش میں وہاں جانے لگا۔ ان میلوں میں بڑے بڑے ڈیلرز نے تصویریں رکھی تھیں۔ ایسے ہی ایک اسٹال پر اس کی نظر ایک فولڈر پر گئی جس کا عنوان تھا۔ ''سیزنز۔''

اس کی ایک چھوٹی سی کندہ کی ہوئی تصویر میں ایک عورت فر کا کوٹ پہنے ہوئے کھڑی تھی اور پس منظر میں ایک شہر نظر آ رہا تھا جو غالباً لندن تھا۔ جسے اس نے دریائے ٹیمز کی وجہ سے پہچانا۔ اس عورت کا پورا جسم فر کے کوٹ میں چھپا ہوا تھا تاہم اس کے جسمانی خطوط واضح تھے۔ کسی ماہر فنکار نے اتنی نفاست سے کندہ کاری کی تھی کہ ایک ایک نقش نمایاں ہو گیا تھا۔ پیٹر اس منقش تصویر کو دیکھ کر مبہوت رہ گیا اور اسے یہ پریشانی لاحق ہو گئی کہ کیا وہ اس شاہکار تصویر کو خرید سکے گا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے دکان دار سے اس کی قیمت پوچھی۔

''یہ تصویر موسم سرما سے متعلق ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''فولڈر کے عنوان کے لحاظ سے اس میں چاروں موسموں کی تصویریں ہونی چاہیے تھیں لیکن ہمارے پاس اس سیٹ کی یہی ایک تصویر ہے۔ اس لیے اس میں کچھ رعایت ہو سکتی ہے۔''

اس نے جو قیمت بتائی، وہ پیٹر کے لیے قابلِ قبول تھی۔ اس کے لیے اسے آئندہ چند ماہ کچھ بچت کرنا پڑتی۔ اس نے اپنا کریڈٹ کارڈ دکان دار کو پکڑا دیا۔ اس نے وہ تصویر لفافے میں رکھی اور اسے دیتے ہوئے بولا۔ ''اب اس کا خیال رکھنا۔''

''تم نے یہ کیوں کہا؟'' پیٹر چونکتے ہوئے بولا۔

''کوئی خاص وجہ نہیں۔'' دکان دار نے کہا۔ ''لیکن اس تصویر میں جو عورت ہے، اس میں ایک خاص کشش ہے جو دیکھنے والوں کو اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو گے۔''

پیٹر اس چھوٹی سی تصویر کو اپنی بغل میں دبا کر چل دیا۔ اسے گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ نہ جانے وہ اتنا کیوں گھبرایا ہوا تھا۔ شاید اسے ڈر تھا کہ راستے میں کوئی اس سے یہ تصویر نہ چھین لے۔ گھر پہنچ کر وہ کافی دیر تک اس تصویر کو حیرت کے عالم میں دیکھتا رہا۔ گوکہ کندہ کاری بہت چھوٹی تھی۔ شاید اس کا سائز دس ضرب آٹھ ہو گا۔ لیکن بنانے والے نے اس میں چھوٹی سی چھوٹی تفصیل بھی شامل کر دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جب بھی اس تصویر کو دیکھتا، اس میں ہر بار ایک نئی بات نظر آتی۔ اس عورت کے چہرے کا بیشتر حصہ نقاب کی وجہ سے ڈھکا ہوا تھا۔ شاید اس نے یخ بستہ ہواؤں سے بچنے کے لیے ایسا کیا ہو جو اس کے نازک گالوں کو نقصان پہنچا سکتی تھی۔ اس نے فر کا ہڈ اور گرم کپڑے کا لبادہ پہن رکھا تھا۔ پیروں میں اونچی ایڑی والے جوتے تھے اور وہ پورے اعتماد سے کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ پیٹر اپنے آپ کو اسے چھونے سے نہ روک سکا۔ ہر بار وہ آنکھیں بند کر کے فر کی گرمائش اور نرمی محسوس کرتا۔ اس کی انگلیاں کاغذ کے کینوس پر حرکت کر رہی تھیں اور اسے مایوسی کا احساس ہو رہا تھا۔

اس نئے مشغلے کی وجہ سے اس کی سماجی زندگی میں بھی تبدیلی آئی۔ ایک دن وہ کتابوں کی دکان کے باہر رکھے ہوئے ڈبوں میں اپنے مطلب کی تصویریں دیکھ رہا تھا کہ اچانک ہی بارش شروع ہو گئی۔ دکان کا مالک دوڑتا ہوا باہر آیا تاکہ ڈبوں کو اندر لے جا سکے۔ پیٹر نے اس کام میں اس کی مدد کی اور تمام ڈبے محفوظ جگہ پر رکھوا دیے۔ اس کے بعد وہ دکان کا دروازہ کھول کر باہر جانے لگا لیکن دکان کے مالک نے اسے روک لیا اور بولا۔ ''اس بارش میں کہاں جاؤ گے۔ بارش رکنے کا انتظار کر لو۔ تب تک ہم چائے پیتے ہیں۔''

چائے کے بعد باتوں کا دور چلا اور پیٹر کو اپنے نئے دوست گیری کے بارے میں تین باتیں معلوم ہوئیں۔ پہلی یہ کہ اسے کندہ کاری کے بارے میں بہت معلومات تھیں۔ دوسرے اسے شطرنج کھیلنا پسند تھا اور تیسرے وہ پیٹر کے گھر کے بہت قریب رہتا تھا۔

اسی ملاقات میں یہ طے ہو گیا کہ وہ دونوں وقتاً فوقتاً شطرنج کھیلا کریں گے۔ اس کے کچھ دن بعد ہی جب تھامس گیری، پیٹر سے ملنے اس کے گھر گیا تو اس کی نظر سٹنگ روم میں اس منقش تصویر پر گئی۔ این کے جانے کے بعد پیٹر نے گھر کی تزئین و آرائش پر کوئی توجہ نہیں دی تھی اور این نے سٹنگ روم کی دیواروں پر جو وال پیپر لگائے تھے، ان کا رنگ بھی مدھم ہو گیا تھا۔ تاہم پیٹر نے شطرنج کھیلنے کے لیے نیا بلب لگا دیا تھا تاکہ وہ کمرا معمول کے مقابلے میں زیادہ روشن رہے۔

''سردی بڑھتی جا رہی ہے۔'' گیری نے کہا۔ پھر وہ رک کر کمرے کی دیواروں کو دیکھنے لگا جہاں پیٹر نے چند تصویریں آویزاں کر رکھی تھیں۔

''میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے پاس تصویروں کا بہت اچھا ذخیرہ ہے۔''

پھر اس کی نظر سامنے والی دیوار پر گئی۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ تیزی سے کمرا پار کر کے اس جانب لپکا اور اس کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ ''تمہارے پاس واقعی ایک عمدہ تصویر ہے۔''

وہ بڑے غور سے اس عورت کی تصویر دیکھ رہا تھا جس کے لیے پیٹر نے ایک نفیس سیاہ اور سنہرے فریم کا انتخاب کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس فریم میں یہ تصویر اور زیادہ اچھی لگے گی۔

''یہ تصویر تم نے کتنے میں خریدی؟'' گیری نے پوچھا۔

''اچھی خاصی قیمت میں۔'' پیٹر نے مختصر جواب دیا۔

''مجھے یقین ہے۔'' اس نے پیٹر کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ واقعی بہت قیمتی ہے۔ اسے ہولر نے بنایا ہے۔ وہ بوہیمیا کا رہنے والا تھا اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ اصلی تصویر ہے۔ ہولر کندہ کاری کے لیے مشہور تھا اور اتنی تفصیل سے جزئیات کو سموتا کہ تصویر حقیقی معلوم ہونے لگتی ہے۔ تم اسے ہاتھ لگا کر محسوس کر سکتے ہو۔''

''اسے مت چھونا۔'' پیٹر بے اختیار بول اٹھا۔

گیری نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ تم نے اسے شیشے کے فریم میں رکھا ہوا ہے۔ تم اس عورت کو غور سے دیکھو۔ لگتا ہے کہ اسے کسی مرد کا انتظار ہے۔ کم از کم اس کے پاؤں یہی بتا رہے ہیں لیکن میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ تمہیں یہ بات معلوم نہیں ہوگی۔''

پیٹر نے دل میں سوچا کہ اسے شروع سے ہی یہ معلوم تھا جب اس نے پہلی بار یہ تصویر دیکھی۔ اسے یہ تصویر اور وہ خوب صورت عورت پسند آئی اور اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ یہ موٹا اس کے بارے میں کیوں ایسی فضول باتیں کر رہا ہے۔ اسے غصہ آنے لگا۔ اتنا تو اس وقت بھی نہیں آیا تھا جب اس نے اپنے گھر کے سامنے سائمن کو اپنی اسپورٹس کار میں این کا انتظار کرتے دیکھا۔

پیٹر کا غصہ اس وقت عروج پر پہنچ گیا جب گیری نے ہاتھ بڑھا کر وہ تصویر دیوار سے اتاری اور اپنے انگوٹھوں میں پکڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ پیٹر کے لیے اپنے آپ پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ وہ بری طرح کانپ رہا تھا لیکن گیری نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ بہر حال وہ تصویر اس نے دوبارہ دیوار پر آویزاں کر دی اور پیٹر کے کہے بغیر شطرنج کھیلنے کے لیے کرسی پر بیٹھ گیا۔

پیٹر نے بمشکل تمام اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''معاف کرنا، میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ اگر تم برا نہ مناؤ تو ہم آج کا پروگرام ملتوی کر دیں۔''

''نہیں، مجھے بالکل برا نہیں لگے گا۔'' گیری نے حیرت سے کہا۔ ''واقعی تم ٹھیک نہیں لگ رہے۔ کوئی بات نہیں۔ پھر کبھی سہی۔''

پھر وہ ہال میں آیا اور اسٹینڈ سے اپنی برساتی اتارتے ہوئے بولا۔ ''ویسے اگر تم کبھی اس تصویر کو بیچنے کا فیصلہ کرو تو پہلے مجھے بتانا۔ میں تمہیں اس کی بہت اچھی قیمت دوں گا۔''

☆☆☆

گیری اپنی اسٹڈی میں بیٹھا ہوا اپنے کمپیوٹر پر پرانی اشیا کی فہرست دیکھ رہا تھا پھر ایک صفحے پر پہنچ کر وہ رک گیا۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ''اس وقت ایک ہزار تھی تو اب اس کی کیا قیمت ہوگی؟'' اس نے ایک بٹن دبایا اور قیمتیں اس کے سامنے اسکرین پر آنے لگیں۔

''اوہ میرے خدا۔'' اس نے اپنے آپ سے سرگوشی کی۔ ''میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی اتنی زیادہ قیمت ہوگی۔ شاید ہولر کو بھی اس کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں ہوگا۔ خیر کوئی بات نہیں۔'' اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور اپنے منصوبے کے بارے میں سوچتا ہوا بیڈ روم کی جانب چل دیا۔

☆☆☆

دروازے پر ہونے والی دستک نے پیٹر کو چونکنے پر مجبور کر دیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ سمجھا کہ شاید این واپس آ گئی ہے۔ وہ نہ جانے کیوں ابھی تک اس کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ شاید اسے ایک موہوم سی امید تھی کہ جلد یا بدیر این کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا۔ اس نے دروازہ کھولا اور گیری کو دیکھ کر حیران ہو گیا۔

''معاف کرنا دوست۔ میں بغیر اطلاع آ گیا۔ دراصل میں یہاں سے گزر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر تم فارغ ہو تو ایک بازی ہو جائے۔'' اس نے براؤن کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی چیز اس کے سامنے لہرائی اور خوش مزاجی سے بولا۔ ''دل بہلانے کا سامان میں لے کر آیا ہوں۔''

اس کے اردگرد برف گر رہی تھی اور پیٹر کے پاس اسے اندر بلانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ اس موسم میں اسے واپس جانے کے لیے کیسے کہہ سکتا تھا۔ اس نے ہچکچاتے

ہوئے پانی کی بوتل اور گلاس میز پر رکھے اور وہ دونوں شطرنج کی میز پر بیٹھ گئے۔ جب گیری نے وہسکی کی بوتل اسے پکڑائی تو اس نے گیری کے گلاس میں زیادہ مقدار ڈالی اور اپنے لیے پانی ملا کر ایک چھوٹا پیگ بنایا۔

پہلی بازی بے نتیجہ رہی اور دونوں میں سے کوئی بھی اسے نہ جیت سکا۔ گیری نے اپنے لیے ایک اور گلاس بنایا لیکن گیری کے اصرار کے باوجود پیٹر نے دوسرا گلاس لینے سے انکار کر دیا۔ گیری نے مشروب ختم کرنے کے بعد کہا۔ ''آج کی بازی ہار جیت کے بغیر ختم ہو گئی لیکن مجھے کھیلنے میں بہت مزہ آیا۔ ہم پھر کسی روز بازی جمائیں گے۔''

پیٹر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ گیری اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ویسے تمہاری یہ تصویر بہت پرانی لیکن پھر بھی اچھی ہے۔ کیا تم اس کے سو پونڈ لینا پسند کرو گے؟''

پیٹر نے نفی میں سر ہلایا تو وہ بولا۔ ''چلو میں کچھ بڑھا دیتا ہوں۔ میں زیادہ سے زیادہ دو سو دے سکتا ہوں۔''

وہ پیٹر کا جواب سن کر حیران رہ گیا۔ ''بالکل نہیں۔ اگر تم ایک ہزار پونڈ دو تب بھی نہیں۔''

''اچھا اچھا کوئی بات نہیں۔ میرا مقصد تمہیں پریشان کرنا نہیں تھا۔'' وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''پھر تم اسے اپنی دیوار پر ہی رہنے دو۔ میں تو صرف تمہارا بھلا چاہ رہا تھا۔''

پیٹر نے نصف بھری ہوئی بوتل اسے تھما دی۔ وہ دروازے پر پہنچ کر بولا۔ ''شب بخیر! اگر تم اس سے جان چھڑانا چاہو تو مجھے بتا دینا۔''

پیٹر غصے سے کانپنے لگا۔ ''میں اسے کسی قیمت پر بھی نہیں بیچوں گا۔ یہ برائے فروخت نہیں ہے۔'' پھر وہ تصویر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گا۔ تمہاری خاطر میں ساری دنیا سے لڑ سکتا ہوں۔''

☆☆☆

دو دن بعد اسے ڈاک سے ایک لفافہ موصول ہوا جو گیری نے بھیجا تھا۔ اس میں اس کے نام تین سو پونڈ کا چیک تھا اور ایک چھوٹی سی تحریر جس میں لکھا تھا۔ ''میں نے ہار ماننا نہیں سیکھا۔''

لگتا تھا کہ پیٹر یہ دھمکی آمیز تحریر پڑھ کر بے ہوش ہو جائے گا لیکن اس نے اس کا کوئی اثر نہیں لیا بلکہ وہ چیک پھاڑ کر گیری کی دکان کے دروازے سے اندر پھینک دیا۔

وہ دسمبر کا وسط تھا اور پیٹر ان دنوں گھر سے باہر نہیں نکلا۔ گھر کا سودا بھی ہر ہفتے سپر مارکیٹ کی وین پہنچا دیتی تھی۔ باہر برف باری شروع ہو چکی تھی۔ ''لگتا ہے کہ اس بار سردی جلدی شروع ہو گئی ہے۔'' اس نے ایک روز شام کے وقت کھڑکیوں کے پردے برابر کرتے ہوئے سوچا۔ اچانک اس کی نظر باہر کی طرف گئی تو اسے باغ کے آخری سرے پر جھاڑیوں میں کچھ نقل و حرکت محسوس ہوئی۔ اسے یوں لگا جیسے کوئی سایہ برفیلی زمین پر پیر پٹختے ہوئے چل رہا ہے۔ اس نے جلدی سے پردے برابر کر دیے اور بستر پر لیٹ گیا۔ رات میں کسی وقت اسے محسوس ہوا کہ کسی نے بیرونی دروازے کا تالا کھولنے کی کوشش کی ہے۔

اس نے بستر سے چھلانگ لگائی اور نیچے کی طرف بھاگا۔ اس نے تمام لائٹس جلا دیں لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ اسے یوں لگا جیسے کوئی دروازے سے نکل کر گیا ہے پھر اسے سٹنگ روم سے آواز آئی۔ وہ دوڑتا ہوا وہاں گیا لیکن کوئی نظر نہیں آیا۔ اس نے وہ تصویر اتار کر بغل میں دبائی اور تمام دروازے کھڑکیاں اچھی طرح چیک کرنے کے بعد اسے اپنے بیڈ روم میں لے گیا اور بستر کے برابر والی میز پر وہ تصویر رکھ دی۔

وہ جانتا تھا کہ اس کے مکان کے گرد گھات لگانے والا کون تھا۔ اس نے خود کلامی کے انداز میں گیری کے الفاظ دہرائے۔ ''میں نے ہار ماننا نہیں سیکھا۔'' پھر جیسے ہی اس کی نظر تصویر پر گئی ، اس کا غصہ کم ہونا شروع ہو گیا۔ اب وہ کافی پُرسکون ہو چکا تھا۔ اس نے گیری کا نمبر ملایا۔ وہ اس کی آواز سنتے ہی بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم مطلب کی بات کرو گے۔''

پیٹر نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ تجویز پیش کی کہ وہ شام کو شطرنج کھیلنے اس کے گھر آئے۔ گیری نے بخوشی اس کی دعوت قبول کر لی اور جب وہ شام کو آیا تو پیٹر نے دروازہ کھولتے ہی اس سے کہہ دیا۔ ''ہم اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے۔'' اور جب گیری نے دوبارہ یہ موضوع چھیڑنے کی کوشش کی تو پیٹر نے کہا۔ ''میں اس تصویر کو کچھ عرصہ اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو۔''

گیری نے اسے حیرت سے دیکھا اور سر ہلا دیا۔ انہوں نے شطرنج کی ایک بازی کھیلی جو گیری نے بہ آسانی جیت لی۔ لگتا تھا کہ پیٹر کا دماغ کہیں اور ہے۔ اس نے کہا۔

''اگر تم خیال نہ کرو تو باقی باتیں ہم کل کر لیں گے۔''

''لیکن میری پیشکش؟'' گیری نے بے تابی سے کہا۔

''اوہ، تم پریشان مت ہو۔'' پیٹر نے کہا۔ ''مجھے تمہاری پیشکش قبول ہے۔ میں نے اس کے بارے میں بہت سوچا اور سچ تو یہ ہے کہ یہ رقم میرے بہت کام آسکتی ہے لیکن فی الحال تم مشروب سے دل بہلاؤ تاکہ تمہارے جسم میں کچھ گرمی آئے۔ دیکھو باہر برف باری ہو رہی ہے۔''

پیٹر کے کچن میں رم کی ایک بوتل رکھی ہوئی تھی۔ پیٹر کو یہ شراب پسند نہیں تھی لیکن این نے جانے سے پہلے کاک ٹیل بنانے کے لیے ایک بوتل خرید لی تھی جسے کھولا نہیں گیا تھا۔ اس نے گیری کے لیے ایک ڈبل گلاس بنایا اور ختم ہونے پر اسے دوبارہ بھر دیا۔

''تم نے اپنے لیے نہیں بنایا۔'' گیری نے جھومتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بھی اب ہاتھ روک دینا چاہیے۔ میں بالکل ہی مدہوش نہیں ہونا چاہتا۔ مجھے گھر بھی جانا ہے۔''

''میں تمہیں بتاؤں۔'' پیٹر بولا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ کیا کہنے والا ہے۔ وہ اس سے پہلے کبھی اتنا پُرسکون نہیں تھا کیونکہ اس کے دماغ میں جو منصوبہ پل رہا تھا وہ بالکل واضح اور شفاف تھا۔ ''میں تھوڑی دور تک تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ مجھے سردی کی پروا نہیں۔ اس طرح مجھے تھوڑی سی تازہ ہوا مل جائے گی جس کی مجھے ضرورت ہے۔''

''ٹھیک ہے، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' گیری نے مشکوک انداز میں کہا۔ ''لیکن تم کچھ عجیب سے لگ رہے ہو۔''

وہ دونوں باہر نکل گئے۔ پیٹر کو ذرا بھی سردی محسوس نہیں ہو رہی تھی اور وہ مضبوطی سے قدم جما کر چل رہا تھا، البتہ گیری کی چال میں تھوڑی سی لڑکھڑاہٹ تھی اور اس کے پاؤں برف پر پھسل رہے تھے۔ وہ جب دریا کے پُل پر پہنچے جو پیدل چلنے والوں کے لیے بنایا گیا تھا تو وہ رک کر بولا۔ ''پانی کو دیکھو، مجھے لگتا ہے کہ بہت جلدی جم جائے گا۔''

''میں تمہاری مدد کرتا ہوں۔'' پیٹر نے کہا کیونکہ پل پر بنے ہوئے تنگ راستے پر اس کے پاؤں پھسل رہے تھے۔ شراب نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔

''اوہ میرے خدا! یہ ریلنگ کتنی ٹھنڈی ہے۔'' گیری نے اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا اور اس پر آدھا لٹک گیا۔ پیٹر نے اسے کمر سے پکڑ کے زور سے دھکا دیا اور گیری دریا میں جا گرا۔ اس کے پانی میں گرتے ہی ایک چھپاکا ہوا لیکن اس میں زیادہ شدت نہیں تھی کیونکہ پانی کی سطح پر پہلے ہی برف کی ہلکی تہ جم چکی تھی۔ گیری نے ایک ہلکی سی چیخ ماری۔ پانی اتنا ٹھنڈا تھا کہ اس کا دل فوراً ہی بند ہو گیا ہوگا۔

اگلے چندروز پیٹر نے اپنی محبوبہ (تصویر) کے ساتھ بڑے پُرسکون انداز میں گزارے۔

اخبارات میں شائع ہونے والی خبریں بڑی پریشان کن تھیں جن میں گیری کی موت کو دردناک حادثہ قرار دیا گیا تھا۔ تاہم وہ بڑے صبر و سکون کے ساتھ پوسٹ مارٹم رپورٹ کا انتظار کرتا رہا جس میں انکشاف کیا گیا کہ مرنے والے کے جسم میں شراب کی غیر معمولی مقدار پائی گئی تھی۔

البتہ پیٹر کو اخبارات میں گیری کی بیوی کا بیان پڑھ کر حیرت ہوئی جس میں اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا تھا کہ اس نے اس شدید سردی میں گیری کو باہر جانے سے منع کیا تھا لیکن وہ نہیں مانا اور ایک ضروری کام کا بہانہ کر کے چلا گیا۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کی بیوی بھی ہے۔'' پیٹر نے تصویر سے کہا۔ اب وہ اپنا زیادہ وقت اس کے ساتھ گزارتا تھا۔ اسے ہر لمحہ یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں کوئی اسے چرا کر نہ لے جائے۔ اسے لمحہ بھر کے لیے اس معصوم عورت سے ہمدردی محسوس ہوئی لیکن فوراً ہی اس پر دوسری سوچیں غالب آ گئیں۔

''مجھے یقین ہے کہ وہ اس کے بغیر اچھی زندگی گزارے گی۔'' اس نے تصویر سے کہا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس کی بات سمجھ رہی ہے۔ گو کہ وہ بول نہیں سکتی تھی لیکن ان کے درمیان ایک ایسا رابطہ تھا جو لفظوں کا محتاج نہیں۔ اسی لیے وہ اس سے دل کی ہر بات کہہ لیتا اور اس کے چہرے پر نظریں جمائے جواب کا منتظر رہتا۔

چندروز بعد شام کو ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اسے ہلکی سی امید تھی کہ شاید یہ ٹیلی فون این کا ہو جو غالباً اسپورٹس کار والے سے علیحدہ ہونے کے بعد واپس آنے کے لیے التجا کر رہی ہو گی۔ لیکن اب اسے اس کی پروا نہیں تھی۔ اس نے سوچا کہ روتی ہے تو رونے دو۔ بہرحال اسے ٹیلی فون تو اٹھانا ہی تھا۔

لیکن دوسری طرف سے اسے ایک مختلف آواز سنائی دی۔ وہ عورت این کے مقابلے میں قدرے بڑی عمر کی تھی۔ اس نے ٹھوس مگر چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں پامیلا گیریسن بول رہی ہوں۔''

پیٹر کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس نے محتاط انداز میں جواب دیا۔ ''گیریسن۔ اوہ ہاں، میں نے شاید اخبار میں پڑھا تھا۔''

''وہ میرا شوہر تھا۔ ایک مہینا پہلے دریا میں ڈوب کر

مر گیا۔''

''مجھے بہت افسوس ہے مسز گیری۔'' اس کے علاوہ وہ اور کیا کہتا۔

لیکن پامیلا نے غم زدہ بیوہ کا کردار ادا کرنے کے بجائے تیزی سے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ تمہیں افسوس ہونا ہی چاہیے کیونکہ یہ تمہارا ابھی نقصان ہے۔''

وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ ''کیوں، کیا مطلب ہے تمہارا.....؟''

''تم پیٹر کینز بری ہو نا۔ مجھے گیری کی دکان سے ایک کاغذ ملا جس سے تمہارا نام معلوم ہوا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر معاملات پر نظر رکھی جائے تو آخر میں اس کا صلہ ضرور ملتا ہے۔ منقش تصویریں بار بار نیلامی میں آتی ہیں اور تب میں جاننا چاہوں گا کہ میں نے ان کی کیا قیمت ادا کی جب وہ میرے ہاتھوں سے گزریں۔''

پیٹر کو اپنے پیٹ میں مروڑ اٹھتا ہوا محسوس ہوا، اس نے احتیاطاً اپنی جیب سے رومال نکال کر منہ پر رکھ لیا۔

''لہٰذا جب مجھے اس کی میز پر سے تین سو پونڈ کا پھٹا ہوا چیک ملا جو تمہارے نام لکھا گیا تھا تو فطری طور پر مجھے تجسس ہوا۔''

''لیکن تمہیں میرا نمبر کیسے معلوم ہوا؟''

''فون بک سے اور اگر اس میں نہ ہوتا تو یہ ایک بہت چھوٹی دنیا ہے۔ یہاں سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ میں کسی بھی دکان دار سے پوچھتی تو وہ بتا دیتا کہ یہی وہ پیٹر ہے جس کے پاس ہولر کی بنائی ہوئی تصویر ہے اور گیری اسے خریدنا چاہ رہا تھا۔ اس کے علاوہ ٹام نے بھی خاص طور پر مجھ سے تمہارا تذکرہ کیا تھا۔''

''اب تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟'' پیٹر نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ دریا کے پل پر جو کچھ ہوا۔ اس کا یقیناً کوئی ثبوت نہیں تھا لیکن اس چیک کی وجہ سے گیری کے ساتھ اس کا تعلق ثابت ہو سکتا تھا اور اس میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں تھی۔

''میں اپنے شوہر کی ذمے داری اور اس کی خواہشات پوری کرنا چاہتی ہوں۔ میں وہ تصویر خریدنا چاہتی ہوں۔ تم مجھے وہ منقش تصویر دے دو اور میں تمہیں اس پھٹے ہوئے چیک کے ٹکڑے دے دوں گی۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس نے چیک کا کاؤنٹر فائل خالی چھوڑ دیا تھا۔ تم اس چیک کو ضائع کر دو گے تو میرے علاوہ کسی کو اس کے بارے میں معلوم نہیں ہو سکے گا۔ اس طرح تم سکون سے رہ سکو گے اور مجھے ایک قیمتی آرٹ کا نمونہ مل جائے گا۔''

پیٹر نے سر اٹھا کر اس تصویر کی طرف دیکھا اور اچانک ہی اس کا ذہن پُرسکون ہو گیا۔ وہ ہمیشہ ہی اس پر اسی طرح اثر انداز ہوتی تھی۔ اس نے سوچا کہ اسے ایسی ہی عورت کی ضرورت ہے۔

اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں تمہاری دکان پر آجاؤں گا۔ تم دکان کب بند کرتی ہو؟''

''چھ بجے۔'' اس نے کہا۔ ''پریشان مت ہو۔ اس وقت وہاں قرب و جوار میں کوئی نہیں ہوتا۔''

''میں چھ بجے کے بعد ہی آؤں گا۔ جب تم دکان بند کر دو گی۔''

دوسری جانب سے ایک قہقہہ سنائی دیا۔ ''بالکل ٹھیک۔ ہم نہیں چاہتے کہ دوسرے گاہک ہمیں دیکھیں۔ لوگوں کو اس بارے میں بات نہیں کرنی چاہیے لیکن اس نے مجھے بتا دیا تھا جس رات وہ تم سے ملنے جا رہا تھا تو اس نے مجھ سے اس خوب صورت عورت کی تصویر کا ذکر کیا تھا لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ تمہیں حسد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تین سو سال پرانی ہے لیکن میں اس کا اشارہ سمجھ گئی اور اسی طرح پولیس بھی حقیقت جان جائے گی۔''

فون رکھنے کے بعد اس نے تصویر سے کہا۔ ''وہ کچھ بھی ثابت نہیں کر سکتے۔'' لیکن وہ پامیلا سے خوف زدہ تھا۔ وہ کتنا زیادہ بولتی ہے۔ اس کی زبان بند کرنا ضروری ہے۔

''کیا تم مجھ سے بات نہیں کر سکتیں؟'' اس نے تصویر سے پوچھا۔ ''مجھے بتاؤ کہ کیا کرنا چاہیے۔ تم تو بالکل خاموش ہو۔''

پیٹر کو محسوس ہوا کہ اس کی خاموشی میں ہی اشارہ چھپا ہوا ہے۔ اس نے اپنے انداز میں جواب دے دیا تھا۔

''اسے لازماً خاموش ہونا پڑے گا۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا اور اس کے ذہن میں منصوبے کے خدوخال واضح ہونے لگے۔ ''بالکل اسی طرح جیسے یہ تصویر۔''

پیٹر گھر سے روانہ ہوا تو اس کی بغل میں کاغذ کا ایک تھیلا دبا ہوا تھا۔ پامیلا کی دکان کا دروازہ بند تھا لیکن اس کے دستک دیتے ہی کھل گیا۔ پامیلا کے بال سنہرے تھے جن میں کہیں کہیں سفیدی جھلک رہی تھی۔ اس نے انہیں پیچھے کی جانب باندھ رکھا تھا۔ اس نے عام سے کپڑے پہن رکھے تھے اور کوئی میک اپ نہیں کیا ہوا تھا۔ اگر وہ سڑک سے گزر رہی ہوتی تو کوئی اس کی جانب دوسری بار دیکھنا گوارا نہ کرتا۔

''اوہ، تم پریشان مت ہو۔'' پیٹر نے کہا۔ ''مجھے تمہاری پیشکش قبول ہے۔ میں نے اس کے بارے میں بہت سوچا اور سچ تو یہ ہے کہ یہ رقم میرے بہت کام آسکتی ہے لیکن فی الحال تم مشروب سے دل بہلاؤ تاکہ تمہارے جسم میں کچھ گرمی آئے۔ دیکھو باہر برف باری ہو رہی ہے۔''

پیٹر کے کچن میں رم کی ایک بوتل رکھی ہوئی تھی۔ پیٹر کو یہ شراب پسند نہیں تھی لیکن این نے جانے سے پہلے کاک ٹیل بنانے کے لیے ایک بوتل خرید لی تھی جسے کھولا نہیں گیا تھا۔ اس نے گیری کے لیے ایک ڈبل گلاس بنایا اور ختم ہونے پر اسے دوبارہ بھر دیا۔

''تم نے اپنے لیے نہیں بنایا۔'' گیری نے جھومتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بھی اب ہاتھ روک دینا چاہیے۔ میں بالکل ہی مدہوش نہیں ہونا چاہتا۔ مجھے گھر بھی جانا ہے۔''

''میں تمہیں بتاؤں۔'' پیٹر بولا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ کیا کہنے والا ہے۔ وہ اس سے پہلے کبھی اتنا پُرسکون نہیں تھا کیونکہ اس کے دماغ میں جو منصوبہ پل رہا تھا وہ بالکل واضح اور شفاف تھا۔ ''میں تھوڑی دور تک تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ مجھے سردی کی پروا نہیں۔ اس طرح مجھے تھوڑی سی تازہ ہوا مل جائے گی جس کی مجھے ضرورت ہے۔''

''ٹھیک ہے، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' گیری نے مشکوک انداز میں کہا۔ ''لیکن تم کچھ عجیب سے لگ رہے ہو۔''

وہ دونوں باہر نکل گئے۔ پیٹر کو ذرا بھی سردی محسوس نہیں ہو رہی تھی اور وہ مضبوطی سے قدم جما کر چل رہا تھا، البتہ گیری کی چال میں تھوڑی سی لڑکھڑاہٹ تھی اور اس کے پاؤں برف پر پھسل رہے تھے۔ وہ جب دریا کے پُل پر پہنچے جو پیدل چلنے والوں کے لیے بنایا گیا تھا تو وہ رک کر بولا۔ ''پانی کو دیکھو، مجھے لگتا ہے کہ بہت جلدی جم جائے گا۔''

''میں تمہاری مدد کرتا ہوں۔'' پیٹر نے کہا کیونکہ پل پر بنے ہوئے تنگ راستے پر اس کے پاؤں پھسل رہے تھے۔ شراب نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔

''اوہ میرے خدا! یہ ریلنگ کتنی ٹھنڈی ہے۔'' گیری نے اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا اور اس پر آدھا لٹک گیا۔ پیٹر نے اسے کمر سے پکڑ کے زور سے دھکا دیا اور گیری دریا میں جا گرا۔ اس کے پانی میں گرتے ہی ایک چھپاکا ہوا لیکن اس میں زیادہ شدت نہیں تھی کیونکہ پانی کی سطح پر پہلے ہی برف کی ہلکی تہ جم چکی تھی۔ گیری نے ایک ہلکی سی چیخ ماری۔ پانی اتنا ٹھنڈا تھا کہ اس کا دل فوراً ہی بند ہو گیا ہوگا۔

اگلے چند روز پیٹر نے اپنی محبوبہ (تصویر) کے ساتھ بڑے پُرسکون انداز میں گزارے۔

اخبارات میں شائع ہونے والی خبریں بڑی پریشان کن تھیں جن میں گیری کی موت کو دردناک حادثہ قرار دیا گیا تھا۔ تاہم وہ بڑے صبر و سکون کے ساتھ پوسٹ مارٹم رپورٹ کا انتظار کرتا رہا جس میں انکشاف کیا گیا کہ مرنے والے کے جسم میں شراب کی غیر معمولی مقدار پائی گئی تھی۔ البتہ پیٹر کو اخبارات میں گیری کی بیوی کا بیان پڑھ کر حیرت ہوئی جس میں اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا تھا کہ اس نے اس شدید سردی میں گیری کو باہر جانے سے منع کیا تھا لیکن وہ نہیں مانا اور ایک ضروری کام کا بہانہ کر کے چلا گیا۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کی بیوی بھی ہے۔'' پیٹر نے تصویر سے کہا۔ اب وہ اپنا زیادہ وقت اس کے ساتھ گزارتا تھا۔ اسے ہر لحہ یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں کوئی اسے چرا کر نہ لے جائے۔ اسے لمحہ بھر کے لیے اس معصوم عورت سے ہمدردی محسوس ہوئی لیکن فوراً ہی اس پر دوسری سوچیں غالب آگئیں۔

''مجھے یقین ہے کہ وہ اس کے بغیر اچھی زندگی گزارے گی۔'' اس نے تصویر سے کہا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس کی بات سمجھ رہی ہے۔ گو کہ وہ بول نہیں سکتی تھی لیکن ان کے درمیان ایک ایسا رابطہ تھا جو لفظوں کا محتاج نہیں۔ اسی لیے وہ اس سے دل کی ہر بات کہہ لیتا اور اس کے چہرے پر نظریں جمائے جواب کا منتظر رہتا۔

چند روز بعد شام کو ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اسے ہلکی سی امید تھی کہ شاید یہ ٹیلی فون این کا ہو جو غالباً اسپورٹس کار والے سے علیحدہ ہونے کے بعد واپس آنے کے لیے التجا کر رہی ہو گی۔ لیکن اب اسے اس کی پروا نہیں تھی۔ اس نے سوچا کہ روتی ہے تو رونے دو۔ بہرحال اسے ٹیلی فون تو اٹھانا ہی تھا۔

لیکن دوسری طرف سے اسے ایک مختلف آواز سنائی دی۔ وہ عورت این کے مقابلے میں قدرے بڑی عمر کی تھی۔ اس نے ٹھوس مگر چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں پامیلا گیریسن بول رہی ہوں۔''

پیٹر کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس نے محتاط انداز میں جواب دیا۔ ''گیریسن۔ اوہ ہاں، میں نے شاید اخبار میں پڑھا تھا۔''

''وہ میرا شوہر تھا۔ ایک مہینا پہلے دریا میں ڈوب کر

مر گیا۔''

''مجھے بہت افسوس ہے مسز گیری۔'' اس کے علاوہ وہ اور کیا کہتا۔

لیکن پامیلا نے غم زدہ بیوہ کا کردار ادا کرنے کے بجائے تیزی سے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ تمہیں افسوس ہونا ہی چاہیے کیونکہ یہ تمہارا ابھی نقصان ہے۔''

وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ ''کیوں، کیا مطلب ہے تمہارا......؟''

''تم پیٹر کینز بری ہو نا۔ مجھے گیری کی دکان سے ایک کاغذ ملا جس سے تمہارا نام معلوم ہوا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر معاملات پر نظر رکھی جائے تو آخر میں اس کا صلہ ضرور ملتا ہے۔ منقش تصویریں بار بار نیلامی میں آتی ہیں اور تب میں جاننا چاہوں گا کہ میں نے ان کی کیا قیمت ادا کی جب وہ میرے ہاتھوں سے گزریں۔''

پیٹر کو اپنے پیٹ میں مروڑ اٹھتا ہوا محسوس ہوا، اس نے احتیاطاً اپنی جیب سے رومال نکال کر منہ پر رکھ لیا۔

''لہٰذا جب مجھے اس کی میز پر سے تین سو پونڈ کا پھٹا ہوا چیک ملا جو تمہارے نام لکھا گیا تھا تو فطری طور پر مجھے تجسس ہوا۔''

''لیکن تمہیں میرا نمبر کیسے معلوم ہوا؟''

''فون بک سے اور اگر اس میں نہ ہوتا تو یہ ایک بہت چھوٹی دنیا ہے۔ یہاں سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ میں کسی بھی دکان دار سے پوچھتی تو وہ بتا دیتا کہ یہی وہ پیٹر ہے جس کے پاس ہولر کی بنائی ہوئی تصویر ہے اور گیری اسے خریدنا چاہ رہا تھا۔ اس کے علاوہ ٹام نے بھی خاص طور پر مجھ سے تمہارا تذکرہ کیا تھا۔''

''اب تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟'' پیٹر نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ دریا کے پل پر جو کچھ ہوا۔ اس کا یقیناً کوئی ثبوت نہیں تھا لیکن اس چیک کی وجہ سے گیری کے ساتھ اس کا تعلق ثابت ہو سکتا تھا اور اس میں کسی شبے کی گنجائش نہیں تھی۔

''میں اپنے شوہر کی ذمے داری اور اس کی خواہشات پوری کرنا چاہتی ہوں۔ میں وہ تصویر خریدنا چاہتی ہوں۔ تم مجھے وہ منقش تصویر دے دو اور میں تمہیں اس پھٹے ہوئے چیک کے ٹکڑے دے دوں گی۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس نے چیک کا کاؤنٹر فائل خالی چھوڑ دیا تھا۔ تم اس چیک کو ضائع کر دو گے تو میرے علاوہ کسی کو اس کے بارے میں معلوم نہیں ہو سکے گا۔ اس طرح تم سکون سے رہ سکو گے اور مجھے ایک قیمتی آرٹ کا نمونہ مل جائے گا۔''

پیٹر نے سر اٹھا کر اس تصویر کی طرف دیکھا اور اچانک ہی اس کا ذہن پُرسکون ہو گیا۔ وہ ہمیشہ ہی اس پر اسی طرح اثر انداز ہوتی تھی۔ اس نے سوچا کہ اسے ایسی ہی عورت کی ضرورت ہے۔

اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں تمہاری دکان پر آجاؤں گا۔ تم دکان کب بند کرتی ہو؟''

''چھ بجے۔'' اس نے کہا۔ ''پریشان مت ہو۔ اس وقت وہاں قرب و جوار میں کوئی نہیں ہوتا۔''

''میں چھ بجے کے بعد ہی آؤں گا۔ جب تم دکان بند کر دو گی۔''

دوسری جانب سے ایک قہقہہ سنائی دیا۔ ''بالکل ٹھیک۔ ہم نہیں چاہتے کہ دوسرے گاہک ہمیں دیکھیں۔ لوگوں کو اس بارے میں بات نہیں کرنی چاہیے لیکن اس نے مجھے بتا دیا تھا جس رات وہ تم سے ملنے جا رہا تھا تو اس نے مجھ سے اس خوب صورت عورت کی تصویر کا ذکر کیا تھا لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ تمہیں حسد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تین سو سال پرانی ہے لیکن میں اس کا اشارہ سمجھ گئی اور اسی طرح پولیس بھی حقیقت جان جائے گی۔''

فون رکھنے کے بعد اس نے تصویر سے کہا۔ ''وہ کچھ بھی ثابت نہیں کر سکتے۔'' لیکن وہ پامیلا سے خوف زدہ تھا۔ وہ کتنا زیادہ بولتی ہے۔ اس کی زبان بند کرنا ضروری ہے۔

''کیا تم مجھ سے بات نہیں کر سکتیں؟'' اس نے تصویر سے پوچھا۔ ''مجھے بتاؤ کہ کیا کرنا چاہیے۔ تم تو بالکل خاموش ہو۔''

پیٹر کو محسوس ہوا کہ اس کی خاموشی میں ہی اشارہ چھپا ہوا ہے۔ اس نے اپنے انداز میں جواب دے دیا تھا۔

''اسے لازماً خاموش ہونا پڑے گا۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا اور اس کے ذہن میں منصوبے کے خدوخال واضح ہونے لگے۔ ''بالکل اسی طرح جیسے یہ تصویر۔''

پیٹر گھر سے روانہ ہوا تو اس کی بغل میں کاغذ کا ایک تھیلا دبا ہوا تھا۔ پامیلا کی دکان کا دروازہ بند تھا لیکن اس کے دستک دیتے ہی کھل گیا۔ پامیلا کے بال سنہرے تھے جن میں کہیں کہیں سفیدی جھلک رہی تھی۔ اس نے انہیں پیچھے کی جانب باندھ رکھا تھا۔ اس نے عام سے کپڑے پہن رکھے تھے اور کوئی میک اپ نہیں کیا ہوا تھا۔ اگر وہ سڑک سے گزر رہی ہوتی تو کوئی اس کی جانب دوسری بار دیکھنا گوارا نہ کرتا۔

پامیلا نے رسمی تکلفات میں پڑے بغیر گیری کی میز کی دراز کھولی اور اس میں سے کاغذ کے ٹکڑے نکالے۔ جب اس نے انہیں میز پر رکھا تو پیٹر نے پہچان لیا۔ یہ وہی تین سو پونڈ کا چیک تھا جو اس نے پھاڑ کر گیری کی دکان میں ڈال دیا تھا۔

''وہ تصویر کہاں ہے؟'' پامیلا نے تیز لہجے میں کہا۔

پیٹر نے وہ پیکٹ میز پر رکھ دیا۔ اس نے اپنے دستانے نہیں اتارے تھے۔ اس لیے مزید کسی تیاری کی ضرورت نہیں تھی۔ پامیلا کا دھیان پیکٹ کی طرف تھا کہ پیٹر نے اچانک اس کی گردن دبوچ لی اور اس نے دونوں ہاتھوں سے پامیلا کا گلا دبانا شروع کیا اور اس کی گرفت سخت ہوتی گئی۔ پامیلا نے اپنے آپ کو چھڑانے کی جدوجہد کی لیکن ناکام رہی اور تھوڑی ہی دیر میں کانٹے میں پھنسی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپنے لگی۔ اس کے ہونٹوں اور زبان سے رال بہہ رہی تھی۔ پیٹر نے اپنا ایک ہاتھ گردن سے ہٹا کر اس کے منہ پر رکھا لیکن وہ اس سے پہلے ہی ساکت ہوچکی تھی۔

باہر اندھیرا پھیل چکا تھا۔ البتہ کچھ فاصلے پر ایک اسٹریٹ لائٹ روشن تھی۔ پیٹر نے دکان کی لائٹ بند کی اور باہر آگیا۔ گلی میں بالکل سناٹا تھا۔ کسی نے اسے دکان سے باہر نکلتے نہیں دیکھا۔ اپنی گلی کے موڑ پر پہنچ کر اس نے آہستہ سے ڈسٹ بن کا ڈھکنا اٹھایا اور اس میں دستانوں کے ساتھ وہ پیکٹ بھی پھینک دیا جس میں تصویر کے بجائے محض ایک گتے کا ٹکڑا تھا۔ اسے یقین تھا کہ صبح کارپوریشن کی گاڑی آنے سے پہلے علاقے کے لوگ اس میں مزید کچرا ڈالیں گے اور یہ دونوں چیزیں اس ڈھیر میں دب جائیں گی۔

گھر پہنچ کر اس نے اپنا اوورکوٹ ہینگر میں لٹکایا اور بیڈروم میں چلا گیا۔ جہاں وہ تصویر اس کا انتظار کر رہی تھی۔

''اب تم بالکل محفوظ ہو۔'' اس نے تصویر ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ صبح اس تصویر کو مستقل طور پر اپنے کمرے کی دیوار پر آویزاں کردے گا تاکہ باہر سے آنے والا کوئی ملاقاتی اسے نہ دیکھ سکے۔

وہ بہت تھک چکا تھا۔ اس لیے لباس تبدیل کیے بغیر ہی بستر پر لیٹ گیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے کسی کار کے رکنے کی آواز سنی پھر کوئی دروازہ کھول کر اندر آیا اور کسی نے نچلی منزل سے اس کا نام لے کر پکارا۔ ''پیٹر، تم کہاں ہو؟''

''این۔'' اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ کئی مہینوں سے وہ اسی لمحے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ این واپس آگئی تھی۔

شاید دوبارہ اس کے ساتھ رہنے کے لیے۔ لیکن وہ بدل چکا تھا اور اس گھر میں این کی جگہ وہ تصویر آگئی تھی۔

وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا اور این کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہ شوخ رنگ کا لباس پہنے ہوئے تھی اور اس کے کھلے ہوئے بال شانوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ وہ پہلے کی طرح زندگی سے بھرپور نظر آرہی تھی۔ اس کے عقب میں دروازے کے پاس ایک آدمی کھڑا ہوا تھا۔

''پیٹر! کیا تم ٹیکسی کا کرایہ دے سکتے ہو؟ میرے پاس چینج نہیں ہے۔''

اس نے جیب سے کچھ نوٹ نکال کر ٹیکسی ڈرائیور کو دیے اور اس کے جانے کے بعد پوچھا۔ ''کیا ہوا؟ واپس کیوں آگئیں؟''

''میں نے اسے چھوڑ دیا پیٹر۔ اور میں کہاں جاتی۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی ٹھکانا نہیں۔''

کافی پینے اور اپنے بارے میں مزید کچھ بتانے کے بعد اس نے کہا۔ ''مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی۔ اس نے مجھے بالکل خالی کردیا۔ بہرحال ہماری شادی ابھی بھی قائم ہے اور مجھے یہاں رہنے کا پورا پورا حق ہے۔''

پیٹر نے کچھ نہیں کہا۔ جب وہ سیڑھیاں چڑھ کر ان کے بیڈروم میں جانے لگی تب وہ تیزی سے بولا۔ ''نہیں، تم دوسرے کمرے میں جاؤ۔''

وہ مڑی اور حیرت سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اوہ میرے خدا! کیا تم نے یہاں کسی اور کو رکھا ہوا ہے؟''

''تمہارے لیے یہ بہت غیر معمولی بات ہوگی۔'' اس نے کہا۔ ''بہت کچھ بدل چکا ہے۔ میں دوبارہ پہلے جیسا تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔''

''اوہ، بہت خوب۔ فی الحال میں اس بارے میں نہیں سوچ سکتی کیونکہ بہت تھک چکی ہوں اور مجھے لباس بھی تبدیل کرنا ہے۔'' وہ الماری کھولتے ہوئے بولی۔ ''میرے کپڑے کہاں ہیں؟''

''وہ میں نے چیریٹی شاپ پر دے دیے۔''

''اوہ بے وقوف انسان۔ ان میں میرے کچھ قیمتی سوئٹر بھی تھے۔ اب مجھے پہننے کے لیے پاجامہ یا کوئی اور چیز دو۔''

اس کی نظر بستر کے سرہانے رکھی ہوئی تصویر پر گئی۔ وہ چونکتے ہوئے بولی۔ ''یہ تصویر یہاں کیوں رکھی ہے۔ اسے ہٹاؤ۔''

پیٹر منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''میں باہر جارہا ہوں۔ تمہارا جو جی چاہے کرو۔''

وہ غصے میں بڑبڑاتا ہوا کوٹ پہنے بغیر ہی باہر آگیا لیکن زیادہ سردی نہیں تھی۔ وہ دریا کے ساتھ ساتھ چلا جارہا تھا۔ اسے لگا جیسے وہ اب گھر جانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہاں اس کی منہ پھٹ اور زبان دراز بیوی آچکی تھی۔ تقریباً ایک میل چلنے کے بعد وہ ایک پب میں داخل ہوا۔ اس نے یکے بعد دیگرے بیئر کے دو گلاس چڑھائے تو اس کا دماغ کام کرنے لگا۔ اس نے سوچا کہ اسے این کا سامنا کرنا چاہیے۔ شاید اسی صورت میں وہ کچھ کرسکے گا۔ وہی جو این اس سے کروانا چاہتی ہے۔

اگلے روز صبح اس نے اپنا اوورکوٹ دیوار پر لٹکا دیکھا تو اسے ایک ایسی بات یاد آئی جس نے اس کے پورے بدن میں سنسنی دوڑادی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے گیری کی دکان کا منظر گھوم گیا جہاں میز پر پامیلا کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس نے گیری کے دیے ہوئے چیک کے ٹکڑے اپنے اوورکوٹ کی جیب میں رکھ لیے تھے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ تیزی سے اٹھا اور اوورکوٹ کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ اس نے ایک ایک کرکے ساری جیبیں دیکھ ڈالیں لیکن وہ ٹکڑے غائب تھے۔ کاغذ کے یہ قیمتی ٹکڑے گیری کے ساتھ اس کا تعلق ظاہر کرسکتے تھے۔

اس نے پورا فرش چھان مارا۔ یہ سوچ کر کہ شاید اس نے خود ہی غلطی سے وہ ٹکڑے نیچے پھینک دیے ہوں لیکن وہاں بھی کچھ نہیں تھا پھر اسے این کا خیال آیا۔ اس نے اسے آواز لگائی۔ وہ سٹنگ روم سے آئی اور بولی۔

''ہیلو پیٹر ڈارلنگ۔ میں ابھی ابھی شہر سے واپس آئی ہوں۔ مسز ہیمن نے مجھے اپنی کار میں لفٹ دے دی تھی۔ وہ مجھے دوبارہ یہاں دیکھ کر بہت حیران ہوئی لیکن کچھ بولی نہیں۔''

''کیا تم نے میرے کوٹ کی جیبوں کی تلاشی لی تھی؟''

''اتنا ناراض ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس بالکل پیسے نہیں تھے اور الماری میں بھی کچھ نہیں ملا۔ اس لیے میں نے یہ سوچ کر تمہارے کوٹ کی جیبیں ٹٹولیں کہ شاید کچھ چینج مل جائے تاکہ میں اپنے لیے کچھ کھانے پینے کی چیزیں لے آؤں۔''

''پھر تمہیں کیا ملا؟''

''تمہاری جیب سے مجھے پھٹا ہوا ایک چیک ملا جس پر ایک رقم لکھی ہوئی تھی اور کسی گیریسن نامی شخص کے دستخط تھے۔ کیا تم نے غصے میں آکر وہ چیک پھاڑا تھا۔ تم کتنے بدل گئے ہو جبکہ میں تمہیں ایک محتاط شخص سمجھتی تھی۔ بہرحال میں وہ چیک لے کر بینک گئی تھی۔''

''کیا؟'' وہ چلایا۔

''میں نے انہیں بتایا کہ یہ چیک غلطی سے پھٹ گیا ہے۔ منیجر کا کہنا تھا کہ اس کے باوجود بھی یہ کیش ہوسکتا ہے۔ وہ ایسا کرسکتے ہیں تاہم وہ چیک فوراً ہی کیش نہیں ہوا۔ غالباً منیجر نے کہا تھا کہ وہ ان ٹکڑوں کو مزید غور اور تصدیق کے لیے آگے بھیجے گا۔''

چھ ماہ بعد وہ پیٹر سے ملنے جیل گئی تو وہاں کی حالت دیکھ کر اس سے رہا نہ گیا اور وہ بولی۔ ''اوہ میرے خدا! کتنی ناگوار بو ہے۔ کیا کبھی اس جگہ کی صفائی نہیں ہوتی؟ بہرحال میں یہ بتانے آئی ہوں کہ وکیل کی فیس دینے کے لیے گھر کی ہر چیز فروخت کرنا ہوگی۔ تمہارا کیس بہت کمزور ہے۔ اس چیک کے ٹکڑوں سے اس عورت کا ڈی این اے میچ کرگیا ہے۔ ان پر پامیلا کا لعاب لگا ہوا تھا۔ اس سے پہلے بینک منیجر اخبار میں پامیلا کے قتل کی خبر پڑھ چکا تھا۔ اس لیے تمہارے نام لکھا ہوا چیک دیکھ کر اسے کچھ شک ہوا۔ پھر پولیس نے تمہارا ذخیرہ دیکھا تو گیری کی دکان سے تمہارا تعلق ثابت ہوگیا۔ رہی سہی کسر گیری کے اس خط نے پوری کردی جو اس نے اپنی بیوی کو لکھا تھا جس میں اس نے کسی خاص تصویر پر نظر رکھنے کی بات کی تھی۔ میں نہیں جانتی کہ تم اس معاملے میں کیسے ملوث ہوگئے لیکن تم پر گیری اور اس کی بیوی کو قتل کرنے کا الزام ہے۔''

پیٹر اب بھی اسی تصویر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے این سے کہا۔ ''وہ تصویر مت بیچنا جس میں ایک عورت فر کا کوٹ پہنے ہوئے کھڑی ہے۔''

''مجھے افسوس ہے پیٹر۔ اسے بیچنا پڑا۔ نیلام کرنے والے کا کہنا تھا کہ پورے گھر میں یہی ایک قیمتی چیز ہے جس کے اچھے پیسے مل سکتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جب میں اسے پیک کررہی تھی تو مجھے اس کی آنکھوں سے ڈر لگ رہا تھا۔'' وہ اپنے موٹے کوٹ میں کانپتے ہوئے بولی۔ ''اس کی زرد آنکھوں کی سردی میری ریڑھ کی ہڈی میں اتر گئی۔ تم کیوں مسکرا رہے ہو پیٹر۔ کسے دیکھ رہے ہو؟''

این کے بائیں کندھے کے پیچھے دیوار پر ایک سایہ نمودار ہورہا تھا۔ وہی نقاب میں چھپا چہرہ اور کپڑے کی کئی تہوں میں لپٹا ہوا جسم۔ وہ این کو کیا بتاتا کہ جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے، این نہیں دیکھ سکتی۔ اسی لمحے اسے یقین ہوگیا کہ یہ تصویر چاہے کتنی بار فروخت ہوجائے لیکن اس کا تصور ہمیشہ اس کے ساتھ رہے گا۔

پامیلا نے رسمی تکلفات میں پڑے بغیر گیری کی میز کی دراز کھولی اور اس میں سے کاغذ کے ٹکڑے نکالے۔ جب اس نے انہیں میز پر رکھا تو پیٹر نے پہچان لیا۔ یہ وہی تین سو پونڈ کا چیک تھا جو اس نے پھاڑ کر گیری کی دکان میں ڈال دیا تھا۔

''وہ تصویر کہاں ہے؟'' پامیلا نے تیز لہجے میں کہا۔

پیٹر نے وہ پیکٹ میز پر رکھ دیا۔ اس نے اپنے دستانے نہیں اتارے تھے۔ اس لیے مزید کسی تیاری کی ضرورت نہیں تھی۔ پامیلا کا دھیان پیکٹ کی طرف تھا کہ پیٹر نے اچانک اس کی گردن دبوچ لی اور اس نے دونوں ہاتھوں سے پامیلا کا گلا دبانا شروع کیا اور اس کی گرفت سخت ہوتی گئی۔ پامیلا نے اپنے آپ کو چھڑانے کی جدوجہد کی لیکن ناکام رہی اور تھوڑی ہی دیر میں کانٹے میں پھنسی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپنے لگی۔ اس کے ہونٹوں اور زبان سے رال بہہ رہی تھی۔ پیٹر نے اپنا ایک ہاتھ گردن سے ہٹا کر اس کے منہ پر رکھا لیکن وہ اس سے پہلے ہی ساکت ہو چکی تھی۔

باہر اندھیرا پھیل چکا تھا۔ البتہ کچھ فاصلے پر ایک اسٹریٹ لائٹ روشن تھی۔ پیٹر نے دکان کی لائٹ بند کی اور باہر آ گیا۔ گلی میں بالکل سناٹا تھا۔ کسی نے اسے دکان سے باہر نکلتے نہیں دیکھا۔ اپنی گلی کے موڑ پر پہنچ کر اس نے آہستہ سے ڈسٹ بن کا ڈھکنا اٹھایا اور اس میں دستانوں کے ساتھ وہ پیکٹ بھی پھینک دیا جس میں تصویر کے بجائے محض ایک گتے کا ٹکڑا تھا۔ اسے یقین تھا کہ صبح کارپوریشن کی گاڑی آنے سے پہلے علاقے کے لوگ اس میں مزید کچرا ڈالیں گے اور یہ دونوں چیزیں اس ڈھیر میں دب جائیں گی۔

گھر پہنچ کر اس نے اپنا اوورکوٹ ہینگر میں لٹکایا اور بیڈروم میں چلا گیا۔ جہاں وہ تصویر اس کا انتظار کر رہی تھی۔

''اب تم بالکل محفوظ ہو۔'' اس نے تصویر ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ صبح اس تصویر کو مستقل طور پر اپنے کمرے کی دیوار پر آویزاں کر دے گا تاکہ باہر سے آنے والا کوئی ملاقاتی اسے نہ دیکھ سکے۔

وہ بہت تھک چکا تھا۔ اس لیے لباس تبدیل کیے بغیر ہی بستر پر لیٹ گیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے کسی کار کے رکنے کی آواز سنی پھر کوئی دروازہ کھول کر اندر آیا اور کسی نے نچلی منزل سے اس کا نام لے کر پکارا۔ ''پیٹر، تم کہاں ہو؟''

''این۔'' اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ کئی مہینوں سے وہ اسی لمحے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ این واپس آ گئی تھی۔ شاید دوبارہ اس کے ساتھ رہنے کے لیے۔ لیکن وہ بدل چکا تھا اور اس گھر میں این کی جگہ وہ تصویر آ گئی تھی۔

وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا اور این کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہ شوخ رنگ کا لباس پہنے ہوئے تھی اور اس کے کھلے ہوئے بال شانوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ وہ پہلے کی طرح زندگی سے بھرپور نظر آ رہی تھی۔ اس کے عقب میں دروازے کے پاس ایک آدمی کھڑا ہوا تھا۔

''پیٹر! کیا تم ٹیکسی کا کرایہ دے سکتے ہو؟ میرے پاس چینج نہیں ہے۔''

اس نے جیب سے کچھ نوٹ نکال کر ٹیکسی ڈرائیور کو دیے اور اس کے جانے کے بعد پوچھا۔ ''کیا ہوا؟ واپس کیوں آ گئیں؟''

''میں نے اسے چھوڑ دیا پیٹر۔ اور میں کہاں جاتی۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی ٹھکانا نہیں۔''

کافی پینے اور اپنے بارے میں مزید کچھ بتانے کے بعد اس نے کہا۔ ''مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی۔ اس نے مجھے بالکل خالی کر دیا۔ بہرحال ہماری شادی ابھی بھی قائم ہے اور مجھے یہاں رہنے کا پورا پورا حق ہے۔''

پیٹر نے کچھ نہیں کہا۔ جب وہ سیڑھیاں چڑھ کر ان کے بیڈروم میں جانے لگی تب وہ تیزی سے بولا۔ ''نہیں، تم دوسرے کمرے میں جاؤ۔''

وہ مڑی اور حیرت سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اوہ میرے خدا! کیا تم نے یہاں کسی اور کو رکھا ہوا ہے؟''

''تمہارے لیے یہ بہت غیر معمولی بات ہوگی۔'' اس نے کہا۔ ''بہت کچھ بدل چکا ہے۔ میں دوبارہ پہلے جیسا تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔''

''اوہ، بہت خوب۔ فی الحال میں اس بارے میں نہیں سوچ سکتی کیونکہ بہت تھک چکی ہوں اور مجھے لباس بھی تبدیل کرنا ہے۔'' وہ الماری کھولتے ہوئے بولی۔ ''میرے کپڑے کہاں ہیں؟''

''وہ میں نے چیریٹی شاپ پر دے دیے۔''

''اوہ بے وقوف انسان۔ ان میں میرے کچھ قیمتی سویٹر بھی تھے۔ اب مجھے پہننے کے لیے پاجامہ یا کوئی اور چیز دو۔''

اس کی نظر بستر کے سرہانے رکھی ہوئی تصویر پر گئی۔ وہ چونکتے ہوئے بولی۔ ''یہ تصویر یہاں کیوں رکھی ہے۔ اسے ہٹاؤ۔''

پیٹر منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''میں باہر جا رہا ہوں۔ تمہارا جو جی چاہے کرو۔''

وہ غصے میں بڑبڑاتا ہوا کوٹ پہنے بغیر ہی باہر آ گیا لیکن زیادہ سردی نہیں تھی۔ وہ دریا کے ساتھ ساتھ چلا جا رہا تھا۔ اسے لگا جیسے وہ اب گھر جانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہاں اس کی منہ پھٹ اور زبان دراز بیوی آ چکی تھی۔ تقریباً ایک میل چلنے کے بعد وہ ایک پب میں داخل ہوا۔ اس نے یکے بعد دیگرے بیئر کے دو گلاس چڑھائے تو اس کا دماغ کام کرنے لگا۔ اس نے سوچا کہ اسے این کا سامنا کرنا چاہیے۔ شاید اسی صورت میں وہ کچھ کر سکے گا۔ وہی جو این اس سے کروانا چاہتی ہے۔

اگلے روز صبح اس نے اپنا اوورکوٹ دیوار پر لٹکا دیکھا تو اسے ایک ایسی بات یاد آئی جس نے اس کے پورے بدن میں سنسنی دوڑا دی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے گیری کی دکان کا منظر گھوم گیا جہاں میز پر پامیلا کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس نے گیری کے دیے ہوئے چیک کے ٹکڑے اپنے اوورکوٹ کی جیب میں رکھ لیے تھے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ تیزی سے اٹھا اور اوورکوٹ کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ اس نے ایک ایک کر کے ساری جیبیں دیکھ ڈالیں لیکن وہ ٹکڑے غائب تھے۔ کاغذ کے یہ قیمتی ٹکڑے گیری کے ساتھ اس کا تعلق ظاہر کر سکتے تھے۔

اس نے پورا فرش چھان مارا۔ یہ سوچ کر کہ شاید اس نے خود ہی غلطی سے وہ ٹکڑے نیچے پھینک دیے ہوں لیکن وہاں بھی کچھ نہیں تھا پھر اسے این کا خیال آیا۔ اس نے اسے آواز لگائی۔ وہ سٹنگ روم سے آئی اور بولی۔

''ہیلو پیٹر ڈارلنگ۔ میں ابھی ابھی شہر سے واپس آئی ہوں۔ مسز ہیمن نے مجھے اپنی کار میں لفٹ دے دی تھی۔ وہ مجھے دوبارہ یہاں دیکھ کر بہت حیران ہوئی لیکن کچھ بولی نہیں۔''

''کیا تم نے میرے کوٹ کی جیبوں کی تلاشی لی تھی؟''

''اتنا ناراض ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس بالکل پیسے نہیں تھے اور الماری میں بھی کچھ نہیں ملا۔ اس لیے میں نے یہ سوچ کر تمہارے کوٹ کی جیبیں ٹٹولیں کہ شاید کچھ چینج مل جائے تاکہ میں اپنے لیے کچھ کھانے پینے کی چیزیں لے آؤں۔''

''پھر تمہیں کیا ملا؟''

''تمہاری جیب سے مجھے پھٹا ہوا ایک چیک ملا جس پر ایک رقم لکھی ہوئی تھی اور کسی گیریسن نامی شخص کے دستخط تھے۔ کیا تم نے غصے میں آ کر وہ چیک پھاڑا تھا۔ تم کتنے بدل گئے ہو جبکہ میں تمہیں ایک محتاط شخص سمجھتی ہوں۔ بہرحال میں وہ چیک لے کر بینک گئی تھی۔''

''کیا؟'' وہ چلایا۔

''میں نے انہیں بتایا کہ یہ چیک غلطی سے پھٹ گیا ہے۔ منیجر کا کہنا تھا کہ اس کے باوجود بھی یہ کیش ہو سکتا ہے۔ وہ ایسا کر سکتے ہیں تاہم وہ چیک فوراً ہی کیش نہیں ہوا۔ غالباً منیجر نے کہا تھا کہ وہ ان ٹکڑوں کو مزید غور اور تصدیق کے لیے آگے بھیجے گا۔''

چھ ماہ بعد وہ پیٹر سے ملنے جیل گئی تو وہاں کی حالت دیکھ کر اس سے رہا نہ گیا اور وہ بولی۔ ''اوہ میرے خدا! کتنی ناگوار بو ہے۔ کیا کبھی اس جگہ کی صفائی نہیں ہوتی؟ بہرحال میں یہ بتانے آئی ہوں کہ وکیل کی فیس دینے کے لیے گھر کی ہر چیز فروخت کرنا ہوگی۔ تمہارا کیس بہت کمزور ہے۔ اس چیک کے ٹکڑوں سے اس عورت کا ڈی این اے میچ کر گیا ہے۔ ان پر پامیلا کا لعاب لگا ہوا تھا۔ اس سے پہلے بینک منیجر اخبار میں پامیلا کے قتل کی خبر پڑھ چکا تھا۔ اس لیے تمہارے نام لکھا ہوا چیک دیکھ کر اسے کچھ شک ہوا۔ پھر پولیس نے تمہارا ذخیرہ دیکھا تو گیری کی دکان سے تمہارا تعلق ثابت ہو گیا۔ رہی سہی کسر گیری کے اس خط نے پوری کر دی جو اس نے اپنی بیوی کو لکھا تھا جس میں اس نے کسی خاص تصویر پر نظر رکھنے کی بات کی تھی۔ میں نہیں جانتی کہ تم اس معاملے میں کیسے ملوث ہو گئے لیکن تم پر گیری اور اس کی بیوی کو قتل کرنے کا الزام ہے۔''

پیٹر اب بھی اسی تصویر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے این سے کہا۔ ''وہ تصویر مت بیچنا جس میں ایک عورت فر کا کوٹ پہنے ہوئے کھڑی ہے۔''

''مجھے افسوس ہے پیٹر۔ اسے بیچنا پڑا۔ نیلام کرنے والے کا کہنا تھا کہ پورے گھر میں یہی ایک قیمتی چیز ہے جس کے اچھے پیسے مل سکتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جب میں اسے پیک کر رہی تھی تو مجھے اس کی آنکھوں سے ڈر لگ رہا تھا۔'' وہ اپنے موٹے کوٹ میں کانپتے ہوئے بولی۔ ''اس کی زرد آنکھوں کی سردی میری ریڑھ کی ہڈی میں اتر گئی۔ تم کیوں مسکرا رہے ہو پیٹر۔ کسے دیکھ رہے ہو؟''

این کے بائیں کندھے کے پیچھے دیوار پر ایک سایہ نمودار ہو رہا تھا۔ وہی نقاب میں چھپا چہرہ اور کپڑے کی کئی تہوں میں لپٹا ہوا جسم۔ وہ این کو کیا بتاتا کہ جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے، این نہیں دیکھ سکتی۔ اسی لمحے اسے یقین ہو گیا کہ یہ تصویر چاہے کتنی بار فروخت ہو جائے لیکن اس کا تصور ہمیشہ اس کے ساتھ رہے گا۔

جواری

تمکین رضا

کھیلوں کی دنیا سے جڑے رہنے والے شائقین وہاں ہونے والے ہر رموز سے واقفیت رکھتے ہیں... میدان کے اندر اور باہر ہونے والی ہر ڈیل... چالبازوں کے لیے آمدنی کا ذریعہ ہوتی ہے... ایسے ہی دھوکے بازوں اور جعل سازوں کی فنکاریاں...

اپنی بیٹی کی خاطر آخری فائٹ کھیلنے والے کھلاڑی کا حتمی انداز......

ہنری لوہے کی میز کے پیچھے رکھی ہوئی لکڑی کی کرسی پر بیٹھا ہوا یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ متوقع پوچھ گچھ سے پریشان نہیں ہے۔ اسے ایک پولیس آفیسر نے ریور بوٹ ڈچز، سے ایک بلاک کے فاصلے پر اپنی گاڑی میں یہ کہہ کر بٹھایا کہ اس سے چند سوالات کرنے ہیں، پھر وہ اسے وہاں سے تین بلاک دور پولیس اسٹیشن لے کر آیا اور ایک ایسے کمرے میں بٹھادیا جس میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔

بیس منٹ بعد عمدہ لباس میں ملبوس ایک شخص ہاتھوں میں کافی کے دو کپ لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے ایک کپ ہنری کے سامنے رکھا اور خود دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

''مسٹر فریڈرک۔'' اس نے ہنری سے کہا۔ ''تم سے مل کر خوشی ہوئی۔''

''میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں سراغ رساں بینیٹ۔''

''تم مجھے جانتے ہو؟''

''ہاں تم ایک ہنس مکھ پولیس آفیسر اور مہرباں سراغ رساں ہو۔ تمہارے بارے میں مشہور ہے کہ تم دس منٹ میں کسی بھی شخص سے اس کے سارے راز اگلوا سکتے ہو۔''

''بعض اوقات ساکھ فائدہ مند ہوتی ہے اور بعض اوقات نہیں۔ تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''میں محض ایک عام شہری ہوں۔''

''ہاں۔'' سراغ رساں نے کہا۔ ''تم ایک ایسے شخص ہو جو ہر زاویے سے دیکھ سکتا ہے۔''

''شاید اس لیے کہ میں کبھی کبھی تاش کھیلتا ہوں۔''

''اور تم ایک اچھے پوکر کے کھلاڑی بھی ہو۔''

''یہ بھی میری وجہ شہرت ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ کام کی بات کرتے ہیں۔ تم جونی کوپر کو جانتے ہو؟''

''ہاں۔''

''ذاتی طور پر؟''

''ہاں، ہمارے درمیان کبھی کبھی گفتگو ہوتی رہتی ہے۔''

''تمہیں معلوم ہے کہ وہ کہاں ہے؟ ہم اسے تلاش کر رہے ہیں۔''

''کیوں؟''

''کیا اس نے تمہیں پینتھر کے بارے میں کچھ بتایا تھا؟''

ہنری نے چند لمحے توقف کرنے کے بعد کہا۔ ''کیا تم سمجھتے ہو کہ اس نے پینتھر کو قتل کیا ہے۔''

''کیا تم ایسا نہیں سمجھتے؟''

''نہیں۔'' ہنری نے کہا۔

''کیوں؟''

''کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اسے کس نے قتل کیا ہے؟''

''واقعی؟'' بینیٹ آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔

''کون ہے وہ؟''

''تم اسے پسند نہیں کرو گے۔''

''بتاؤ تو سہی۔''

''میں ایک کہانی سنانا چاہتا ہوں۔''

☆☆☆

''کیا تم ہنری ہو؟''

یہ ایک ہفتے پہلے کی بات ہے۔ ہنری دریائی کشتی ڈچز میں واقع بار کی ریلنگ کے ساتھ کھڑا ہوا تھا اور اس نے بڑی احتیاط سے اسکاچ کا گلاس پکڑ رکھا تھا۔ اس رات اس نے جوئے میں بھاری رقم جیتی تھی۔ اس لیے وہ یہ فضول خرچی کر سکتا تھا۔ اس نے بارٹینڈر پیٹرک سے کہا کہ وہ اس کے لیے

ایک بڑا گلاس تیار کرے۔

ہنری نے کندھے پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو وہ جونی کوپر تھا۔

اس نے دوبارہ کہا۔ ''کیا تم ہنری ہو؟''

''ہاں۔'' ہنری نے گلاس کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے کہا۔

''اور تم جونی کوپر۔''

''بالکل ٹھیک۔'' کوپر بولا۔ ''کیا ہم بات کر سکتے ہیں؟'' اس نے عرشے کی طرف اشارہ کیا۔

ہنری نے اپنے گلاس کی طرف دیکھا اور پیٹرک سے کہا۔ ''میں واپس آ کر پی لوں گا۔''

وہ دونوں عرشے پر چلے گئے جہاں مسی پی کی گرم ہوا نے ان کا استقبال کیا۔ ہنری نے اپنے ہاتھ ریلنگ پر رکھے اور دور سے نظر آنے والی فیکٹریوں کی جانب دیکھنے لگا۔

''میں نے کچھ لوگوں سے تمہارے بارے میں سنا ہے۔'' کوپر بولا۔ ''کہ تم اچھے آدمی ہو۔ میرا مطلب ہے کہ تم جو کام کرتے ہو، اس میں بہت اچھے ہو۔ میرا ابھی ایک مسئلہ ہے۔''

''وہ کیا؟'' ہنری نے پوچھا۔

''ہفتے کو ہونے والا مقابلہ۔ تمہیں اس بارے میں معلوم ہے؟''

''ہاں، میں نے اس کا ٹکٹ لیا ہے۔''

جونی کوپر ہفتے کے روز اپنے لائٹ ہیوی ویٹ ٹائٹل کے دفاع کے لیے بلی بینسن المعروف دی پینتھر سے مقابلہ کرنے والا تھا۔ کوپر کو مقامی شائقین کی حمایت حاصل تھی جو اس کے منظم انداز کو پسند کرتے تھے۔ وہ اپنے حریف کو ابتدائی چند راؤنڈ میں بھگا بھگا کر تھکا دیتا اور جیسے ہی وہ سست پڑتا وہ تابڑ توڑ حملے کر کے اسے ناک آؤٹ کر دیتا۔ اسی لیے لوگ اسے پسند کرتے تھے۔ ان کی پسندیدگی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ ایماندار تھا اور اس نے کبھی کوئی میچ فکس نہیں کیا تھا۔

جونی کوپر لوگوں سے انعام وصول نہیں کرتا تھا۔ اس نے یہ اصول بنا رکھا تھا کہ وہ کبھی کسی سے پیسے نہیں لے گا۔ رنگ کے گرد اگلی پانچ قطاروں میں بیٹھے ہوئے لوگ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے۔ اس نے باکسنگ کی دنیا پر واضح کر دیا تھا کہ وہ رشوت نہیں لیتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے قومی سطح پر زیادہ توجہ نہیں ملی اور مڈ ویسٹ سے باہر اسے بہت کم مقابلے ملے لیکن باکسنگ کے شائقین اسے پسند کرتے تھے۔

''لوگ پینتھر کے بارے میں کیا کہہ رہے ہیں؟''

کوپر نے پوچھا۔

''تم نہیں جانتے؟''

''جانتا ہوں لیکن تم نے کیا سنا ہے؟''

''یہی کہ وہ ایک اچھا، پھرتیلا اور نوجوان باکسر ہے۔''

ہنری نے کہا۔ ''لیکن تم اسے ہرا سکتے ہو۔ ممکن ہے کہ چار کی جگہ چھٹے یا ساتویں راؤنڈ میں فیصلہ ہو۔''

''ہاں۔'' کوپر نے کہا۔ ''لہٰذا میں تم سے ایک رعایت چاہتا ہوں۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے کچھ نوٹ نکالے اور ہنری کو دیتے ہوئے کہا۔ ''پورے ایک ہزار ہیں۔''

''کون سے راؤنڈ میں فیصلہ چاہتے ہو؟''

''چوتھے راؤنڈ میں۔''

''کیا تم سمجھتے ہو کہ چوتھے راؤنڈ تک مقابلہ کر لو گے؟'' ہنری نے پوچھا۔

''نہیں۔'' کوپر نے کہا پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں شرطیہ کہتا ہوں کہ چوتھے راؤنڈ میں گر جاؤں گا۔''

''تم مذاق کر رہے ہو۔'' ہنری نے کہا۔

''نہیں، میں سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں، اب تمہیں یہ کام کرنا ہے۔''

''لیکن کیوں؟''

''مجھے باکسنگ سے کبھی کچھ نہیں ملا۔ لوگ سمجھ رہے ہیں کہ میں جیت جاؤں گا لیکن جب تم شرط لگاؤ گے تو کوئی اسے نہیں سمجھ پائے گا۔''

''کیا کسی نے تمہارے دماغ میں یہ بات ڈالی ہے؟''

''نہیں، یہ میرا اپنا آئیڈیا ہے۔''

''مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میں کوپر کی ہار پر شرط لگاؤں۔''

''تم اپنے ساتھ دوسرے لوگوں کو شامل کر لو۔'' کوپر نے کہا۔

''اگر تم چوتھے راؤنڈ میں گر گئے تو لوگوں کو شک ہو جائے گا۔''

''چوتھا راؤنڈ ہی ٹھیک رہے گا۔''

''کیا تم ریٹائر ہو رہے ہو؟'' ہنری نے پوچھا۔

کوپر نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''مقابلہ ختم ہونے کے بعد تم شرط میں جیتی ہوئی رقم میری نیو ہیون کو دے دو گے۔ وہ ڈاگ ٹاؤن میں رہتی ہے۔ اس میں سے جو تم مناسب سمجھو، اپنی محنت کا معاوضہ سمجھ کر رکھ لینا۔''

☆☆☆

''اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں ایک اور آفیسر کو بلا لوں۔'' بینیٹ نے کہا اور باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک لمبے چوڑے آدمی کے ساتھ واپس آیا اور بولا۔

''ہنری، یہ لیفٹیننٹ پال میکم ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ بھی تمہاری کہانی سن لے۔''

☆☆☆

ہنری دوسرے دن میری نیو ہیون کی تلاش میں نکل گیا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ لڑکی کون ہے جس پر اچانک ہی قسمت مہربان ہو گئی ہے۔ لیکن اسے تلاش کرنا خاصا مشکل تھا۔ بالآخر اس نے لائبریری میں جا کر پبلک ریکارڈ دیکھنے کا فیصلہ کیا کہ شاید اس میں اس نام کی کوئی لڑکی مل جائے۔

اس نے کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی لڑکی سے کہا۔ ''معاف کرنا، میں اس علاقے میں ایک ایسی لڑکی کی تلاش میں ہوں جس کے نام کے آخر میں نیو ہیون آتا ہے۔ کیا اس کے بارے میں معلوم کرنے کا کوئی طریقہ ہے؟''

لڑکی نے حیرت سے اسے دیکھا لیکن کچھ بولی نہیں۔

''کیا تم میری کچھ مدد کر سکتی ہو؟''

''شاید۔'' اس نے کہا۔ ''میرے نام کے آخر میں نیو ہیون آتا ہے۔''

ہنری نے اسے حیرت سے دیکھا اور بولا۔ ''کیا تمہارا نام میری ہے۔''

''ہاں۔'' وہ بولی۔ ''تم مجھے کیوں تلاش کر رہے ہو؟''

''کیا تم جونی کوپر کو جانتی ہو؟''

''نہیں۔'' وہ بولی۔ ''کیا میرے لیے یہ جاننا ضروری ہے؟''

ہنری نے لڑکی کو غور سے دیکھا۔ اس نے گلابی رنگ کا بلاؤز اور اسکرٹ پہن رکھا تھا اور بالوں کو پیچھے کی طرف کر کے ایک بینڈ سے باندھ رکھا تھا۔

''تم کسی باکسر کو جانتی ہو؟''

لڑکی کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔ وہ بولی۔ ''بالکل نہیں، تم کون ہو؟''

''میرا نام ہنری ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اور میں الجھن میں پڑ گیا ہوں۔''

''میں بھی الجھ رہی ہوں۔'' وہ لڑکی بولی۔ ''کیا تم بتا سکتے ہو کہ مجھے کیوں تلاش کر رہے ہو؟''

''یقیناً، کیوں نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''میری ایک ایسے

شخص سے ملاقات ہوئی ہے جو تمہیں کچھ رقم دینا چاہتا ہے اور وہ باکسر جونی کوپر ہے۔ کیا تمہیں حیرت نہیں ہوئی؟''

''وہ ایسا کیوں چاہ رہا ہے؟'' میری نے کہا۔ ''میں نے پہلے کبھی اس... کا نام نہیں سنا۔''

''مجھے کوئی اندازہ نہیں ہے۔'' ہنری بولا۔ ''امید تھی کہ شاید تم کچھ بتا سکو، تمہارے کیا حالات ہیں؟''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔'' اس نے کہا۔

''اکیلی رہتی ہو؟''

''میں سترہ سال کی ہوں۔'' اس نے کہا جس کا مطلب تھا۔ ''نہیں۔''

''ماں کے ساتھ ہو؟''

''یہ ذاتی نوعیت کا سوال ہے۔''

''باپ؟''

''اب میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔''

اس کا مطلب ہے کہ وہ ماں کے ساتھ رہتی ہے، تو کیا کوپر اس کا باپ تھا۔ یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی۔ میری کی آنکھیں کوپر جیسی تھیں۔

''ٹھیک ہے میری۔'' اس نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''پرسکون ہو جاؤ۔''

''میں کسی باکسر کو نہیں جانتی۔'' اس نے کہا۔

☆☆☆

بینیٹ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''گویا تمہارا خیال ہے کہ کوپر نے مقابلہ ہارنے کے بارے میں اس لیے سوچا کہ وہ شرط میں جیتی ہوئی رقم اس لڑکی میری کو دے دے جو شاید اس کی بیٹی ہے۔''

ہنری دو پولیس والوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ جبکہ تیسرا راہداری میں سے اندر جھانک رہا تھا۔ بینیٹ نے آواز لگائی۔ ''روکی، اندر آ جاؤ اور تم بھی سنو۔''

''جاری رکھو۔'' بینیٹ نے روکی کے آنے کے بعد کہا۔

ہنری سر کھجاتے ہوئے بولا۔ ''کیا میں نے کالان جونیئر کا تذکرہ کیا؟''

''ڈیٹرائٹ کا بدمعاش۔'' بینیٹ نے کہا۔ ''نہیں، وہ اس معاملے میں کہاں سے آ گیا؟''

''وہ یہ مقابلہ دیکھنے شہر میں موجود تھا۔ پینتھر اسی کا آدمی ہے۔''

☆☆☆

جمعرات کے روز ہنری نے بار میں پیٹرک سے پوچھا۔ ''کیا تم نے ایمی کو دیکھا ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ میں نے اسے سیفائر روم میں دیکھا تھا۔'' پیٹرک نے کہا۔

ہنری مڑا اور تیزی سے سیفائر روم میں چلا گیا۔ جہاں عمدہ ملبوسات اور مشروبات دستیاب تھے۔ ایمی نیلے رنگ کے گاؤن میں ملبوس شیمپین کی چسکیاں لے رہی تھی۔ وہ اس طرح کمرے کا جائزہ لے رہی تھی جیسے کوئی بلی کھیتوں میں زخمی پرندوں کو تلاش کرتی ہے۔ جیسے ہی اس نے ہنری کو دیکھا وہ لگاوٹ سے بولی۔

''ہنری! میں تمہاری کیا خدمت کر سکتی ہوں؟''

''وہی جو تم ہمیشہ کرتی ہو، یعنی معلومات۔''

''بہت اچھا۔'' وہ بولی۔

''کیا تم نے ہفتے کی شب ہونے والے مقابلے کے بارے میں کچھ سنا ہے؟''

''کوپر بمقابلہ پینتھر؟'' ایمی بولی۔ ''مجھے باکسنگ کے بارے میں معلومات نہیں ہیں۔ البتہ لوگوں کے خیال میں کوپر فیورٹ ہے جبکہ پینتھر اس کے مقابلے میں نوجوان اور پھرتیلا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ کوپر سے سخت مقابلہ کرے گا۔''

''تم کس کے ساتھ یہ مقابلہ دیکھنا پسند کرو گی؟''

''تمہیں کیوں بتاؤں؟'' وہ شوخی سے بولی۔

وہ اس جانب دیکھنے لگی جہاں ایک چھوٹے قد کا نوجوان شخص قیمتی لباس پہنے..... کھڑا تھا۔ لگتا تھا جیسے کوئی بچہ اپنے باپ کے کپڑے پہن کر آ گیا ہے۔ ہنری نے اسے غصے میں اپنے دونوں باڈی گارڈ سے باتیں کرتے دیکھا جو اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔

''تم جونیئر کو شکار کرنا چاہ رہی ہو؟'' ہنری نے پوچھا۔

جونیئر، ڈیٹرائٹ کے بدمعاشوں کالان کی تیسری نسل سے تھا۔ اس سے پہلے اس کا باپ ڈیڈ کالان اور دادا گراہم کالان اپنے گروہ کی سربراہی کر چکے تھے۔ اسی وقت کالان کے پاس سے ایک سگریٹ بیچنے والی لڑکی گزری۔ کالان نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن وہ اسے گھورتی ہوئی آگے نکل گئی۔ کالان نے قہقہہ لگایا اور آگے بڑھ گیا۔

دوسرے دن وہ کالان جونیئر سے ملنے کے ارادے سے ڈیجز پر گیا۔ وہ اپنے دونوں باڈی گارڈز کے ساتھ ٹہل رہا تھا۔ ہنری نے اس کے قریب جا کر کہا۔ ''کیا میں تمہارے

"آنے کی وجہ جان سکتا ہوں؟"

جونیئر نے اسے اوپر سے نیچے دیکھا اور بولا۔ "میں کل ہونے والا مقابلہ دیکھنے آیا ہوں۔ پینتھر میرا آدمی ہے۔ وہ تمہارے مقامی ہیرو کو ہرا دے گا۔"

"میرا خیال ہے کہ مجھے بھی وہ مقابلہ دیکھنا چاہیے۔" ہنری بولا۔

جونیئر نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "اچھا مذاق ہے۔ کل شہر میں ہونے والی یہ واحد تفریح ہے اور میں جانتا ہوں کہ تم وہاں موجود ہوگے۔"

"تم مجھے جانتے ہو؟"

"ہاں تم ہنری ہو۔ جواری اور پیشہ ور ہوشیار شخص۔"

"تم مجھے شوقیہ اسمارٹ شخص کہہ سکتے ہو کیونکہ مجھے اس کام کا کوئی معاوضہ نہیں ملتا۔"

"دلچسپ آدمی ہو۔" جونیئر نے کہا۔ "ممکن ہے کہ میں تمہیں معاوضہ دینا شروع کردوں۔ اس بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"نہیں۔" ہنری نے کہا۔ "یہ میرا مشغلہ ہے۔ البتہ اگر تم جوا کھیلنا چاہو......"

"بالکل نہیں۔" جونیئر بولا۔ "ڈیڈی نے ہمیشہ یہی کہا کہ کبھی ایسے شخص کے ساتھ مت کھیلو جسے تم نہیں جانتے۔"

"لگتا ہے کہ تمہارے ڈیڈی بہت اچھے کھلاڑی تھے؟"

"خوفناک حد تک۔" جونیئر نے کہا۔ "لیکن ہمیشہ اچھا مشورہ دیتے تھے۔ تمہارے پاس کچھ وقت ہے۔ میں تم سے اکیلے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔"

ہنری اسے ایسی جگہ لے گیا جہاں قریب میں کوئی نہیں تھا اور بولا۔ "میں تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں؟"

اس نے آواز نیچی کر کے کہا۔ "میں تم سے ایک سوال کررہا ہوں اگر تم نے ٹھیک نہیں بتایا تب بھی میں سمجھ جاؤں گا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

"ٹھیک ہے۔"

"کیا ہفتے کو ہونے والا مقابلہ فکس ہے؟"

"میں اتنا باخبر نہیں ہوں۔"

"اور اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو تمہیں معلوم ہوجاتا؟"

"میں نے افواہیں سنی ہیں۔"

جونیئر نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا اور بولا۔

"ٹھیک ہے، تمہارا شکریہ۔"

☆☆☆

ہنری یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ کوپر اس لڑکی کو شرط میں جیتی ہوئی رقم کیوں دینا چاہ رہا ہے جو اسے جانتی بھی نہیں۔ اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے اس نے میری کی ماں سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ایسے وقت لائبریری فون کیا جب میری ڈیوٹی پر نہیں تھی اور کہا کہ اسے میری کی ماں سے ایک اہم معاملے پر فوراً بات کرنی ہے۔ فون اٹھانے والی عورت نے ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر اسے میری کی ماں کا پتا دیا چنانچہ وہ جمعے کی سہ پہر یمپٹن ڈائنر پہنچ گیا جہاں اس کی ملاقات جینی سے ہوئی۔

ہنری نے اس سے ایک کپ کافی منگوائی اور اسے میزوں کے گرد چکر لگاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ کافی تھکی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ جب وہ دوبارہ اس کی میز پر آئی تو ہنری نے ازراہِ ہمدردی کہا۔ "لگتا ہے کہ آج کافی مصروف رہی ہو؟"

"نہیں، تمہیں کچھ چاہیے؟"

ہنری نے پوچھا۔ "تم جینی ہو نا؟"

اس نے ہنری کی طرف دیکھا اور بولی۔ "ہاں، تم میرا ٹیگ دیکھ سکتے ہو۔"

"اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں ایک سوال پوچھ سکتا ہوں۔"

"کیسا سوال؟"

"تم نے جونی کوپر کو کیا بتایا تھا؟"

"جونی کوپر؟" وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔ "میں اسے نہیں جانتی۔ کیا تم کھانے کا آرڈر دو گے؟"

ہنری نے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لیے اسے ایک دفعہ غور سے دیکھا اور میز پر پچاس سینٹ رکھ کر کھڑا ہوگیا۔ "ٹھیک ہے۔ کافی پلانے کا شکریہ۔"

سینٹ لوئس کے ایرینا میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ ہنری نے ایمی کا بازو تھام رکھا تھا۔ وہ اس وقت ایک خوب صورت ریشمی گاؤن پہنے ہوئے تھی جبکہ ہنری نے اپنے لباس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ اس کی نظر ایک طویل قامت شخص پر گئی جس کا نام ہیرس تھا۔ وہ لوگوں سے شرط کے پیسے وصول کرکے انہیں مار کر پکڑا رہا تھا۔

"میں ابھی آیا۔" ہنری نے کہا اور بکی کی طرف جانے لگا۔

"ٹھیک ہے۔ تم اپنا کام کرو۔" ایمی نے کہا۔

ہیرس پیشہ ور بکی تھا۔ اس لیے اس نے ایسا کوئی اشارہ نہیں دیا جس سے ظاہر ہوتا کہ ہنری کی شرط غیر معمولی ہے۔

جب وہ اپنی سیٹ پر واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ ایمی ایک بینکر ٹائپ شخص کے ساتھ مصروف تھی۔ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھا۔ اس نے ہنری کی طرف مڑ کر دیکھا اور بولی۔ "تم مقابلہ دیکھو، میں مصروف ہوں۔"

پہلے دو نمائشی مقابلے مایوس کن تھے اور لوگوں کو ان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اصل مقابلہ دیکھنے آئے تھے۔ بالآخر طویل انتظار کے بعد اناؤنسر رنگ میں آیا۔ سفید بالوں والا ڈوک للی گزشتہ بیس سال سے یہ فرائض انجام دے رہا تھا۔

"خواتین و حضرات! اس کونے میں ڈیٹرائٹ سے آیا ہوا مہمان دی پینتھر، بل بینن کھڑا ہے۔ اس کا وزن ایک سو اٹھہتر پونڈ ہے۔"

بینن جھومتا ہوا رنگ میں داخل ہو اور اس نے تماشائیوں کی طرف دیکھ کر فضا میں مکے لہرائے۔

"اور۔" للی نے کہا۔ "سینٹ لوئس مسوری سے تمہارا اپنا جونی کوپر، وزن ایک سو ستر پونڈ۔"

اس کے رنگ میں داخل ہوتے ہی لوگ دیوانہ وار نعرے لگانے اور سیٹیاں بجانے لگے۔ وہ باوقار انداز میں چلتا ہوا رنگ کے وسط میں پہنچا۔ اس نے نہ تو بے مقصد اچھل کود کی اور نہ ہی بلاوجہ مکے لہرائے۔ البتہ ہجوم کے نعروں کا جواب دینے کے لیے ایک ہاتھ فضا میں ضرور بلند کیا۔

ہنری نے دیکھا کہ کوپر ہجوم کی طرف دیکھ رہا ہے۔ شاید وہ اسے ہی تلاش کررہا ہوتا کہ اس کے سر کا اشارہ دیکھ کر سمجھ جائے کہ منصوبے پر عمل شروع ہوگیا ہے لیکن ہنری کی نشست تیسری قطار میں تھی اور وہ اندھیرے میں ایسی جگہ بیٹھا ہوا تھا جہاں اسے کوئی نہ دیکھ سکے۔

گھنٹی بجی اور پہلا راؤنڈ شروع ہوگیا۔ دونوں باکسر حرکت میں آگئے۔ وہ اپنی جگہ پر اچھلتے اور ہاتھوں کو مکا مارنے کے انداز میں آگے پیچھے کرتے رہے لیکن کسی نے بھی دوسرے پر حملہ نہیں کیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ دوسرے فریق کے داؤ پیچ سمجھنے کی کوشش کررہے ہوں۔ دو منٹ بعد راؤنڈ ختم ہوا اور دونوں باکسر اپنے اپنے کونوں میں چلے گئے۔

ہنری نے مجمع کا جائزہ لیا۔ اسے ایمی کی تلاش تھی۔ بالآخر وہ اسی بینکر ٹائپ شخص کے ساتھ نظر آگئی جس کو وہ پہلے شکار کرچکی تھی۔ ہنری مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ بہرحال یہ ایمی کے لیے کمائی کی رات تھی۔ ہنری کو اس شخص سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔

دوسرا راؤنڈ بھی پہلے جیسا ہی تھا۔ سوائے اس کے کہ کوپر کی آنکھ کے نیچے ایک ہلکا سا کٹ لگ گیا جس پر مجمع اچھل پڑا۔ دوسرے اور تیسرے راؤنڈ کے درمیانی وقفے میں ہنری نے کالان جونیئر کو دیکھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور وہ اپنے باکسر کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ دوسری جانب کوپر نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور اس کی ٹھوڑی نیچے کی جانب جھکی ہوئی تھی۔ اس کا منیجر چلا چلا کر اسے ہدایات دے رہا تھا۔ ہنری کو ایسا لگا کہ کوپر اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کررہا ہے۔

تیسرا راؤنڈ شروع ہونے کی گھنٹی بجی۔ دونوں باکسرز ایک دوسرے کی جانب تیزی سے بڑھے۔ اس بار وہ پہلے سے زیادہ متحرک تھے اور ایک دوسرے پر تابڑ توڑ حملے کررہے تھے۔ راؤنڈ شروع ہونے کے ایک منٹ بعد کوپر کے حملوں میں تیزی آگئی۔ ہنری اس کی آنکھوں میں دیکھ سکتا تھا کہ یہ اس کے کیریئر کا آخری راؤنڈ ہوگا اور وہ اس سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔

کوپر نے دائیں ہاتھ سے پینتھر کو ایک زوردار مکا رسید کیا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا فرش پر جا گرا، اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن دوبارہ گر گیا۔ ریفری نے گنتی شروع کی۔ تماشائی دم سادھے یہ منظر دیکھ رہے تھے جبکہ کوپر غصے میں نظر آرہا تھا۔ اس نے چلا کر اپنے حریف سے کچھ کہا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ریفری کی گنتی جاری تھی۔ "پانچ، چھ۔"

کوپر نے ایک بار پھر مجمع کی طرف دیکھا۔ ہنری کا خیال تھا کہ وہ اسے تلاش کررہا ہے۔ ریفری کی گنتی جاری تھی۔ "سات، آٹھ" کوپر واپس اپنے کونے میں چلا گیا۔ وہ یقین نہ کرنے کے انداز میں اپنے سر کو ہلا رہا تھا۔ پینتھر نے ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ کالان جونیئر چلا چلا کر اس کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔

"دس۔" اور ریفری نے کوپر کا ہاتھ اوپر اٹھا دیا۔

شائقین نے جوش میں آکر تالیاں بجانا شروع کردیں لیکن ہنری جانتا تھا کہ وہ اس مقابلے سے مطمئن نہیں تھے۔ انہیں ایک بھرپور اور لمبی فائٹ کی توقع تھی۔ ہنری نے دیکھا کہ جونیئر کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ چلا چلا کر پینتھر کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔

☆☆☆

"ٹھیک ہے۔" بینیٹ نے ہنری کی کہانی میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "پینتھر کو کس نے قتل کیا؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" ہنری نے کہا۔

"تم نے تو کہا تھا کہ تم جانتے ہو۔"

"میں نے کہا تھا کہ مجھے یقین ہے قتل کس نے کیا ہے۔"

"وہ کون ہے؟"

ہنری نے تمام لوگوں کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی زبان سے قاتل کا نام سننے کے منتظر تھے۔ ہنری نے کہا۔ "میں مقابلہ ختم ہونے کے بعد کوپر کی تلاش میں واپس لاکر روم میں چلا گیا۔"

"تم ہمیں قاتل کا نام نہیں بتاؤ گے۔"

"میں اسی طرف آرہا ہوں۔"

☆☆☆

جیسے ہی ہنری لاکر روم میں داخل ہوا۔ کوپر اسے دیکھ کر غرایا اور پلک جھپکتے میں اس نے ہنری کو ایک لاکر کی طرف دھکیل دیا۔

"تمہارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔" ہنری نے جلدی سے کہا۔

"کیا؟" کوپر نے غصے سے کہا۔

"تم مجھے چھوڑ دو تو بتاتا ہوں۔"

کوپر نے اس کا گریبان چھوڑ دیا اور بولا۔ "اب بتاؤ کیا بات ہے؟"

ہنری نے اپنی جیب سے ایک ہزار ڈالر کا لفافہ نکال کر اسے دے دیا جسے اس نے گنے بغیر لاکر میں رکھ دیا۔

"میری نیوہیون تمہاری بیٹی نہیں ہے۔" ہنری نے کہا۔

کوپر نے ایک سرد آہ بھری اور لکڑی کی بینچ پر بیٹھ کر ایک ہاتھ سے اپنا سر سہلانے لگا۔

"میں جانتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"اگر جانتے ہو تو پھر تم نے یہ سب کیوں کیا؟"

"اس کی ماں جینی کی وجہ سے۔" کوپر نے کہا۔ "اس کا کہنا ہے کہ اس کے ساتھ میرا کبھی تعلق رہ چکا ہے۔"

"کیا واقعی؟"

"وہ سولہ سال پرانی بات کر رہی ہے۔" کوپر نے کہا۔ "ممکن ہے کہ وہ ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اس زمانے میں میرے کئی لڑکیوں سے تعلقات تھے۔"

"اوہ، اب میں سمجھا۔"

"اس نے مجھے بتایا کہ میں اس کی بیٹی کا باپ ہوں۔ لہٰذا میں نے سوچا کہ اس کی مدد کرنی چاہیے۔"

"تو یہ بات ہے۔" ہنری نے کہا۔ "جینی اپنی دکھ بھری کہانی لے کر تمہارے پاس آئی۔ اس نے بیٹی کا کہہ کر تمہارے دماغ میں کوئی ایسی بات ڈالی کہ تم نے اس مقابلے سے فائدہ اٹھانے کے بارے میں سوچا۔"

"ہاں۔" کوپر نے کہا۔ "میں نے محسوس کیا کہ اس میچ سے فائدہ اٹھانے کا یہی ایک باعزت طریقہ ہے۔"

ہنری نے سوچا کہ جینی زیادہ ہوشیار نکلی کہ اس نے اس شخص کو اپنے مطلب کے لیے استعمال کر لیا۔

"تمہارا اس بارے میں کیا اندازہ ہے؟" کوپر نے پوچھا۔

"ٹائمنگ۔" ہنری نے کہا۔ "یہ اتفاق ہے کہ تم دونوں ایک ہی شہر میں ہو اور اس نے مقابلہ شروع ہونے سے پہلے تمہیں ایک بیٹی کی کہانی سنا دی۔"

"بس، تمہاری سمجھ میں یہی آیا؟"

"نہیں۔" ہنری نے کہا۔ "میں نے اس سے تمہارے بارے میں پوچھا تھا۔"

"پھر اس نے کیا کہا؟"

"کچھ نہیں، وہ تمہیں نہیں جانتی اور میں نے اس کی بات کا یقین کر لیا۔"

"ہوسکتا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہی ہو۔"

ہنری نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں، وہ جھوٹ نہیں بول رہی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ تم کون ہو۔ لہٰذا تمہاری کوئی بیٹی نہیں ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" اس نے مجھے کاغذات دکھائے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔"

"یہ بتاؤ کہ اس کا حلیہ کیسا تھا؟"

☆☆☆

یہاں پہنچ کر ہنری کافی پینے کے لیے رکا جو ٹھنڈی ہو چکی تھی لیکن اس کی پروا کیے بغیر وہ کافی حلق سے اتار لی۔

"پھر اس نے کیا بتایا؟" سراغ رساں بینیٹ نے پوچھا۔

"کوپر نے کہا کہ وہ ایک سرخ بالوں والی طویل قامت عورت تھی۔ اس نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ وہ مقابلہ ختم ہونے کے بعد اس کے پاس آئی اور ڈرنک کی دعوت دی پھر اس نے بتایا کہ میری نیوہیون اس کی بیٹی ہے۔"

"سرخ بالوں والی۔" بینیٹ نے کہا۔ "لیکن یہ وہ عورت تو نہیں جو تمہیں کافی ہاؤس میں ملی تھی؟"

"ہاں۔" ہنری نے کہا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اس

عورت کے سیاہ بال تھے اور وہ چھوٹے قد کی تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ کسی اور عورت نے اپنے آپ کو جینی ظاہر کر کے اس سے بات کی۔"

"اچھی اداکاری تھی۔" بینیٹ نے کہا۔ "لیکن جب پینتھر کو شکست ہوئی تو وہ نقلی مس نیوہیون کسی اور کو بے وقوف بنانے چلی گئی کیونکہ کوپر سے کچھ ملنے کا امکان ختم ہو گیا تھا۔"

"بالکل ٹھیک۔" ہنری نے کہا۔

"پینتھر کے بارے میں کیا کہو گے؟"

"مجھے اس کی موت پر حیرت ہوئی۔"

"تمہارے خیال میں اس کا قاتل کون ہوسکتا ہے؟"

"ڈیٹرائٹ سے آنے والا مہمان۔" ہنری نے کہا۔

"کالان جونیئر!" بینیٹ اور دوسرے پولیس والے حیران رہ گئے۔ کسی دوسری ریاست کے بدمعاش کو گرفتار کرنا، ان کے لیے مصیبت کا باعث بن سکتا تھا۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ تم یہ سننا پسند نہیں کرو گے۔"

"اس نے پینتھر کو قتل کیوں کیا؟"

"میں یہ ثابت نہیں کر سکتا۔" ہنری نے کہا۔ "لیکن ہم فرض کر لیتے ہیں کہ پینتھر کا تیسرے راؤنڈ میں ناک آؤٹ ہونا اس کی توقع کے خلاف تھا جس کی وجہ سے جونیئر کو بھاری مالی نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا بہت کچھ داؤ پر لگا ہوا تھا۔"

"وہ تیسرے راؤنڈ میں کیوں ناک آؤٹ ہوا۔ کیا اسے معلوم نہیں تھا کہ جونیئر کو کراس کرنے کا کیا نتیجہ نکلے گا؟"

"مجھے اس کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔" ہنری نے کہا۔

"میں وہاں کھڑا ہوا کوپر سے باتیں کر رہا تھا کہ ایرینا پر کام کرنے والا ایک لڑکا دوڑتا ہوا ہال میں داخل ہوا اور چلا کر بولا کہ پینتھر مر گیا۔"

بینیٹ نے بناوٹی انداز میں کہا۔ "گویا تم کہہ رہے ہو کہ کوپر جائے وقوعہ سے دور تھا؟"

"ہاں، وہ میرے ساتھ تھا۔"

"ہوسکتا ہے کہ وہ تمہارے پہنچنے سے پہلے ہی یہ قتل کر چکا ہو۔"

"اور اس کے بعد گرفتار ہونے کے لیے لاکر روم میں آ گیا ہو۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ جونیئر نے ہی یہ قتل کیا ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی دوسرا جواری بھی پینتھر کی شکست پر مشتعل ہو گیا ہو؟"

"ممکن ہے لیکن کوئی اور پینتھر کے اتنے قریب کس طرح جا سکتا ہے؟ کیا تم نے جونیئر کے باڈی گارڈز کو دیکھا ہے؟"

بینیٹ نے اس اطلاع پر اپنا ہونٹ چبایا اور دوسرے آفیسرز کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے کہ شو ختم ہو چکا ہے۔ اب میں اس شخص سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہوں گا۔"

ان کے جانے کے بعد بینیٹ آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ "میں کوپر کو کلیئر کرتے ہوئے خوشی محسوس کر رہا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے کہ اس نے مجھے بھی کچھ پیسے دیے تھے۔"

"وہ اس گندے پروفیشن میں سب سے زیادہ ایماندار شخص ہے۔"

بینیٹ ایک بار پھر بناوٹی انداز میں بولا۔ "تمہاری کہانی میں بہت جھول ہیں۔ تم نے ایک بار بھی اپنی بااعتماد دوست ایمی کا ذکر نہیں کیا اور میں جانتا ہوں کہ وہ اس رات اپنا کام کر رہی تھی۔ میرے آدمیوں نے بتایا ہے کہ اس نے ایک وکیل سے جو کسی عورت کی تلاش میں تھا، پانچ ہزار ڈالر پکڑ لیے۔ کیا تم اس بارے میں کچھ جانتے ہو؟"

"نہیں۔"

"میرے پاس تمہیں گرفتار کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے لیکن میں تم سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ تم نے کہا کہ مقابلہ شروع ہونے سے پہلے تم نے ایک شرط لگائی تھی اور یہ بھی کہا کہ کوپر کو اس کے پیسے واپس کر دیے تھے۔"

ہنری نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "وہ شرط میں نے اپنے پیسوں سے لگائی تھی کہ پینتھر چوتھے راؤنڈ میں جیت جائے گا لیکن میرا خیال غلط نکلا۔"

"ٹھیک ہے۔" بینیٹ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "اب تم جا سکتے ہو۔"

"تم جانتے ہو کہ میں کہاں ملوں گا۔" ہنری نے جانے سے پہلے کہا۔

☆☆☆

"کوپر، یہ بتاؤ کہ جینی دیکھنے میں کیسی لگتی تھی؟"

"اس کے سنہری بال تھے۔ خوب صورت جسم، اس نے اپنے بال کسی فیشن ایبل عورت کی طرح بنا رکھے تھے۔"

"ٹھیک ہے۔" ہنری نے کہا۔ "تم اس کی باتوں میں آ گئے لیکن تمہاری ساکھ اور رقم دونوں محفوظ ہیں۔"

کوپر نے حسرت آمیز لہجے میں کہا۔ "کاش، میری

ایک بیٹی ہوتی۔"

ہنری نے سوچا، کہہ دے کہ تمہارے پس منظر کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ نہ جانے تمہاری کتنی بیٹیاں ہوں گی جن کے بارے میں تم نہیں جانتے لیکن وہ خاموش رہا۔

کوپر نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ پینتھر کیوں گر گیا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ مزید چند راؤنڈ مقابلہ کر سکتا تھا۔"

"میرا خیال ہے کہ اس میں جونیئر کالان کا ہاتھ ہے۔"

"ہاں۔"

"اب تم کیا کرو گے کوپر؟"

"کہیں چلا جاؤں گا۔"

"واقعی؟ مگر کہاں؟"

"ابھی کچھ سوچا نہیں۔" کوپر نے کہا۔ "مجھ جیسا آدمی ہر جگہ کام تلاش کر سکتا ہے۔"

"کیا باکسنگ چھوڑ دو گے؟"

کوپر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

اس رات مقابلہ شروع ہونے سے ایک گھنٹا پہلے ہنری، پینتھر کے لاکر روم میں گیا۔ وہ اس وقت ٹریننگ کر کے سستا رہا تھا۔ ہنری نے کہا۔ "میں تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"تم کون ہو؟"

ہنری نے.... جیب سے ایک لفافہ نکالا اور اس کی بینچ پر رکھ دیا۔

"پانچ سو ڈالر ہیں۔" ہنری نے کہا۔ "جونیئر نے کہا ہے کہ تمہیں تیسرے راؤنڈ میں ناک آؤٹ ہونا ہے۔ اس طرح کہ کسی کو شک نہ ہو۔"

باکسر تھوڑا سا حیران ہوا۔ "تیسرے راؤنڈ میں؟"

اس نے لفافہ اٹھا لیا اور اس کا وزن تولنے لگا۔

ہنری نے کہا۔ "کوئی مسئلہ تو نہیں ہے؟"

"نہیں۔" پینتھر نے کہا۔

☆☆☆

"تم نے میری چھوٹی سی چال کو ناکام بنا دیا۔ اگر تم جان گئے تھے کہ میں ہی اس سے جینی بن کر ملی تھی تو مجھے نقصان پہنچا کر تمہیں کیا فائدہ ہوا؟"

"کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی غلط مقصد کی خاطر اس کی شہرت خراب ہو۔"

"لہٰذا تم نے اسے یقینی بنایا کہ پینتھر چوتھے راؤنڈ تک نہ پہنچ سکے۔"

"ہاں۔" ہنری نے کہا۔ "لیکن میں نہیں سمجھتا تھا کہ جونیئر اسے مار ڈالے گا۔"

"کیا تم اپنے آپ کو اس کا ذمے دار سمجھتے ہو؟"

"ہاں۔"

"ہنری۔" ایمی نے کہا۔ "تم غلط سوچ رہے ہو۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ جونیئر نے پینتھر کو کیوں قتل کیا؟"

"ہاں۔" ہنری نے کہا۔ "کیونکہ وہ تیسرے راؤنڈ میں ناک آؤٹ ہو گیا تھا۔ جیسا کہ میں نے اس سے کہا جبکہ جونیئر مجھ سے پہلے ہی پوچھ چکا تھا کہ یہ مقابلہ فکس تو نہیں ہے۔"

"نہیں۔" ایمی بولی۔ "جونیئر نے تم سے اس لیے پوچھا کہ وہ خود ایسا کر چکا تھا۔ اس کے مطابق پینتھر کو پانچویں راؤنڈ تک کھیلنا تھا لیکن وہ تیسرے راؤنڈ میں ہی ناک آؤٹ ہو گیا جس کی وجہ سے جونیئر کو بہت بھاری نقصان ہوا۔ ان ایک ہزار ڈالر سے کہیں زیادہ جو کوپر نے تمہیں دیے تھے۔"

"لگتا ہے کہ تمہیں بھی کچھ حصہ دینا پڑے گا۔"

"ہنری۔" ایمی نے کہا۔ "پوری بات سن لو۔ کوپر نے تمہیں ایک ہزار دیے۔ تم نے پینتھر کو پانچ سو ڈالر دیے اور پولیس کو بتایا کہ مقابلہ شروع ہونے سے پہلے تم نے شرط لگائی تھی کہ کوپر چوتھے راؤنڈ میں ناک آؤٹ ہو جائے گا جبکہ تم نے کوپر کو اس کے ہزار ڈالر واپس کر دیے جس کا مطلب ہے کہ تم نے پینتھر پر شرط لگائی تھی کہ وہ تیسرے راؤنڈ میں ناک آؤٹ ہو جائے گا اور اس طرح تم نے شرط جیت کر بھاری رقم جیت لی۔ اس میں میرا حصہ تو بنتا ہے۔"

ہنری نے اپنی جیب سے ایک لفافہ نکال کر اسے دیا۔

ایمی نے لفافہ کھول کر دیکھا اور بولی۔ "گو کہ یہ میری توقع سے کم ہے لیکن برا نہیں۔"

ہنری نے اس کا بازو پکڑا اور دونوں ٹہلتے ہوئے کشتی میں داخل ہو گئے۔

"ایک آخری بات۔" ایمی بولی۔ "کوپر کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم ہے۔" ہنری بولا۔ "لیکن میرا اندازہ ہے کہ اس نے باکسنگ چھوڑ دی ہے۔"

"بہت برا ہوا۔" ایمی بولی۔ "اس کی وجہ سے ہمارا کاروبار چل رہا تھا۔"

نہ جانے کون تھے۔

کم از کم میں تو نہیں جانتا تھا اور ماما بھی نہیں جانتی تھیں۔

بس ایک شام میرے والد انہیں نہ جانے کہاں سے اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ ایک بوڑھے انسان، ساٹھ سے زیادہ کی عمر، دُبلے پتلے سے، عینک لگی ہوئی۔ ان کے ہاتھ میں ایک سوٹ کیس بھی تھا جو بہت پرانا ہو چکا تھا۔

والد نے ان کے بارے میں بتایا۔ "یہ میرے شکور تایا

ماضی کے خزانوں میں چھپے مستقبل کے خوابوں کا تاج محل......

کہانی معاشرے سے جنم لیتی ہے... یہ کہانی بھی انسانی معاشرے کی سب سے بڑی دستاویز ہے... نیکی اور بدی کا لامتناہی سلسلہ... سماجی ناانصافی کا ایسا المیہ جو دلوں میں تاعمر جاگزیں رہتا ہے... دل کی آنکھوں سے پڑھی جانے والی وہ کہانی جو کل کی طرح آج بھی زندہ ہے...

خزانہ

سیرینا راض

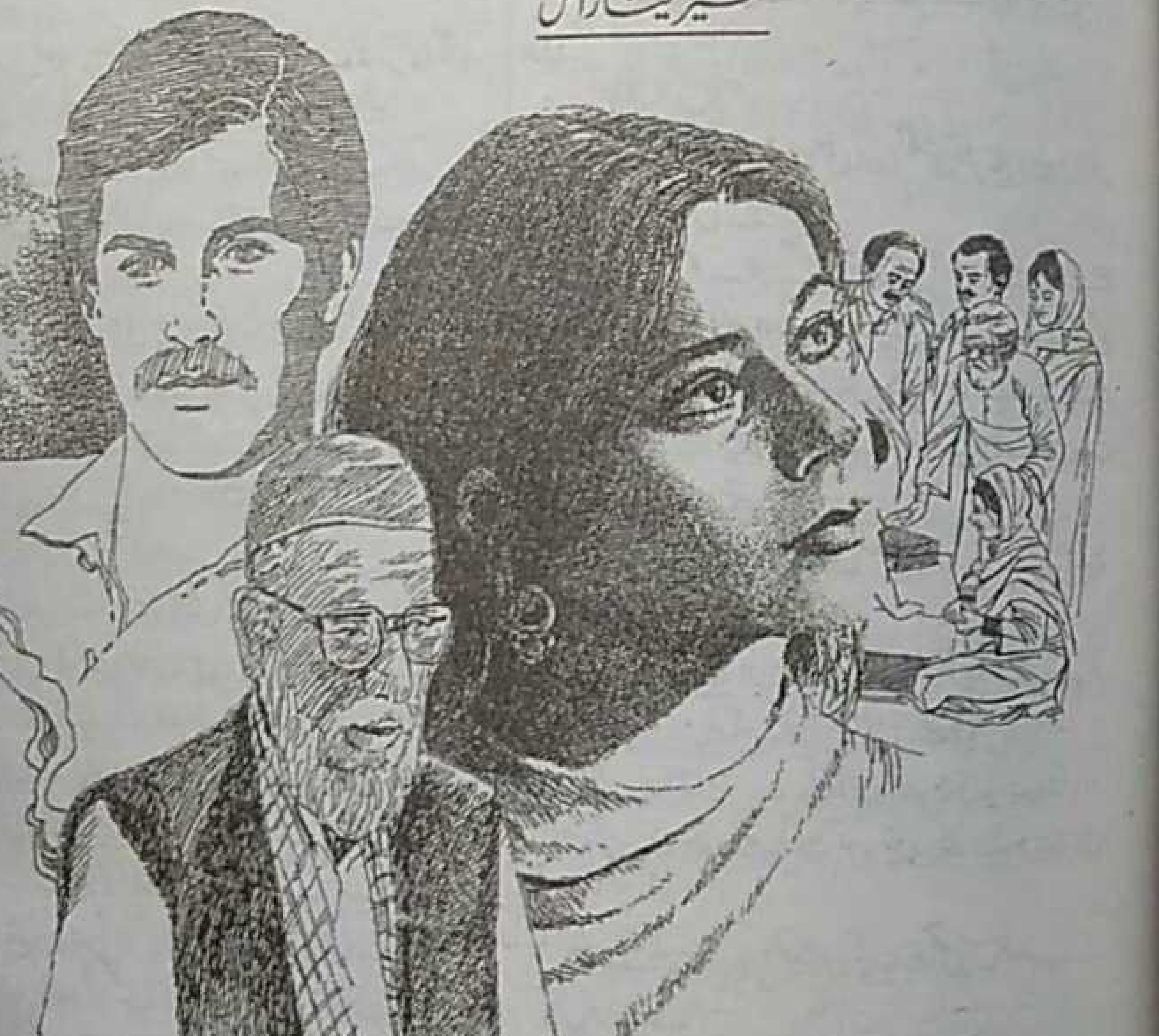

ہیں۔ کبھی انہوں نے اچھے دن بھی دیکھے تھے۔ بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ ایک شاندار سی ملازمت تھی ان کے پاس۔ صرف ایک بیٹی تھی جو شادی کر کے امریکا چلی گئی تھی اور وہیں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ آباد تھی لیکن ایک حادثے میں اس کا انتقال ہوگیا۔ یہ بالکل تنہا رہ گئے ہیں۔ مجھے یہ ایک فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے ملے تھے۔"

ہم سب یہ داستان سنتے رہے۔ ابو نے پھر کہا۔ "میں ان کو زبردستی اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔ خوددار آدمی ہیں۔ ہم پر بوجھ نہیں بنیں گے۔"

میری امی بھی ابو ہی کے مزاج کی تھیں۔ لوگوں سے پیار کرنے والی، ہمدرد۔ ساتھ دینے والی۔

انہوں نے خیر مقدم کیا۔ "چلیں اچھا کیا آپ نے۔ اتنا بڑا گھر ہے کسی کمرے کو ان کے لیے سیٹ کر دیتی ہوں۔"

اس وقت شکور صاحب ڈرائنگ روم میں تھے۔ یہ باتیں ٹی وی لاؤنج میں ہو رہی تھیں۔

ہم چار بہن بھائی تھے۔ میں سب سے بڑا تھا۔ بی اے کر رہا تھا۔ انگلش لٹریچر میں ماسٹر کرنا تھا مجھے۔ مجھ سے چھوٹی میری بہن عینی تھی۔ اس کے بعد ذیشان، اس کے بعد ایک اور بہن حجاب۔

سب تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ہم سب کا مزاج بھی ابو ہی جیسا ہوگیا تھا۔ کسی کو پریشان نہیں دیکھ سکتے تھے۔

امی نے ملازمہ سے کہا کہ وہ لان کی طرف والا کمرا سیٹ کر دے جبکہ ابو شکور صاحب کو ڈرائنگ روم سے بلا کر لاؤنج میں لے آئے تھے۔

ہم نے انہیں بڑی حیرت اور دلچسپی سے دیکھا تھا۔ ابو نے ہم سب کا تعارف کروایا۔ انہوں نے امی کے سر پر ہاتھ رکھ کر بہت سی دعائیں دیں۔ امی کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے کیونکہ ایک سال پہلے ہمارے نانا ابو کا انتقال ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے امی کو ان کی یاد آگئی ہو۔

پھر انہوں نے ہم سے باتیں کیں۔ اتنی دیر میں ملازمہ نے ان کا کمرا سیٹ کر دیا تھا۔ ابو ان کو کمرے میں لے گئے۔

ان کے جانے کے بعد سب نے امی سے سوالات کیے۔ کون ہیں یہ؟ کیا یہ اب ہمارے ساتھ ہی رہیں گے۔ یہ پہلے کیوں نہیں آئے تھے، وغیرہ وغیرہ۔

ملازمہ نے ان کا سوٹ کیس بھی ان کے کمرے میں پہنچا دیا تھا۔ میں بہت پُرجوش ہو رہا تھا۔ کیونکہ میں نے ایسی بہت سی کہانیاں پڑھ رکھی تھیں جن میں اسی طرح کا کوئی بوڑھا کسی گھر میں آ کر رہتا ہے اور جاتے جاتے گھر والوں کی قسمت بدل کر چلا جاتا ہے۔

ملازمہ نے چائے لگا دی۔ ابو ان کو ان کے کمرے سے بلا کر لے آئے۔ اتنی دیر میں انہوں نے نہا کر کپڑے بھی بدل لیے تھے۔

چائے کی میز پر انہوں نے امی سے کہا۔ "بیٹے میں تو نہیں آ رہا تھا لیکن منصور مجھے زبردستی لے آئے ہیں۔"

"اچھا ہوا نا کہ آپ جیسا کوئی بزرگ ہمارے ساتھ آگیا ہے۔ ہمیں اس کی محسوس ہوتی تھی۔ اب آپ آگئے ہیں تو ہمیں بہت اچھا لگ رہا ہے۔"

پھر انہوں نے میری طرف دیکھا۔ "بیٹے تم کیا کر رہے ہو؟"

"انکل! فی الحال تو بی اے میں ہوں۔ لیکن ماسٹر کرنے کا ارادہ ہے۔"

"لنگویسٹک میں یا لٹریچر میں؟" انہوں نے پوچھا۔

میں ان کے اس سوال پر چونک گیا تھا۔ بہت کم لوگوں کو ان دونوں کا فرق معلوم ہوگا۔ ان کا سوال اس بات کی نشاندہی کر رہا تھا کہ وہ بہت کچھ جانتے ہیں۔

"لٹریچر میں کرنے کا ارادہ ہے انکل۔" میں نے بتایا۔

"اچھا ہے۔ لیکن نئے اور پرانے ادب کی اسٹڈی کرنی ہوگی۔"

"انکل آپ؟"

"ہاں بیٹا، میں نے فلاسفی اور انگلش لٹریچر دونوں میں ماسٹر کیا ہے۔" انہوں نے بتایا۔

ہم سب مرعوب ہوگئے تھے۔ کیا آدمی تھے وہ۔ اتنے سادہ۔ اتنے پڑھے لکھے اور اتنے پریشان حال۔ وقت بھی کیا ہوتا ہے۔ انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔ نہ جانے انہوں نے کیسے دن دیکھے ہوں گے۔ لیکن اب ہمارے یہاں رہنے پر مجبور ہوگئے تھے۔

وہ ہم سب کے بارے میں معلوم کرتے رہے۔ اپنے بارے میں بہت کم گفتگو کی ہوگی۔

اچانک امی نے ان سے پوچھا۔ "انکل اگر میں آپ کو ابو کہہ کر مخاطب کروں تو آپ کو برا تو نہیں لگے گا؟"

"ارے بیٹا! میرے لیے اس سے بڑی بات اور کیا ہوگی کہ مہوش کے بعد مجھے ایک اور بیٹی اللہ نے دے دی ہے۔"

ابو کے لیے یہ بہت اطمینان کی بات تھی کہ ہم سب نے ان کو قبول کر لیا تھا۔

"آپ اپنے بارے میں بتائیں؟" امی نے پوچھا۔

"میرا مطلب ہے کہ فیملی۔"

"اب تو تم ہی لوگ فیملی ہو۔" شکور صاحب نے کہا۔ "ویسے ایک بیٹی تھی مہوش۔ جو گزشتہ دس برسوں سے امریکا میں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ تھی۔ پھر یہ ہوا کہ خدا کی کوئی مصلحت سامنے آگئی۔ اس نے میری بچی کو اپنے پاس بلا لیا۔ وہ اس دنیا میں نہیں رہی۔ ایک ایکسیڈنٹ میں اس کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے تین بچے ہیں۔ میرے نواسے۔ تینوں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔"

یہ ایک دکھ بھرا موضوع تھا۔ ابو اس کی طرف اشارہ دے چکے تھے لیکن تفصیل اب معلوم ہو رہی تھی۔ شکور صاحب کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

"ویسے ایک بات بتا دوں بیٹا۔ یہ جو زندگی ہے نا، اس میں صرف ایک بات کام میں آتی ہے۔ جاننے اور سیکھنے کا عمل۔ ابنِ رشد کا نام تو سنا ہی ہوگا۔ اس کی زندگی کی صرف دو راتیں مطالعے کے بغیر گزری ہیں۔ ایک شادی کی رات اور دوسری موت کی رات۔" شکور صاحب نے خود ہی موضوع بدل دیا تھا۔

"نانو، پھر تو آپ کے پاس بھی کتابیں ہوں گی؟" عینی نے پوچھا۔ وہ انٹر کر رہی تھی۔

"ہاں بیٹا، بہت کتابیں ہیں جن کو اپنے ایک جاننے والے کے گھر رکھوا دیا ہے۔ کیونکہ ٹھکانا ہی کوئی نہیں تھا۔"

"ابو، اب یہ آپ کا اپنا گھر ہے۔ اپنی چیزیں جا کر لے آئیں۔"

ہم سب ہی ان کے آنے سے خوش ہوگئے تھے۔ ایک بزرگ ہمارے پاس آگئے تھے۔ میں یہ سوچتا ہوں کہ وہ کیسے لوگ ہوتے ہیں جن کے گھر میں کوئی بوڑھا یا بزرگ ہوتا ہے لیکن وہ اس کی قدر نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کو تو سمیٹ کر رکھا جاتا ہے۔ ان کے تجربوں سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔

کتابیں ایک طرف رہ جاتی ہیں اور وزڈم ہمیں جینے کا صحیح راستہ دکھا دیتا ہے۔ یہ دانشمندی ایسے ہی لوگوں میں ہوتی ہے جو ایک طرف تو کتابوں سے دوستی رکھتے ہوں اور دوسری طرف زندگی بھی کھلی ہوئی کتاب کی طرح ان کے سامنے ہو۔

"میرے پاس اس کی یادیں ہیں۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بتا رہے تھے۔ شاید وہ ابھی تک یادوں کے ٹرانس میں تھے۔

دوسرے یا تیسرے دن میں ان کے ساتھ چلا گیا جہاں انہوں نے کتابیں رکھوائی تھیں۔ وہ ناظم آباد کا ایک گھر تھا اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت اور دکھ ہوا کہ وہ لوگ کتابوں سے

ٹیلی فون نمبر

شوہر کو اپنی حسین بیوی سے بس ایک ہی شکایت تھی کہ وہ گھر صاف نہیں رکھتی۔ ہر چیز گرد میں اَٹی رہتی۔ شروع شروع میں شوہر کو بیوی کی اس عادت سے سخت تکلیف رہی۔ آخر وہ بھی عادی ہوگیا اور بیوی سے شکایت ترک کر دی۔

ایک دن جب وہ گھر میں داخل ہوا تو خلافِ معمول بیوی نے گھر جھاڑ پونچھ کر خوب صاف کر رکھا تھا۔ جب وہ لکھنے کی میز پر پہنچا تو اس نے سخت شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

"رضوبہ، میری میز کی گرد کس نے صاف کر دی؟"

بیوی نے معصومیت سے جواب دیا: "میں نے، کیوں کیا ہوا؟"

شوہر نے کہا۔ "یہ کیا غضب کر دیا، میں نے اس پر ایک اہم ٹیلی فون نمبر لکھ رکھا تھا۔"

آرڈر

ہمارے بھائی لطیف میمن نے خالص کاروباری ذہن پایا ہے، پھر بھی وہ کوشاں ہیں کہ فوج میں بھرتی ہوجائیں۔ ان کا خیال ہے کہ فوج میں بے شمار آرڈر ملتے ہیں۔

رامسوامی سے اینا راج کا تعاون

کس قدر بیزاری کا اظہار کر رہے تھے۔

ان کے خیال کے مطابق ان کے گھر میں خوامخواہ کا کچرا جمع ہوگیا تھا کیونکہ ڈیک رکھنے یا ڈیکوریشن پیس رکھنے کی جگہ نہیں رہی تھی۔ انہوں نے اس بات پر شکر ادا کیا تھا کہ وہ کتابیں ان کے گھر سے جا رہی تھیں۔

میں نے ان کتابوں کو دیکھا۔ کیسی کیسی نایاب کتابیں تھیں ان کے پاس۔ ہم ان کتابوں کو اپنے ساتھ لے آئے۔ ابو نے ایک کام یہ کیا کہ وہ کتابیں رکھنے کے لیے ریکس کا آرڈر دیتے آئے تھے۔ کوریڈور میں شکور صاحب کے کمرے کے سامنے بہت بڑی جگہ تھی۔ وہ ریکس وہاں لگ گئے۔ پھر کتابوں کے رکھنے کا مرحلہ شروع ہوا۔

ہم سب ان کا ساتھ دے رہے تھے۔ اس دوران اگر شکور صاحب تھک جاتے تو امی کو آواز دیتے۔ "بہو ایک کپ چائے تو بھجوا دو۔"

امی فوراً ہی ان کے حکم کی تعمیل میں لگ جاتیں۔

دو دنوں تک کتابوں کی سیٹنگ کا مرحلہ چلتا رہا تھا۔ انہوں نے ہی رہنمائی کی تھی۔ تاریخ کی کتابیں ایک طرف۔

فلسفے ایک طرف۔ ادب ایک طرف۔ اس میں بھی اردو اور انگریزی ادب الگ الگ۔ نفسیات ایک طرف۔ مذہب کے حوالے سے بھی ان کے پاس بہت کتابیں تھیں۔

میری بہن عینی نے پوچھا۔ ''نانو! آپ نے کیا ساری کتابیں پڑھ رکھی ہیں؟''

''ہاں بیٹا۔'' وہ مسکرا دیے۔ ''ہر کتاب میں، میں نے حواشی بھی لکھے ہیں۔ ان پر نشانات لگائے ہیں۔ تم خود دیکھ لینا۔''

گھر میں ایک عجیب سی رونق تھی۔

ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''بیٹے! آج سے تمہاری پڑھائی کا سلسلہ شروع۔ تم نے جتنے نوٹس وغیرہ بنائے ہیں۔ میرے پاس لیتے آنا۔''

اس دن مجھے پتا چلا کہ علمیت ہوتی کیا ہے۔ انہوں نے جب انگریزی شاعری پر لیکچر دینا شروع کیا ہے تو مزہ آگیا۔ کیا مطالعہ تھا ان کا۔ کہاں کہاں سے حوالے دے رہے تھے اور میں صرف یا تو سن رہا تھا یا پھر نوٹس بنا رہا تھا۔

اسی طرح میری تعلیم ہوتی رہی۔ انہوں نے عینی کو بھی اسی سلیقے اور علمیت کے ساتھ پڑھایا۔ وہ شخص جو ایک اجنبی بن کر ہمارے گھر میں داخل ہوا تھا۔ اب وہ ایک خاص اہمیت اختیار کر گیا تھا۔

ایک دن ابو نے ان سے کہا۔ ''شکور چاچا! آپ کے آنے سے مجھے جتنی تقویت ہوئی ہے، وہ میں بتا نہیں سکتا۔ میرے باس کئی دنوں سے مجھے آفس کے کام کے سلسلے میں سنگاپور بھیجنا چاہ رہے تھے لیکن میں اس لیے نہیں جا رہا تھا کہ گھر کی دیکھ بھال کے لیے کوئی نہیں تھا۔''

''کیوں نہیں تھا؟'' شکور چاچا نے کہا۔ پھر میری طرف اشارہ کیا۔ ''یہ ہمارے نصیر میاں بڑے ہو گئے ہیں۔ ان پر ذمے داریاں ڈالو۔ ان میں اعتماد پیدا کرو۔ زندگی بہت مشکل ہوتی ہے۔ ابھی سے لڑنے کا حوصلہ پیدا کرو۔ کیوں بیٹا؟'' یہ جملہ میری طرف دیکھ کر کہا تھا۔

''جی ہاں، نانو، یہ تو ہے۔'' میں بھی ان کو نانو ہی کہتا تھا۔

''خیر، اب میں اس گھر میں ہوں۔ تم بے فکر ہو کر جاؤ۔''

ابو اسی ہفتے پندرہ بیس دنوں کے لیے سنگاپور چلے گئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد شکور نانو کی محبتیں ہمارے ساتھ رہی تھیں۔

ایک رات میں اتفاقاً شکور نانو کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ مجھے ورڈز ورتھ کی شاعری کی خصوصیات معلوم کرنی تھیں۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ شکور نانو اپنی کرسی پر بیٹھے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا جیولری باکس تھا۔

وہ اس جیولری باکس کو پیار کر رہے تھے۔ بار بار چومتے۔ پھر اس سے کچھ بولنے لگتے۔

میرے لیے یہ بہت حیرت انگیز منظر تھا۔ وہ تو بہت سنجیدہ انسان تھے۔ پھر یہ حرکت سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں نے جان بوجھ کر اپنے جوتوں سے تھپ تھپ کیا۔ آہٹ سن کر شکور نانو نے اس باکس کو جلدی سے تکیے کے نیچے رکھ دیا۔

''نانو! میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں بیٹے، آؤ اندر آ جاؤ۔''

میں ان کے پاس چلا گیا۔ ویسے مجھے ایک تجسس سا ہو گیا تھا۔ کیا تھا اس جیولری باکس میں۔ شکور نانو سے اس قسم کی کسی حرکت کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی لیکن انسان کی کتنی پرتیں ہوتی ہیں۔ کیسے کیسے راز اس کے سینے میں دفن ہوتے ہیں۔ وہ جیولری باکس کسی بہت بڑے بھید کی گواہی دے رہا تھا۔

میں تو ان کے پاس کچھ معلوم کرنے آیا تھا لیکن یہ سب دیکھ کر مجھے دوسری ہی فکر لگ گئی تھی۔

''ہاں بیٹا بتاؤ، خیریت تو ہے نا؟'' نانو نے پوچھا۔

''جی نانو، میں وہ ورڈز ورتھ کی ایک پوئم کے بارے میں معلوم کرنے آیا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''چلیں پھر کبھی سہی۔''

''کبھی کیوں۔ ابھی میں اس وقت کچھ نہیں کر رہا ہوں، تم بیٹھ جاؤ۔''

میں ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ نانو نے پھر جو بولنا شروع کیا ہے تو مزہ آ گیا۔ میں یہ بھول ہی گیا کہ میں نے نانو کو کیا کرتے دیکھا تھا۔

خدا جانے اس جیولری باکس میں کیا ہے جس کی وہ اتنی حفاظت کرتے ہیں۔

''کوئی بہت ہی قیمتی چیز ہوگی ماما۔'' عینی نے کہا۔

''ارے ان کی سب سے قیمتی چیز تو ان کی کتابیں ہیں جو ہمارے سامنے پڑی رہتی ہیں۔''

میں انہیں بتا چکا تھا کہ میں نے شکور نانو کو کس طرح اس جیولری باکس سے پیار کرتے اور باتیں کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ خود ابو کے لیے بھی یہ حیرت کی بات تھی لیکن انہوں نے ہمیں منع کر دیا تھا۔ ''خبردار! تم لوگ شکور چاچا سے اس بارے میں کچھ مت پوچھنا۔ انہیں بتانا ہوگا تو خود ہی بتا دیں گے۔''

پھر یہ ہوا کہ کئی مہینے اسی طرح گزر گئے۔ کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ پھر ایک رات ان کی طبیعت خراب ہو گئی۔ وہ درد سے بے حال ہو رہے تھے۔ ابو کو جگایا گیا۔ ہم انہیں اسپتال لے آئے۔ اتنے دنوں میں ان سے انسیت ہو گئی تھی۔ سب ہی پریشان تھے۔

فوری طور پر ان کا چیک اپ ہوا۔ پتا چلا کہ ان کے گردے جواب دے چکے ہیں۔ انہیں ڈائیلائسز کے مراحل سے گزارا گیا۔ وہ بہت کمزور اور نڈھال ہو چکے تھے۔ ایک ہفتے بعد انہوں نے ہم سے کہا۔ ''دیکھو، ہر ایک کو اس دنیا سے جانا ہے۔ مجھے بھی احساس ہونے لگا ہے کہ اب زندہ نہیں رہوں گا۔ رات خواب میں میری گڑیا میرے پاس آئی تھی۔ (ان کا اشارہ اپنی مرحوم بیٹی کی طرف تھا) وہ کہہ رہی تھی۔ ابو میں کب سے انتظار کر رہی ہوں۔ آپ آتے کیوں نہیں ہیں؟ اور ویسے بھی میں اب زندہ رہ کر کیا کروں گا۔ کیا رہ گیا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ میرے لیے یہ بڑے اطمینان کی بات ہے کہ مجھے تم لوگوں کی محبت حاصل ہو گئی ہے۔ اب اس دنیا سے بالکل ہی ناکام نہیں جاؤں گا۔''

ابو نے انہیں دلاسا دیا۔ ''ارے انکل، کیوں مایوس ہو رہے ہیں۔ ابھی آپ کو زندہ رہنا ہے۔ عینی کی شادی کرنی ہے۔''

''ہاں نانو۔ میں تو آپ کو اس طرح نہیں جانے دوں گی۔'' عینی نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ رو رہی تھی۔

شکور نانو مسکرا دیے۔ ''اچھا بیٹا! اب میں تم لوگوں کو اپنے ایک راز میں شامل کر رہا ہوں۔ میرے بیگ میں ایک جیولری باکس رکھا ہے۔ کوئی اس کو لا سکتا ہے؟''

''میں لے آتا ہوں نانو۔'' میں نے کہا۔

''ہاں بیٹے تم ہی چلے جاؤ۔''

ابو وہیں رہے تھے۔ میں نے ان کی گاڑی لی اور گھر کی طرف دوڑا دی۔ اس باکس کا راز سامنے آنے والا تھا لیکن کس قیمت پر؟

وہ باکس وہیں رکھا تھا جہاں نانو نے بتایا تھا۔ میں نے وہ باکس اٹھا لیا۔ بظاہر وہ خالی ہی دکھائی دے رہا تھا لیکن میں نے اسے کھول کر نہیں دیکھا۔

اسپتال واپس آیا تو سب لوگ نانو کے بیڈ کے پاس ہی تھے۔ سب سے زیادہ پریشان ابو اور امی تھے۔ کیونکہ ان دونوں نے اس عرصے میں ان کا بہت خیال رکھا تھا۔ میں نے وہ باکس نانو کے حوالے کر دیا۔ ''یہ لیں نانو، اپنا باکس۔''

''شکریہ بیٹا۔ اب میں بتاتا ہوں کہ اس باکس کی کہانی کیا ہے۔'' انہوں نے ایک گہری سانس لی۔ ''اس وقت میری مہوش سات آٹھ برس کی تھی۔ ایک بار کھیل کھیل میں اس سے ایک گلدان ٹوٹ گیا۔ وہ ایک قیمتی اور خوب صورت گلدان تھا۔ میں اس پر ناراض ہوا۔ میں نے کہا کہ میں تم سے کٹی ہو گیا ہوں۔ اب بات نہیں کروں گا۔ وہ شروع سے بہت حساس لڑکی تھی۔ اس رات وہ اپنے کمرے میں بند ہو کر نہ جانے کیا کرتی رہی۔ اس نے اپنے پرانے باکس جمع کیے اور ان سے یہ جیولری باکس بنا لیا۔

میں اس وقت ناشتا کر رہا تھا جب وہ اپنے کمرے سے یہ باکس لے کر نکلی۔ اس کا موڈ ابھی تک خراب تھا کیونکہ میں نے اسے ڈانٹا تھا۔

''یہ لیں ابو، اپنا باکس۔'' اس نے کہا۔ ''یہ میں نے خود بنایا ہے۔ میں نے آپ کا نقصان جو کر دیا تھا۔ یہ اس کی جگہ ہے۔''

میں نے باکس کھول کر یوں ہی شرارت کے انداز میں کہا۔ ''لیکن یہ باکس تو خالی ہے۔''

''نہیں، یہ خالی نہیں ہے۔ اس میں کچھ بھرا ہوا ہے۔ ذرا غور سے دیکھیں۔''

''نہیں بیٹا! مجھے تو کچھ نظر نہیں آ رہا، تم بتاؤ۔''

''ابو اس کو بنا کر میں بہت دیر تک اس کو پیار کرتی رہی ہوں۔ میرا پیار بھرا ہوا ہے اس میں۔ ذرا دیکھیں تو سہی۔''

اس کی یہ بات سن کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں رونے لگا۔ وہ تو شادی کر کے چلی گئی۔ لیکن یہ باکس میرے پاس ہی رہا۔ میرے بچو! یہ باکس خالی نہیں ہے۔ اس میں مہوش کا پیار بھرا ہوا ہے۔ اس کی سانسوں کی ملائمت اس باکس میں چھپی ہوئی ہے۔ وہ تو اب اس دنیا میں نہیں رہی لیکن اس کے پیار سے بھرا ہوا یہ باکس میرے پاس ہے۔ مجھے ہمیشہ اس کی یاد دلاتا ہے۔'' وہ رونے لگے تھے۔ صرف وہی نہیں ہم سب رو رہے تھے۔ یہ ایک باپ اور بیٹی کے پیار کی انمول کہانی تھی۔

ایک مہینے کے بعد شکور نانو کا انتقال ہو گیا۔

ہم انہیں گھر لے آئے تھے۔ ہم ابھی تک ان کو یاد کرتے ہیں۔ شکور نانو شاید آپ کی روح یہ دیکھ رہی ہو کہ ہم نے اس باکس کو کبھی خالی نہیں رکھا۔

ہم ہر سال آپ کی برسی مناتے ہیں۔ اور ہر برسی کے موقع پر اس باکس پر پیار کر کے اسے بھرتے رہتے ہیں۔ کیونکہ آپ کی بیٹی کی طرح ہم نے بھی تو آپ سے پیار کیا ہے نا؟

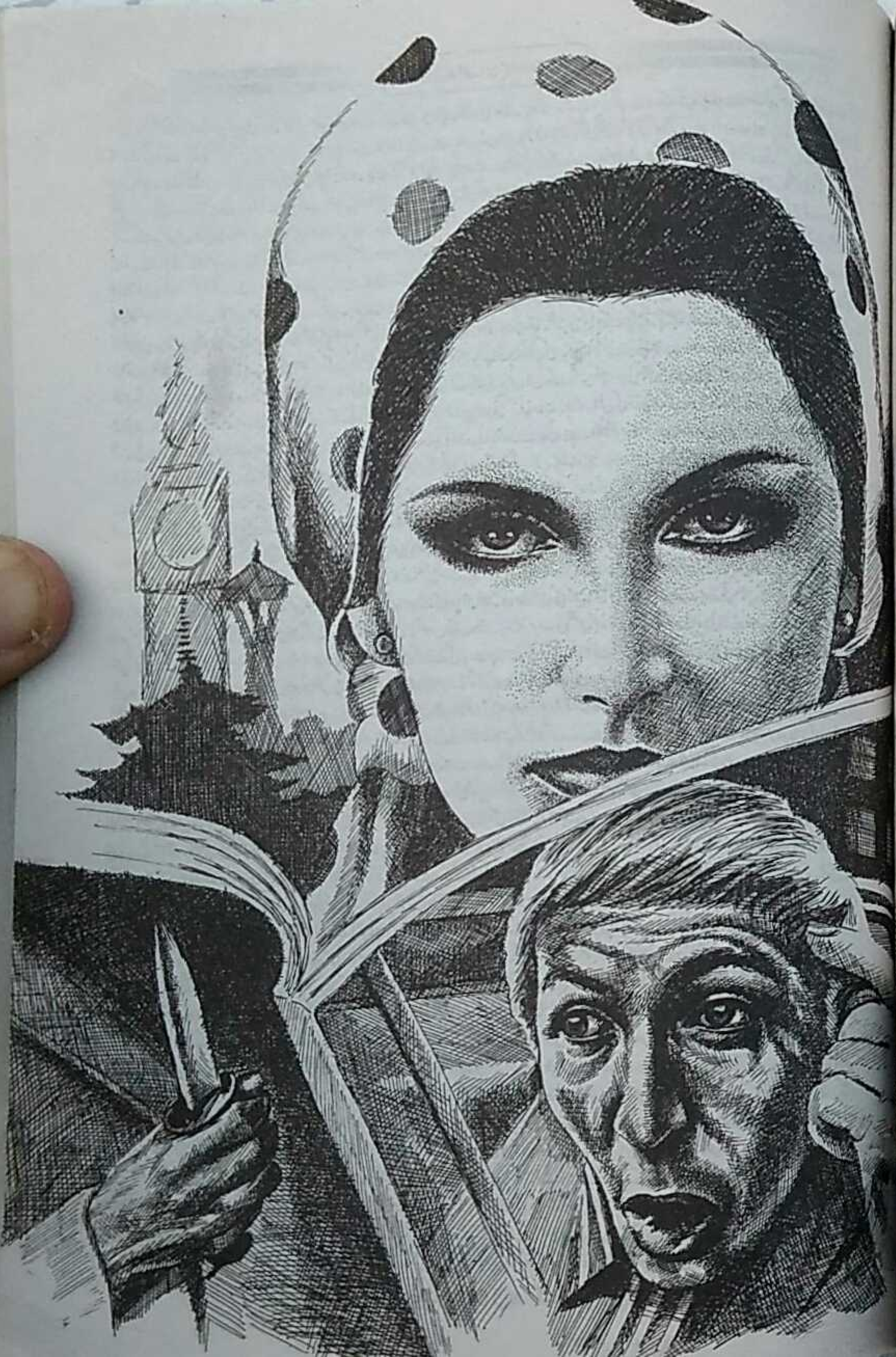

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہورہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جوان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ہوا دلچسپ سلسلہ...

قسط نمبر: 54

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

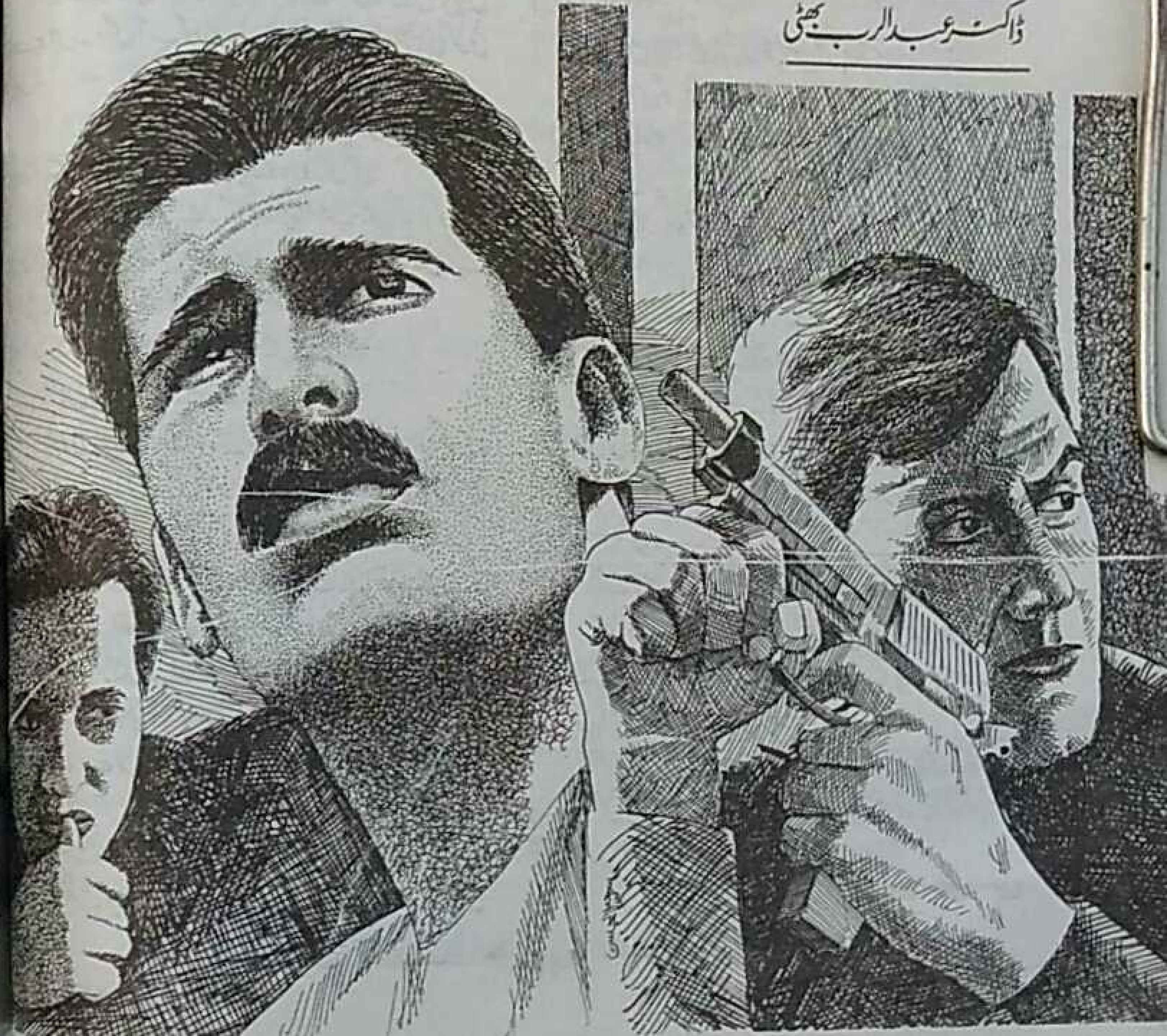

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ، سوتیلی ماں کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہوگئی۔ شہزی کی دوستی وہاں ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہوگئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑپتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کمیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازع عرصے سے چل رہا تھا۔ کمیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا، زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش تھی۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ''اسپیکٹرم'' کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہوجاتی ہے، عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر فیگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نو دولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنے ماں باپ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطنِ عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیوٹمسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیوٹمسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کرلیتے ہیں۔ شہزی، کمیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کمیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہوجاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر فیگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر فیگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دستِ راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر فیگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنا لیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام جھنگری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جودڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہوچکا ہے اور لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ میں بلیوٹمسی کے چندر ناتھ، شیام اور کورنیلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیوٹمسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیوٹمسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہوگئی تھی کہ وہ ایک محبِ وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس برمی قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھوسک کو بے بس کردیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہوجاتے ہیں۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پُرفریبیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندر ناتھ حملہ کردیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھجوانی تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک رینا نامی لڑکی کو تنگ کررہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کررہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ رینا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ کے ایل ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ تھا۔ شہزی، رینا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ رینا، شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیوٹمسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیوٹمسی کے ہیڈ کوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی جی بھجوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھجوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کمیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی ''انڈیمان'' پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں سے تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھجوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بھجوانی مدد کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔ اس اثنا میں کورنیلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو ''کلی منجارو'' پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہوجاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھجوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات نانا شکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا اسمگلر تھا۔ نانا شکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور نانا شکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف روانہ ہوجاتا ہے۔ نانا شکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ چھائی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہوچکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کردیتے ہیں۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کرکے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کردیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے نانا شکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہوجاتا ہے۔ اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ وہ ایک نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حدِ نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے کیونکہ ہر طرف سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو تھے۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہوجاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ منیجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کرکے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں برمی مسلم گروپ کا مجاہد ٹولا ان پر حملہ کردیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم برمی مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کردیتا ہے، پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کلی منجارین سے ٹاکرا ہوجاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کرلیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہوجاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے کلی منجارین سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر بُرد کر کے طلسم نور ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے پھر ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں ملکوں کے کوسٹ گارڈز سے نمٹتے اپنی سرزمین پاکستان پہنچتے ہی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر بشام کی بیوہ ارم سے ملتا ہے۔ وہاں کا زمیندار شاہ نواز خان جو پہلے بھی ہیرا چوری کر چکا تھا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں بشام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزی وغیرہ کی آمد پر شاہ نواز خان دھوکے سے بشام کے قتل اور اس کی بیوہ ارم کے اغوا کے جرم کی رپورٹ کرا دیتا ہے۔ پولیس اول خیر اور کمیل دادا کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ شہزی کو شاہ نواز خان اپنا قیدی بنا کر لے جاتا ہے۔ اچانک رات کے سناٹے میں خطرناک ڈاکو پریل چانڈیو حویلی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ واپسی میں شاہ نواز کی بیٹی سونہڑیں بھی ساتھ ہوتی ہے جو اس کی محبوبہ ہے۔ جاتے ہوئے پریل، شہزی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔ اسی رات پریل کا نائب لائق ماچھی لانچ میں آکر سازش کرتا ہے اور پریل کو غائب کرا کر خود سردار بن بیٹھتا ہے اور سونہڑیں کو تاوان کے لیے قبضے میں کرلیتا ہے۔ شہزی، لائق ماچھی کے ساتھی عارب خان کو قابو کرلیتا ہے۔ شہزی، پریل کو بچا لانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ پریل، شہزی کا احسان مند ہوتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہزی کے ساتھیوں اور سونہڑیں کو چھڑانے کے لیے تھانے پر حملہ کردیتا ہے مگر رینجرز کی اینٹی ڈکیت فورس وہاں پہلے سے موجود تھی۔ مقابلے میں پریل اور اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں۔ شہزی اور اس کے ساتھی رینجرز کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ شہزی، میجر وسیم کو اپنے بارے میں تمام حقائق سے آگاہ کرتا ہے، میجر وسیم، شہزی پر اعتماد کرتے ہوئے بھاری نفری کے ساتھ شاہ نواز کے خفیہ ذیرے پر ریڈ کر کے طلسم نور ہیرا برآمد کرلیتے ہیں۔ اس مہم کے بعد شہزی اپنے ساتھیوں سمیت بیگم ولا کا رخ کرتا ہے جہاں شہزی کے والدین اور زہرہ کی نگاہیں منتظر تھیں۔ پاکستان پہنچ کر شہزی کو پتا چلتا ہے کہ عارفہ، نوید سانچے والا کی قید میں ہے عارفہ کو رہائی دلا کر نوید کو قانون کے شکنجے میں دے دیتا ہے پھر زہرہ کے تعاون اور ماں باپ کی دعاؤں کے سائے میں عابدہ کی رہائی کے لیے کمیل دادا اور شکیلہ کے ساتھ نئے مشن پر امریکا روانہ ہوتا ہے۔ طیارہ ابھی پاکستانی حدود میں تھا کہ شہزی کا ٹاکرا وزیر جان سے ہوتا ہے۔ مگر شہزی، وزیر جان کو چکمہ دے کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور ایک تھائی لڑکی ساتچی سے ملاقات ہوجاتی ہے۔ وہاں ایک شاپنگ مال میں کچھ دہشت گرد حملہ آور ہوتے ہیں اور لوگوں کو یرغمال بنا کر اپنے قیدی چھڑانا چاہتے ہیں۔ ان کا سرغنہ، شہزی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ جو کاسپاکو کا آدمی ہے۔ ایک مقام پر وزیر جان سے پھر ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ تادیر لڑائی کے بعد وزیر جان کو تہِ آب کرکے اپنے ازلی دشمن سے چھٹکارا پا لیتا ہے۔ وزیر جان کے خاتمے کے بعد کاسپاکو کے ہرکارے شہزی کو بے ہوش کرکے پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ کاسپاکو، شہزی کی بہادری کا قائل ہوجاتا ہے اور خالص سونے کا گوتم بدھ کا مجسمہ جو پہلے ہی بینکاک میوزیم سے چرا لیا گیا تھا، اب اسے امریکا پہنچانا تھا۔ اور اس کے لیے کاسپاکو شہزی کا انتخاب کرتا ہے اور امریکی ایجنٹ روڈلف کے ساتھ امریکا روانہ ہوتا تھا کہ اسپیکٹرم کے ایجنٹوں سے ٹکراؤ ہوجاتا ہے۔ روڈلف ہر قدم پر اس کا ساتھ دیتا ہے اور بالآخر ایک طویل ساتھ دینے کے بعد روڈلف مارا جاتا ہے۔ روڈلف کی دوست یاسمین کے ساتھ شہزی امریکا روانہ ہوتا ہے۔ کوہارا یہاں بھی شہزی کا پیچھا نہیں چھوڑتا اور طیارہ ہائی جیک کرلیتا ہے اور طیارے کو موریطانیہ کے صحرا میں اتارنا چاہتا ہے مگر فیول ختم ہونے کے باعث طیارے کو کریش لینڈنگ کرنا پڑتی ہے اور طیارہ ریت کے سمندر میں دھنستا چلا جاتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

شمع دان...... میرے ہاتھ میں تھمی ہوئی تھی۔ اس کی ٹمٹماتی پیلی روشنی میرے خیالات کی طرح لرزاں تھی۔ میں گویا سرتاپا مرتعش تھا۔ سوچ رہا تھا کہ آخر ہال میں ایسا کیا ہوسکتا تھا جس نے میرے دل کو دہلا کر رکھ دیا تھا؟

میں نے خود سے سوال کیا۔ نیز، اس سوال کے ذہن میں اُبھرنے کی وجہ کیا تھی؟ اس کی نامعلوم سی پُراسراریت یا پھر باہر موجود جیپ جو سے جی کوہارا کے استعمال میں تھی۔

دوسرا یہ کہ یاسمین کے ملے ہوئے اُدھورے رُقعے کی وہ تحریر جس میں یاسمین نے بتایا تھا کہ وہ میری زندگی اس خونی درندے سے بچانے کی غرض سے اس کے ساتھ جارہی ہے۔ یوں میرے حساب سے اُسے اب تک کوہارا کے ساتھ روانہ ہوجانا چاہیے تھا لیکن باہر تاریک ریگ زار میں کھڑی جیپ بغیر عنوان کے کچھ اور کہانی سنارہی تھی۔

ایک ہی بات ذہن میں اُبھرتی تھی اور وہ یہ کہ وہ دونوں ابھی کہیں بھی نہیں گئے تھے۔ وہ اسی اہرام نما ٹھکانے میں تھے مگر کہاں؟

میں نے ہال کا ابھی تفصیلی جائزہ کہاں لیا تھا؟ مگر وہاں کا ماحول تو ایسا تھا ہی نہیں کہ کوئی بیٹھا ہوا وہاں دکھائی دیتا؟

یوں میں چند ثانیے وہیں دروازے کے پاس گم صم سا یہی کچھ سوچتا کھڑا رہا کہ مجھے اب ہال کا جائزہ بھی لے لینا چاہیے۔ اس عجیب جگہ کا بس ایک وہی گوشہ ایسا تھا جہاں کا میں نے ابھی تک رخ نہیں کیا تھا۔

میں پلٹا۔ ہرسُو خاموشی اور گھمبیر سناٹا طاری تھا۔ ہال چند قدموں کے فاصلے پر تھا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اس طرف کا رخ کیا۔

شمع دان کا ہاتھ میں نے بلند اور سامنے کی طرف کر رکھا تھا۔ میں ہال میں قدم رکھ چکا تھا۔ جھکی جھکی مخروطی چھت والے اس ہال میں داخل ہوتے ہی میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ وہاں مدھم سی روشنی تھی۔

میں اندر داخل ہوا تو میرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی شمع دان سے ہال مزید کچھ روشن ہوا تھا۔ اس کا فرش پتھریلا تھا۔ سنگی دیواریں کہیں سے اُبھری ہوئی...اور کہیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ ہال کے خشک اور پتھریلے فرش پر مجھے چار افراد چت اور ساکت لیٹے نظر آئے۔ ان کے ہاتھ سینوں پر تھے، یوں جیسے گہری نیند سو رہے ہوں۔ ان کی ترتیب بے تکی تھی۔ کوئی ایک کونے میں پڑا تھا تو کوئی دوسرے کونے پر، دو افراد ہال کے وسط میں ساتھ، ساتھ لیٹے ہوئے تھے۔ ایک طرف کچھ سامان بکھرا ہوا تھا۔

نجانے یہ کیا اسرار تھا؟ میں نے چند ثانیے رکنے کے بعد چند قدم اور آگے بڑھائے تو ٹھٹکا۔ عقدہ کھلا کہ یہ سوئے ہوئے لوگ نہیں بلکہ حنوط شدہ لاشیں تھیں۔

میرا دھیان لامحالہ اپنے اس عمر رسیدہ مصری میزبان کی طرف چلا گیا، سوچا، یہ اسی کا کوئی روایتی شاخسانہ ہے لیکن جانے کیا بات تھی کہ مجھے لگ رہا تھا کہ یہاں کوئی ایسی غیر معمولی بات ہے ضرور جس نے مجھے ایک لمحے کو دہلا کر رکھ دیا تھا۔

بلاشبہ یہ منظر بھی کم خوف ناک تو نہ تھا مگر جغرافیائی اعتبار سے یہ مقام اور علاقہ ایسا تھا کہ لاشوں کو حنوط کرنا کوئی خاص چونکانے والا امر محسوس نہیں ہوتا تھا۔ تو پھر یہاں ایسا کیا تھا جس نے میرے دل کو بُری طرح دھڑکا رکھا تھا؟

میں اور آگے بڑھا۔ سب سے پہلے وسط میں رکھی دونوں لاشوں کے قریب آیا اور اکڑوں بیٹھ کر ان کا جائزہ لینے لگا۔

بڑی مہارت اور صفائی وصناعت کے ساتھ لاشوں کو حنوط کیا گیا تھا کہ جیسے ابھی آنکھیں کھول کر باتیں کرنا شروع کردیں گی۔ اب میں اسے کاری گری کہوں یا پھر ستم ظریفی کہ ان پر لباس سمیت ہی ملمع کاری کردی گئی تھی۔ گویا کپڑے اُتارنے کی زحمت بھی گوارا نہیں سمجھی تھی۔ لگتا کچھ ایسا ہی تھا جیسے حنوط کا مقصد کچھ اور رہا ہو...... کیا؟ اس کا علم تو کیا اندازہ تک نہیں تھا مجھے۔ یہ کون تھے، میں بھلا کیا جانتا؟

دونوں لاشیں خاصی پرانی محسوس ہوتی تھیں لیکن ان میں بُو نہیں تھی۔ ہاں البتہ ہلکی سی عجیب قسم کی بُو کا احساس ہوتا تھا، یہ شاید کسی کیمیکل وغیرہ کی ہوسکتی تھی۔

ان لاشوں کو دیکھ کر میں نے حیرت سے سوچا کہ کیا آج کے جدید دور میں بھی لوگ فرعون جیسی سوچ پر اعتقاد رکھتے ہیں کہ مرنے کے بعد اپنی لاشوں کو مومیا دینے کی وصیت کردیں، کیونکہ فرعونی عقیدے کے مطابق انہیں دوبارہ زندہ ہونا ہوتا ہے۔

مجھے اپنی سوچ پر ہی ہنسی آگئی اور میں نے بے اختیار اپنا سر جھٹکا لیکن آخر یہ کیا اسرار تھا؟

یہ دونوں ممیاں ایک جوان مرد اور عورت کی تھیں۔ میں نے باقی دو لاشوں کا جائزہ لینے کا ارادہ کیا جو الگ الگ کونوں میں پڑی ہوئی تھیں۔

ابھی میں وہاں سے اُٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اچانک ہال کے اسرار بھرے سناٹے میں ایک ہلکی آواز اُبھری، جیسے کسی نے سانس کھینچنے کی کوشش چاہی ہو۔ میں سرتاپا کانپ گیا۔

پہلا ہی لرزتا خیال دل میں یہی اُبھرا کہ ان لاشوں میں سے کیا کوئی ایک زندہ ممی کی لاش تھی؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ ممکن ہے میرا وہم ہو۔ ہوسکتا کہ کسی نامعلوم رخنے سے باہر صحرا میں چلتی تیز خنک ہوا کا آوارہ جھونکا در آیا ہو۔

میں سب سے پہلے سیدھے ہاتھ کے کونے میں رکھی لاش کی طرف بڑھا۔ وہ کسی عمر رسیدہ آدمی کی لاش تھی۔ ایک بات میں نے محسوس کی تھی کہ اب تک جن تین لاشوں کا جائزہ لے چکا تھا، وہ سب غیر ملکی نظر آتے تھے۔

یہ بات بھی میرے اس خیال کی نفی کرتی تھی کہ یہاں مقامی لوگوں کی خواہش سے ان کی لاش کو حنوط کیا گیا تھا۔ تو پھر...... یہ سب کیا تھا؟

دفعتاً ایک ہلکی سی کراہ اس اہرام نما چھوٹے سے ہال میں اُبھری۔ میں اپنی جگہ سن ہوکر رہ گیا۔ اب اسے میں اپنا وہم نہیں قرار دے سکتا تھا۔

یہ آواز بہت واضح تھی اور میرے بائیں بازو کے کونے کی جانب سے سنائی دی تھی جدھر چوتھی لاش رکھی تھی۔ میں کھڑے کھڑے اس کی جانب گھوم گیا۔ ساکت، خاموش اور تنہا ماحول کی اس محدود فضا میں وہ منظر ایک عام آدمی کے ...لرزادینے کے لیے کافی تھا۔

کونے میں ایک چوبی تختے پر پڑی مومیائی لاش نے کروٹ لی یوں جیسے وہ اُٹھنے کی کوشش میں ہو۔ کیونکہ اس کا ایک ہاتھ تخت سے فرش پر آرہا تھا۔ لاش کا چہرہ بھی میری طرف تھا۔

ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا جیسے میں مصریات کے کسی جادوئی ماحول میں آگیا ہوں۔ ایک ممیائی لاش بھلا کیوں کر حرکت کرسکتی تھی؟

میں نے دل مضبوط کیا اور اس کی جانب بڑھا۔ پیلی اور تھراتی ہوئی مدھم روشنی میں جب میں نے قریب سے اس چوتھی لاش کا چہرہ دیکھا تو بُری طرح چونک گیا۔ ایک لمحے کے لیے تو اپنی آنکھوں پہ یقین نہ آیا اور میں ایک ٹک اس کا چہرہ گھورتا رہ گیا۔

وہ مومیائی لاش اب واضح طور پر حرکت میں تھی، سارے جسم کو تو نہیں، البتہ کچھ حصوں کو وہ حرکت دینے پر قادر معلوم ہوتی تھی۔ اس نے اپنے ایک اکڑے ہوئے ہاتھ کی ہتھیلی فرش پر ٹکا دی تھی اور اسی سہارے مقدور پھر اوپری بدن اور گردن کو بھی موڑ کر اُٹھانے کی کوشش کی تھی۔ یوں جیسے وہ مجھ سے فریاد کناں ہو۔

اس کے سوکھے اور کڑک سے ہونٹ بہ مشکل متحرک ہوئے اور پھر مجھے اس کی کپکپاتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”شش...... شش...... شہزی!“

وہ بس اتنا ہی کہہ پایا تھا اور اس نے سانس کھینچنے کی کوشش چاہی تھی۔ صاف لگتا تھا کہ اس کی سانسیں بھی اکھڑ رہی تھیں۔

وہ سے جی کوہارا تھا۔ ایک سفاک اور خونی درندے کے ایسے عبرت ناک انجام کی تو مجھے بھی توقع نہ تھی کہ اُسے ایک زندہ ممی بنادیا گیا تھا، مگر کیوں......؟ کیا یہ میرے اس پُراسرار میزبان کی حرکت تھی؟ مگر اسے کوہارا سے بھلا کیا دشمنی تھی؟ پھر میں بھی تو ادھر ہی تھا اور جانے کتنی دیر تک بے ہوش اور اس کے رحم وکرم پر تھا، اس نے میرے ساتھ ایسا کیوں نہیں کیا تھا؟

میں اس کے قریب اکڑوں بیٹھ گیا۔

”یہ سب کس نے کیا ہے تمہارے ساتھ......؟“ میں نے پوچھا۔ وہ مکمل مومیایا ہوا تھا۔ بدن اکڑا ہوا تھا۔ شاید اسے مومیائے گئے ابھی تھوڑی ہی دیر بیتی تھی۔

وہ اپنے سوکھے اور اکڑے ہوئے ہونٹوں سے بولنے کی کوشش کرنے لگا، حتیٰ کہ وہ اپنی زبان بھی باہر نہیں نکال پارہا تھا۔ کوہارا جیسے آدمی کا یہ حشر کسی عبرت سے کم نہ تھا، یہ بھی ایک فرعون ہی تو تھا۔

”شش...... شہزی! امم...... مجھے یہاں سے نکالو...... ی ی...... یہ تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔“

”پہلے مجھے بتاؤ کہ یہ سب کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”اس نے تمہارے ساتھ یہ سب کیوں کیا ہے؟ اور یاسمین کہاں ہے؟ تم تو اس کے ساتھ......“ میرا جملہ اس کھٹکے کی آواز سے اُدھورا رہ گیا جو اس دروازے سے آتی محسوس ہوئی تھی جہاں کچھ دیر قبل میں موجود تھا۔

میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے گردن گھما کر اس طرف دیکھا تو میرا وہی مصری میزبان کھڑا تھا۔

میں اسے دیکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ کوہارا کی کپکپاتی کراہیں گونجنے لگیں۔ اس سے خوف اور بے چینی ہویدا ہوتی تھی۔

''یہ...... یہ تم نے اس کے ساتھ کیا کر ڈالا ہے......؟'' میں نے ہمت اور حوصلے سے کام لیا۔ میرا لہجہ قدرے برہم تھا۔ میں اپنی جگہ کھڑا رہا اور اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا مگر وہ تہ خانہ نما ہال کی محرابی چوکھٹ پر آسیبی سائے کی طرح کھڑا ہماری جانب گھورتا رہا۔ میں شاید جوش میں اس سے انگریزی میں مخاطب ہو گیا تھا حالانکہ پہلے میں نے اس کے ساتھ اشاروں میں بات کی تھی۔ لہٰذا میں ابھی اس سے اشاروں میں ہی کچھ استفسار کرنے کا سوچ رہا تھا کہ اچانک کوہارا کی کپکپاتی آواز ابھری۔

''شش...... شہزی! اس مردود شیطان کو فوراً مار ڈالو...... ی ی...... یہ تمہیں بھی زندہ......'' کوہارا کی آواز سے حد درجہ دہشت اور بے قراری مترشح تھی، بلاشبہ اسے بات کرنے میں دقت کا سامنا ہو رہا تھا۔

کوئی اور موقع ہوتا تو میں کوہارا سے یہ ضرور کہتا کہ تم سے بڑا کون رذیل شیطان ہو سکتا ہے۔

میں نے دیکھا وہ مصری دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتا ہوا قریب آیا اور مجھ سے بولا۔

''تمہیں اس کی کیوں فکر ہو رہی ہے؟ یہ تو تمہارا دشمن ہے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ میں بُری طرح چونک گیا۔ وہ ٹوٹی پھوٹی سہی مگر انگریزی میں بات کر رہا تھا۔ جبکہ میں اب تک یہی سمجھے ہوئے تھا کہ اسے مصری عربی بولنے کے سوا اور کوئی زبان نہیں آتی۔ کیونکہ میں نے اب تک، مختصر سہی مگر اشاروں کی زبان میں ہی بات کی تھی۔ تب مجھے بھی یاد آیا کہ اس کمرے میں مختصر سے چوبی شیلف میں چند اجنبی زبان میں رکھی کتابوں کے علاوہ انگریزی کی بھی چند کتابیں رکھی تھیں۔ یوں مجھے پہلے ہی سمجھ لینا چاہیے تھا کہ اسے زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت انگریزی ضرور آتی ہی ہوگی۔

دوسری چونکنے کی وجہ میری یہ تھی کہ اسے کیسے پتا تھا کہ کوہارا میرا دشمن تھا۔ نجانے یہ کیا اسرار تھا۔

''ہاں! یہ ٹھیک ہے، لیکن تم نے اس کا یہ حشر کیوں کیا؟ یہ تمہارا دشمن تو نہیں تھا؟ اور...... اور میری ساتھی یاسمین خانم کہاں ہے؟ وہ تو اس کے ساتھ ہی تھی؟''

میں نے اس بار اپنے لہجے میں برہمی کے بجائے تحمل مزاجی سموتے ہوئے اس سے بات کی تھی۔ کیونکہ ابھی تک میرے اس پُراسرار میزبان نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا بلکہ میرا حیرت انگیز طریقے سے علاج کیا تھا کہ میں خود کو بالکل بھلا چنگا محسوس کر رہا تھا۔ لیکن مجھے یاسمین کی طرف سے زیادہ تشویش تھی۔

''میرا خیال ہے، حنوط کاری میں تھوڑی کسر اور کمی رہ گئی ہے۔ ورنہ ایسا نہ ہوتا۔'' میری بات کا جواب دینے کے بجائے وہ فرش پر تصویرِ عبرت بنے کوہارا کی طرف دیکھتے ہوئے جیسے خود کلامیہ بڑبڑایا۔ ''یا پھر شاید...... یہ کچھ زیادہ ہی سخت جان واقع ہوا ہے اور اسے قبل از وقت ہوش آ گیا، ویسے بھی یہ ابھی مکمل طور پر حنوط کاری کے مرحلے سے نہیں گزرا ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے اس کی دو بار مزید ملمع کاری ہونی ہے۔ فنِ حنوط کاری میں یہ ابھی پہلا اور سادہ مرحلہ کہلاتا ہے۔ تیسرا اور آخری مرحلہ طویل المدت ہوتا ہے۔ ابھی یہ صرف بیرونی ملمع کاری ہے۔''

اسے بدستور سنکیوں کی طرح بڑبڑاتے دیکھ کر مجھے غصہ آنے لگا۔ ''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟''

وہ ہنوز کوہارا کو گھور رہا تھا، جو اپنے جسم کو حرکت دینے کی جستجو کی سرتوڑ کوشش کر رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس مصری کو کچا چبا جائے جس نے اسے اس بُری طرح بے بس کر رکھا تھا۔

''مجھے پہلے یہ کام نمٹانا ہوگا۔ پھر میں تم سے بات کروں گا۔'' وہ بولا اور ایک جانب کونے میں جہاں الابلا سامان رکھا تھا، کی طرف بڑھا۔ میں اپنی جگہ کھڑا اسے اُلجھی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا۔

میرے قدموں کے قریب پڑے کوہارا نے میری ٹانگ پکڑ لی۔ میں چونکا اور ایک جھٹکے سے اپنی ٹانگ اس کی گرفت سے چھڑا لی جو زیادہ مضبوط نہیں تھی۔

وہ قابلِ رحم حالت میں تھا۔ ''شش...... شہزی! خ خ...... خدا کے لیے مجھے اس شیطان سے بچاؤ، میں...... میں ایسی عبرت ناک اور بے بسی کی موت نہیں مرنا چاہتا۔ یاد رکھو......! یہ تمہارا بھی یہی حشر کرے گا۔''

میں نے اس کی داد و فریاد بڑی بے رحمی کے ساتھ نظر انداز کر دی اور مصری میزبان کی طرف دیکھنے لگا، جو ایک تھیلا نما کوئی شے گھسیٹتا ہوا اس طرف لا رہا تھا۔

اس کے بعد تھیلے سے اس نے ایک لکڑی کا صندوقچہ سا نکالا، اسے فرش پر رکھا اور اس کا ڈھکن اُوپر سے اُٹھایا۔ اندر چھوٹے بڑے خانے نظر آ رہے تھے، جو بھانت بھانت محلول اور مسالوں سے بھرے ہوئے تھے۔

اس نے نچلے خانے میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹی سی

شیشی نکالی۔ اس کے اندر ہلکے سبز رنگ کا کوئی محلول بھرا ہوا تھا۔ شیشی نصف تھی۔ اس کا ڈھکن ہٹا کر وہ کوہارا کی طرف متوجہ ہوا اور سفاکی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''یہ دوا پی لو، تمہاری موت آسان ہو جائے گی۔ ورنہ میں تم جیسے چوروں سے ایسی رعایت کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ منہ کھولو اپنا۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا ایک ہاتھ کوہارا کے سر کی طرف بڑھایا اور دوسرا شیشی والا ہاتھ اس کے منہ کی طرف......

کوہارا کے لیے ''چور'' کا لفظ سن کر مجھے کچھ تعجب ہوا مگر میں اس کے اس لفظ پر زیادہ غور نہیں کر سکا۔

وہ مصری شاید اس کی بے ہوشی کا عمل طویل کرنا چاہتا تھا یا پھر اس پر حنوط کاری کا عمل دہرانے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔ (یا یوں کہہ لیں کہ جو کمی بیشی تھی، اسے وہ پوری کرنا چاہتا تھا)

اس وقت کوہارا کا چہرہ شدید طیش، بے بسی، خوف اور بے قراری کے ملے جلے تاثرات کا عجیب ملغوبا دکھائی دے رہا تھا۔ ایسے دبنگ دشمن کی بھیگی بلی جیسی حالت مضحکہ خیز معلوم ہو رہی تھی۔

کوہارا نے اپنے ریختہ مگر اکڑے ہوئے وجود کی مقدور بھر طاقت کو جیسے اپنے ایک ہاتھ میں سموتے ہوئے مصری کا ہاتھ جھٹکا۔ نتیجے میں شیشی تو مصری کے ہاتھ سے نہیں چھوٹی البتہ اس میں سے کچھ دوا اُچھل کر فرش پر ضرور گر پڑی۔

کوہارا نے اسی ہاتھ سے مصری کو بھی دبوچنا چاہا اور اس کے ایک ہاتھ کی کلائی بھی پکڑنے میں کامیاب ہو گیا، مگر میں نے دیکھا کہ اس مصری نے بڑے آرام سے اپنی کلائی اس کی کمزور گرفت سے چھڑا لی۔

کوہارا نے اپنے بے بس وجود میں خون کی گردش بحال کرنے کی غرض سے جھٹکا لیا مگر بے سود، وہ ایک ذرا معمولی سا ہی اپنے جسم کو جنبش دے پایا تھا۔

''شش...... شہزی!'' اس نے پھر مجھے پکارا۔ اس کے لہجے اور آواز سے حد درجہ لاچارگی اور بے بسی مترشح تھی۔ وہ بڑی عجیب کیفیت کا شکار ہو رہا تھا۔

''ٹھیک ہے پھر، تمہاری مرضی۔'' مصری بڑبڑایا۔ ''تم بھوک پیاس سے تڑپ بھی سکو گے اور اپنی موت کو زندہ ممی کی صورت کھلی آنکھوں سے دھیرے دھیرے خود کو دبوچتا پاؤ گے۔''

یہ کہہ کر اس نے شیشی کا ڈھکن دوبارہ لگا دیا اور اسے ایک طرف رکھنے کے بعد چینی کے چھوٹے ڈنڈا کونڈی میں مختلف مسالے نکال کر مکس کرنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ شاید حنوط کاری کا کوئی آمیزہ بنا رہا تھا۔

میں نے کوہارا کی طرف دیکھا۔ مجھے بھی جیسے اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنے کا موقع مل گیا اور میں اکڑوں اس کے قریب بیٹھ کر اس کی بے بسی پر حظ اُٹھانے والے انداز...... میں مسکراتے ہوئے بولا۔

''دیکھ لو کوہارا......! اپنا عبرت ناک انجام، تم ایسی ہی سزا کے مستحق تھے۔ کتنے بے گناہ لوگوں کے خون سے تم نے اپنے سفاک ہاتھ رنگے ہیں۔ اب تم قطرہ قطرہ موت کے زہر کا مزہ چکھو گے، آج مصر کے اہراموں کے پیچھے تمہاری زندگی کا سورج دھیرے دھیرے غروب ہونے لگا ہے۔''

''شہزی! میں تمہارا دشمن ہوں۔'' وہ بولا۔ ''کیا تم بھول گئے کہ میں نے تمہیں عظیم دشمن کا لقب دے رکھا تھا مگر تم تو بزدل دشمن نکلے۔ اگر تمہاری نظروں میں دشمنی کا یہی معیار ہے تو ٹھیک ہے پھر...... میں بھی اس موت کو بہ خوشی گلے لگا لیتا ہوں، اس اطمینان کے ساتھ کہ...... تمہارے ہاتھوں میری ہلاکت نہیں ہوئی۔ اب میں تم سے بالکل بھی رحم اور مدد کی بھیک نہیں مانگوں گا۔ دور ہٹ جاؤ مجھ سے......'' یہ کہہ کر اس نے اپنی نظریں چھت پر جما دیں۔

پل کے پل جیسے کوہارا کے ان الفاظ نے میرا اندر جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ میرے اندر ایک چھناکا ہوا۔ میرے دماغ کی کوئی رگ تھرکی۔ انا نے للکارا۔ شانِ خودی اور جی داری کو ایک دھچکا لگا۔ وجود میں کوئی چیخا۔

میں گم صم اور ایک ٹک کوہارا کا چہرہ تکتا رہ گیا مگر اس نے اب میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ یہ اس کی شان تھی، اس کی خودی اور انا تھی، وہ اب میری طرف دیکھنے کا روادار نہیں رہا تھا۔ میرے بائیں ہاتھ پر وہ مصری اپنے ''کام'' میں مگن تھا۔

''ٹھہر جاؤ......'' تخاطب وہی مصری تھا۔ میری آواز اور اشارے پر اس کے مہارت اور تیزی کے ساتھ چلتے ہوئے ہاتھ ایک دم رک گئے۔

''کیا مطلب......؟''

''مطلب یہ کہ...... تم اس کے ساتھ اب میری اجازت کے بغیر کوئی ایسی حرکت نہیں کرو گے جو اس کی جان لے۔'' میرا لہجہ حد درجہ سنجیدہ تھا۔ مصری میزبان مجھے پہلے تو ایک ٹک دیکھتا رہا... پھر وہ بھی ذرا بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ ہوش میں تو ہو تم؟''

''میں بالکل ہوش میں ہوں۔'' میں بدستور اسی لہجے میں بولا۔ ''تم ابھی فی الحال اسے اسی حالت میں چھوڑ دو، یہ میرا اور اس کا معاملہ ہے۔ تم مجھے پہلے میری ساتھی لڑکی کے بارے میں بتاؤ کہ وہ کہاں ہے؟''

میرے لہجے سے ہی نہیں بلکہ رویے سے بھی اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ''ہوا نے گویا مخالف سمت چلنا شروع کر دیا ہے......''

''ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی لیکن یہ صرف تمہارا ہی دشمن نہیں بلکہ میرا بھی دشمن ہے بلکہ میرا شکار ہے یہ...... بہر حال، آؤ اندر چل کر باتیں کرتے ہیں۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنا سامان وہیں چھوڑا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ کوہارا اسی طرح لیٹے لیٹے میری طرف دیکھنے لگا۔

''ش...... شہزی! ہوشیار رہنا اس بدبخت سے...... یہ موقع ملتے ہی تم پر بھی وار کرنے کی کوشش کرے گا۔''

''یہ خطرہ تو مجھے تمہاری طرف سے بھی لگا رہے گا، کوہارا......!'' میں نے زہریلے طنز سے جواباً کہا۔

''لیکن تم نے آج دشمن داری کی لاج رکھ کر ثابت کر دیا ہے کہ تم کوہارا کی دشمنی کے لائق ہو۔'' وہ ایک عجیب سے تفاخر سے بولا۔ ''شاید تمہاری یہ ادا میرے دل کو بھا جائے اور میں بھی تمہارے ساتھ اپنی دشمنی بھلا دوں۔''

''میں جانتا ہوں کہ تم ایک سانپ ہو، کوہارا......!'' میں نے اس کی باتوں میں آئے بغیر کہا۔ ''میں تمہیں جتنا بھی دودھ پلا دوں، تم موقع ملتے ہی سب سے پہلے مجھے ہی ڈسو گے۔''

اس اثنا میں وہ مصری میزبان ہال کے جھکے ہوئے محرابی دروازے کی طرف بڑھ چکا تھا۔ میں بھی فوراً اس کے پیچھے ہولیا۔ وہ جیسے ہی ہال سے نکلا، اس نے بڑی پھرتی کے ساتھ گھوم کر دائیں ہاتھ کی بیرونی پتھریلی دیوار پر ہاتھ مارا۔ مجھے اس کی حرکت کا پتا چلنے میں چند لمحات کی تاخیر ہوگئی۔ اچانک ایک ہلکی سی گونج نما سرسراہٹ اُبھری، جیسے کوئی سل سرکی ہو، ابھی میں محراب سے دو چار قدموں کے فاصلے پر ہی تھا کہ نکاسی والی تنگی چوکھٹ سپاٹ ہوگئی۔ ایک سل نے کسی خفیہ گوشے میں سرک کر وہ حصہ برابر کر دیا تھا۔

میں اندر قید ہوگیا۔ میرا دل اُچھل کر حلق میں آن اٹکا اور میں تیزی سے دروازے کی طرف لپکا۔ دروازہ کیا تھا گویا دیوار تھی، ایک پتھریلی سل تھی جسے میں دھکیلنے کی مجنونانہ سی مگر لاحاصل کوشش کرنے لگا۔

''وہ رذیل تمہیں گولی دے گیا شہزی!'' اچانک میرے کانوں میں کوہارا کی نحیف سی مایوس آواز ٹکرائی۔ میں اس کی پروا کیے بغیر تھوڑی دیر تک اس بھاری سل پر زور آزمائی کرتا رہا۔ اس کے بعد سر جھٹک کر واپس پلٹ آیا۔

اب میں بھی قید ہو چکا تھا۔

☆☆☆

لمحہ بھر کے لیے میرے دل کو ہول سا آ گیا۔ فکر و تشویش سے میرا سینہ گھٹ کر رہ گیا۔ پیشانی پر اَن گنت لکیروں کا جال نمودار ہوا۔

''کر گیا نا وار!'' کوہارا کی عقب سے زہریلی آواز اُبھری۔ ''اب ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہو چکے ہیں، شہزی!''

میں اس کی بکواس پر توجہ دیے بغیر وہیں کھڑے کچھ سوچتا رہا۔ مجھے سخت پچھتاوا ہو رہا تھا۔ وہ جبہ پوش مصری بڑی آسانی سے جل دے گیا تھا۔ میرے تو سان گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اس قدر تیزی سے قدم اُٹھالے گا کہ مجھے کچھ کرنے کی مہلت بھی نہیں ملے گی۔ وہ کم بخت میری توقعات سے زیادہ زیرک اور پھرتیلا ثابت ہوا تھا۔ اس سے زیادہ مکار بھی۔ پھر شاید میں نے ہی کچھ جلد بازی سے کام لیا تھا۔

''میرا نہیں خیال کہ اب وہ یہاں کبھی آئے گا بھی...... اس وقت تک جب تک ہماری روحیں اس منحوس اہرامی تہ خانے سے پرواز نہیں کر جاتیں۔'' کوہارا کا مایوس کن بیان جاری تھا۔

''تم اپنی بکواس بند نہیں کر سکتے؟'' میں جھلا کر اس کی طرف گھوما۔ وہ ہلکے سے ٹھٹھا مار کے ہنسا۔ اس سے وہ مجھے اور زیادہ زہر لگا۔

''دیکھ لو، شہزی! سیر کو سوا سیر پڑ گئے۔ ہم دونوں خود کو بڑا جغادری سمجھتے تھے، کس طرح اس کمینے نے ہمیں پل بھر میں زیر کر ڈالا۔''

''ایسا بے خیالی اور دھوکے میں ہوا۔'' میں نے شاید جھینپ مٹانے کی غرض سے کہا۔

''جنگ اور محبت میں ہر طرح کے ہتھیار جائز ہیں۔'' اس کی حالت قدرے بہتر ہوتی نظر آ رہی تھی لیکن وہ اب بھی اپنی جگہ کافی حد تک ساکت تھا، ماسوائے ہونٹ اور جسم کا کچھ حصہ حرکت دینے کے۔

''تم تو سب جانتے ہو گے۔'' بالآخر میں نے موضوع بدلا۔ ''یہ آخر معاملہ کیا ہے؟ کون ہے یہ بدبخت شخص؟ اور...... اور یاسمین کو اس رذیل نے کہاں غائب کر دیا ہے؟''

''آفرین ہے تم پر......'' کوہارا پھیکے پن سے ہنسا۔ ''خود مصیبت میں پھنسے ہو اور فکر اس ایرانی شہزادی کی......''

''وہ میری مخلص اور وفادار ساتھی ہے۔''

''مخلص، وفادار...... اونہہ۔'' وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ ''تم ان رنگین تتلیوں کو بے شک بے وقوف بنا سکتے ہو شہزی! لیکن مجھے نہیں اس لیے کہ میں نے تمہارے ساتھ ایک طویل عرصہ بتایا ہے۔ عابدہ سے لے کر سوشیلا، پھر میری ہی ساتھی چندر کلا کو ورغلا کر اپنے ساتھ ملایا، اس کے بعد انڈیمان کی بلیک کوئن اور اب یہ ایرانی حسینہ یاسمین خانم۔'' وہ اس یاوہ گوئی کے بعد لمحہ بھر کو رکا پھر بولا۔

''لیکن پھر تمہاری عابدہ کے سلسلے میں یہ ساری تگ و دو دیکھتا ہوں تو عجیب مخمصے کا بھی شکار ہو جاتا ہوں۔ ایک بات بتاؤ شہزی! کیا واقعی تم عابدہ سے سچی محبت کرتے ہو؟''

میں نے کوہارا کی بکواس سننے کے بعد ایک گہری ہنکاری بھری اور اس سے کہا۔

''کوہارا! میرے بارے میں جو تم رائے قائم کر رہے ہو، وہ درحقیقت تمہاری اپنی گندی سوچ اور گھٹیا ذہن کی عکاسی کر رہی ہے، مثل مشہور ہے کہ جو جیسا ہوتا ہے وہ دوسرے کو بھی ویسا ہی سمجھتا ہے۔ پھر غبی انسانوں کے منہ سے سچ بھی خود ہی نکل جاتا ہے، جیسا کہ تم نے آخر میں کہا کہ میں عابدہ کے لیے یہ ساری تگ و دو کر رہا ہوں، رہی بات ان لڑکیوں کی جن کے نام تم نے گنوائے ہیں وہ سب میری محض اچھی اور وفادار ساتھی رہی ہیں۔''

''بُرا مت مانو...... میں درحقیقت کچھ اور سوچ رہا تھا۔'' کوہارا نے اچانک لہجہ بدل لیا۔

''سوچتے رہو......'' میں نے بے پروائی سے کہا اور ایک طرف کونے میں دیوار سے پشت لگا کر ننگی فرش پر بیٹھ گیا۔

''شہزی! تم واحد انسان ہو جس نے دشمنی کی صورت میں بھی مجھے اس قدر متاثر کیا ہے کہ اگر کسی موقع پر مجھے تمہیں ہلاک کرنا پڑا تو یقین کرو میرا، مجھے اس کا بے حد دکھ ہوگا۔ ایک طرف میرا دل تمہاری دوستی کی طرف مائل ہوتا ہے تو دوسری طرف ماسٹر لولوش کا خیال آ جاتا ہے۔ کیونکہ میں موت قبول کر سکتا ہوں مگر اس سے غداری کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔'' وہ اتنا کہہ کر چپ ہوگیا۔

میں اس کی بات پر پہلی بار چونکا تھا لیکن وہ ایسا شخص نہیں تھا کہ میں اس کے متعلق کوئی مثبت رائے قائم کرتا۔ تاہم اتنا ضرور تھا کہ کوہارا جیسے بے حس اور جذبات سے عاری شخص کے منہ سے اس طرح کی گفتگو مجھے اس کا الگ روپ دکھا رہی تھی۔

شاید وقت کی ڈور دراز ہو جائے تو فطری طور پر کچھ انسیت کے جذبات انسان کے اندر از خود پروان چڑھنے لگتے ہیں۔

بہرکیف میں بس اس کی طرف دیکھتا رہا کہ وہ کہنا کیا چاہ رہا ہے۔

''شہزی! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم میرے راستے سے اور میں تمہارے راستے سے ہٹ جاؤں؟''

''ہو سکتا ہے۔'' میں نے تلخ مسکراہٹ سے کہا۔ ''بشرطیکہ تم اپنی کنپٹی پر گولی مار کر چھلگری سمیت ان تمام بے گناہوں کی اموات کا ازالہ خود کو موت کی سزا دے کر دو، جنہیں تم نے بیدردی سے ہلاک کیا۔''

''میرے راستے میں جو حائل ہوگا، اس کا میں یہی انجام کروں گا۔'' اس کی چنگیزی بربریت ایکا ایکی لوٹ آئی۔

''تم غلط راستے پر گامزن ہو کوہارا......!'' میں نے کہا۔

''چھوڑ دو یہ باتیں۔ ہم دونوں کے بیچ کبھی نہیں بن سکتی۔'' اس نے جھلا کر موضوع بدل دیا۔ ''مجھ پر تم نے ایک احسان کر ہی دیا ہے تو اب یہ بھی کر دو کہ میرے جسم سے یہ گندے غلیظ مسالے جھاڑ دو۔ ویسے اب میں خود کو کافی بہتر محسوس کر رہا ہوں۔''

''میں تم پر کوئی احسان کر رہا ہوں اور نہ ہی کرنا چاہتا ہوں، ماسوائے تمہیں جلد سے جلد موت کی وادی میں دھکیلنے

کے......'' میں نے ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی اور صاف گوئی سے کہا۔ ''کیونکہ تم جیسے درندے اور خونی قاتل پر احسان کرنے کا مطلب ہی انسانیت پر ظلم ہوگا۔ کسی خوش فہمی میں مت رہنا، سے جی کوہارا......! اب تک میں نے جو موقع تمہیں دیا ہے، وہ محض تمہارے یاوہ گوئی کے جواب میں اور اس برتے پر کہ کہیں تم یہ نہ سمجھنا کہ شہزی نے تمہیں کمزور سمجھ کر زیر کیا۔''

میری بات سن کر کوہارا بولا۔ ''کاش، شہزی! میں اپنے ایک ہاتھ کو اتنا حرکت دے سکتا تو تمہیں سلام کرتا۔ گریٹ شہزی! گریٹ، اسی لیے تو میں تمہیں اپنا عظیم دشمن سمجھتا ہوں۔'' وہ ایک ثانیے رکا پھر بولا۔

''شہزی! اپتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ اب...... ہم دونوں دشمنوں میں سے کسی ایک کا وقت قریب ہے اور یہ بھی کہ اگر ہم دونوں میں سے کسی ایک کو ہلاک کرنے کا موقع مل گیا تو مرنے کے بعد دل میں کوئی کسک ضرور چھوڑے گا، ایک دوسرے کو ہلاک کر ڈالنے کے دوران میں ہمارے بیچ ایسا کچھ ہوگا ضرور...... جو بالکل انوکھا ہوگا۔''

''تمہارا دماغ چل گیا ہے کوہارا......! شاید یہ ان حالات کا اثر ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کم از کم تمہیں ہلاک کر ڈالنے کے بعد میرے دل میں کوئی کسک نہیں اُبھرے گی۔''

''شاید تم ٹھیک کہتے ہو شہزی! کہ میرا دماغ چل گیا ہے۔'' وہ بولا۔ ''میں نے آج اپنی زندگی میں پہلی بار ایک بھیانک موت کو اپنے بالکل قریب محسوس کیا تھا۔''

ہمارے درمیان چند سیکنڈوں کی خاموشی کا وقفہ رہا۔

اسرار بھری رات دبے پاؤں بیت رہی تھی۔ کوہارا اپنے جسم کو وارم اَپ کے انداز میں حرکت دیتا رہا۔ ساتھ ہی وہ اب ایک ہاتھ کو اس قدر ہلا جلا رہا تھا کہ اپنے جسم سے حنوط کاری کے مسالوں کو بھی جھاڑ کر پھینک رہا تھا۔

ایکا ایکی مجھے یوں لگا جیسے کوئی درندہ، نیم بے ہوشی کے بعد دوبارہ بیدار ہورہا ہو۔

میں محتاط ہوگیا۔ ''شہزی! میری ایک مدد اور کردو ذرا......، تاکہ ہم دونوں مل کر اس مشترکہ کشتی کو پار لگا سکیں۔''

''میں نے تم سے کچھ پوچھا تھا۔'' میں نے اس کی خواہش کو صرفِ نظر کرتے ہوئے کہا۔

''کیا......؟''

''یہی کہ...... تم تو سب جانتے ہوگے، یہ آخر معاملہ کیا ہے؟ کون ہے یہ بدبخت شخص؟ اور یاسمین کو اس رذیل نے کہاں غائب کردیا ہے؟''

''تم جب زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے راستے میں بے ہوش ہوگئے تو......'' وہ سنجیدہ لہجے میں بتانے لگا۔ ''ہمارے پیچھے ایک پولیس گاڑی لگ گئی تھی۔ پولیس کو جُل دینے کے بعد اس مردود مصری کے ہاں ہم نے پناہ لی۔ وہ تمہیں دیکھنے لگا۔ ہمیں اس نے کچھ پینے کو پیش کیا۔ جس کے بعد میں تو بے ہوش ہوگیا اور یہاں میری آنکھ کھلی...... بس! اب تک یہی ہوا۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا کہ یہ کون ہے؟ اور اس نے یاسمین کا کیا حشر کیا ہے۔''

اس کے جواب پر مجھے ایک بار پھر یاسمین کی طرف سے گہری تشویش نے گھیر لیا۔

مجھے متفکر اور تشویش زدہ پا کر کوہارا بولا۔ ''میرا خیال ہے یاسمین کے سلسلے میں تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس نے یقیناً اس کے ساتھ ایسا کچھ نہیں کیا ہوگا۔ ورنہ وہ بھی ہمارے ساتھ اور سامنے ہوتی۔ وہ ایرانی شہزادی یوں بھی ایک چلتا پرزہ لگتی تھی، میرا خیال ہے وہ اسے جُل دے کر بھاگ نکلی ہوگی۔''

میں نے اس کی رائے کے جواب میں کوئی تبصرہ کرنا ضروری نہیں سمجھا پھر کچھ سوچ کر میں فرش سے اُٹھا اور اس کی طرف بڑھا۔

میں نے بہرحال مصلحتاً اس کی ''عارضی'' مدد کی ٹھان لی تھی۔ ''لگتا ہے یہ کسی محلول سے ہی اُتریں گی۔ تم اس کا وہ سامنے پڑا تھیلا اُٹھالاؤ۔'' کوہارا نے کہا۔

میں وہ تھیلا اُٹھالایا۔ اس کے اندر سے چوبی صندوقچہ برآمد کیا اور اسے کھول کر اس کا سارا سامان مع لوازمات کے فرش پر اُلٹ دیا۔ کچھ ایسے محلول کی شیشیاں بھی برآمد ہوئیں جن پر لیبل چسپاں تھے۔ ایک شیشی پر انگریزی میں ''فورمل ڈی ہائیڈ'' درج تھا۔

اس کے نیچے بریکٹ میں باریک حروف میں اس کی تفصیل درج تھی جس کے مطابق یہ محلول جسم کے اندرونی اعضا کو سڑنے نہیں دیتا تھا۔ گویا یہ حنوط کاری میں کام آنے والا کوئی انجکشن تھا۔ کیونکہ اس کے ساتھ سرنج بھی تھی۔

بہرکیف میں نے اپنی سی کوشش سے کوہارا کی یہ

ساری بیرونی ملمع کاری کو کافی حد تک صاف کیا۔ اس مصری نے بتایا تھا کہ ابھی یہ حنوط کاری پہلے مرحلے میں تھی۔

قصہ مختصر...... کوہارا کی حالت کافی بہتر ہوگئی۔ وہ اُٹھ کر کھڑا ہوگیا، تھوڑا لڑکھڑایا مگر پھر سیدھا ہوکر اُچھل کود کرنے لگا۔ اس کی ایک آنکھ پر فلیپ لگا ہوا تھا، ایک ٹانگ میں لنگ بھی باقی تھا۔

''میں تمہارا یہ احسان یاد رکھوں گا شہزی!'' وہ کچھ سکون میں آنے کے بعد بولا۔ ''لیکن اس وقت تک جب تمہاری کسی تیسرے آدمی کے ہاتھوں جان خطرے میں نہ ہو لیکن میرے نرغے میں آگئے تو نہیں بخشوں گا، یاد رہے، یہی اُصول تمہارا ابھی رہا ہے۔''

''یہ وقت بتائے گا، اب کام کی بات کرو۔'' میں نے کھنڈی ہوئی متانت سے کہا۔ ''یاسمین کے بارے میں پتا لگانا ضروری ہے اور وہ صرف یہی مصری بتاسکتا ہے۔''

''اس ہال کمرے کا ایک بار پھر اچھی طرح جائزہ لینا ہوگا۔'' اس نے جواب میں کہا اور ہم یہی کرنے لگے۔

ہر جگہ کا جائزہ لے لیا مگر مفر کی کوئی راہ ہمیں نہ مل سکی۔

''کم بخت کوئی ایسا کند آلہ یا اوزار بھی نہیں ہے کہ جسے سنگی سل پر آزمایا جاسکتا ہو۔'' کوہارا دانت پیس کر بولا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ کوہارا نے بھی میرے چہرے سے کچھ ایسا محسوس کرلیا، بولا۔ ''کیا کوئی ترکیب ذہن میں آرہی ہے؟''

''کوہارا......'' میں چند قدم اس کے قریب آکر بولا۔ ''تمہیں اردو آتی ہے؟'' وہ میرے سوال پر حیران تو ہوا تاہم جواب میں بولا۔

''آتی تو ہے مگر ہندی انداز کی اور ٹوٹی پھوٹی۔ مگر تم کرنا کیا چاہتے ہو؟''

میں نے اس سے اردو میں کہا۔ ''غور سے سنو میری بات...... ہمیں ڈراما کرنا ہوگا۔ ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو جائیں گے۔ ایک دوسرے کو زخمی بھی کرنا پڑے گا تھوڑا بہت، اس کے بعد نڈھال ہوکر گر پڑیں گے۔ غصے اور طیش میں آکر شور بھی مچائیں گے۔ کیا تم میری بات سمجھ رہے ہو؟''

''بالکل سمجھ رہا ہوں اور اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔'' وہ شاید میری اسکیم سمجھ گیا تھا۔ کیونکہ اس کے کانے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

''یہ مصری ضرور کسی خفیہ رخنے سے ہم پر نظر رکھے ہوئے ہوگا۔ اسے معلوم تو ہے ہی کہ ہم ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے کے ہاتھوں زخمی اور بے ہوش پاکر وہ اندر آنے کی کوشش کرے گا تاکہ ہم دونوں پر بے ہوشی کی حالت میں قابو پاسکے۔ بس! اس کے بعد ہم اسے دبوچ لیں گے۔''

ہم نے منصوبے کے مطابق یہی کیا۔ پہلے چلّا چلّا کر ایک دوسرے کو کوستے رہے، تاکہ وہ مصری اس طرف متوجہ ہوسکے۔ اس کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا ہوگئے۔

ہم نے ایک دوسرے کے کپڑے تک پھاڑ ڈالے۔ گھونسے اور مُکّے مار کے چہرہ بھی زخمی کرلیا۔ کوہارا کے گھونسے نے میرا ہونٹ متورم کردیا جبکہ میں نے بھی اس کے ساتھ یہی کیا۔ اس کے بعد ہم نڈھال ہوکر گر پڑے۔

ہم غصے میں اپنے حلق سے بلند آوازیں بھی خارج کرتے رہے۔ پھر فرش پر گر پڑے اور کبھی وہ میرے سینے پر چڑھ جاتا کبھی میں اس پر سوار ہوکر اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبا رہا تھا۔

ہم دونوں دیرینہ دشمنوں کے بیچ یہ پہلا اور عجیب موقع تھا کہ ہم مصنوعی انداز کی لڑائی لڑ رہے تھے۔ اس کے بعد ہم نڈھال ہوکر کراہنے اور لمبے لمبے سانس لینے لگے۔ اس کے بعد بے سدھ ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے جیسے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگئے مگر اس طرح کہ ہمارے چہروں کا رخ اسی سل نما دروازے کی طرف ہی تھا، آنکھیں بظاہر بند تھیں مگر ایک جھری سی بنا کر دیکھتے رہے۔

میری اس انوکھی اسکیم کا نتیجہ جلد ہی برآمد ہوگیا۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ ہلکی سی سرسراہٹ اُبھری۔ میرا دل فرطِ جوش سے تیز تیز دھڑکنے لگا۔

میں نے اپنی آنکھ کی جھری سے دیکھا، وہ مصری دروازہ نما سل سرکا کر اندر داخل ہورہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک عجیب سی شے تھمی ہوئی تھی۔ یقیناً کوہارا نے بھی اسے اندر داخل ہوتے دیکھ لیا ہوگا، تاہم میں نے اسے تاکید کر رکھی تھی کہ ہم دونوں میں سے اگر کسی ایک کو بھی اس پر حملہ کرنے کا موقع ملا تو ہم دریغ نہیں کریں گے اور کسی قسم کی جلدبازی سے بھی کام نہیں لیا جائے گا۔

ہال میں شمعوں کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ مصری سل ہٹنے کے بعد ہال میں داخل ہوا مگر صرف ایک قدم...... اس

کے بعد وہیں رک گیا۔ اس کے ہاتھ میں جو شے تھمی تھی، میں اسے بھی دیکھ رہا تھا۔ سرِدست میں اس شے کے بارے میں کوئی اندازہ قائم نہ کرسکا۔ ہوسکتا تھا، وہ کوئی ہتھیار ہو مگر کس نوعیت کا؟ یہ نہیں پتا چلا۔

وہ رک کر ہماری جانب ایک ٹک تکتا رہا۔ میں اس کے جلد سے جلد قریب آنے کی دعا مانگنے لگا۔ خدشہ بھی دل میں اُبھرا کہ کہیں ہماری چالاکی کا شبہ ہوتے ہی یہ کم بخت واپس نہ پلٹ جائے۔

تھوڑی دیر وہیں ٹھہرے رہنے کے بعد اس نے ہماری جانب قدم بڑھا دیے۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ کچھ قریب آنے پر مجھے اس کے ایک ہاتھ میں پکڑی ہوئی شے کو پہچاننے کا موقع ملا۔ وہ کوئی عجیب ساخت کا تیز اور کند فولادی ہتھیار تھا۔ پہلی نظر میں یہ بُغدے کی طرز کا محسوس ہوا تھا۔

وہ ایک بار پھر ہمارے ذرا قریب آکر ٹھہر گیا۔ میں اور کوہارا اسکیم کے مطابق ایک دوسرے سے صرف تین، چار گز کے فاصلے پر اپنے ہاتھ پاؤں پھیلائے بے سُدھ پڑے تھے۔

وہ مصری پھر آگے بڑھا۔ اس نے سب سے پہلے کوہارا کی جانب رخ کیا تھا اور جھک کر اسے دیکھنے لگا۔ گویا اس پر حملہ کرنے کا پہلا موقع کوہارا کو ملنے والا تھا لیکن میری کوشش تھی کہ یہ موقع پہلے مجھے ملتا، کیونکہ کوہارا کی سابقہ حالت کے پیشِ نظر اس کا حملہ چُوک بھی سکتا تھا۔ اس صورت میں مصری کو بھاگنے کا موقع مل جاتا۔ حالانکہ گرتے وقت میں نے خود کو اس رخ پر فرش پر ڈالا تھا کہ مصری اندر داخل ہوتے ہی میری جانب بڑھتا مگر اس نے کوہارا کا انتخاب کیا تھا۔

مجھ سے مصری کا فاصلہ چار پانچ گز کا تھا۔ یوں بھی ہم دونوں دانستہ ایک دوسرے کے قریب قریب پڑے تھے۔

اچانک مصری سیدھا ہوا اور اس نے اپنے ہاتھ میں تھاما ہوا بُغدا نما ہتھیار فضا میں بلند کیا، وہ کوہارا پر وار کرنا چاہتا تھا کہ اچانک وہ حرکت میں آیا اور اس نے اپنی ایک ٹانگ اس کی ٹانگوں سے ٹکرا دی۔ مصری کا توازن بگڑا۔

یہ اس کے لیے غیر متوقع نہیں تو اچانک ضرور تھا مگر کوہارا کا وار شاید خاطر خواہ اثر انداز نہیں ہوسکا، پل کے پل وہ مکار مصری ہماری اسکیم سمجھ گیا۔ اس نے خود کو سنبھالا دیا اور پلٹ کر بھاگا، میرے اوسان خطا ہوگئے۔

کوہارا کو اُٹھنے میں تاخیر کا سامنا ہوا تو وہ حلق کے بل چیخ پڑا۔

''شہزی! اسے پکڑو......''

میں تو پہلے ہی حرکت میں آچکا تھا اور مچھلی کی طرح تڑپ کر گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل پر دروازے کی طرف بھاگتے مصری کی جانب لپکا اور...... ایک دم کھڑا ہوا تو تب تک وہ مصری محرابی چوکھٹ تک پہنچ چکا تھا۔

میں نے ایک لانگ جمپ لگائی۔ جیسے ہی وہ چوکھٹ پار کرنے لگا، میں اس پر جا پڑا۔ اُسے رگیدتا ہوا پہلے والے کمرے میں لے گیا۔ ہم دونوں ہی گرے لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے اس مصری کے حلق سے دل خراش چیخ کی آواز سنائی دی اور میرے چہرے پر خون کے چھینٹے پڑے۔

میں ایک لمحے کو بوکھلا سا گیا۔

اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بُغدا نما ہتھیار کا تیز اور کند پھل اس کی گردن پر پھر چکا تھا۔ وہ اب اُدھڑی ہوئی گردن کے ساتھ میرے نیچے پڑا ہوا ذبح کیے جانور کی طرح تڑپنے لگا اور میرے سنبھلتے اور دیکھتے ہی وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔

''مر گیا یہ ذلیل......!'' کوہارا کی عقب سے آواز ابھری۔ ''بہت اچھا ہوا لیکن کاش! اس ذلیل کو میں اپنے ہاتھوں، اذیتیں دے کر ہلاک کرتا۔''

''بکواس بند کرو اپنی......'' میں کھڑا ہو کر جھلاّئے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''تم کبھی عقل کی بات بھی سوچتے ہو؟ اب کون ہمیں بتائے گا کہ یہ سارا کیا چکر تھا؟ اور یاسمین کہاں ہے؟''

کوہارا بھی میری بات پر سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ چپ رہا۔ میں بھی یک ٹک کھڑا مصری کی خون آلودہ لاش کو بلاارادہ تکنے لگا۔

''کم از کم اس کے کپڑے اور جوتے تو میرے کام آہی جائیں گے، تم بھی کوئی ترکیب آزماؤ۔ تمہارا لباس بھی مضحکہ خیز ہو رہا ہے۔'' اس نے کہا۔

اس کی بات درست تھی۔ میرا لباس ابتر تھا۔ پتلون کا ایک پائنچہ ٹانگ کی مرہم پٹی کی وجہ سے ران تک کٹا ہوا تھا۔ شرٹ کی بھی کچھ ایسی ہی حالت ہو رہی تھی۔ کوہارا، اس کا لباس اور جوتے اُتارنے میں مصروف ہوگیا۔ میں نے بھی اِدھر اُدھر ڈھونڈ ڈھانڈ کے اضافی لباس اور جوتے دیکھ لیے۔ لباس کیا ہونا تھا، گھٹنوں سے بھی نیچے جبّے اور صافے

تھے۔ ہم نے وہ پہن لیے۔ البتہ اس کھلے ڈلے لباس میں خود کو کافی ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

چند منٹوں میں اس سے فارغ ہونے کے بعد ہم چند ثانیے گم صم سے کھڑے رہے۔

''ہمیں اب بہرحال یہاں سے کوچ کرنا ہوگا۔'' بالآخر لمحے بھر کی پُراندیش خاموشی کے بعد کوہارا بولا۔

''لیکن ہم جائیں گے کہاں؟'' میں نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہماری منزل یاسمین خانم کے دم سے تھی۔ پہلے اسے تلاش کرنا ہوگا۔''

کوہارا نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ آزادی پاتے ہی وہ جیسے ایک دم مجھ سے لاتعلق ہوگیا تھا اور پلٹا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا، وہ اس منحوس ٹھکانے سے باہر کی طرف نکل رہا تھا۔ میں بھی ایک لمحہ نہیں ٹھہرا اور اس کے پیچھے باہر آگیا۔

اگرچہ میرا ارادہ مصری کی لاش کو ٹھکانے لگانے کا تھا لیکن کوہارا نے اس سلسلے میں کوئی دلچسپی لی تھی نہ ہی وہ میری مدد کرتا۔

باہر صحرا میں خنک رات اُتری ہوئی تھی۔ آسمان پر کہیں کہیں تارے ٹمٹما رہے تھے۔ ایک طرف بستی کے گھروں کی بے ترتیب قطاروں کے ہیولے نظر آتے تو دوسری جانب حدِ نگاہ ریت کا سمندر پھیلا ہوا تھا۔

میں نے دیکھا کوہارا باہر آتے ہی دائیں بائیں اور اِدھر اُدھر جھک کر کچھ دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں اس حرکت کا مطلب سمجھ چکا تھا اور اسی لیے میں نے اپنی توجہ اردگرد کا جائزہ لینے پر مرکوز کردی۔

بستی پر سناٹا طاری تھا۔ فضا خنک اور رکی رکی سی محسوس ہوتی تھی۔ چہار سُو عجیب قسم کا مرگ آسا سکوت طاری تھا۔ مکانوں کے بے ترتیب ہیولوں کے درمیان اندھیری گلیاں مردہ اور تنگ بل کھاتے راستے کسی حنوط شدہ لاش کی طرح محسوس ہوتے تھے۔

''انہیں یہاں سے گئے ہوئے زیادہ دیر نہیں بیتی ہے......'' معاً کوہارا کی خیال انگیز آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔

''تو تم نے ان کے پیروں کے نشانات دیکھ لیے......'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کتنے لوگ ہیں؟ کیا یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یاسمین بھی......''

''ہاں۔'' اس نے میری بات کاٹی۔ ''صرف دو افراد روانہ ہوئے ہیں۔ ان میں ایک عورت ہے، وہی یاسمین ہو گی۔''

''کسی عورت کا اندازہ کیسے ہوا تمہیں؟''

''یاسمین کے پیروں تلے جو جوتے ہیں ان سے...... جبکہ دوسرے شخص کے جوتوں کی بناوٹ ویسی ہی ہے جیسی اس مصری کی تھی۔'' کہتے ہوئے اس نے اپنے ایک پاؤں سے جوتے کا نشان بنایا۔ جوتا اسی مصری کا ہی تھا، لہٰذا دوسرے مردانہ جوتا کی شیپ اینڈ سائز بھی ویسی ہی پائی گئی۔

''ہم......'' میرے منہ سے پُرسوچ انداز میں برآمد ہوا۔

''لہٰذا اب دو ہی باتیں ذہن میں اُترتی ہیں۔'' کوہارا کا بیان جاری تھا۔ ''ایک تو یہ کہ یاسمین کے ساتھ جانے والا آدمی اسی مصری کا ساتھی ہوسکتا ہے، دوسری بات یہ کہ اس کے ساتھی کے ساتھ جانے میں خود یاسمین کی مرضی بھی شامل ہوگی۔ میرا خیال ہے اس حرافہ (یاسمین) نے کوئی چکر چلایا ہے۔''

مجھے یہ اعتراف کرنے میں اب کوئی عار نہ تھا کہ کوہارا صرف کشت و خون بہانے کا عادی نہیں بلکہ باریک بین بھی تھا۔ کیونکہ میں اس کی باتوں کو (ماسوائے کسی چکر کے) رد نہیں کرسکا تھا۔

یوں کوہارا اپنے تئیں تازہ کار حالات کا تجزیہ کرتے ہی پاس کھڑی جیپ کی طرف لپکا۔

وہ اس میں سوار ہوگیا۔ میں بھی اس کی جانب بڑھا۔ مجھے اس کی بے رخی بُری طرح کھلنے لگی تھی۔ وہ اب اپنی اوقات پر اُتر آیا تھا۔ کیونکہ اب اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

چابی شاید اگنیشن سوئچ میں لگی ہوئی تھی۔ وہ جیپ اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں جا کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے میری طرف دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ جیپ کا انجن ہر بار سلف لگانے...... پر کھرکھراتا اور پھر خاموش ہوجاتا۔

جیپ اسٹارٹ کرنے کی دو تین بار ناکام کوشش کے بعد کوہارا نے جھلا کر اسٹیئرنگ پر ہاتھ مارا۔

''کوئی خرابی ہے یا فیول ختم ہے؟'' میں نے کسی خیال کے تحت اس سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

''کوئی خرابی لگتی ہے شاید، فیول کا مسئلہ نہیں ہے۔'' وہ جواب میں یہ کہتے ہوئے اُترا اور بونٹ کی طرف بڑھا۔

پھر ایک لمحے کو رکا اور میری طرف سنجیدہ نظروں سے گھورنے لگا۔

''تم تو ایسے دیکھ رہے ہو جیسے جیپ کی خرابی کا ذمے دار میں ہوں؟'' میں نے کہا۔

''تم اب اپنا راستہ لو شہزی! مجھے اب تمہاری ضرورت نہیں رہی۔'' اس نے سرد و سپاٹ لہجے میں کہا۔

''تم جیسے بے حس اور رذیل آدمی سے مجھے یہی توقع تھی کوہارا......!'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''لیکن اس وقت اس جیپ کی مجھے بھی ضرورت ہے۔ تم چاہو تو اپنا الگ اور پیدل راستہ ناپ سکتے ہو۔''

میری بات پر اس نے خونخوار نظروں سے دیکھا تھا اور غرا کر بولا۔ ''اس جیپ کا مالک میں ہوں۔ تم اپنا پیدل راستہ لو۔ سمجھے......!''

''بالکل نہیں، جب تم اس بات کا اعتراف کر چکے ہو کہ ہم اس وقت ایک ہی کشتی کے سوار ہیں تو اس کشتی پر بھی مشترکہ سواری کریں گے۔'' میں نے کہتے ہوئے جیپ کی طرف اُنگلی کا اشارہ کیا۔ وہ خوفناک انداز میں غراتا ہوا میری جانب بڑھا مگر پھر بہت قریب...... پہنچ کر رک گیا۔

درحقیقت کوہارا، فوری طور پر یاسمین اور مصری کے ساتھی کے تعاقب میں اکیلا نکلنے کا ارادہ رکھتا تھا اور اس کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا کہ وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاتا۔ کیونکہ ہم تو ایک دوسرے کی راہ کھوٹی کرنا چاہتے تھے۔

بہرکیف اس وقت ہم دونوں زخمی تھے۔ اس کی ٹانگ کی حالت بھی کچھ اچھی نہیں تھی اور خود میری ایک ٹانگ اور بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ جبکہ اس اہرام نما سے مکان میں ایک مقامی باشندے کی لاش بھی پڑی تھی۔

بستی اس وقت محوِخواب تھی اور رات اپنے آخری پہر میں۔ ایسے میں آپس کی لڑائی ہمیں نقصان پہنچا سکتی تھی۔ شاید یہی سب باتیں خبیث کوہارا نے بھی پل بھر میں سوچی تھیں اس لیے وہ میرے خلاف جارحانہ قدم سے ایک دم باز آ گیا تھا۔

ایک گہری سانس لے کر اس نے اپنے اندر کا تناؤ کم کیا اور بولا۔ ''شہزی! میری اس رعایت کو غنیمت جانو اور میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ میں تم سے دو دو ہاتھ کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ ورنہ ابھی یہاں تمہاری لاش پڑی ہوتی۔ یاسمین کی اچانک گمشدگی کے بعد یہ معاملہ اور بھی گمبھیر ہو چکا ہے اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ......''

''کوہارا......!'' میں نے غرا کر اس کی بات کاٹ دی۔ مجھے اس کی ڈھٹائی اور نخوت آمیز غرور پر طیش آ گیا۔ وہ شاید مجھے اتنا ہی تر نوالہ سمجھے ہوئے تھا۔

''یاسمین کو تو میں ہر ممکن طرح سے تلاش کرنے کی کوشش کروں گا لیکن یہ جیپ اس وقت میری اہم ضرورت بن سکتی ہے اور سنو...... وہ نقشہ بھی تمہیں میرے حوالے کرنا ہوگا، جو تم نے یاسمین سے چھینا تھا۔'' میں نے کہتے ہوئے، ہتھیلی کھول کر اپنا ایک ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا۔

میری بات سن کر اس کی اکلوتی آنکھ کی وحشیانہ چمک کچھ اور تیز ہو گئی لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر ایک ٹھہراؤ سا آیا اور اسی لہجے میں بولا۔

''دیکھو شہزی! اس وقت ہمارا جلد از جلد اس بستی سے نکل جانا بہتر ہوگا۔ اگر ہم یہاں لڑ پڑے تو اندر اس مکان میں ایک لاش بھی پڑی ہے جس کے قاتل تم ہو۔ پولیس گاڑی یوں بھی نجانے ہماری یا کسی اور کی تلاش میں یہاں گھومتی پھر رہی ہے۔ لہٰذا اس بحث کا نقصان تمہیں ہو گا۔'' اس کی مکاری اور شاطرانہ مزاج میرے لیے نیا نہیں تھا۔

''مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ ہاں اس تنازعے کی ایک صورت ہو سکتی ہے کہ دو میں سے ایک چیز میرے حوالے کر دو، پھر معیار کا توازن برابر ہو جائے گا اور ہم ایک دوسرے سے سمجھوتا کرنے کی پوزیشن میں بھی آ جائیں گے یا پھر ڈیول لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ، جو جیتا دونوں چیزیں اسی کی ہوئیں۔''

''بہت مکار ہو تم...... شہزی!'' وہ میری طرف گھور کر معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔

''کیا لو گے؟''

''جیپ یا نقشہ۔''

''نقشہ میں نہیں دوں گا جیپ لے لو۔''

''اس پر ٹاس ہوگا۔''

''ٹاس کے لیے کوائن کا ہونا لازمی ہے۔''

''کوئی بات نہیں، ہاتھوں سے ہو سکتا ہے۔''

''منظور ہے۔''

ہم دونوں آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔ دونوں نے تین بار اپنے ہاتھ جھٹکے، چوتھی بار میں اس کے بائیں ہاتھ کی اُنگلیاں میرے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے مختلف ہو گئیں۔ وہ

ٹاس جیت گیا۔

اس نے جیپ میرے حوالے کر دی اور خود ہلکا قہقہہ مار کے جیپ کی طرف بڑھا۔ میں اپنی شکست پر اندر ہی اندر تلملا گیا۔

نقشہ میرے لیے ہی نہیں، کوہارا کے لیے بھی ضروری تھا بلکہ اس کے لیے تو کچھ زیادہ ہی ضروری تھا۔ وہ میرے قابو میں رہ سکتا تھا اور میں جیپ کے لیے اس کی مدد بہ آسانی حاصل کر سکتا تھا۔

''اب جیپ کے پاس کیا کرنے جا رہے ہو؟ یہ تو میری ہوئی؟'' میں نے کہا۔

''جیپ تمہیں ہی مبارک ہو شہزی!'' وہ بولا۔ ''میں اس میں سے اپنا کچھ ضروری سامان اُتار لوں۔''

''ہرگز نہیں۔'' میں نے صاف انکار کر دیا اور اس کے قریب جا کر اسے جیپ میں سوار ہونے سے روک دیا۔ 'معاہدے کے مطابق جیپ اب میری ہوئی اور اس میں موجود ساری اشیا بھی۔ تم نے نقشہ جیت لیا اب اپنی راہ لو۔''

اچانک کوہارا نے مجھے اپنے کندھے کی زوردار ٹھوکر رسید کر ڈالی۔ میں اس کے لیے تیار نہ تھا۔ بدبخت کے گینڈے جیسی جسامت کی ٹھوکر نے میرے قدم اکھاڑ دیے اور میں (ریتیلی) زمین سے چند انچ اُچھل کر ذرا پرے جا گرا۔ وہ لپک کر جیپ میں سوار ہوا اور نہایت پھرتی کے ساتھ اندر کسی خفیہ خانے سے کوئی شے برآمد کی۔

ادھر میں جب تک سنبھلا، وہ سیاہ رنگ کا ایک پستول مجھ پر تان چکا تھا۔

''شہزی! اب میری نظروں سے دفع ہو جاؤ...... ایسا نہ کہ میں مجبور ہو کے گولی چلا دوں۔''

میں جانتا تھا وہ ایک حد تک گولی چلانے سے کترا رہا تھا۔ گولی کے دھماکے سے بستی کے لوگ جاگ سکتے تھے لیکن میرے زیادہ آڑے آنے پر وہ یہ حرکت بھی کر ڈالتا۔ اس لیے میں نے اس مردود کی اسی رعایت کو ہی کافی جانتے ہوئے بے بسی سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور ناچار اپنے دونوں ہاتھ بلند کر دیے۔ جس کا مطلب تھا کہ میں نے اپنی ہار اور اس کی بات تسلیم کر لی۔

اس کے بعد میں تیز تیز قدموں سے صحرا میں نکلنے کے بجائے آبادی کی طرف چلا گیا۔

لیکن زیادہ دور نہیں گیا۔ کھجوروں کے ایک جھنڈ کی آڑ میں جا کھڑا ہوا اور کوہارا کی جانب دیکھنے لگا۔ وہ جیپ کا بونٹ اُٹھائے اس کی خرابی دیکھنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا اور گاہے بہ گاہے اس طرف بھی سر گھما کر دیکھ لیتا تھا جدھر میں اس کی تاک میں کھڑا تھا۔

وہ میری طرف سے بھی محتاط اور خبردار تھا۔ کیونکہ اتنا بے وقوف تو وہ بھی نہ تھا کہ اسے اندازہ نہ ہوتا، میں یا وہ جب تک یہاں موجود ہیں ایک دوسرے پر وار کرنے کی کوشش کریں گے۔

اس نے کوئی چھوٹی سی ٹارچ جلا رکھی تھی۔ اسی کی روشنی میں وہ خرابی تلاش کر رہا تھا۔ میں ابھی اس پر قابو پانے کی کسی تدبیر پر غور کر ہی رہا تھا کہ اچانک غیر متوقع طور پر میں نے اسے بونٹ گراتے اور جیپ میں جلدی سے سوار ہوتے دیکھا۔

حالانکہ مجھے اُمید نہ تھی کہ اتنی جلدی وہ خرابی دور کر لے گا۔ میں اگر اس کی طرف دوڑتا بھی تو وہ یقیناً مجھ پر گولی بھی چلا سکتا تھا، کیونکہ اس سے اب یہ توقع رکھنا بے وقوفی ہوتی کہ وہ گولی کے دھماکے کی پروا نہیں کرتا۔ بستی کے لوگ بھی جاگ جاتے اور مجھے دھر لیتے۔ (بشرطیکہ اس کا نشانہ خطا جاتا)

میں غصے اور بے بسی سے اپنے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ وہ ایک بار پھر اس مہم میں مجھ سے ''پہل'' پر تھا اور میں یہاں ہاتھ ملتا رہ گیا تھا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ یہاں کہیں اونٹ کا کسی گھر یا دروازے کے باہر بندھا ہونا اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ میرا ذہن اس نازک وقت میں تیزی سے کام کر رہا تھا۔

میں نے اپنے عقب میں خاموش پڑے گھروں کا رخ کیا اور ایک گلی میں داخل ہو گیا۔ کہیں کوئی قریب آوارہ کتا ہولے سے بھونکا تھا، میں نے راستہ بدل دیا۔

ایک مکان کے باہر مجھے کھجور کے درخت تلے دو اُونٹ نظر آئے، دونوں نے اپنی لمبی گردنیں گھما کر جسم پر لپیٹ رکھی تھیں۔ دوسرا اُونٹ چھوٹا تھا، وہ اس کا بچہ معلوم ہوتا تھا۔

یہ سوچ کر کہ کہیں بڑے اُونٹ کو لے چلا تو اس کا بچہ بغبغا کے شور نہ مچا دے، اسے چھوڑ کر میں آگے بڑھ گیا۔

اونٹ چوری کرنا آسان بھی معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ کسی کی نظر پڑنے کا بھی خدشہ الگ دامن گیر تھا۔ عجب مشکل

میں پھنسا گیا تھا مجھے یہ کم بخت کوہارا...... موذی اور عذاب جاں بنا ہوا تھا مسلسل یہ مردود میرے لیے ...... بلکہ یاسمین کے لیے بھی...... اس کی روانگی یاسمین کی جان کا خطرہ اور اس رذیل کی کامیابی تھی، جسے سبوتاژ کرنے کی میں کوشش میں لگا ہوا تھا۔

یوں میرے لیے تشویش کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ...... یاسمین کی پیش کردہ معلومات کے مطابق ہماری منزل اب زیادہ دور نہیں رہی تھی۔ نوبیان کے صحرا میں تو ہم داخل ہو چکے تھے اور لکسر کا علاقہ یہاں سے بمشکل پچیس تیس کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔ کوہارا کو تیز رفتار سواری میسر آ چکی تھی جبکہ میں ابھی پیدل تھا۔

اب میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ موقع ملتے ہی بلا تاخیر اس خبیث خونی درندے کوہارا کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس کی موجودہ حرکت نے میرے دل و دماغ میں اس کے لیے نفرت و انتقام کی چنگاریوں میں اضافہ ہی کیا تھا۔

بالآخر مجھے ایک مختصر سی کچی چہار دیواری کے اندر چند اُونٹ اونگھتے ہوئے نظر آئے۔ یہ کوئی باڑا سا تھا۔ دیواریں تین چار فٹ سے زیادہ بلند نہ تھیں۔ ریتیلے تنگ راستے پر چلتا میں باڑے کے دروازے تک پہنچا۔

وہاں سال خوردہ سا چوبی پھاٹک بنا ہوا تھا جس کا ایک پٹ کہن سالی کا شکار ہو کے چوکھٹ سے اکھڑ کر ریت میں دھنس چکا تھا دوسرا کھلا پڑا تھا۔

میں پھاٹک کے پاس آیا اور اندر جھانکا، قریب ایک مطلب کے اونٹ کو تاڑا...... ''مطلب'' اس لیے کہ ایک تو اس کی قامت درمیانی تھی، دوسرے اس پر مجھے زین وغیرہ پڑی ہوئی نظر آئی تھی، پھر وہ کھڑا ہوا بھی تھا، یعنی نیم غنودہ نہیں تھا۔ شاید اس کے مالک نے کسی باعث زین نہیں اُتاری تھی۔

میں ہلکی ہلکی آواز سے اسے پچکارنے لگا۔ وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ مجھے ڈر لگا کہیں یہ آواز نہ نکالے مگر شکر تھا ایسا نہیں ہوا۔

اونٹ نے اپنا بھدا منہ گھما کر اپنی اُلسائی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا ضرور تھا پھر دوسری طرف کر لیا تھا۔ میں دھیرے دھیرے اس کے قریب گیا۔ اس کی لگام پر ہاتھ رکھا اور اسے باڑے سے باہر لے آیا۔

میں اسے لے کر پیدل چند قدم وہاں تک چلا تھا جہاں کوہارا نے قدموں کے نشانات دیکھ کر اپنے سفر کی ابتدا کی تھی۔ اب میرے لیے صرف اس کی جیپ کے ٹائروں کو ہی نگاہ میں رکھنا کافی تھا۔

ایک آسانی تو میسر آ ہی گئی تھی، کیونکہ کوہارا یقیناً یاسمین وغیرہ کے قدموں کے نشانات پر ہی آگے بڑھا تھا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد میرا منزل کی جانب سفر ہو چکا تھا۔

☆☆☆

اُونٹ خوب سیر تھا۔ مست چال سے چلا جا رہا تھا۔ اس کے بڑے بڑے ''تھپے'' پاؤں ریت پر چلنے کے لیے ہی قدرت نے بنائے تھے۔ اسے کوئی دشواری نہیں ہو رہی تھی۔ میں اونٹ کو دوڑا نہیں سکتا تھا۔

کیونکہ منزل کا پتا نہیں تھا۔ دوسرے مجھے اونٹ بھگانے کا بھی کوئی تجربہ نہ تھا، بہ صورتِ دیگر اونٹ صحرا کا ہوائی جہاز بن جاتا اور مجھے ڈر تھا کہ میں اس پر کیا خود پر بھی قابو نہیں پا سکتا، کہیں بدنصیب پروفیسر جمشید کی طرح میں بھی اس کے پیروں تلے نہ روندا جاتا۔

مجھے ریت پر جیپ کے ٹائروں کے نشانات دیکھنے پڑ رہے تھے اس لیے بھی میں نے اونٹ کی رفتار آہستہ کر رکھی تھی۔

سفر جاری تھا۔ مجھے پہلی بار اس سارے معاملے پر کچھ غور کرنے کا موقع ملا تھا۔ مثلاً اس پُراسرار مگر قسائی فطرت مصری میزبان کی ہم سے (کوہارا سے) کیا دشمنی تھی؟ یاسمین کو کیوں چھوڑ دیا گیا تھا؟ وہ اگر مصری کے ساتھی کے ساتھ گئی تھی تو کیوں؟ اس کی کیا مجبوری تھی؟ نیز مصری کے اہرامی قید خانے میں باقی لاشیں کن غیر ملکیوں کی تھیں؟ کیا انہیں بھی اس خبیث نے زندہ حنوط کرنے کی سزا سے دوچار کیا تھا جیسی وہ کوہارا کو دینا چاہتا تھا۔

''سزا'' سے مجھے یاد آیا کہ وہ مصری میزبان سنکیوں کی طرح یہی بڑبڑا رہا تھا جب وہ کوہارا پر دوبارہ حنوط کاری کا عمل کر رہا تھا، اس نے اسے ''چور'' کہا تھا۔

اب یاسمین سے مل کر (اگر وہ مل جاتی) .... ہی اس اسرار سے پردہ اُٹھ سکتا تھا۔

میرا سفر سست روی کا شکار تھا۔ دور مشرقی ٹیلوں سے صبح کاذب کی سپیدی دھیرے دھیرے نمودار ہونا شروع ہو گئی تھی۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق اب تک مجھے سفر کرتے ایک یا ڈیڑھ گھنٹا تو بیت چکا تھا۔

میرے بائیں جانب کافی دور سے نظر آتی ٹمٹماتی

روشنیاں کسی بھرے پُرے شہر کا پتا دیتی تھیں۔ یاسمین کے مطابق لکسر دریائے نیل کے قدرے پرے تھا اور اس کے دوسرے کنارے پر قاہرہ کا شہر آباد تھا۔

جدید طرزِ رہائش کے سبب قاہرہ دریائے نیل کے کنارے تک آگیا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے دوسرے کنارے پر بھی شہری طرز کی آبادیاں، جدید عمارتیں اور مشہور عجائب خانے بن گئے تھے۔ تاہم لکسر اب بھی دور افتادہ ہی کہلاتا تھا۔ وہ وہاں سے کافی دور تھا۔

صحرائے نوبیان غزہ تک چلا گیا تھا اور یہ ایران کے دشتِ لوط کی طرح خاصا طویل اور بے آب و گیاہ ویران صحرا تھا۔

بے آب و گیاہ اس ریگزار میں کہیں کہیں چھوٹے بڑے ٹیلے نظر آنے لگے تھے مگر یہ سلسلہ مختصر تھا، کہیں سوکھے درخت بھی دکھائی دے رہے تھے۔ تاہم حدِ نگاہ جیسے ریت کی دلدل دکھائی دے رہی تھی۔

دلدل اس لیے کہ کہیں کہیں اونٹ کا پاؤں بہت اندر ریت میں دھنس جاتا تھا۔ اونٹ کے اچانک جھکنے سے مجھے بھی ایک زوردار جھٹکا لگتا اور کئی بار تو میں گرتے گرتے بچا تھا۔

میں جلد سے جلد منزل کے قریب آنے کی دعا مانگتا رہا، تاکہ چلچلاتی دھوپ سے مجھے نجات ملے، کیونکہ اونٹ پر کوئی ہودہ یا کجاوہ نہیں بنا ہوا تھا۔ سورج طلوع ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی۔

صبح دم کی سپید روشنی چہار سُو دھیرے دھیرے پھیلنے لگی تھی۔ جیپ کے ٹائروں کے نشان چونکہ تازہ تھے۔ اسی لیے کچھ آسانی ہوگئی تھی، لہٰذا میں نے جلد سے جلد منزل تک پہنچنے کے لیے اونٹ کی لگام کو مخصوص انداز میں جھٹکا دیتے ہوئے اسے ذرا ''ٹشکارا'' تاکہ وہ ذرا دوڑ پڑے۔

اونٹ کی تو جیسے دلی مراد بر آئی، اس نے دوڑ لگادی، میں گھبرایا لیکن پھر اس کا کوہان پکڑے مضبوطی سے جما رہا۔

یہاں سے ٹائروں کے نشان قوس کی صورت میں دائیں جانب گھوم رہے تھے۔ دفعتاً میں چونکا۔ ایک جانب یہ نشانات دو ٹیلوں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ میں نے نجانے کیا سوچ کر اس طرف سے جانے کے بجائے لمبا چکر کاٹنا چاہا کہ ٹیلوں کے دوسری جانب نشان جاتے نظر آجائیں گے، اونٹ کو میں نے دوسری راہ پر لگادیا۔

یہی راستہ میری بدقسمتی ثابت ہوا۔ ایک مقام پر مناسب رفتار سے دوڑتے اونٹ نے زبردست جھٹکا کھایا۔ اس طرف شاید کچھ زیادہ گہرا گڑھا تھا کہ ریت میں اس کا اگلا دایاں پاؤں گھٹنے تک جا دھنسا۔ وہ گرتے گرتے بچا اور ساتھ ہی زور سے بغبغایا۔ وہ تو خود کو بچا گیا مگر میں اس زوردار اور اچانک جھٹکے سے خود کو نہیں بچا سکا اور نیچے آرہا۔

میرے حلق سے بلاارادہ چیخ سی خارج ہوگئی، ریت پر میں منہ کے بل گرا تھا۔ سنبھلا تو اونٹ یہ جا وہ جا۔ میں ریت پر پڑا ذرا دیر کو یونہی ہانپتا رہا۔ اس کے بعد اُٹھا تو میری عجیب حالت ہورہی تھی۔

منہ میں ریت کے ذرات چلے گئے تھے بلکہ نتھنوں میں بھی کچھ ریت گھس گئی تھی۔ ناک میں سرسراہٹیں ہونے لگیں تو میں نے دوچار چھینکیں ماریں۔ سر جھاڑا اور اپنا جبّہ بھی۔ اس کے بعد پیدل ہی آگے بڑھا۔

جلد ہی عقدہ کھلا کہ میں شاید منزل کے قریب پہنچ چکا ہوں۔ کیونکہ ان دنوں مذکورہ ٹیلوں کو پار کرتے ہی مجھے سامنے کسی ''مختصر'' پڑاؤ کے آثار دکھائی دیے۔ مگر وہاں اُوپر گدھ منڈلا رہے تھے۔ مجھے حیرت ہوئی، جیپ کے نشانات اسی طرف جارہے تھے، کیا یہاں کوہارا کے ساتھی فروکش تھے؟ یہی ایک خیال ذہن میں ابھرا لیکن پھر فوراً ہی اپنے اس خدشے کو باطل قرار دے دیا۔ کیونکہ یاسمین بہرحال کوہارا کے ساتھ نہیں تھی، نہ ہی راستے میں کہیں نشانات سے یہ پتا چلتا تھا کہ راستے میں کہیں کوہارا کی کسی سے مڈھ بھیڑ بھی ہوئی تھی، اس کے پاس جیپ تھی اور وہ بہرحال مجھ سے پہلے منزل تک پہنچنے پر قادر تھا۔

پھر یہ پڑاؤ......؟ ایک سوالیہ نشان تھا۔ اسے زائل کرنے کے لیے میں محتاط روی سے بہ غور سامنے نگاہ جمائے بڑھتا رہا۔ کچھ گدھ خیموں کے قریب بھی نظر آئے۔ گدھوں کی موجودی یہاں انسانوں کی غیر موجودگی کا پتا دیتی تھی۔

وہ تین عدد سرخ اور نیلے رنگ کے کینوسی خیمے تھے۔ دو بڑے اور ایک چھوٹا۔ (یاد رہے خیموں کی چادریں کبھی بھی سیاہ رنگ کی نہیں رکھی جاتیں، کیونکہ میدانی اور بارانی علاقوں میں خیمہ زن ہونا پڑتا ہے اور بارش اور بجلی کڑکنے کی صورت میں سیاہ رنگ پر آسمانی بجلی جلدی گرتی ہے)

وہاں دھواں اُٹھ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ابھی ابھی وہاں کچھ لوگ موجود تھے اور پھر اچانک کہیں روانہ ہوگئے۔ اگرچہ ابھی تک میں نے خیموں کا اندر سے جائزہ نہیں لیا تھا۔

اچانک ایک گدھ چلّایا اور نیچی اُڑان لیتے ہوئے

میرے سر سے گزرا۔ میں نے اس کی ٹھونگ سے بچنے کے لیے جھکائی دی۔

پڑاؤ میں سناٹا طاری تھا۔ ہر سُو دل دھڑکا دینے والا گہرا سکوت تھا۔ یہاں میں نے سب سے پہلے ریتیلی زمین کا جائزہ لیا۔ پتا چلتا تھا کہ جیپ یہاں رکی تھی۔ اس کے علاوہ ایک دو اور گاڑیوں کی یہاں موجودی کے آثار ملے، ان کے ٹائروں کی ساخت اور تھی...... ایک طرف میں نے چوڑے مخصوص ٹائروں والی ''فوروہیل'' بائیک دیکھی۔

میں سوچنے لگا، یہ لوگ کہاں گئے؟ کیا کوہارا سے ان کی شناسائی تھی؟ یا پھر یہاں بھی مصری میزبان کی طرز کا کوئی اور پُراسرار معاملہ تھا؟

میں نے ایک خیمے کا رخ کیا۔ ابھی میں اس کے قریب ہی پہنچا تھا کہ اچانک ٹھٹک کر رکا۔ دو گدھ اندر ایک دوسرے سے اُلجھتے خیمے سے نمودار ہوئے۔ یہ خاصے جسیم گدھ تھے۔ ان کی سرخ سرخ گردنیں لمبی اور بالوں سے عاری تھیں۔ کھوپڑی بھی گنجی تھی۔ ایک گدھ کی چونچ میں کچھ دبا ہوا تھا۔ غور سے دیکھنے پر میں سرتاپا لرز گیا۔

اس گدھ کی مڑی ہوئی چونچ میں ایک عدد انسانی آنکھ کا ڈیلا دبا ہوا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اسے نگل گیا۔ میرے لیے وہ دہشت ناک منظر تھا۔ وہ دونوں گدھ اپنے غلیظ پر پھڑپھڑاتے ہوئے اُڑ گئے۔

میں آگے بڑھا اور خیمے کے اندر گھسا تو کیا دیکھتا ہوں، ایک جوان رعنا عورت نہایت قابلِ رحم حالت میں پڑی تھی۔ اس کی دونوں آنکھوں کے ڈیلے غائب تھے اور وہاں سے خون آلودہ ریشے بند پپوٹوں سے جھانک رہے تھے، پیٹ پھٹا ہوا تھا۔ اس کی جلد کی رنگت صاف اور شفاف رہی ہوگی، مگر اس وقت مردار خور گدھوں نے اسے گرسنہ چونچیں مار مار کر اس کا پیٹ اُدھیڑ ڈالا تھا۔ اس کے سنہرے رنگ گھنے بال زمین پر پھیلے ہوئے تھے، تاہم اس کی پیشانی پر سرخ روشن دان بھی بنا نظر آیا، صاف پتا لگتا تھا کہ اسے پیشانی میں گولی مار کے ہلاک کیا گیا تھا۔ عورت غیر ملکی لگتی تھی۔

اندر سے انتہائی ناگوار بُو اُٹھ رہی تھی۔ میرا جی اُلٹ گیا اور میں اُلٹے پیروں باہر نکل آیا۔ مجھے قے آگئی۔

میں نے اپنے حواس بحال کیے اور اسی طرح دوسرے نسبتاً چھوٹے خیمے کی جانب بڑھا تو وہاں ایک بڑھے کی لاش ملی۔ اسے بھی گولی ماری گئی تھی۔ اس نگنی اور ظالمانہ بربریت پر میں ہول کر رہ گیا۔ کوہارا کے سوا یہ چنگیزیت اور کون کرسکتا تھا۔ میں نے نفرت اور غیظ آلود انداز میں ہونٹ سکیڑ کر سوچا۔

پھر جب میں تیسرے خیمے کا جائزہ لینے پہنچا تو چونک کر وہیں رک گیا۔ اندر سے کوئی زخمی حالت میں کہنیوں اور گھٹنوں کے بل پر باہر آنے کی کوشش کررہا تھا۔ ساتھ ہی دو عدد مردار خور گدھ پھدک پھدک کر اسے ٹھونگے مارنے کی کوشش کررہے تھے۔

اس کی حالت بھی غیر ہورہی تھی۔ میں لپک کر اس کے قریب پہنچا۔

''پپ...... پانی......'' وہ بمشکل کراہ کے بولا۔ یہ بھی غیر ملکی تھا اور اس کا لہجہ مجھے امریکی لگا تھا۔ یہ درمیانی عمر کا آدمی تھا۔ میں اِدھر اُدھر دوڑا مگر کچھ نہ ملا۔

''پانی تو نہیں ہے، یہاں تو لگتا ہے کچھ بھی نہیں چھوڑا گیا ہے۔ تم کون ہو؟'' میں نے اس سے پوچھا۔ ''یہ...... یہ ظلم کس نے کیا تم لوگوں پر......؟''

اس کی سانسیں اُکھڑ رہی تھیں۔ پانی نہ ملنے کا سن کر اس پر حد درجہ مایوسی طاری ہوگئی۔ وہ کچھ بول نہیں پا رہا تھا۔ شاید اس کا منہ حلق تک سوکھ گیا تھا اور پھر اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔

میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ میں تیزی سے پلٹا۔ فوروہیل بائیک کے قریب آیا۔ شکر تھا کہ مجھے سواری میسر آگئی تھی لیکن جب میں نے بائیک پر سوار ہو کر اسے اسٹارٹ کیا تو مایوسی ہوئی۔ فیول ٹینک چیک کیا تو وہ خالی تھا۔ میں نے جھلا کر اس کے سینگ نما اسٹیئرنگ پر ہاتھ مارا۔

پھر اچانک ایک خیال ذہن میں اُبھرا۔ اس طرح کی گاڑیاں رکھنے اور یہاں دور دراز کے علاقوں کا رخ کرنے والے افراد اپنے ہمراہ اضافی فیول رکھتے ہوں گے۔

میں نے ایک بار پھر ان کے پڑاؤ اور خیموں کا اچھی طرح سے جائزہ لینے کی ٹھانی۔

گدھوں نے لاشوں سے ضیافت اُڑانا شروع کردی تھی۔ میں انہیں کب تک بھگاتا۔ بھوک اور مردار شکار نے انہیں دلیر بنادیا تھا۔ اب تو ان کی تعداد بھی زیادہ ہونے لگی تھی۔ مجھے اپنا ڈر ہوا کہیں یہ مجھ پر ہی نہ ہلّا بول دیں۔

میں نے اس بار اچھی طرح سے ایک ایک خیمے میں گھس کر جائزہ لیا۔ لیکن کچھ بھی نہ ملا۔ جب مایوس ہو کر پڑاؤ کو خیرآباد کہنے لگا تو اچانک میری نظر بجھے ہوئے الاؤ کے

قریب ایک تین چار لیٹر کے ڈبے پر پڑی۔

میں فوراً اس کی طرف لپکا۔ اسے اُٹھا کر ڈھکنا کھولا اور سونگھا تو دل میں مسرت کی لہر اُٹھی۔ یہ فیول تھا۔ اسے شاید آگ وغیرہ جلانے کے لیے رکھا گیا تھا۔ لیکن یہ دیکھ کر مجھے تھوڑی سی مایوسی ہوئی کہ اس میں بھی بمشکل دو لیٹر ہی فیول تھا۔

بہرطور یہی غنیمت جان کر میں اسے اُٹھائے بائیک کی طرف آیا اور اس کے ٹینک میں باقی ماندہ فیول اُنڈیل دیا۔

بائیک اس مرتبہ دو تین بار کی کوشش میں اسٹارٹ ہو گئی۔ میں وہاں سے روانہ ہوگیا۔

ریت پر کوہارا کی جیپ کے ٹائروں کے علاوہ بھی دوسری گاڑی کے ٹائروں کے نشانات تھے۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا چکر تھا؟ اگر ان غیر ملکیوں کے پڑاؤ پر کوہارا نے شب خون مارا تھا تو کیوں؟

اگر ان کا ٹکراؤ اتفاقی تھا تو کوہارا کو اپنی منزل کی جانب سفر جاری رکھنا چاہیے تھا۔ آخری سوال میرے ذہن میں یاسمین اور اس آدمی کے بارے میں اُبھرا تھا جو اس کے ہمراہ تھا۔ وہ کہاں تھے؟

یہ نشانات میری رہنمائی کررہے تھے اور میں درست سمت میں گامزن تھا۔

فور وہیل بائیک کے موٹے چوڑے ٹائر ریت میں بغیر کسی دشواری کے رواں تھے۔ مزید نصف پون گھنٹے کے بعد میں ایسے علاقے میں داخل ہوا جو مجھے ”منزل“ پر پہنچنے کا پتا دیتے تھے۔

یہاں کی ویرانی کچھ ایسی تھی کہ لگتا تھا جیسے عرصے سے یہاں کوئی انسانی آبادی تو کجا کسی نے قدم بھی نہیں رکھا ہوگا۔ چند پرانے اہرام بھی نظر آرہے تھے مگر ان کی ہیئت میں کسی روایتی قسم کی پُراسراریت مفقود تھی، لگتا ایسا ہی تھا مہم جو، طالع آزما اور ان چوروں کے ٹولے..... جو ایسے دور افتادہ اہراموں میں گھس کر فرعونی دولت اور نوادرات ہتھیانے آتے تھے، ان اہراموں کے برسوں پرانے رازوں کو بے نقاب کرچکے تھے۔

دن نکل آیا تھا۔ سورج ابھی سوا نیزے تک نہیں پہنچا تھا مگر ابھی سے ہی اس کی تمازت چہرہ اور بدن جھلسائے دیتی تھی۔

پروفیسر جمشید اور یاسمین کے ہمراہ رہتے ہوئے مجھے بھی یہاں تک کی منزل کا اندازہ ہوچکا تھا لیکن یہ کوئی زیادہ اہم بات بھی نہیں تھی، اصل منزل ابھی تک نظروں سے اوجھل تھی۔

اچانک بائیک نے جھٹکے لینا شروع کردیے۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ فیول ختم ہونے لگا تھا۔ بالآخر بائیک کا انجن تھوڑا مزید کھانسنے کے بعد بند ہوگیا۔ بائیک رک گئی۔ میں اُتر آیا اور گردوپیش کا جائزہ لینے لگا۔

عجب ویرانی کا راج تھا چاروں طرف...... کسی علاقے یا گم گشتہ بستی کے آثار ان چھوٹے بڑے اُدھڑے پچھڑے اہراموں، ٹیلوں اور سوکھے درختوں سے لگایا جاسکتا تھا۔ کہیں کہیں مجھے کسی قدیم عمارتوں کے کھنڈرات بھی نظر آرہے تھے۔

ایک مقام پر میں نے دیکھا، جیپ کے ٹائروں کے نشانات ٹھہر گئے تھے۔ جبکہ دوسری گاڑی کے نشان جو نسبتاً بڑی تھی، لگ بھگ پندرہ بیس گز آگے جاکر ایک ٹیلے کی اُوٹ میں غائب ہورہے تھے۔

یہاں یہ لوگ تھوڑی دیر کے لیے رکے تھے۔ کوہارا کی جیپ میں شاید پھر کوئی خرابی پیدا ہوگئی تھی، اس کے بعد یہ لوگ دوسری مذکورہ گاڑی میں آگے بڑھے تھے تو پھر کوہارا کی جیپ کیوں نہیں نظر آرہی تھی؟ اسے تو یہاں موجود ہونا چاہیے تھا؟ یہ ایک سوال مجھے اُلجھن میں ڈال رہا تھا۔

میں نے ایک بار پھر جھک کر غور سے ریت پر ان نشانوں کو دیکھا تو عقدہ یہ کھلا کہ ٹائروں کے نشانات خاصے گڈمڈ ہوکر اسی ٹیلے کی آڑ میں غائب ہورہے تھے۔ کیا جیپ کو دھکا لگایا گیا تھا یا پھر ”ٹوچین“ کیا گیا تھا؟

میں نے قدم آگے بڑھادیے۔ پھر جیسے ہی ٹیلے کی آڑ میں گیا تو ٹھٹک کر رک گیا۔ سامنے ریتیلی ڈھلان پر جیپ ایک جانب کو جھکی ہوئی کھڑی نظر آگئی۔ وہ خالی تھی۔ میں لپک کر آگے بڑھا۔ ایک بار پھر مجھے زبردست جھٹکا لگا۔

دوسری گاڑی کھنڈرات کے قریب کھڑی تھی۔ یہ بھی جیپ ٹائپ بڑی گاڑی تھی، جس کا بیک ڈور بھی تھا۔ یہ ایک سائڈ سے جھکی ہوئی کھڑی تھی۔ پتا چلا اس کا ایک ٹائر فلیٹ ہو چکا تھا۔ وہاں کوئی ذی نفس نہیں نظر آتا تھا۔ میں نے کھنڈرات کی طرف دیکھا۔ اس کی ”شیپ“ ایسی نہیں تھی کہ اس پر کسی اہرام کا گمان ہوتا۔

میں چند ثانیے سوچتا رہ گیا۔ کھنڈرات میرے سامنے

تھے۔ یہاں زمین ریتیلی ہونے کے ساتھ کہیں کہیں سے سخت اور کھردری تھی۔ مجھے ایک سے زائد قدموں کے نشانات نظر آئے۔ بادِسموم چلنا شروع ہوگئی تھی۔ نشان تازہ تھے اسی لیے صاف دکھائی دیتے تھے، ورنہ تو ہواؤں اور ریت پھیلنے سے یہ زیادہ دیر قائم نہیں رہتے اسی لیے میں نے ان کی تلاش کی کوشش تیز کردی۔

کھنڈرات کے اندر آیا تو اس کے سال خوردہ اور منہدم در و دیوار سے عجیب سی کہن سالی ٹپکتی نظر آئی۔ یہ ویران تھا۔ قدموں کے نشانات اندر بھی گڈمڈ دکھائی دیے۔ اس کے بعد عقبی گوشے سے ایک ٹوٹی ہوئی دیوار سے دوسری طرف نکل گئے تھے۔ میں بھی یہاں سے دوسری طرف نکل آیا۔

تب ہی میں نے ایک بڑا ہیبت ناک منظر دیکھا۔ میرے سامنے تین اہرام تنے کھڑے تھے۔ قدیم مصری معماروں کی دست صناعی پیش کرتے نوبیان کے سینے پر شان سے تنے کھڑے نظر آئے۔ وہیں میں نے ایک خیمہ لگا دیکھا۔ چند لوگوں کی جھلک بھی دکھائی دی تھی۔

قربِ منزل کے جوش تلے میرا دل ہی نہیں جسم کا رُواں رُواں بھی مرتعش ہوگیا۔ میں وہیں ایک ٹیلے کی ڈھلان پر زمینی آڑ لے کر دبک گیا۔

یہ تینوں اہرام ایک دوسرے سے تقریباً پچیس اور تیس گز کے فاصلے پر تھے، ان کی بھی حالت ویسی ہی تھی جیسی کہ میں پہلے دیکھتا آرہا تھا، دو تو چھوٹے تھے اور بُری طرح اُدھڑے ہوئے نظر آرہے تھے۔ فرعونی دولت کے ہوس کار چور گروہوں نے ان کی خوبصورتی اور عظمت گہنا کر رکھ دی تھی۔

حالانکہ تاریخ میں یہ شواہد موجود تھے کہ ان اہراموں کو تعمیر کرنے کے بعد فرعونوں نے ان کے نکاسی کے راستے بند کردیے تھے یا اس قدر خفیہ رکھے تھے کہ جو صرف ان کو ہی معلوم تھے۔ یعنی ایک بار جو اندر داخل ہوتا تو وہ اس کی اسرار بھری بھول بھلیوں میں کھو جایا کرتا تھا۔ لیکن آج کے چوروں نے ان کی یہ ”کاری گری“ پاش پاش کرڈالی تھی۔

تیسرا اہرام نسبتاً زیادہ اُدھڑا ہوا اور امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں مسمار شدہ بھی نظر آتا تھا۔

ایک ہی بات کا میرے ذہن نے اندازہ لگایا تھا کہ ثمانہ کا گمشدہ مقبرہ ”ڈارک گریڈ پیرامڈ“ انہی تینوں اہراموں کے کسی خفیہ تہ خانوں میں ہوسکتا تھا۔

شاید اسی لیے ان لوگوں نے یہاں ڈیرا ڈال لیا تھا اور تلاش کا کام شروع کردیا تھا۔

میرے حوصلے بلند تھے۔ یہاں پہنچتے ہی میرے دل و دماغ میں قلوپطرہ کے ان تینوں عجیب اور انوکھے مگر خطرناک ہتھیاروں کا تصور تازہ ہونے لگا جو ثمانہ کے گمشدہ مقبرے میں اس کی ممی کے ساتھ مدفن تھے۔

بقول پروفیسر جمشید مرحوم کے ان ہتھیاروں کا ملنا ثابت کرتا ہے کہ دورِ فراعنہ اور ان عظیم الشان اہراموں کی تعمیر میں خلائی معماروں کا بھی کسی نہ کسی حوالے سے تعلق رہا تھا۔ سے جی کوہارا ان تینوں ہتھیاروں کو قبضہ کرنے کے لیے سرتوڑ کوشش میں تھا تاکہ اپنے ”گریٹ ماسٹر“ لولووش کی خدمت میں پیش کرکے اسے ناقابلِ شکست بنادے۔

لولووش جیسے خبیث اور شیطان صفت انسان کی طاقت کو دوچند کرنے کا بیڑا کوہارا نے اُٹھایا تھا تو میں نے بھی اب قسم کھا رکھی تھی اسے اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ حالانکہ جب روڈلف نے (اور بعد میں یاسمین نے) مجھے ثمانہ سے متعلق جو صراحت بتائی تھی، اس وقت میں نے اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دی تھی، لیکن پھر رفتہ رفتہ اور کچھ حالات کے تھپیڑوں نے مجھے یہاں تک پہنچایا تو میں اسی کو قدرت کی ایک حکمت اور مشیتِ ایزدی...... سمجھ کر اس مہم میں کود پڑا تھا۔

پس...... منزل سامنے تھی مگر نتیجہ ابھی آنکھوں سے اوجھل تھا۔

لب بام ان ساری باتوں کا تازہ ہونا ایک فطری عمل تھا جو چند ثانیوں کے دوران ہوا اور میرے اندر ایک نئے جوش و جستجو کو جنم دینے لگا۔

میں نے ٹیلے کی ڈھلانی آڑ پر لیٹے لیٹے چند گہری سانسیں لے کر اپنی طاقت کو مجتمع کیا، اس کے بعد دائیں جانب کو سرکا۔

اس طرف سوکھے درختوں کا جھنڈ تھا اور کچھ سوکھی جھاڑیوں کا مختصر سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔

میں کسی صحرائی چھپکلے کے مانند ریت پر رینگتا ہوا ان کے خیمے کے قریب کھڑی گاڑی کی آڑ کے نزدیک پہنچ کر اپنی سانسیں بحال کرنے لگا۔ ریت گرم ہونے لگی تھی اور مجھے یہاں تک کا فاصلہ سینے اور کہنیوں کے بل پر بہت جانفشانی سے طے کرنا پڑا تھا۔

میری نظروں کے سامنے اب اس خیمے اور اطراف کا

منظر واضح تھا۔ وہاں دو افراد بیٹھے دکھائی دیے تھے۔ ان میں ایک جبہ پوش تھا جو مصری ہی لگتا تھا۔ وہ خاصا گرانڈیل اور تنومند جسامت کا تھا جبکہ دوسرا ایک دبلا پتلا غیر ملکی تھا۔ اس نے نیکر اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ کوئی ہتھیار ان کے آس پاس رکھا نظر نہیں آتا تھا۔ میں اُٹھا اور سیدھا ان کے پاس جا پہنچا۔

وہ دونوں ایک اجنبی کو اس طرح اچانک اپنے سامنے پا کر چونک گئے تھے۔ میں نے مصری کے چہرے کا جائزہ لیا تو چونکے بنا نہ رہ سکا۔ اس کے چہرے پر مجھے شناسائی کی جھلک محسوس ہوئی تھی اور تب ہی میری آنکھوں میں چمک اُبھری۔

حالانکہ وہ میرا شناسا نہیں تھا لیکن باوجود اس کے مجھے اس کا چہرہ شناسا اسی لیے محسوس ہوا تھا کہ اس کی شبیہ اس مصری میزبان سے کافی ملتی جلتی تھی۔ پل کے پل مجھے یہ سمجھنے میں چنداں دیر نہ لگی تھی کہ یہی وہ شخص تھا جس کے ساتھ یاسمین گزشتہ رات پُراسرار حالات میں روانہ کر دی گئی تھی۔

وہ مصری مجھے دیکھتے ہی کچھ ایسے ہی انداز میں چونکا تھا اور گہری سوچ میں پڑ گیا تھا۔ دوسرا غیر ملکی میری طرف دیکھ کر حیرانی سے بولا۔

''اے مسٹر! تم کون ہو؟'' اس کا لہجہ امریکی تھا۔ یہ مجھے انہی کا ہی ساتھی محسوس ہوا تھا جن کے پڑاؤ کو میں عبرت ناک حالت میں دیکھ کر آ رہا تھا۔ الجھنیں گڈمڈ ہونے لگی تھیں۔

میں نے جواب میں رکھائی سے کہا۔ ''میں اپنی ایک ساتھی خاتون کی تلاش میں ہوں۔ راستے میں مجھے ایک پڑاؤ ملا تھا۔ کیا تمہارا تعلق انہی لوگوں سے تھا؟''

پڑاؤ کے حوالے پر وہ بُری طرح چونکا اور اس نے قریب کھڑے اس مصری کی طرف کن انکھیوں سے دیکھا جس کی حیرت سے پھیلی ہوئی آنکھیں ہنوز میرے چہرے کا جائزہ لینے میں محو تھیں۔

''تمہاری ساتھی کا نام یاسمین تو نہیں؟'' بالآخر اس نے کہا۔

''بالکل یہی نام ہے اس کا، کہاں ہے وہ اور یہ سب کیا چکر ہے؟'' میں اس کی طرف دیکھ سنجیدگی سے بولا تو اس بار اس مصری نے دبلے پتلے امریکی کی طرف کچھ ناگوار سی نظروں سے گھور کر جیسے اسے سرزنش کی۔

''تم چپ رہو مسٹر ریلے! مجھے بات کرنے دو۔'' وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولا پھر میری جانب متوجہ ہو کر بولا۔

''پہلے تم میری بات کا جواب دو۔ مسٹر! میرے بھائی خمس کو تم نے کیوں قتل کیا؟''

اس کی بات پر میں بُری طرح چونکا۔ تو یہ اس مصری کا بھائی تھا اور اس کا نام ہی شاید خمس تھا۔ اس کے سوال میں ہی مجھے کئی جواب از خود مل گئے۔ کوہارا بدبخت نے حقیقت کو چھپاتے ہوئے جھوٹ سچ سے کام لیتے ہوئے اسے میرے خلاف ورغلایا تھا، مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ آخر کوہارا نے پھر اسے کس طرح رام کر لیا تھا؟

کیونکہ یہ بھی تو اسی کے بھائی کی قید میں تھا۔ یا پھر اس وقت تک معاملہ کچھ اور رہا تھا دونوں کے درمیان؟ لہٰذا میں نے بھی چالاکی سے کام لیا بولا۔

''کون خمس؟ کون تمہارا بھائی؟ میں کیا جانوں کہ تم کون ہو......؟ میں تمہیں جانتا تک نہیں اور تم ایک قتل کا الزام میرے سر تھوپنے کی کوشش کر رہے ہو؟''

''زیادہ چالاک مت بنو۔'' وہ غرایا۔ ''مجھے تمہارے اس موٹے ساتھی کوہارا نے سب بتا دیا ہے۔''

میں تھوڑی دیر خاموش رہا اور اس کی ڈھٹائی پر دل ہی دل میں تلملانے لگا پھر طنزیہ کاٹ سے بولا۔

''تم اتنے انجان تو نہیں ہو جتنا بننے کی کوشش کر رہے ہو جبکہ تم مجھے پہچان بھی چکے ہو کہ میں کون ہوں اور اس شخص کو بھی جس کا ابھی تم نے نام کوہارا بتایا۔ تمہارے بھائی خمس (مصری میزبان) نے کوہارا کو زندہ ممی میں تبدیل کر دیا تھا، تم نے اس سے پوچھا نہیں کہ وہ کس طرح تمہارے بھائی خمس کی قید سے نکلا؟''

میری بات پر وہ جبہ پوش مصری تھوڑا لاجواب سا ہوا مگر پھر اسی اکھڑپن اور ڈھٹائی سے بولا۔ ''میرے بھائی خمس کو ان لوگوں سے نفرت ہے جو یہاں مصر کی سرزمین پر چوری کی نیت سے داخل ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہم ''طظموس'' کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان اہراموں کو چوروں کی دست بُرد سے بچانا ہمارا فرض چلا آ رہا ہے۔''

''سنو میری بات غور سے......'' میں نے اس بار کھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا اور پھر مختصر الفاظ میں اسے اصل حقیقت سے بھی آگاہ کر دیا۔

''یہ تھا اصل سچ...... اب تمہیں اگر پھر بھی میری

باتوں پر یقین نہیں آ رہا ہے تو پھر اپنا راستہ ناپو کیونکہ میں تمہاری اور تمہارے بھائی خمس کی اصلیت بھی جان چکا ہوں۔'' میں نے اصل حقائق کا آئینہ اس کے سامنے رکھ دیا تھا تاکہ اسے اپنی صورت بھی دکھائی دے جائے۔

''اور...... تم!'' میں نے آخر میں اس نیکر پہنے امریکی سے مخاطب ہو کر کہا۔

''میری بات اور اس کی اصل حقیقت سمجھ سکتے ہو۔ مسٹر ریلے! وہ یہ کہ...... کوہارا نامی جس آدمی کے ساتھ تم یا تمہارے ساتھی ہیں وہ ایک خونی اور بے رحم انسان ہے۔ تم کیوں اس کا ساتھ دینے پر مجبور ہوئے ہو اور وہ کہاں ہے اس وقت؟''

''یہ تمہارے کسی سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں ہے مسٹر شہزاد!'' وہ مصری پھر اکھڑپن سے بولا۔ مجھے اس کی دوبارہ مداخلت پر طیش آ گیا تاہم میں چونکا بھی کہ اسے میرا نام بھی معلوم ہو چکا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں اس کے ساتھ سختی سے پیش آتا ریلے نے اسی مصری کو اس بار سخت برہمی سے کہا۔

''تم اب خاموش رہو اور مجھے بات کرنے دو۔'' پھر جب وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا تو اس کا لہجہ دوستانہ تھا۔

''مسٹر شہزاد! تمہاری باتیں بالکل درست ہیں۔'' پھر اس نے ایک لمحہ رک کر اس مصری کی طرف تلخ نظروں سے دیکھا اور مزید کہا۔

''یہ تمہیں اصل حقیقت کیا بتائے گا، میں تمہیں بتاتا ہوں کہ......'' اس کی بات درمیان میں رہ گئی، یہی وہ وقت تھا جب خمس کا گرانڈیل بھائی حرکت میں آیا اور اس نے دبلے پتلے ریلے کو گردن سے دبوچ لیا۔ دوسری حرکت میں نے کی تھی اور اس گرانڈیل مصری پر چیتے کی طرح جھپٹا تھا۔ اس نے مجھ پر لات چلانے کی کوشش چاہی تھی کہ میں نے اپنی دائیں ٹانگ کا گھٹنا اس کے پیٹ پر رسید کر دیا۔ یہ ضرب خاصی شدید تھی۔ مصری کے حلق سے زخمی اونٹ جیسی بلبلاتی آواز خارج ہوئی اور اس نے ریلے کی گردن چھوڑ دی۔

وہ اپنا دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑے جھکا مگر دوسرے ہی لمحے اس نے اسی طرح جھکے ہوئے میرے پیٹ پر اپنے سر کی ٹکر رسید کر دی۔ میں چند قدم پیچھے لڑکھڑا گیا اور گر پڑا۔ مصری خونخوار انداز میں غراتا ہوا دوبارہ مجھ پر جھپٹا اور چاہتا تھا کہ میرے سینے پر سوار ہو جائے کہ میں

زمین پر لیٹے لیٹے تڑپا اور اپنی جگہ چھوڑ دی، وہ اس خالی جگہ پر سینے کے بل گرا اور اس کے حلق سے چیخ خارج ہو گئی۔ میں نے تڑپ کر اس پر جھپٹا مارا اور پشت پر سوار ہو گیا۔ میں چاہتا تو ایک جھٹکے سے اس کی گردن کا منکا توڑ سکتا تھا مگر میں بلاوجہ خون خرابے کا قائل نہ تھا۔ میں نے البتہ اس کی گدی پر کراٹے کی طرز کا بھرپور وار کر کے اسے ساکت کر دیا۔

دبلا پتلا امریکی آنکھیں پھاڑے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں ہانپتے ہوئے سیدھا کھڑا ہو گیا اور ریلے سے بولا۔

''ہاں! مجھے بتاؤ یہ سب کیا چکر ہے؟ لگتا ہے تم کچھ حقیقت جانتے ہو؟''

''میں بہت کچھ جانتا ہوں اور تم ہی وہ انسان ہو جو یقیناً ہماری مدد کر سکتے ہو۔'' وہ ایک دبے دبے جوشِ مسرت تلے بولا۔

''وہ خونی درندہ جس کا نام کوہارا لیا جا رہا ہے۔ اس نے میرے ساتھیوں سے ساز باز کر رکھی ہے۔ وہ سب اس اہرام کے اندر داخل ہو چکے ہیں۔'' اس نے اپنے عقب میں سینہ تانے کھڑے اہرام کی جانب اشارہ کیا۔

''کیا یہی ڈارک ٹریڈ پیرامڈ ہے، جس کے کسی خفیہ تہ خانے میں ثمانہ کا صدیوں پرانا گمشدہ مقبرہ موجود ہے؟'' میں نے پوچھا تو ریلے کا چہرہ ایک بار پھر حیرت کی تفسیر پیش کرنے لگا۔ اسی لہجے میں بولا۔

''مائی گاڈ! تم تو سب جانتے ہو! وہ لڑکی یاسمین یقیناً تمہاری ساتھی ہوگی۔ تم نے صحیح اندازہ لگایا ہے...... یہی وہ پیرامڈ ہے جس کی تلاش میں ہم یہاں تک پہنچے ہیں۔''

''تم لوگ کون ہو اور کوہارا کے ساتھ اندر کون کون گیا ہے؟''

جواب میں وہ اپنے سوکھے پڑتے ہونٹوں پر بار بار زبان پھیرنے لگا۔ وہ مجھے ایک دم پُرجوش سا نظر آنے لگا تھا۔ بولا۔

''میں تمہیں سب بتا دوں گا، آؤ یہاں بیٹھو۔ لیکن پہلے اس موذی کا بندوبست کرنا ہوگا۔'' اس نے گرانڈیل مصری کی جانب اشارہ کیا جو زمین پر بے سدھ پڑا تھا۔

''اگر اسے ہوش آ گیا تو یہ مصیبت پیدا کر دے گا۔ میرے پاس رسی ہے۔'' وہ بولا۔ ''آؤ میرے ساتھ......'' کہتے ہوئے وہ خیمے کے اندر مڑا، کیونکہ ہم سرے پر ہی

کھڑے تھے۔ میں بھی اس کے پیچھے اندر آ گیا۔

سوائے چند ضروری اشیا کے اور کوئی قابلِ ذکر شے دکھائی نہیں دی تھی، لہٰذا دوسری پارٹی سے متعلق مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مجرمانہ طرز کی نہیں ہو سکتی تھی۔

اس نے ایک طرف کونے میں رکھے عمومی ساز و سامان میں سے ایک مضبوط سی ڈوری نکالی اور پھر ہم دونوں نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔

میں جلد از جلد اس اہرام کے اندر داخل ہونا چاہتا تھا۔ اندر کوہارا ابھی موجود تھا اور یاسمین بھی۔ یوں اس کی جان کو سخت خطرہ تھا۔ کوہارا اس کے لیے کسی وقت بھی ملک الموت بن سکتا تھا۔ لیکن حقائق جانے بغیر میرا ہر قدم اندھی کھائی پر بھی پڑ سکتا تھا۔

''مسٹر ریلے! اندر میری ساتھی کی زندگی سخت خطرے میں ہے۔ لہٰذا مجھے جلد سے جلد حقائق سے آگاہ کر دیں کہ اندر کتنے لوگ موجود ہیں اور میں انہیں کہاں اور کیسے تلاش کر سکتا ہوں۔''

''تم اندر یوں بھی نہیں جا سکتے مسٹر شہزاد!'' ریلے ..... دھوپ سے بچ کر خیمے کے ایک کونے میں بچھے کپڑے کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر جا بیٹھا اور مجھے بھی اپنے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ مجھے پیاس لگی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے ایک چھاگل سی تھمائی تھی۔ اس میں بھی پانی بس چند گھونٹ ہی تھا، میں نے بس اپنا منہ اور حلق ہی تر کیا تھا اور اسے واپس لوٹا دی۔

''اندر خطرناک بھول بھلیاں ہیں۔ بے شمار گڑھے ہیں اور تیزابی نوعیت کا رساؤ ہے۔ کسی کی رہنمائی کے بغیر تمہارا اندر جانا اپنی موت کو آواز دینے کے مترادف ہو گا۔''

''لیکن پھر یہ مسئلہ کیسے حل ہو گا؟ اندر اگر میری ساتھی کے علاوہ تمہارا بھی کوئی ساتھی موجود ہے تو کوہارا اسے بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اپنا مطلب پورا ہوتے ہی وہ ذلیل کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔'' میرے لہجے میں پریشانی اور تشویش تھی۔

''اندر میرے دو ساتھی ہیں۔ ایک پروفیسر ڈین گروبن اور دوسرے ڈاکٹر ہیر اللہ، وہ ایک اینا ٹومسٹ (Anatomist) اور فزیالوجسٹ ہیں جبکہ پروفیسر ڈین گروبن ماہرِ فلکیات اور آرکیالوجسٹ ہیں۔'' وہ بتانے لگا اور میں پورے دھیان سے اس کی باتیں سنتا رہا۔

''میں ڈاکٹر ہیر اللہ کا اسسٹنٹ ہوں۔ ہمارے تین ساتھی اور تھے جن میں ایک عورت بھی تھی، لیزا، وہ پروفیسر ڈین گروبن کی اسسٹنٹ تھی، ہم ایک امریکی تحقیقاتی ادارے ڈسکور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک عرصے سے جرمن اور دیگر مغربی ٹی وی چینل سے ثمانہ کی ممی سے متعلق خبریں اور تحقیقی رپورٹس نشر کی جا رہی تھیں۔ جس نے ایک بار پھر طالع آزماؤں کو مصر کا رخ کرنے پر مجبور کیا۔ لہٰذا ثمانہ کے مقبرے کی تلاش میں ہم اپنی ٹیم کے ساتھ پچھلے ایک ہفتے سے قاہرہ کے ایک ہوٹل میں مقیم تھے، ہمارا طیارہ چارٹرڈ تھا اور ادارے نے ہی ہمیں یہ سہولت مہیا کی تھی۔ وہ قاہرہ کے ائرپورٹ ٹنل پر موجود ہے۔ یہ دورہ مکمل طور مصری حکومت سے اجازت نامہ حاصل کر کے کیا گیا۔ نوبیان کے صحرا تک قاہرہ سے کرائے کی گاڑیاں حاصل کی گئیں اور نوبیان تک کا سفر انہی گاڑیوں کے ذریعے کیا گیا۔''

وہ ایک ثانیے کے لیے ٹھہرا، میں ہونٹ بھینچے اس کی بات غور سے سنتا رہا۔ ابھی تک اُس کے منہ سے میرے مطلب یا دلچسپی کی کوئی بات برآمد نہیں ہوئی تھی۔

''پھر اس کے بعد......'' وہ آگے بتانے لگا۔

''گزشتہ شب جب ہم سونے کی تیاری میں مصروف تھے۔ دو اجنبی افراد نے ہمارے پڑاؤ کا رخ کیا۔ اس میں ایک تو مقامی باشندہ تھا دوسری ایک خوبصورت خاتون تھیں۔ اسی کا نام یاسمین تھا اور اس کے ساتھی مصری کا ہاموس...... وہ یہی بدبخت ہے۔'' اس نے قریب بے ہوش اور رسن بستہ حالت میں پڑے خمس کے بھائی کی طرف اشارہ کیا۔

''ہاموس شاید تمہاری ساتھی یاسمین کو اس کی مرضی کے بغیر لکسر کی جانب ہی لے جا رہا تھا۔ یا پھر ان دونوں کے درمیان پہلے سے ہی کوئی معاہدہ طے پایا ہوا تھا، باتوں کے دوران جب ہمیں یہ معلوم ہوا کہ وہ ایران کے ایک مشہور اسکالر پروفیسر جمشید حمیدی کی بیٹی ہے تو ڈاکٹر ہیر اللہ اور پروفیسر ڈین گروبن بہت متاثر ہوئے کیونکہ وہ دونوں بھی پروفیسر جمشید سے واقف تھے۔

''محترمہ یاسمین نے ہمیں حقیقت بتائی کہ اس کا ایک پاکستانی ساتھی شہزاد احمد خان...... ابوسر کی کسی بستی میں سخت زخمی حالت میں موجود ہے اور وہ اس کی حفاظت اور شفایابی کے لیے خمس کی بات ماننے پر مجبور ہوئی ہے۔ خمس کی حقیقت سے یاسمین نے ہمیں آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہ خود کو طظموس کی قدیم نسل سے بتاتا ہے۔ اسے

ان لوگوں سے سخت نفرت ہے جو تحقیق اور مہم جوئی کی آڑ میں یہاں (مصر) آ کر اہراموں کی کھدائی کرتے اور اسے نقصان پہنچاتے ہیں، وہ انہیں چور سمجھتا ہے جو ان اہراموں سے قیمتی نوادرات اور دولت چرا کر لے جاتے ہیں۔ اس نے ایسے لوگوں کو سزا دینے کے لیے ہی اپنا ایک اہرام نما مقبرہ بنا رکھا ہے اور جو اس کے نرغے میں پھنستا ہے، وہ انہیں سزا کے طور پر زندہ مومیا دیا کرتا ہے۔ لیکن جب میں نے اسے یہ بتایا کہ ہمیں کسی دولت کا کوئی لالچ نہیں ہے بلکہ ہم واقعی ثمانہ نام کی ایک ممی کے گمشدہ مقبرے کا کھوج لگانا چاہتے ہیں جسے لکسر کے لوگوں نے بنتِ نیل کا خطاب دے رکھا تھا۔

''تب اس کی بات پر خمس چونکا، کیونکہ وہ خود بھی ثمانہ کی ممی کو بازیاب کرنا چاہتا تھا کیونکہ ثمانہ کی روایتی کہانی وہاں کے عام باشندوں کے لیے محض فسانہ طرازی سہی لیکن طظموس کی نسل سے تعلق رکھنے والے لوگ اسے حقیقت ہی سمجھتے تھے۔ وہ اسے دیوی کا درجہ دیتے تھے۔ یہ روایت طظموس نسل میں سینہ بہ سینہ چلی آ رہی تھی۔ وہ اس کے نام کا باقاعدہ چرچا کرتے ہوئے اسے چاند کی دیوی...... ''ہاموس'' کا نام دینا چاہتا تھا۔ اسی نام سے وہ لکسر میں ایک مندر بھی تعمیر کرانے کا ارادہ رکھے ہوئے تھا۔ مگر اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ اس کی دریافت کے بعد اس کی ممی کو کہیں نہیں لے جانے دیں گے، یاسمین نے اسے تسلی دی کہ اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے وہ تو بس اپنے مرحوم باپ کی یہ خواہش پوری کرنا چاہتی ہے کہ ثمانہ کی ممی کی دریافت و بازیافت کا سہرا ان کے سر رہے۔ خمس اس سے مطمئن بھی ہوا اور خوش بھی کہ یاسمین ان کی ''دیوی'' کا کھوج لگانے آئی تھی، البتہ یاسمین نے کوہارا کے متعلق اسے بتا دیا تھا کہ وہ ان کا سب سے بڑا دشمن ہے اور ایک خطرناک عالمی مجرم کا دستِ راست ہے اسی کے ایما پر ثمانہ کی ممی مدفن نوادراتی خزانوں کو چرانے کی نیت سے آیا ہے۔

''لہٰذا خمس نے کوہارا کو کوئی دوا پلا کر بے ہوش کر دیا اور اس کے ساتھی یعنی یاسمین کے ساتھی تمہارا اس نے علاج کیا۔ خمس نے البتہ اپنے چھوٹے بھائی ہاموس کو یاسمین کے ساتھ لکسر کی جانب ایک اونٹ پر روانہ کر دیا۔

''اب خدا جانے یاسمین کا اصل مقصد کیا تھا، مگر بہرحال یہ مہم ڈین گروبن ڈاکٹر ہیر اللہ کو مشترکہ محسوس ہوئی، کیونکہ ہم خود بھی گزشتہ پندرہ روز سے یہاں ڈارک گریڈ پیرامڈ کی تلاش میں خاک چھانتے پھر رہے تھے۔ بہرحال اب ایک مسئلہ پیدا ضرور ہوا کہ...... وہ دونوں ثمانہ کی لاش پر تحقیق کرنا چاہتے تھے کہ آیا کیا واقعی ان مفروضات میں کوئی حقیقت بھی تھی یا نہیں کہ ثمانہ کا باپ درحقیقت ایک خلائی انسان تھا؟

''اس تحقیقاتی پارٹی کا سربراہ ایک امریکی ماہرِ فلکیات پروفیسر ڈین گروبن تھا، جس کی شکاگو میں ایک بڑی رصدگاہ تھی۔ اس کے مطابق وائٹ گلیکسی مریخ کے قریب ترین تھی اور سیارہ ''زوٹون'' بھی اجرامِ فلکی کی رو سے اسی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ جس طرح مریخ میں زندگی کے آثار دیکھے گئے تھے اسی طرح زوٹون میں بھی ہو سکتے تھے۔ وہ ثمانہ کی ممی پر تحقیق کرنا چاہتا تھے۔ اسے معلوم تھا کہ مبینہ طور پر ثمانہ کا باپ ایک خلائی انسان تھا۔ اس نے اپنے ساتھ ایک فرنچ پروفیسر ڈاکٹر ہیر اللہ کو بھی ملایا ہوا تھا جو میڈیکل بیالوجسٹ تھا۔ اناٹومی اور فیزیولوجی میں پی ایچ ڈی بھی تھا۔ وہ ثمانہ کی ممی (لاش) پر یہ تحقیق کر کے اس امر کا یقین کرنا چاہتے تھے کہ آیا اگر واقعی ثمانہ کا باپ ایک خلائی انسان ''وائٹ گلیکسی'' سے تعلق رکھنے والے سیارہ زوٹون'' سے تعلق رکھتا تھا تو یقیناً ثمانہ کی ممی کے فوسلز سے حاصل ہونے والے ڈی این اے سے اس کی نشانیاں ملیں گی۔ اس طرح سیارہ زوٹون کی بھی تلاش ممکن ہو سکے گی۔

''مگر اب یہاں مسئلہ ہاموس کا پیدا ہوتا تھا کہ اسے کس طرح رام کیا جائے؟ ابھی یہ سب سوچ بچار جاری تھی کہ کوہارا بھی وہاں آن ٹپکا۔ تب تک ہاموس کو یاسمین سمیت ان سب پر شبہ ہو چکا تھا کہ یہاں کھچڑی اور پکنے لگی ہے۔ اس نے یاسمین کو سختی کے ساتھ انہیں چھوڑ کر روانہ ہونے کا کہا، مگر یاسمین اسے بہلائے ہوئے تھی اور تسلیاں دے رہی تھی کہ اس مہم میں جتنے ماہرین ساتھ ہوں اُتنا ہی بہتر ہو گا۔ اسی دوران کوہارا وہاں آن ٹپکا...... اس کی جیپ کا فیول ختم تھا اور اسے مدد کی ضرورت تھی۔ لیکن جیسے ہی وہ وہاں مدد کے لیے پہنچا تو ہاموس اسے پہچان گیا اور یاسمین بھی اسے دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئی۔

''کوہارا بہت مکار تھا۔ اس نے یہی بتایا کہ ثمانہ کے گمشدہ مقبرے کی دریافت کا سہرا اس کے سر ہونا چاہیے، جبکہ یہ دونوں یاسمین اور ہاموس اس کے مددگار تھے جو اسے دھوکا دے کر منزل کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ البتہ کوہارا کو یہاں دیکھ کر یاسمین کو تمہارے بارے میں

تشویش اور فکر ہوئی۔ کوہارا نے اسے تسلی دینی چاہی مگر وہ اس پر بھروسا کرنے پر تیار نہ تھی۔ ہاموس اور یاسمین سمیت ہم سب نے کوہارا کو دھتکار دیا اور اس کی مدد کرنے سے بھی انکار کر دیا۔

''کوہارا بظاہر تو لوٹ گیا مگر پھر اس نے بے خبری میں اچانک ہم پر وار کر دیا۔ ہمارے ساتھی مارے گئے، اس کے بعد وہ یاسمین کو اپنے ساتھ لے جانے پر مجبور کرنے لگا تو اس نے کہا کہ وہ ڈاکٹر ہیراللہ اور پروفیسر ڈین کو بھی ساتھ رکھے گی۔ اس مہم میں اس تجربہ کار پارٹی کا ساتھ ہونا لازمی ہے۔ انہیں صرف ثمانہ کی ممی سے مطلب ہے جبکہ کوہارا کا ثمانہ کے مقبرے سے دلچسپی کا تعلق محض وہاں مدفن خزانے سے تھا۔''

ریلے ایک بار پھر سانس لینے کو رکا۔ میں جانتا تھا کہ کوہارا کا مقصد کیا تھا۔ اسے خزانے وغیرہ سے تو کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی، جبکہ اس کا مقصد ان ہتھیاروں سے تھا جن کے حصول کے لیے اس مردود نے اب تک کشت و خون کا بازار گرم کر رکھا تھا۔

ریلے آگے بتانے لگا۔ ''ہاموس اور کوہارا کی آپس میں نہیں بن رہی تھی۔ ان کے بیچ وجہ تنازعہ کیا تھا، یہ کسی کو نہیں معلوم تھا اور ہم سے چھپایا بھی جا رہا تھا۔ (یہ وجہ صرف ہمیں معلوم تھی)

''کوہارا نے ہاموس کو بھی ہلاک کرنے کی کوشش چاہی تھی، مگر وہ بچ گیا۔ تاہم پھر ایک ہی مفاد ہونے کے سبب اور کچھ یاسمین کے سمجھانے بجھانے سے بظاہر معاملہ رفع دفع ہو گیا، کیونکہ اب سب کی منزل ایک ہی تھی اور آپس کی لڑائی کی صورت میں ان سب کی محنت اور مہم ناکامی سے دوچار ہو سکتی تھی پھر کسی کے ہاتھ کچھ نہ آتا۔

''ہاموس اس وقت شاید مصلحتاً خاموش تو ہو گیا تھا مگر اس کے دل میں کچھ اور ہی کھچڑی پک رہی تھی۔ بہرحال اب یہ سب لوگ یہاں پہنچ چکے تھے اور ڈارک گریڈ پیرامڈ کے اندر قسمت آزمائی میں مصروف تھے۔ مجھے اور ہاموس کو یہاں موجود رہنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ لیکن ہاموس بضد تھا کہ وہ بھی ان کے ہمراہ اندر جائے گا۔ ابھی ہم دونوں میں یہی بحث ہو رہی تھی کہ تم آ گئے۔''

ریلے اپنی بات بتا کر خاموش ہو گیا۔ تب میں نے بھی اسے جلدی جلدی ہاموس، اس کے بھائی خمس اور کوہارا سے متعلق اسے بتا دیا، وہ بے حد حیران ہوا اور تشویش زدہ بھی...... پھر ایک طرف کونے میں بے سدھ رسن بستہ پڑے ہاموس کی طرف دیکھ کر مجھ سے تشویش سے بولا۔

''یہ تو بہت اچھا ہوا مسٹر شہزاد کہ تم آ گئے۔ ورنہ ہاموس سے مجھے یہاں جان کا خطرہ تھا۔''

''مگر اس سے زیادہ بڑا خطرہ کوہارا کی صورت میں اندر ابھی موجود ہے۔ ہمیں اندر جانا ہو گا۔'' میں نے جوشیلے لہجے میں کہا اور ریلے نے فوراً اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔ پھر وہ خیمے سے کچھ مختصر سا ضروری سامان وغیرہ سمیٹنے لگا اور میں جب تک اس پُرہیبت اہرام کا قریب سے جائزہ لینے لگا۔

مٹیالے رنگ کے اس اہرام کو دیکھ کر لگتا تھا کہ ہمارے علاوہ بھی کئی مہم جو پارٹیاں یہاں آ چکی تھیں۔ کیونکہ اہرام کی مخروطی در و دیواریں امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ چوروں اور دیگر لوگوں کی دست بُرد کے باعث چھوٹے بڑے رخنوں اور آدم گزار سوراخوں سے اٹی پڑی تھیں۔

ذرا دیر بعد ریلے ایک چھوٹا سا تھیلا سنبھالے میرے قریب آ کر بولا۔ ''مسٹر شہزی! میں تیار ہوں، اندر کافی تاریکی ہو سکتی ہے، ایک ٹارچ آپ بھی پکڑ لیں۔'' کہتے ہوئے اس نے ایک درمیانے سائز کی ٹارچ مجھے تھما دی۔ اس کے بعد ہم ایک بڑے سے سوراخ سے اس عظیم اہرام کے اندر داخل ہو چکے تھے۔

☆☆☆

میں نے جیسے ہی اس عظیم اہرام کے اندر قدم رکھا تو اچانک میرے دل و دماغ کی عجیب کیفیت ہونے لگی۔ مجھے یوں لگا جیسے وقت نے مجھے ہزاروں سال پیچھے دھکیل دیا ہو۔ قلوپطرہ اور دورِ فراعنہ کا جاہ و حشم، سامری جادوگروں کی اسراریت، فرعون بادشاہوں اور ان کی ملکاؤں کے شاہانہ و پُرہیبت دربار......

ابھی ہم اہرام کے ابتدائی گوشے میں کھڑے تھے۔ یہاں سے باہر کی روشنی مختلف روزنوں اور سوراخوں سے اندر داخل ہو رہی تھی ـــ اسی لیے اندرونی منظر میری آنکھوں کے سامنے روشن تھا۔

مجھے بوسیدہ دیواروں پر عجیب و غریب اشکال اور رسم الخط میں کچھ تحریریں بھی نظر آئیں۔ ایک دیوار پر قطار در قطار چھوٹی سائز کی تصویریں بنائی گئی تھیں۔ ریلے نے بتایا کہ یہ بھی ایک قدیم اور تصویری مصری زبان ہے۔

اس کے بعد ہم ان راستوں پر آگے بڑھنے لگے جن کے مطابق بقول ریلے کے ہمارے ساتھیوں نے اندر جانے سے پہلے اپنی کچھ نشانیاں چھوڑ رکھی تھیں تاکہ واپسی میں انہیں کوئی دشواری نہ ہو اور ہم انہی نشانیوں کی مدد سے ان کے تعاقب میں آگے بڑھنے لگے۔ یوں بھی عموماً مہم جو پارٹیاں ایسا ہی کرتی تھیں، تاکہ اہراموں کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر نہ رہ جائیں۔ لہٰذا اس مقصد کے لیے انہوں نے عام سا سفید پاؤڈر اور چونے کا استعمال کر رکھا تھا۔

ہم انہی کی نشانی پر آگے بڑھنے لگے۔ ہمارے اطراف میں اُدھڑے ہوئے سنگی مجسمے اور کہیں مکڑی کے جالے تنے ہوئے تھے۔ زمین کھردری اور پتھریلی تھی۔ دائیں بائیں منہدم دیواریں اور کہیں بڑے سوراخ تھے۔ ہمیں ان میں سے بھی گزرنا پڑتا تھا۔ یوں ہم جیسے جیسے بعید زین گوشے میں جا رہے تھے تاریکی بڑھتی جا رہی تھی حتیٰ کہ ایک مقام پر مسٹر ریلے نے ٹارچ روشن کر دی اور میں نے بھی کیا۔

جلد ہی ہمیں احساس ہوا کہ ہم اب نیچے کی طرف جانے لگے ہیں، یہ تصور کرتے ہی ہمارا سفر اس پُرہیبت اہرام کے تہ خانے کی طرف جاری تھا، مجھے وجود میں ہلکی سی کپکپی کا احساس ہوا تھا۔

اچانک ایک دیوار پر میری ٹارچ کا ہالہ پڑا۔ دو پُرہیبت مجسمے مجھے گھورتے دکھائی دیے۔ یوں جیسے ہمیں اپنی صدیوں پرانی عمل داری میں داخل ہوتا پا کر برہم ہوں۔

محکمہ آثارِ قدیمہ والوں نے اس کے قریب انگریزی میں ان دونوں مجسموں سے متعلق تحریر لکھ چھوڑی تھی۔ میں رک کر اسے پڑھنے لگا۔

''یہ پتھریلے تابوت ہیں، سیاحوں کی دلچسپی کے لیے ان میں سے ممیاں نکال کر سجائی گئی ہیں۔ راعموساسی اور اس کی محبوبہ کپکاش۔'' یہ پڑھ کر ہم آگے بڑھ گئے۔

ہم اب نیچے کی طرف سفر کر رہے تھے اور ہمارے اطراف میں گھور تاریکی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ ٹارچوں کی روشنی غنیمت تھی ورنہ تو اس غضب کی کالی بھٹ تاریکی کے باعث ہم کسی گڑھے میں بھی جا گرتے۔ یہاں آس پاس گڑھے بھی تھے جن کی دیواروں سے نکیلے پتھر نکلے ہوئے تھے۔

ہمیں کچھ گھٹن اور آکسیجن کی کمی کا احساس ہونے لگا۔ سفید چونے کے نشان ہماری رہنمائی کر رہے تھے۔

''اور کتنا آگے جانا ہو گا، مجھے تو خوف محسوس ہو رہا ہے۔'' ریلے نے ایک جگہ پتھریلی دیوار سے ٹک کر مرتعش سے لہجے میں کہا۔ ''پپ...... پتا نہیں کیوں سردی سی لگ رہی ہے اب......''

وہ خوف زدہ سا ہو رہا تھا، حقیقت یہ تھی کہ خود میرے دل میں بھی ہول سے اُٹھ رہے تھے۔ کسی اہرام کے اندر اور پھر اس کے تہ خانوں میں اُترنے کا یہ میرا ابھی پہلا تجربہ تھا۔ اس کی یہ بات بھی درست تھی کہ یہاں ایک عجیب سی ٹھنڈ کا احساس ہونے لگا تھا۔ یہاں آواز بھی گونج رہی تھی اور ایک عجیب سا ''ایکو ساؤنڈ'' پیدا کرتی محسوس ہوتی تھی۔

مجھے پتا نہیں تھا کہ یہ دبلا پتلا مسٹر ریلے اتنا بزدل ثابت ہو گا۔ تاہم میں ابھی اس سے حوصلے کے چند الفاظ کہنے ہی والا تھا کہ دفعتاً ایک تیز چیخ اُبھری۔ ریلے لرز گیا اور میرے ساتھ چپک گیا۔ خود میں بھی دہل سا گیا تھا۔

''یی یہ...... چیخ...... کس کی تھی؟'' ریلے کانپتی آواز میں بولا۔ وہ بالکل ہی بودا ثابت ہو رہا تھا، بھلا میں کیا جانتا۔ میں نے چیخ کی سمت روشنی پھینکنے کی کوشش چاہی تھی کہ اسی وقت پھڑ پھڑاہٹ کی آواز اُبھری.... ایک غیر معمولی جسامت کی بڑی سی چمگادڑ میرے سر کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ میں نے یک دم جھکائی دی۔ وہ کہیں تاریکی کے بطن میں غائب ہو گئی۔

''یی یہ...... چیخ یقیناً کسی بدروح کی ہو گی، اور یہ چمگادڑ کے روپ میں......''

''خاموش......'' میں نے اسے چپ کرا دیا۔ ''حوصلہ کرو ریلے! تم تو ایک ڈاکٹر کے اسسٹنٹ ہو، جو خود بھی یہاں کہیں موجود ہے۔ دلیر بنو، چلو آگے بڑھو، بدروح کا کوئی تصور نہیں۔''

میں نے اسے سمجھایا۔ اسے حوصلہ ہوا لیکن میں ابھی تک اس چیخ پر اُلجھا ہوا تھا۔ چیخ کے آہنگ سے میں ابھی تک یہ اندازہ نہیں لگا پایا تھا کہ وہ مرد کی تھی یا عورت کی۔

ہم پھر آگے بڑھنے لگے۔ جلد ہی ہمارے قدم ایسی کھردری اور ناہموار زمین سے لگے جس سے اندازہ ہوا کہ یہ کسی ہال کا فرش ہو۔ میں یہاں ٹھہر گیا اور اطراف میں روشنی پھینکی۔

یہ کچھ کھلی جگہ تھی، مگر یہاں بھی وہی متروکہ نقش و نگار کندہ نظر آئے۔ کچھ فحش قسم کی تصاویریں بھی کندہ تھیں۔

جس میں فرعونی بادشاہوں کو اپنے حرم کی عورتوں اور کنیزوں سے بوس وکنار اور اسی طرح کی اٹھکیلیاں کرتے دکھایا گیا تھا۔ شاہانہ لباس میں ایک ملکہ بھی دکھائی گئی جو دو کالے غلاموں کے ساتھ ''مشغول'' تھی۔ کچھ عجیب الخلقت جانوروں کی بھی تصاویر نظر آئیں۔

ہم سفید چونے اور پاؤڈر کی نشانی پر آگے بڑھے، لیکن ابھی ایک قدم ہی اُٹھایا تھا کہ اچانک مجھے یوں لگا جیسے کسی نے لمبا سانس کھینچا ہو...... میں ٹھٹک کر رکا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

''کک...... کیا پھر کچھ ہوا؟'' ریلے خوف سے منمنایا۔

میری توجہ آواز کی طرف تھی۔ میں ابھی اس کی سمت جانچنے کی کوشش میں تھا کہ اچانک...... دوسری لمبی سانس اُبھری اور ساتھ ہی کوئی کراہا۔ میں نے ایک دم دائیں جانب گردن گھمائی اور ٹارچ کی روشنی بھی اس طرف پھینکی۔ منظر روشن ہوگیا، جس نے مجھے بُری طرح چونکا دیا۔

وہاں ایک اٹی پڑی گرد آلودہ ٹوٹی دیوار سے پشت کے بل لگا کوئی زمین پر لڑھکا ہوا تھا۔ میں تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔

ریلے میرے پیچھے تھا۔ وہ ایک فل شرٹ، ٹائی اور پتلون میں ملبوس کوئی پکی عمر کا غیر ملکی شخص تھا۔

''ڈاکٹر ہیرالڈ مکینزی......'' میرے عقب سے ریلے کی پکار اُبھری۔ میں اس کے قریب پہنچ کر اسے سنبھالنے لگا، وہ زخمی تھا۔ اس کی پیشانی سے خون رِس رہا تھا۔ کچھ خراشیں چہرے پر بھی نظر آتی تھیں۔ کپڑے مسک چکے تھے اور کہیں کہیں سے پھٹے ہوئے نظر آتے تھے۔

''پپ...... پانی......'' اس کے خشک پڑتے ہونٹوں نے بمشکل یہ لفظ اُگلا تھا۔ میں نے ریلے کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر ہیرالڈ اس کا باس تھا اسی لیے ریلے ہی اسے دیکھنے اور سنبھالنے لگا۔ اس نے اپنے تھیلے سے پانی کی بوتل برآمد کی اور ڈاکٹر ہیرالڈ کے منہ سے لگا دی۔ چند گھونٹ پانی پینے کے بعد ہیرالڈ کچھ بولنے اور دیکھنے کے قابل ہوا تو اس نے نیم وا آنکھوں سے ہماری طرف دیکھا۔

''ڈاک! آر یو او کے......؟'' ریلے نے پوچھا۔ ڈاکٹر نے اثبات میں دھیرے سے اپنے سر کو جنبش دی پھر میری طرف دیکھا۔ اس کے بعد اپنے اسسٹنٹ سے ہلکی آواز میں کچھ کہا، اسسٹنٹ نے ہی اسے کچھ بتایا۔ وہ مطمئن نظر آنے لگا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ متوحش سا ہوگیا اور بائیں جانب اشارہ کرنے لگا۔ وہاں گھور تاریکی کا راج تھا۔

''اس طرف...... وہ اس طرف کو گئے ہیں۔'' ڈاکٹر ہیرالڈ کراہتے ہوئے کہا۔

''تم اِدھر ہی ان کے پاس ٹھہرو، میں آگے جا کر دیکھتا ہوں۔'' میں نے ریلے کی طرف دیکھ کر کہا اور ٹارچ کی روشنی پھینکتا ہوا اس طرف بڑھا۔ تو اچانک میرا پاؤں رپٹا، میں نے سنبھلنے کی کوشش چاہی تھی کہ میرا توازن مزید بگڑتا چلا گیا۔

وجہ اس کی یہ تھی کہ میرے پیروں تلے زمین کھسکتی چلی گئی تھی، وہ شاید کوئی ڈھلانی تنگ راستہ تھا، ٹارچ میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گری اور میں بھی گرا تو میرا سر کسی سخت چھت نما منڈیر سے ٹکرایا تھا، میرے حلق سے بے اختیار چیخ نکل گئی، میں گر پڑا تھا اور اب ایک تنگ سے راستے پر سیدھا گھستا چلا گیا، مجھے یہ کوئی سرنگ نما ڈھلانی راستہ لگا تھا۔

ٹارچ میرے آگے آگے لڑھکتی جارہی تھی، اور تقریباً کوئی پندرہ بیس فٹ لڑھکنے کے بعد میں کسی سخت چھجے نما پتھریلے پتھر سے ٹکراتا ہوا نیچے خلا میں جا گرا۔ شکر تھا کہ اس کی بلندی زیادہ نہیں تھی۔

یوں میں نے کچھ بیدار مغزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو سر کے بل گرانے سے محفوظ رکھا اور پہلو کے بل سخت مگر مٹی سے اٹی ہوئی پتھریلی زمین پر گرا تھا۔ کچھ چوٹ تو آئی مگر یہ قابلِ برداشت تھی۔

لیکن جیسے ہی میں سنبھلا تو دنگ رہ گیا...... تین افراد بڑے ڈرامائی سے انداز میں مجھے وہاں کھڑے دکھائی دیے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بڑی بڑی ٹارچیں تھیں۔ میں انہیں دیکھ کر چونکا۔

ان میں دو میرے شناسا چہرے تھے تیسرا اجنبی تھا۔ وہ دراز قامت اور پکی عمر کا کوئی غیر ملکی تھا اور میرے محتاط اندازے کے مطابق یہی امریکی پروفیسر ماہرِ فلکیات اور آرکیالوجسٹ ڈین گروبن تھا۔ وہ میری طرف حیرت سے آنکھیں اور منہ...... پھاڑے یوں دیکھ رہا تھا جیسے میں آسمان سے ٹپکی ہوئی کوئی خلائی مخلوق ہوں، اسے ابھی حقیقت کا کوئی ادراک نہ تھا۔ لہٰذا اس کی یہ کیفیات بجا تھی۔

باقی دو چہرے کوہارا اور یاسمین تھے۔ ان کے وسط

میں کسی شکستہ چبوترے کے آثار نمایاں ہوتے تھے۔ وہاں ایک بڑا سا ہنڈا روشن تھا۔ اس کے دائیں بائیں مجھے تنگ اور اندھیری گزرگاہیں بھی دکھائی دی تھیں۔ جو نجانے اندر اور مزید کتنے تہ خانوں اور اہرام کی بھول بھلیوں میں جا کر ختم ہوتی تھیں۔

اِدھر...... یاسمین مجھے دیکھتے ہی میری جانب ''شہزی'' کہتے ہوئے لپکی تھی جبکہ کوہارا کا چہرہ مجھے یہاں دیکھ کر بُری طرح بھنا کر رہ گیا تھا۔

''تم مجھ پر ایک آسیبی ممی بن کر سوار ہوگئے ہو شہزی! آج میں تم دونوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' اس نے غرا کر کہا۔ اس کے لہجے سے ازحد جھلاّہٹ اور غیظ مترشح ہوتا تھا۔ ایک وقت تھا اس نے ہمیں دق کر رکھا تھا اور اب میں اس کے پیچھے پنجے جھاڑ کے پڑا ہوا تھا۔

ہم دونوں کے درمیان ابتدا سے ہی یہی ہوتا چلا آیا تھا۔ کبھی میں سیر ہوتا تو کبھی وہ سوا سیر، کبھی وہ مجھے زیر کر ڈالتا تو کبھی میں......

اب اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس نے گولی چلا دی۔ تہ خانے میں گولی چلنے کی آواز کسی دھماکے سے کم نہ تھی۔ مگر اس کے تلملائے ہوئے پُرطیش تیوروں کو بھانپتے ہی میں نے یاسمین کو خود سے پرے دھکا دے دیا تھا اور خود بھی دوسری جانب جا پڑا تھا۔ کوہارا کا نشانہ خطا گیا، مگر اس نے میری جانب دوبارہ پستول کی نال کا رخ کیا تو اسی وقت چھت سے کنکر اور پتھروں کی بارش ہوگئی۔

بدبخت کوہارا نے جھلا کر پھر بھی ایک اندھا فائر کر ہی ڈالا، میں چونکہ اب بھی اس کے نشانے پر ہی تھا اسی لیے میں نے ایک اور جست...... بھری اور جگہ چھوڑ دی۔

تہ خانے کی چھت سے مٹی اور گرد و غبار کا طوفان اُمڈ پڑا تھا۔ گھٹن بڑھنے لگی تھی۔

''بائی گاڈ! مسٹر کوہارا......! فار گاڈ سیک...... فائرنگ بند کرو ورنہ یہاں ہم سب ملبے کے ڈھیر تلے زندہ دفن ہو جائیں گے۔ تم معاہدے کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔''

پروفیسر ڈین کی چلاّتی ہوئی آواز اُبھری۔ نجانے کوہارا کا ان کے ساتھ کیا معاہدہ تھا؟ اور پروفیسر ڈین کی سادگی ہی تھی کہ اس نے کوہارا جیسے بدخصلت اور عہد شکن کے ساتھ نجانے کیا معاہدہ طے کر رکھا تھا۔ بھلا کوہارا جیسے فریبی اور شاطر آدمی کو اس کی کب پروا ہوتی۔

کوہارا نے یوں بھی فائرنگ بند کر دی تھی۔ ہمیں کھانسی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میری اور کوہارا کی جنگ آخری مرحلے پر تھی اور وہ باز آنے والا شخص نہ تھا اسی لیے میں اپنے حواسوں کو بحال رکھتے ہوئے تہ خانے کی سال خوردہ اور پتھریلی دیوار کے سہارے اس کی جانب بڑھتا رہا۔ میں نے اپنی کھانسی بھی دبا رکھی تھی۔ لیکن اس سے مجھے شدید گھٹن کا احساس ہوا، میں کھانسنے لگا۔ شاطر کوہارا کو کچھ شبہ ہوا تھا اسی لیے اس نے اپنی جگہ چھوڑ دی تھی۔

ٹارچوں کی روشنیاں گرد و غبار کے مٹیالے بگولوں کو کرسٹل بال کی طرح روشن کیے ہوئے تھیں مگر دکھائی پھر بھی کچھ نہیں دے رہا تھا، کوہارا والی جگہ پر میں پہنچا، اسے خالی پایا۔

دفعتاً مجھے یاسمین کی چیخ سنائی دی۔

''شہزی! جہاں بھی ہو رک جاؤ۔ تمہاری ایرانی شہزادی کا حسین پہلو میرے پستول کی زد میں ہے۔'' کوہارا کی غراتی ہوئی خونخوار آواز پر میں چند ثانیوں کے لیے سکتے کا شکار ہوگیا اور تب ہی اچانک میرے تیزی سے کام کرتے ہوئے ذہن میں بجلی کی سی تیزی سے ایک خیال اُبھرا۔

سے جی کوہارا نے بھی میرے جیسی ہی چال چلنے کی کوشش کی تھی۔ وہ گرد و غبار کے ''پردے'' کا فائدہ اُٹھا کر یاسمین کی جانب جا کھسکا تھا لیکن شاید کوہارا یہ بھول گیا تھا کہ یاسمین جس رخ پر کھڑی تھی، وہ میرے ذہن کے خانے میں بھی محفوظ تھا۔

میں نے اسی جانب پیش قدمی کی اور گرد کے بادل چھٹنے سے پہلے ہی میں نے کوہارا کو جا کر دبوچ لیا۔ اگرچہ یہ بڑا خطرناک اور رسکی تھا۔ درندہ صفت کوہارا بدک سکتا تھا اور اسی عالم میں ٹریگر بھی دبا دیتا، مگر اس بے وقوف نے اپنے زعم میں یہ جتا ڈالا تھا کہ اس کے پستول کی نال یاسمین کے پہلو سے لگی ہوئی تھی اسی لیے میں نے کوہارا کے قریب جا کر اسے کچھ ایسے انداز میں ''چھاپا'' تھا کہ اس نے بدک کر ٹریگر تو دبا دیا تھا اور گولی بھی چلی تھی مگر یاسمین کے نہیں لگی۔

میں نے دراصل کوہارا کے زوردار کندھے کی ٹھوکر رسید کی تھی اور بیک وقت میرا ایک ہاتھ یاسمین کی کمر کے گرد حمائل بھی ہوا تھا۔ جس سبب وہ کوہارا کی گرفت سے نکل کر ایک طرف ہوگئی تھی۔ تاہم اگلے چند لمحوں میں وہ میرے ساتھ آن لگی، اس کے گداز جسم کا لمس مجھے کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزتا محسوس ہوا، وہ سخت خوف زدگی کا شکار تھی۔ کیونکہ کوہارا کا مقصد شاید اب پورا ہو چکا تھا اور وہ

سب کو ہلاک کرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔
تیسری گولی کے چلنے کے ساتھ ہی ایک انسانی چیخ اہرام کے تہ خانے میں ابھری تھی، میں دھک سے رہ گیا۔ رذیل کوہارا کی تیسری گولی نے شاید پروفیسر ڈین کو چاٹ لیا تھا۔ کوہارا کا یہی وتیرہ تھا، جو اس پر بھروسا کرتا وہ سب سے پہلے اسی کی ہلاکت کا سبب بنتا تھا۔
تہ خانے میں پتھروں اور گرد و غبار کی بارش ہوتی رہی۔ میں یاسمین کو خود سے لگائے ایک طرف اندازے کی بنیاد پر کھسکتا جا رہا تھا۔ جانتا تھا کہ اس وقت کوہارا کے سر پر خون سوار تھا۔
''سب چلے جاؤ یہاں سے...... نکل جاؤ...... ہاہا...... ہاہا...... مجھے میری منزل مل چکی ہے اور اب میں کسی کو یہاں برداشت نہیں کروں گا۔ جو میرے سامنے آئے گا، اسے ہلاک کر ڈالوں گا۔''
وہ پاگل ہو گیا تھا شاید، کامیابی کے قریب اس نے اپنے قدم محسوس کر لیے تھے لیکن مجھے ابھی تک ایسا کچھ نظر نہیں آیا تھا۔
میں یاسمین کو لیے دیواروں کو چھوتا ہوا اس میں کوئی ایسا خلا یا راستہ تلاشتا رہا کہ مجھے کسی طرح یہاں سے عارضی طور پر ہی سہی نکل جانے کا موقع مل جائے اور پھر ایسا ہی ہوا۔
ایک خلا میں میرے ہاتھ جھول گئے اور میں یاسمین کو لیے اسی طرف کو مڑ گیا۔ کافی آگے جا کر تنگی دیوار آ گئی، ہم دونوں اس کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔ یاسمین میرے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔ جگہ بہت تنگ تھی۔
ہم دونوں کے جسم گویا باہم چسپاں ہو گئے تھے۔ ہماری سانسیں تک ایک دوسرے میں شامل ہو رہی تھیں۔ یاسمین کے سینے کا زیر و بم مجھے صاف محسوس ہوتا تھا۔
''کیا ممی دریافت کر لی گئی ہے؟'' میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔
''ہاں...... !مگر تم۔''
''موت سر پر کھڑی ہے صرف میرے سوالوں کے جواب دو۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔
''ممی کا ٹھکانا کدھر تھا؟''
''اسی جگہ جہاں ہم کھڑے تھے۔ اس کے درمیان جو شکستہ چبوترا تھا اس کے اندر تقریباً چھ فٹ کی گہرائی میں پتھر کا وہ تابوت موجود تھا جس کے اندر ثمانہ کی ممی......'' یاسمین کی آواز حلق میں ہی اٹک گئی۔ کیونکہ پروفیسر ڈین گروبن مدد کے لیے چلّا رہا تھا۔
''مائی گاڈ! میری مدد کرو...... یہ...... درندہ مجھے...... مار ڈالے......'' اس کی آواز حلق میں اٹک گئی۔ پھر یوں گھٹی گھٹی آوازیں آنے لگیں اس کی......، جیسے وہ عالمِ نزاع میں ہو۔
میں مخمصے کا شکار ہو گیا۔
''شش...... شہزی! اس بے چارے بوڑھے کی مدد کرو...... خدا کے لیے...... وہ بہت قابل انسان ہے۔''
میں یاسمین سے الگ ہوا اور دوبارہ متروکہ ہال کی جانب کھسکا۔ یاسمین بھی شاید میرے پیچھے دیوار سے لگی کھسکتی چلی آ رہی تھی۔ میں سرے پر پہنچا، دھول مٹی اور گرد و غبار چھٹنے لگا تھا۔ میں اندازہ لگا رہا تھا کہ کوہارا کا پستول خالی ہو چکا تھا۔ ورنہ وہ اپنی جسمانی طاقت کھپانے کے بجائے... پستول کی ایک گولی خرچ کر سکتا تھا۔
یہ اندازہ لگاتے ہی میں اس طرف کو لپکا۔ وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ کوہارا پروفیسر ڈین کا گلا دبوچے جا رہا تھا۔ وہاں ریلے اور ڈاکٹر ہیر اللہ بھی آ چکے تھے، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہاں ''ٹپک'' پڑے تھے۔ کیونکہ ان کے کپڑے بھی دھول مٹی میں اٹے ہوئے تھے، ریلے کوہارا کی سمت بڑھا تھا مگر اس کی ایک ہی لات نے دبلے پتلے پچی سے ریلے کو دور پھینک دیا تھا۔
کوہارا، پروفیسر ڈین کی گردن دبوچے جا رہا تھا اور یہی وہ وقت تھا جب میں نے جوشِ غیظ تلے اس کی جانب جست لگائی اور سیدھا کوہارا پر جا پڑا۔ وہ بلبلا کر الگ ہو گیا۔ مگر گرتے ہی سنبھلا اور زخمی بھیڑیے کی طرح مجھ پر اچھل کر پڑا۔
اس نے قریب آتے ہی میرے پہلو میں اپنی ایک ٹانگ کا گھٹنا رسید کر دیا۔ یہ کسی عام آدمی کا وار نہیں تھا گینڈے جیسی جسامت کے حامل کوہارا کے مضبوط اور آہنی گھٹنے کا وار تھا، اذیت کی ایک لہر میرے پورے وجود میں سرایت کر گئی اور میں اپنے حلق سے بے اختیار ابھرنے والی کراہ آمیز چیخ کو نہ روک سکا، ایک سائڈ سے پہلو پر ہاتھ رکھ کے جھک سا گیا، کوہارا نے مجھے ایک ہی ہلّے میں ڈھتے دیکھا تو اس کا بھی جیسے جوشِ غیظ سوا ہو گیا، اس نے مجھے سنبھلنے بھی نہ دیا اور مجھے ایک زبردست ٹھوکر رسید کر دی۔ میں زمین سے چند انچ اُچھل کر سیدھا وسط میں واقع شکستہ چبوترے پر جا پڑا۔ لیکن یہ کیا، چبوترے پر گرتے ہی میں لڑھکا اور نیچے گرتا چلا گیا۔ کوئی چھ سات فٹ کی گہرائی میں پہنچ کر میں کسی سخت شے پر گرا۔

یہاں گھپ تاریکی تھی لیکن میرے سر کے اُوپر بدنما سا خلا کا سرا تھا۔ میں اس اچانک اُفتاد پر ذرا دہل سا گیا۔ اُوپر ہلکی سی روشنی تھرک رہی تھی، وہ اس ہنڈے کی تھی جس کا ذکر اول کر چکا تھا۔
تب ہی میں نے یاسمین کی چیخ کی آواز سنی، یوں لگا جیسے کوئی اسے زد و کوب کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ کوہارا کے علاوہ کون بدبخت ہو سکتا تھا۔ یاسمین کو خطرے میں محسوس کر کے میرا دل یک دم تشویش آمیز بے چینی کا شکار ہو گیا۔
میں کھڑا ہوا تو میرے پاؤں اس سخت سی پتھریلی شے میں دھنسنے لگے، جلد ہی عقدہ کھلا کہ وہ کوئی پتھریلا تابوت تھا اور اس کا ڈھکن...... امتدادِ زمانہ کے سبب بھربھرا گیا تھا۔ میں سنبھلا، اس وقت میرے سر پر کوہارا سوار تھا میں نے پیروں کو نسبتاً مضبوط سی جگہ پر اٹکایا اور دونوں ہاتھوں سے کھردری دیوار کا سہارا لیا ہی تھا کہ اُوپر جا سکوں، اچانک یاسمین کی اس بار... کراہتی ہوئی آواز ابھری جو بہت قریب سے آئی تھی، ساتھ ہی کوئی خونخوار انداز میں غرایا بھی تھا۔
میں نے سر اُٹھا کر اُوپر دیکھا اور میرے دل کی دھڑکنیں سوا ہو گئیں۔ سرے پر یاسمین کا گلنار چہرہ جھکا ہوا تھا اور کوہارا نے اسے گردن سے دبوچ کر نیچے کی طرف جھکا رکھا تھا۔
مجھے دیکھ کر وہ پُرغیظ انداز میں چیخا۔ ''شہزی! باہر نکل آؤ، ورنہ تمہاری اس محبوبہ نمبر دو کا ٹینٹوا دبا دوں گا۔''
میں تو یوں بھی باہر ہی آ رہا تھا لیکن نجانے کیوں میں کچھ کھٹک سا گیا۔ ایسا کیا تھا یہاں جو یہ مجھے نکلنے پر زور دے رہا تھا؟
ٹھیک اسی وقت عقب سے شاید کوہارا پر کسی نے سخت شے سے وار کیا۔ اس کے حلق سے کراہ خارج ہوئی، وار کرنے والے کا خیال تھا کہ وہ ڈھے جائے گا، مگر اسے کیا معلوم تھا کہ یہ خبیث شیطان اپنے اندر شیطان جیسی طاقت رکھتا تھا۔ چوٹ سہنے کے لیے اس نے شاید لحہ بھر کے لیے اپنے جسم کے مضروب حصے کو سہلایا تھا۔ اس کے بعد وحشیانہ غراہٹ سے اس پر پلٹ کر پل پڑا تھا۔ ایک درد بھری چیخ ابھری تھی، جسے میں پہچان گیا، تختہ بننے والا یہ...... ریلے تھا۔ اُدھر یاسمین نے بھی عین ایسے ہی لمحات میں بے جگری کا مظاہرہ کیا جو اس کا طرہ تھا، نجانے کیسے کوہارا کی گرفت سے خود کو چھڑایا تھا اور اندر کود پڑی۔ یہی نہیں اس نے بیدار مغزی کا ایک اور مظاہرہ بھی کیا تھا۔ چبوترے پر رکھا ہنڈا ابھی اس نے اُچک لیا تھا۔
یاسمین خانم پکے ہوئے پھل کی طرح سیدھی میری گود میں آن گری تھی۔ ہنڈا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرنے لگا مگر میں نے دونوں کو ہی گرنے سے بچا لیا تھا۔
''شہزی! سنبھلو...... ادھر...... یہاں......'' وہ بے ربط سے الفاظ میں بولی۔ اس کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اب اس کے خوف پر ایک عجیب طرح کے جوش نے غلبہ پا لیا تھا۔ اس نے مجھے جلدی سے ایک طرف ہونے کا کہا اور خود متروکہ تابوت کے ڈھکن کو اُوپر اُٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔
''مم...... میری مدد کرو شہزی! ی ی...... یہی ثمانہ کا تابوت ہے، جلدی کرو۔'' اس نے ہانپتے ہوئے فرطِ جوش سے کہا اور مجھے اپنے وجود میں ایکا ایکی سنسنی کا احساس ہوا...... پھر تو جیسے میرا اپنے جسم کا بھی رُواں رُواں جوش سے مرتعش ہونے لگا۔
ہم نے مل کر پتھر کے اس بوسیدہ تابوت کا ڈھکنا گویا ٹکڑوں کی شکل میں علیحدہ کیا۔ ہنڈے کی وجہ سے اندر خاصی روشنی پھیل گئی تھی۔ لیکن ابھی ہم تابوت کے اندر کا جائزہ ہی لے رہے تھے کہ اچانک اُوپر تہ خانے کے متروکہ ہال میں ریلے کی لرزا دینے والی آواز ابھری۔ یہ اس کی آخری چیخ سے مشابہ محسوس ہوئی تھی۔
''شہزی...... ! فار گاڈ سیک! ہمیں اس خونی درندے سے بچاؤ۔'' یہ پروفیسر ڈین کی آواز تھی۔
سے جی کوہارا کے خلاف نفرت کی ایک شدید لہر میرے پورے وجود میں سرایت کر گئی اور میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس گڑھے سے نکل کر چبوترے پر آ گیا۔ تب ہی میری آنکھوں نے ایک بے رحم منظر دیکھا۔
سے جی کوہارا کسی دیو کی طرح، بے چارے دبلے پتلے ریلے کی گردن مروڑے جا رہا تھا یہاں تک اس نے اس کی گردن پوری گھما کے دوبارہ سامنے کر ڈالی تھی۔ یہ بڑی اذیت ناک موت تھی۔ ایک اور بے گناہ اور کمزور شخص کو کوہارا جیسے درندے کو سفاکی کے ساتھ ایک معصوم انسان کا قتل کرتے دیکھ کر میں پھر جیسے اپنے آپے میں نہیں رہا۔ اس بدبخت نے بے چارے کو اس وار کرنے کی بڑی بھیانک سزا دی تھی اور دیکھا جاتا تو ریلے نے اپنی بساط بھر طاقت اور ہمت کے بل بوتے پر ہماری ایک طرح سے مدد ہی کرنی چاہی تھی۔
دوسری طرف ڈاکٹر ہیر اللہ اور پروفیسر ڈین اس کھلی بربریت پر خوف سے لرز گئے تھے اور کوہارا کو ایسی دہشت زدہ

نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی خوفناک عفریت ہو، یوں بھی اس میں کیا شک تھا۔

’’کوہارا......!‘‘

میں نفرت اور غضب سے اس قدر حلق پر زور دے کر دہاڑا تھا کہ ایک لمحہ کے لیے میں نے کوہارا...... کے پُرغیظ چہرے پر بھی تھرتھراہٹ محسوس کی...... وہ ریلے کی گردن مڑی لاش کو پھینک کر میری جانب پلٹا اور تب تک میں چبوترے سے اس پر چھلانگ لگا چکا تھا۔

میری جست کسی شکاری اور خونخوار چیتے سے کم نہ تھی۔ میں کوہارا سے ٹکرایا اور اپنے کسرتی بدن کی طاقت کے بل بوتے پر اسے لیے زمین پر آرہا۔

سنبھلتے ہی میں نے اسے اپنے دونوں ہاتھوں سے دبوچ کر کھڑا کر دیا اور ایک زوردار گھونسا اس کے جبڑے پر جڑ دیا۔ کوہارا...... کے دہن سے خون چھلکا اور وہ کراہتا ہوا چند قدموں تک لڑکھڑاتا چلا گیا۔ میرے زوردار پنچ سے اس کے جبڑے کا اندرونی حصہ جو ’’سوفٹ ٹشو‘‘ کہلاتا ہے۔ دانتوں تلے پھٹ چکا تھا، دو تین دانتوں کو میں نے خون کی پھوار کے ساتھ اُگلتے بھی دیکھا۔ میں رکا نہیں، میرا غیظ فزوں تر تھا۔ اُچھل کر میں نے ایک لات اس کے سینے پر بھی جڑ دی۔ وہ اپنے گرانڈیل وجود کے باعث اُچھلا تو نہیں البتہ دوبارہ چند قدم پیچھے کی جانب لڑکھڑاتا ہوا پتھریلی دیوار سے پشت کے بل جا ٹکرایا۔

خون آلودہ اس کا چہرہ وحشت کی تصویر پیش کر رہا تھا، میں پھر اس پر جھپٹا تو اس نے گینڈے جیسی جسامت کے باوصف پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے اپنے کندھے کی ٹھوکر رسید کر دی۔ مجھے جھٹکا لگا لیکن سنبھلنے میں دیر میں نے بھی نہیں لگائی تھی۔

موقع پاتے ہی میں نے اس سے کوئی ڈیڑھ دو فٹ کا فاصلہ جانچا اور ایک ٹانگ کی ایڑی کے بل گھوم گیا۔ رائٹ کک سے اس کے مضروب جبڑے کو دوبارہ نشانہ بنایا۔ وہ اُدھڑ کر رہ گیا۔ اس کے حلق سے پہلی بار میں نے سخت اذیت ناک چیخ کی آواز سنی تھی، لیکن یہاں مجھ سے ایک فاش غلطی ہو گئی جس کا خمیازہ مجھے بھگتنا پڑا۔

گولی لگنے کی وجہ سے میری جس ٹانگ پر پٹی بندھی ہوئی تھی اس کا زخم نہ صرف ہرا ہو گیا بلکہ اس میں سے بھل بھل خون بھی جاری ہو گیا۔ یہی نہیں تکلیف کے باعث میں کھڑا بھی نہ ہو پایا اور لڑکھڑا گیا، گرنے سے بچانے کے لیے مجھے ڈاکٹر ہیرالڈ نے یک دم آگے بڑھ کر سہارا دیا۔ وہ مجھ سے ذرا قریب ہی کھڑا تھا۔

’’کیپ اِٹ اَپ ینگ مین......‘‘ وہ مجھے حوصلہ دیتے ہوئے جوش بولا۔

جبکہ اِدھر کوہارا ابھی زمین بوس ہو چکا تھا اور بھربھرائی ہوئی پتھریلی زمین پر لیٹا خون تھوکنے لگا، اس کا جبڑا اُبری طرح کٹ پھٹ کر سرخ لوتھڑے کی طرح لٹکنے لگا تھا۔

مجھے بھی گرتا پا کر اس خبیث کی ہمت کو سہارا ہوا تھا اور وہ اپنا لوتھڑا نما زخمی جبڑا سہلاتا سنبھالتا ہوا بہ وقت تمام اُٹھ کھڑا ہوا اور وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ میری جانب لپکا۔ پروفیسر ڈین نے فوراً آگے بڑھ کر اس کا راستہ روکنا چاہا تھا کہ کوہارا نے اسے اپنے ایک ہی ہاتھ سے پرے دھکا دے دیا اور کسی جنگلی ارنے بھینسے کی طرح مجھ سے ٹکرایا۔

مجھے ڈاکٹر ہیرالڈ نے سہارا دے رکھا تھا مگر وہ بھی مجھے سنبھال نہ پایا، نتیجے میں ہم دونوں ہی گرے تو کوہارا مجھ پر چڑھ دوڑا۔ یہی وہ وقت تھا جب میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ تڑپ کر اس کی گینڈے جیسی موٹی گردن اپنے بازو کے شکنجے میں کس لی اور اپنے وجود کی پوری قوت صرف کرتے ہوئے اس کی گردن پر دباؤ بڑھاتا چلا گیا، یہاں بھی وہی مسئلہ پیدا ہوا کہ میرا یہ بازو بھی زخمی تھا مگر آج میں نے کوہارا کا دم باہر نکالنے کا مصمم ارادہ کر رکھا تھا، وہ میری آہنی گرفت سے اپنی گردن چھڑانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا اور اپنے گرانڈیل جسم کو جھٹکے دے رہا تھا، یوں لگا مجھے جیسے کوئی مگرمچھ میری گرفت میں تھا۔

اِدھر میرے زخمی بازو کی طاقت باعث تکلیف کے کم ہونے لگی، لیکن جوش اس درد پر غالب رہا، کوہارا کا چہرہ سرخ ہوتا چلا گیا، دھیرے دھیرے اس کی آنکھیں اُبلنے کے قریب ہو گئیں اور پھر جب میں نے دیکھا کہ شکنجہ خاطر خواہ دباؤ حاصل کر چکا تو میں نے اپنے وجود کی گویا ساری طاقت بازو میں مجتمع کرتے ہوئے ایک جھٹکا دیا۔ کڑک کی آواز اُبھری اور...... کوہارا...... کا سر ڈھلک گیا۔

ٹھیک اسی وقت ایک تیز چیخ کی آواز اُبھری تھی۔ یہ بنتِ نیل ثمانہ کے مقبرے سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

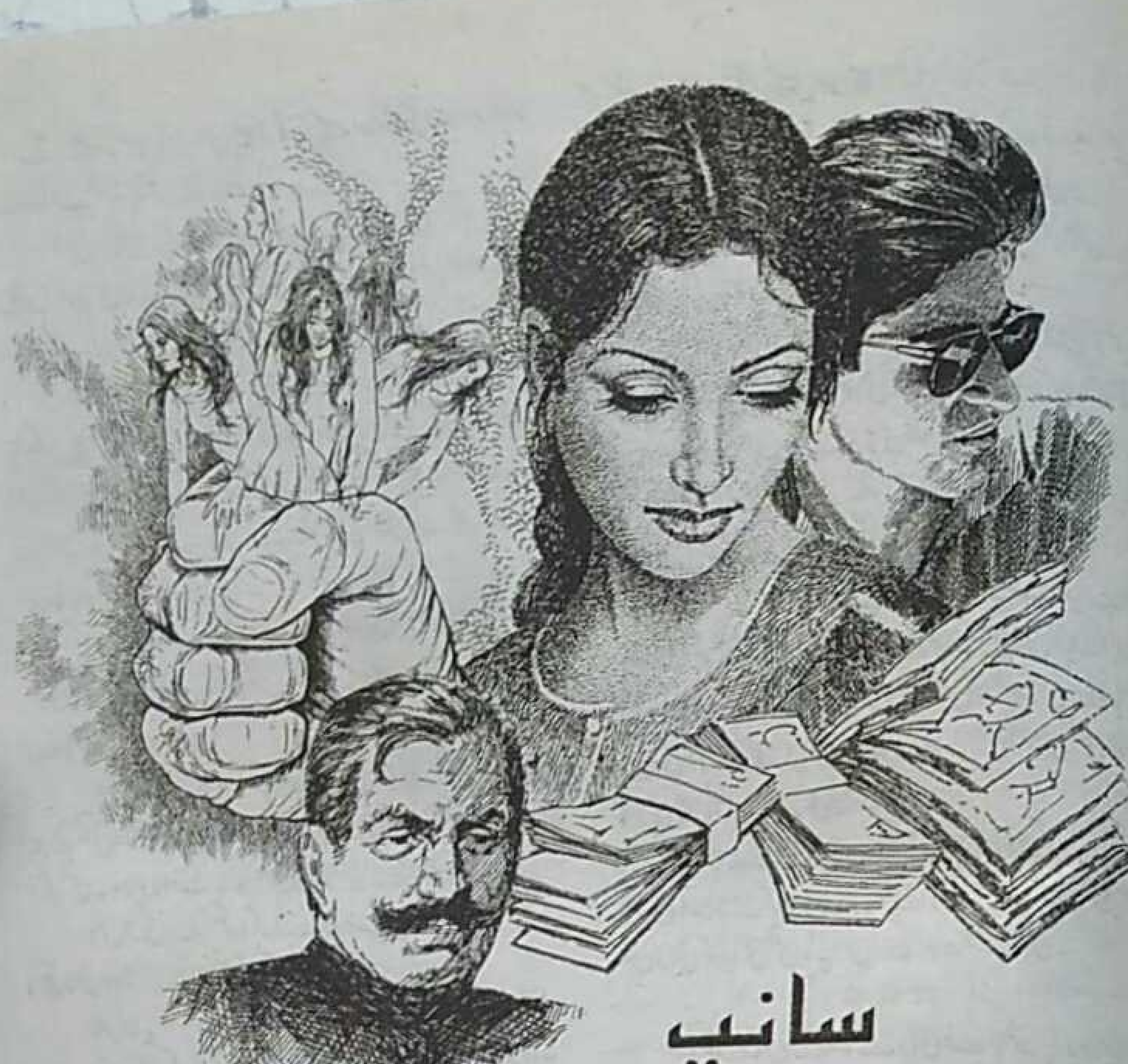

سانپ

سرور اکرام

مشکل گھڑی ہر آن نہیں رہتی... اگرچہ یہ کٹھن گھڑی انسان کے قدم اکھاڑ دیتی ہے... اور وہ ان سمتوں کا رخ کر لیتا ہے جو اُن دگرگوں حالات سے زیادہ دہشت ناک ہوتی ہیں مگر افسوس کہ اس کا ادراک اس وقت ہوتا ہے جب پُلوں کے نیچے سے پانی گزر چکا ہوتا ہے... ایسے ہی افراد کی عکاس تحریر... جن کی زندگی کے حالات نے انہیں غلط راستوں کا راہی بنا دیا...

ایک اور دریا کا سامنا تھا...... میں ایک دریا کے پار اترا تو......

عنایا نے جب اس لڑکی کو دیکھا تو دیکھتی رہ گئی۔

عنایا اس وقت شہر کے ایک شاندار شاپنگ مال کے ایک شوکیس کے سامنے کھڑی ان... میں رکھے ہوئے ملبوسات دیکھ رہی تھی۔ اس شوکیس میں بہت قیمتی ملبوسات تھے۔ ایسے کہ عنایا صرف انہیں دیکھ سکتی تھی۔ خریدنے کی استطاعت نہیں تھی اس میں۔

اس کا دفتر اسی روڈ پر ایک چھوٹی سی بلڈنگ میں تھا۔ وہ لوگ ایم بی اے اور سی اے کرنے والوں کی کوچنگ

کرتے تھے۔ شہر میں اس سینٹر کی ایک ساکھ تھی۔ دور دور سے طالب علم آیا کرتے تھے۔

اس سینٹر کے اساتذہ بھی اپنے فن کے ماہر لوگ تھے۔ ان کی ریپو بہت اچھی تھی۔ اسی لیے اس سینٹر میں ایڈمیشن لینے والوں کی لائن لگی رہتی۔

عنایا اس سینٹر میں ریسپشن پر ہوتی تھی۔ اس کی چھٹی پانچ بجے شام کو ہوا کرتی۔ اس کا اسٹاپ کچھ آگے جا کر تھا۔ اس کو اسی شاپنگ مال کے سامنے سے گزرنا پڑتا تھا۔ وہ روزانہ ہی شاپنگ مال کے شوکیس میں رکھے ہوئے ملبوسات کو دیکھا کرتی تھی۔

اس شام بھی وہ ملبوسات کو دیکھنے میں مصروف تھی کہ کوئی اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ عنایا نے جب اس کو دیکھا تو دیکھتی رہ گئی۔

عنایا کو اس کا چہرہ کچھ جانا پہچانا سا لگا۔ اس لڑکی نے بہت قیمتی سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے بہت مہنگی پرفیوم لگا رکھی تھی۔ وہ پورا فٹ پاتھ اس کی خوشبو سے معطر ہو رہا تھا۔

اس لڑکی نے مسکرا کر اسے مخاطب کیا۔ ''اس طرح کیا دیکھ رہی ہو؟ کیا پہچانا نہیں مجھے؟''

پھر عنایا کو یاد آیا کہ وہ کون تھی۔ اس کا نام رانی تھا۔ وہ اسی کے محلے کی لڑکی تھی۔ بہت بُرے حالات تھے ان لوگوں کے۔ رانی کے باپ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ایک بھائی تھا جو مجرموں کے کسی گروہ میں شامل ہو گیا تھا۔ ایک بار پولیس اسے پکڑ کر لے گئی تھی۔ رانی کی دو چھوٹی بہنیں اور بھی تھیں۔ اسکول میں پڑھ رہی تھیں، رانی خوش شکل لڑکی تھی۔ عنایا سے اس کی دوستی تھی۔ وہ کبھی کبھی عنایا کے گھر آجاتی۔ کبھی عنایا بھی اس کے گھر چلی جاتی۔

ان سے زیادہ تعلقات نہیں تھے پھر وہ لوگ اس محلے کو چھوڑ کر چلے گئے۔ ان کا پتا ہی نہیں چلا۔ عنایا نے بھی بی اے کرلیا... اور اسے یہ جاب مل گئی۔ جاب جیسی بھی ہو لیکن یہاں عزتِ نفس کا خیال رکھا جاتا۔ پڑھا لکھا ماحول تھا۔ اساتذہ بھی اس کا احترام کرتے تھے۔ طالب علم بھی اپنی پڑھائی پر دھیان رکھنے والے تھے۔ عنایا یہاں مطمئن تھی۔ اب اتنے عرصے کے بعد رانی کو اپنے پاس دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔

''رانی، تم؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں، میں۔ میں شاپنگ کے لیے اندر جا رہی تھی۔ میری نظر تم پر پڑی۔ میں نے تمہیں پہچان لیا تو تمہارے پاس آکر کھڑی ہو گئی لیکن تم تو ڈریسز دیکھنے میں اتنی محو تھیں کہ تمہیں احساس بھی نہیں ہو سکا۔''

''ہاں یار۔'' عنایا ہنس دی۔ ''میں روز ادھر سے گزرتی ہوئی اس شوکیس کے سامنے رک جاتی ہوں۔''

''اچھا آؤ، کہیں چل کے بیٹھتے ہیں، اطمینان سے باتیں ہوں گی۔'' رانی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

عنایا کو اگرچہ گھر پہنچنا تھا لیکن وہ انکار نہیں کر سکی۔ رانی اتنے دنوں کے بعد جو ملی تھی۔ وہ اس کے ساتھ چل دی۔ اسی فٹ پاتھ پر ایک گاڑی کھڑی تھی۔ رانی اس گاڑی کے پاس جا کر رک گئی۔ ''بیٹھو۔'' اس نے دروازہ کھول دیا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

''رانی۔'' عنایا کچھ جھجکنے لگی تھی۔ ''یہ سب کیا ہے؟''

''تم بیٹھو تو سہی۔'' رانی نے کہا۔ ''یہاں ایک اچھا سا ریستوران ہے۔ وہاں چل کر بیٹھتے ہیں، اطمینان سے باتیں ہوں گی اور یہ گاڑی میری ہی ہے۔ میں تمہیں کسی اور کی گاڑی میں نہیں بٹھا رہی۔''

عنایا بہت حیران سی اس کے برابر بیٹھ گئی۔ رانی نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ وہ ایک دوسری ہی لڑکی تھی۔ عنایا جس رانی کو جانتی تھی، یہ اس سے بہت مختلف تھی۔

☆☆☆

شاپنگ مال کے سامنے والی فٹ پاتھ پر وہ بیٹھا کرتا تھا۔ وہ ایک بھکاری تھا۔

کپڑے بوسیدہ، بال الجھے ہوئے۔ شیو بڑھی ہوئی۔ ایک درخت کے نیچے وہ بیٹھا رہتا تھا۔ اس کی نگاہیں سامنے لگی رہتیں۔ وہ جانتا تھا کہ کس وقت شاپنگ مال میں کون آتا ہے۔ کچھ تو ہفتے میں ایک بار آیا کرتے۔ کچھ عورتیں ایسی بھی آتی تھیں جو صرف مال کی رونق دیکھنے آیا کرتیں۔

وہ سب کو پہچانتا تھا۔ اس مال کے دکاندار اور اس میں کام کرنے والا اسٹاف۔ سب اس کی نگاہوں میں تھے۔ وہ لڑکی جو ابھی کسی دوسری لڑکی کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھ کر گئی تھی، وہ اسے بھی پہچاننے لگا تھا۔ اس کا نام راجا تھا۔ آس پاس کے کیبن والے اسے اچھی طرح جانتے تھے۔ اس کی سب سے الگ بات یہ تھی کہ وہ کبھی آواز نہیں لگاتا تھا۔ اس کے پاس ایک چھوٹی سی چادر تھی جس کو بچھا کر بیٹھ جاتا۔ اگر کسی نے کچھ ڈال دیا تو ٹھیک ورنہ خاموش بیٹھا رہتا۔

مال کے سامنے ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا جس کا ویٹر ادھر سے گزرتے ہوئے کیبن والوں کے اور راجا کے آرڈر لے لیا کرتا۔

راجا نے اس لڑکی کو کسی اور کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ یہ ایک نئی بات تھی۔

راجا نے اپنے شانے پر پڑی ہوئی چھوٹی سی تولیا اٹھا کر اس طرح اپنے چہرے پر رکھ لی کہ اس کا چہرہ چھپ گیا تھا پھر اس نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا موبائل نکال کر کسی کا نمبر ملا کر بات کی۔ ''ہاں دیکھو، ابھی ابھی ایک لڑکی اس ٹارگٹ کے ساتھ کسی طرف اسی کی گاڑی میں نکلی ہے۔ تم اس کا پیچھا کر کے معلوم کرو۔ اور......'' موبائل آف کر کے اس نے جیب میں رکھ لیا۔ آس پاس والوں کو احساس بھی نہیں ہو سکا تھا کہ اس نے ابھی موبائل پر کسی سے بات کی ہے۔

ایک اور بھکاری اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ وہ ایک بڑھا تھا۔ ''راجا استاد۔'' اس نے راجا کو مخاطب کیا۔ ''یار کچھ دنوں سے بہت مندا چل رہا ہے۔''

''وہ کیوں؟'' راجا نے پوچھا۔

''کیا بتاؤں، میری جو جگہ ہے نا، وہاں کوئی رونق ہی نہیں ہے۔ ہر طرف دفتر ہی دفتر ہیں۔ اب وہ لوگ صبح دفتر پہنچنے کی جلدی میں ہوتے ہیں اور شام کو گھر پہنچنے کی جلدی میں ہوتے ہیں۔ اسی لیے ان کے پاس راستے میں رک کر بھیک دینے کی فرصت ہی نہیں ہوتی۔ تیری جگہ تو بہت شاندار ہے یار، ہر وقت رونق ہی رونق۔''

''یہ تو ہے۔'' راجا مسکرا دیا۔ ''لیکن تو فکر مت کر، اگلے مہینے میں یہ جگہ چھوڑ رہا ہوں۔''

''وہ کیوں؟''

''اپنے دیس واپس جا رہا ہوں۔'' راجا نے بتایا۔ ''میری جگہ خالی ہو جائے گی، یہاں تو آجانا۔''

''پکی بات ہے نا؟'' بھکاری خوش ہو گیا...

''ہاں یار، بالکل پکی۔'' راجا نے کہا۔

بھکاری نے خوش ہو کر اسی وقت سامنے سے گزرتے ہوئے باہر والے کو چائے کا آرڈر دے دیا تھا۔

☆☆☆

عنایا اور رانی دونوں چائے پی رہی تھیں۔ رانی نے کھانے پینے کی بھی بہت سی چیزیں منگوا لی تھیں۔ اس کے تیور ہی کچھ اور ہو گئے تھے۔ اس کے لہجے اور اس کی آواز میں پیسا بول رہا تھا۔

''تم لوگ تو چلے گئے تھے؟'' عنایا نے کہا۔ ''پھر کیا ہوا، میرا مطلب ہے کہ کہاں سے یہ سب کچھ ہو گیا؟''

''اس لیے کہ میں نے جھجک مارنی چھوڑ دی۔'' رانی نے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''شرافت کی زندگی میں سوائے پریشانی کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ کیا شرافت کی زندگی گزار کر تم اپنا فلیٹ بھی خرید سکتی ہو؟ کبھی نہیں۔ زندگی بھر کرائے کے مکان میں سڑتی رہو۔ ارے جب گھر میں کچھ نہ ہو، پیٹ خالی ہو تو کیا اس وقت شرافت کسی کام آتی ہے؟ کیا وہ آکر پوچھتی ہے کہ تم دو دنوں سے فاقے سے کیوں ہو؟ اب تم خود اپنا حال دیکھ لو۔ تم نے بتایا کہ تمہیں بیس ہزار ملتے ہیں۔''

''ہاں، بیس ہزار۔''

''تو کیا ہوتا ہے اس بیس ہزار میں؟'' رانی نے کہا۔ ''کیا تم اپنے خواب پورے کر سکتی ہو؟ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔''

''تو پھر کیا کیا جائے؟'' عنایا نے پوچھا۔

''بولڈ اسٹیپ۔'' رانی نے کہا۔ ''میری طرح۔ میں نے بولڈ اسٹیپ اٹھایا اور بہت آگے نکل گئی۔''

''کیسا بولڈ اسٹیپ؟''

''ابھی نہیں، کیا پہلی ہی ملاقات میں سب جان لینا چاہتی ہو؟'' رانی نے کہا۔

''تو پھر کب تک بتاؤ گی؟''

''دو چار ملاقاتوں کے بعد۔'' رانی نے کہا۔ ''بلکہ تم ایسا کرو، میرے گھر آجاؤ۔ امی تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گی۔'' رانی نے اپنا پتا بتا دیا۔ ''ایسا کرو کہ تم ابھی میرے ساتھ ہی چلو۔''

''ابھی تو میں گھر جاؤں گی۔'' عنایا نے کہا۔

''تو پھر میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔'' رانی نے کہا۔ ''آنٹی سے بھی مل لوں گی۔ وہ بھی دیکھ کر حیران رہ جائیں گی۔''

''ہاں، یہ اور بھی اچھا ہوگا۔''

☆☆☆

اس دفتر کا مالک ایک شریف آدمی تھا۔ اگرچہ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی لیکن دفتر میں کام کرنے والی لڑکیاں اس کی شرافت کے گن گایا کرتی تھیں۔ ''نسیم صاحب تو کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ مجال ہے جی کبھی کسی سے جھڑک کر بات کر دیں۔ بیٹا، بیٹا ہی کہتے رہتے ہیں۔''

اس دفتر میں ریکروٹنگ کا کام ہوتا تھا۔ خاص طور پر پڑھی لکھی لڑکیوں کو بیرونِ ملک جاب پر بھیجا جاتا تھا۔ باقاعدہ ایگریمنٹ کے تحت پانچ سال کا ویزا لگوا دیا جاتا۔

اتنا ہی نہیں بلکہ سیلری بھی اتنی ہوتی تھی کہ یہ لڑکیاں پانچ برسوں میں اتنا نہیں کما سکتی تھیں جتنا انہیں دو چار مہینوں میں مل جاتا تھا۔ جو لڑکیاں اس ایجنسی کی معرفت باہر گئی تھیں، ان کے گھر والے اب عیش کررہے تھے۔ جب لڑکی مہینے کے دو لاکھ روپے گھر بھیج رہی ہو تو اور کیا چاہیے۔ لڑکیوں کے والدین بھی شکریہ ادا کرنے آجایا کرتے تھے۔

اسی دفتر کی معرفت ہر مہینے کی سیلری بھی آیا کرتی تھی۔ جب گھر والے سیلری وصول کرنے آتے تو نسیم صاحب کو دعائیں دیتے ہوئے واپس جاتے۔

اسی دفتر میں نورین بھی کام کرتی تھی۔ وہ بھی ایک سیدھی سادی لڑکی تھی۔ خاص طور پر اس کی آنکھیں غضب کی تھیں۔ ان میں ایسا کیف تھا کہ دیکھنے والا ڈوب کر رہ جاتا تھا۔ نورین کا گھر اس دفتر سے بہت فاصلے پر تھا۔ وہ بس کے ذریعے آیا جایا کرتی تھی۔ بس سے اترنے کے بعد بھی اسے کچھ دور تک پیدل چلنا پڑتا تھا۔

پچھلے کئی دنوں سے نورین نوٹ کررہی تھی کہ دفتر سے چھٹی کے بعد وہ جب بس میں سوار ہوتی ہے تو ایک گاڑی پہلے سے کھڑی ہوتی ہے۔ اس نے یہ دیکھ لیا تھا کہ وہ ایک نوجوان ہے جو گاڑی ڈرائیو کررہا ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ جب بس سے اترتی تو وہی گاڑی پہلے سے اس کے اسٹاپ پر کھڑی رہتی جیسے اسی کا انتظار کررہی ہو۔

نورین کو اب خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ اس شام جب وہ بس سے اُتر کر کچھ ہی دور چلی تھی کہ گاڑی اس کے پاس آکر رک گئی۔ وہی نوجوان گاڑی چلا رہا تھا۔ نورین نے اپنی رفتار تیز کردی۔ لیکن اس نوجوان نے گاڑی اس کے پاس لاکر روک دی۔ ''سنیں، پریشان نہ ہوں۔ آپ سے کچھ کہنا ہے۔''

نورین کو رکنا پڑا تھا۔ اس نوجوان کا لہجہ بہت مہذب تھا۔ ''کیا بات ہے؟'' اس نے اکھڑے لہجے میں پوچھا۔

''کیا آپ مجھے صرف دو منٹ دیں گی؟'' اس نے کہا۔ ''آپ کے مستقبل کی بات ہے۔''

''میرے مستقبل کی؟'' نورین حیران رہ گئی تھی۔ ''کیا ہوا ہے میرے مستقبل کو؟''

''اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ مجھے صرف دو منٹ چاہئیں۔'' اس نے کہا۔ ''مجھ سے خوف نہ کھائیں۔ اگر آپ چاہیں تو میں گاڑی سے اُتر جاتا ہوں۔ آپ بات کرلیں۔''

اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔ ویسے بھی یہ ایک مصروف سڑک تھی۔ لوگ آجا رہے تھے۔

''ٹھیک ہے اُتر کر بات کرلیں۔'' اس نے کہا۔

نوجوان نے گاڑی ایک طرف کھڑی کردی اور گاڑی سے اتر آیا، وہ ایک قبول صورت نوجوان تھا۔ لباس بہت سلیقے کا تھا۔ پہلی نظر میں وہ ایسا نہیں معلوم ہوتا تھا جس طرح کے نو دو لتیے لوفر نوجوان ہوا کرتے ہیں۔

وہ نوجوان اس کے پاس آگیا۔ ''دیکھیں، میں بات تو ویسے بھی کرسکتا ہوں لیکن یہ اچھا نہیں لگے گا کہ ہم اس طرح کھڑے ہو کر باتیں کریں۔ سامنے ایک ہوٹل ہے، ہم چائے بھی پیتے رہیں گے اور ہماری بات بھی ہوجائے گی اور آپ کوئی خطرہ بھی محسوس نہیں کریں گی۔''

کچھ دیر سوچنے کے بعد نورین نے گردن ہلادی۔ دونوں سڑک کراس کرکے سامنے والے ایک ہوٹل میں آکر بیٹھ گئے۔

''دیکھیں۔'' اس نوجوان نے بات شروع کی۔ ''پہلی بات تو یہ بتادوں کہ میں ایک سرکاری آفیسر ہوں۔ آپ میرا کارڈ دیکھ لیں۔ اس کے بعد آپ اطمینان سے باتیں کرسکیں گی۔''

اس نے اپنی جیب سے ایک کارڈ نکال کر نورین کے سامنے کردیا۔ کارڈ یہ بتا رہا تھا کہ وہ ایک خفیہ ایجنسی کا اہلکار ہے اور اس کا نام شہزاد ہے۔ ''اطمینان ہوگیا آپ کو؟'' اس نے پوچھا۔ ''میرا نام شہزاد ہے اور میں خفیہ ایجنسی کا ایس پی ہوں۔ حالانکہ ہم کسی پر اپنی شناخت ظاہر نہیں کرتے۔ یہ ہمارے اصولوں کے خلاف ہے لیکن آپ کو اطمینان دلانا ضروری تھا۔''

''میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ایک خفیہ ایجنسی کے اعلیٰ عہدیدار کو مجھ سے کیا کام پڑ گیا؟'' نورین نے کہا۔

''آپ سے نہیں، آپ کی حب الوطنی سے کام ہے۔'' شہزاد نے کہا۔ ''کئی دنوں سے آپ کی نگرانی کی جارہی ہے اور ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ آپ ایک مخلص پاکستانی لڑکی ہیں۔ اپنے وطن کے لیے سب کچھ کرسکتی ہیں۔''

''اس میں تو کوئی شک کی بات نہیں ہے کہ میں ایک خالص پاکستانی لڑکی ہوں لیکن میں کس کام آسکتی ہوں؟''

''آپ جس دفتر میں کام کرتی ہیں، کیا اس کے کردار سے مطمئن ہیں؟'' شہزاد نے پوچھا۔

''جی ہاں، وہاں ابھی تک مجھے کوئی شکایت نہیں ہوئی ہے۔'' نورین نے کہا۔

''کیا آپ نے کبھی اس بات پر غور کیا ہے کہ آپ کی

فرم صرف لڑکیوں کو باہر کیوں بھیجتی ہے؟'' شہزاد نے پوچھا۔

''جی ہاں، ایک دو بار ذہن میں خیال آیا تھا پھر یہ سوچا کہ ان کی پالیسی ہوسکتی ہے۔ یہ سوچ کر خاموش رہ گئی۔''

''بالکل صحیح کہا۔ پالیسی تو ہے لیکن مختلف مزاج کی پالیسی ہے۔ کیا آپ جانتی ہیں کہ باہر جاکر ان لڑکیوں کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ کسی قسم کی اچھی جاب مل جاتی ہے۔''

''جی ہاں، جاب تو مل جاتی ہے لیکن یہ لڑکیاں باہر جاکر...... میرا مطلب ہے کہ باہر انہیں عیاشی کا سامان بنادیا جاتا ہے۔ ان کے لیے گاہک لائے جاتے ہیں۔ وہ گرائے پر چلتی ہیں۔ اب اس سے زیادہ کھل کر میں کیا کہوں؟''

''اوہ خدا۔'' نورین نے اپنا سر تھام لیا۔ ''خدا کے لیے نہ کہیں یہ سب۔''

''یہ سچائی ہے، نورین صاحبہ۔'' شہزاد کا لہجہ تلخ ہوگیا تھا۔ ''آپ کا دفتر مجبور لڑکیوں کو اس طرح تباہ کررہا ہے۔ زندگی بھر کے لیے پھر وہ کسی کام کی نہیں رہتیں۔ اس کے عوض کیا ہوتا ہے؟ معلوم ہے آپ کو؟ ان کے گھر والوں کے پاس ان کے پیسے آنے لگتے ہیں۔ سیلری کے نام پر۔ اور گھر والے یہ سمجھتے ہیں کہ بیٹی کی جاب بہت اچھی ہے۔''

''جی ہاں، یہ تو میں خود دیکھتی ہوں کہ ان لڑکیوں کی سیلری بہت اچھی ہوتی ہے۔'' نورین کی آواز کانپ رہی تھی۔

''کیا ان میں سے کوئی لڑکی باہر جاکر واپس بھی آئی ہے؟'' شہزاد نے پوچھا۔

''میرے علم میں تو نہیں ہے۔''

''کیا کسی سے آپ کا کوئی رابطہ ہوا ہے؟''

''نہیں، کسی سے نہیں اور ویسے بھی میرا کام کلائنٹس کو ہینڈل کرنا نہیں ہے، میں صرف اکاؤنٹس دیکھتی ہوں۔''

''سمجھ گیا۔ بہت ہوشیاری سے کام ہورہا ہے۔''

''میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ فرم کے مالک نسیم صاحب تو بہت شریف آدمی دکھائی دیتے ہیں۔''

''یہی تو حکمتِ عملی ہے، اگر اس کی جگہ کوئی بدمعاش صورت آدمی وہاں بٹھادیا جائے تو کیا لڑکیاں اس پر اعتماد کرلیں گی؟''

''جی نہیں، ایسا نہیں ہوگا لیکن یہ بتائیں کہ میں اس سلسلے میں کیا کرسکتی ہوں؟'' نورین نے پوچھا۔

''اس وقت وطن کو آپ کی خدمات کی ضرورت ہے۔ کیا آپ وطن کی خدمت نہیں کریں گی؟''

''دل و جان سے۔ لیکن میں کیا کرسکتی ہوں؟''

''آپ اس فرم کی معلومات ہمیں دیا کریں تاکہ کیس مضبوط بنا کر انہیں گرفت میں لایا جائے۔''

''بتائیں، مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''پہلے تو اس بات پر بھروسا کرنا ہوگا کہ آپ جو بھی کررہی ہیں، وطن اور مجبور لڑکیوں کی بھلائی کے لیے کررہی ہیں، جو غریب لڑکیاں ان کے چنگل میں پھنس چکی ہیں، وہ بے چاری تو پھنس ہی گئی ہیں لیکن ہم یہ چاہتے ہیں کہ آئندہ کسی کے ساتھ ایسا نہ ہو۔''

''مجھ سے جو ہوسکے گا، وہ کرنے کو تیار ہوں۔'' نورین نے کہا۔

''اس سے پہلے ایک بات اور ماننا ہوگی کہ حکومت کی جانب سے ان کاموں کا باقاعدہ معاوضہ دیا جائے گا۔''

''ارے نہیں، یہ تو میں ان لڑکیوں کی بھلائی کے لیے کروں گی جو ابھی اس چنگل میں نہیں پھنسی ہیں۔'' نورین نے کہا۔

''پھر بھی آپ کو معاوضہ تو لینا ہی ہوگا۔ کیونکہ آخر ہم بھی تو سیلری لیتے ہیں۔''

''تو پھر بتائیں، کیا کروں میں؟''

''اس فرم کی ایکٹیویٹی کی نیوز ہمیں دیتی رہیں۔'' شہزاد نے کہا۔ ''کہاں دیں گی کس طرح دیں گی؟ یہ سب آپ کو بتادیا جائے گا۔''

ہوٹل سے نکلتے ہوئے نورین کو اس بات کی خوشی ہورہی تھی کہ وہ بھی کسی طور وطن کے کام آنے والی ہے۔

☆☆☆

رانی سے عنایا کی دوستی پہلے سے کہیں زیادہ ہوچکی تھی۔ پہلے محلے داری کی وجہ سے سلام دعا تھی۔ آنا جانا تھا لیکن اب باقاعدہ دوستی ہوگئی تھی۔ عنایا اس کے گھر بھی جاچکی تھی۔ شہر کے ایک پوش علاقے کا ایک شاندار فلیٹ اور فرنیچر بھی بہت شاندار تھا۔ رانی کی ماں اب ایک شاندار فلیٹ میں آرام کی زندگی گزار رہی تھی۔ رانی کا وہ بھائی جو مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث رہتا تھا۔ ملک سے باہر چلا گیا تھا جبکہ رانی کسی جگہ جاب کررہی تھی۔

ایک دن عنایا نے اس سے پوچھا۔ ''رانی تم جو کسی بولڈ اسٹیپ کی بات کررہی تھیں، وہ کیا ہے؟''

"میرا خیال ہے کہ تمہیں بتا دیا جائے۔" رانی نے کہا۔
"ظاہر ہے۔"
"دیکھو، میں ماڈلنگ ایجنسی کے لیے ماڈل لڑکیاں فراہم کرتی ہوں۔" رانی نے بتایا۔ "پہلے شرافت کی زندگی گزارتی رہی اور فاقے کرتی رہی۔ کچھ بھی نہیں تھا ہمارے پاس۔ پھر یہ ہوا کہ ایک بندی سے ملاقات ہوگئی۔ اس نے ایک ماڈلنگ ایجنسی سے میرا تعارف کروا دیا۔ اس کے بعد میری دنیا ہی بدل گئی۔ میں ایسی لڑکیوں کو ماڈلنگ کے لیے اس ایجنسی کے حوالے کر دیتی ہوں جو لڑکیاں اس لائن میں قدم رکھنے کے لیے خوار ہوتی رہتی ہیں۔"
"یہ تو کوئی ایسا کام نہیں ہے جس کے لیے پریشان ہوا جائے۔" عنایا نے کہا۔ "میں ایسی کئی ایجنسیز کو جانتی ہوں جو یہی کام کرتی ہیں۔ ان کو کوآرڈی نیٹر کہا جاتا ہے۔"
"ارے واہ، تم کو یہ سب کیسے معلوم؟" رانی نے پوچھا۔
"میرا ایک خالہ زاد بھائی یہی کام کرتا تھا۔ اسی نے مجھے سب کچھ بتایا ہے۔ اب تو خیر وہ ملک سے باہر چلا گیا ہے۔ اس سے بہت کچھ معلوم ہوا تھا۔"
"میرے بارے میں کیا خیال ہے؟" عنایا نے پوچھا۔ "کیا میں ماڈلنگ کر سکتی ہوں؟"
"کر تو سکتی ہو لیکن تمہارے بارے میں کچھ اور میرے ذہن میں ہے۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ تمہاری زندگی بن جائے۔"
"وہ کس طرح؟"
"یہ میں بتا دوں گی۔ وقت آنے دو۔"
"بتا بھی دو یار۔" عنایا نے کہا۔
اس وقت وہ دونوں رانی کے فلیٹ ہی میں تھیں۔
"ٹھہرو، میں تمہیں کچھ دکھاتی ہوں۔" رانی مسکرا کر بولی۔ "دل تھام کر دیکھنا۔"
رانی نے اپنا موبائل آن کیا۔ اس میں سے ایک تصویر منتخب کر کے اس نے موبائل عنایا کے سامنے کر دیا۔
"کیا خیال ہے۔ کیسا ہے یہ نوجوان؟ دیکھو اس کو۔"
وہ ایک خوب صورت نوجوان تھا۔ عمر بھی چوبیس پچیس سے زیادہ نہیں تھی۔
"اس کا نام خرم ہے۔" رانی نے بتایا۔ "میرا خالہ زاد بھائی ہے۔ جرمنی میں رہتا ہے۔ انجینئر ہے۔"
"تو پھر تم مجھے یہ سب کیوں بتا رہی ہو؟" عنایا نے پوچھا۔
"ہم پاکستان میں اس کی شادی کرانا چاہتے ہیں۔" رانی نے بتایا۔ "لڑکی تلاش کر رہے ہیں اور میری نظر میں تم سے اچھی لڑکی اور کون ہو سکتی ہے۔"
"میں؟" عنایا بوکھلا گئی تھی۔ "لیکن میں کیسے؟"
"کیوں تم کیوں نہیں؟" رانی نے کہا۔ "تمہارا تو ابھی کوئی رشتہ بھی نہیں ہوا ہے۔ خرم بالکل اکیلا ہے۔ صورت تو دیکھ ہی لی ہے۔ خاندان میرا ہی ہے۔ اب جیسا بھی ہے تمہارے سامنے ہے۔ زندگی ناکامی میں گزری ہے۔ تو کیا ضروری ہے کہ ساری زندگی پریشانی میں رہو۔ والدین تو باہر کا رشتہ تلاش کرتے ہیں اور تم کو گھر بیٹھے مل رہا ہے۔"
"اس کا فیصلہ میں تو نہیں کر سکتی ہوں نا۔" عنایا نے کہا۔ ویسے اسے خود وہ نوجوان پسند آیا تھا۔
"ہاں، ہاں، کیوں نہیں۔ میں خود آنٹی سے بات کروں گی۔" اس دن رانی کے گھر سے واپسی پر عنایا بہت خوش تھی۔

☆☆☆

اس میٹنگ روم میں ایک خاص میٹنگ ہو رہی تھی۔ اس میٹنگ میں تین سرکاری عہدے دار موجود تھے۔ خفیہ ایجنسی اور پولیس کے کچھ اہلکار تھے۔ سب کے سامنے فائلیں کھلی ہوئی تھیں۔ ایک شخص کھڑا ہوا۔ وہ اپنی رپورٹ پیش کر رہا تھا۔
"سر! جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ یہ ریکٹ بہت پرانا ہے۔ ہمارے ملک سے لڑکیوں کو اچھی جاب کا جھانسا دے کر باہر بھیجا جاتا ہے۔ جہاں ان کی مجبوریوں کا فائدہ اٹھا کر انہیں سیکس ورکر بنا دیا جاتا ہے۔ وہ بے چاری لڑکیاں اس پر احتجاج بھی نہیں کر پاتیں اور اس طرح تباہ ہو جاتی ہیں۔ گھر والوں کو پتا بھی نہیں چلتا کہ ان کی لڑکیوں کے ساتھ کیا گزر رہی ہے۔"
"ان کو باہر بھیجنے کے لیے کسی ریکٹروٹنگ ایجنسی کا تو سہارا لیا جاتا ہوگا؟" کسی آفیسر نے پوچھا۔
"یس سر، ایسا ہی ہوتا ہے۔" اس نے بتایا۔ "ہم نے جس ایجنسی کا پتا لگایا ہے اس کا نام انڈس ہے۔ نسیم نام کا ایک آدمی اس ایجنسی کو چلا رہا ہے۔ وہ بہت شریف قسم کا انسان ہے بظاہر۔ اس کے خلاف ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ بس ایک بات کھٹکتی ہے کہ وہ صرف لڑکیوں کو باہر جاب دلواتا ہے، لڑکوں کو نہیں۔"

"کیا ان لڑکیوں کے گھر والوں سے معلومات حاصل کی گئی ہیں؟"
"یس سر لیکن بدقسمتی سے ان سب کا یہی کہنا ہے کہ ان کی لڑکیاں بہت آرام سے ہیں اور بہت عزت کی جاب کر رہی ہیں اور اچھے پیسے کما رہی ہیں۔"
"تو پھر یہ کیسے پتا چلا کہ وہ لڑکیاں باہر جا کر غلط ہاتھوں میں پڑ جاتی ہیں۔"
"اتفاق سے ایک لڑکی ہمارے ہاتھ لگ گئی تھی سر۔" اس نے بتایا۔ "اس کا نام روبینہ تھا۔ وہ لاہور کی رہنے والی تھی۔ اسے بھی جاب کا جھانسا دے کر باہر بھیجا گیا تھا۔ لیکن اس کی قسمت اچھی تھی۔ وہ تباہ ہونے سے پہلے اپنا پاسپورٹ لے کر بھاگ نکلی۔ ورنہ عام طور پر یہ لوگ پاسپورٹ اپنے پاس رکھ لیتے ہیں۔ اس طرح لڑکیاں بے بس ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس لڑکی نے ہمیں ساری بات بتا دی۔ ہم نے اس ایجنسی پر چھاپا مارا لیکن وہاں سے کچھ بھی پتا نہیں چلا۔ کیونکہ ان لوگوں نے سرے سے اس بات سے ہی انکار کر دیا کہ وہ لڑکیوں کی ریکروٹنگ کا کام کرتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ لڑکیوں کے علاوہ لڑکوں کو بھی بھیجتے ہیں۔ ان کے پاس درجنوں ثبوت تھے اور جن لڑکیوں کو انہوں نے بھیجا ہے، ان کو کوئی شکایت نہیں ہے۔"
"سوال پھر وہی ہے کہ کیسے پتا چلا کہ وہ لڑکیاں برباد ہو رہی ہیں۔ صرف ایک لڑکی کے بیان پر کیسے یقین کر لیا گیا؟"
"اس لیے کہ وہ لڑکی جس طرح کی کہانی سنا رہی تھی۔ وہ سچ ہی معلوم ہوتی تھی۔" اس نے کہا۔ "وہ اپنے ساتھ کچھ اور لڑکیوں کے پتے بھی لائی تھی۔ جن کے ساتھ ایسا سلوک ہو رہا ہے۔ یہ ملک کو بدنام کرنے کی گھناؤنی سازش ہے۔"
"کیا اس قسم کا کام کرنے والی ایک ہی ایجنسی ہے؟" سوال کیا گیا۔
"نو سر، تین ایجنسیاں ہیں اور بظاہر ہر ایک کا دامن صاف ہے۔"
"پھر کس گراؤنڈ پر انہیں پکڑا جائے؟"
"میری نظر میں ایک لڑکی آ گئی ہے سر۔ جو اس قسم کا کام کرتی ہے۔ وہ لڑکیوں کو ماڈلنگ کا جھانسا دے کر اس ایجنسی کے حوالے کر دیتی ہے اور وہ لڑکیاں ایکسپورٹ کر دی جاتی ہیں۔ اس لڑکی کو قابو میں کرنے کے لیے مجھے بہت کام کرنا پڑا ہے سر۔ میں بھکاری بن کر ایک شاپنگ مال کے سامنے فٹ پاتھ پر بیٹھا رہا ہوں۔ کیونکہ اس لڑکی کا شاپنگ مال میں آنا جانا ہے۔"
"ظاہر ہے وہ وہاں شاپنگ کے لیے جاتی ہوگی؟"
"نو سر، وہ وہاں لڑکیوں کو پھانسنے کے لیے جاتی ہے۔ اسی لیے وہ ہفتے میں کم از کم تین چار بار اس مال میں جاتی ہے اور اپنا شکار پھانس لیتی ہے۔ بس وہ لڑکی قابو میں آ جائے تو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔"
"اور وہ آپ کے قابو میں کیسے آئے گی؟"
"آ جائے گی سر۔ میں ایک اور لڑکی سے اس ایجنسی کے لیے کام لے رہا ہوں۔ وہ لڑکی اسی ایجنسی میں جاب کرتی ہے۔ وہ ایک سیدھی سادی لڑکی ہے لیکن محب وطن ہے۔ وہ لڑکی اس ایجنسی کی خبریں دیا کرے گی اور اسی بنیاد پر ہم اس ایجنسی کو اپنی گرفت میں لے سکیں گے۔"
"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ایجنسی کے خلاف ڈائریکٹ کارروائی کیوں نہیں کرتے؟"
"کیونکہ وہ ایک بڑے لیڈر کی ایجنسی ہے۔ سامنے کوئی اور آدمی ہے۔ پیچھے کوئی اور ہے اور جب تک ہمارے اہلِ اقتدار دولت کی ہوس ختم نہیں کریں گے۔ یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ مقامی پولیس کوئی کارروائی نہیں کر سکتی۔ کیونکہ وہ ایک طاقتور آدمی ہے۔"
"کیا قانون سے بھی زیادہ طاقتور؟"
"یس سر، ہمارے یہاں اس قسم کے نام نہاد لیڈر کبھی کبھی قانون سے زیادہ طاقتور ثابت ہو جاتے ہیں۔"

☆☆☆

نورین شہزاد سے ملاقات کے بعد بہت پُرجوش بھی تھی اور الجھی ہوئی بھی تھی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اسے کبھی اس قسم کے حالات کا سامنا.... کرنا پڑے گا۔ اس دفتر میں سب کچھ اسے ٹھیک ہی معلوم ہوتا تھا لیکن اب وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ اس کا دفتر صرف لڑکیوں ہی کو ملک سے باہر یوں بھیجتا ہے؟ اس نوجوان نے اس کے ذہن میں ایک سوال کھڑا کر دیا تھا۔
اس دن اس نے معمول کے مطابق اپنی ڈیوٹی ادا کی اور دفتر سے آف ہو کر جانے لگی تھی کہ اس کے باس نسیم نے اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔
ویسے تو وہ کام کے سلسلے میں اسے بلایا ہی کرتا تھا لیکن اس دن اس کا بلانا اسے پریشان کر گیا تھا۔ کئی سوالات تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ باس کو پتا چل گیا ہو کہ وہ کسی خفیہ ایجنسی کے آدمی سے ملی ہے۔
وہ ڈرتے ڈرتے باس کے کمرے میں داخل ہوئی۔

اس کمرے میں اس وقت ایک اور لڑکی بیٹھی تھی۔ نورین اس لڑکی کو پہچانتی تھی۔ اس دفتر میں اس کا آنا جانا تھا۔ وہ سیدھے باس ہی کے پاس جاتی تھی۔ اس کا نام رانی تھا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' نسیم نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

وہ رانی کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''نورین! تم ان کو پہچانتی ہو؟'' نسیم نے پوچھا۔

''یس سر! یہ اس دفتر میں آتی جاتی ہیں۔'' نورین نے جواب دیا۔

''ان کا نام رانی ہے۔'' نسیم نے بتایا۔ ''انہیں تم سے ایک کام ہے۔''

''مجھ سے؟'' نورین حیران رہ گئی تھی۔ ''مجھ سے کیا کام ہوسکتا ہے سر؟'' نورین نے پوچھا۔

''میں بتاتی ہوں۔'' رانی نے کہا۔ ''مجھے بہت دنوں سے اپنے آفس کے لیے تم جیسی لڑکی کی ضرورت تھی۔ نسیم صاحب میرے رشتے دار ہوتے ہیں۔ اسی لیے اس دفتر میں میرا آنا جانا ہوتا ہے۔ میں نے ان سے کہہ رکھا تھا کہ مجھے کوئی اچھی سی ورکر دلائیں۔ انہوں نے کہا کہ میرے دفتر آکر دیکھ لو کئی لڑکیاں کام کرتی ہیں۔ میں نے تمہارا انتخاب کرلیا ہے۔ اب تم میرے آفس میں میرا ہاتھ بٹایا کروگی۔''

''آپ کے دفتر میں کیا کام ہوتا ہے؟'' نورین نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے دفتر کا نیچر آف بزنس کیا ہے؟''

''وہ ایک میرج بیورو ہے۔'' رانی نے بتایا۔ ''وہاں بہت اچھے خاندانوں کے رشتے طے ہوتے ہیں اور وہ بھی بغیر کسی معاوضے کے۔ یعنی ہم کوئی فیس نہیں لیتے۔''

''میں آپ کے میرج بیورو میں کیا کرسکتی ہوں؟'' نورین نے پوچھا۔

''کلائنٹس کو ہینڈل کرنا۔'' رانی نے کہا۔ ''جو لوگ رشتے کے لیے آتے ہیں، ان کو گائیڈ بھی کرنا اور مناسب رشتوں کا سلیکشن بھی کرنا۔''

''نورین، رانی نے مجھ سے کہا تھا کہ انہیں کوئی ایسی لڑکی چاہیے جو ان کے میرج بیورو کو سنبھال سکے۔ میرے ذہن میں تمہارا نام آیا اور میں نے تمہارے بارے میں بتا دیا اور اب یہ تمہارے سامنے ہیں۔''

''نورین! میرا میرج بیورو چاہے جیسا بھی ہو لیکن وہاں تمہاری سیلری یہاں سے پانچ ہزار روپے زیادہ ہو گی۔''

نورین کے لیے یہ ایک اچھی آفر تھی۔ اس نے نسیم کی طرف دیکھ کر گردن ہلا دی۔ ''اوکے سر، آپ کہہ رہے ہیں تو میں یہ آفر مان لیتی ہوں۔''

''تو پھر کل ہی سے دفتر جوائن کرلیں۔''

نورین اس کمرے سے باہر آئی۔ اس کے باہر جانے کے بعد رانی نے نسیم کی طرف دیکھا۔ ''اچھی لڑکی ہے ہمارے کام آئے گی۔''

''خدا مجھے معاف کرے رانی، میں بہت پستی میں گرتا جارہا ہوں۔'' نسیم نے کہا۔

''اس کا احساس مجھے بھی ہوتا ہے لیکن ہمارے پاس کوئی آپشن نہیں ہے۔ اس کے مطالبات پورے کرنے پڑتے ہیں ورنہ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔''

نسیم کا چہرہ بجھ گیا تھا۔

☆☆☆

ایک ذرا سی غلطی تھی۔ نسیم کو پیسوں کی سخت ضرورت تھی۔ وہ ایک ایماندار آدمی تھا۔ اس نے اب تک اپنے فرائض بہت خلوص اور سچائی سے ادا کیے تھے۔ صرف دو لاکھ روپے۔ اس کے لیے اس کی عزت داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ وہ ایک سرکاری محکمے میں کام کرتا تھا۔ سڑکوں کے ٹھیکے کے ٹینڈر پاس کرنا اس کی ذمّے داری تھی۔ وہ الجھن میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک ٹھیکیدار اس کے پاس آگیا۔ نسیم کے محکمے میں وہ کئی بار کام کرچکا تھا۔

''سر جی، میں آپ کے پاس ایک کام سے آیا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن آپ یہ نہ سمجھیں کہ مجھے کسی قسم کے ٹھیکے کی ضرورت ہے اس لیے آیا ہوں۔''

''تو پھر بتاؤ دلدار، میں تمہارے کیا کام آسکتا ہوں؟''

''کام یہ ہے کہ جو میں کہوں آپ اس سے انکار نہیں کریں گے۔'' دلدار نے کہا۔

''بتاؤ تو سہی۔'' نسیم نے کہا۔

دلدار نے اپنی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر نسیم کے سامنے رکھ دی۔ ''یہ لیں، یہ دو لاکھ روپے ہیں اور آپ کے لیے ہیں۔''

''لیکن کیوں؟'' نسیم حیران رہ گیا۔

''اس لیے کہ آپ کو ابھی ان کی ضرورت ہے۔'' دلدار نے کہا۔ ''اب یہ چھوڑیں کہ مجھے کیسے پتا چلا اور دوسری بات یہ ہے کہ میں کسی کام کے لیے نہیں کہہ رہا۔ مجھے کوئی ٹھیکا نہیں چاہیے۔ کچھ بھی نہیں چاہیے۔ اپنے ذہن سے یہ خیال نکال دیں۔''

''تو پھر؟'' نسیم حیران رہ گیا۔

''مجھ سے یہ دیکھا نہیں گیا کہ آپ جیسا ایماندار اور بااصول انسان معمولی سی رقم کے لیے پریشان ہوتا رہے۔ آپ بس یہ سمجھ لیں کہ خدا نے مجھے ایک نیکی کی توفیق دی ہے۔ انکار کرکے مجھے اس نیکی سے محروم نہ کریں۔''

نسیم سے کچھ بولا نہیں جارہا تھا۔ اسے دلدار کے لہجے میں خلوص محسوس ہوا تھا۔ انسان کے بھی کتنے روپ ہوتے ہیں۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ دلدار جیسا آدمی اس طرح اس کے کام آسکتا ہے۔ دو لاکھ اس کی پریشانی ختم کرسکتے تھے۔

''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کیا کہوں؟''

''کچھ نہ کہیں، جائیں اور اپنی پریشانی دور کریں اور ہاں میں بیرونِ ملک جارہا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ بہت دنوں تک میری آپ سے ملاقات بھی نہ ہو۔''

یہ پہلا موقع تھا کہ نسیم کے پاس اس طرح پیسے آگئے تھے اور وہ بھی کسی جبر یا دباؤ کے بغیر۔ اسے کوئی کام نہیں کرنا تھا۔ اس لیے اس کے ضمیر پر کوئی بوجھ بھی نہیں تھا اور وہ کسی حد تک مطمئن بھی تھا۔

پھر کچھ دنوں کے بعد اس کی ملاقات دلدار سے ہو گئی۔ وہ ایک شاپنگ سینٹر سے نکل رہا تھا جبکہ نسیم دفتر سے گھر جارہا تھا۔

دلدار اچانک اس کے سامنے آگیا تھا۔ ''ارے نسیم صاحب، آپ اس طرف کہاں؟''

''کیا ہوا دلدار، تم باہر نہیں گئے؟'' نسیم نے پوچھا۔

''نہیں نسیم صاحب۔ خاندان میں ایک ڈیتھ ہوگئی تھی۔ اسی لیے جانا کینسل ہوگیا۔ اب تین چار مہینے بعد جاؤں گا۔ آپ کہاں جارہے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''گھر کی طرف۔'' نسیم نے بتایا۔

''چلیں میں آپ کو ڈراپ کردیتا ہوں۔'' دلدار نے کہا۔

نسیم کچھ سوچنے کے بعد اس کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ راستے میں ایک شاندار سی کوٹھی کے سامنے دلدار نے گاڑی روک دی۔

''سر، اگر بُرا نہ مانیں تو میں صرف دو منٹ میں شاہد رانا صاحب سے مل کر آجاؤں۔''

''کون شاہد رانا؟'' نسیم نے پوچھا۔ ''وہ سیاست داں؟''

''جی ہاں، وہی بلکہ ایسا کریں آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔ شاہد صاحب بہت معقول انسان ہیں۔ آپ ان سے مل کر خوش ہوں گے۔''

نسیم کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا وہ اس کے ساتھ ہولیا۔ شاہد رانا سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک معقول انسان ثابت ہوا۔ اس کے دل میں اس قوم کا درد تھا۔ وہ ملک کی صورتِ حال پر بہت متفکر دکھائی دیتا تھا۔

اسی ملاقات میں شاہد رانا نے اسے ایک پیشکش کر دی۔ ''نسیم صاحب! آپ مجھے پسند آئے ہیں۔ آپ میں کام کرنے کا جذبہ بھی ہے اور صلاحیت بھی ہے۔''

''جی سر، بہت بہت شکریہ۔''

''میں ایک آفر دینا چاہتا ہوں۔ میں نے ایک ریکروٹنگ ایجنسی بنائی ہے جو ہنرمند خواتین اور لڑکیوں کو ملک سے باہر جاب دلوائے گی۔''

''جی؟ صرف لڑکیوں اور خواتین کو؟'' نسیم نے پوچھا۔

''ہاں کیونکہ یہ وہ طبقہ ہے جس کو چانس ہی نہیں ملتا۔ خاص طور پر پڑھی لکھی لڑکیوں کو۔ ان کے لیے ملک سے باہر جاکر عزت کی جاب کرنا ایک خواب کی طرح ہوتا ہے۔ ہم انہیں باعزت طور پر باہر بھیج کر ان کو باعزت جاب دلوائیں گے۔''

''سر یہ تو بہت نیک ارادہ ہے۔'' نسیم نے کہا۔

''میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ ایجنسی آپ سنبھال لیں۔'' شاہد نے کہا۔

''میں؟'' نسیم حیران رہ گیا۔

''جی ہاں، یہ سمجھ لیں کہ وہ ایجنسی آپ ہی کی ہوگی۔'' شاہد رانا نے کہا۔ ''میری پوزیشن ایسی ہے کہ میں سامنے نہیں آسکتا۔ طرح طرح کی باتیں ہونے لگیں گی۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ہماری قوم کا مزاج ایسا ہوگیا کہ ہم کسی سیاست داں کی غلطی برداشت کرنے کو تیار ہی نہیں ہوتے۔ دوسرے چاہے کچھ بھی کرتے رہیں۔''

''یس سر، اس بات کو سب محسوس کرتے ہیں۔''

''یہ سمجھیں کہ وہ ایجنسی آپ ہی کی ہوگی۔ میرا کہیں نام نہیں آئے گا۔''

نسیم کے لیے یہ ایک مشکل مرحلہ تھا لیکن دلدار نے بھی حوصلہ بڑھایا اور نسیم اس ایجنسی کا مالک بن گیا۔

☆☆☆

رانی کے گھر کے حالات بہت بُرے تھے۔ اس کا ایک ہی بھائی تھا لیکن وہ کسی کام کا نہیں تھا۔ وہ محلے کے لوفر لڑکوں کی صحبت میں پڑ کر تباہ ہو چکا تھا۔ اسی زمانے میں

اسے ہیروئن کی لت بھی لگ گئی تھی۔ اس کے اخراجات رانی اور اس کی ماں کی برداشت سے باہر تھے۔

اس نے بالآخر اسنیچنگ شروع کر دی۔ رفتہ رفتہ وہ ایک کرمنل بن گیا۔ اس کے بعد اس کا پتا نہیں چلا۔ خبر یہ ملی تھی کہ کسی واردات میں مارا گیا ہے۔ رانی اور اس کی ماں نے رو دھو کر صبر کر لیا۔

اب رانی کے لیے کوئی راہ نہیں تھی۔ وہ ایک پڑھی لکھی اور خوب صورت لڑکی تھی۔ ایک دن اسے ایک عورت جمیلہ مل گئی۔ اس نے رانی کو ایک ایسے ادارے کے سربراہ سے ملوا دیا جو ضرورت مند لڑکیوں کی مدد کیا کرتا تھا۔ اس ادارے نے رانی کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ ہر مہینے اسے دس ہزار مل جاتے تھے۔

پھر یہ ہوا کہ اس ادارے نے رانی کو ایک دفتر میں جاب دلوا دی۔ اس دفتر میں ماڈلنگ کی تربیت دی جاتی تھی۔ رانی کے لیے یہ ایک دلچسپ کام تھا اور یہاں پتا چلا کہ آنے والی لڑکیوں کو کس طرح بلیک میل کیا جاتا ہے۔ ان لڑکیوں کے قابلِ اعتراض پوز لیے جاتے تھے اور ان کو بلیک میل کیا جاتا تھا اور جب وہ بے چاریاں پوری طرح قابو میں آجاتیں تو انہیں طاقتور لوگوں کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔ پھر وہ کسی کام کی نہیں رہتی تھیں، وہ مجبور ہو جاتی تھیں۔

اس دوران رانی کی انکم میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس کے پاس گاڑی بھی آگئی تھی۔ وہ لوگ اس پرانے محلے کو چھوڑ چکے تھے۔ انہوں نے شہر کے ایک پوش علاقے کا ایک فلیٹ خرید لیا تھا۔

رانی پہلے تو اس جنجال سے نکلنا چاہتی تھی لیکن جب اس کی ملاقات ایک طاقتور سیاست داں سے ہوئی تو اس نے رانی کے خیالات ہی بدل دیے۔ یہ ملاقات ماڈلنگ کے اسی ادارے کے سربراہ نے کروائی تھی۔

اس سیاست داں نے کہا تھا۔ ''رانی! تم نے زندگی مفلسی اور شرافت میں رہ کر گزار لی۔ کیا ملا تمہیں کچھ بھی نہیں۔ تمہارا بھائی کیوں مارا گیا، بتاؤ؟ اسے کسی نے نہیں مارا۔ اس کی موت کی ذمے دار مفلسی ہے، کیا کرتا وہ؟ موبائل نہیں چھینتا، ڈاکے نہیں ڈالتا تو اور کیا کرتا؟ تم خود کو دیکھ لو، کیا ملا ہے تمہیں؟ کچھ بھی نہیں۔ تم اب محرومی کی زندگی نہیں گزارو گی۔ بلکہ تمہیں بہت آگے جانا ہے اور یہاں آگے جانے کا راستہ سیدھا نہیں ہوتا۔ اپنے آپ کو ٹیڑھا کر کے نکلنا پڑتا ہے۔ تم وہی کرو جو تم سے کہا جارہا ہے۔ پہلے تو یہ شرافت وغیرہ کا لبادہ اتار دو۔ کچھ نہیں رکھا ایسی شرافت میں، عیش کرو کہ یہ دنیا اسی لیے بنائی گئی ہے۔ بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔

اس کے بعد سے رانی نے اپنی جون ہی بدل لی۔ وہ ایسے راستوں پر چل نکلی جو راستے اسے اندھیری گھاٹیوں تک لے جاتے تھے۔ وہ بار بار برباد کی گئی اور اس نے اور بھی نہ جانے کتنی لڑکیوں کو برباد کیا۔ اسے کسی پر رحم نہیں آتا تھا۔ اس شخص نے کہا تھا کہ یاد کرو کہ جب تمہارے گھر میں فاقے ہوتے تھے تو کیا یہ معاشرہ تمہاری مدد کو آتا تھا؟ کبھی نہیں۔

اس نے رانی کو ایک میرج بیورو کا مالک بنا دیا۔ اس کی ملاقات نسیم سے کروائی گئی اور رانی کی معرفت لڑکیاں جاب کے بہانے ملک سے باہر جانے لگیں۔ وہ اب گلے گلے تک اس دلدل میں اتر چکی تھی۔ وہ اگر چاہتی بھی تو اس کی جان نہیں چھوٹ سکتی تھی۔

☆☆☆

عنایا نے جب کال ریسیو کی تو ایک اجنبی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو، مجھے عنایا سے ملنا ہے۔''

''جی بول رہی ہوں۔'' عنایا نے کہا۔ ''آپ کون؟''

''میرا نام خرم ہے، رانی کا خالہ زاد بھائی۔ شاید رانی نے میرے بارے میں بتایا ہوگا۔''

عنایا کا دل دھڑک اٹھا۔ یہ وہی ہو سکتا تھا رانی نے جس کے لیے کہا تھا جو بیرونِ ملک جاب کرتا تھا اور رانی عنایا سے اس کا رشتہ لگوا رہی تھی۔

''جی ہاں، سمجھ گئی۔'' عنایا نے کہا۔ ''فرمائیں۔''

''عنایا مجھے تم سے بہت ضروری ملنا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ پہلے ہم ایک دوسرے سے مل لیں۔ کیونکہ ہمارے درمیان ایک رشتہ قائم ہونے جارہا ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں کیسے مل سکتی ہوں؟'' عنایا نے کہا۔

''یہ بہت ضروری ہے عنایا۔ یہ زندگی کا سوال ہے۔ میری بھی اور تمہاری بھی۔ ہم کسی ہوٹل میں ملیں گے تاکہ تم کو کسی بات کا خدشہ نہ ہو۔''

عنایا نے اس قسم کی بہت سی باتیں سُن رکھی تھیں۔ جب شادی سے پہلے لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے سے مل لیتے تھے۔ دونوں کے درمیان انڈر اسٹینڈنگ ہو جاتی تھی۔ پھر

شادی کے بعد ایک خوشگوار زندگی گزارتے تھے اور ویسے بھی وہ کسی ہوٹل میں ملنے کو کہہ رہا تھا اسی لیے کوئی خدشہ بھی نہیں تھا۔

''ٹھیک ہے، میں مل لیتی ہوں۔'' عنایا نے کہا۔

''تو پھر تم ہوٹل بلیو اسٹار پہنچ جاؤ۔'' خرم نے کہا۔ ''وہ ایک مشہور ہوٹل ہے۔ وہاں کا ماحول بھی بہت اچھا ہے۔ تمہیں کوئی جھجک نہیں ہوگی۔''

''ہاں دیکھا ہے میں نے۔'' عنایا نے کہا۔

''تو پھر شام پانچ بجے میں تمہارا انتظار کروں گا۔'' خرم نے کہا۔

عنایا ٹھیک وقت پر ہوٹل پہنچ گئی تھی۔ خرم واقعی بہت مہذب اور خوش شکل نوجوان تھا جیسا رانی نے کہا تھا۔

دونوں جب بیٹھ چکے تو خرم نے پوچھا۔ ''کھانے میں کیا پسند کرو گی؟''

''کچھ نہیں۔'' عنایا نے کہا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہوٹل میں بیٹھنے کا جرمانہ تو دینا پڑے گا۔''

''تو پھر آئسکریم منگوا لیں۔''

خرم نے آئسکریم کا آرڈر دے دیا۔ ''یہ بتاؤ، رانی سے تمہاری دوستی کس طرح ہوئی تھی؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ پہلے اسی محلے میں رہتی تھی جہاں میں رہتی ہوں۔'' عنایا نے بتایا۔ ''پھر وہ لوگ محلہ چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ بہت دنوں کے بعد اس سے ملاقات ہوئی ہے۔''

''سمجھ گیا۔'' اس نے ایک ہنکارا بھرا۔ ''دیکھو، تم مجھے ایک سیدھی سادی لڑکی لگی ہو۔ میں تم سے صاف صاف کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ تم میری بات ذرا دھیان سے سنو۔ میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔'' خرم نے کہا۔

''یہی بات آپ مجھ سے فون پر بھی کہہ سکتے تھے؟'' عنایا کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔

''لیکن ایک اور بات سن لو۔'' اس نے کہا۔ ''مجھے تم ہی سے شادی کرنی ہے۔''

''جی، یہ کیا مذاق ہے؟'' عنایا بھڑک اٹھی تھی۔ ''کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''میری پوری بات سن لو پلیز۔'' اس نے کہا۔ ''میں رانی کے حوالے سے شادی نہیں کروں گا... بلکہ خود ہی شادی کروں گا۔''

''خرم صاحب، آپ نے تو مجھے الجھا دیا ہے۔''

حضور والا تیار! ہم حاضر ہیں

''تم سے ملنے سے پہلے میں خود الجھا ہوا تھا۔'' خرم نے کہا۔ ''یوں سمجھ لو کہ اندھیرے میں تھا لیکن اچانک روشنی مل گئی ہے۔ اب میں اس روشنی کو برقرار رکھنا چاہتا ہوں۔ بس میری یہ بات مان لو کہ رانی تمہارے لیے کوئی رشتہ لے کر آئے تو انکار کر دینا، سمجھیں اور میرا انتظار کرنا۔''

عنایا بہت الجھی ہوئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ شخص رانی کے بارے میں کیا کہہ رہا تھا۔ رانی سے کیوں خبردار کر رہا تھا۔

اس نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''رانی تو آپ کی خالہ زاد بہن ہے۔''

''نہیں، میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ وہ اسی قسم کی حرکتیں کیا کرتی ہے۔ میں تو اس کے لیے......'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا۔ ''میں تمہیں ایک مشورہ اور دے رہا ہوں، ان نیچرل گروتھ سمجھتی ہو؟''

''سمجھتی تو ہوں، لیکن آپ بتائیں؟''

''دیکھو عنایا، اگر کوئی تمہیں اچانک ترقی کرتا ہوا دکھائی دے جائے جبکہ کچھ دنوں پہلے اس کے پاس کچھ بھی نہ ہو اور اچانک اس کے پاس اپنا گھر بھی ہو جائے۔ گاڑی بھی آجائے تو سمجھ لو کہ ان نیچرل گروتھ ہو رہی ہے۔ یہ سب کچھ رات دن کی کڑی محنت اور سچی لگن سے بھی نہیں ہو سکتا۔

تم خود اندازہ لگا سکتی ہو کہ جس کو اس طرح دیکھو جان لو کہ کہیں نہ کہیں گڑبڑ ضرور ہے۔ بہرحال میں نے اشارہ دے دیا ہے۔ اب صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ رانی سے ملنے سے بھی پرہیز کرو۔ کوئی بہانہ کر دیا کرو۔ ورنہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

عنایا اس کی باتوں پر غور کرتی رہی۔ اس کی باتیں دل کو لگ رہی تھیں۔ اس نے خود رانی اور اس کی ماں کے حالات دیکھے تھے اور اب یہ تبدیلی دیکھ رہی تھی۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ ترقی جب ان نیچرل ہو سمجھ لو کہ وہاں گڑبڑ ضرور ہے۔ رانی کی پوری ترقی ان نیچرل تھی۔

☆☆☆

رانی بہت الجھی ہوئی تھی۔ اس کو ایک ٹاسک دیا گیا تھا جو اسے ہر حال میں پورا کرنا تھا۔ کچھ سوچ کر اس نے نورین کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ وہ اس وقت اپنے میرج بیورو میں بیٹھی تھی۔

نورین جب اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ کسی سے فون پر باتیں کر رہی تھی۔

''یس سر، آپ فکر نہ کریں۔ سارے حالات قابو میں ہیں۔ ہاں، ہو جائے گا۔ میں اطمینان سے نہیں بیٹھی ہوں، اپنا کام کر رہی ہوں...... جی۔'' وہ دوسری طرف سے کچھ دیر سنتی رہی پھر اس نے فون بند کر دیا۔ نورین اس کے سامنے ہی کھڑی تھی۔

''بیٹھ جاؤ نورین، کھڑی ہوئی کیوں ہو؟'' اس کا لہجہ بہت نرم تھا۔

نورین اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''تم نے شاہد رانا کا نام تو سنا ہوگا۔''

''یس رانی صاحبہ، وہ بہت بڑے سیاست دان ہیں۔''

''مجھے ان کے پاس جانا ہے۔ میرا ایک پرسنل کام ہے۔ تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہوں۔''

''مجھے کیوں؟''

''نورین! تم بہت ذہین لڑکی ہو۔ بہت محنتی۔ یہ ٹھیک ہے کہ تم میرے آفس میں کام کرنے لگی ہو لیکن تم جیسوں کی یہ منزل نہیں ہونی چاہیے۔''

''آپ کی مہربانی ہے میڈم۔''

''اسی لیے تمہیں شاہد صاحب سے ملوانا چاہتی ہوں۔'' رانی نے کہا۔ ''تمہیں تو اندازہ ہوگا کہ وہ کتنے طاقتور انسان ہیں۔''

''جی...... میں نے بہت کچھ سن رکھا ہے۔'' نورین کو اندازہ ہو رہا تھا کہ شاید وہ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی ہے۔ شہزاد نے جس کام کے لیے کہا تھا اس کام کے کرنے کا وقت آ گیا تھا۔

وہ رانی کے کمرے سے نکل کر اپنے کیبن میں آئی۔ اس نے اپنا پرس اٹھایا اور کیبن سے باہر آ گئی۔

رانی اسی کے انتظار میں کھڑی تھی۔ نورین کا بڑا سا پرس دیکھ کر مسکرا دی۔ ''خیر تو ہے؟ کیا شاپنگ کا ارادہ ہے؟''

''ہاں، اگر واپسی میں وقت ملا تو شاپنگ بھی کر لوں گی۔''

رانی کی گاڑی جب شاہد رانا کے گھر کے احاطے میں داخل ہوئی تو نورین کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ زندگی میں پہلی بار ایسا کام کرنے جا رہی تھی۔ ایک مشن لے کر وہ رانی کے ساتھ آئی تھی۔ شہزاد نے شاہد رانا پر شبہ ظاہر کیا تھا لیکن ان لوگوں کے پاس اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا اور اتنی بڑی ذمے داری نورین کے کاندھے پر ڈال دی گئی تھی۔

شاہد رانا کا گھر بہت شاندار تھا۔ رانی اسے بے دھڑک ڈرائنگ روم میں لے آئی تھی۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اس گھر میں اس کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ نورین کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر کچھ دیر کا کہہ کر گھر کے اندر بھی چلی گئی تھی۔

نورین کے لیے یہ بہت اچھا موقع تھا۔ بس ذرا سی ہمت چاہیے تھی۔ اس نے اپنا بیگ کھولا۔ اس میں ایک چھوٹی سی ڈیوائس تھی جو اسے کمرے میں لگانی تھی۔ اس نے بہت پھرتی سے ڈیوائس آتش دان کے برابر ایک میز کے نیچے سیٹ کر دی۔

یہ ساری تیکنیک اسے شہزاد نے سکھا دی تھی۔ اس بگ کے ذریعے آوازیں کہیں دور جا کر ٹیپ ہو جاتی تھیں۔

اس وقت اس کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ سب کچھ پہلی بار ہو رہا تھا۔ جیسے وہ پہلی بار چوری کر رہی ہو۔ وہ صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔

رانی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ شاہد رانا بھی تھا۔ اس کے چہرے سے اس کی خباثت ظاہر ہو رہی تھی۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی۔ شراب نوشی کی کثرت نے آنکھوں کے گرد حلقے ڈال دیے تھے۔

نورین اسے دیکھ کر خوف زدہ سی ہو گئی تھی۔ اس کی

ہوس ناک نگاہیں نورین پر جم کر رہ گئی تھیں۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ آدمی قریب سے اتنا بھیانک بھی ہو سکتا ہے۔

''رانی نے تمہاری بہت تعریف کی ہے۔'' شاہد نے کہا۔ ''تم واقعی بہت خوب صورت لڑکی ہو۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ تم ہمارا ساتھ دو۔''

''میں...... میں کس طرح ساتھ دے سکتی ہوں؟'' نورین نے پوچھا۔

''دیکھو، تم سے کھل کر بات کرنی ہوگی۔'' شاہد نے کہا۔ وہ سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

اس وقت رانی نے کہا۔ ''اچھا سر مجھے اجازت دیں۔ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ نورین آپ کے سامنے ہیں۔ آپ ان کو اپنی آفر بتا دیں باقی یہ اپنی مرضی کی مالک ہیں، میں چلتی ہوں۔''

''آپ کہاں جا رہی ہیں؟'' نورین پریشان ہو کر بولی۔ ''میں آپ کے ساتھ ہی واپس جاؤں گی۔''

''ارے لڑکی، میں تمہیں کھا نہیں جاؤں گا۔'' شاہد نے کہا۔ ''دس منٹ بیٹھ جاؤ، چلی جانا، میری گاڑی تمہیں ڈراپ کر دے گی۔''

نورین نے رانی کی طرف دیکھا لیکن وہ خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گئی تھی۔

نورین کو اس بات کا اطمینان تھا کہ اس وقت اس کمرے میں جو باتیں ہو رہی ہیں، وہ کہیں نہ کہیں سنی جا رہی ہوں گی۔

''آپ کچھ کہہ رہے تھے؟'' اس نے شاہد رانا کی طرف دیکھا۔

''ہاں، میں یہ کہہ رہا تھا کہ تم ایک خوب صورت لڑکی ہو، تم میں ایک طرح کی جنسی کشش بھی ہے جو بہت کم میں ہوتی ہے۔''

نورین پہلو بدل کر رہ گئی۔ وہ ایسی باتیں سننے کی عادی نہیں تھی۔ ''آگے کہیں سر۔'' اس کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔

''برا مان گئیں۔'' وہ ہنس دیا۔ ''میں نے ایک خاص مقصد سے تمہارے حسن کی تعریف کی ہے۔ میں زندگی کی دوڑ میں تمہیں بہت آگے دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں اپنی سیکریٹری بنانا چاہتا ہوں۔ پرسنل سیکریٹری۔ جو اپنے باس کی ہر بات سے واقف ہوتی ہے۔ تمہاری تنخواہ ایک لاکھ روپے مہینا ہوگی۔''

''لیکن میرا کام کیا ہوگا؟'' نورین نے پوچھا۔

''وہی بتانے جا رہا تھا۔ تمہارا کام آسان بھی ہوگا اور مشکل بھی۔'' شاہد رانا نے کہا۔ ''میں تمہیں تفصیل سے سمجھاتا ہوں کہ تمہیں کرنا کیا ہوگا۔''

☆☆☆

اس وقت اس کمرے میں شہزاد کے علاوہ کچھ اور بھی بااختیار لوگ موجود تھے۔ ایک ڈیوائس سے شاہد رانا کی آواز آ رہی تھی۔ اس کی باتوں کو ریکارڈ کیا جا رہا تھا۔ شاہد اپنی اسکیم بتا رہا تھا۔

وہ نورین کو چارے کے طور پر اپنے مخالف سیاست دانوں کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ وہ نورین سے کہہ رہا تھا کہ چونکہ الیکشن قریب ہے۔ اسی لیے نورین کو تیزی سے کام کرنا ہوگا۔ سب سے پہلے اسے درانی پر ہاتھ ڈالنا ہے۔ درانی ایک شریف سیاست داں تھا۔ لوگوں میں اس کی مقبولیت بھی تھی اور عزت بھی۔ درانی اسی حلقے سے کھڑا ہو رہا تھا جو حلقہ شاہد رانا کا تھا۔

شاہد رانا، درانی کو جنسی اسکینڈل میں بدنام کر دینا چاہتا تھا۔ اس کے لیے اس نے نورین کا انتخاب کیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ نورین کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ اسے کسی طرح درانی کے قریب پہنچا دیا جائے گا۔ وہ درانی کو اپنے اعتماد میں لے گی۔ اس کے بعد اس پر جنسی طور پر ہراساں کرنے کا الزام لگا دے گی۔ اس نے کہا تھا آج کل یہ بہت عام ہو گیا ہے۔ جنسی طور پر ہراساں کرنے کا الزام لگا دو۔ بس اس کا کام تمام ہو گیا۔ سچ اور جھوٹ کا فیصلہ تو بعد میں ہوتا رہے گا۔ بس ایک پریس کانفرنس۔ ایک عدد الٹی سیدھی کتاب۔ جس کا وہ خود بندوبست کر دے گا۔ اس کے علاوہ بھی اس نے بہت کچھ کہا تھا۔

باتوں کے دوران اس نے یہ اعتراف بھی کر لیا تھا کہ اس کی ریکروٹنگ ایجنسی لڑکیوں کو باہر بھیج دیتی ہے اور ان لڑکیوں کو وہاں کے ایجنٹ نیلام کا مال بنا دیتے ہیں۔ اس کے مال کی کھپت دنیا کے کئی ملکوں میں ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ۔

اس ریکارڈنگ نے سب کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ سب سر تھام کر رہ گئے تھے۔ کچھ دیر تک خاموشی رہی تھی۔

''مسٹر شہزاد! شاہد جس لڑکی کے سامنے یہ سب کہہ رہا ہے وہ خود کیسی ہے؟'' کسی نے پوچھا۔

''وہ بہت شریف لڑکی ہے سر۔'' شہزاد نے جواب دیا۔ ''اس نے یہ سب ملک اور قوم کی محبت میں کیا ہے۔ اس کو ڈیوائس استعمال کرنے کی تکنیک بھی میں نے سکھائی تھی۔ اس نے اپنی عزت اور جان کی پروا نہ کرتے ہوئے اتنا بڑا قدم اٹھا لیا ہے۔''

"ایسی لڑکیاں احترام کے قابل ہوتی ہیں۔"

"یس سر، اس میں کوئی شک نہیں ہے۔"

"سوال یہ ہے کہ اب کیا کیا جائے؟" ایک آفیسر نے پوچھا۔ "اس میں کوئی شک نہیں کہ اس شخص کے خلاف ہمارے پاس ثبوت آگیا ہے لیکن ہم اس پر ہاتھ اس لیے نہیں ڈال سکتے کہ اس طرح ہمارے ملک کی بدنامی ہوگی۔ لوگوں کا سیاست دانوں پر اعتماد ختم ہوجائے گا۔"

"ہر سیاست داں تو ایسا نہیں ہے سر۔ بہت سے صاف کردار کے بھی ہیں۔"

"اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ لیکن الیکشن کے قریب یہ اسکینڈل ملک کی بدنامی کا سبب بن جائے گا۔ دشمن ویسے ہی تاک میں رہتا ہے۔ وہ نمک مرچ لگا کر اس اسکینڈل کو آسمان تک پہنچادے گا۔"

"تو پھر کیا کیا جائے؟"

"سر، ان تمام سوالوں کے جواب سے پہلے مجھے اس معصوم اور محب وطن لڑکی کا خیال ہے جو اس کام کے لیے آمادہ ہوئی ہے۔ خدا کرے کہ وہ شاہد کے گھر سے خیریت کے ساتھ باہر نکل آئے۔"

☆☆☆

نورین اس گھر سے باہر آگئی تھی۔ اس نے اپنا کام کر دیا تھا۔ جو ذمے داری اسے دی گئی تھی، وہ اس نے پوری کر دی تھی۔

شاہد رانا کے ڈرائیور نے اس کے کہنے پر اسے محلے کے باہر ہی اتار دیا تھا۔ اسے اپنی امی کے لیے کچھ چیزیں لینی تھیں۔ وہ دکان میں داخل ہو رہی تھی کہ شہزاد اس کے سامنے آگیا۔

نورین اسے دیکھ کر خوش ہوگئی تھی۔ "چلو کہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" شہزاد نے کہا۔ "ویسے اتنا بتا دوں کہ مجھے تم پر فخر ہے۔"

دونوں ایک ہوٹل میں آکر بیٹھ گئے۔ "جانتی ہو، مجھے صرف تمہاری فکر تھی۔" شہزاد نے کہا۔ "میں ڈر رہا تھا کہ کہیں تم پھنس نہ جاؤ لیکن خدا کا شکر ہے کہ تم اس گھر سے نکل آئیں اور ہمارا کام ہوگیا۔ اس کی ساری گفتگو ریکارڈ ہوچکی ہے۔"

"کیا آپ لوگ اسے پکڑ لیں گے؟"

"ابھی وہ مرحلہ دور ہے۔" شہزاد نے کہا۔ "بہت سی دشواریاں ہیں۔"

"میرے لیے کیا حکم ہے، میں کیا کروں؟" نورین نے پوچھا۔

"تم اب اس دفتر کو چھوڑ دو۔" شہزاد نے کہا۔ "ہمیں سب سے پہلے اس لڑکی رانی کو اٹھانا ہے۔ کیونکہ وہ بہت کچھ جانتی ہے۔ میں نے اپنے طور پر تحقیق کی ہے۔ وہ ایک شریف گھرانے کی شریف سی لڑکی تھی۔ غربت میں زندگی گزاری ہے پھر نہ جانے کیسے ان چکروں میں پھنس گئی۔ بہر حال اس نے جو کچھ کیا ہے، اس کی سزا تو ملے گی۔ اس نے اپنے میرج بیورو اور ٹیم کے ساتھ مل کر درجنوں لڑکیوں کو برباد کیا ہے۔ اس کی سزا تو اسے بھگتنا ہوگی۔"

"اس کے بعد میرا کیا ہوگا؟"

"تمہارا کیا ہونا ہے۔" شہزاد مسکرا دیا۔ "تم کو ایوارڈ دیا جائے گا۔"

"اور یہ ایوارڈ کون دے گا؟"

"میری امی۔" شہزاد مسکرا دیا۔ "وہ تمہارے انتظار میں ایوارڈ لیے بیٹھی ہیں، اگر تم چاہو تو۔"

نورین نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس کے سارے خواب ایک دم سے تعبیر بن کر اس کے سامنے آنے لگے تھے۔

☆☆☆

رانی کمرے میں تھی جب اس کی ماں کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں رانی کے لیے چائے تھی۔ وہ چائے ایک طرف رکھ کر رانی کے سامنے ہی بیٹھ گئی۔ وہ بہت گہری نگاہوں سے رانی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات رانی کے لیے بہت اجنبی سے تھے۔

"کیا بات ہے ماما، اس طرح کیا دیکھ رہی ہیں؟" رانی نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں بیٹا۔" رانی کی ماں نے ایک گہری سانس لی۔ "میں سوچ رہی ہوں کہ ہماری تربیت میں کہاں خرابی رہ گئی تھی۔ تم تو جانتی ہو کہ تمہارے ابو کیسے آدمی تھے؟"

"ہاں، جانتی ہوں میں۔" رانی کا لہجہ تلخ ہوگیا تھا۔ "زندگی بھر خود بھی مفلسی میں رہے اور ہمیں بھی مفلسی میں رکھا۔"

"لیکن اپنے ضمیر کا سودا کبھی نہیں کیا۔"

"کیا فائدہ ایسی ایمانداری کا؟ جب بچے بھوک سے تڑپ رہے ہوں۔ آپ ذرا پہلے کے حالات دیکھیں اور آج کی زندگی پر غور کریں۔ اب کیا نہیں ہے ہمارے پاس۔ سب کچھ ہے۔ اپنا شاندار فلیٹ ہے۔ اپنی گاڑی ہے، بینک بیلنس ہے۔ بھوک نام کی کوئی چیز ہمارے قریب نہیں آتی۔"

"لیکن سکون نام کی تو کوئی چیز نہیں ہے۔ میرا بیٹا بھی ہمارے پاس نہیں رہا۔"

"مفلسی نے اسے مجرم بنا دیا تھا اماں۔ یہ کیوں بھول رہی ہیں لیکن آج آپ کو یہ سب کیوں یاد آرہا ہے؟"

"آج خرم میرے پاس آیا تھا۔" اس نے بتایا۔ "وہی خرم جسے تم اپنا خالہ زاد بھائی ظاہر کرتی ہو۔ تم نے اس کی تین شادیاں کروائی ہیں اور آج تک ان لڑکیوں کا پتا نہیں چلا کہ وہ کہاں غائب ہوگئیں۔"

"غائب کہاں ہونا ہے، وہ سب باہر جا کر عیش کر رہی ہیں۔"

"وہ عیش نہیں ہے۔ قید کاٹ رہی ہیں۔ مجھے افسوس ہے میری رانی کہ تم نے میرے پیٹ سے جنم لیا ہے اور تم لڑکیوں کی تجارت کرتی ہو۔"

"کس نے بتایا؟"

"اسی خرم نے۔" اس کی ماں نے کہا۔ "میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں بیٹا، تم اس چکر سے نکل آؤ۔ بہت بری طرح پھنس گئی ہو۔"

"تو کیا، اس قسم کی زندگی آپ کو اچھی نہیں لگ رہی؟" رانی نے پوچھا۔

"نہیں، بالکل بھی نہیں۔" اس کی ماں نے کہا۔

"کمال ہے۔" رانی ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی میں بلا کا طنز تھا۔ "اماں! یہ سب تو آپ کو اس وقت سوچنا تھا جب میں پہلی بار اس گھر میں اپنا قیمتی موبائل لے کر آئی تھی۔ جب میں نے آپ کے ہاتھ پر دس ہزار رکھے تھے، میں نے یہ بتایا تھا کہ میں اپنی گاڑی خرید رہی ہوں، گھر میں نیا فرنیچر آیا تھا۔ جب ہم نے پرانا محلہ چھوڑ دیا تھا اور ہم نے ایک نیا شاندار فلیٹ لیا تھا۔ اس وقت اگر آپ میرا ہاتھ روک لیتیں، مجھے مار مار کر گھر میں بند کر دیتیں تو یہ سب کچھ نہیں ہوتا۔ اب میری واپسی ناممکن ہے اماں۔ ناممکن ہے۔"

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس کی ماں نے کہا۔ "خرم بتا رہا تھا کہ تم اس کی ایک اور شادی کروا رہی ہو؟"

"ہاں۔" رانی نے جواب دیا۔ اس کی آواز بہت بجھی ہوئی تھی۔

"اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ اس لڑکی کا نام عنایا ہے۔"

"جی ہاں، اس کا نام عنایا ہے۔"

"رانی، کیا یہ وہی عنایا تو نہیں ہے؟" اس کی ماں نے

پوچھا۔ "جو ہمارے محلے میں رہتی تھی۔"

"ہاں اماں، یہ وہی عنایا ہے۔" رانی نے جواب دیا۔ "لیکن اب اطمینان رکھیں۔ کہانی کچھ اور ہوگئی ہے۔ عنایا کی شادی خرم سے تو ہو رہی ہے لیکن اس میں میری اسکیم والی بات نہیں ہے۔ خرم اس کو پسند کرنے لگا ہے۔ وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس سے شادی کر رہا ہے۔ اسی طرح کی شادی جس طرح ہمارے گھروں میں ہوا کرتی ہے۔ اس کی ماں باقاعدہ خرم کا رشتہ لے کر عنایا کے گھر گئی تھیں۔ ان لوگوں نے یہ رشتہ قبول کرلیا ہے۔"

بولتے بولتے رانی کی آواز میں درد سمٹ آیا تھا۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اس کی ماں جانتی تھی کہ اس کے زخم ہرے ہوگئے ہیں۔ اس کے خواب ٹوٹ کر اس کی آنکھوں میں کرچیوں کی طرح اتر آئے ہیں۔ اس نے بھی دلہن بننے کے خواب دیکھے ہوں گے۔ لیکن اب زندگی نہ جانے اسے کن راستوں پر لے گئی تھی۔ وہ تو بہت اچھی لڑکی تھی پھر یہ سب کیا ہوگیا تھا۔

رانی کی ماں بھی رونے لگی۔

☆☆☆

شاہد رانا اور شہزاد آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ رانا غصے میں پہلو بدل رہا تھا۔ ایک عام سا انٹیلی جنس آفیسر اس کی حیثیت کو چیلنج کرنے اس کے گھر آگیا تھا۔

"آخر تم چاہتے کیا ہو؟" رانا نے پوچھا۔

"رانا صاحب، میں نہیں چاہتا بلکہ یہ بدقسمت ملک چاہتا ہے جس کی قسمت میں آپ جیسے لوگ لکھے ہیں جس کی اب کراہیں بھی دم توڑنے لگی ہیں۔ خدا کے لیے اب تو پیچھا چھوڑ دیں۔ اب بہت ہوگئی۔"

"آفیسر! تم شاید اپنے ہوش میں نہیں ہو۔"

"ہم لوگوں کو ہوش تو اب آیا ہے۔ یہ بے چارے عام لوگ تو چھوٹے موٹے جرائم کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے تیر مار لیا ہے۔ اصل تباہی تو آپ لوگ کر رہے ہیں۔ ملک کی عزت کو یورپ کے بازاروں میں نیلام کر رہے ہیں۔ نوکریوں اور شادیوں کے بہانے ہمارے ملک کی لڑکیوں کو باہر بھیج کر انہیں کال گرل بنا رہے ہیں۔"

"ک۔۔۔۔۔۔ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟"

"کتنے ثبوت چاہئیں؟ کیا ان بدنصیب لڑکیوں کی فہرست پیش کر دوں جن کو آپ نے برباد کیا ہے۔ یا ان لوگوں کے نام بتاؤں جو آپ کے لیے کام کرتے ہیں۔ ان میں سے کئی تو وعدہ معاف گواہ بن چکے ہیں۔ اور سب سے

بڑھ کر ایک اور ثبوت ہے ہمارے پاس۔''

''وہ...... وہ کیا ہے؟''

''خود آپ کا اعتراف۔'' شہزاد نے کہا۔

''میرا اعتراف؟''

''ہاں، جو آپ نے اس لڑکی کے سامنے کیا تھا، جسے آپ اپنی سیکریٹری بنا رہے تھے۔'' ایک منٹ رک جائیں۔ شہزاد صوفے سے اٹھ کر آتش دان کے پاس چلا گیا۔ نورین نے اسے بتا دیا تھا کہ اس نے وہ ڈیوائس کہاں چھپائی تھی۔ وہ ڈیوائس نکال کر رانا کے پاس آگیا۔ ''یہ دیکھیں رانا صاحب، یہ وہ ڈیوائس ہے جس کے ذریعے آپ کی ایک ایک بات ریکارڈ ہو چکی ہے۔ آپ کے پاس آنے والی نورین انٹیلی جنس کی کارکن ہے، سمجھے۔''

''میں، میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ میری پہنچ بہت اوپر تک ہے۔''

''معاف کیجیے گا شاہد صاحب...... بہت اوپر تو صرف اللہ کی ذات ہوتی ہے اور وہ بھی ان گھناؤنے جرائم کے لیے آپ کو معاف نہیں کرے گا۔ اس ملک کے قانون میں آپ کی گرفتاری بھی شامل ہے۔ اگر چاہیں تو اپنے ذرائع سے معلوم کر سکتے ہیں۔''

شاہد رانا، کچھ دیر تک پھٹی پھٹی نگاہوں سے شہزاد کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ایک آہ بھر کر سینہ تھام لیا تھا۔

اس کی کہانی ختم ہو گئی تھی۔

☆☆☆

میٹنگ میں شہزاد اپنا بیان ریکارڈ کروا رہا تھا۔ ''وہ پہلے سے دل کا مریض تھا۔ یہ جھٹکا برداشت نہیں کر سکا اور اسپتال جاتے جاتے اس کی موت ہو گئی۔ ایک طرح سے اس کے حق میں یہ بہتر ہوا۔ ورنہ اسے عدالتوں کا سامنا کرنا پڑتا۔''

''اور اس آدمی کا کیا ہوا جو ریکروٹنگ ایجنسی چلا رہا تھا؟''

''نسیم۔ وہ حقیقت میں ایک شریف انسان تھا سر۔ اس کی مجبوریوں نے اسے اس مقام تک پہنچا دیا تھا۔ وہ ایک طرح سے بلیک میل ہو رہا تھا۔ اسی لیے اس نے خودکشی کر لی۔ ایک لڑکی تھی رانی جو اپنی قسمت بدلنے کے چکر میں غلط راستوں پر چل نکلی تھی۔ اس کو اس کی ماں نے زہر دے کر مار دیا۔''

''ماں نے مار دیا؟''

''جی سر۔ وہ ایک شریف سیدھی سادی گھریلو عورت ہے۔ اسے اپنی بیٹی کی ایسی حرکتیں پسند نہیں تھیں لیکن وہ کچھ بول نہیں سکتی تھی پھر جب پانی سر سے گزر گیا تو اس نے اپنی بیٹی کو زہر دے کر مار دیا۔''

''اوہ، ایسے بھی لوگ ہیں ہمارے یہاں۔''

''یس سر۔ ہر قسم کے کردار ہیں۔ اچھے، بُرے، نیک، بدمعاش۔''

''تم نے اپنے بیان میں ایک لڑکی عنایا کا ذکر کیا تھا، اس کا کیا ہوا؟''

''اس کی شادی اس شخص سے ہو رہی ہے جسے رانی اپنا خالہ زاد بھائی ظاہر کرتی تھی۔ وہ اپنے گناہوں پر بہت شرمندہ ہے اور ہر قسم کی سزا بھگتنے کو تیار ہے۔''

''ایک اور لڑکی بھی ہے جس نے ڈیوائس رکھی تھی؟''

''سر، وہ لڑکی گرفتار ہونے والی ہے۔'' شہزاد نے بتایا۔

''گرفتار ہونے والی ہے، وہ کیوں؟ اس نے تو قانون کی مدد کی ہے، وہ کیوں گرفتار ہو گی؟''

''سر، اس کی گرفتاری کسی اور انداز کی ہے۔ اسے میں گرفتار کر رہا ہوں۔ شادی کے بندھن میں۔''

''اوہ۔'' سب مسکرا دیے۔ ''مبارک ہو۔ کیا تم سے شادی کے بعد بھی وہ ہمارے لیے کام کرے گی؟''

''کیوں نہیں سر۔ ملک اور قوم کے لیے وہ ہر وقت حاضر ہے۔''

''تم نے یہ نہیں بتایا کہ رانی کی ماں کا کیا ہوا؟''

''وہ پاگل ہو گئی ہے سر۔'' شہزاد نے بتایا۔ ''اس وقت وہ ایک پاگل خانے میں ہے۔''

اس میٹنگ روم کی فضا بہت بوجھل ہو گئی تھی۔

☆☆☆

وہ ایک بوڑھی عورت تھی جو پاگل خانے کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی رہتی اور بولتی رہتی۔

''ہٹاؤ، یہ سب...... یہ سارے نوٹ سامنے سے ہٹا لو۔ رانی، رانی دیکھ تو سہی۔ جلدی آ۔ یہ دیکھ، یہ نوٹ کس طرح سانپ بنتے جا رہے ہیں۔ ارے دیکھ تو سہی۔ یہ سب کس طرح سانپ بن رہے ہیں۔ ہٹا میرے سامنے سے، ہٹا دے۔ سب مجھ کو کاٹ لیں گے۔ رانی تو سنتی کیوں نہیں ہے؟ جلدی آ جا۔ جلدی آ جا۔ بھگا دے سب کو۔ آ جا۔'' اس کی آواز گونجتی رہتی۔ گونجتی رہتی۔

اس کی نگاہیں دور تک اس کا تعاقب کیا کرتی تھیں۔

مہوش کو اس کا اس طرح دیکھنا بہت بُرا لگتا تھا، وہ دوسرے مزاج کی لڑکی تھی۔ اس نے اب تک بہت سلیقے کی زندگی گزاری تھی۔ والدین کے انتقال کے بعد وہ اپنی پھوپی اور پھوپا کے گھر آ گئی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ لوگ اس کو طعنے دیں کہ ماں باپ کی موت کے بعد لڑکی نے پَر نکال لیے۔ اسے بہت بچ بچ کر چلنا تھا۔ ہر قسم کی نگاہوں

تجسّس کے عنصر کا بھی اپنا ایک حُسن ہے... خوبی ہے... جب تک انسان کھوج و تجسس میں مبتلا رہتا ہے، اس کے گرد... سرشاری و مسرت کا ایک اَن دیکھا جالا سا تن جاتا ہے... جیسے ہی علم و آگہی کا انکشاف ہوتا ہے... اس کی خوشی فنا ہو جاتی ہے... زندگی کے رازوں اور بھیدوں میں گِھرے کرداروں کا ہیجان...

عجلت میں کیے گئے فیصلوں کے پچھتاوے...... دونوں کو بہت جلدی تھی......

جلدی کا فیصلہ

فلزا غزل

سے خود کو محفوظ رکھتا تھا۔

وہ بہت خوب صورت تھی۔ سرو قد۔ آہو چشم۔ کسی رومانی شاعر کے خوابوں کی طرح۔ کالج میں بھی نہ جانے کتنے اس کے دیوانے تھے لیکن وہ سب کو نظرانداز کر دیا کرتی۔ اپنے حالات اور ماحول نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا۔

احتیاط کے باوجود وہ لڑکا اس کا تعاقب کیا کرتا۔ اس کی نگاہیں مہوش کے گرد گھوما کرتیں۔ ایسا لگتا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو لیکن اس کی ہمت نہیں ہو رہی ہو۔ یا پھر مہوش کے تیور سے اسے ڈر لگتا تھا۔

مہوش نے اس کے سامنے ایک پھل بیچنے والے آدمی کی دھجیاں اُڑا دی تھیں۔ وہ گھر کے کسی کام سے مارکیٹ کی طرف گئی تھی۔ اسے ایک جگہ آم دکھائی دے گئے۔ ہر باذوق کی طرح مہوش کو بھی آم بہت پسند تھے۔ وہ ایک آم والے کے پاس رک گئی۔

آم والا مہوش جیسی خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر لہک اٹھا۔ ”لے جائیں جی جو جی چاہے لے جائیں۔ آپ کے لیے بالکل آدھے دام پر۔“

مہوش نے تیوریاں چڑھا لیں۔ ”کیوں؟ کیا تم میرے رشتے دار ہو کہ میرے لیے آدھے دام پر دے رہے ہو۔“

”نہیں تو جی۔“ آم والا گڑبڑا گیا۔ ”میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ گاہکوں کو خوش کرنا میرا فرض بنتا ہے نا اور وہ بھی آپ جیسی گاہک کو۔“

مہوش نے اسے دو چار باتیں سنا دیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس نے ٹھیلے کے باٹ اور ترازو بھی اٹھا کر ایک طرف پھینک دیے۔ ”کمینے انسان، ابھی تیرا منہ توڑ کر رکھ دوں گی۔“

آم والا خاموش ہو گیا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں دو چار لوگ لڑکی کی حمایت میں نہ آجائیں۔ مہوش آگے بڑھ گئی۔ اسی وقت وہ اس کے سامنے آگیا جو اس کا پیچھا کیا کرتا تھا۔ اس کو دیکھا کرتا تھا۔ ”یہ لوگ بہت بدتمیز ہوتے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”آپ کہیں تو میں اس کی ٹھکائی کر دوں؟“

مہوش کو اس پر بھی غصہ آگیا۔ ”کیوں؟ تم کو مجھ سے ایسی کیا ہمدردی ہو رہی ہے۔ آئندہ مجھے اس طرح مخاطب مت کرنا۔ ورنہ راستے ہی میں تمہاری ٹھکائی کروا دوں گی۔“

اس نے گہری نگاہوں سے مہوش کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں غصہ یا ناراضی کا عنصر نہیں تھا بلکہ ایک دکھ تھا۔ جیسے اسے یہ توقع نہ ہو کہ مہوش اسے بھی جھڑک سکتی ہے۔ اس نے اپنا راستہ بدل لیا اور ایک طرف چلا گیا۔

مہوش اس دن بہت خراب موڈ لے کر گھر واپس آئی تھی۔ ایسے موقع پر اسے اپنی امی کی کمی بہت محسوس ہوتی تھی۔ وہ اس کے چہرے کو دیکھ کر ہی سمجھ جاتیں کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔ وہ اس کے لیے کھانا گرم کر کے لاتیں۔ اس کے پاس بیٹھ کر نرم لہجے میں دریافت کرتیں کہ اس کے ساتھ ہوا کیا ہے۔

لیکن اب کون پوچھنے والا تھا۔ وہ گھر آتی تو پھوپی اپنے کمرے میں ہوتیں۔ پھوپا اپنے دفتر میں ہوتے۔ گھر میں صرف فیاض ہوتا تھا۔ مہوش ابھی تک اسے سمجھ نہیں پائی تھی۔ وہ ایک خاموش طبیعت انسان تھا۔ کسی سے زیادہ بات نہیں کرتا تھا۔ مہوش کو بھی وہ سرسری ہی لیا کرتا تھا۔ مہوش کو اپنے حُسن پر بہت ناز تھا۔ لوگ اسے دیکھتے تو دیکھتے ہی رہ جاتے تھے۔ لیکن فیاض کو اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی تھی۔ اس کے لیے شاید بس اتنا ہی تھا کہ اس کے ماموں کی بیٹی ماموں کے انتقال کے بعد اس کے گھر آکر رہنے لگی ہے۔ اس کا اپنا بزنس تھا۔ وہ اپنی گاڑی میں جایا کرتا۔

ایک دن اس کی پھوپی نے کہا۔ ”بیٹا! فیاض کہہ رہا تھا کہ وہ تجھے بس اور ویگن پر کالج نہیں جانے دیا کرے گا۔ وہ اپنی گاڑی میں دفتر جاتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ تمہیں راستے میں ڈراپ کر دیا کرے گا۔ البتہ کالج سے واپس تمہیں خود ہی آنا ہوگا۔“

”نہیں پھپو، میں کہاں انہیں تکلیف دوں گی۔“

”ارے اس میں تکلیف کی کیا بات ہے۔ وہ تمہارے لیے کوئی غیر تو نہیں ہے۔“

اس طرح فیاض کے ساتھ اس نے کالج جانا شروع کر دیا۔

فیاض اس سے دس بارہ سال بڑا تھا۔ اس کی شادی ہو چکی تھی۔ بہت عجیب شادی تھی اس کی۔ پورے خاندان والوں نے اس کی شادی کے بارے میں صرف سنا تھا۔ فیاض نے گھر والوں سے چھپ کر شادی کی تھی اسی لیے اس شادی میں کوئی شریک نہیں ہوا تھا لیکن بیوی کو اس نے طلاق دے دی تھی۔

یہ ایسا موضوع تھا کہ مہوش نے کبھی اپنی پھوپی سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔

کچھ دنوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا پھر اس نے محسوس کیا کہ فیاض صرف اس کی وجہ سے اپنے دفتر جلدی جانے لگا

سے خود کو محفوظ رکھنا تھا۔

وہ بہت خوب صورت تھی۔ سرو قد۔ آہو چشم۔ کسی رومانی شاعر کے خوابوں کی طرح۔ کالج میں بھی نہ جانے کتنے اس کے دیوانے تھے لیکن وہ سب کو نظرانداز کردیا کرتی۔ اپنے حالات اور ماحول نے اسے خوف زدہ کردیا تھا۔

احتیاط کے باوجود وہ لڑکا اس کا تعاقب کیا کرتا۔ اس کی نگاہیں مہوش کے گرد گھوما کرتیں۔ ایسا لگتا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو لیکن اس کی ہمت نہیں ہورہی ہو۔ یا پھر مہوش کے تیور سے اسے ڈر لگتا تھا۔

مہوش نے اس کے سامنے ایک پھل بیچنے والے آدمی کی دھجیاں اُڑادی تھیں۔ وہ گھر کے کسی کام سے مارکیٹ کی طرف گئی تھی۔ اسے ایک جگہ آم دکھائی دے گئے۔ ہر باذوق کی طرح مہوش کو بھی آم بہت پسند تھے۔ وہ ایک آم والے کے پاس رک گئی۔

آم والا مہوش جیسی خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر لہک اٹھا۔ ''لے جائیں جی جو جی چاہے لے جائیں۔ آپ کے لیے بالکل آدھے دام پر۔''

مہوش نے تیوریاں چڑھالیں۔ ''کیوں؟ کیا تم میرے رشتے دار ہو کہ میرے لیے آدھے دام پر دے رہے ہو۔''

''نہیں تو جی۔'' آم والا گڑبڑا گیا۔ ''میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ گاہکوں کو خوش کرنا میرا فرض بنتا ہے نا اور وہ بھی آپ جیسی گاہک کو۔''

مہوش نے اسے دو چار باتیں سنادیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس نے ٹھیلے کے باٹ اور ترازو بھی اٹھا کر ایک طرف پھینک دیے۔ ''کمینے انسان، ابھی تیرا منہ توڑ کر رکھ دوں گی۔''

آم والا خاموش ہوگیا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں دو چار لوگ لڑکی کی حمایت میں نہ آجائیں۔ مہوش آگے بڑھ گئی۔ اسی وقت وہ اس کے سامنے آگیا جو اس کا پیچھا کیا کرتا تھا۔ اس کو دیکھا کرتا تھا۔ ''یہ لوگ بہت بدتمیز ہوتے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''آپ کہیں تو میں اس کی ٹھکائی کردوں؟''

مہوش کو اس پر بھی غصہ آگیا۔ ''کیوں؟ تم کو مجھ سے ایسی کیا ہمدردی ہورہی ہے۔ آئندہ مجھے اس طرح مخاطب مت کرنا۔ ورنہ راستے ہی میں تمہاری ٹھکائی کروادوں گی۔''

اس نے گہری نگاہوں سے مہوش کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں غصہ یا ناراضی کا عنصر نہیں تھا بلکہ ایک دکھ تھا۔ جیسے اسے یہ توقع نہ ہو کہ مہوش اسے بھی جھڑک سکتی ہے۔ اس نے اپنا راستہ بدل لیا اور ایک طرف چلا گیا۔

مہوش اس دن بہت خراب موڈ لے کر گھر واپس آئی تھی۔ ایسے موقع پر اسے اپنی امی کی کمی بہت محسوس ہوتی تھی۔ وہ اس کے چہرے کو دیکھ کر ہی سمجھ جاتیں کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔ وہ اس کے لیے کھانا گرم کرکے لاتیں۔ اس کے پاس بیٹھ کر نرم لہجے میں دریافت کرتیں کہ اس کے ساتھ ہوا کیا ہے۔

لیکن اب کون پوچھنے والا تھا۔ وہ گھر آتی تو پھوپی اپنے کمرے میں ہوتیں۔ پھوپا اپنے دفتر میں ہوتے۔ گھر میں صرف فیاض ہوتا تھا۔ مہوش ابھی تک اسے سمجھ نہیں پائی تھی۔ وہ ایک خاموش طبیعت انسان تھا۔ کسی سے زیادہ بات نہیں کرتا تھا۔ مہوش کو بھی وہ سرسری ہی لیا کرتا تھا۔ مہوش کو اپنے حُسن پر بہت ناز تھا۔ لوگ اسے دیکھتے تو دیکھتے ہی رہ جاتے تھے۔ لیکن فیاض کو اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی تھی۔ اس کے لیے شاید بس اتنا ہی تھا کہ اس کے ماموں کی بیٹی ماموں کے انتقال کے بعد اس کے گھر آکر رہنے لگی ہے۔ اس کا اپنا بزنس تھا۔ وہ اپنی گاڑی میں جایا کرتا۔

ایک دن اس کی پھوپی نے کہا۔ ''بیٹا! فیاض کہہ رہا تھا کہ وہ تجھے بس اور ویگن پر کالج نہیں جانے دیا کرے گا۔ وہ اپنی گاڑی میں دفتر جاتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ تمہیں راستے میں ڈراپ کردیا کرے گا۔ البتہ کالج سے واپس تمہیں خود ہی آنا ہوگا۔''

''نہیں پھپو، میں کہاں انہیں تکلیف دوں گی۔''

''ارے اس میں تکلیف کی کیا بات ہے۔ وہ تمہارے لیے کوئی غیر تو نہیں ہے۔''

اس طرح فیاض کے ساتھ اس نے کالج جانا شروع کردیا۔

فیاض اس سے دس بارہ سال بڑا تھا۔ اس کی شادی ہوچکی تھی۔ بہت عجیب شادی تھی اس کی۔ پورے خاندان والوں نے اس کی شادی کے بارے میں صرف سنا تھا۔ فیاض نے گھر والوں سے چھپ کر شادی کی تھی اسی لیے اس شادی میں کوئی شریک نہیں ہوا تھا لیکن بیوی کو اس نے طلاق دے دی تھی۔

یہ ایسا موضوع تھا کہ مہوش نے کبھی اپنی پھوپی سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔

کچھ دنوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا پھر اس نے محسوس کیا کہ فیاض صرف اس کی وجہ سے اپنے دفتر جلدی جانے لگا ہے۔ کئی دنوں کے بعد اس نے فیاض سے کہہ دیا۔ ''آپ میری وجہ سے جلدی آفس جانے لگے ہیں۔ میں اب خود سے آیا کروں گی۔ میں نے بس کا روٹ دیکھ لیا ہے۔ اسی لیے کل سے آپ ایسا نہ کیا کریں۔''

فیاض نے کچھ نہیں کہا۔ ایک ہنکارا لے کر رہ گیا۔ مہوش جھلا کر رہ گئی۔ خدا جانے کیسا آدمی تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو مہوش سے ہزار باتیں کرتا۔ ''ارے مجھے کیا تکلیف ہونی ہے۔ میرا تو راستہ ہی وہی ہے بلکہ تمہاری وجہ سے میرا تو فائدہ ہوا ہے۔ میں پہلے دیر سے دفتر جایا کرتا تھا لیکن تمہاری وجہ سے اب وقت سے پہلے پہنچ جاتا ہوں۔'' لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔ مہوش بس کے ذریعے کالج آنے جانے لگی۔

اس کے کچھ دنوں کے بعد ہی وہ نوجوان اس کی راہ میں آنے لگا تھا جس کی نگاہیں دور تک اس کا پیچھا کیا کرتیں اور اس وقت مہوش سوچتی کاش اس نے فیاض کو منع نہیں کیا ہوتا۔ کم از کم اتنا تو تھا کہ فیاض اس کا کزن تھا۔ کچھ تو اس کی حفاظت کر ہی سکتا تھا لیکن وہ پیچھا کرنے والا نوجوان بھی ایسا نہیں تھا کہ اس نے کبھی چھیڑ چھاڑ کی ہو۔ اس کا کام بس ایک ہی تھا۔ مہوش کو دیکھتے رہنا۔ فی الحال اس کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

ایک دن اس کی پھوپی فیاض کی ماں نے مہوش سے دل کی بات کہہ دی۔ ''بیٹا! میں جو کچھ کہہ رہی ہوں۔ اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ چونکہ تم یہاں رہ رہی ہو اسی لیے تم پر جبر کررہی ہوں۔''

''نہیں پھوپی بتائیں۔'' مہوش نے کہا۔

''بیٹا! تم دیکھ رہی ہو کہ فیاض اکیلا ہو کر رہ گیا ہے۔ بیوی کے جانے کے بعد اس نے تنہائی کو اپنا ساتھی بنا لیا ہے۔ بس دفتر کا ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کی زندگی میں کوئی خوشی نہیں ہے۔''

''ہاں پھوپی یہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں لیکن میں کیا کرسکتی ہوں؟''

''بیٹا! میں یہ چاہتی ہوں کہ فیاض سے تمہاری شادی ہوجائے۔'' پھوپی نے کہا۔

مہوش خاموش ہوگئی۔ فیاض اس کی نظر میں بھی ایک اچھا انسان تھا۔ اپنے کام سے کام رکھنے والا۔ سوبر سا۔ اس نے کبھی الٹی سیدھی بات نہیں کی تھی اور نہ ہی اس نے اپنی طرف سے ایسا کوئی اشارہ دیا تھا۔

''کیا سوچ رہی ہو بیٹا؟''

''کچھ نہیں پھوپی، جیسے آپ کی مرضی۔'' مہوش نے گردن جھکالی۔

''خوش رہو۔ تم نے میرے دل سے بوجھ اتار دیا۔ تم تو پہلے بھی میری بیٹی ہو۔ بہو بن جانے کے بعد اس گھر کی مالکن بھی ہوجاؤ گی۔''

اس رات وہ بہت دیر تک سوچتی رہی۔ وقت کیسا بے رحم ہوتا ہے۔ فیاض اسے بھی اس لیے پسند تھا کہ وہ ایک سلجھا ہوا انسان تھا لیکن اس نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ اس کے ساتھ اس کا جیون ساتھی بھی بننا ہوگا۔ بہرحال جو خدا کی مرضی۔

لیکن پھوپی کی خواہش پوری نہیں ہوسکی۔ فیاض نے شادی سے صاف انکار کردیا۔ ''نہیں، مجھے شادی نہیں کرنی۔''

''کیوں نہیں کرنی؟''

''بس یوں ہی۔'' فیاض نے کہا۔ ''آپ مہوش کی شادی کہیں اور کرادیں۔ میں خود اس کے لیے کوئی اچھا سا رشتہ تلاش کروں گا۔''

پھوپی سمجھاتی رہیں لیکن وہ انکار ہی کرتا رہا۔

مہوش کو بہت عجیب سا لگا تھا۔ اس میں ایسی کیا خرابی تھی کہ فیاض نے شادی سے انکار کردیا تھا۔ کیا وہ لڑکی مہوش سے اچھی تھی جس سے اس نے چھپ کر شادی کرلی تھی اور بعد میں وہ لڑکی خود اس سے بے وفائی کر گئی تھی۔ اس نے فیاض کو چھوڑ دیا تھا، کیوں؟

ایک دن اس سوال کا جواب مل ہی گیا۔ وہ مارکیٹ سے کچھ لے کر باہر نکل رہی تھی کہ ایک عورت اس کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔

وہ ایک جوان اور دلکش عورت تھی۔ ''تم مہوش ہو نا؟'' اس نے پوچھا۔

''جی ہاں، لیکن تم کون ہو؟'' مہوش حیران سی ہوگئی۔

''میں سارہ ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''تم نے مجھے نہیں دیکھا ہوگا۔''

''جی ہاں، میں نے پہلے نہیں دیکھا۔'' مہوش نے بتایا۔ ''تم کون ہو؟''

''تمہارے کزن کی سابقہ بیوی۔'' اس نے کہا۔

''کیا مطلب؟ فیاض...... فیاض کی۔'' مہوش سے کچھ کہا نہیں جارہا تھا۔

''ہاں اسی کی بیوی تھی پھر میں نے اس سے جان چھڑا لی۔'' اس نے کہا۔ ''تمہیں اس طرح پہچانتی ہوں کہ فیاض

نے تمہاری کئی تصویریں دکھائی تھیں۔''

''میری تصویریں؟'' مہوش حیران رہ گئی۔

''چلو کہیں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ یہاں کھڑے کھڑے کیا باتیں ہوں گی۔''

مہوش کو بھی بہت کچھ جاننے کا شوق ہو گیا تھا۔ وہ دونوں ایک ریستوران میں جا کر بیٹھ گئیں۔

''یہ اس وقت کی بات ہے جب میں اس کی بیوی تھی۔'' سارہ نے بتانا شروع کیا۔ ''چونکہ میں نے یہ شادی اپنے گھر والوں سے چھپ کر کی تھی اسی لیے ہم نے ڈکلیئر نہیں کیا تھا۔ دوسری طرف فیاض نے بھی اپنے ماں باپ سے شادی چھپائی تھی۔ اسی لیے ہم ایک دوسرے کے خاندان کو نہیں جانتے تھے۔ لیکن اس نے اپنے پورے خاندان کی تصویریں دکھائی تھیں۔ خاص طور پر تمہاری تصویریں۔ تمہاری تعریف کرتا تھا اسی لیے جب میں نے تمہیں دیکھا تو پہچان گئی پھر نام معلوم کر کے کنفرم بھی کر لیا۔''

سارہ اپنی باتوں سے بہت اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ بات کرنے کا انداز بھی اچھا تھا اور صورت کی بھی بہت معقول تھی۔ پھر ایسی کیا بات ہوئی تھی کہ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔

''سارہ تم مجھے بہت اچھی لگی ہو۔ میں نے یہ تو سنا تھا کہ فیاض نے شادی کر لی ہے لیکن علیحدگی کیوں ہوئی، یہ میں نہیں جانتی۔'' مہوش نے کہا۔

''یہ ایک عجیب داستان ہے۔ ہمارے درمیان علیحدگی اس لیے نہیں ہوئی کہ ہماری محبتوں میں کوئی کمی آ گئی تھی یا مجھے اس سے کوئی شکایت تھی۔ نہیں ایسی بات نہیں ہے بلکہ باہمی رضامندی سے یہ علیحدگی ہوئی تھی۔''

''تم بہت عجیب بات کہہ رہی ہو۔''

''ہاں ایسا ہی ہے۔'' سارہ نے ایک گہری سانس لی۔ ''وہ کسی عورت کے قابل نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟'' مہوش چونک گئی۔

''میرا خیال ہے کہ تم نے مطلب سمجھ لیا ہوگا۔ اس کو شادی کرنی ہی نہیں تھی۔''

مہوش کو یاد آیا کہ فیاض نے کس طرح مہوش سے شادی کرنے سے انکار کیا تھا۔ پھوپی کے حکم کے باوجود اس نے منع کر دیا تھا۔ اس وقت مہوش کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ فیاض ایسا کیوں کر رہا ہے لیکن اب بات سمجھ میں آ گئی تھی۔

''اگر ایسا ہی تھا تو وہ پھر تم سے شادی کرنے کو بے تاب کیوں ہو رہا تھا؟'' مہوش نے پوچھا۔ ''کیا اسے اپنی کمزوری کا علم نہیں تھا؟''

''ہاں۔ علم تھا اور یہ بات میں بھی جانتی تھی۔'' سارہ نے کہا۔ ''لیکن میں تو اس کی محبت میں اندھی ہو رہی تھی۔ میں نے یہ سوچا کہ کچھ دنوں کے علاج کے بعد وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ ایسی کئی کہانیاں میں سن چکی تھی پھر بعد میں اس وقت احساس ہوا کہ کسی عورت کی تکمیل ہی اس وقت ہوتی ہے جب وہ ماں بن جائے۔ ورنہ عورت ادھوری رہتی ہے۔ جب میں اپنے بھائیوں یا بہنوں کے بچوں کو دیکھتی تو دل پر نشتر سے چلنے لگتے۔ آہستہ آہستہ میرے اندر تلخیاں گھلنے لگیں۔ میں ایک بات بتا دوں کہ فیاض ایک بڑا انسان ہے۔ یہ میں کہہ رہی ہوں۔ وہ جو اس کی بیوی ہوا کرتی تھی۔ وہ ایک بڑا انسان ہے۔''

''تمہاری اس بات نے بھی اُلجھا دیا ہے۔'' مہوش نے کہا۔

''ہاں، لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔'' سارہ دھیرے سے بولی۔ ''یہ ایک عظیم قربانی کی کہانی ہے۔ وہ قربانی جو اس شخص نے میری خوشی کی خاطر دی ہے۔ اس نے مجھے اداس دیکھا تو پریشان ہو گیا۔ میں ان دنوں بہت پریشان رہنے لگی تھی۔ ہر وقت ایک ہی خیال رہتا۔ یا خدا! کیا میری گود یوں ہی خالی رہے گی؟ کیا میں کبھی ماں نہیں بن سکوں گی؟ میں یہ بتا چکی ہوں کہ میں نے اس کو کئی ڈاکٹر کو دکھایا لیکن ہر ایک کا یہی جواب تھا کہ یہ خامی چونکہ پیدائشی ہے۔ اسی لیے ٹھیک نہیں ہو سکتی۔''

مہوش بہت دھیان سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ یہ معما حل ہونے لگا تھا۔

''پھر یہ ہوا کہ فیاض نے صرف میری خوشی کی خاطر مجھے چھوڑ دیا۔''

''اگر چھوڑنا ہی تھا تو پھر شادی ... کیوں کی تھی؟'' مہوش نے تلخ ہو کر پوچھا۔

''میں نے بتایا نا کہ اسے امید تھی کہ اس کا علاج ممکن ہے۔ وہ ایک دن ٹھیک ہو جائے گا۔ اس چکر میں وہ انگلینڈ بھی گیا تھا لیکن وہاں سے بھی یہی جواب ملا۔ مختصر یہ کہ اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ مجھ سے مشورہ کر کے۔ مجھے اعتماد میں لے کر۔ میری خوشی کی خاطر۔ اس نے کہا کہ وہ میری زندگی برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ وہ نہیں چاہتا کہ میں اپنی محرومی کو لیے زندگی بھر روتی رہوں۔ اسی لیے وہ مجھے چھوڑ رہا ہے اور ہوا بھی یہی۔ میں نے دوسری شادی کر لی اور اب میں دو

پیارے پیارے بچوں کی ماں ہوں۔ تم اس کیفیت اس سرشاری کا اندازہ نہیں کر سکتیں۔ جب میرے بچے میری گود میں آتے ہیں تو سمجھ میں آ جاتا ہے کہ قدرت نے عورت کو کیوں پیدا کیا ہے؟''

مہوش بہت دیر تک خاموش رہی۔ دونوں کے درمیان یہ ایک عجیب ملاقات تھی۔ فیاض کی شادی کے حوالے سے دھند صاف ہو گئی تھی۔ اس وقت اسے اپنی پھوپی پر غصہ آ رہا تھا۔ جب انہیں فیاض کی اس کمزوری کا علم تھا تو پھر وہ کیوں چاہتی تھیں کہ مہوش اس سے شادی کر لے۔ کیا صرف اس لیے کہ وہ ان کے یہاں پرورش پا رہی تھی۔ وہ پھوپی کے فیصلے کے خلاف کچھ نہیں بول سکتی تھی؟

دوسری طرف اسے فیاض کا بھی دکھ ہو رہا تھا۔

کیا زندگی تھی اُس کی؟ ہمیشہ کی تنہائی اور ایسی تنہائی... کہ جس کا کوئی مداوا بھی نہیں تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اُلجھنوں میں کیا کرے۔ ایک طرف تو فیاض کا معاملہ تھا اور دوسری طرف وہ نوجوان تھا جو اس کا پیچھا کیا کرتا۔

اس نے کبھی مہوش کو چھیڑنے یا اسے نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ صرف اس کو دیکھتا رہتا تھا۔ اس کی نگاہوں میں حسرتیں ہوتیں یا مہوش کے لیے پیار کا جذبہ ہوتا۔ عورت ایسی نگاہوں کے تیور کو بھانپ لیتی ہے۔ اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ کون اسے کن نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔

وہ تعاقب کرنے والا نوجوان اس کے راستے میں کھڑا تھا۔

مہوش اسے دیکھ کر منہ پھیر کر آگے بڑھ گئی۔ اس دن پہلی بار اس کا دل چاہا کہ وہ اس کے پاس جا کر پوچھے کہ اسے تکلیف کیا ہے۔ وہ کیوں اسے ڈسٹرب کر رہا ہے؟ وہ آگے بڑھی ہی تھی وہ نوجوان اپنی گاڑی سے اتر کر اس کے پیچھے آنے لگا۔ اب مہوش سے رہا نہیں گیا۔ وہ ایک جگہ رک گئی۔ نوجوان کچھ جھجکتا ہوا اس سے کچھ فاصلے پر رک گیا۔

اس بار مہوش خود اس کے پاس چلی گئی تھی۔ وہ نوجوان اسے اپنے پاس دیکھ کر بوکھلا گیا۔

''مسٹر! کیا تکلیف ہے تمہیں؟'' مہوش نے سخت لہجے میں پوچھا۔

''جی...... وہ...... وہ......'' نوجوان نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ لیکن کہہ نہیں سکا۔

''تم نے خود کو کیا سمجھ رکھا ہے؟ کیوں میرا پیچھا کرتے رہتے ہو؟'' آواز دوں لوگوں کو۔ وہ ابھی تمہارا دماغ ٹھیک کر دیں گے۔''

''غضب ہو گیا...... کل امی نے مجھے تمہارے ساتھ موٹر سائیکل پر جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا!''

''اوہ......! یہ تو بہت برا ہو، تمہاری شامت آ گئی ہوگی۔''

''شام کو گھر گئی تو امی نے مجھ سے ایک طرف کا رکشے کا کرایہ واپس لے لیا...... بہت سخت ہیں میری امی!''

☆☆☆

''میں جلدی میں ہوں، بچے کی طبیعت خراب ہے۔''

''اوہو! تو تم نے چپکے سے شادی بھی کر ڈالی۔ بچہ تمہارا ہی ہے؟''

''نہیں...... میں نے اسپتال سے چرایا ہے۔''

حیدرآباد سے سیرینا وہاب کی حکمتِ عملی

''آپ نہیں سمجھیں گی۔'' اس نے کہا۔ ''میں بہت مجبور ہو کر ایسی حرکت کر رہا ہوں۔ ورنہ میں ایک شریف انسان ہوں۔'' اس نے اپنی جیب سے پرس نکال کر اس میں سے ایک تصویر نکال کر مہوش کے سامنے کر دی۔ ''یہ دیکھیں ناراض ہونے سے پہلے اس کو دیکھ لیں۔''

مہوش اس تصویر کو دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔ وہ جو بھی تھی۔ تقریباً مہوش ہی کی طرح تھی۔ وہی آنکھیں وہی چہرہ۔ سب کچھ وہی۔ اس تصویر کو دیکھ کر مہوش کے لہجے کی سختی پگھل گئی تھی۔

''یہ...... کس...... کس کی تصویر ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میری زندگی کی، جو اَب اس دنیا میں نہیں رہی۔'' اس نے بتایا۔ ''اسی لیے جب پہلی بار آپ کو دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ ایسا لگا جیسے میری دوست میری کوکب دنیا میں واپس آ گئی ہو اسی لیے آپ کا تعاقب کرتا ہوں۔ مجھے تسلی سی ہو جاتی ہے۔''

''کمال ہے اتنی مشابہت۔'' مہوش بڑبڑائی۔

''جی ہاں اسی لیے تو میں بھی پاگل ہو گیا تھا۔'' اس نے کہا۔ ''آپ نے بُرا مانا ہے...... آئندہ سے آپ مجھے نہیں دیکھیں گی۔''

''ارے، نہیں نہیں۔'' مہوش کو اس نوجوان پر ترس آنے لگا۔ ''آپ مجھ سے مل سکتے ہیں...... میں آپ کی مجبوری سمجھ گئی ہوں۔''

''بہت بہت شکریہ۔'' اس نے کہا۔ ''میرا نام جنید ہے۔ میں آپ سے خود ہی مل لیا کروں گا یا دیکھ لیا کروں گا۔ میرے لیے اتنا ہی بہت ہوگا، خدا حافظ۔'' وہ اپنی گاڑی کی طرف چلا گیا۔

مہوش کچھ دیر تک حیران سی کھڑی رہی۔ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ اگر کسی کو اپنے محبوب جیسی صورت شکل کا کوئی مل جائے تو وہ اس کو اپنا وہی محبوب سمجھ کر اس کے لیے دیوانہ ہو جاتا ہے۔

اس کے ذہن میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ ذرا سی دیر میں دو واقعات ہوئے تھے۔ ایک تو سارہ اس سے ملی تھی۔ فیاض کی سابقہ بیوی۔ اس نے فیاض کے بارے میں ایک افسوس ناک انکشاف کیا تھا اور دوسرا واقعہ یہ ہوا تھا۔

وہ پاگل نوجوان نہ جانے کیوں اس کی زندگی میں در آیا تھا۔ کیا لینا دینا تھا اس سے۔ وہ تو اس کو تعاقب کرتا دیکھ کر اس سے نفرت محسوس کرنے لگی تھی اور اب اس نوجوان نے نہ صرف راستہ روک کر اس سے بات کی تھی بلکہ اپنی مجبوری بھی بتا دی تھی۔ مہوش اُلجھی ہوئی گھر پہنچ گئی۔ فیاض گھر پر ہی موجود تھا۔

ہمیشہ کی طرح کسی کتاب میں کھویا ہوا۔ اس کی زندگی میں اب کتابوں کی خوشیاں رہ گئی تھیں یا پھر فطرت کے حسین مناظر اس کے دکھوں کا مداوا کر سکتے تھے۔ مہوش اسے سلام کر کے اپنے کمرے کی طرف جانے لگی کہ فیاض نے اسے آواز دے کر روک دیا۔ وہ فیاض کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔

''بیٹھ جاؤ۔'' فیاض نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

مہوش سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ''جی، کچھ کہنا ہے؟''

''ہاں۔'' فیاض نے ایک گہری سانس لی۔ ''بات یہ ہے کہ تمہیں میرا رویہ بہت بُرا لگا ہوگا کہ میں نے تم سے شادی سے کیوں انکار کیا۔ حالانکہ ہم دونوں ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ ایک ساتھ رہ رہے ہیں۔ تم میری عادتوں سے واقف ہو۔ اسی طرح میں بھی تمہارے بارے میں جانتا ہوں پھر بھی میں نے انکار کر دیا، کیوں؟ کیا تم نے کبھی یہ سوچنے کی کوشش کی؟''

''نہیں فیاض صاحب! میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔'' اس نے شاید پہلی بار فیاض کو صاحب کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ فیاض نے اسے چونک کر بھی دیکھا تھا۔

''اگر تمہارے دل میں کوئی خیال نہیں آیا تو تم ایک حیرت انگیز لڑکی ہو۔'' فیاض نے کہا۔

''ایسا ہی سمجھ لیں۔'' مہوش کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ ''بات یہ ہے کہ ہم لڑکیاں اچھی طرح جانتی ہیں کہ ان کی ورتھ کیا ہے۔ انہیں کس انداز میں اپنے آپ کو بچا کر زندگی گزارنی ہے۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو لیکن میرے انکار کی ایک خاص وجہ ہے جو میں تمہیں بتانا نہیں چاہتا۔''

مہوش کا دل چاہا کہ وہ سارہ سے اپنی ملاقات کا احوال بتا دے لیکن وہ خاموش رہی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ سب معلوم ہوتے ہی فیاض شرمندگی سے پھر اس کے سامنے ہی نہیں آئے گا۔ وہ ایسی مزاج کا انسان تھا۔ مہوش اسے شرمندہ نہیں کرنا چاہتی تھی اسی لیے وہ خاموش رہی۔

''کیا میں اپنے کمرے میں جا سکتی ہوں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں جاؤ۔'' فیاض نے کہا۔ اس کے لہجے میں بے پناہ دکھ تھا۔ وہ ایک بار پھر اپنی کتاب کی طرف متوجہ ہو گیا۔

مہوش اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس کے دل میں ایک طوفان برپا ہو رہا تھا۔ فیاض کی بے بسی اس طوفان کا سبب بن رہی تھی۔ کاش اس کی زندگی میں خوشیاں شامل ہو سکیں، کاش......

دوسری صبح اس نوجوان جنید کو دیکھ کر وہ بُری طرح جھلا گئی۔ اس نے تو پیچھا ہی پکڑ لیا تھا۔ اگر مہوش کی شکل اس کی گم شدہ محبوبہ سے ملتی تھی تو اس میں اس کا کیا قصور تھا؟ وہ خوامخواہ اس کے کالج کے گیٹ پر آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

مہوش کو دیکھ کر اس نے مسکرا کر اسے سلام کیا۔ مہوش بھناتی ہوئی اس کے پاس پہنچ گئی۔ ''اے مسٹر!'' اس نے غصے سے کہا۔ ''اب بہت ہو گئی۔ کیوں مجھے بدنام کرنا چاہتے ہو؟ اگر تمہاری محبوبہ میری ہم شکل تھی تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟''

''یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' وہ بُری طرح بوکھلا گیا۔

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ پلیز آئندہ سے اس طرح میرا پیچھا نہ کریں۔'' مہوش کے لہجے میں سختی تھی۔ مہوش کو افسوس بھی ہوا۔ وہ گردن جھکا کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

مہوش کالج کے گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ کلاس روم میں اس کا دل نہیں لگا۔ کچھ عجیب سی بے چینی تھی۔ شاید اس نے اس بے چارے کا دل توڑ دیا تھا۔ وہ صرف دیکھتا ہی تو رہتا تھا۔

گھر پہنچی تو فیاض اسی طرح اپنی جگہ کتاب لیے بیٹھا تھا۔ مہوش کو دیکھ کر اس نے پھر آواز دی۔ ''مہوش اِدھر آؤ۔ تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔''

''جی فیاض بھائی۔'' وہ اس کے سامنے جا کر بیٹھ گئی۔

''دیکھو مہوش، میں ہر حال میں تمہارا بھلا چاہتا ہوں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم ایک اچھی زندگی گزارو۔ ایک پُرسکون زندگی۔ جو تمہیں خوشیاں دے سکے۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا۔''

''جی ہاں سمجھ رہی ہوں۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''میرا ایک دوست ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اس کی زندگی میں کئی دکھ آتے رہے ہیں۔ وہ ایک سلجھا ہوا انسان ہے۔ بہت پڑھا لکھا، ذہین اور اپنا بزنس ہے اس کا۔''

''یہ سب آپ مجھ سے کیوں کہہ رہے ہیں؟''

''تم سے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ماما تمہاری شادی ایک ایسے شخص سے کرنا چاہتی ہیں جو غیر مہذب ہے۔ میرے دوست کی طرح کلچرڈ نہیں ہے اور تم...... تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ تم بے تُکے لوگوں کے درمیان جا کر پھنس جاؤ۔''

''آپ کا کیا خیال ہے کہ آپ اپنے جس دوست کی بات کر رہے ہیں، وہ معیار پر پورا اترے گا۔''

''سو فیصد۔'' فیاض نے کہا۔ ''یہ میں اپنی پوری ذمّے داری سے کہہ رہا ہوں۔ اس کی زندگی میں بس ایک ٹریجڈی ہوئی تھی۔ بہت دنوں تک ڈسٹرب رہا تھا۔ اب سنبھل گیا ہے۔ یہ میرا دعویٰ ہے کہ تم اس کے ساتھ خوش رہو گی۔''

مہوش کا دل بھر آیا۔ فیاض نہ جانے کس دل سے کہہ رہا ہوگا۔ مہوش نے گردن جھکا لی۔ فیاض نے جس انداز سے یہ سب کہا تھا۔ اس سے اس کے خلوص کا اندازہ ہو رہا تھا۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ مہوش کی زندگی اچھی گزرے۔ ایک پُرخلوص اور محبت کرنے والے ساتھی کا ساتھ مل جائے۔ شاید فیاض کی خوشی اسی میں تھی۔

''جواب دو مہوش۔'' فیاض نے پوچھا۔ ''کیا میں اس کو ہاں کہہ دوں؟''

''جو آپ کی مرضی۔'' مہوش نے کہا۔

وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ زندگی میں یہ مرحلہ تو آنا ہی تھا۔ ایک نئی زندگی کی ابتدا۔ ایک اجنبی کے ساتھ۔ اگر فیاض اس کی تعریف کر رہا تھا تو پھر وہ ٹھیک ہی ہوگا۔ فیاض ایک سلجھا ہوا انسان تھا۔ اس نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی اپنے اس دوست کو مہوش کے لیے منتخب کیا ہوگا۔

دوسری صبح کالج جانے سے پہلے جب وہ اپنی پھوپی کے پاس سلام کرنے گئی، پھوپی کسی کو فون کر رہی تھیں۔ ان کے لہجے سے پریشانی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ''ہاں...... ہاں، دعا کرتی رہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں بھی آ جاؤں گی۔ فیاض ابھی اسپتال گئے ہیں۔ چلو پھر بات کرتی ہوں۔''

''کیا ہوا پھوپو، خیریت تو ہے نا؟''

''ارے فیاض کے ایک دوست کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ فیاض اسی کو دیکھنے اسپتال گئے ہیں، تم کالج جا رہی ہو؟''

''جی پھوپو۔''

''دیکھو ہو سکتا ہے کہ میں گھر پر نہ رہوں۔ میں بھی چلی جاؤں۔''

''جی پھوپو۔''

''شکور کی آج چھٹی کروا دینا۔ کہنا کل ضرور آ جائے۔''

اس دن اس کی پھوپی تو گھر جلدی واپس آ گئی تھیں لیکن فیاض کی واپسی دیر سے ہوئی تھی۔ پھوپی اپنے کمرے میں تھیں، وہ بہت تھکا ہوا اور نڈھال دکھائی دے رہا تھا۔ شکور کی چھٹی کر دی گئی تھی۔ اسی لیے فیاض نے مہوش کو آواز دے کر کہا۔ ''کیا تم میرے لیے چائے بنا دو گی پلیز۔''

''کیوں نہیں ابھی لاتی ہوں، آپ بیٹھ جائیں۔''

مہوش جب اس کے لیے چائے لے کر پہنچی تو وہ خاموش بیٹھا تھا۔

مہوش اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ فیاض بہت اداس تھا۔

''میں نے سنا تھا کہ آپ کے کسی دوست کی طبیعت خراب تھی۔'' اس نے پوچھا۔ ''اب کیسے ہیں؟''

''انتقال ہو گیا اس کا۔'' فیاض نے بتایا۔ ''بے وقوف نے خودکشی کر لی۔ مر گیا۔ ایک پرچھائیں کے تعاقب میں مر گیا۔''

''میں نہیں سمجھی...... کیا ہوا تھا اُس کے ساتھ؟''

''بہت پہلے اس نے کسی لڑکی سے محبت کی تھی۔ بہت ٹوٹ کر چاہا تھا پھر یہ ہوا کہ اس لڑکی کا انتقال ہو گیا۔ اس کی موت نے اس کو بھی نیم مردہ کر دیا۔ ہم دوستوں کے سمجھانے پر دوبارہ زندگی کی طرف لوٹ آیا تھا پھر اس نے اپنے بزنس کی طرف دھیان دینا شروع کر دیا اور اچھا خاصا کام کرنے لگا۔ اس کا بزنس ایکسپورٹ امپورٹ کا تھا۔ پیسے والا آدمی تھا۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا کہ اس نے خودکشی کر لی، مر گیا۔''

''لیکن کیوں؟ جب سب کچھ ٹھیک ہو چلا تھا تو پھر کیوں خودکشی کر لی؟'' مہوش نے پوچھا۔

''بس جنون۔ اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا ہوں۔ اس کو ایک ایسی لڑکی دکھائی دے گئی جو اس کی مرنے والی محبوبہ کی طرح تھی۔ کل وہ بتا رہا تھا کہ اس لڑکی نے اس کو بُری طرح جھڑک دیا جبکہ وہ صرف اپنی محبوبہ کی شباہت کی وجہ سے اس کا پیچھا کیا کرتا تھا۔ اس صدمے کو وہ پاگل برداشت نہیں کر سکا۔ اس نے جان دے دی۔''

مہوش ایک سناٹے کے عالم میں فیاض کی باتیں سنتی رہی تھی۔ یہ تو اسی لڑکے کے بارے میں بتا رہا تھا جو اس کا پیچھا کیا کرتا تھا جس کی محبوبہ کی شکل مہوش کی طرح تھی۔ یہ تو وہی کہانی تھی۔ مہوش نے کل اسے بُرا بھلا کہا تھا اور اس نے اپنی جان دے دی تھی۔

مہوش، فیاض کے سامنے نہیں بیٹھ سکی۔ اپنے کمرے میں آ گئی۔ وہ یہ سوچ رہی تھی کہ اگر فیاض کو پتا چل گیا کہ مہوش ہی وہ لڑکی ہے جس کی شکل مرنے والے کی محبوبہ کی طرح ہے۔ اسی نے اس کو جھڑک کر بھگا دیا تھا تو اس کے کیا تاثرات ہوں گے؟

اپنے بستر پر لیٹ کر وہ بہت دیر تک سوچتی رہی۔ رہ رہ کر اس لڑکے کا خیال آ رہا تھا جس کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ اگر وہ پیچھا بھی کر رہا تھا تو اس میں کیا تھا۔ اس نے مہوش کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا تھا۔ وہ تو ایک مہذب لڑکا تھا۔

لیکن مہوش کو کیا اندازہ ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی جان بھی دے دے گا۔ مر جائے گا۔

کیسی موت ہوئی تھی۔ زندگی کے نہ جانے کتنے رنگ اس کی نگاہوں کے سامنے آ گئے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا اسی کا نام زندگی ہے کہ کسی کی خاطر جان دے دی جائے۔ اور وہ بھی اس کے لیے جو پرچھائیں بن کر رہ گئی تھی جس کا کوئی وجود نہیں تھا۔ جو اَب صرف اس لڑکے کے خوابوں اور خیالوں میں رہ گئی تھی۔

فیاض کئی دنوں تک خود کو سنبھال نہیں سکا تھا۔ پہلے بھی وہ بہت ہی کم بات کرتا تھا اب تو اس نے مکمل خاموشی اختیار کر لی تھی۔

کئی دنوں کے بعد اس کی پھوپی نے اس سے شادی کے موضوع پر بات کی۔ ''بیٹا! میں نے تو یہ چاہا تھا کہ فیاض سے تمہاری شادی ہو جائے۔ تم اسی گھر میں میری آنکھوں کے سامنے رہو لیکن جو خدا کو منظور۔ بہرحال میں نے تمہارے لیے ایک رشتہ تلاش کیا ہے۔ لڑکے کا اپنا کاروبار ہے۔ بہت خوش رکھے گا۔''

مہوش کو فیاض کی باتیں یاد آ گئیں۔ اس نے یہی کہا تھا کہ امی اس کے لیے ایک رشتہ تلاش کر رہی ہیں اور وہ شخص فیاض کو پسند نہیں ہے کیونکہ وہ ایک غیر مہذب شخص ہے۔

مہوش کو یاد آیا کہ فیاض نے اپنے ایک دوست کے بارے میں بات کی تھی۔ اس نے اپنی جھجک کو ایک طرف رکھا اور فیاض کے پاس پہنچ گئی۔ وہ اپنے کمرے میں تھا۔ مہوش جو کچھ بھی کہنا چاہ رہی تھی۔ اس کا اظہار ذرا مشکل تھا لیکن اب انتظار کرنے کا وقت نہیں تھا۔ پھوپی اس کے رشتے کے لیے سیریس ہو گئی تھیں۔ فیاض کمرے ہی میں تھا۔

''فیاض بھائی! آپ نے اس دن جو بات کی تھی، میں اسی لیے آئی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''کون سی بات؟''

''آپ اپنے کسی دوست کی بات کر رہے تھے جس سے...... میرا مطلب ہے کہ میرے لیے......''

''اوہ۔'' فیاض اداس ہو گیا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ میرے جس دوست نے خودکشی کی تھی، وہ وہی تو تھا۔''

''کیا؟'' مہوش کو ایک شاک سا لگا۔ ''یہ وہی تھا۔''

''ہاں، وہی تھا بدقسمت۔ جو اپنی محبوبہ کی تصویر لیے گھومتا رہتا تھا اور اس کو اپنی محبوبہ جیسی ایک لڑکی مل گئی تھی لیکن......'' فیاض خاموش ہو گیا۔

مہوش کے ذہن میں آندھیاں چلنے لگیں۔ کیا ہو گیا تھا یہ۔ وہ اگر اس دن اس لڑکے کو جھڑکتی نہیں تو پھر اسی سے اس کی شادی ہو جاتی۔ اس محروم لڑکے کو اس کی شکل میں اس کی کھوئی ہوئی محبوبہ مل جاتی۔ دونوں نے جلدی کی تھی۔

مہوش نے اس کو غلط سمجھ کر اس کو بُرا بھلا کہنے میں اور...... اُس لڑکے نے اپنی جان دینے میں۔

کیا عجلت میں کیے گئے فیصلے درست ثابت ہوتے ہیں۔

لے پالک

نسرین منصور

بعض یادیں... باتیں... ماہ و سال گزرنے کے باوجود اپنا نشان چھوڑ جاتی ہیں... ایسی نشانیاں جو تہِ زمین کا حصہ بن کے وقت کی قید سے آزادی حاصل کر لیتی ہیں... تہِ خاک میں چھپی انسانی لاشوں کی دریافت کا ماجرا جو ڈھانچوں کی صورت اختیار کر گئی تھیں... اس شخص کا قصہ جو فطرتاً بُرا تھا...

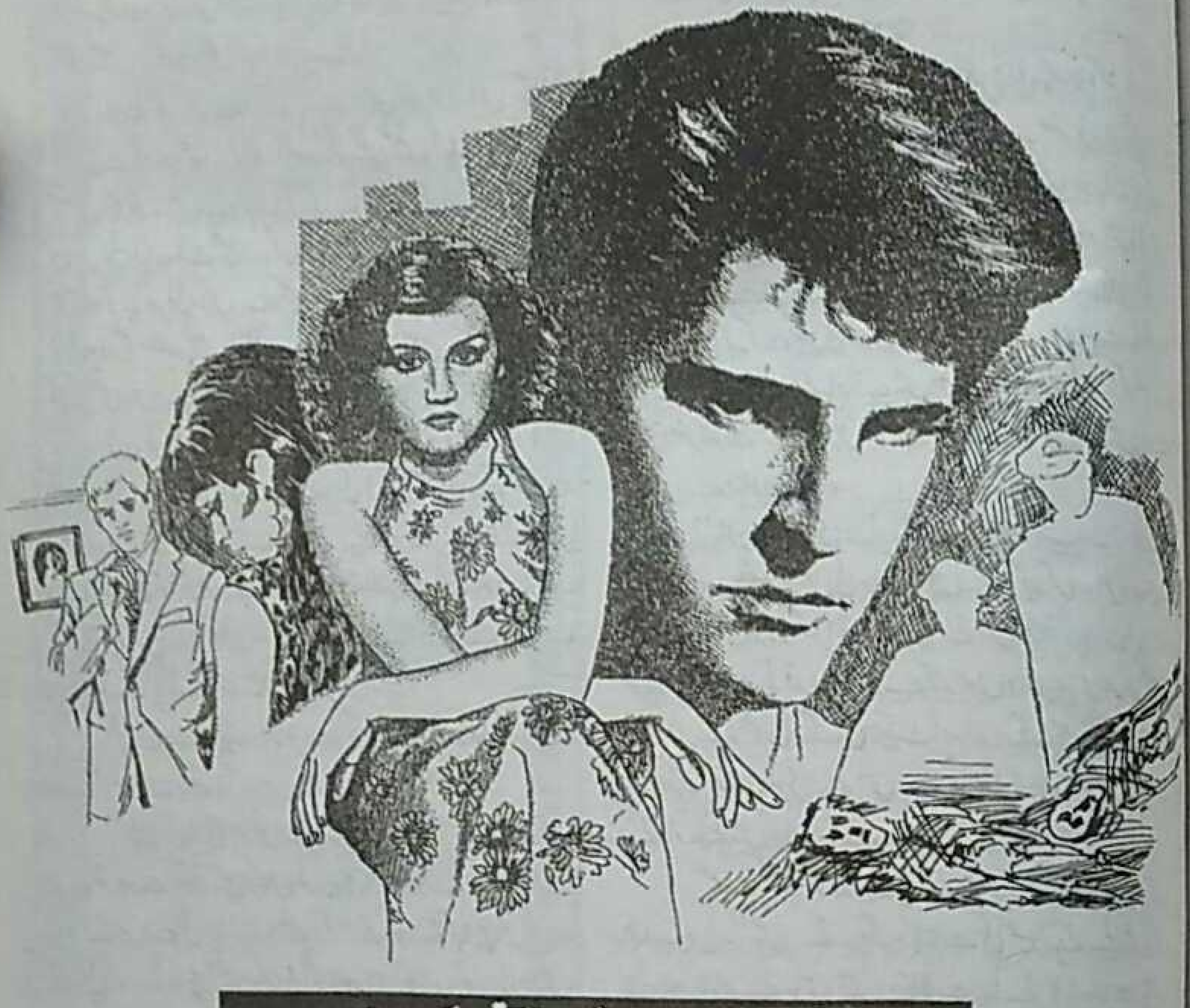

ڈر...... خوف...... اور دہشت کا نشاں بننے والے آستین کے سانپ کا زہریلا وار......

مسز لیلین کو وان لڑکھڑاتے ہوئے شوہر کے قدموں کے پاس فرش پر جا گری۔ وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ ''یہ تمہاری غلطی ہے۔'' اس کا لہجہ قدرے نرم تھا۔ ''ہمیشہ تمہاری ہی غلطی ہوتی ہے اور تم مجھے ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہو۔ اپنا حلیہ ٹھیک کر لو۔ تمہیں ان زخموں کو چھپانا ہے تاکہ مہمان نہ دیکھ سکیں۔ تمہارے پاس بہت عمدہ ملبوسات ہیں جنہیں پہن کر تم ان نشانات کو چھپا سکتی ہو۔ مجھے غصہ مت دلاؤ۔ یاد کرو میں نے تم سے کیا کہا تھا۔ تمہیں یاد ہو گا جب میں تمہیں پارک سے باہر لے گیا تھا اور اس کنکریٹ کے فرش پر کھڑا کر کے بتایا تھا کہ اس کے نیچے کیا ہے......''

لیلین نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور آہستہ سے سر ہلا دیا۔

''جو لوگ مجھے ناراض کرتے ہیں، وہ غائب ہو جاتے ہیں۔'' اس کے شوہر نے کہا۔ ''تمہیں یہ بات نہیں بھولنا چاہیے۔''

☆☆☆

بین فورڈ نے کنکریٹ کی تہ کو غور سے دیکھا۔ چوڑائی کے مقابلے میں اس کی لمبائی زیادہ تھی۔ اس کے اندازے کے مطابق وہ جگہ بیس فٹ لمبی اور دس فٹ چوڑی تھی۔ کنکریٹ کی یہ تہ شہر کے جنوب مشرقی مضافات کے ایک میدان میں بنائی گئی تھی جو تقریباً پانچ ایکڑ کے رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ جس کا بڑا حصہ خودرو پودوں، جھاڑیوں اور گھاس سے گھرا ہوا تھا اور کہیں کہیں درخت بھی نظر آ رہے تھے۔

بہت غور کرنے کے باوجود بین فورڈ کو اس جگہ پر کنکریٹ کی تہ بچھانے کا مقصد سمجھ میں نہیں آیا۔ اسے یہ غیر متعلق لگ رہا تھا۔ اس کے چاروں کونے مربع شکل کے تھے۔ اس کی گہرائی ایک فٹ تھی۔ اگر وہ زمین کی سطح کے نیچے تک چلی گئی ہو تو یہ گہرائی اس سے بھی زیادہ ہو سکتی تھی۔ کیونکہ اس کا کوئی واضح مقصد نہیں تھا اور یہ جگہ تعمیراتی کام کے لیے حاصل کی گئی تھی اس لیے کنکریٹ کی اس تہ کو بھی متروک قرار دیا گیا۔

بین فورڈ نے ان دونوں آدمیوں کو دیکھا جو اپنے ہاتھوں میں ہوا کے دباؤ سے چلنے والی ڈرل مشین لیے کھڑے تھے اور ان مشینوں کو پائپ کے ذریعے کمپریسر سے جوڑ دیا گیا تھا۔ اس نے خوشگوار لہجے میں انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''آج تمہارا پورا دن اس کام میں لگ جائے گا۔ اسے اطراف سے کاٹو گے یا آمنے سامنے کے سروں سے؟''

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر ایک بولا۔ ''اطراف سے۔'' دوسرے نے اس کی تائید کی۔

''جیسے تمہاری مرضی۔ یہ میں تم پر چھوڑتا ہوں۔ اگر میری ضرورت ہو تو میں وہاں ملوں گا۔'' فورڈ نے میدان کے دوسرے سرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا جہاں ایک کھدائی کرنے والی مشین کھڑی تھی اور اس کا ڈرائیور برابر میں کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔

فورڈ کے جاتے ہی ڈرل مشینوں نے کام شروع کر دیا۔ ان کے شور سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ ابھی دوپہر نہیں ہوئی تھی کہ اس سے پہلے ہی دونوں مشینیں خاموش ہو گئیں۔ فورڈ کو تجسس ہوا اور اس نے نقشے پر سے نظریں ہٹا کر دیکھا کہ دونوں ڈرل آپریٹر اپنے پیروں کے پاس کسی چیز پر نظریں جمائے تھے۔ ایک نے اپنی ڈرل مشین اوپر کی جانب اٹھا رکھی تھی اور اسے ایک ہاتھ سے پکڑے ہوئے تھا جبکہ دوسرے نے اپنی مشین زمین پر رکھ دی اور فورڈ کی جانب مڑ کر اپنا بازو اوپر اٹھایا اور اسے اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔

''لگتا ہے کہ انہیں کوئی مدفون خزانہ مل گیا ہے۔'' فورمین نے طنزاً کہا۔

''اگر خزانہ ملتا تو وہ ہمیں نہ بتاتے۔'' فورڈ نے جوابی طنز کیا۔ ''بلکہ اسے اپنے پاس ہی رکھ لیتے۔'' یہ کہہ کر اس نے نقشہ فورمین کے حوالے کیا اور متجسس انداز میں ان آپریٹرز کی جانب چل دیا۔ قریب جا کر معلوم ہوا کہ ان دونوں آدمیوں کو کنکریٹ کی تہ میں دبا ہوا ایک انسانی ڈھانچا ملا ہے۔

☆☆☆

جارج ہنری نے ڈھانچے پر نظر ڈالی پھر ڈاکٹر این کی طرف دیکھا۔ وہ بولی۔ ''یہ کوئی مرد ہے۔ مغربی یورپین یا ایشیائی۔'' اس نے جھک کر دانتوں کا معائنہ کیا اور کہنے لگی۔ ''اس کا تعلق وسطی یورپ یا امریکا سے نہیں ہے اور اس کا جبڑا بھی کمزور ہے اس لیے یہ جزائر غرب الہند کا بھی نہیں ہو سکتا۔''

یہ کہہ کر وہ کھڑی ہو گئی اور بولی۔ ''اس کا پوسٹ مارٹم ہو جائے تو میں اس کے بارے میں مزید بتا سکوں گی۔ اگر تم نے اپنی ضرورت کے مطابق تصویریں لے لی ہیں تو میں اسے یہاں سے ہٹا دوں؟''

''ہاں۔'' ہنری نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''سب تصویریں لی جا چکی ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ اس جانب چل دیا جہاں فورڈ کھڑا تھا۔ ہنری نے اس کا بغور جائزہ لیا۔ وہ فربہ جسم، چھوٹے قد اور چوڑے کندھوں والا پچاس سالہ شخص تھا۔ اس نے شوخ رنگ کی جیکٹ اور زرد رنگ کا سیفٹی ہیلمٹ پہن رکھا تھا۔ ہنری نے اس سے پوچھا کہ وہ کنکریٹ کی تہ کے بارے میں کیا جانتا ہے۔

''بہت کم۔'' فورڈ نے یارک شائر کے مخصوص لہجے میں جواب دیا۔ ''میں نے یہ جگہ مکانات کی تعمیر کے لیے خریدی ہے اور ہمارے پاس بیس مکانات بنانے کا اجازت نامہ ہے۔ یہ کوئی مشہور جگہ نہیں ہے اس لیے مجھے سستی زمین مل گئی اور مکانات بھی زیادہ مہنگے نہیں ہوں گے لیکن جب یہ علاقہ ڈیولپ ہو جائے گا تو مجھے ان مکانوں کی اچھی قیمت مل جائے گی۔ میرے لیے یہ ایک جوا ہی ہے۔ بہرحال کنکریٹ کی یہ تہ غلط جگہ پر بچھائی گئی ہے۔ میں اسے اپنے منصوبے میں ضم نہیں کر سکتا اس لیے اس کا ملبا کسی منظور شدہ کچرے کے ڈھیر پر ڈال دوں گا۔ یہی ایک محفوظ طریقہ ہے تاکہ میرے کام میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔''

''تمہاری بات سمجھ میں آ رہی ہے۔''

''میں نے زمین کا سروے کروایا تھا لیکن اس وقت اس کنکریٹ کا مقصد میری سمجھ میں نہیں آیا۔ جس کسی نے بھی یہ بچھائی، اس نے بڑی ہوشیاری اور صفائی سے اپنا کام کیا۔ پہلے اس نے لکڑی کے تختے بچھائے اور انہیں آپس میں اس طرح جوڑ دیا کہ وہ کنکریٹ کے خشک ہونے تک اپنی جگہ نہ چھوڑیں جیسے کسی عمارت کی چھت ڈالتے وقت لکڑی کی شٹرنگ کی جاتی ہے۔''

''اس تہ کو بچھانے میں کتنے آدمیوں نے حصہ لیا ہو گا؟''

''ایک آدمی دن بھر میں یہ کام کر سکتا ہے۔'' فورڈ نے جواب دیا۔ ''اگر اس کے پاس کنکریٹ کی پوری مقدار اور پانی موجود ہو۔ اس میدان کے کنارے پر ایک ندی بہہ رہی ہے۔'' فورڈ نے میدان کے جنوبی حصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر یہ سب چیزیں موجود ہوں تو ایک آدمی پورے دن میں یہ کام مکمل کر سکتا ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ وہ شام ہونے تک بُری طرح تھک چکا ہو گا۔''

''تمہارے خیال میں یہ تہ کتنی پرانی ہے؟'' ہنری نے پوچھا۔

''یہ بتانا بہت مشکل ہے...... اس پر کائی جمی ہے اور نہ ہی یہ کہیں سے کریک ہوئی ہے، یہ کنکریٹ کی خاصیت ہے کہ وہ ساٹھ سال تک سخت رہتی ہے پھر اس میں دراڑیں پڑنا شروع ہو جاتی ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ یہ ستر سال سے کم پرانی ہے؟'' ہنری نے وضاحت چاہی۔

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' فورڈ نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ستر سال سے زیادہ پرانی نہیں ہے لیکن اس کی کیا اہمیت ہے؟''

''ہاں اگر یہ انسانی ڈھانچا ستر سال سے زیادہ پرانا ہے تو شاید اس میں ہماری دلچسپی باقی نہ رہے کیونکہ مجرم خود بھی اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہو گا۔ زیادہ تر لوگ بیس یا تیس سال کی عمر میں قتل جیسا جرم کرتے ہیں لہٰذا ستر سال بعد وہ مر چکے ہوں گے یا ان کی یادداشت ختم ہو گئی ہو گی۔''

''اوہ، اب سمجھا۔ یہ یقیناً ستر برس سے کم پرانی ہے بلکہ اتنی زیادہ بھی نہیں جیسا کہ دکھائی دے رہی ہے۔ میرے خیال میں یہ زیادہ سے زیادہ دس برس پرانی ہو گی۔'' فورڈ نے پورے اعتماد سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ ہمیں معلوم کرنا ہو گا کہ کنکریٹ کی یہ تہ

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور
انمٹ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ سرگزشت کراچی

شمارہ اکتوبر 2018ء
کی جھلکیاں

مرگ برگ
اس شاعر بے مثل کا زندگی نامہ جس کی شاعری
لہو رلاتی تھی مگر اسے ہی لہو میں نہلا دیا گیا

شوق پرواز
تاریخ سے نابلد ہوائی جہاز کو مغرب کا کارنامہ
سمجھتے ہیں لیکن ہوا میں اڑنے کا مظاہرہ کئی
صدی قبل معروف مسلم سائنسداں نے کیا تھا

آگ کا دریا
تاریخ کے صفحات میں مدفون ایک
جنگجو کے کشت و خون کا تذکرہ

آل راؤنڈر
اس پاکستانی سپر اسٹار کی داستان
جسے کوئی چانس دینے پر تیار نہ تھا

اس کے علاوہ

بھی بہت سی سچی داستانیں، سچے قصے
اور دلچسپ سچ بیانیاں

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر نیا شمارہ مختص کرا لیں

کب بچھائی گئی تھی۔ تم نے یہ زمین کس سے خریدی؟"

"پرک ولو ہولڈنگ نامی کمپنی سے۔" فورڈ نے جواب دیا۔

ہنری نے یہ نام دہرایا جیسے اسے یاد کرنے کی کوشش کررہا ہو۔

"ہاں۔" فورڈ نے تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ "یہ نام سننے میں بہت اچھا لگتا ہے لیکن وہ خاصے سست لوگ ہیں۔"

"تم ایسا سمجھتے ہو۔" ہنری نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اس لیے کہ میں انہیں جانتا ہوں۔" فورڈ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "وہ لچے لفنگوں کا ایک گروپ ہے۔ وہ ایسی زمینیں سستے داموں خرید لیتے ہیں جن پر پلاننگ کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ وہ اس وقت تک ان زمینوں کو اپنے پاس رکھتے ہیں جب تک اجازت نہ مل جائے اور اس کے بعد بھاری منافع کے ساتھ انہیں فروخت کر دیتے ہیں پھر اس رقم سے ایسی ہی اور زمینیں خرید لیتے ہیں اور اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔"

"تم نے انہیں سست کہا، کیوں؟" ہنری نے پوچھا۔

"کیونکہ وہ کوئی تعمیری کام نہیں کر رہے اور جب وہ اپنا کاروبار ختم کریں گے تو انہیں کوئی اطمینان نہیں ہوگا۔ اس کے برعکس میں مکانات تعمیر کرتا ہوں جو دیرپا ہوتے ہیں۔ تم میرا کوئی ایک مکان خریدو۔ وہ تمہارے بچوں کے بھی کام آئے گا۔" فورڈ نے سینہ پھلاتے ہوئے کہا۔ "اس طرح مجھے دلی سکون اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔"

"یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔" ہنری نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں تم سے کہوں گا کہ فی الحال یہ جگہ خالی کر دو۔"

"اوہ پوری جگہ......" فورڈ نے مایوسی کے انداز میں کہا۔

"ہاں۔" ہنری مضبوط لہجے میں بولا۔ "پوری جگہ، مجھے افسوس ہے۔ ہمیں کنکریٹ کی پوری تہ کو کھودنا ہوگا۔ ممکن ہے کہ اس میں سے مزید لاشیں برآمد ہوں۔"

"مزید لاشیں؟" فورڈ نے چونکتے ہوئے کہا۔

"ہاں، اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔" ہنری نے وضاحت کی۔ "اس کے بعد ہم اپنے جاسوس کتے اس جگہ پر چھوڑ دیں گے جو سونگھ کر انسانی گوشت اور ہڈیوں کا پتا لگا سکتے ہیں۔ اب تم مجھے پرک ولو کمپنی کا پتا بتاؤ۔"

"ان کا اسٹون یو پر ایک چھوٹا سا دفتر ہے۔" فورڈ نے جواب دیا۔

☆☆☆

پرک ولو ہولڈنگ کا مالک ٹام لوکسی ایک باتونی شخص تھا۔ اس کے چھوٹے قد اور دبلے چہرے پر شوخ زرد رنگ کی جرسی اور براؤن پینٹ نے اس کی شخصیت کو مزید مضحکہ خیز بنا دیا تھا۔

ہنری نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا اور ساتھ ہی اس کے کاروبار کے بارے میں جاننے کی خواہش ظاہر کی۔

"میں کیمبرج شائر کے نزدیک ایک گاؤں ولوز، کا رہنے والا ہوں۔ میں اور میرا جڑواں بھائی وہیں پلے بڑھے۔ ہمارا باپ بذات خود اچھا آدمی تھا لیکن اس نے زندگی میں کبھی آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ کھیتوں میں مزدوری کیا کرتا تھا اور کام پر آنے جانے کے لیے اس کے پاس ایک پرانی سائیکل تھی۔ ایک دن اس نے مجھے اور میرے بھائی کو بلا کر کہا۔ "میں نے اپنی طرف سے بہترین کوشش کی لیکن کچھ زیادہ نہیں کما سکا۔ میں تمہارے لیے کچھ چھوڑ کر نہیں جا رہا۔ میرے بعد تمہیں بھی یہی کام کرنا ہوگا لیکن جب تمہارے پاس کچھ پیسے جمع ہو جائیں تو کوئی دوسرا کام تلاش کرنا ورنہ ساری عمر میری طرح مفلسی کی زندگی گزار دو گے۔"

"لہٰذا ہم دونوں بھائیوں نے اس کی نصیحت پر عمل کیا اور نارتھ سی آئل پلیٹ فارم پر کام کرنے لگے۔ ہمارا قد کاٹھ ایسا نہیں تھا کہ غوطہ خوری یا عرشے پر کام کر سکیں جس میں اچھے پیسے ملتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے ہمیں رنگ کرنے پر لگا دیا۔ یہ اس لحاظ سے بھی محفوظ تھا کہ ہمیں خراب موسم میں کام نہیں کرنا پڑتا تھا۔ ہم نے دو سال وہاں کام کیا پھر باپ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے تھوڑی سی زمین خرید لی۔ ہم ایسی زمینیں خریدتے جہاں پلاننگ کی اجازت نہیں تھی۔ پھر یہ اجازت حاصل کرتے جس میں بعض اوقات کئی سال لگ جاتے لیکن اس کے بعد زمین کی قیمت کئی گنا بڑھ جاتی اور ہمیں اس کی فروخت پر ٹھیک ٹھاک منافع ملتا اس طرح ہماری اچھی گزر بسر ہونے لگی۔ یہ سب ہماری اپنی محنت کا نتیجہ ہے۔"

"بالکل۔" اس نے غراتے ہوئے کہا۔ اسے فورڈ سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ لوکسی اور اس کے بھائی نے پیسے کمانے کا غیر اخلاقی طریقہ اختیار کیا ہے۔ اس نے پوچھا۔ "اس زمین کے بارے میں کیا کہو گے جو تم نے بین فورڈ کو فروخت کی ہے؟"

"ہاں، یہ جگہ یارک کے جنوب مشرق میں ہے۔" لوکسی نے وضاحت کی۔ "یہ اس وقت مارکیٹ میں فروخت کے لیے آئی جب تھامس اسٹریٹ کی ایک جائداد فروخت

ہو رہی تھی۔ میں نے اس کے وکیل وڈلینڈ سے سودا کر لیا۔"

"ہاں، میں انہیں جانتا ہوں۔ وہ مجرموں کو قانونی مدد فراہم کرتے ہیں۔"

"ہاں، انہوں نے مجھے بھی یہی بتایا تھا۔"

"پھر تم نے یہ زمین کب خریدی؟" ہنری نے پوچھا۔

"تقریباً دس سال پہلے......" لوکسی نے لمحہ بھر توقف کیا۔ "نہیں پندرہ سال۔ وقت کتنی جلدی گزر جاتا ہے۔"

"کیا تم نے وہ زمین دیکھی تھی؟"

"بالکل۔ اس وقت وہاں خالی میدان اور کھیت تھے لیکن اردگرد نئی عمارتیں بننا شروع ہو گئی تھیں جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ علاقہ ڈیولپ ہو رہا ہے۔ یہ جگہ ہمارے لیے مثالی تھی۔ جب ہم نے وہ زمین خریدی تو وہ پرانے ساز و سامان اور ملبا ڈالنے کے لیے استعمال ہو رہی تھی۔"

"اس زمین پر ایک کنکریٹ کی تہ بھی ہے۔ کیا یہ اس وقت بھی تھی جب تم نے وہ جگہ خریدی؟" ہنری نے پوچھا۔

"ہاں، لگتا تھا کہ بالکل نئی ڈالی گئی ہے۔" لوکسی نے جواب دیا۔ "میں سوچنے لگا کہ اس کی کیا کہانی ہے۔ میں یہی سمجھا کہ تعمیراتی کام شروع کرنے کی غرض سے کنکریٹ کا یہ پلیٹ فارم بنایا گیا ہوگا لیکن اجازت نہ ملنے کی وجہ سے اسے روک دیا گیا۔"

"پندرہ سال۔" ہنری نے تصدیق چاہی۔ "میں یہی جاننا چاہ رہا ہوں۔"

"میں تھامس اسٹریٹ کو اچھی طرح جانتا تھا۔" فرم کے سینئر پارٹنر نے کہا۔

"اس کی موت کیسے واقع ہوئی؟" ہنری نے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"بہت عجیب انداز میں۔" وڈلینڈ نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

"عجیب انداز میں؟" ہنری نے پوچھا۔ "وہ کیسے؟"

"ہاں، میں اسے عجیب ہی کہوں گا۔ اس وقت تک وہ خود بھی رنڈوا ہو چکا تھا۔ اس کی بیوہ ویرونیکا چند برس قبل انتقال کر گئی تھی۔ اس کے پسماندگان میں تھامس کے علاوہ اس کا لے پالک بیٹا بھی تھا۔ دراصل اس کی موت کثرتِ شراب نوشی سے ہوئی۔ وہ عادی نشے باز تھا اور اس کی خون کی نالیوں میں شراب بہہ رہی تھی اس لیے اس کی موت پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ میں جانتا تھا کہ شراب ایک دن اس کی جان لے لے گی۔"

"اوہ، اب سمجھا۔" ہنری نے کہا۔

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں' اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 1200 روپے
امریکا کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 9,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: مرزا ثمر عباس فون نمبر: 0301-2454188
سرکولیشن منیجر...... سید منیر حسین 0333-3285269
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35804200-35804300

"وہ گھر میں رہنے والا شخص تھا اور اسے زیادہ گھومنے پھرنے کا شوق نہیں تھا لیکن ایک کسان کو اس کی لاش ایک گڑھے میں پڑی ہوئی ملی۔ سردی کے موسم میں بھی اس کے جسم پر بنیان اور انڈرویئر کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس کے جسم پر زخموں کے نشانات پائے گئے اور نہ ہی تشدد کی کوئی علامت ملی۔ اس لیے پوسٹ مارٹم کرنے والا ڈاکٹر بھی کوئی حتمی رائے نہ دے سکا اور اس کی موت ایک معما بن گئی۔"

"اس کی جائداد کا کیا بنا؟" ہنری نے پوچھا۔

"وہ اس کی وصیت کے مطابق تقسیم کردی گئی۔ اس نے تینوں بھانجوں کو اپنا وارث بنایا تھا۔" وڈلینڈ نے وقفہ لیا۔ "اس میں بھی ایک مسئلہ پیدا ہوگیا۔"

"اوہ، وہ کیا؟"

"اس کا مکان قیمتی اور نادر اشیا سے بھرا ہوا تھا لیکن جب اس کی بہن اور بھانجے وہاں گئے تو انہیں کچھ نہیں ملا۔ سب چیزیں غائب ہوچکی تھیں۔"

"یہ کام اس کے لے پالک لڑکے نے کیا ہوگا۔" ہنری نے خیال ظاہر کیا۔

"ممکن ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ چوروں کا کام ہو جنہیں معلوم ہوگیا ہوگا کہ بوڑھے کی موت کے بعد مکان میں کوئی نہیں ہے۔"

"کیا اس کا لے پالک بیٹا وہاں نہیں تھا؟"

"نہیں، جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے وہ اس وقت گھر سے باہر تھا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ اس کی غیر موجودگی میں مکان بالکل خالی تھا؟"

"ہاں، بھاری فرنیچر اور قالین وغیرہ اپنی جگہ موجود تھے لیکن چاندی کے برتن، ویرونیکا کے زیورات اور کچھ انتہائی قیمتی آئل پینٹنگز غائب تھیں جو رات کی تاریکی میں نامعلوم چور لے گیا یا لے گئے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کارروائی کسی ایک شخص نے کی یا ان کی تعداد ایک سے زیادہ تھی۔ وہاں زبردستی گھسنے کی کوئی علامت نہیں ملی لیکن وہ ایک پرانا مکان ہے اور اس میں داخل ہونا قدرے آسان ہے۔ صرف گراؤنڈ فلور کی ایک کھڑکی کو ہلکا سا دھکا دے کر یہ مقصد حاصل کیا جاسکتا ہے۔ جب ہم اس موضوع پر گفتگو کررہے تھے تو اس کی بہن نے بھی یہی بات بتائی۔"

"کیا تم نے پولیس کو اس کی اطلاع دی؟"

"ہاں لیکن وہ کوئی سراغ نہ لگا سکے۔ اس کا لے پالک بیٹا جسٹن گھر سے دور تھا اور اس پر اس لیے بھی شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اچانک ہی دولت مند نہیں ہوگیا حالانکہ چوری ہونے والی اشیا کی مجموعی مالیت چھ ہندسوں میں تھی۔"

"چھ ہندسوں میں؟" ہنری نے اپنی بھویں اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اور یہ پندرہ سال پہلے کی بات ہے؟"

"اس کی بہن مسز سلوا کا یہی کہنا ہے۔ دراصل مسئلہ یہ ہوا کہ ان اشیا کی کوئی فہرست نہیں بنائی گئی تھی جس سے ان کی تعداد اور مالیت کا پتا چلتا۔"

"پھر تو انہیں آسانی سے بیچا جاسکتا ہے؟"

"ہاں۔" وڈلینڈ نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ "ایسا ہی ہے۔"

☆☆☆

"مجھے بہت افسوس ہے۔" سومر لینڈ گریگ نے کہا۔ وہ اس وقت ان کے چھوٹے سے مکان کے لیونگ روم میں کھڑا تھا۔

"تمہیں کوئی غلط فہمی تو نہیں ہوئی؟" اس آدمی نے اپنے آپ پر ضبط کرتے ہوئے کہا جبکہ اس کی بیوی آنکھوں پر رومال رکھے رو رہی تھی۔

"نہیں۔" گریگ نے جواب دیا۔ "اس ڈھانچے کا ڈی این اے ہمارے ریکارڈ میں موجود تمہارے بیٹے کے ڈی این اے سے میچ کرگیا ہے۔"

"چلو، ہمیں کم از کم اتنا تو معلوم ہوگیا۔ اسے لاپتا ہوئے پندرہ برس ہوچکے ہیں۔"

"اس کے ساتھ ایک اور لاش بھی دفنائی گئی تھی۔"

"چارلی برکلے۔" اس آدمی نے وثوق سے کہا۔ "وہ دونوں بہت اچھے دوست تھے۔ میں نہیں سمجھتا کہ چارلی کو بھی پولیس سے کوئی مسئلہ ہوا ہو۔"

"وہ کہاں رہتا تھا؟"

"اپنے والدین کے ساتھ۔" اس آدمی نے سڑک کے پار ایک مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ پیلے رنگ کے دروازے والا مکان ہے۔ وہ وہاں رہتا تھا۔ اس کے والدین اب بھی وہیں مقیم ہیں۔"

☆☆☆

"انہیں لاشیں مل گئی ہیں۔" اس آدمی نے عورت کے بازو پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا اور وہ درد سے کراہنے لگی۔

"میں اپنی گاڑی میں وہاں سے گزر رہا تھا تو میں نے کچھ لوگوں کو کنکریٹ کی کھدائی کرتے دیکھا۔ اب وہ کسی وقت بھی یہاں آسکتے ہیں۔ اگر میں گونگا بہرا بن گیا اور تم نے اپنی

زبان بند رکھی تو یہ معاملہ دب جائے گا۔ تمہیں صرف یہ یاد رکھنا چاہیے کہ میں کیا کرسکتا ہوں۔"

وہ اپنا چہرہ عورت کے کان کے قریب لاتے ہوئے بولا۔ "یاد رکھو، میں تمہارے جسم پر کوئی نشان چھوڑے بغیر تمہیں قتل کرسکتا ہوں۔ میں پہلے بھی تین مرتبہ ایسا کرچکا ہوں۔ تمہیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے۔"

☆☆☆

مسز برکلے کی خاموشی اور اداسی نے گریگ کو صرف حیران ہی نہیں کیا بلکہ اسے اس مظلوم عورت سے ہمدردی بھی ہورہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "اس کے بیڈ روم میں ایک کنگھا میں نے سنبھال کر رکھا ہوا ہے جس کے دندانوں میں اس کے کچھ بال ہیں۔"

"بہت خوب۔" گریگ نے کہا۔ "کیا تمہیں معلوم ہے کہ جب وہ غائب ہوا تو کیا کررہا تھا؟"

"میں نہیں جانتی۔" مسز برکلے نے کہا۔ وہ چھوٹے قد لیکن مضبوط جسم کی عورت تھی۔ گریگ نے نوٹ کیا کہ اس نے اپنا گھر بہت صاف ستھرا رکھا ہوا تھا۔ "لیکن مجھے ڈر ہے کہ وہ کوئی غلط کام کررہا تھا۔ ان دنوں وہ مائیکل کارنی کے ساتھ زیادہ رہتا تھا جس کا مکان سڑک کے پار ہے۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے تمہیں وہاں سے نکلتے ہوئے دیکھا ہے۔ کارنی کا ہمیشہ پولیس کے ساتھ کوئی نہ کوئی مسئلہ رہتا تھا اور وہ میرے بیٹے کو بھی ساتھ لے جاتا تھا۔ تم اس کی گرل فرینڈ سے پوچھ سکتے ہو۔ اب اس کی شادی ہوچکی ہے۔ اس کا نام رتھ ہے اور وہ میری مونک میں ویٹرس ہے۔"

☆☆☆

"میرے بھائی نے کہا تھا کہ اس نے اپنے گھونسلے میں ایک سانپ پال رکھا ہے۔" ربیکا سلوا نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "اس کے انتقال سے پہلے میں اس سے ملنے گئی تھی۔ وہ اس وقت بھی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ میں جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئی تو وہ بولا۔ 'اگر مجھے کچھ ہوجائے تو اس کی ذمے داری جسٹن پر ہوگی۔' یہ کہہ کر وہ مڑا اور دوبارہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ میرا خیال ہے کہ اسے پہلے سے اپنی موت کا اندازہ ہوگیا تھا۔"

"مسٹر اسٹریٹ کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی؟" ہنری نے سامنے بیٹھی ہوئی مسز سلوا سے پوچھا۔ اس ادھیڑ عمر عورت نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا جیسے ابھی تک سوگ کی حالت میں ہو۔

"نہیں، تھامس اور ویرونیکا نے بہت علاج کروایا پھر مایوس ہوکر انہوں نے جسٹن کو گود لے لیا۔ اس وقت وہ آٹھ برس کا تھا۔ آپ کسی ایسے بچے کو اچھا نہیں بنا سکتے جو فطرتاً برا ہو۔ جب وہ اسے گھر لے کر آئے تب تک اس کی بری عادتیں پختہ ہوچکی تھیں۔ مجھے وہ لڑکا کبھی پسند نہیں آیا گوکہ بڑا ہوکر وہ بہت خوب صورت اور جوان نکلا لیکن اس کی آنکھوں میں شیطانی چمک تھی۔"

"تمہارے خیال میں جسٹن ہی مسٹر اسٹریٹ کی موت کا ذمے دار تھا؟" ہنری نے پوچھا۔

"مجھے پورا یقین ہے۔ میرا بھائی سردی برداشت نہیں کرسکتا تھا اس لیے وہ اس ٹھنڈے موسم میں گھر سے باہر نہیں نکلتا۔" مسز سلوا نے جواب دیا۔ "جسٹن نے یقیناً اتنا انتظار کیا ہوگا کہ وہ شراب پی کر مدہوش ہوجائے پھر وہ اسے کار تک لے گیا اور اسے جنگل کے قریب ایک گڑھے میں پھینک دیا تاکہ وہ موسم کی سختی برداشت نہ کرسکے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ اسے سردی سے مرنے کے لیے چھوڑ دیا؟" ہنری نے وضاحت چاہی۔

"ہاں، یہی میرا مطلب ہے۔" مسز سلوا نے نرم لہجے میں جواب دیا۔

"کیوں؟" ہنری نے پوچھا۔ "اس کا کیا مقصد تھا؟"

مسز سلوا نے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "پیسہ۔ اس کے علاوہ اور کیا مقصد ہوسکتا ہے؟"

"اس کے علاوہ بھی دیگر محرکات ہوں گے؟"

"نہیں۔" مسز سلوا نے وضاحت کی۔ "وہ اس کی تمام دولت پر قبضہ کرنا چاہ رہا تھا۔ جب آخری بار میری بھائی سے بات ہوئی تو اس نے بتایا کہ جسٹن سے اس کا زوردار جھگڑا ہوا ہے۔ جسٹن اس سے آئے دن اپنی کسی ضرورت کے لیے پیسے مانگتا رہتا تھا۔ تنگ آکر بھائی نے اسے گھر سے جانے اور کوئی ملازمت تلاش کرنے کے لیے کہہ دیا اور غصے میں اس کے منہ سے یہ بھی نکل گیا کہ اسے وراثت میں کچھ نہیں ملے گا۔ اس نے جسٹن کو یاد دلایا کہ اس نے اسے نازونعم سے پالنے کے علاوہ مہنگے اسکولوں میں پڑھایا ہے اور وہ اب بھی اس کی مالی مدد کرنے کے لیے تیار ہے بشرطیکہ وہ اپنی پڑھائی دوبارہ شروع کردے۔ کیونکہ اس نے یونیورسٹی کی تعلیم مکمل نہیں کی تھی اور وہ واپس میرے بھائی کے پاس آکر رہنے لگا تھا۔

"میرے بھائی نے یہ سارے اثاثے اسٹاک مارکیٹ کی کمائی سے بنائے تھے۔ اس نے جسٹن کو بتادیا کہ وہ اس کا سگا بیٹا نہیں ہے اور اس نے اپنی تمام دولت و جائداد بھانجوں کے نام کردی ہے البتہ اس نے مجھے اپنے ایک یا دو نوادرات دینے کا وعدہ کیا۔ خاص طور پر وائلڈ میڈ"

''والملک میڈ؟'' ہنری نے حیرانی سے پوچھا۔

''یہ ورمیر کی بنائی ہوئی ایک پینٹنگ ہے جس میں ایک نوجوان خادمہ جگ سے دودھ نکال رہی ہے۔''

''ہاں، میں نے بھی وہ پینٹنگ دیکھی ہے۔ اس میں روٹی کا ٹکڑا میز پر رکھا ہوا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھالیں گے۔''

''ہاں، یہی ورمیر کا کمال ہے۔'' مسز سلوا نے کہا۔ ''فیدر نے بھی ایسی ہی ایک تصویر بنائی۔ اسے جعل سازی نہیں کہہ سکتے بلکہ ایک جونیئر آرٹسٹ نے اپنے استاد کی نقل کر کے سیکھنے کی کوشش کی لیکن مجھے وہ پینٹنگ بہت پسند تھی اور میرے بھائی نے وعدہ کیا کہ وہ یہ تصویر مجھے دے گا اور اس نے یہ بات میرے بیٹوں کی موجودگی میں کہی کہ اس کے مرنے کے بعد وہ تصویر میری ہوگی لیکن جب ہم بعد میں اس کے گھر گئے تو اس پینٹنگ سمیت تمام قیمتی اشیا غائب تھیں۔ میں نے اسی وقت ان سے کہا تھا کہ اگر تم ان گمشدہ چیزوں کو تلاش کر لو تو تمہیں میرے بھائی کے قاتل کا بھی پتا چل جائے گا۔ میں اب بھی یہی کہتی ہوں گو کہ میرا خیال ہے کہ وہ سب چیزیں فروخت ہو چکی ہوں گی۔ تفتیش سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ جب میرے بھائی کو آخری بار زندہ دیکھا گیا۔ اس کے پانچ دن بعد اس کی لاش گڑھے سے ملی۔ اس طرح جسٹن کو چیزیں غائب کرنے کے لیے کافی وقت مل گیا۔''

''لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ جسٹن اس وقت گھر پر نہیں تھا۔''

''وہ اپنی گرل فرینڈ سے ملنے گیا ہوا تھا۔'' مسز سلوا نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔

''اس نے پولیس کو بتایا کہ وہ ان پانچ دنوں کے دوران اس کے ساتھ تھا۔''

''ہم اس سے بات کر کے دیکھ لیتے ہیں کہ کیا اب بھی وہ اس بیان پر قائم ہے۔''

''مجھے افسوس ہے کہ تم ایسا نہیں کر سکو گے کیونکہ وہ لاپتا ہو چکی ہے۔'' مسز سلوا نے آہستہ سے کہا۔ ''بھائی کی موت کے چند ماہ بعد میں نے اپنے طور پر تحقیقات کی۔ اس لڑکی کا نام بساندرا فیلڈنگ تھا۔ میں نے ٹیلی فون ڈائریکٹری میں پارک میں رہنے والے فیلڈنگ فیملی کے نمبر تلاش کیے۔ ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ تیسرے نمبر پر ہی میرا مطلوبہ فیملی سے رابطہ ہوگیا۔ پہلے تو وہ چونک گئے لیکن جب میں نے انہیں بتایا کہ میں کون ہوں اور کس لیے فون کیا ہے تو انہوں نے کہا کہ وہ غائب ہوگئی ہے۔''

''تمہیں کسی پر شبہ ہوا؟'' ہنری نے پوچھا۔

''جب میں اس کے باپ سے باتیں کر رہی تھی تو میرے کانوں میں اس کی ماں کی آواز بھی آئی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اس کی بیٹی کو خاموش کیا گیا ہے کہ کہیں وہ اپنا بیان نہ بدل دے لیکن اس کا باپ ڈر کے مارے یہ بات زبان پر نہیں لا رہا تھا۔''

رتھ ہیویٹ، میری مونک کے بار کاؤنٹر پر جھکی ہوئی تھی۔ اس نے گریگ کے سوال کے جواب میں کہا۔ ''چارلس برکلے۔ ہاں یہ نام میرے ماضی کا حصہ ہے۔ وہ مجھے آج بھی یاد ہے۔ وہ مائیکل کورنی کے ساتھ نظر آتا تھا اور اس کی ماں کو یہی فکر لاحق رہتی تھی کہ کہیں وہ پولیس کے ساتھ بگاڑ نہ کرے۔ کورنی اچھا آدمی نہیں تھا لیکن چارلس اسے بُرے کاموں سے روکتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ کورنی کے پاس ایک کام ہے جس میں اسے ایک آدمی کی اور ضرورت ہے۔ ایک مکان سے سامان اٹھانا ہے جو فروخت ہو رہا ہے۔ وہاں سے اچھے پیسے ملیں گے۔ وہ میری اس سے آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد میں نے اسے نہیں دیکھا۔''

☆☆☆

گریگ نے محسوس کیا کہ اس عورت کی آنکھوں میں خوف جھلک رہا ہے۔ وہ ہنری کے ساتھ کووان کے مکان میں کھڑا تھا۔ جسٹن کووان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ جیسے وہ ان دونوں پولیس آفیسرز کا مذاق اڑا رہا ہو۔ اس کی بیوی لیلن اس کے پیچھے کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ زرد اور وہ تھوڑا سا لڑکھڑا رہی تھی اسی لیے گریگ کو لگا کہ وہ تھوڑی سی خوف زدہ ہے۔

''یہ واقعی اسکاٹش نام ہے۔'' ہنری نے کہا۔ ''ہمیں توقع نہیں تھی کہ ٹیلی فون ڈائریکٹری میں اس نام کے کئی لوگ موجود ہوں گے اور ایسا ہی ہے۔ اگر تم بُرا نہ مانو تو میں کہوں گا کہ تم نے چھوٹی سی عمر میں بہت ترقی کی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ اس طرح کا یہ بڑا مکان......''

''نہیں، میں نے تمہارے کہنے کا بُرا نہیں مانا۔'' جسٹن کووان نے کہا۔ وہ دراز قد، سیاہ بالوں والا ہینڈسم شخص تھا۔ ''میں نے ایک پلاٹ خریدا، اس کی صفائی کروائی اور اسے کار پارکنگ کے لیے مخصوص کر دیا۔ میں نے وہاں ایک چھوٹا سا لکڑی کا کیبن بنایا اور وہاں ایک بوڑھے شخص کو بٹھا دیا تاکہ وہ کار کھڑی کرنے والوں سے پارکنگ فیس وصول کرتا رہے۔ میں شام کو جا کر اس سے دن بھر کی آمدنی وصول کر لیتا۔''

''کافی محنت کا کام تھا۔'' ہنری نے طنزیہ تبصرہ کیا پھر اسے دیوار پر لگی ہوئی ایک پینٹنگ نظر آئی۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''دلچسپ تصویر ہے۔''

''دا ملک میڈ۔'' کووان نے تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ ایک ڈچ آرٹسٹ فرتیز فیڈ نے بنائی تھی۔ میرے منہ بولے باپ نے اپنی موت سے چند روز قبل یہ تصویر مجھے دے دی تھی۔''

''واقعی۔'' ہنری نے ایک بار پھر طنزیہ لہجہ اختیار کیا۔ ''یہ تصویر تو اسے بھی بہت پسند ہوگی پھر اس نے تمہیں کیسے دے دی؟''

''وہ بہت فیاض تھا۔ اس نے مجھے کئی چیزیں دیں جو اس کی یاد دلاتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اسے پہلے سے اپنی موت کا اندیشہ ہو گیا ہوگا۔''

''بہت خوب!'' اب ہنری کا لہجہ قدرے نرم تھا۔ ''لیکن ہم یہاں ایک قطعہ زمین کے بارے میں بات کرنے آئے ہیں جو پارک کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔ وہاں پر تعمیراتی کام شروع کرنے کے لیے پہلے سے بنی ہوئی کنکریٹ کی تہ کو توڑا گیا تو اس کے نیچے سے دو انسانی ڈھانچے برآمد ہوئے ہیں۔ یہ لاشیں چارلس برکلے اور اس کے دوست مائیکل کورنی کی ہیں جو پندرہ سال پہلے لاپتا ہو گئے تھے۔ وہ زمین تمہارے باپ کی ملکیت تھی۔ کیا تم ان لاشوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے؟''

''بالکل نہیں۔'' جسٹن کووان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ان کے بارے میں کچھ علم نہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ ہم تم سے رابطے میں رہیں گے۔'' ہنری نے کہا۔ ''اگر تمہیں کچھ معلوم ہو جائے......''

''بالکل۔ میں تمہیں فوراً بتا دوں گا۔'' کووان نے پورے جوش و خروش سے کہا۔

ہنری اور گریگ واپس جانے کے لیے مڑے۔ ان کے کمرے سے نکلتے ہی کووان نے اپنی بیوی کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ ''باہر جا کر دیکھو کہ وہ پولیس والے چلے گئے؟''

لیلن نے حکم کی تعمیل کی اور ان دونوں کے پیچھے چلتی ہوئی بیرونی دروازے تک گئی۔ ہنری باہر جا چکا تھا لیکن گریگ نے مڑ کر دیکھا اور آہستہ سے بولا۔ ''دیکھو مسز کووان، جو کچھ اس گھر میں ہو رہا ہے، تمہیں اس سے الگ رہنا چاہیے۔ اگر کوئی غیر معمولی بات دیکھو یا محسوس کرو تو بلاخوف و خطر مائیکل گیٹ بار پولیس اسٹیشن آجانا۔ میرا نام گریگ ہے اگر میں وہاں موجود نہ ہوا تو تم کسی بھی پولیس آفیسر سے مدد لے سکتی ہو۔ ہم تمہیں مکمل تحفظ دیں گے اور اگر تمہارے پاس اس کے خلاف کوئی انفارمیشن ہے۔'' اس نے گھر کے اندر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اکتوبر 2018ء کے شمارے کی ایک جھلک
خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ
مزید
خطوط کی محفل، محفل شعر و سخن اور
ملک صفدر حیات کی تھانے داری

بجنگ آمد
چاہت کے گنگناتے جذبوں اور رقابت کی تپش میں جلنے والوں کا انجام...... آخری صفحات پر **طاہر جاوید مغل** کا دلربا انداز

مکافات
ماضی کے پوشیدہ گوشوں کی فسوں گری اور بند دریچوں میں پنہاں راز و نیاز...... تاریخی صفحات پر **ڈاکٹر ساجد امجد** کا منفرد انداز

رنگ آسماں
زہریلے سانپوں اور گہری چالوں پر مشتمل خوفناک اور عبرت ناک واقعات کا سنگم...... **اے آر راجپوت** کے خیالات کی پرواز

وقت
خوشگوار مستقبل کی آس اور کربناک ماضی کی بھول بھلیوں میں گم شدہ لمحات کا احاطہ کرتے وقت کی مکاریاں۔ **حسام بٹ** کے قلم کا جادو

اس کے علاوہ
منظر امام، تنویر ریاض، شاہ زین رضوان، سلیم انور، محمد طاہر عمیر اور ثمر عباس کی خوبصورت کہانیاں

"تب بھی تمہیں کوئی ڈر نہیں ہونا چاہیے۔" اس نے لمحہ بھر توقف کرنے کے بعد کہا۔ "ہم جانتے ہیں کہ ان دونوں آدمیوں کے قتل سے تمہارے شوہر کا کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔ اسی طرح اپنے منہ بولے باپ کی موت اور سانڈرا فیلڈنگ کی گمشدگی میں بھی اس کا ہاتھ ہے۔ ہمیں صرف اسے ثابت کرنے کے لیے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

جواب میں لیلن کووان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

مرد اور عورت ساحلِ سمندر پر ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے چہل قدمی کر رہے تھے۔ موسم بے حد خوشگوار تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی جس سے عورت کے سنہرے بال اُڑ کر اس کے چہرے اور پیشانی کو چھو رہے تھے۔ جنہیں وہ بار بار بڑی ادا سے پیچھے کر رہی تھی۔ مرد نے اسے پیار سے دیکھا اور اپنے قریب کرتے ہوئے بولا۔

"یہ بڑی پریشانی کی بات ہے۔ ہم سب کچھ جانتے ہوئے بھی اسے ثابت نہیں کر سکتے گوکہ اس طرح کے کیس ہمارے پاس آتے رہتے ہیں لیکن جسٹن کووان بہت ہی خطرناک شخص ہے جب اس کا کام نکل جاتا ہے یا وہ لوگ اس کے لیے خطرہ یا اس کے راستے کی رکاوٹ بن جاتے ہیں تو وہ انہیں غائب کر دیتا ہے یا وہ پُراسرار طور پر لاپتا ہو جاتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کوئی سامنے آئے یا پھر کوئی ثبوت ہاتھ لگ جائے۔"

وہ تقریباً پندرہ منٹ تک اسی طرح چہل قدمی کرتے رہے پھر جارج ہنری نے کہا۔

"مجھے بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔ کیوں نا اسی ریستوران میں دوبارہ لنچ کریں۔"

"ہاں۔" ڈاکٹر این اس کا بازو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے بولی۔ "ہاں، ہمیں وہیں چلنا چاہیے۔"

ڈاکٹر این کی رضامندی جان کر وہ خوشی سے جھوم اٹھا اور اسے یقین ہو گیا کہ اس کے بعد بھی باقی مراحل اسی آسانی سے طے ہوتے چلے جائیں گے اور ایک دن وہ ڈاکٹر این کو پروپوز کر سکے گا۔

☆☆☆

لیلن کووان انٹرویو روم میں بیٹھی گرم چائے پی رہی تھی جو اس کے لیے سراغ رساں گریگ نے منگوائی تھی۔ اس کی برساتی بھیگ چکی تھی اور باہر اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا گوکہ ابھی شام کے پانچ بجے تھے۔ باہر کھمبوں پر اسٹریٹ لائٹس روشن ہو چکی تھیں اور تیز بارش ہو رہی تھی۔

"میں بتا سکتی ہوں کہ سانڈرا فیلڈنگ کی لاش کہاں ملے گی؟" لیلن کووان کا چہرہ خوف سے زرد ہو رہا تھا۔ "اس نے مجھے ان دو آدمیوں کے بارے میں بھی بتایا تھا کہ اس نے ان کی لاشیں کہاں دفن کی تھیں۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں سے تم نے انہیں برآمد کیا ہے۔ اس نے وہ لاشیں دفن کرنے کے بعد وہاں کنکریٹ کی تہ بچھا دی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ دونوں لاشیں دریافت ہونے تک اسی تہ کے نیچے موجود تھیں۔ انہوں نے اس کے منہ بولے باپ کو کار تک لے جانے میں مدد کی تھی۔ اس نے انہیں بتایا کہ وہ اپنے بوڑھے باپ کو علاج کی غرض سے اسپتال لے جا رہا ہے کیونکہ بہت زیادہ شراب پینے سے اس کے باپ کی طبیعت بگڑ گئی ہے اور اس کے معدے کی صفائی ضروری ہے۔ وہ خود بھی اپنے باپ کو اسپتال لے جا سکتا تھا لیکن اسے کار تک لے جانے کے لیے مدد کی ضرورت تھی......"

"جبکہ درحقیقت ایسا نہیں ہوا۔" گریگ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "وہ اپنے باپ کو اسپتال کے بجائے شہر سے باہر لے گیا اور جنگل کے قریب ایک گڑھے میں پھینک دیا تا کہ وہ سردی سے ٹھٹھر کر مر جائے۔"

"ہاں۔" لیلن کووان نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اس کے بعد وہ دو دن تک مکان سے قیمتی اشیا دوسری جگہ منتقل کرتے رہے اور ان دونوں کو یہی بتایا گیا کہ یہ مکان فروخت ہو رہا ہے۔ اس کے باوجود جسٹن مطمئن نہیں تھا۔ کیونکہ وہ بہت کچھ جانتے تھے اور ان کا زندہ رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے موقع پا کر انہیں قتل کر دیا۔ یہی کچھ سانڈرا فیلڈنگ کے ساتھ بھی ہوا۔ گوکہ اس نے پولیس کو یہی بیان دیا تھا کہ ان پانچ دنوں میں جسٹن اس کے ساتھ تھا لیکن وہ کسی وقت بھی اپنے بیان سے مکر سکتی تھی اس لیے جسٹن نے اسے بھی راستے سے ہٹا دیا اور اب میری باری تھی۔ تم لوگوں کے آنے کے بعد وہ میری طرف سے بھی مشکوک ہو گیا تھا۔ آج دوپہر اس نے میرا گلا گھونٹنے کی کوشش کی لیکن نہ جانے کیا سوچ کر مجھے چھوڑ دیا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ ورنہ ایک منٹ بعد میری بھی لاش ہی ملتی لیکن وہ اگلی بار مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"اس کی نوبت نہیں آئے گی۔" گریگ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "اس کا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ ہم تمہارا بیان لے کر محفوظ جگہ پہنچا دیں گے اور وہ اب بقیہ زندگی جیل میں ہی گزارے گا۔"

جب کوئی افتاد پڑتی ہے تو پریشانی اچانک ہی سامنے آکھڑی ہوتی ہے... مگر کچھ نامعقول لوگ پریشانی کو خود دعوت دے بیٹھتے ہیں... اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ سرسری سی ملاقات... آگے چل کر اس کے لیے وبالِ جان بن جائے گی... ایک سیدھی سادی... اپنے کام سے کام رکھنے والی لڑکی کی رُوداد... وہ اچانک ہی کہیں غائب ہو گئی تھی... والدین... دوست... احباب اس کی گمشدگی سے سخت ہراساں اور پریشان تھے...

مجرموں اور قانون کے آہنی شکنجے میں پھنسے ایک گناہ گار کا قصۂ بے گناہی......

گُمشدہ

ارشد بیگ

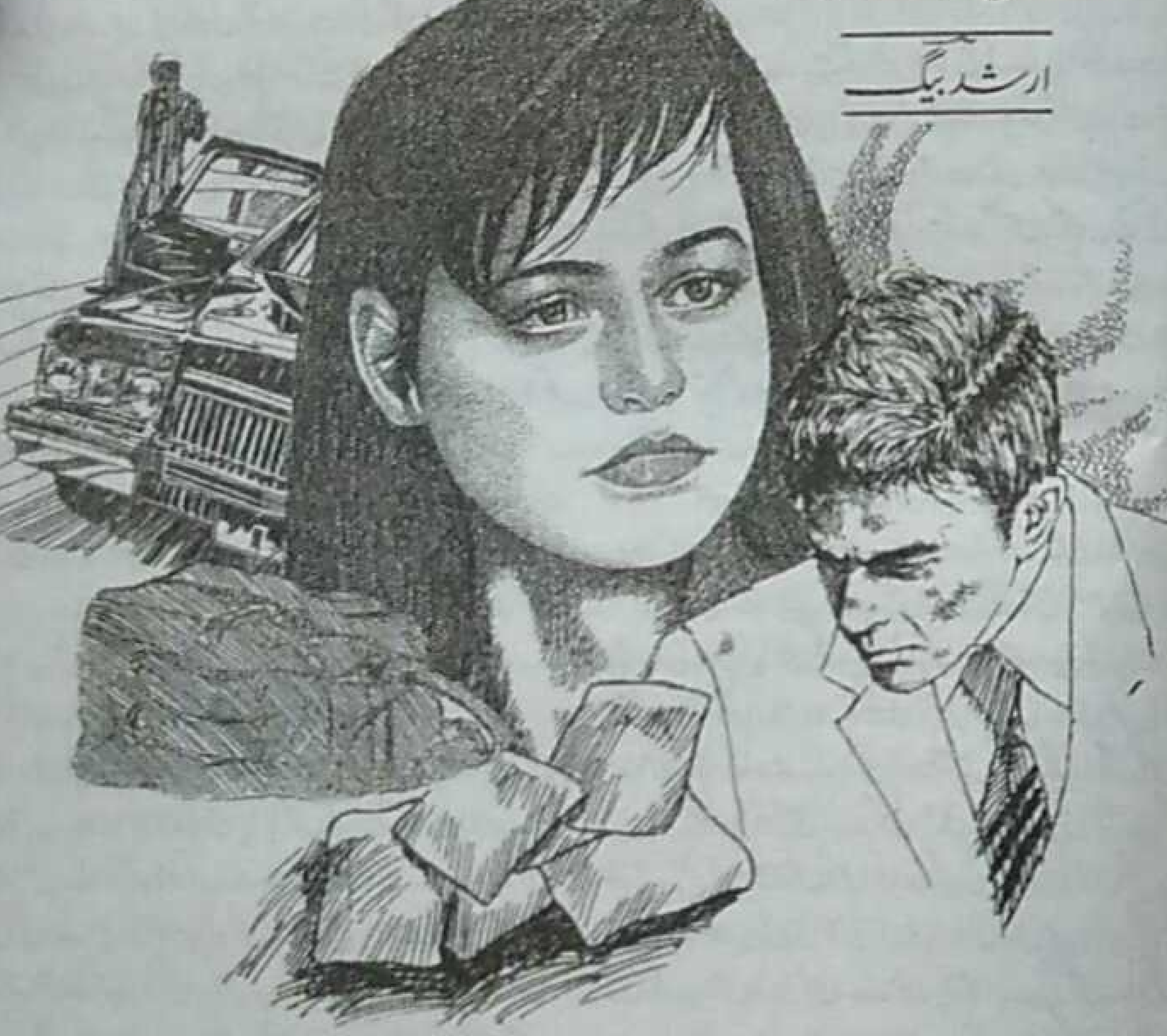

جینی اوڈیل کے والدین مقررہ وقت سے دس منٹ پہلے ہی آ گئے تھے۔ پرائیویٹ سراغ رساں آرچے چرڈ اندرونی کمرے میں ٹیلی فون پر مصروفِ گفتگو تھا جس کی وجہ سے انہیں استقبالیہ کمرے میں کچھ دیر انتظار کرنا پڑا۔ دونوں ہی پریشان اور گھبرائے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی عمریں پچاس اور پچپن کے درمیان تھیں۔ انہوں نے کام والے کپڑے پہن رکھے تھے۔ باپ کسی کار ڈیلر کے یہاں معاون کارکن اور ماں نرسنگ ہوم کے کچن

میں کام کرتی تھی۔ سراغ رساں سے گفتگو کے دوران میں انہوں نے بتایا کہ وہ نورتیج کے علاقے میں دو بیڈروم کے ایک اپارٹمنٹ میں رہتے تھے اور وہ اپنی گم شدہ بیٹی کی تلاش میں مدد کے لیے رچرڈ کے پاس آئے تھے لیکن ان کے پاس اس کی فیس ادا کرنے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ انہوں نے اپنی کل نقدی پینتالیس ڈالر اس کے سامنے رکھے اور کہا۔

''مسٹر رچرڈ پلیز ہماری بے بی کو تلاش کردو۔''

بے بی کا پورا نام جینی اوڈیل تھا۔ عمر پچیس سال اور وہ ایک کلب میں ویٹریس کے طور پر کام کرتی تھی۔ اس کی آمدنی والدین کی مجموعی تنخواہ سے دگنی تھی۔ اس نے ہائی اسکول سے گریجویشن کیا تھا اور ہیئر ڈریسر بننا چاہ رہی تھی لیکن دو ماہ کی ٹریننگ اور لائسنس حاصل کرنے کے باوجود اسے جزوقتی بیوٹیشن کی ملازمت مل سکی۔ تنخواہ اتنی کم تھی کہ اسے ایک اور ملازمت کرنا پڑی جہاں ہفتے میں تین دن جانا ہوتا تھا۔ یہ کام اسے پسند آگیا اور اس نے ایک ریستوران میں کل وقتی ملازمت کرلی۔

ساڑھے انیس سال کی عمر میں اس نے والدین کا گھر چھوڑا، اور ایک چھوٹے سے فلیٹ میں منتقل ہوگئی۔ اکیس سال کی تھی تو اس نے ایک بڑے ریستوران میں ملازمت کرلی جہاں اچھی تنخواہ کے ساتھ اسے بڑی ٹپ بھی ملتی تھی۔

...... کچھ عرصے بعد اسے ایک کلب میں زیادہ اچھی تنخواہ پر جاب مل گئی اور وہ ایک لڑکی کے ساتھ تین بیڈروم کے ڈیلکس اپارٹمنٹ میں منتقل ہوگئی۔

وہ ایک خوب صورت اور ہمیشہ خوش رہنے والی لڑکی تھی جس سے وہ بلاناغہ فون پر باتیں کرتے اور ہر دوسرے اتوار اس کے ساتھ ڈنر کرتے۔ وہ صرف ان سے قریب ہی نہیں تھی بلکہ اس کی کامیابی ان کے لیے باعثِ فخر تھی پھر وہ اچانک ہی غائب ہوگئی۔ اس نے فون پر کچھ بتایا اور نہ ہی خط کے ذریعے وضاحت کی۔ البتہ اس نے اپارٹمنٹ میں ساتھ رہنے والی لڑکی سے ایک خط کے ذریعے ضرور معذرت کی لیکن اس لڑکی کو بھی اس کے جانے کی وجہ معلوم نہیں تھی۔

''کسی مرد کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' رچرڈ نے اس کے والدین سے پوچھا۔ انہوں نے صرف ایک کے بارے میں اعتراف کیا گوکہ اس نے گزشتہ برسوں میں کئی دوست بنائے لیکن ان میں کوئی بھی اس قابل نہیں تھا جس کا تعارف وہ اپنے ممی ڈیڈی سے کرواسکتی۔

☆☆☆

گلوریا نے گھنٹی کی آواز پر دروازہ کھول دیا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ آنے والا کون ہے۔ وہ اس شخص کا انتظار کررہی تھی جو اس کے ساتھ اپارٹمنٹ میں رہ سکے۔ آنے والا مرد تھا گوکہ اس نے اشتہار میں یہ واضح کردیا تھا کہ عورت کو ترجیح دی جائے گی لیکن اسے ہر حال میں یکم ستمبر سے پہلے کسی مناسب شخص کا انتخاب کرنا تھا ورنہ اسے پورے اپارٹمنٹ کا کرایہ دینا پڑتا اس لیے وہ اس سے ملنے پر تیار ہوگئی لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ وہ شخص نہیں تھا جس کا وہ انتظار کررہی تھی بلکہ آر جے رچرڈ نامی ایک سراغ رساں تھا جس کی خدمات جینی کے والدین نے اسے تلاش کرنے کے لیے حاصل کی تھیں۔

رچرڈ نے پہلے تو بغیر اطلاع آنے پر معذرت کی اور کہا کہ وہ ٹیلی فون پر بات کرنا چاہ رہا تھا لیکن بات نہیں ہوسکی۔ دراصل وہ شام کے اوقات میں بہت مصروف ہوتی تھی اور جینی اپنے ساتھ آنسرنگ مشین بھی لے گئی تھی۔ بہرحال گلوریا اسے جینی کے بارے میں کچھ زیادہ نہ بتا سکی۔ دراصل وہ دونوں دوست نہیں تھیں۔ ان کی ملاقات ایک مشترکہ دوست کے توسط سے ہوئی تھی جب اس کی شادی ہوگئی تو گلوریا نے جینی کو اپنے ساتھ رکھ لیا۔

ان میں زیادہ بات چیت نہیں ہوتی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ انہوں نے کمرے بانٹ لیے تھے۔ جینی کے حصے میں ماسٹر بیڈروم اور چھوٹا بیڈروم آیا جبکہ گلوریا کو لیونگ روم اور میڈیم بیڈروم ملا۔ کچن، ڈائننگ روم اور بالکونی مشترکہ تھیں۔ اسی طرح ان کا سامان مثلاً کھانے کے برتن اور پلیٹیں بھی الگ الگ تھیں۔

گلوریا کو جینی سے کوئی شکایت نہیں تھی بلکہ وہ گھر کو صاف ستھرا رکھنے میں اس کی مدد کرتی تھی۔ دونوں تقریباً ہم عمر تھیں۔ گلوریا کمیونٹی کالج کی لیبارٹری میں سپروائزر تھی جبکہ جینی کلب میں ویٹریس کے طور پر کام کرتی تھی۔ وہ گلوریا سے زیادہ خوب صورت اور اسمارٹ تھی۔ وہ سگریٹ پیتی اور اپنے دوستوں کی خاطر تواضع کے لیے شراب کا بندوبست کرتی جو ہفتے میں دو تین بار اس سے ملنے آتے تھے۔

جولائی کے وسط میں گلوریا اپنے گروپ کے ہمراہ تعطیلات گزارنے شہر سے باہر گئی۔ ایک ہفتے بعد جب وہ اتوار کی سہ پہر گھر واپس آئی تو اسے ڈائننگ ٹیبل پر ایک رقعہ رکھا ہوا ملا جس پر صرف ایک لفظ سوری اور جینی کا نام لکھا ہوا تھا۔ وہ اپنا فرنیچر، کپڑے اور آنسرنگ مشین بھی ساتھ لے گئی تھی۔ البتہ بلینڈر اور کافی میکر گلوریا کے لیے چھوڑ دیا۔

رچرڈ نے گلوریا کو جینی کی ایک دو سال پرانی تصویر دکھائی اور پوچھا کہ اس میں جینی کی کتنی مماثلت نظر آتی ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ پہلے کے مقابلے میں بہت بدل گئی تھی۔ اس تصویر میں اس کے بال سیدھے اور سیاہ تھے اور وہ کسی طرح بھی بری لڑکی نہیں دکھائی دے رہی تھی۔

عین اسی وقت دروازے کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ آر جے رچرڈ ہال میں چلا گیا۔ آنے والے شخص نے اپنا تعارف رینڈی نورس کے نام سے کروایا۔ گلوریا نے اسے بیٹھنے کی دعوت دی اور اپنے اطمینان کے لیے اس سے کچھ سوالات پوچھنے لگی۔ وہ بھی ویسٹ کمیونٹی کالج میں کام کرتا تھا اور حال ہی میں اس کی تقرری کمپیوٹر اینڈ ڈیٹا پروسیسنگ ڈپارٹمنٹ میں ہوئی تھی۔

اس کی عمر اٹھائیس سال تھی۔ وہ چھ سال فوج میں گزار چکا تھا۔ وہ ناردرن الینوس یونیورسٹی کا گریجویٹ تھا اور ابھی تک اس کی رہائش ڈی کلب میں ہی تھی تاوقتیکہ اسے ویسٹ کمیونٹی کالج کے نزدیک رہنے کی جگہ نہ مل جائے۔ تاہم گلوریا اسے اپنے ساتھ رکھنے میں کچھ ہچکچا رہی تھی۔ کیونکہ وہ مرد تھا۔ دراز قد اور ہینڈسم اور گلوریا سے اس کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ وہ معمولی شکل وصورت کی لڑکی تھی اور اسے کسی بھی لحاظ سے پُرکشش نہیں کہا جاسکتا تھا۔

اپنی ضرورت کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس نے رینڈی سے آزمائشی بنیاد پر ایک مہینے کا عارضی معاہدہ کرنے کا فیصلہ کیا اور ساتھ ہی کچھ شرائط بھی بتادیں جن میں ایک یہ بھی تھی کہ وہ اپنے کسی دوست خاص پر لڑکی کو مدعو کرنے سے پہلے گلوریا کو مطلع کرے گا تاکہ اس موقع پر وہ فلیٹ میں موجود نہ رہے۔ وہ یہ شرط مان گیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا۔

''فی الحال یہاں میرا کوئی دوست نہیں ہے لیکن تم سے دوستی کی توقع کررہا ہوں۔'' اس کے ہونٹوں پر شرارتی مسکراہٹ تھی۔ ''مثال کے طور پر اگر میں کسی روز تمہیں ڈنر پر مدعو کروں تو امید ہے کہ تم انکار نہیں کروگی۔''

گلوریا نے کوئی جواب دینے کے بجائے مسکرانے پر اکتفا کیا۔ وہ بے مروتی کا مظاہرہ کرکے ایک اچھے کرائے دار کو ناراض کرنا نہیں چاہتی تھی اور پھر اگلے روز ہی انہیں کالج کے کیفے ٹیریا میں ایک ساتھ لنچ کرنے کا موقع مل گیا۔ گلوریا جیسے ہی وہاں پہنچی، رینڈی بھی اچانک اس کے سامنے آگیا اور بولا۔ ''یہی وہ جگہ ہے جہاں میں نے تمہیں پہلے دیکھا تھا۔''

گلوریا کو اس کی یہ بات کچھ عجیب سی لگی کیونکہ کھانے کے وقفے میں کیفے ٹیریا لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوتا تھا اور اس ہجوم میں نظر آنا ایک ناممکن سی بات تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ وہ تنہائی محسوس کررہا ہے اور اسے کسی ساتھی کی ضرورت ہے۔

دو دن بعد جمعے کے روز لنچ کرتے ہوئے اس نے گلوریا سے کہا، وہ شام کو اسے اپنی گاڑی میں ڈی کیب لے جاسکتی ہے کیونکہ وہ اپنی کار اس کے اپارٹمنٹ پر چھوڑ دے گا اور اگلے روز اپنا سامان وین میں رکھ کر لے آئے گا۔ اس روز شام میں گلوریا کی کوئی مصروفیت نہیں تھی اس لیے وہ اس کی مدد کرنے پر تیار ہوگئی۔ رینڈی نے اس کی گاڑی میں گیس ڈلوانے کی پیشکش کی لیکن گلوریا نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ دوستی میں ایسی باتیں نہیں کی جاتیں۔

دوسرے دن صبح گیارہ بجے دروازے پر دستک ہوئی تو گلوریا سمجھی کہ رینڈی اپنا سامان لے کر آگیا لیکن پھر اسے خیال آیا کہ اب تو اس کے پاس چابی ہے پھر وہ گھنٹی یوں بجائے گا۔ اس نے انٹرکام پر پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''میں جینی اوڈیل کا دوست ہوں اور تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں نیچے آرہی ہوں۔''

وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی اور شیشے کے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ وہ حلیے سے ہی خاصا مشکوک لگ رہا تھا۔ اس کی عمر تیس کے لگ بھگ تھی۔ اس نے خاکی رنگ کی پتلون اور نیلی قمیص پہن رکھی تھی۔ گلوریا نے ڈیوڑھی میں کھڑے کھڑے پوچھا۔

''تم جینی کے دوست ہو؟''

''اوہ، ہاں، جینی اور میں کچھ عرصہ پہلے تک ملتے رہے ہیں۔''

''اچھا مجھے یاد نہیں۔'' گلوریا نے کہا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''جوئے۔'' اس نے دیوار پر لگے ہوئے بورڈ کو دیکھا پھر بولا۔ ''جوئے گرانٹ۔''

جیسے ہی گلوریا دروازہ کھول کر باہر آئی، اس نے اس کا راستہ روک لیا۔ وہ نہ آگے جاسکتی تھی اور نہ ہی پیچھے ہٹ سکتی تھی۔ اس شخص نے اپنے دونوں بازو اس طرح پھیلائے کہ وہ دیوار کا سہارا لینے پر مجبور ہوگئی۔ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں جینی کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ وہ میری غیر موجودگی میں یہاں سے جاچکی ہے۔''

''وہ اپنی کوئی چیز چھوڑ کر گئی ہے؟ کوئی غیر اہم چیز۔''

شاید تمہیں اس کے بارے میں معلوم ہو؟“

”نہیں۔“ گلوریا نے کہا۔ ”مجھے کچھ معلوم نہیں۔“

”وہ کہاں گئی ہے۔ کلب والوں کو کچھ معلوم نہیں لیکن تم اس کی دوست ہو۔ وہ تمہارے ساتھ رہتی تھی۔ اس نے تمہیں کچھ بتایا ہوگا؟“

”نہیں، میں چھٹیاں گزارنے باہر گئی ہوئی تھی۔ واپس آئی تو وہ جا چکی تھی۔“

وہ اپنا چہرہ گلوریا کے قریب لاتے ہوئے بولا۔ ”مس، مجھ سے جھوٹ مت بولو۔“

اچانک بیرونی دروازہ کھلا اور ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ ”تم یہاں کیا کر رہے ہو جیک؟“ اس کے ساتھ ہی دو مضبوط ہاتھوں نے اسے پکڑ کر کھینچا اور گلوریا کے برابر میں ہی دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ گلوریا کو کچھ یاد نہیں کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ بس وہ اتنا ہی دیکھ سکی کہ رینڈی نے کچھ سخت سست کہنے کے بعد اسے چھوڑ دیا۔ البتہ اسے اتنا یاد رہا کہ لفٹ کے ذریعے اوپر جاتے ہوئے رینڈی نے اپنا بازو اس کے کندھوں پر رکھا ہوا تھا اور اسے سہارا دے کر اوپر لے جا رہا تھا۔

☆☆☆

اس شام آر جے رچرڈ گھر آیا تو اس کا موڈ خلاف معمول بگڑا ہوا تھا۔ اس کی بیوی گنی نے پوچھا۔ ”کیا کسی کیس کے بارے میں سوچ رہے ہو؟“

”ہاں، سوچ رہا ہوں کہ تمہیں بتاؤں یا ابھی نہیں۔“

”اگلے بدھ کے بعد میں بہت مصروف ہو جاؤں گی۔ اس لیے بہتر ہے کہ ابھی بتا دو۔“

”مجھے ایک گمشدہ لڑکی جینی اوڈیل کو تلاش کرنا ہے جو وسط جولائی سے غائب ہے۔ اس نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ یہاں تک کہ اس کے ساتھ اپارٹمنٹ میں رہنے والی لڑکی بھی لاعلم ہے وہ ایک ہفتے کے لیے شہر سے باہر گئی ہوئی تھی۔ اس کی غیر موجودگی میں اس نے اپنا سامان سمیٹا اور چلی گئی۔ کل مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس نے ایک ٹرک کرائے پر لیا تھا۔ جو چار گھنٹے میں سامان چھوڑ کر واپس آ گیا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ زیادہ دور نہیں گئی۔ میں نے قریب ترین سیلف اسٹوریج کو چیک کیا اور اس شخص کا پتا لگانے میں کامیاب ہو گیا جس نے اس کا سامان اتارنے میں مدد کی تھی لیکن اس سے مسئلہ اور الجھ گیا۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ لاپتا فرد نہیں اور نہ ہی کوئی چھوٹی بچی ہے بلکہ ایک پچیس سال کی لڑکی ہے جو کئی سالوں سے خود مختار زندگی گزار رہی ہے اور اپنی مرضی سے کہیں چلی گئی ہے۔“

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ والدین سے اس کے بہت اچھے تعلقات تھے اور وہ بھی اس سے خوش تھے کیونکہ اس کی وجہ سے ان کی زندگی آرام سے گزر رہی تھی۔ اسی طرح روم میٹ سے بھی اس کے اچھے تعلقات تھے لیکن اس نے اسے بھی اپنے جانے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا اور اسٹوریج میں بھی اپنا سامان چھ مہینے کے لیے رکھوایا جیسے اسے اس دوران میں واپس آنے کی امید ہو۔“

”کیا تم اسی وجہ سے پریشان ہو؟“ گنی نے پوچھا۔

”نہیں۔“

”پھر کس بات کی پریشانی ہے؟“

”میں اس لڑکی سے مل چکا ہوں جو اس کے اپارٹمنٹ میں رہتی ہے۔ گلوریا نے مجھے بتایا کہ وہ دونوں الگ الگ زندگی گزار رہی تھیں اس لیے وہ اس کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں بتا سکتی سوائے اس کے کہ اس کی کئی مردوں سے دوستی تھی۔ وہاں سے واپسی پر میں اس کلب میں گیا جہاں وہ کام کرتی تھی۔ منیجر نے بتایا کہ جب یہ کلب شروع ہوا تھا، تب سے وہ یہاں کام کر رہی تھی۔ اسے سب لوگ پسند کرتے تھے اور وہ ٹپ کے ذریعے اچھے خاصے پیسے کما لیتی تھی اور کمپنی کی پالیسی کے مطابق کلب بند ہونے کے بعد کسی سے میل جول نہیں رکھتی تھی۔ گو کہ وہ یہاں سے کسی سے بھی بہت زیادہ قریب نہیں تھی لیکن اس کے اچانک چلے جانے پر سب حیران رہ گئے۔“

”میں نے منیجر سے کہا کہ کیا وہ مجھے اس کی کوئی حالیہ تصویر دے سکتا ہے اور اس نے مجھے ایسی ایک تصویر دے دی۔ اس کے پاس اور بھی کئی تصویریں تھیں جو کام کرنے کے دوران میں لی گئی تھیں لیکن میرے پاس انہیں دیکھنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ پھر اس نے مجھے ایک بارٹینڈر اور ویٹریس سے ملوایا جو دو سال سے جینی کے ساتھ کام کر رہے تھے لیکن ان سے کوئی خاص بات معلوم نہ ہو سکی۔ سوائے اس کے کہ اس کے حالیہ دوست کا نام رون تھا لیکن وہ اس کا پورا نام نہیں بتا سکے۔ اس کے بغیر یہ اطلاع بے معنی تھی۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے دو تصویریں نکالیں اور ان میں سے ایک اسے دیتے ہوئے بولا۔ ”گو کہ یہ تصویر دو سال پرانی ہے لیکن جینی کے والدین کے مطابق اس سے بہت ملتی ہے۔“

اس تصویر میں وہ لڑکی بہت مطمئن، سیدھی سادی اور

خوشگوار موڈ میں نظر آ رہی تھی۔ وہ ایک پکنک ٹیبل پر بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے سامنے جوس کا کین رکھا ہوا تھا۔ اس نے زرد رنگ کی پولو شرٹ اور نیلے رنگ کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔

”جب میں نے اس کی روم میٹ کو وہ تصویر دکھائی تو وہ بولی کہ یہ جینی سے بہت مختلف ہے۔ وہ کبھی مطمئن نہیں دکھائی دی اور چہرے سے ہی بُری لڑکی لگتی ہے۔ اس کے بال ہمیشہ بے ترتیب رہتے اور وہ بہت زیادہ میک اپ کرتی ہے۔ وہ دیکھنے میں ہی تھکی ہوئی اور مایوس لگتی ہے اور یہ دوسری تصویر ہے جو کلب کے منیجر نے مجھے دی تھی۔“

گنی نے دونوں تصویروں کا باری باری جائزہ لیا اور پھر اس کی نظریں دوسری تصویر پر ٹھہر گئیں جس میں جینی پہلی تصویر سے بالکل مختلف لگ رہی تھی۔ اس نے ایسا لباس پہن رکھا تھا جو اس کے پیشے کے لیے ناگزیر تھا اور بہت حد تک ون پیس پیراکی کے لباس جیسا تھا۔ اس تصویر میں دو ویٹریس پوز بنائے کھڑی تھیں اور ان کے عقب میں اسٹیج پر ایک نیم برہنہ عورت نظر آ رہی تھی۔ گنی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ”یہ وہ جگہ نہیں جہاں تمہاری ایجنسی مداخلت کرے۔“

”بالکل۔“ رچرڈ نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”یہ محض......“

”ٹھیک ہے، آگے کہو۔“

”جینی کے والدین میرے کلائنٹ ہیں اور میں نہیں سمجھتا کہ ان کی زندگی میں جینی کے علاوہ کچھ ہے۔ وہ چھوٹے موٹے کام کر کے اپنا گزارہ کر رہے ہیں اور ان کے پاس میری فیس دینے کے لیے پیسے نہیں ہیں جبکہ میں پہلے ہی اس تحقیقات پر چھ گھنٹے لگا چکا ہوں اور اب تک میرا تین سو ڈالر کا بل بن چکا اور مجھے صرف پینتالیس ڈالر ملے ہیں۔ اب تک میں جو کچھ معلوم کر سکا ہوں، وہ یہ کہ ان کی بیٹی لاپتا نہیں ہوئی بلکہ اپنی مرضی سے کہیں چلی گئی ہے یا کہیں چھپی ہوئی ہے۔“

”کیونکہ وہ لاپتا نہیں ہوئی اس لیے پولیس بھی اس معاملے میں دلچسپی نہیں لے گی اور نہ ہی اسے بسوں، ٹرین، ہوائی جہاز یا اس کے نئے ایڈریس پر تلاش کرے گی جو اس نے یقیناً پوسٹ آفس میں دیا ہوگا۔ ہمیں اس کی کار کا میک، ماڈل اور لائسنس نمبر بھی معلوم نہیں جس کی وجہ سے اس کی تلاش میں کوئی مدد نہیں مل رہی گو کہ میں کوشش کر رہا ہوں لیکن ابھی تک کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔“

”اور تم اس کیس کو چھوڑنا بھی نہیں چاہتے؟“

”جب تک میں نے اس کی روم میٹ کی گفتگو نہیں سنی اور وہ تصویر نہیں دیکھی...... میں یہی سمجھ رہا تھا کہ صورتِ حال اتنی تشویش ناک نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ وہ بیزار ہو گئی ہو، لاس ویگاس چلی گئی ہو یا اس نے نیا پیشہ اختیار کر لیا ہو اور اپنے والدین کا سامنا نہ کرنا چاہتی ہو۔ ایسا لگتا تو نہیں لیکن سب کچھ ممکن ہے۔ بہرحال اس نے جو بھی کیا، اس میں اس کا ارادہ شامل ہے۔“

”اب تم ایسا نہیں سمجھتے؟“

”اس کی اچھی خاصی آمدنی تھی اور وہ ایک مہنگے اپارٹمنٹ میں رہ رہی تھی۔ بظاہر اس کے جانے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی لیکن اس کی دوسری تصویر دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کسی خوف میں مبتلا تھی اور اس کا سامنا وہ کافی عرصے سے کر رہی تھی۔ اسی لیے وہ یہاں سے چلی گئی۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ وہ اپنی مرضی سے نہیں گئی؟“

”ہاں، اسے حالات نے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا۔ جن کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔“

”تمہارے خیال میں اسے کس کا خوف ہو سکتا ہے؟“

”لگتا یہی ہے کہ وہ کسی ایک شخص یا کچھ لوگوں کے ڈر سے بھاگ رہی ہے اور سمجھتی ہے کہ اسے ان سے کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ وہ ان کا مقابلہ یا اپنا دفاع نہیں کر سکتی اور جانتی ہے کہ کوئی بھی اس کی مدد نہیں کر سکتا۔“

”گویا تم یہ کہہ رہے ہو؟“

”ہاں، اس بات کا بہت امکان ہے کہ وہ خطرے میں ہو اور مجھے شبہ ہے کہ جو کوئی بھی اس کا تعاقب کر رہا ہے، وہ محض اس لیے اپنی کوشش ترک نہیں کرے گا کہ اسے تلاش کرنا آسان نہیں۔“

☆☆☆

گلوریا کو اپارٹمنٹ میں چھوڑ کر رینڈی وین سے اپنا سامان اتارنے چلا گیا۔ اس وقت تک گلوریا کے حواس بحال ہو چکے تھے۔ اس نے سامان رکھنے میں رینڈی کی مدد کی۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے کھانا کھایا جو ان کا ایک ساتھ چوتھا لنچ تھا۔ گلوریا نے ازراہِ مذاق کہا۔ ”ایسا لگتا ہے کہ ہم ایک ساتھ لنچ کرنے کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔“

”میرے لیے تو یہ اچھی بات ہے کیونکہ اس شہر میں نیا ہوں اور میرا کوئی دوست بھی نہیں ہے۔“ رینڈی بولا پھر اس نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ”تم نے کسی سراغ رساں کا تذکرہ کیا تھا جو جینی کو تلاش کر رہا ہے۔ بہتر ہوگا کہ اسے اس

شخص کے بارے میں بتادیا جائے جو جینی کو پوچھتا ہوا یہاں آیا تھا اور تمہیں پریشان کر رہا تھا۔"

"جیسا تم مناسب سمجھو۔"

چنانچہ کھانا کھانے کے بعد اس نے رچرڈ کا نمبر ملایا اور بولا۔ "میرا نام رینڈی نورس ہے اور میں گلوریا کا دوست ہوں۔ کچھ دیر پہلے یہاں ایک واقعہ پیش آیا اور ہم سمجھتے ہیں کہ تم اس بارے میں جاننا چاہو گے۔ وہ تھوڑی سی پریشان ہے۔ اس لیے اس نے مجھ سے کہا ہے کہ تمہیں اس واقعے کی اطلاع دے دوں لیکن اگر تم چاہو تو اس سے بات کر سکتے ہو۔"

"بعد میں کرلوں گا۔ اسے کوئی نقصان تو نہیں پہنچا؟"

"جسمانی تو نہیں البتہ ذہنی طور پر وہ کافی منتشر ہے۔ اگر میں وقت پر نہ آجاتا تو اسے نقصان پہنچ سکتا تھا۔" یہ کہہ کر رینڈی نے رچرڈ کو پورا واقعہ سنا دیا۔

"اس کا حلیہ بتاؤ۔" رچرڈ نے کہا۔

"قد تقریباً چھ فٹ ایک انچ، دبلا پتلا، سنہرے بال، زرد آنکھیں، عمر تقریباً تیس سال اس نے گہری نیلے رنگ کی قمیص، سرخ ٹائی اور خاکی پتلون پہنی ہوئی تھی۔ لیموزین میں سوار ہوتے وقت اسی رنگ کا کوٹ پہن لیا۔ البتہ میں اس کی کار کا نمبر نہ دیکھ سکا۔"

"وہ دوبارہ بھی آسکتا ہے اور شاید تمہارے اپارٹمنٹ میں نقب لگائے کیونکہ وہ کسی ایسی چیز کی تلاش میں ہے جو جینی نے کہیں چھپا رکھی ہے۔ اس کے علاوہ تمہاری بلڈنگ میں کیمرے لگے ہوئے ہیں۔ تم انتظامیہ کو یہ کہانی سنا کر ان سے اس واقعے کی ویڈیو یا اس شخص کی تصویر لے سکتے ہو پھر وہ پولیس کو دے دینا۔ دو کاپیاں مل جائیں تو اچھا ہے۔ ایک مجھے دے دینا۔"

☆☆☆

"کیا تم سوموار کو مصروف ہو؟" رچرڈ نے بیوی سے پوچھا۔

"کیوں؟ کوئی خاص بات ہے؟" گنی نے پوچھا۔

"وہی جینی اوڈیل والا معاملہ۔ میں بیک وقت دو جگہ نہیں جاسکتا۔"

"دو جگہ سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"چلر پارک اور دوسری جگہ کے بارے میں خود مجھے بھی معلوم نہیں۔ یاد ہے میں نے کل تمہیں بتایا تھا کہ مجھے جینی کی کار کے بارے میں کچھ معلوم ہوا ہے۔"

"ہاں، اس نے اپنی کار بیچ دی ہے۔"

"کار خریدنے والی عورت چلر پارک میں رہتی ہے۔ جینی نے یہ سودا اپارٹمنٹ سے جانے کے دوسرے دن ہی کر لیا تھا۔ اس طرح کے سودے عام طور پر خاندان والوں یا دوستوں کے درمیان ہوتے ہیں۔ وہ عورت اس کی کوئی رازداں ہوسکتی ہے یا یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے اشتہار دیکھ کر اس سے رابطہ کیا ہو۔ اگر تمہارے پاس وقت ہے اور تم میری مدد کرنا چاہتی ہو تو اس عورت سے کچھ معلوم کرنے کی کوشش کرو۔"

"تمہارا دوسرا پروجیکٹ کیا ہے؟"

"آج دوپہر مجھے رینڈی نورس نے فون کیا تھا۔ وہ گلوریا کا نیا روم میٹ ہے جسے اس نے جینی کی جگہ اپنے اپارٹمنٹ میں رکھا ہے۔ آج صبح جب وہ اپنا سامان لے کر آیا تو اس نے دیکھا کہ ایک آدمی گلوریا کو پریشان کر رہا ہے اور قریب تھا کہ وہ اس پر حملہ کردے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

"رچرڈ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں نے تمہیں بتایا تھا کہ جینی کسی کو جگہ دینے کی کوشش کر رہی ہے اور یہ شخص کسی ایسی چیز کی تلاش میں آیا ہوگا جو وہ چھوڑ گئی ہو یا پھر اس کا نیا پتا معلوم کرنا چاہ رہا ہوگا۔ یہ گلوریا کی خوش قسمتی ہے کہ نورس فوج میں دو سال گزار چکا ہے، وہ بروقت پہنچ گیا اور اس نے ذرا دھمکا کر اس شخص کو بھاگنے پر مجبور کردیا۔ بہتر ہوتا کہ وہ اس شخص کو پولیس کے حوالے کردیتا گو کہ اس شخص نے اپنا فرضی نام بتایا لیکن وہ شوفر کی وردی پہنے ہوئے تھا اور لیموزین میں آیا تھا۔ لہٰذا میں اس لیموزین کمپنی کی تلاش میں جا رہا ہوں جو اپنے ڈرائیوز کو نیلی قمیص اور خاکی پتلون پہناتی ہے۔"

پیر کی صبح گنی نے ایک سرکاری اہلکار کا روپ دھارا۔ اور اس عورت سے ملنے چلی گئی جس نے جینی کی کار خریدی تھی۔ یہ بتانے کے لیے کہ اس خریداری میں سیلز ٹیکس کا حساب کرنے میں غلطی ہوئی ہے اور اس سلسلے میں جینی کو مطلع کرنا ضروری ہے مگر مطلوبہ عورت فلس ہرمانسکی اپنے گھر پر موجود نہیں تھی۔ چنانچہ گنی نے عمارت میں بنی ہوئی دکانوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اس وقت صبح کے ساڑھے آٹھ بجے تھے اور عمارت کے کونے میں واقع صرف ایک ہوٹل ہی کھلا ہوا تھا۔ گنی نے کاؤنٹر پر بیٹھی ویٹریس سے پوچھا۔

"مجھے اوپر کی منزل پر رہنے والی ایک کرائے دار کے بارے میں معلوم کرنا ہے۔ کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ وہ کہاں ملے گی؟"

اس نے آخری بوتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہوڈی!"

گنی نے آخری بوتھ میں جھانک کر دیکھا۔ ہوڈی ناشتا کر رہا تھا۔ گنی نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "معاف کرنا، مجھے ویٹریس نے بتایا ہے کہ تم شاید فلس ہرمانسکی کے بارے میں جانتے ہو۔ وہ اس وقت کہاں ملے گی؟"

"تم اس سے کیوں ملنا چاہتی ہو؟"

"کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔"

اس نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "تم پولیس والی تو نہیں ہو؟"

"نہیں، دراصل مس ہرمانسکی نے چند ہفتے قبل ایک استعمال شدہ کار خریدی ہے، ہمیں صرف سیلز ٹیکس کے حوالے سے کچھ معلومات درکار ہیں۔"

"وہ تمہیں بینسن ول کے بیوٹی پارلر میں مل سکتی ہے۔ یہ آنسرنگ پارک پر واقع ہے۔"

گنی کو بیوٹی پارلر ڈھونڈنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ مس ہرمانسکی وہاں موجود تھی۔ گنی نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے جولائی میں ایک فورڈ مستانگ جینی اوڈیل نامی خاتون سے خریدی تھی۔ اس کے سیلز ٹیکس میں ایک غلطی ہے لیکن اس کا تم سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم جینی اوڈیل سے رابطہ نہیں کر سکے۔ لگتا ہے کہ وہ کسی کو اپنا نیا پتا بتائے بغیر کہیں چلی گئی ہے۔ مجھے ڈپارٹمنٹ کی طرف سے بھیجا گیا ہے تاکہ تم سے مل کر معلوم کروں کہ وہ کہاں مل سکتی ہے۔"

گنی نے جیسے ہی جینی کا نام لیا، ہرمانسکی کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اس نے سیلون کے داخلی دروازے کی طرف دیکھا۔ ایک نوجوان عورت اندر داخل ہو رہی تھی اور اس نے بھی وہاں کی ہیئر اسسٹنٹ کا لباس پہن رکھا تھا۔ گنی نے عقبی دیوار میں لگے ہوئے قدِ آدم آئینے میں دیکھا اس لڑکی نے اپنے بال ڈائی کیے ہوئے تھے اور آنکھوں کے گرد گہرا میک اپ تھا۔ اس کی اچانک آمد سے مس ہرمانسکی بوکھلا گئی اور قدرے اونچی آواز میں بولی۔

"جینی اوڈیل؟ میں اس کے بارے میں کیا بتا سکتی ہوں کہ وہ کہاں ملے گی؟ میری صرف اس سے کار خریدتے وقت ملاقات ہوئی تھی۔"

آنے والی لڑکی بھی اچانک اپنی جگہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ گنی نے اس لڑکی سے تغافل برتتے ہوئے کہا۔ "چلانے کی ضرورت نہیں۔ اگر تم مدد نہیں کر سکتیں تو کوئی بات نہیں۔ اس معاملے کا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے تمہیں اتنا گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ شرمندہ ہوتے ہوئے بولی۔ "مجھے افسوس ہے۔ شاید میں تمہاری بات سمجھ نہیں سکی۔"

"بہرحال اگر کبھی اس کے بارے میں معلوم ہو تو مجھے اطلاع کردینا۔ میں تمہیں ایک نمبر دے رہی ہوں۔"

جب وہ ایک کاغذ پر آر جے رچرڈ کا پرائیویٹ نمبر لکھ رہی تھی تو وہی سنہرے بالوں والی لڑکی ان کے پاس سے گزری اور دوسری کرسی پر جا کر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ اب ان کے درمیان چھ سے آٹھ فٹ کا فاصلہ تھا اور گنی کو اس بارے میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہی جینی اوڈیل تھی۔ گو کہ اس نے بال ڈائی کر لیے اور چہرے میں بھی کچھ تبدیلی لانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے سینے پر لگے ہوئے بیج پر اس کا نام ڈونا این لکھا ہوا تھا۔

☆☆☆

بے چاری

جارج بش اور اوباما ایک بار میں بیٹھے دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک ہندو لڑکا ان کے قریب آیا اور بہت مرعوب ہوتے ہوئے بولا۔ "سر! میں آپ دونوں کا تہ دل سے پرستار ہوں۔ کیا آپ یہ بتانا پسند کریں گے کہ آپ کس موضوع پر بات کر رہے ہیں؟"

"تیسری جنگ عظیم ہمارا پلان ہے۔" بش نے کہا۔ "اس مرتبہ ہم دو تین کروڑ مسلمانوں کو ماریں گے اور کترینہ کیف کو بھی!"

"کترینہ بے چاری کو کیوں؟" لڑکے نے حیرت سے پوچھا۔

بش نے فاتحانہ انداز میں اوباما کی طرف دیکھا اور بولا۔ "میں نہ کہتا تھا کہ مسلمانوں کو مارنے پر کوئی کچھ نہیں بولے گا۔ اس لڑکے کو کروڑوں مسلمانوں کے قتل سے کوئی واسطہ نہیں — ایک کترینہ کی فکر ہے — میں اتنی دیر سے تم کو یہی سمجھا رہا تھا۔ میری مانو اور پروگرام پر عمل شروع کردو!"

خانیوال سے قدرت اللہ نیازی کے چٹکلے

اکیس سال کی عمر میں جینی اوڈیل کو ایک ریستوران میں ویٹریس کی ملازمت ملی تو اس کی آمدنی میں بھی اضافہ ہو گیا اور اسے تنخواہ کے علاوہ اچھی خاصی ٹپ بھی ملنے لگی۔ تین ماہ بعد اس نے اپنی دوست کے ساتھ اروبا جانے کا پروگرام بنایا۔ جہاں ان کی ملاقات ٹیری اور جوئے سے ہوئی۔ یہ دونوں اومیئر کے ائرپورٹ سے ہی ان کے پیچھے لگ گئے تھے۔ اروبا میں انہوں نے پانچ دن اکٹھے سیر و تفریح کرتے ہوئے گزارے۔ ٹیری کی جوڑی جینی کے ساتھ بن گئی جبکہ جوئے نے اس کی سہیلی کو چن لیا۔ واپس آنے سے ایک رات قبل ٹیری نے اسے بتایا کہ وہ کسی کام کے سلسلے میں میامی جارہا ہے۔ اس نے جینی سے کہا کہ اس کے بیگ میں بالکل جگہ نہیں ہے۔ کیا وہ اپنے سوٹ کیس میں اس کی شیونگ کٹ رکھ لے گی۔ وہ واپس آکر اپنا سامان لے لے گا۔ جینی ہمیشہ سے دوسروں کی باتوں میں آجاتی تھی۔ اس بار بھی اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔

شکاگو آنے کے دو دن بعد اس کی دوست نے فون پر کہا۔ ''تم نے سن ٹائمز دیکھا۔ صفحہ نو پر ٹیری کی خبر چھپی ہے۔ وہ میامی میں کوکین لے جاتے ہوئے پکڑا گیا۔''

یہ سنتے ہی جینی کو اس بیگ کا خیال آیا جو ٹیری نے اسے دیا تھا۔ وہ دروازے کے ساتھ ایک میز پر رکھا ہوا تھا۔ جینی کا خیال تھا کہ جب وہ آئے گا تو وہ اسے دروازے سے ہی بیگ پکڑا کر خدا حافظ کہہ دے گی مگر اب صورتِ حال بدل چکی تھی۔ اس نے بیگ کھولا۔ اس میں کپڑے میں لپٹے ہوئے چھ جار رکھے ہوئے تھے۔ ہر ایک کا وزن لیبل کے مطابق آٹھ اونس تھا۔ اس نے ایک جار کھول کر اس میں انگلی ڈالی جو آدھا فاصلہ طے کرنے کے بعد کسی ٹھوس چیز سے ٹکرائی۔

جینی اتنی معصوم نہیں تھی۔ وہ سگریٹ اور شراب کا مزہ چکھ چکی تھی لیکن منشیات سے ابھی تک اس کا واسطہ نہیں پڑا تھا لیکن وہ سمجھ گئی تھی کہ ان جاروں میں کیا ہے۔ وہ سوچ میں پڑ گئی کہ کیا کرے۔ پہلے خیال آیا کہ پولیس کو اطلاع کر دے لیکن کیا وہ اس کی بات پر یقین کرلیں گے۔ کہیں وہ خود کسی مصیبت میں نہ پھنس جائے۔ چنانچہ اس نے اس سے جان چھڑانے اور کسی کو کچھ نہ بتانے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ باتھ روم میں گئی۔ اس نے سفید پاؤڈر سے بھرے ہوئے چھ پلاسٹک بیگ نکالے اور انہیں ٹوائلٹ کے فلیش میں بہا دیا۔ پھر اس نے جار پر سے لیبل اتارے اور جار سمیت تمام چیزوں کو عمارت کے عقب میں کچرے دان میں پھینک دیا۔

ایک ہفتے بعد اسے پہلا خط موصول ہوا۔ اس میں لکھا تھا۔ ''ڈیئر مس جینی! ہوسکتا ہے کہ مجھے آنے میں دیر ہو جائے۔ میرا شیونگ بیگ سنبھال کر رکھنا۔ ٹیری سیمسن۔''

خط پڑھ کر وہ سنّاٹے میں آگئی۔ ٹیری نے اسے استعمال کیا اور وہ منشیات کے حوالے سے قانون شکنی کی مرتکب ہوئی لیکن اس سے بھی بُرا وقت وہ ہوگا جب ٹیری اپنی امانت واپس لینے اس کے دروازے پر آئے گا جسے وہ فلیش میں بہا چکی تھی۔

اس کے بعد کچھ مزید خطوط آئے۔ ایک دو میں یہ دھمکی بھی دی گئی تھی کہ اگر ٹیری کو اس کا سامان نہیں ملا تو وہ مشکل میں پڑ جائے گی۔ پہلے اس نے سوچا کہ وہ کہیں روپوش ہوجائے لیکن پھر اس نے ٹیری کے مقدمے کا فیصلہ ہونے تک انتظار کرنا مناسب سمجھا۔ جولائی میں اسے نو سال قید کی سزا سنائی گئی لیکن تین ماہ بعد ہی وہ پیرول پر رہا ہو گیا۔ اس کے رہا ہوتے ہی جینی نے فرار کا منصوبہ بنایا اور ڈونا این کے نام سے ہیئر ڈریسر کی ملازمت اختیار کرلی۔

اس کا خیال تھا کہ کچھ عرصے بعد ٹیری اس کی تلاش ترک کردے گا یا دوبارہ کسی جرم میں گرفتار ہو کر جیل چلا جائے گا۔ چنانچہ وہ ڈونا این کے روپ میں اس بیوٹی پارلر میں کام کرتی رہی جہاں ایک لڑکی تھوڑا بہت اس کے بارے میں جانتی تھی۔ باقی لوگوں سے اس نے جھوٹ بولا۔ یہی نہیں بلکہ اپنے لیے جعلی کاغذات اور جعلی لائسنس بھی بنوالیا اور دو کمروں کا فلیٹ کرائے پر لے کر وہاں رہنے لگی۔

ایک شام جب وہ کچھ خریداری کرنے کے بعد گھر واپس آئی تو اس نے اپنے اپارٹمنٹ کے نیچے ایک کار کھڑی دیکھی۔ اس میں سے ایک شخص باہر آیا۔ اس وقت تک اندھیرا ہو چکا تھا اس لیے وہ اسے ٹھیک طرح نہ دیکھ سکی۔ اس نے اپنا پرس اور بیگ سنبھالا اور تیز تیز قدموں سے چلنے لگی۔ وہ آدمی بھی اس کے پیچھے آیا اور اونچی آواز میں اس کا نام لے کر پکارا۔

''جینی اوڈیل!''

اس نے وقت ضائع کیے بغیر اپنی کار کی طرف دوڑ لگا دی اور تیزی سے کار چلاتے ہوئے وہاں سے فرار ہوگئی۔ ایک منٹ بعد اس کی کار نے بھی جینی کا پیچھا کرنا شروع کردیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ وہ واپس بھی نہیں جاسکتی تھی کیونکہ پہچان لی گئی تھی گو کہ آواز سے اس نے اندازہ لگالیا کہ وہ ٹیری نہیں تھا لیکن ممکن ہے کہ وہ اس کا کوئی دوست ہو جو کسی لالچ میں اس کی مدد کررہا تھا۔

وہ مختلف راستوں پر گاڑی دوڑاتی رہی۔ اس کی کوشش یہی تھی کہ وہ اسے چکما دے کر نکل جائے بالآخر اس کی یہ کوشش کامیاب ہوئی۔ ایک جگہ اسے یوٹرن ملا اور اس نے اپنی گاڑی واپس موڑ لی جبکہ وہ تیزی میں سیدھا نکل گیا۔ وہ جگہ اس کے پرانے اپارٹمنٹ سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر تھی۔ اگر وہ گلوریا کے پاس چلی جائے تو ایک رات وہاں قیام کرسکتی تھی یا اس سے کچھ پیسے لے کر کسی موٹیل میں چلی جاتی۔

اس نے اپنی کار کچھ فاصلے پر روکی اور وہاں سے چلتی ہوئی اپنی پرانی عمارت کی طرف آگئی۔ وہاں ایک سیڈان کھڑی تھی جو تقریباً ویسی ہی تھی جس نے اس کا تعاقب کیا تھا جبکہ عین اسی وقت ایک لیموزین وہاں آکر رکی۔ اس نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی کیونکہ رات کے نو بج رہے تھے اور اسے فوری طور پر پناہ کے لیے جگہ چاہیے تھی۔

اس نے اپنے عقب میں کسی کار کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس میں سے لیموزین کا ڈرائیور باہر نکلا۔ یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ لہٰذا وہ چلتی رہی لیموزین کا ڈرائیور بھی اس کے پیچھے آیا اور جب وہ اس کے قریب پہنچا تو بہت دیر ہوچکی تھی۔

''میری جان، میری مس جینی۔ تم نے اپنے بال ڈائی کروا لیے۔'' ٹیری سیمسن اس کی کلائی پکڑتے ہوئے بولا۔

☆☆☆

گلوریا اور رینڈی بہت جلد ایک دوسرے کے قریب آگئے۔ گلوریا تو اسی وقت سے اس کی قدر کرنے لگی تھی جب اس نے اس بدمعاش سے اسے بچایا تھا۔ جب وہ اسے سہارا دے کر بیڈروم میں لایا تو گلوریا نے اظہارِ تشکر کے طور پر اس کا گال چوم لیا جو اس کے نزدیک کوئی خاص بات نہیں تھی لیکن وہ اتنا خوش ہوا کہ اسے بانہوں میں لے کر رقص کرنے لگا۔ اتوار کے دن اس نے انکشاف کیا کہ وہ بہت اچھا کھانا بنا سکتا ہے اور اصرار کر کے اس نے اپنے اور گوریا کے لیے ڈنر تیار کیا۔ کھانے کے بعد انہوں نے ساتھ بیٹھ کر فلم دیکھی۔

پیر کے دن کھانے کے وقفے کے دوران گلوریا کو اچانک یہ محسوس ہوا کہ رینڈی کے ساتھ اس کا جوڑ کسی طرح مناسب نہیں۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ وہ اس معاملے کو یہیں ختم کردے۔ گھر آنے کے بعد وہ ساڑھے آٹھ بجے اپنے کاموں سے فارغ ہوئی تو اس نے رینڈی کے کمرے کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہا۔ ''رینڈی، مجھے تم سے بات کرنی ہے۔''

شریر کہیں کے.... تم نے ابھی ابھی میرے بچے کو کے مارے اور اب ڈراما کر رہے ہو!

''ہاں کہو۔'' وہ دروازے پر آتے ہوئے بولا۔

وہ دونوں لیونگ روم میں صوفے پر بیٹھ گئے تو گلوریا نے کہا۔ ''میں سمجھتی ہوں کہ جو کچھ ہمارے درمیان ہوا، وہ ایک غلطی تھی۔ اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔''

''اوہ۔'' وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ''لیکن میں سمجھ رہا تھا کہ......''

''میں جانتی ہوں کہ تم کیا سمجھ رہے تھے لیکن تمہیں غلط فہمی ہوئی۔ میں اب تک یہی سمجھ رہی تھی کہ تم میرا خیال رکھتے ہو۔ میرے لیے پریشان ہوتے ہو۔''

گلوریا کی بات پوری نہ ہوئی تھی کہ گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ گلوریا نے انٹرکام اٹھایا۔ دوسری طرف سے جینی کی آواز سنائی دی۔ ''میں ہوں جینی اوڈیل، تمہارے پاس آنا چاہتی ہوں۔ میرے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' یہ کہہ کر گلوریا نے بٹن دبایا اور اس کا انتظار کرنے لگی۔ چند سیکنڈ بعد اس نے دستک دی۔ گلوریا نے دروازہ کھولا۔ جینی اندر داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے ٹیری تھا جسے دیکھ کر گلوریا سکتے میں آگئی۔

''میں واپس آگیا ہوں مس۔'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا پھر چاقو لہراتے ہوئے بولا۔ ''تم بھی اس کے ساتھ ہی کھڑی ہوجاؤ۔''

گلوریا بمشکل جینی کو پہچان پائی۔ اس کے تراشیدہ سنہرے بال، آنکھوں کا گہرا میک اپ اور عجیب سا لباس، سب کچھ اس کے لیے نامانوس تھا۔

ٹیری نے کہا۔ ''میں جانتا تھا کہ تم جھوٹ بول رہی ہو۔ جینی کہیں نہیں گئی بلکہ یہیں رہ رہی تھی۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

''نہیں۔'' جینی چلائی۔ ''اور اس بات کی کوئی اہمیت نہیں۔ چاہے میں کہیں بھی رہوں تمہیں مجھ سے غرض ہے۔''

''تم؟'' وہ طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔ ''تم سے کس کو غرض ہوسکتی ہے۔ مجھے اپنا مال چاہیے وہ یہیں پر ہے اور وہ میں لینے آیا ہوں۔''

گلوریا نے سوچا، وہ سراغ رساں ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ جینی کے پاس کوئی ایسی چیز ہے جو ٹیری مانگ رہا ہے۔ کوئی ایسی چیز جو اس نے چھپائی ہوئی ہے۔ اب کوئی ایسا جھوٹ بولنا چاہیے جس سے انہیں وقتی طور پر مہلت مل جائے۔ اس نے کہا۔

''یقیناً وہ وہی بکس ہوگا جینی جو تم نے الماری کے اوپر والے خانے میں رکھا تھا۔'' گلوریا نے اسے اشارہ کیا کہ شاید وہ اس کی بات سمجھ جائے پھر بولی۔ ''مجھے نہیں معلوم ہے کہ اس میں کیا ہے یا تم دونوں کے درمیان کیا بات ہوئی تھی لیکن خدا کے واسطے اب کوئی بحث نہ کرنا۔''

''کتیا۔'' وہ اسے بازو سے پکڑتے ہوئے بولا۔

''چلو ہم وہ باکس دیکھتے ہیں۔''

''نہیں، وہ نہیں ہے۔''

''چپ ہو جاؤ۔ اگر اس خوب صورت چہرے پر نقش و نگار بنا دیے جائیں تو تم اور بھی پیاری لگو گی۔'' اس نے چاقو کا بلیڈ اس سے ٹچ کرتے ہوئے کہا پھر گلوریا سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''تم ہمیں اس الماری تک لے کر چلو۔''

☆☆☆

رینڈی تک یہ آوازیں پہنچیں تو وہ چونک کر پلٹا۔ اس نے بیڈروم کا دروازہ کھول کر دیکھا تو اسے گلوریا الماری کی طرف بڑھتی نظر آئی۔ اس کے پیچھے ٹیری تھا اور اس نے جینی کی گردن پر چاقو رکھا ہوا تھا۔ رینڈی نے لمحہ بھر کے لیے سوچا اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی کارروائی کرتا، جینی کو ٹھوکر لگی اور اس کے حلق سے ایک چیخ برآمد ہوئی پھر اس نے رچرڈ کو مخالف سمت سے ٹیری پر حملہ کرتے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ اسے سنبھلنے کا موقع ملتا، رینڈی نے اس کی کلائی پر ضرب لگائی اور چاقو اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ دوسری طرف رچرڈ نے اس کے جبڑے پر زوردار گھونسا رسید کیا اور ٹیری چکرا کر زمین پر گر پڑا۔

دراصل اس شام رچرڈ نے جینی سے اس کی نئی رہائش گاہ کے باہر بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اس سے خوف زدہ ہو کر اپنی کار کی طرف بھاگی۔ رچرڈ نے اپنی گاڑی میں اس کا پیچھا کیا لیکن ایک مقام پر پہنچ کر وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ وہ جگہ اس کے پرانے اپارٹمنٹ سے تھوڑے فاصلے پر تھی۔ رچرڈ کو یقین تھا کہ وہ وہیں جائے گی۔

وہ جینی سے پہلے گلوریا کے اپارٹمنٹ پر پہنچ گیا۔ اس وقت گلوریا اور رینڈی لیونگ روم میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ رچرڈ نے ابھی ان سے ہیلو ہائے کی تھی اور وہ گلوریا سے پوچھنے والا تھا کہ جینی کیوں چھپتی پھر رہی ہے کہ دروازے کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ گلوریا نے فوراً فیصلہ کیا کہ وہ جینی سے بات کرنے کے بعد اس کا تعارف رچرڈ اور رینڈی سے کروائے گی چنانچہ وہ دونوں بیڈروم میں چھپ گئے۔ جینی اکیلی نہیں آئی بلکہ اس کے ساتھ ٹیری بھی تھا جس کی وجہ سے ان دونوں کو کمرے سے باہر آنا پڑا۔

اس کے بعد سب کچھ توقع کے مطابق ہوا۔ ٹیری کو دوبارہ جیل بھیج دیا گیا اور پھر اس کے بارے میں کوئی خبر سننے میں نہیں آئی۔ جینی کو ایک بہتر ملازمت مل گئی اور اس نے والدین سے وعدہ کیا کہ آئندہ وہ کسی لڑکے سے دوستی نہیں کرے گی پھر کچھ عرصے بعد اس کی شادی ہوگئی۔

پولیس کے آنے پر جینی نے انہیں پورا واقعہ تفصیل سے سنایا کہ کس طرح ٹیری نے اسے کیریئر کے طور پر استعمال کیا اور جب اسے معلوم ہوا تو اس نے ہزاروں ڈالر مالیت کی کوکین فلیش میں بہا دی اور خود ٹیری سے بچنے کے لیے روپوش ہوگئی۔ پولیس ٹیری سمپسن کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گئی اور رچرڈ نے اپنا فرض سمجھا کہ وہ جینی کو اس کے والدین تک پہنچا دے۔

ان کے جانے کے بعد رینڈی نے گلوریا کو بازو سے پکڑ کر صوفے پر بٹھایا۔ اس کے لیے پانی لے کر آیا اور اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''کیا تم میرے بغیر رہ سکو گی؟''

گلوریا نے اس کے سینے پر سر رکھا اور بولی۔ ''سوچ کر بتاؤں گی۔''

اس واقعے کو پچیس سال ہو چکے ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہ دونوں اسی اپارٹمنٹ میں رہ رہے ہیں۔ ان کی شادی ہوگئی۔ تین بچے بھی ہیں لیکن گلوریا ابھی تک سوچ رہی ہے کہ کیا وہ رینڈی کے بغیر رہ سکے گی؟

الٹ پھیر

محمد ذوالقرنین خان

لوگوں کی بھلائی کے لیے... کسی نیک مقصد کے لیے بُرا راستہ اختیار کرنا نہایت ہی کم عقلی کی بات ہے کیونکہ ایسے ہر راستے کا اختتام کسی نہ کسی تاریک گڑھے پر ہی ہوتا ہے... ہوش کو خیرباد کہہ کے جوش سے کام لینے والے دوستوں کا مجرمانہ احوال... پے در پے واقعات اور الٹ پھیر کی چالوں نے ان کو نہایت تیز اور بے رحم بنا دیا... سانحات کی ڈور میں ایسے الجھے کہ پھر ہر سازش کے حقیقی خدوخال نمایاں ہوتے چلے گئے... محبت... وابستگی اور التفات نے ان کو ایک تکون کی صورت میں جکڑ دیا تھا...

خطرناک کھلاڑیوں سے ٹکرا جانے والے منہ زوروں کا جارحانہ انتقام......

ٹریننگ کے دنوں میں دن بھر کی تھکا دینے والی روٹین کے بعد جب وہ رات کو بستر پر گرتا تو صبح کوئی سپاہی جھنجوڑ کر ہی اسے اٹھاتا اور دن کیسے گزر جاتا معلوم ہی نہیں ہوتا۔ چھٹی والے دن کے لیے اتنے کام بچ جاتے تھے کہ وہ باقی دنوں سے زیادہ مصروف گزرتا۔ آج جبکہ وہ انتہائی پُرسکون اور پُرتعیش جگہ پر ڈیوٹی سرانجام دے رہا تھا تو اسے معلوم ہوا کہ مصروفیت کتنی بڑی نعمت ہے۔ تھکاوٹ کتنا بڑا سکھ ہے۔ دورانِ ٹریننگ جب بھی ٹھنڈا پانی میسر آجاتا تو اس کا

رُواں رُواں تشکر سے بھر جاتا۔ وہ بھوک لگتی جو پانی زدہ دال کو بھی جنت کے کھانے کا ذائقہ بخش دیتی۔ اے۔ سی لگے کمرے میں اسے کسی پل چین نہیں آتا تھا۔ جسم پر طاری ہونے والی کسل مندی سے وہ کرسیاں بدل بدل کر جان چھڑانے کی کوشش کرتا۔ رات سوتے جاگتے گزرتی۔ وہ تو اس نیند کا عادی تھا کہ آنکھیں موند کر وا کیں تو رات ختم ہو گئی۔

اپنی جرأت، بے باکی اور لگن سے وہ بہت جلد اپنے افسروں کی نظر میں آ گیا تھا۔ چھ فٹ چار انچ کا وہ جوان بہت لیے دیے رہتا۔ ٹریننگ کے فوراً بعد اسے سی ایم کی طرف بھیج دیا گیا۔ انہیں دہشت گردوں کی جانب سے مسلسل دھمکیاں مل رہی تھیں۔ سی ایم ان دنوں عوامی مقامات پر جانے سے احتراز برتتے تھے اس لیے سارا دن وہ کسی اے۔ سی لگے کمرے میں بیٹھا جماہیاں لیتا رہتا۔ کبھی صاحب کے گھر اور کبھی اسمبلی کے لان میں ٹہلتا رہتا۔ تنخواہ دگنی تھی۔ سہولیات بے پایاں تھیں۔

اس دن بھی سی ایم بہت منت سماجت کے بعد ایک سیمینار میں جانے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ وہ سائے کی طرح ان سے چپکا ہوا تھا۔ جب اس کی نظر انتہائی قیمتی لباس میں ملبوس ایک شخص پر پڑی۔ اس کا خون کنپٹیوں میں ٹھوکرے مارنے لگا تھا۔ اس کی نظریں اس پر ٹک گئی تھیں جن میں اتنی حدت تھی کہ اس شخص کو بھی اس کی جانب متوجہ ہونا پڑا۔ کچھ دیر کے لیے وہ شخص الجھن کا شکار ہوا پھر وہ سی ایم کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اب وہ مصافحے کے لیے پر تول رہا تھا۔ جیسے ہی وہ آگے بڑھا۔ اس نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے پیچھے دھکیل دیا... اور غرا کر بولا۔ ''کیپ ڈس ٹینس'' خجالت سے اس شخص کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ اس سے فائدہ یہ ہوا کہ پھر کسی کی جرأت نہیں ہوئی کہ وہ آگے بڑھ کر مصافحہ کرے۔ سی ایم تیزی سے اپنی نشست تک پہنچ گئے۔ کھانے کے دوران اس شخص جسے اس نے دھکیل کر پیچھے کر دیا تھا، سی ایم نے بلوایا۔

''جناب! آج تو آپ ہماری جانب دیکھ بھی نہیں رہے۔'' وہ قریب آیا تو سی۔ ایم نے شرارت سے کہا۔

وہ شخص خوشامدی انداز میں جھکا اور تیزی سے سی ایم کے سینے سے اپنا سر لگا دیا۔ ''شاہ جی آپ نے محافظ ہی ایسے پال رکھے ہیں کہ ڈر لگتا ہے۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''ضرورت ہے یار! جانتے ہو حالات کیسے ہیں۔ وہ ہے بھی ایجنسی کا آدمی تم جانتے ہو سخت ٹریننگ ان کا دماغ خشک کر دیتی ہے۔ کام کاسناؤ کیسا جا رہا ہے؟'' موضوع بدلنے کے لیے انہوں نے کہا۔

اس وقت بھی وہ وزیر اعلیٰ سے خوش گپیوں میں مصروف اس شخص پر نگاہیں گاڑے کھڑا تھا۔ اس شخص کو دیکھ کر اس کے پرانے زخم پھر سے تازہ ہو گئے تھے۔ اس کی وہ بے کلی دوبارہ سے جاگ گئی تھی جسے گزرتے ہوئے وقت نے تھپکیاں دے کر سُلا دیا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا وہ اس کا نرخرہ کاٹ ڈالے۔ وہ کچھ دیر اور وہاں کھڑا رہتا تو غصے سے ہی ابل رہا ہوتا اسے اردگرد بھی گہری نظر رکھنی تھی۔ وہ اس جانب متوجہ ہو گیا۔

مگر اسے وہ دن یاد آ رہے تھے جب وہ تاریک کمرے میں دن رات بستر پر پڑا رہتا تھا۔ روشنی سے اسے نفرت ہو گئی تھی۔ کچھ پیاروں کے چہرے اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا گئے تھے۔

☆☆☆

ان دنوں جنوبی شہر کے حوالے سے میڈیا میں بہت لے دے ہو رہی تھی۔ زاہد پاپی جس نے اپنے بھائی متین چریا کو قتل کر ڈالا تھا۔ اس کی جرأت بہت بڑھ گئی تھی۔ ایجنسی کے پانچ سپاہی اس نے مار ڈالے تھے۔ تنگ تاریک گلیاں اور گنجان آبادی والے اس علاقے کو کبھی قابلِ اعتنا ہی نہیں جانا گیا مگر اب وہ ایک دم سے سب کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ زاہد پاپی کو درپردہ سیاسی پشت پناہی بھی حاصل تھی۔ کچھ سیاستدانوں کو ووٹ کے لالچ نے اندھا کر دیا تھا۔ اس علاقے کے لوگ زاہد پاپی کو پوجتے تھے۔ اس نے انہیں روزگار مہیا کیا تھا۔ وہ اس سے خوفزدہ تھے کہ وہ اپنے مخالفین کو بہت بے دردی سے قتل کرتا تھا۔ پولیس کے پاس اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ اس سے نمٹ سکتی۔

☆☆☆

اس دن حسبِ معمول وہ سی ایم کے کمرے کے باہر موجود تھا جب اسے گیلری سے کسی کے اونچا اونچا بات کرنے کی آواز آئی۔ وہ صورتِ حال جاننے کے لیے باہر نکلا تو ایک لڑکی عبدالمالک سے اپائنمنٹ کے سلسلے میں جھگڑ رہی تھی۔ سی ایم نے اچانک ساری ملاقاتیں منسوخ کر دی تھیں یہ بات وجۂ نزاع تھی۔

وہ ایک نظر میں اس لڑکی کو پہچان گیا اور تیر کی طرح اس کے پاس گیا۔

''کیا مسئلہ ہے مالک۔'' اس نے پی ایس سے پوچھا۔ وہ چاہتا تھا وہ لڑکی اسے پہچاننے میں پہل کرے تاکہ اس کی سبکی نہ ہو۔

''یہ محترمہ بات نہیں سمجھ رہیں۔ انہوں نے سی ایم کو کوئی سترہ اسکیل کا افسر سمجھ رکھا ہے۔'' عبدالمالک غصے سے بولا۔

اسے اس لڑکی کی آنکھیں اپنے چہرے پر گڑی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ شاید پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔

''تم یہاں کیسے؟'' اچانک لڑکی نے خوشگوار لہجے میں پوچھا۔

''پہلے آپ بتائیں آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟'' اس نے مسکرا کر کہا۔ اسے خوشی ہوئی تھی کہ وہ اسے بھولی نہیں تھی۔

یہ سن کر اس لڑکی کا چہرہ ایک بار پھر لال ہو گیا۔ ''کتنی سفارشوں اور دھکوں کے بعد سی ایم سے ملاقات کا وقت طے ہوا اور وہ صاحب۔'' اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ مالک وہاں سے کھسک لیا تھا۔ ''خیر چھوڑو تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''میں سی۔ ایم کی سیکیورٹی ٹیم کا حصہ ہوں۔ آج تو ان سے ملاقات واقعی ممکن نہیں۔ ہم بس ابھی نکل رہے ہیں۔ آپ یوں کریں کل شام کو سی۔ ایم ہاؤس آ جائیں۔ میں آپ کی ملاقات کروا دوں گا۔''

عین اسی وقت کان میں لگے ہیڈ فون پر اسے اطلاع ملی کہ سی ایم اسے طلب کر رہے ہیں۔

اگلے روز جب سی۔ ایم سے اس نے اس بابت بات کی تو وہ اتنا حیران ہوئے کہ اس لڑکی کو دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کو کبھی گمان بھی نہیں گزر سکتا تھا کہ وہ بھی کسی کو ان سے ملوانے لا سکتا ہے اور وہ بھی کسی لڑکی کو۔

وہ معذور بچوں کے کسی اسکول سے منسلک پرنسپل تھی اور فنڈ کی عدم دستیابی کی شکایت لے کر آئی تھی۔ سی۔ ایم بہت شفقت سے پیش آئے اور اسی وقت سارا مسئلہ حل کر دیا۔ اس کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا تھا۔ کمرے سے باہر آ کر اس نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اس نے بمشکل جسے تھاما۔ ''بہت شکریہ۔ بچے تمہیں دعائیں دیں گے۔'' اس نے گرمجوشی سے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ ''میرے اسکول ضرور آنا۔'' وہ اپنا کارڈ تھماتے ہوئے بولی تھی۔

وہ اگلے دن ہی پہنچ جاتا مگر اسے یہ مناسب نہیں لگا اس نے خود پر بہت جبر کر کے ایک ہفتے بعد جانے کا ارادہ کیا تھا۔ مگر تیسرے ہی دن مالک نے اسے اپنے دفتر بلوایا اور اسے کہا کسی لڑکی کا فون ہے۔

''کل ہمارے اسکول میں تقریب ہے۔ تمہیں ضرور آنا ہے۔'' اس لڑکی کی مدھر آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اس کا انگ انگ مسرت سے سرشار ہو گیا تھا۔

اگلا سارا دن اس نے وہاں اس کی معیت میں بچوں کے ساتھ گزارا۔ بہت دنوں بعد وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

''تمہاری شادی ہو گئی؟'' اس لڑکی نے اچانک پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

یہ سوال اس کے دماغ میں بھی کب سے کلبلا رہا تھا مگر اسے ہمت نہیں ہو پائی تھی۔ موقع دیکھ کر اس نے بھی دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھ لیا۔

''تمہاری تو ہو گئی ہو گی۔''

''نہیں، میں نے نہیں کی۔'' اس لڑکی نے اطمینان سے جواب دیا۔

''وہ بہت کھلے دل کا مالک تھا مگر لوگوں کی باتیں برداشت نہیں کر پایا۔'' اس کا اشارہ اپنے منگیتر کی جانب تھا۔ ''میں جانتی تھی میرے ساتھ رہے گا تو ہر پل اذیت میں گزارے گا اس لیے میں خود ہی اس سے دور ہو گئی۔''

اس بات نے اسے ان تلخ دنوں کی یاد پھر سے دلا دی تھی۔ اس کا سارا سکون غارت ہو کر رہ گیا۔

☆☆☆

جنوبی شہر کی خبریں وہ دیکھ اور سن رہا تھا۔ ایک دن وہ اپنے افسر کے گھر جا پہنچا۔

سر نوشاد اس کے استاد بھی تھے۔ وہ ان کا چہیتا شاگرد تھا۔

''حولدار صاحب کیسے آنا ہوا۔'' اسے دیکھ کر وہ خوشی سے چہکے۔ سیلیوٹ کر کے اس نے مصافحہ کیا۔ اور ان کے اشارے پر مؤدب انداز میں بیٹھ گیا۔

''سر آپ سے ضروری کام تھا۔'' اس نے عادت کے موافق مختصر بات کی۔

''یار مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے؟ تمہاری تو آج کل پانچوں انگلیاں گھی میں ہیں۔ سنا ہے سی ایم تمہارے بنا کھانا نہیں کھاتا۔'' ان کا اشارہ اس کے کھانا چکھنے کی ڈیوٹی کی جانب تھا۔

''سر مجھے جنوبی شہر کی پوسٹنگ چاہیے۔ جہاں آج کل زاہد پاپی سرگرم ہے۔'' اس نے بنا کسی تکلف میں پڑے اپنی بات کہہ دی۔

کرنل صاحب نے اسے حیرت سے دیکھا۔

''تم وہاں جا کر کیا تیر مار لو گے۔ ویسے بھی اس مسئلے کو سیاسی بنیادوں پر حل کرنے کے لیے مشاورت چل رہی ہے۔ وہاں پہلے ہی ہمیں بھجوا کر غلطی کی گئی۔''

''سر یہ مسئلہ سیاسی ہے ہی نہیں۔ زاہد پاپی صرف گولی کی زبان سمجھتا ہے۔'' اس نے تنفر سے کہا۔

''تمہاری اس میں دلچسپی کی کیا وجہ ہے؟'' انہوں نے آنکھیں سکیڑ کر پوچھا۔

جواب میں وہ خاموش رہا، کچھ نہیں بولا۔

''یہ مسئلہ جلد حل کرلیا جائے گا تم فکرمند نہ ہو۔'' انہوں نے دلاسا دیا۔

''سر! سب جانتے ہیں وہ کس نیچر کا آدمی ہے۔ اس نے اپنے بھائی کا سر کاٹ ڈالا۔ سو بندے تو وہاں دفن ہیں جہاں وہ روزانہ ناچ گانے سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ ہم شترمرغ کی طرح سر ریت میں دے کر طوفان سے نہیں بچ سکتے۔''

''فی الحال تم سی ایم کے چہیتے ہو جب تک وہ سیٹ پر ہے تم کہیں نہیں جاسکتے۔ دوسری بات اس علاقے میں ہماری ایجنسیاں اس کا رسوخ کم کرنے کے لیے متحرک ہوچکی ہیں۔ فی الحال وہاں اب آپریشن نہیں کیا جارہا۔ جب بھی ایسا موقع آئے گا تو میں اوپر بات کرکے تمہیں بلوالوں گا۔'' انہوں نے اسے بہلاتے ہوئے کہا۔

ڈھیروں نصیحتوں کے ہمراہ چائے پلا کر اسے رخصت کردیا گیا تھا۔

روزانہ وہ زاہد پاپی کے حوالے سے خبریں سن سن کر بے چین رہنے لگا تھا۔ میڈیا اسے ہیرو بنانے پر تُلا ہوا تھا۔ اس کی وڈیوز جن میں وہ شیخیاں بگھار رہا ہوتا بڑے بڑے ٹی وی چینلز من وعن نشر کردیتے۔ وہ جانتا تھا خفیہ والے سرتوڑ کوشش کے بعد بھی کامیاب نہیں ہو پارہے۔ زاہد پاپی نے مخبری کے الزام میں تین چار بندے سرِعام قتل کرکے وہاں ایسی دہشت قائم کر دی تھی کہ وہاں بسنے والے ایسی کسی حرکت کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ چند پرانے لوگ تھے جن کے ذریعے کچھ خبریں باہر آجاتی تھیں۔ ایک دن اس علاقے میں ہونے والے ایک دنگے کی خبر دیکھ رہا تھا۔ اسے وہاں ایک چہرہ نظر آیا اور وہ اچھل پڑا۔

وہ اس کا دوست انور تھا۔ جو انٹیلی جنس کا کورس کرکے ان سے علیحدہ ہوگیا تھا۔ اس نے یہاں وہاں فون کرکے اس کو ڈھونڈ نکالا۔ وہ اس کی آواز سن کر ششدر رہ گیا۔

''تم وہ آخری آدمی ہو جس کے بارے میں، میں سوچ سکتا ہوں کہ وہ مجھے فون کرے گا۔'' انور نے اپنی حیرت کو چھپایا نہیں۔

''تمہیں ٹی وی میں پولیس والوں پر پتھراؤ کرتے دیکھا تو سوچا حال چال پوچھ لوں۔''

انور نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''آج کل سرکار نے اس کام پر لگایا ہوا ہے۔ روزی روٹی کا سوال ہے۔ کرنا پڑتا ہے، تم سناؤ۔ تم کو بھی سی ایم کے کان میں سرگوشیاں کرتے دیکھا ہے۔ بڑے جیمز بانڈ بنے پھرتے ہو۔''

اس بات پر اس نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔

''تم کو اسی لیے فون کیا کہ تم مجھے یہاں سے نکالنے کی سبیل کرو۔ تم لوگ وہاں کچھ تو کررہے ہو۔ مجھے بھی ساتھ رکھ لو۔'' اس نے اپنا مدعا بیان کیا۔

''پاگل ہوگئے ہو کیا حولدار۔'' انور یہ سن کر بھڑک گیا۔

''یہاں موت رقص کررہی ہے۔ خوف اور دہشت کا ہر جانب پہرا ہے۔ میں روز سر سے کفن باندھ کر نکلتا ہوں۔ کوئی پتھر کوئی گولی میرا خاتمہ کرسکتی ہے۔ قسمت سے اچھی جگہ بیٹھے ہو تو وہیں رہو۔ حماقت نہیں کرو۔ میں تو سوچ رہا تھا تمہیں کہوں مجھے یہاں سے نکالو تم تو خود مصیبت گلے لگانے پر تُلے ہوئے ہو۔''

انور، لیکچر سر نوشاد بھی دے چکے ہیں۔ تم بات کرواپنے افسروں سے...... آگے میری قسمت ہے۔'' اس نے تلخی سے کہا اور فون بند کردیا۔

اسے یقین تو نہیں تھا کہ انور کچھ ایسا کرے گا مگر ایک دن اسے ہیڈ کوارٹر سے کال آگئی۔

وہاں انٹیلی جنس کے بڑے دماغ موجود تھے۔

انہوں نے اس کا انٹرویو لیا۔ اس نے انہیں اس علاقے میں جانے کی وجہ بتائی اور دو دنوں بعد اسے سی ایم کی ناراضی کے باوجود واپس بلوالیا گیا۔

اسے اپنی صلاحیتوں کا کھل کر استعمال کرنے کا موقع دیا گیا تھا۔ زاہد پاپی اس کا پرائم ٹارگٹ تھا۔

انور اور اس کی ٹیم اس کے ساتھ تھی۔

☆☆☆

رات کے اس پہر وقار، باسط اور اکبر سڑک پر مٹرگشت کررہے تھے۔ وہ جب بھی یوں چلتے تو دو چیزوں کا اہتمام کرتے۔ ایک بات بات پر قہقہہ لگاتے، دوسرا ایک دوسرے کو زدوکوب کرتے۔ پہلے دو مل کر تیسرے کو مارتے پھر کسی بات پر پارٹی بدل جاتی اور پہلے کی شامت آجاتی۔

فتح کے نشے میں چور وقار گھر کے دروازے کو کچھ زیادہ ہی زور سے پیٹ رہا تھا۔ آج کے ہر مقابلے میں وہ فاتح رہا تھا۔ وہ گھر سے چند سو روپے لے کر نکلا تھا اور اب اس کی جیب میں دس ہزار روپے تھے۔ جب سے اس نے اسنوکر کے بہترین کھلاڑی نادر کو مسلسل تین بار شکست دی تھی۔ چہار سُو اس کے نام کا ڈنکا بجنے لگا تھا۔ دس سال کھیل کر اس نے یہ مقام پایا تھا۔ وہ جب اسٹک ہاتھ میں تھام لیتا تو ٹیبل پر پڑی ہر گیند کو تاریک گڑھے میں اترنا پڑتا۔ بڑے بڑے کھلاڑی آتے، منہ کی کھاتے اور پلٹ جاتے۔ یہ مقام پانے کے لیے

اس نے بہت پاپڑ بیلے تھے۔

کافی دیر دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد اس کی چھوٹی بہن نادیہ نے دروازہ کھولا۔ ''چھوٹی! دروازہ جلدی کھولا کر۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک چپت اس کے سر پر لگادی۔ جس کو وہ خاطر میں نہیں لائی۔

''بھائی آج تو میرے پیسے ملیں گے ناں!'' نادیہ نے اس کے پیچھے چلتے ہوئے بے چینی سے پوچھا۔

''کون سے پیسے؟'' وقار نے مصنوعی حیرت چہرے پر سجاتے پوچھا۔

''وہی پیسے جو آپ نے منتیں ترلے کرکے مجھ سے ہتھیائے تھے۔ اس وقت تو آپ چہرے پر ایسی بے چارگی طاری کرلیتے ہو کہ مجھے ترس آجاتا ہے۔ اب پوچھتے ہو کون سے پیسے؟'' نادیہ نے برہم ہوکر کہا۔

بہت اچھا موڈ ہونے کے باوجود اس کی یہ بات وقار کو ناگوار گزری۔ وہ تیزی سے مڑا اور لپک کر نادیہ کی چُٹیا پکڑلی۔

''سود خور تو نے پیسے مجھ پر ترس کھاکے نہیں دیئے تھے بلکہ دگنے کرکے لٹانے کے لالچ میں دیے تھے۔''

نادیہ جو روزِ اول سے ہی منہ پھٹ تھی، چپ نہ رہ سکی۔

''بھائی! تم کون سا محنت کرکے کما کر لائے ہو۔ یہ لمبی لمبی رقمیں جُوا کھیل کر بناتے اور پھر ڈبو دیتے ہو۔'' اس نے اس انداز سے کہا کہ وقار ہنس پڑا۔

''بیٹا! میرا آج پکا ارادہ تھا تمہیں ہزار روپے دوں گا مگر تمہاری زبان قینچی کی طرح چلتی ہے۔ یہ پکڑو اپنے پانچ سو۔'' ہزار ہزار کے نوٹوں میں سے اس نے ایک پانچ سو کا بوسیدہ نوٹ نکال کر نادیہ کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ اتنے پیسے دیکھ کر نادیہ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

''بھائی دو دن میں پھر تم میری منتیں کررہے ہوگے، یہ رقم زیادہ دیر تک تو تمہاری جیب میں ٹکنے والی نہیں۔'' نادیہ نے اسے دھمکاتے ہوئے کہا۔

وقار کے بے نیازی سے آگے بڑھتے قدم یکدم رک گئے۔

''اگر زبان کو لگام دینے کا وعدہ کرو تو پانچ سو اور بھی دے سکتا ہوں۔'' وقار نے کچھ سوچ کر کہا۔

وہ ایک اچھا کھلاڑی تھا مگر جُوا مہارت کا قائل نہیں ہوتا اس لیے نادیہ کی بات سن کر وہ ٹھٹک گیا تھا۔ وہ عارف پٹھان کے کلب میں کھیلتا تھا۔ وہاں اس کا نام تھا ایک مقام تھا۔ عارف پٹھان کو اسنوکر کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ وہ کبھی ایک اچھا کھلاڑی نہیں رہا۔ باپ کے مرنے کے بعد اس نے گودام سے کباڑی کا سامان نکال کر وہاں اسنوکر کلب بنالیا۔ چونکہ اس کی اپنی ساری عمر ایسی جگہوں پر گزری تھی اس لیے وہ کاروباری نقطہ نظر سے ہر اونچ نیچ کو سمجھتا تھا۔ چھوٹے لڑکوں کی حوصلہ افزائی کرتا۔ ان کے پاس اگر پیسے نہ بھی ہوتے تو انہیں کھیلنے سے نہ روکتا۔ وہ سارا دن وہاں گزار دیتے تو کوئی اعتراض نہ کرتا۔ کہنہ مشق کھلاڑیوں سے پیسہ نہیں لیتا تھا۔ ان کی ٹیبلز مخصوص تھیں۔ انہیں بہترین اسنوکر کیو دی جاتی تھیں۔ بس وہ ان سے یہ چاہتا تھا کہ کبھی کبھار وہ اس کے کہنے پر ہار جائیں۔ اس کی یہ حکمتِ عملی نہایت کامیاب رہی۔ قریب ہی اپنی ایک دکان پر اس نے چائے پان سگریٹ اور دوسری کھانے پینے کی چیزوں کا انتظام کردیا تھا جسے اس کا سالا سنبھالتا تھا وہاں سے بھی خوب آمدنی ہورہی تھی۔

وقار اسنوکر کلب میں داخل ہوا تو حسبِ معمول عارف جسے سب عارف لالہ کہتے تھے، کاؤنٹر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وقار اس عزت افزائی پر مسکرادیا۔ مصافحہ کرنے کے بعد وہ کسی فاتح جنرل کی طرح اپنے لاکر کی جانب بڑھا۔ اپنی کیو نکالی۔ اتنی دیر میں اس کی ٹیبل سیٹ کی جاچکی تھی۔ وہ وہاں کھڑا ہوگیا۔ کھلاڑی آتے ہار کر ہٹ جاتے۔ وقت کا پتا ہی نہیں چلا کب رات کے بارہ بج گئے اور سب کی واپسی کا وقت ہوگیا۔

عارف لالہ اپنی گاڑی کی جانب جارہا تھا۔ سنسان سڑک پر پیچھے سے آتے قدموں کی آہٹ پر اس نے اپنی رفتار میں اضافہ کردیا۔ یہ دیکھ کر باسط کو شرارت سوجھی۔

''اوئے عارف! جو کچھ جیب میں ہے نکال کر سڑک پر رکھ دے۔ پیچھے مڑکر دیکھا تو کھوپڑی اُڑادوں گا۔'' وہ آواز کو موٹا کرکے بولا۔

اس کا خیال تھا عارف اس کی آواز پہچان جائے گا مگر آواز سناٹے میں گونجی تو کچھ زیادہ ہی ہیبت ناک ہوگئی۔ وقار اور اکبر مسکرا کر رہ گئے۔

عارف نے بلاچون وچرا... جیب سے بٹوا اور موبائل نکال کر سڑک پر رکھا اور تیزی سے بھاگ کھڑا ہوا۔

اس کی اس حرکت پر وہ تینوں قہقہے مار کر ہنس دیے۔

وقار بٹوا اور موبائل لے کر آگے بڑھا مگر اکبر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے روک دیا۔ ''اس کی گاڑی میں پسٹل رہتا ہے۔ کل دیں گے اسے اور اس کی خوب دھجیاں بھی اُڑائیں گے۔ بہت تیس مار خان بنا پھرتا ہے۔ ہاتھی کے جسّے میں چوہے کا دل لیے پھرتا ہے۔ حد ہے خدا کی قسم حد ہے۔'' اکبر نے قہقہہ مار کر کہا۔

بٹوے میں پچاس ہزار روپے موجود تھے۔ چونکہ وہ

شرارت باسط کی تھی اس لیے وہ دونوں چیزیں اسے تھما دی گئیں۔

اگلے دن وقار اور باسط ایک ساتھ کلب پہنچے۔

''کیوں! عارف لالہ کل رات تمہارے ساتھ خوب ہوئی؟'' باسط نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

عارف نے قہرآلود نگاہ اس پر ڈالی۔ ''یہ انسپکٹر اسی لیے آیا ہوا ہے۔'' سر کے اشارے سے اس نے بتایا۔ دریائی گھوڑے کی طرح کا ایک شخص ایک طرف کونے میں پیسٹری کھانے میں مصروف تھا۔

یہ دیکھ کر ان دونوں کو سانپ سونگھ گیا۔

''ان کی قسمت اچھی تھی، میرا پستول گاڑی میں تھا ورنہ میں ان کو وہیں بھون دیتا۔'' اس کے بعد مغلظات کا ایک طوفان اس کے منہ سے بہہ نکلا۔ وہ ڈاکوؤں کو گالیوں سے نواز رہا تھا۔

بٹوا اور موبائل اس وقت وقار کے پاس تھے۔ اس کے دل میں آئی کہ نکال کر اس کے منہ پر مارے مگر انسپکٹر کی موجودگی میں چپ رہا اور تیزی سے اپنی ٹیبل کی جانب بڑھ گیا۔

باسط نے بھی اپنے غصے پر قابو پایا اور قریب ہی ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔

یوں گالیاں دیتے دیکھ کر انسپکٹر جو عارف کا چچازاد تھا، اس کو مداخلت کرنا پڑی۔

''پکڑ لیں گے ان سالوں کو، تم فکر کیوں کرتے ہو۔ مجھے تو وہ تمہارے کلب کے ہی لگتے ہیں جنہیں معلوم تھا کہ تم رات کے اس وقت نکلتے ہو اور رقم بھی جیب میں تگڑی رکھتے ہو۔'' اس نے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے اوپری ہونٹ پر لگی کریم کو مونچھوں کی جڑوں میں پہنچاتے ہوئے کہا۔

''ایسی جرأت کوئی نہیں کر سکتا محابت بھائی! یہ سب اپنے بچے ہیں۔'' عارف نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ پھر وہ باسط کی جانب متوجہ ہو۔

''بیٹا! زیادہ نہ ہنس۔ اب تم دھیان سے گھر جانا۔ تم بھی ہزار پانچ سو تو جیب میں ہارنے کے لیے رکھتے ہی ہو۔ کہیں کوئی لوٹ ہی نہ لے۔'' عارف نے گم صم باسط کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے قہقہہ لگا کر کہا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس نے انہیں خواہ مخواہ ناراض کر دیا ہے۔

''چھوڑو عارف لالہ بات نہ گھماؤ۔ اتنی گندی گالیوں نے طبیعت خراب کر دی۔ مجھے کیا معلوم تھا تم ایسے بھرے بیٹھے ہو۔'' باسط نے وہاں سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''بابو! یہ اپنا علاقہ ہے کوئی ہمیں ہی لوٹ کر یوں چلتا بنے تو یہ نیک شگون نہیں۔ اس وقت صرف گالیاں ہی دے سکتا ہوں میرے ہاتھ آ گئے تو ان پر تیل چھڑک کر آگ لگا دوں گا۔'' ایک مرتبہ پھر اسے طیش آ گیا۔

''تم نے جو یہ کیمرے سڑک پر لگائے ہوئے ہیں، کس دن کام آئیں گے۔'' انسپکٹر محابت اچانک بولا تھا۔

وقار جو قریب ہی ٹیبل پر موجود تھا، اس نے چائے سڑکتے انسپکٹر محابت پر طنزیہ نگاہ ڈالی اور وہیں سے بولا۔

''یہ ہاتھی کے وہ دانت ہیں جو دکھانے کے لیے ہیں کتنی مرتبہ عارف لالہ کو کہا رات کو جاتے ہوئے کیمرے بند نہیں کیا کرو مگر یہ سنتا ہی نہیں۔'' یہ سن کر وہاں سب ہنس پڑے۔

''پہلے بھی ایک مرتبہ مشین جل گئی تھی۔'' عارف نے نظریں چُراتے ہوئے کہا۔

باسط نے ایک نظر سامنے اسکرین پر ڈالی جہاں آٹھ مختلف مناظر دکھائی دے رہے تھے۔ ایک نظر میں اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ کیمرے عارف کی ویسے بھی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ لیکن انہیں اس بات کا کھٹکا لگ گیا تھا کہ کہیں آس پاس کسی دکان کے کیمرے کی آنکھ میں وہ منظر محفوظ نہ ہو گیا ہو۔

شام کو وہ تینوں اکبر کی بیٹھک میں اکٹھے تھے۔

فیصلہ یہ ہوا تھا کہ وہ پیسے واپس نہ کیے جائیں۔ موبائل انہوں نے توڑ کر پھینک دیا تھا۔

☆☆☆

اس وقت وقار اس لڑکے کو گھورے جا رہا تھا جو مسلسل پانچ دفعہ ہار چکا تھا مگر ٹیبل سے جانے کو تیار نہیں تھا۔ عارف کئی مرتبہ وقار کو اشارہ بھی کر چکا تھا کہ وہ ایک گیم ہار جائے مگر وہ اس اناڑی سے ہارنے کو تیار نہیں تھا۔ اب وقار پر بیزاری طاری ہونے لگی تھی۔ جب چھٹی دفعہ بھی وہ ہار گیا تو وقار نے اسے وہاں سے ہٹنے کا کہا۔

''تم بیٹ ڈبل کر لو۔'' لڑکے نے بے نیازی سے کہا۔

''میں صرف پیسے کے لیے نہیں کھیلتا جانی! مجھے تھرل بھی چاہیے۔ تم میرے لیے کسی تالاب میں بیٹھی ہوئی بطخ کے مانند ہو۔ جسے کوئی اناڑی بھی شکار کر سکتا ہے۔ عارف لالہ کے کہنے پر تم سے کھیل لیا۔ اب تم یہاں سے نکلو۔'' وقار نے متکبرانہ لہجے میں کہا۔

''ابے! دنبے کو بطخ بول رہا ہے ہوش میں تو ہے۔'' پاس بیٹھے پپو نے اس لڑکے کے تن و توش کی جانب اشارہ کر کے کہا تو سب ہنس پڑے۔

''اوئے مسٹر! زبان سنبھال کر بات کرو۔'' وہ لڑکا چلایا۔

''بیٹا زبان سنبھال کر بات کی تب ہی تو تجھے دنبہ بولا ہے۔ خدا قسم تیری شکل تو اس جانور جیسی ہے جس کا نام لینے سے ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے۔''

پپو اس وقت بھرے ہوئے سگریٹ کے خمار میں تھا۔ اس کے مزاج سے باقی سب تو واقف تھے مگر وہ لڑکا نیا تھا۔ اس نے اسٹک گھمائی اور سرر کی آواز کے ساتھ وہ پپو کے سر سے جا ٹکرائی۔ اسٹک ٹوٹ گئی اور چند لمحوں کے لیے پپو سمیت سب سکتے میں چلے گئے ہوش تب آیا جب گاڑھا سرخ خون اس کے چہرے پر پھسلنے لگا۔ وقار کا الٹا ہاتھ اس لڑکے کے چہرے پر پڑا۔ اس کے بعد وہاں جتنے لوگ تھے، انہوں نے حسبِ استطاعت اس مار کٹائی میں اپنا حصہ ڈالا۔ وہ تو عارف بیچ میں کود پڑا ورنہ وہ اس لڑکے کی ہڈیاں توڑ دیتے۔

اب مسئلہ یوں تھا کہ فریقین اپنی اپنی جگہ رسوخ والے تھے تو قانون ایک طرف کھڑا اپنے لمبے ہاتھ مل رہا تھا۔ ایس ایچ او کی پوری کوشش تھی کہ صلح ہو جائے ورنہ اس کو نوکری کے لالے پڑ جاتے۔ دن رات اپنی صفائیاں دیتے گزرتے۔ وقار گروپ کے پسِ پشت اکبر کے ماموں کی سیاسی پارٹی تھی اور حملہ آور پٹنے والا لڑکا کسی جاگیردار کا بیٹا تھا مگر چونکہ شروعات اس نے کی تھی اور پپو اچھا خاصا زخمی ہو کر اسپتال میں داخل تھا اس لیے وہ کسی حد تک دبے ہوئے تھے۔

اس وقت یہی طے ہوا کہ خود ہی مل بیٹھ کر معاملات طے کر لیے جائیں۔

پپو کو ہرجانے کے طور پر پچاس ہزار روپے دیے گئے اور وقار نے معافی مانگ لی۔ یہ بات یہاں ختم ہو جاتی مگر ایک مہینے بعد وہ لڑکا اپنے چار ساتھیوں سمیت وہاں آ موجود ہوا۔

وقار اس وقت جھک کر سیاہ گیند کو سوراخ میں دھکیلنے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔

''ہاں چیمپئن! کھیلو گے۔'' ان میں سے ایک لڑکا بولا۔

''تمہارے دوست نے بتایا نہیں کہ میں بطخوں کے ساتھ نہیں کھیلتا۔'' وقار نے حقارت سے کہا۔

''کھیلتا تو میں بھی سڑک چھاپ لوگوں کے ساتھ نہیں مگر تجھے سبق سکھانا ہے اس لیے یہاں آ گیا ہوں۔'' اس لڑکے نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے بات آگے بڑھتی، عارف ان کے پیچھے سے نمودار ہوا اور وقار کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''ایک منٹ میرے ساتھ آؤ۔''

''کھیل لے استاد! ان کی حسرت بھی پوری ہو جائے گی۔ تگڑی رقم رکھو۔ جیت گئے تو دونوں کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔'' عارف جوش سے بولا۔

''اور ہار گئے تو پیسے کون دے گا؟'' وقار نے خشک لہجے میں کہا۔

''تم اس بات کی فکر نہ کرو۔ میں اس گیم کو اسپانسر کروں گا مگر جیت گئے تو آدھی رقم میں لوں گا۔ ویسے اگر تمہیں لگتا ہے کہ ہار جاؤ گے تو نہ کھیلو۔'' عارف نے اس کی دکھتی رگ دبائی۔

وہ لڑکا ایک لاکھ سے کم پر کھیلنے کو تیار نہیں تھا۔ عارف کی شہ اور کچھ لالچ کے ہاتھوں مجبور ہو کر وقار مان گیا۔

کھیل شروع ہو چکا تھا۔ پانچ فریم کی گیم تھی۔ پہلے دونوں فریم وہ لڑکا ہار گیا۔ وقار کو زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔ تیسرے فریم میں وقار لاابالی پن کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ وہ لڑکا بازی لے گیا۔ جب اگلی گیم کا بھی فاتح وہ رہا تو وقار اور عارف کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اب وہاں سارا کلب اکٹھا ہو چکا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس لڑکے نے ٹیبل خالی کر دی۔ جب وہ آخری بچی ہوئی سیاہ گیند کو کونے والے سوراخ میں دھکیل رہا تھا تو وہ 110 پوائنٹ بنا چکا تھا۔ سب کو گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔

''آج تمہاری قسمت اچھی تھی، کل آنا اس سے دگنی رقم پر کھیلیں گے۔'' وقار نے اسے گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔

عارف نے یہ سن کر اپنا سر پیٹ لیا۔

''رقم دگنی ہوگی اور کھیل تین فریم کا ہوگا۔'' ایک لاکھ وصول کرتے ہوئے وہ لڑکا بولا۔ پیسے دیتے ہوئے عارف کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔

''مجھے منظور ہے۔'' وقار نے پُرجوش انداز میں کہا۔

یہ سن کر وہ لڑکا مسکرایا اور بولا۔ ''تم کہیں اس خوش فہمی میں مبتلا تو نہیں کہ کل جیت جاؤ گے۔ اس بات کی گارنٹی کون دے گا کہ ہارنے کے بعد تم دو لاکھ روپے دے بھی سکو گے۔ مجھے تو نہیں لگتا تمہاری جیب میں پھوٹی کوڑی بھی موجود ہو۔ عارف لالہ تو مشکل ہے تم پر آج کے بعد بھی رقم لگانے کا سوچے بھی۔ ہاں اگر یہ سب چندہ کر کے تمہارے کھیلنے کا بندوبست کریں تو میں تیار ہوں۔''

وہ اسے ذلیل کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ جواباً وقار کچھ بول بھی نہیں سکتا تھا۔

''بس کل ہار گئے تو پیسے چُکا دینا۔ پیسے نہ ہوئے تو یہاں سب کے سامنے زمین پر ناک رگڑ کر اس کھیل کو چھوڑ دینا۔ کہو منظور ہے۔''

وقار بس انہیں گھور کر رہ گیا۔ اکبر نے آگے بڑھنے کی کوشش کی، وقار نے اسے روک دیا۔

''مجھے نہیں لگتا یہ کل آئے گا۔'' ان میں سے ایک بولا۔

یہ سن کر باسط بھڑک گیا۔ ''تم اپنی چونچ بند رکھو۔ کل دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ یہ کھیل ہے اس میں ٹکا بھی لگ جاتا ہے۔ تم سب کو کل وقار یہاں ناک رگڑوائے گا'' مگر وہ سب نہیں جانتے تھے وقار اپنے ہی تکبر کا شکار... ہونے جا رہا تھا۔ گھر پہنچتے پہنچتے وہ جان گیا تھا کہ جوش میں آ کر اس نے بڑی غلطی کر دی تھی۔ وہ اس لڑکے سے نہیں جیت سکتا تھا وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ بڑا کھلاڑی تھا۔ وجہ یہ تھی کہ دو لاکھ ہارنے کا اس پر کوئی اثر نہ ہوتا وہ امیر باپ کا بیٹا تھا مگر اس کی تو نیند حرام ہو گئی تھی۔ اتنے دباؤ میں وہ کیسے اچھا کھیل سکتا تھا؟

اس وقت وہ باسط اور اکبر کو بھی اپنی پریشانی میں شامل نہیں کر سکتا تھا۔ ایک طرف اس کی انا، اس کا غرور تھا۔ دوسری طرف اس کی غربت کھڑی تھی۔ اس کا سب کچھ داؤ پر لگ گیا تھا۔ یہ ہار اس سے اس کا سب کچھ چھین لیتی۔ وہ جانتا تھا ہارنے یا جیتنے کی صورت میں وہ لڑکا پھر چیلنج کر دے گا۔ اس امیرزادے کا مقصد ہی اس کی تذلیل تھی۔ اس کا ایک حل تھا کہ وہ کچھ دن کے لیے غائب ہو جاتا مگر اس کا دل نہیں مانا کہ یوں بزدلوں کی طرح فرار ہو جائے۔

اس نے اپنی زندگی کے دس بہترین سال اسنوکر کو دیے تھے۔ وہ اس کھیل کو چھوڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

اگلے دن وہ مقررہ وقت پر پہنچ گیا۔ اس نے اپنا سارا تجربہ اور توجہ ٹیبل پر مرکوز کر لی مگر جب انسان اندر سے ڈرا ہوا ہو تو پھر جیت نہیں سکتا۔ پہلا فریم ہارنے کے باوجود وہ لڑکا اگلے دونوں فریم جیت گیا۔

اس نے اب دو لاکھ کا مطالبہ شروع کر دیا تھا۔

''عارف بھائی اپنے دوست کی مدد کرو ورنہ اس کو زمین پر سب کے سامنے ناک رگڑنا ہوگی۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑی سافٹ ڈرنک منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔

''ویسے اگر سارے کلب والے چندہ کریں تب بھی مشکل ہے کہ آدھی رقم بھی جمع ہو۔'' اس نے تحقیر آمیز نظر اُن سب پر ڈال کر کہا۔

اکبر اطمینان سے اپنی جگہ سے اٹھا اور اچانک اس کا گریبان پکڑا اور پسٹل اس کے سر پر رکھ دیا۔ ''تجھے بھونکنے کا مرض لاحق ہے اس لیے آج یہ تیری دوا ساتھ لایا ہوں۔ بیٹا ہلنا نہیں ورنہ تیرے سر میں اتنا بڑا سوراخ ہوگا کہ آرام سے گیند پاٹ ہو جائے گی۔ تو مجھے نہیں جانتا مگر یہ سب جانتے ہیں۔'' اس نے انتہائی درشت لہجے میں کہا۔

''بہت سن لی تیری بک بک۔ بکواس کیے جا رہا ہے۔ ابے! یہاں سارے غریب لوگ ہیں تو تُو مذاق اُڑائے گا۔ گیم ہی جیتا ہے۔'' ایک موٹی گالی دے کر بولا۔ ''ہمیں خرید نہیں لیا۔ کل کلب بند ہوگا پرسوں آ کر شرافت سے پیسے لے جانا۔ اب تمہارے منہ سے کوئی بات نہیں نکلنی چاہیے۔ خاموشی سے نکل لے۔''

جتنے آرام سے اس نے پسٹل نکالا تھا، اتنی ہی تسلی سے دوبارہ رکھ لیا اور جا کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

''پرسوں پیسے مل جانے چاہئیں ورنہ تم لوگ مجھے جانتے نہیں۔'' دروازے کے پاس جا کر وہ بولا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

وقار نے اکبر کو تشکر بھری نظروں سے دیکھا تھا۔ آج وہ لڑکا اسے کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑتا۔

کلب سے باہر آ کر اکبر نے سگریٹ کا کش لیا اور بولا۔ ''وقار اب اوکھلی میں سر دے ہی دیا ہے تو موصلوں سے نہ ڈرو۔ پیسے دینے ہوں گے۔ تمہارا ایک نام ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ مصلحتاً واپس چلے گئے مگر وہ واپس آئیں گے۔ ہم اُن سے نہیں لڑ سکتے۔''

''پیسے لائیں گے کہاں سے۔'' وقار نے تفکر سے کہا۔

''تم اپنے ماموں سے بات کرو۔''

''میں ماموں سے نہیں مانگ سکتا۔ اول تو وہ دیں گے ہی نہیں، دیے بھی تو وہ مامی سے کوئی بات نہیں چھپاتے اور مامی فوراً امی کے پاس پہنچ جائیں گی کہ لڑکا دو دو لاکھ کی شرطیں لگا رہا ہے۔'' اس نے منہ سے دھواں نکالتے ہوئے کہا۔

''تو حل کیا ہے۔'' باسط نے جھلا کر کہا۔

''حل یہ ہے کہ پچاس ہزار ہمارے پاس ہیں۔ جیسے یہ پچاس آئے ویسے ڈیڑھ لاکھ بھی آ سکتے ہیں۔ اس شہر میں شکار کے لیے بطخیں بہت ہیں۔''

یہ سنتے ہی وقار اور باسط چلتے چلتے ایک جھٹکے سے رک گئے۔

''ہوش میں تو ہو تم۔'' وقار کو غصہ آ گیا۔ ''یار مانا کہ جُوا کھیلتے ہیں۔ کبھی کبھار مار پیٹ بھی کر لیتے ہیں لیکن اب اتنا بھی نہ گراؤ کہ گلی کوچوں سے موبائل چھیننے لگیں۔''

''تم تو بکواس بند کرو۔ یہ وقت تمہاری خودسری کی وجہ سے دیکھ رہے ہیں۔ پہلے پوری بات سن لو۔ اب بیچ میں نہیں بولنا۔'' اکبر نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''ماموں کا ایک ہمسایہ ہے۔ سب اسے بوبی انکل

کہتے ہیں۔ واک کے لیے صبح ایک پارک جاتا ہے۔ تم دونوں اگر بزدلی نہ دکھاؤ تو دو ڈھائی لاکھ کا انتظام اس سے ہو جائے گا۔''

''کوئی اور حل ہے تو بتاؤ۔'' باسط بولا۔

''پہلے پلان تو سن لو بزدلو!'' اکبر دہاڑا۔ ''وہ بہت شریف النفس اور بے ضرر آدمی ہے۔ تم دونوں پسٹل دکھا کر اس کی گاڑی میں بیٹھ جانا۔ رقم تو اس کے پاس زیادہ نہیں ہوتی۔ مگر اے ٹی ایم کارڈ درجن بھر بٹوے میں بھرے ہوتے ہیں۔''

''کیا مطلب ہم دونوں بیٹھ جائیں، منصوبہ تمہارا ہے تم شامل ہی نہیں ہو۔ واہ! بڑے ماسٹر مائنڈ بنے ہوئے ہو۔'' باسط نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''احمق آدمی وہ مجھے پہچان بھی سکتا ہے۔'' اکبر نے اس کی کمر پر ایک دھپ رسید کیا۔ پھر ایک بندہ اے ٹی ایم کارڈ سے پیسے نکلوانے کے لیے بھی ہونا چاہیے۔'' اکبر نے ان کی طرف دیکھا۔

''تم دونوں اگر میرے بغیر نہیں کر سکتے تو کہو۔ میں بھی گاڑی میں آ جاتا ہوں۔'' اکبر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

پھر وہ انہیں گھسیٹ کر بوبی انکل کو دکھانے کے لیے لے گیا۔

گول مٹول بوبی انکل کو دیکھ کر ہی انہیں اطمینان ہو گیا۔

''ویسے تمہیں کیسے معلوم کہ وہ اس وقت بٹوا لائے گا۔ اور اس میں اے ٹی ایم کارڈ ہوگا۔'' باسط مشکوک لہجے میں پوچھا۔

''اوئے بے دال کے بودم! میں جب ماموں کے گھر تھا تو انکل بوبی اور میں ایک ہی بیکری سے سامان لیتے تھے۔ تب مجھے خیال آتا تھا کہ کیسا بیوقوف آدمی ہے، کوئی دو تھپڑ مار کر یہ سارے کارڈ اور ساتھ ان کے پاسورڈ لے جائے تو لاکھوں بٹور لے۔'' اب وہ انہیں پارک لے آیا تھا اور تفصیل بتا رہا تھا۔ ''یہاں وہ گاڑی کھڑی کرتا ہے۔ اس درخت کے پیچھے میں کھڑا ہوں گا اور تم نے یہاں بٹوا پھینکنا ہے۔'' وہ اس اہتمام سے انہیں سب بتا رہا تھا کہ باسط اپنے گال پیٹتا ہوا چلاّ اٹھا۔

''ابے یہ تو پروفیشنل لٹیرا ہے کیسے سہولت سے بتا رہا ہے۔'' وقار جو خود بھی حیران تھا، زور سے ہنس پڑا۔

''اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ بس کرائم پر مبنی پروگرام غور سے دیکھا کرو سب سیکھ جاؤ گے۔'' اکبر جھینپ کر بولا۔

''یاد رکھنا نئے ٹریک سوٹ پہننا کہ جب اس کے قریب جاؤ تو اسے شک نہ ہو۔ اینٹی ڈسٹ ماسک چڑھا لینا۔ ایک دو جھانپڑ لگا کر پاس ورڈ اگلوا لینا۔'' اس نے ہدایات دیتے ہوئے کہا۔ بعد میں اس سارے عمل کی اس نے انہیں اپنی بیٹھک میں باقاعدہ مشق بھی کروائی۔

اگلے دن دھڑکتے دلوں کے ساتھ وقار اور باسط جاگنگ کرتے ہوئے بوبی کی گاڑی کے پاس عین اس وقت پہنچے جب وہ گاڑی میں بیٹھ رہا تھا۔ باسط نے اسے پسٹل دکھایا اور وقار نے اسے دھکا دے کر دوسری نشست پر گرا دیا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

باسط پچھلی نشست پر بیٹھ گیا تھا۔ اکبر نے انہیں کہا تھا کہ بوبی کو ہر صورت پیچھے بٹھانا اور پسٹل اس کی پسلیوں کے ساتھ جوڑ کر رکھنا مگر اس وقت وہ دونوں گھبرا گئے۔

بوبی کو لگا کہ اسے اغوا کر کے لے جایا جا رہا ہے جیسے ہی گاڑی کچھ آگے بڑھی اس نے دروازہ کھول کر چھلانگ لگا دی۔ وقار نے اسے بیک ویو مرر میں لڑھکنیاں کھاتے ہوئے دیکھا۔ اس دوران اس کے پاس لوگ جمع ہو چکے تھے۔

وہ گاڑی کو وہاں سے لے کر نکل گیا۔ باسط منہ کھولے وقار کو دیکھ رہا تھا۔ اس وقت اکبر کی کال موصول ہوئی۔ وہ یہ سب دیکھ رہا تھا۔

اس نے انہیں تسلی دی کہ گھبرائیں نہیں اور حتی الوسع اپنی انگلیوں کے نشان مٹا کر گاڑی کسی جگہ پارک کر کے گھر کی راہ لیں۔ کیمروں سے بچنے کی بھی اس نے تاکید کی تھی۔ وقار نے پہلے تو گھبرائے ہوئے باسط کو ایک سنسان گلی میں اتار دیا۔ قریب ہی روڈ تھا اسے بہ آسانی کوئی نہ کوئی سواری مل سکتی تھی۔ وہ اکیلے ہی گاڑی کو پارک کرنے لے گیا تھا۔ شام تک سارے نیوز چینل اغوا کی ناکام کوشش کے حوالے سے خبر چلا چکے تھے۔

وہ دونوں سر جھکائے بیٹھے تھے جب وقار وہاں پہنچا۔

''آج تو بال بال بچے۔ اکبر تم نے تو مروا ہی دیا تھا۔''

اکبر نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''مجھے کیا معلوم تھا تم دونوں کاٹھ کے اُلو ہو۔ ہر بات اچھے سے سمجھائی مگر تم دونوں کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ بزدلی بہت بڑی ذلت ہے۔''

وقار نے یہ سن کر قہقہہ لگایا۔ ''اب جو تم نے کہا اس پر قائم رہنا اپنے بیان سے پھرنا نہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے جیب سے ہزار ہزار کی چار گڈیاں نکال کر میز پر رکھ دیں۔

باسط اور اکبر جو مایوسی سے سر نہوڑائے بیٹھے تھے، سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

''یہ کہاں سے آئے تمہارے پاس؟'' اکبر نے پیسے

اٹھاتے ہوئے کہا۔

''یہ تو کچھ نہیں اب اور بھی آئیں گے۔ چلو عارف لالہ ہماری راہ تک رہا ہوگا۔ اکبر پیسے تم جیب میں رکھو تم ہی دینا۔ بڑے بڑے ڈائیلاگ بھی تم نے ہی مارے تھے۔''

''تم نے گاڑی کے ساتھ کیا کیا؟'' اکبر نے اچھل کر اس کی گردن کو اپنے بازو کے شکنجے میں لیتے ہوئے کہا۔

''میری جان سب بتاؤں گا بس آج دیکھتے جاؤ۔'' وقار نے اسے پسلیوں کے نیچے مُکا رسید کرتے ہوئے کہا۔

اکبر نے نخوت سے دو لاکھ اس لڑکے کی جانب یوں پھینکے جیسے کتے کو ہڈی پھینکی جاتی ہے۔

''ایک گیم اور ہو جائے۔'' وقار نے اسٹک کو پاؤڈر لگاتے ہوئے کہا۔

اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر کے وہ کھیلنے پر تیار ہو گیا۔

اس دن وہ پورے اعتماد سے کھیلا تھا اور مخالف کی ایک نہیں چلنے دی۔ ایک فریم بھی وہ نہیں ہارا۔ آخر اس لڑکے نے ہاتھ اٹھا دیے۔ اس نے سب سے پہلے عارف کو سود سمیت اس کی رقم لوٹائی۔ سارے کلب والوں کو دعوت کھلائی اور بچ جانے والی رقم تینوں نے تقسیم کر لی۔

''اب سچ بتاؤ تم نے گاڑی کا کیا کیا؟'' اکبر نے گھر پہنچتے ہی پوچھا۔

''یار سب اتفاق کی بات ہے۔ اتفاق سے میرے کلاس فیلوز نے بہت ترقی کی ہے۔ ان میں ایک مکینک ہے جو پارٹ ٹائم کار لفٹر بھی ہے۔ اتفاق سے اس دن میں نے اسے سڑک پر دیکھ لیا۔ اس کا نمبر بھی اتفاق سے میرے پاس تھا۔ میں نے اسے فون کر کے بتایا کہ دو بندے ایک گاڑی سڑک کنارے چھوڑ کر چلے گئے ہیں چابی بھی اس میں لگی ہوئی ہے۔ اس کو جب ماڈل بتایا تو اس نے دبی دبی آواز میں چلّانا شروع کر دیا کہ میں وہ اس تک پہنچا دوں۔ وہیں میں نے چار لاکھ میں سودا کیا اور گاڑی لے جا کر اسے دے دی۔ دو گھنٹے بعد جا کر اس سے پیسے لے لیے۔''

''یاؤ دماغ تو ہے تمہارے پاس۔'' اکبر نے پھر اس کی گردن میں بازو ڈالنا چاہا مگر اب وقار تیار تھا۔ اس نے جھکائی دے کر خود کو بچایا اور اس کا بازو پکڑ لیا۔

''بیٹا صرف تو ہی ماسٹر مائنڈ نہیں بھائی بھی اتفاق کی گیند پر چھکا مار سکتا ہے۔'' وقار اس کا بازو مروڑتے ہوئے بولا۔

''کیا خیال ہے جب تم دونوں اتنے شاطر اور چالاک ہو تو اپنا ایک گینگ نہ بنا لیا جائے۔'' باسط نے پیسے جیب سے نکال کر دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہارے منہ کو حرام لگ گیا ہے حرام خور۔ آج کل اگلے پکڑ کر جلا دیتے ہیں۔'' وقار نے اسے ایک دھپ رسید کر کے کہا۔

باسط نے ہاتھ میں پکڑے ہزار ہزار کے نوٹ ہوا میں اچھال دیے۔ اب وہ دھمال ڈال رہا تھا۔ ''اکبر کی امی چلّائیں۔ کم بختو! کتنی بار کہا ہے آپس میں ہاتھا پائی نہ کیا کرو مگر تم لوگ باز ہی نہیں آتے۔'' اس سے پہلے کہ وہ اندر آتیں اکبر تیزی سے باہر نکل گیا تاکہ انہیں اس طرف آنے سے روکے۔ وقار نے ایک مُکا پیسے اکٹھے کرتے باسط کی پیٹھ پر مارا۔ اور بولا۔

''جلدی کر! اگر انٹی نے دیکھ لیا بیٹا تو ہم سب کی کھٹیا کھڑی کر دیں گی۔''

☆☆☆

آج بہت دنوں بعد نادیہ اپنے بھائی کو ہشاش بشاش پا کر اس کے پاس جا بیٹھی تھی۔

''ضرور کوئی کام ہوگا۔'' وقار نے موبائل پر سے نگاہیں اٹھائے بِنا کہا۔

''آپ ہی اتنے دنوں سے روتی صورت بنا کے گھوم رہے تھے۔ میں اس لیے پاس نہیں آئی آپ پھر لحاظ نہیں کرتے۔'' نادیہ نے منہ بنا کر کہا۔

وقار آج بہت خوش تھا، وہ زیرِ لب مسکرا دیا۔ ''بول کیا چاہیے؟'' اس نے حاتم طائی کی قبر پر لات مارتے ہوئے پوچھا۔

''سوچ لو کہوں گی تو بُرے بُرے منہ بناؤ گے۔ اس مرتبہ مجھے تگڑی رقم چاہیے موبائل چلتے چلتے رک جاتا ہے نیا خریدنا ہے۔'' نادیہ نے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم اسی کو ٹھیک کیوں نہیں کروا لیتیں۔'' وقار نے اسے چڑانے کے لیے کہا۔

''مجھے کیا ضرورت ہے جب چار ہزار میں ایک بیوقوف مجھ سے خرید رہی ہے۔''

''چار ہزار؟ مارکیٹ میں یہ پندرہ سو کا بھی کوئی نہیں خریدے گا۔'' وقار چلّایا۔

''نہ خریدے...... میں کون سا مارکیٹ میں بیچوں گی۔ کالج کی لڑکی ہے میں نے کہہ دیا واپس کیا تو ہزار کاٹ لوں گی۔'' اس نے فخر سے بتایا۔

''مجھ سے کتنے بٹورنے آئی ہو؟'' وقار جس کی پہلے ان

باتوں پر پیشانی شکن آلود ہو جاتی تھی، بہت اطمینان سے بولا۔

''مجھے سات ہزار روپے چاہئیں۔'' نادیہ جو چار مانگنے آئی تھی موقع کو غنیمت جان کر رقم بڑھاتے ہوئے بولی۔

وقار نے اسے گھور کر دیکھا۔ جیب میں ہاتھ ڈالا اور چار ہزار نکال کر اسے تھما دیے۔ اور بولا۔ ''بندے کو اپنی اوقات دیکھ کر منہ کھولنا چاہیے۔''

نادیہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گئی۔ اس کا اپنا موبائل بھی اتنے کا بک جاتا کچھ پیسے اس کے پاس بھی تھے اب وہ ایک اچھا موبائل خریدنے کی پوزیشن میں آ گئی تھی۔ اس لیے پیسے لے کر خاموشی سے اٹھ کر وہاں سے چل دی۔ نیا موبائل لے کر وہ بہت خوش تھی۔ اس کے کیمرے کا رزلٹ شاندار تھا۔ اس نے اپنی اور وقار کی ڈھیروں تصویریں اتاری تھیں۔

☆☆☆

اس جیت کے بعد کلب میں وقار کی عزت کچھ اور بھی بڑھ گئی تھی۔ دوسرے کلبوں سے بھی لوگ اس سے کھیلنے آنے لگے تھے۔

اس شام بھی وہ حسبِ معمول وہاں موجود تھا جب اس کا موبائل تھرتھرایا۔ اسکرین پر اس کے والد کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ وہ شاذ و نادر ہی اسے فون کرتے تھے۔ وہ تیزی سے باہر کی جانب لپکا۔ اندر میوزک کی گھن گرج میں بات کرنا ممکن نہ تھا۔ کافی دیر تک باسط دروازے کی جانب دیکھتا رہا مگر وہ نہیں لوٹا۔ اس نے اسے کال ملائی مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اب اس نے اکبر کو کال ملائی اور صورتِ حال بتائی۔ وہ بھی پریشان ہو گیا۔ وہ وقار کی فطرت سے واقف تھا کہ کھیل ادھورا چھوڑ کر وہ کبھی کہیں نہیں جاتا تھا۔

وہ سیدھا اُس کے گھر پہنچے تو گھر پر تالا تھا۔ محلے والوں سے پوچھا، ان کو بھی کچھ علم نہ تھا۔

دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ اس وقت اکبر کے نمبر پر وقار کی کال آئی۔ اس نے اسے فوراً اسپتال پہنچنے کا کہا تھا۔

پتھرایا ہوئے چہرہ لیے وہ ان کو باہر ہی مل گیا۔ اس کا رنگ سیاہ پڑ گیا تھا۔ وہ دونوں جو پہلے ہی پریشان تھے، اسے ایسا پا کر مزید پریشان ہو گئے۔

''کیا ہوا بھائی!'' اکبر نے تقریباً اسے جھنجوڑ کر پوچھا۔

''نادیہ نے خودکشی کر لی ہے۔ تم پولیس سے جان چھڑاؤ۔ وہ کیس بنانا چاہتے ہیں۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

سیر کو سوا سیر

''دیکھو میرا کیا حال ہے۔ ساڑی ہے تو اس میں بارڈر نہیں ہے، سرخی ہے تو پاؤڈر نہیں ہے، ڈبیا ہے تو کاجل نہیں ہے۔'' بیوی نے اپنے شوہر کے سامنے اپنا دکھڑا رو دیا۔

''بیگم تم ٹھیک کہتی ہو، میرا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے...... مثلاً جیب ہے تو پیسا نہیں ہے۔'' شوہر نے بڑی معصومیت سے کہا۔

یہ سن کر اکبر کے جسم میں ایک لمحے کو سنسنی سی دوڑ گئی۔ وہ چھوٹی لڑکی اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائی جو بڑی بڑی آنکھوں میں شرارت لیے پٹر پٹر ان سب کو جواب دیتی تھی۔ وہ جھینپ سکتے تھے یا ہنس سکتے تھے، اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔

''کیا وہ اتنی بڑی ہو گئی تھی کہ خودکشی کرلے؟'' اس نے سوچا۔

''تم یہاں مجسمہ بن کر کھڑے رہو گے یا جس کام کے بلایا ہے وہ بھی کرو گے۔'' وقار نے تلخی سے کہا۔

''وہ جیسے ہوش میں آ گیا تھا۔ وہ سیدھا پولیس والے کی جانب بڑھا۔ اپنا تعارف کروایا۔ کچھ دیر گفت و شنید کے بعد وہ وہاں سے جانے پر تیار ہو گئے۔

جتنے منہ، اتنے سوال تھے، اتنے مفروضے تھے مگر اصل بات گھر والوں کو بھی معلوم نہیں تھی۔ بس ماں کو یہ معلوم تھا کہ وہ چند دنوں سے پریشان اور گم صم تھی۔ ہر کام بے دلی سے کرتی تھی مگر ان کا خیال تھا اس عمر میں لڑکیوں پر ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ انہوں نے اس بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ اس نے بھی اپنی پریشانی کسی کو نہیں بتائی۔

وقار نے اس کا موبائل چھان مارا جو اس نے کچھ دن پہلے ہی خریدا تھا مگر اس میں بھی کچھ نہیں تھا۔ وہ اس کی سہیلیوں سے ملا ان سے بات چیت کی مگر چکر سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اتنی ہنس مکھ لڑکی کیسے خودکشی کر سکتی ہے۔ کسی کو بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس خوش کلام بلبل نے انہیں کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔

اسے اب جا کے معلوم ہوا کہ وہ اپنی بہن سے کتنی محبت کرتا تھا۔ اس کے ساتھ گزارا ہوا ہر لمحہ اس کی آنکھ کے سامنے آ کر ٹھہر جاتا۔ اس کی ہنسی جو بھی اسے چڑایا کرتی تھی اب اس کے کان سننے کو ترستے تھے۔ اس کا گھر جانے کو من نہیں کرتا تھا۔ باہر بھی جی نہیں لگتا۔ اکبر اور باسط اس کا دل بہلانے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔

چند مہینوں بعد وہ اپنی روٹین پر واپس آ گیا۔ ہنسنے بولنے بھی لگا تھا۔ اسنوکر بھی جم کر کھیلتا مگر اندر سے وہ مر گیا تھا۔ اس کی روح کا کوئی حصہ نادیہ کے ساتھ چلا گیا تھا۔

ایک دن اکبر غصے میں بھرا ہوا وقار کے گھر آیا۔

''اس بوڑھے سنار کو سبق سکھانا پڑے گا۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ بڈھا جانتا بھی ہے پھر بھی ہمارے خاندان کو انکار کر دیا۔'' اکبر نے پھنکارتے ہوئے کہا۔

وقار بے اختیار ہنس پڑا۔ ''وہ تمہارے خاندان سے نہیں، تم سے شاکی ہے۔ جس طرح کا تم نے حلیہ بنایا ہوا ہے بات بات پر پستول نکال لیتے ہو۔ دس لڑائیاں تم نے محلے میں لڑی ہیں۔ ایک میں اپنے ہونے والے سالے کو بھی پیٹ ڈالا تھا۔ کیوں دے گا وہ تمہیں رشتہ۔ اس کا دماغ خراب ہے۔''

''تم اس کے طرف دار بنو گے تو تمہارے بھی دانت توڑ دوں گا۔'' اکبر مُکا لہراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

''مجھے یہ اعتراض نہیں کہ اس نے رشتہ نہیں دیا۔'' وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''بھاڑ میں جائے وہ لڑکی وہ بڈھا۔ مگر اس کو امی سے بدتمیزی نہیں کرنی چاہیے تھے۔ اس کا حساب اس کو دینا ہوگا۔ یار رشتہ مانگا تھا، انکار کر دیتے۔ کہہ دیتے نہیں دے سکتے مگر یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ مجھ جیسے بیٹوں کی ماؤں کو شرفا کے گھریوں منہ اٹھا کر جانے کی جرأت نہیں کرنی چاہیے۔ ابے اس بڈھے کی بیٹی نے میری منتیں کیں کہ رشتہ بھیجوں۔ جب ملوں ہاتھ جوڑ دیتی ہے۔ آخر میری ماں کو فون کر کے خود کہا۔ مگر میری ماں نے اس کا نام نہیں لیا۔ چپ کر کے لوٹ آئیں۔'' غصے سے ..... اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

وقار ایک دم سنجیدہ ہو گیا تھا۔ ''اس بڈھے کو سبق سکھا دیں گے، تم بے فکر رہو۔'' اس نے گلاس میں پانی انڈیلتے ہوئے کہا۔

باسط بھی آ گیا تھا۔ اب جو سبق سکھانے کا پلان اکبر نے بتایا تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ انہیں اس کی دماغی حالت پر شک گزرا۔ انتقام لینے کا یہ کون سا طریقہ ہے، باسط نے حیران ہو کر پوچھا۔

''تم بڈھے کو لوٹنا چاہتے ہو؟ گھامڑ! اس کی دکان کا محل وقوع دیکھا ہے۔ وہ بازار کے مرکز میں ہے۔ دو گارڈز اس کی دکان کے سامنے کھڑے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہاں ہر دکان پر بندوق بردار گارڈز ہیں اور سب نے گٹھ جوڑ کر رکھا ہے۔ آج تک تو کوئی ڈاکا وہاں کامیاب نہیں ہوا۔ اس سے بہتر ہے مجھے اپنا پسٹل دو، میں بڈھے کو گولی مار دوں گا۔'' باسط نے ساری مشکلات کا ذکر یوں کیا جیسے وہ پہلے ڈاکا مارنے جا چکا ہے۔

وہ دونوں باسط کی بات سن کر حیران رہ گئے۔ حالانکہ یہ ساری معلومات اکبر نے اس خیال کے آنے کے بعد اکٹھی کی تھیں۔

''بات تو، تُو نے سیانوں والی کی ہے اُلو کی دم! لیکن میری بھی تو سن۔ ہم نہ تو روایتی چور ہیں نہ ہی ان جیسا کچھ کریں گے۔ ہمارا مقصد چوری یا ڈاکا ہے بھی نہیں۔ ہم اسے سبق سکھائیں گے۔ یہ سب کچھ بہت ہٹ کے ہوگا۔ بہت آسان ہوگا۔ جب سنو گے تو اش اش کر اٹھو گے اور میں پہلے بتا دوں یہ مال میرے سسر کا ہے اس پر حق میری بیوی کا ہے۔ تم لوگوں کو صرف محنتانہ ملے گا۔''

''ابے کیا ملے گا؟'' باسط نے حیرت سے کہا۔

''مطلب ڈاکے کی فیس ملے گی۔ پہلے سے بتا رہا ہوں۔ بعد میں چیں چیں نہیں کرنا۔''

''مگر ڈاکا مارنے کون جا رہا ہے۔ میں تو نہیں جاؤں گا۔'' باسط نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''یار سن تو لو۔'' اکبر نے جھلا کر کہا۔

''ڈاکے کا سب سے مشکل پہلو بچ کر نکلنا ہوتا ہے مگر یہ اس واردات میں سب سے آسان ہوگا۔ تم لوگ دکان کے اندر جاؤ گے۔ کاؤنٹر کے مخالف سمت سیڑھیاں ہیں۔ وہاں سے ہوتے ہوئے سیدھا اوپر پہنچ جاؤ گے۔ دو تالے ساتھ لے کے جانا۔ گرل کو کھینچ کر اسے تالا لگا دینا اور بھاری بھرکم دروازہ بند کر کے اسے بھی لاک کر دینا۔ اب تم لوگ موجود ہو گے بڈھے کے اسٹرونگ روم میں جہاں اس کا خزانہ موجود ہے۔ وہاں ایک دو کاریگر بھی ہو سکتے ہیں۔ ان کو اپنے جھانپڑوں سے تم لوگ پُرسکون کر دو گے۔ اب مسئلہ اس بابا آدم کے زمانے کی تجوری کو کھولنے کا ہے، اس کے لیے پریکٹس کرنی پڑے گی۔ وہ بھی ہو جائے گی۔ اسٹرونگ روم میں ایک چھوٹی سی کھڑکی ہے جس کی آہنی سلاخیں باہر کی طرف جھٹکا دینے سے نکل جائیں گی، دوسری طرف تین فٹ کی دوری پر ایک اور کھڑکی ہے۔ وہ کھڑکی تمہیں کھلی ملے گی۔ وہ دراصل ایک ہوٹل کا کمرا ہے۔ اس کمرے سے نکل کر تم لوگ ہوٹل کے اوپر چلے جانا وہاں کچرا پھینکنے والے روزن سے لوٹا ہوا مال نیچے پھینکنا اور خود وہاں موجود اسنوکر کلب میں گھس جانا۔ اگلے چند گھنٹے وہیں گزارنا اور ہنسی خوشی گھر کو چل دینا۔''

''یہ ساری معلومات تمہارے پاس کہاں سے آئیں؟'' وقار نے اس کا کان مروڑتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔ ''اتنا تم ماسٹر مائنڈ ہوتے تو ہم جیسے سڑک چھاپ لوگوں کے دوست کیوں ہوتے۔ اس وقت تم کسی بڑے حکومتی عہدے پر کام کر رہے ہوتے۔ ملک لوٹ رہے ہوتے۔ مجھے جب تک تم یہ نہیں بتاؤ گے تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس بڈھے کی دکان کا رخ بھی کروں۔''

یہ سن کر اکبر نے قہقہہ لگایا۔ ''مجھے تو جلنے کی بُو آ رہی ہے۔ تم لوگ میری پلاننگ کرنے کی صلاحیت سے حسد کرنے لگے ہو۔'' اس نے انہیں چڑانے کے لیے کہا۔

''اصل بات یہ ہے کہ گھر کا بھیدی جب لنکا ڈھانے پر تیار ہو تو معلومات مل ہی جاتی ہے۔ اس مشن ''سبق سکھاؤ'' میں آپ کی بھابی شامل ہیں۔ تجوری کھولنے کی وڈیو اس نے بھیجی ہے۔ میں اس ہوٹل کی کھڑکی میں کھڑے ہو کر اس سے ملتا تھا۔ کالج کے دنوں میں جب وہ جلدی فارغ ہو جاتی تو دکان آ جاتی اور اوپر اسٹرونگ روم میں ہوتی تھی۔ کیا خوبصورت دن تھے۔ وہ سلاخیں بھی میں نے اپنی قوتِ بازو سے اکھاڑ ڈالی تھیں۔ ایک دن اس کے ظالم باپ کو شک ہو گیا تو اس نے وہاں کیمرا لگا دیا اور یوں سب ختم ہو گیا۔'' اکبر گویا گردن اٹھائے کسی مرغ کی طرح خیالی دریچے سے وہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔

''جو لڑکی اپنے باپ کی نہیں وہ تیری کیا ہوگی۔'' باسط دور کی کوڑی لایا۔

''اوئے خبیث! شرم کر...... وہ مدد کر رہی ہے اور تم بکواس کر رہے ہو۔'' اکبر بپھر کر بولا۔ ''وہ اپنے باپ کے خلاف نہیں، اپنی سوتیلی ماں کے خلاف ہے جو اسے اپنے گنوار بھانجے کے ساتھ بیاہ کر انگلینڈ بھیجنا چاہتی ہے۔ اس کے ابا کی آنکھوں پر تو پٹی بندھ گئی ہے۔ اب یہی ایک طریقہ ہے کہ اس بڈھے کو اس کی اوقات یاد دلائی جائے۔''

اکبر نے بہت مشکل سے انہیں مشن ''سبق سکھاؤ'' کے لیے تیار کیا تھا۔ اس مشن کے لیے انہوں نے بہت حد تک اپنے حلیے تبدیل کیے تھے۔ کم از کم وہ پہلی نظر میں پہچانے نہیں جا سکتے تھے۔ دوپہر کا وقت منتخب کیا گیا۔ چونکہ اس وقت گارڈز پر بھی کسل مندی طاری ہوتی۔ بازار بھی سنسان ہوتا۔ دکان میں گاہک بھی کم ہونے کا امکان تھا۔ اس لیے یہ وقت انہیں مناسب لگا۔

وہ دونوں کیپ پہنے، سیاہ چشمے لگائے دکان میں جا گھسے۔ جب تک وہاں کوئی کچھ سمجھتا، وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتے چلے گئے۔ لمحوں میں انہوں نے گرل کھینچی اور اسے تالا لگا دیا۔ اس کے بعد دروازہ بھی بند کر دیا۔ اچانک پیچھے سے ان دونوں کو کسی نے للکارا۔

''خبردار! ہاتھ اوپر کرو۔ کون ہو تم لوگ۔'' مڑ کے جو دیکھا تو چند سیڑھیاں اوپر باوردی گارڈ خوفناک گن ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔

''نیچے دکان میں ڈاکو آ گئے ہیں۔'' باسط ہکلا کر بولا۔ ''اور کتنے گارڈ ہیں یہاں ان کو بھی بلاؤ جلدی۔''

یہ سنتے ہی گارڈ کا تنا ہوا جسم کچھ ڈھیلا پڑ گیا۔ ''میں اکیلا ہی ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''انہوں نے دونوں گارڈز بھی مار ڈالے ہیں۔'' باسط نے روہانسی آواز میں کہا۔

وہ گارڈ تیزی سے نیچے اترا۔ ''تم پیچھے ہٹو۔'' وہ دروازے سے جھانکنا چاہ رہا تھا۔ وقار نے اس کی کنپٹی پر ایک زوردار مُکا جمایا۔ اس کا سر دروازے سے ٹکرایا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اندر جانے سے پہلے دروازے پر اندرونی طرف لگے کیمرے پر انہوں نے اسپرے کر کے اسے اندھا کر دیا تھا۔ تجوری کھولنے میں انہیں دقت ہوئی مگر کوشش کر کے انہوں اسے کھول ہی لیا۔ آنکھوں کو خیرہ کرتی سونے کی اینٹوں کو انہوں نے باریک دستانے پہنے لرزیدہ ہاتھوں سے اٹھا کر تھیلے میں بھرا۔ کام مکمل کر کے وہ کھڑکی کے راستے ہوٹل کے کمرے میں پہنچ گئے تھے۔ ہر ہر چیز پلان کے مطابق ہوئی تھی۔

☆☆☆

اسنوکر کلب میں وقار کو دیکھ کر سب کو خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔ اس کے شاگرد آگے بڑھ بڑھ کر اس سے مل رہے تھے۔ اس وقت اسے خدشہ محسوس ہوا کہ اس کی یہ شہرت سارے کیے کرائے پر پانی نہ پھیر دے۔

پولیس جب ہوٹل میں داخل ہوئی، وہ دونوں وہیں تھے۔ روایتی انداز میں ان سے بھی سوال پوچھے گئے تھے جن کا انہوں نے اعتماد سے جواب دیا تھا۔ جہاں وہ تھے وہاں جم تھا، اسنوکر کلب تھا، کڈز کارنر تھا اور بہت کچھ تھا۔ وہاں کون آیا؟ کون گیا؟ اس بات کا خیال رکھنے کا کسی کے پاس کوئی وقت نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر باسط اور وقار مطمئن ہو گئے۔

بڈھے کا بی پی شوٹ کر گیا تھا۔ وہ اسپتال میں پڑا تھا۔ وہاں کی انجمن نے ہڑتال کر دی تھی۔ کروڑوں روپے مالیت کا سونا چوری ہونے کی وجہ سے میڈیا نے بھی کچھ زیادہ کوریج کی تھی۔ پولیس کے پاس کرنے کو اور بھی بہت کام تھے۔ آہستہ آہستہ معاملہ دبتا گیا۔

دوسری طرف اس کی بیٹی نے بھی صاف صاف کہہ دیا تھا کہ شادی کرے گی تو صرف اکبر سے ورنہ گھر بیٹھی رہے گی۔

اتنے بڑے نقصان کے بعد اس میں پہلے جیسا دم خم باقی نہیں بچا تھا۔ بیوی سے بھی تعلقات خراب رہنے لگے تھے۔ اکبر کے ماموں نے بھی اس پر دباؤ ڈالا۔ اس طرح یہ معاملہ ختم گیا۔ اکبر نکاح کے بعد پھولا نہیں سما رہا تھا جب اس موٹے بھدے کالے گول مٹول شخص نے اس کی جانب مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور اپنا منہ اس کے کان کے قریب لا کر کچھ بولا۔

اکبر کی مسکراہٹ ایک دم غائب ہوگئی۔ وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا جیسے اسے کسی نے ڈنک مارا ہو۔

اس وقت اس کے ماموں آگے بڑھے اور اکبر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے بولے۔ ''یہ سلامت مرزا ہے۔ کرائم برانچ سے حال ہی میں ڈی ایس پی کے عہدے سے ریٹائر ہوا ہے۔ تمہارے ابو کا بڑا گہرا دوست تھا۔'' یہ سن کر اکبر کا رنگ مزید پھیکا پڑ گیا۔ اس کے ماموں کسی اور کی جانب متوجہ ہوئے تو سلامت مرزا نے اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔

''گھبراؤ نہیں، وہ آپس کی بات تھی۔ کل شام مونیکا ہوٹل میں اپنے ساتھیوں سمیت آؤ۔ تم لوگوں سے کچھ بات کرنی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

وقار تیزی سے اس کی طرف آیا۔ ''تیرے چہرے پر کیوں ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔'' سلامت مرزا کو اس سے بات کرتا وہ دیکھ چکا تھا۔

''وہ سامنے اس شخص کو دیکھ رہا ہے اس نے میرے کان میں پتا ہے کیا کہا۔''

''جناب کیا کمال کی قسمت پائی ہے بلکہ ذہانت کہنا چاہیے۔ لڑکی بھی حاصل کرلی اور سسر کا سونا بھی ہتھیا لیا۔''

یہ سن کر وقار بھی پریشان ہوگیا۔

''کل ملنے کا کہا ہے۔'' اکبر نے تفکر سے کہا۔

''مل لیں گے۔ تو یوں منہ بنا کے کھڑا نہ ہو۔ ہم نے جب کچھ کیا ہی نہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت بھی کیا ہے۔'' وقار نے اسے تسلی دی۔ حالانکہ اس شخص کو دیکھ کر اسے بھی ایک انجانا سا خوف محسوس ہوا تھا۔

اگلے دن وہ پوری تیاری اور اعتماد کے ساتھ اس ہوٹل میں موجود تھے۔

''مجھے ایک کیس کے سلسلے میں تم لوگوں کی مدد چاہیے۔ کام خطرناک ہے مگر تم لوگوں کو تو خطروں سے کھیلنے کا شوق ہے۔ اس لیے تم لوگوں سے مدد طلب کر رہا ہوں۔'' اس نے چائے کا سپ لیتے ہوئے کہا۔

''انکل آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے ہم عام لوگ ہیں۔ ان سرکاری کاموں میں آپ ہمیں نہ گھسیٹیں۔'' اکبر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''یہ سرکاری کام نہیں ہے بھتیجے۔ یہ کام ذاتی نوعیت کا ہے اور تمہاری مدد کے بنا نہیں ہو سکتا اس لیے تم سب کو یہاں بلایا ہے۔''

''دیکھو کرنا یوں ہے......'' وقار نے طیش میں آ کر اچانک میز پر ہاتھ مارا۔ سلامت مرزا اچھل پڑا اس کے ہاتھ سے پیالی گرتے گرتے بچی۔

''جب کہا کہ ہم نہیں کریں گے تو بات ختم ہوگئی ڈی ایس پی صاحب۔ آپ کو بات سمجھ آجانی چاہیے۔'' اس نے چبا چبا کر کہا۔

اردگرد بیٹھے لوگ متوجہ ہوگئے تھے۔ سلامت مرزا نے اِدھر اُدھر دیکھا اور بولا۔

''کام تو تم لوگوں سے ہی لینا ہے کیونکہ تم لوگ بہت کام کے بندے ہو۔ اور یہ کام مفت نہیں ہوگا اس کی قیمت ہو گی۔''

''اچھا آپ ہمیں کیا قیمت دیں گے؟'' باسط نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''میں تم لوگوں کی طرف سے اس واردات کے حوالے سے اپنے لب سی لوں گا جس سے تمہیں کروڑوں کا فائدہ ہوا ہے۔'' چائے کا سپ لیتے ہوئے اس نے کہا۔

ایک لمحے کے لیے تینوں پر سکتہ طاری ہوگیا۔

''میں اکبر کی تصویر لے کر ہوٹل کے سابق منیجر کے پاس گیا تھا۔ وہ اسے کمرا نمبر اکیس والا لڑکا بتا رہا تھا۔ اکبر تم جب بھی ہوٹل جاتے دو چار گھنٹے کے لیے وہی کمرا لینے کی خواہش کرتے تھے جس کے سامنے تمہارے سسر کی دکان کے اوپری کمرے کی کھڑکی کھلتی ہے۔

انگریز کے زمانے کی وہ تجوری پانچ منٹ میں صرف وہی کھول سکتا ہے جسے اس کے پوائنٹس معلوم ہوں۔ دنیا میں تین افراد ہیں جنہیں وہ معلوم تھے۔ تمہارا سسر، سالا اور تمہاری منکوحہ۔ سسر تو تم سے اب بھی مطمئن نہیں۔ اب بھی تمہیں وہ تجوری دکھانا بھی گوارا نہ کریں۔ سالے کے ساتھ تم مار پیٹ کر چکے ہو۔ ویسے منکوحہ بھی تمہیں کیوں بتائے گی حالانکہ وہ سوتیلی ماں سے تنگ تھی مگر باپ کی تجوری کا تو پھر بھی نہیں بتائے گی۔''

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''ایک آخری بات' وقار اور باسط اس دن ہوٹل میں تھے۔ ہوٹل کے کیمرے نے انہیں باہر جاتے ہوئے تو دیکھا مگر اندر آتے ہوئے ان دونوں نے شاید سلیمانی ٹوپی پہن رکھی

تھی۔'' سلامت مرزا نے چائے کا ایک لمبا گھونٹ بھرا۔

''بیٹا! مجرم جتنا بھی چالاک ہو، وہ اتنا کچھ اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے کہ ایک عقل کا اندھا تفتیش کار بھی ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے بھی اس تک پہنچ جاتا ہے۔ لیکن اس عمر میں ایسی چالاکی اور ہوشیاری ماننا پڑے گا کہ تم تینوں خطروں کے کھلاڑی ہو۔''

''انکل آپ ہمیں بلیک میل کر رہے ہیں؟'' اکبر شکایت بھرے لہجے میں بولا۔

''بیٹا تو ہو جاؤ بلیک میل، اسی میں ہم سب کا فائدہ ہے۔ مل کر ایک کام نمٹائیں گے۔ تم اپنی راہ لینا میں اپنی راہ لوں گا۔ یقین مانو مجبوری ہے۔ یہ کام بہت اہم ہے اور میں اکیلا ہوں۔ سرکار کی مدد بھی نہیں لینی ورنہ یہ کام بھی نہیں ہو سکے گا۔ کام بہت اہم ہے کہ تم بچوں کو بلیک میل کرنے پر اتر آیا ہوں۔ تم لوگوں کو میرا ساتھ دینا ہوگا۔''

''ہمیں کرنا کیا ہوگا؟'' وقار نے تلخی سے پوچھا۔

''لہجے میں اتنی کڑواہٹ ہوگی تو تم کام کیسے کرو گے۔ کل تم مجھے نو بجے سامنے بس اسٹینڈ پر ملو۔ اپنی اپنی بائیکس لے کے آنا۔ ایک چھوٹا سا ٹیسٹ ہے۔ میں وقت کی پابندی کا قائل ہوں اور کوئی کوتاہی برداشت نہیں کروں گا۔'' وہ ان کو پیچ و تاب کھاتا چھوڑ کر چل دیا۔

شام کو تینوں نے مشورہ کیا کہ جب تک کوئی دوسرا حل نہ سوچ لیا جائے خود کو سلامت مرزا کے حوالے کر دینا چاہیے۔

نو بجے وہ بس اسٹینڈ پر پہنچ چکے تھے۔ تب ہی وقار کو اس کا میسج موصول ہوا۔ انہیں ایک سفید انڈس کا تعاقب کرنا تھا اور اس پر نظر رکھنی تھی۔

''یار یہ ہمیں مروائے گا۔ نجانے یہ شخص کون ہے؟ کیوں نہ تیرے سسر کو سارا سونا واپس کر کے معافی مانگ لیں، اب تو نکاح بھی ہو چکا، وہ ہمارا کیا بگاڑ لے گا۔ اپنی بیٹی اور داماد کو تو جیل نہیں بھیجے گا۔'' باسط نے مشورہ دیا۔

''وہ بھی کر لیں گے مگر وہ آخری آپشن ہے۔'' وقار نے اسے تسلی دی۔ ''پہلے یہ تو دیکھ لیں یہ چاہتا کیا ہے۔ ہم دو دو کر کے تعاقب کریں گے۔ کوئی گڑبڑ ہوئی تو وہاں سے نکل جائیں گے۔''

وہ گاڑی ایک بلڈنگ کی پارکنگ میں جا کر رک گئی۔ اس میں سے ایک جوان لڑکا اترا اور بلڈنگ کے اندر چلا گیا۔ گیارہ بجے تک وہ وہاں کھڑے رہے تب اکبر آگے بڑھا اور وہاں کھڑے گارڈ سے ماچس مانگی۔ سگریٹ جلانے کے دوران بات چیت شروع کر دی۔

''یار یہ ساری گاڑیاں ایمپلائز کی ہیں۔'' اس نے سگریٹ جلاتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں سر کسٹمر بھی آتے رہتے ہیں۔ آپ یہاں کیسے آئے ہیں؟''

''میرا انٹرویو ہے۔ دعا کرو کام بن جائے۔ وہ سفید انڈس دیکھ رہے ہو میرے دوست کی ہے۔ اب اس کی سفارش کوئی مانتا ہے یا نہیں۔ تم اسے جانتے تو ہوگے؟'' اس نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔

''بس سر شکل کی حد تک واقف ہوں ویسے بھی میں گیٹ پر ہوتا ہوں۔ سلام کروں تو صاحب لوگ سر ہلا کر نکل جاتے ہیں۔'' گارڈ نے سادگی سے کہا۔

''چھٹی کتنے بجے ہوتی ہے۔'' اس نے مہنگا سگریٹ گارڈ کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

''یہی کوئی پانچ بجے مگر زیادہ تر لوگ سات بجے ہی نکلتے ہیں۔'' اس نے مسرت سے سگریٹ پکڑتے ہوئے کہا۔

''میں ذرا اندر چکر لگا کے آؤں، دعا کرنا۔'' یہ کہہ کر اکبر اندر چل دیا۔ وہ ہر کام کو دلچسپ بنا لیتا تھا، یہ اس کی فطرت کا حصہ تھا۔ وقار اور باسط کو اس نے گھر بھیج دیا تھا۔ اس بلڈنگ میں مختلف ایڈ کمپنیاں اپنے اپنے دفتر کھولے بیٹھی تھیں۔ ایک جگہ اس نے بتایا کہ اس کے کاغذات گم گئے ہیں۔ اب وہ ہر کمرے میں جھانک جھانک کر اس بابت معلوم کر رہا تھا۔

چوتھی منزل پر وہ جوان اسے دکھائی دے گیا۔ وہ سیدھا اس کی جانب بڑھا اور اسے بتایا کہ وہ ماڈل بننا چاہتا ہے، اس سلسلے میں اسے معلومات درکار ہیں۔ وہ لڑکا یہ سن کر مسکرا دیا۔

''دوست سب سے پہلے تو تم یوں کرو کہ اس کے لیے درست جگہ جاؤ۔ ہمارے ہاں سے تمہیں گاڑیوں کے ٹریکر دستیاب ہو سکتے ہیں۔'' اس نے ایک جانب اشارہ کر کے کہا۔ وہاں اس کمپنی کا نام واضح الفاظ میں لکھا ہوا تھا۔ اکبر یہ دیکھ کر جھینپ گیا۔

اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے وہ بولا۔ ''نیچے چلے جاؤ۔ وہاں فاروق ہوگا اس سے مل لو۔''

''مگر میں اس سے کہوں گا کیا؟'' اکبر نے معصومیت سے کہا۔

''وہی کہنا جو مجھ سے کہا ہے۔'' لڑکے نے جواب دیا۔

''اگر آپ کا ریفرینس ساتھ ہو جاتا تو کام بن جاتا۔ یہ لوگ بہت مغرور ہیں۔ آپ میری مدد کر دیں۔'' اکبر نے خوشامدی لہجے میں کہا۔

اس لڑکے نے بٹوے سے اپنا کارڈ نکالا اور اسے تھما دیا۔

یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ اکبر وہ کارڈ لے کر جھومتا ہوا نیچے آیا اور فوراً اس کامیابی کی اطلاع وقار اور باسط کو دی۔

اس کے بعد اس نے سلامت مرزا کو ساری رُوداد سنائی اور داد چاہی۔

''تمہارا دماغ خراب ہے۔'' سلامت مرزا، سب سننے کے بعد دہاڑا۔ ''شکر ہے یہ ایک ٹیسٹ کیس تھا۔ میں نے تمہیں کہا تھا صرف نگرانی رکھو، کہاں آتا جاتا ہے۔ یہ نہیں کہا تھا کہ اس کے دفتر میں گھس کر اس کا کارڈ لے آؤ۔ کل تم سب مجھ سے ملو لوکیشن میسج کر رہا ہوں۔ تمہیں ابھی کافی کچھ سمجھانا ہے۔'' وہ ناراضی سے بولا۔

دوسرے دن وہ ساحل کے کنارے ایک شاندار بنگلے میں بیٹھے تھے۔

''مشن کی تکمیل تک یہ بنگلا ہمارے استعمال میں رہے گا۔ کل سے تم لوگ یہیں شفٹ ہو جاؤ۔ مشن خطرناک ہے یا نہیں، یہ وقت ثابت کرے گا مگر ہم پوری طرح چوکس رہیں گے۔ اور خدارا جتنا میں کہوں جیسے کہوں صرف اتنا ہی کرو۔'' سلامت مرزا آخری جملے پر زور دے کر بولا۔

''یہ بنگلا کس کا ہے؟'' وقار نے مشکوک ہو کر پوچھا۔

''یہ اسی کرم فرما کا ہے جس کے لیے ہم یہ کام سرانجام دے رہے ہیں۔ وہ ہمیں تمام تر سہولیات فراہم کریں گے۔ تم لوگ خوش ہو جاؤ گے۔'' سلامت مرزا نے جواب دیا۔

''وہ شخص کون ہے اور کام کیا ہے؟ انکل کیوں خوامخواہ جاسوسی فلموں والا ماحول پیدا کیا ہوا ہے۔ سیدھی طرح بتائیں کہ مسئلہ کیا ہے؟'' اکبر نے بیزار ہو کر پوچھا۔

سلامت مرزا کے لبوں پر تبسم نمودار ہوا۔ ''مسئلہ یہ ہے کہ میرے ایک محسن ہیں، ان کی بیٹی کو بلیک میل کیا جا رہا ہے۔ ہمیں اس بلیک میلر کو پکڑنا ہے اور اس مواد کو ضائع کرنا ہے۔ بس اتنا جاننا کافی ہے۔ میں اس شخص کا نام نہیں بتاؤں گا مگر ہو سکتا ہے آگے جا کر تمہیں اس کے نام کا علم ہو جائے۔ اس صورت میں تم لوگ اپنی زبان بند رکھو گے۔'' اس نے تنبیہ کی۔

''یہاں دو تین گاڑیاں موجود ہیں۔ اسلحہ بھی تمہیں فراہم کر دیا جائے گا۔ کل سے ہمارا مشن شروع ہو رہا ہے۔ یاد رکھنا اگر کوئی چالبازی دکھائی تو ساری عمر جیل میں سڑتے رہو گے اور یہ بات دماغ سے نکال دو ستار صاحب تم لوگوں کو معاف کر دیں گے۔ اس کی بیوی تم لوگوں کو کچا چبا جائے گی۔ اگر تم لوگوں نے حسبِ منشا کام کیا تو تم لوگوں کو میں اچھا خاصا معاوضہ بھی دلوا دوں گا۔ وہ ان کو گاجر دکھا کر چھڑی سے ہانک رہا تھا۔

شاندار بنگلے میں آ کر اور مہنگی گاڑیاں تصرف میں پا کر وہ کچھ پُرجوش ہو گئے۔

''بلیک میلر نے ماہم سے پیسے منگوائے ہیں۔'' سلامت مرزا نے بتانا شروع کیا۔ ''اسے خود آنے کا کہا ہے۔ تم تینوں اس کے ساتھ جاؤ گے۔ اس پر نظر رکھو۔ پیسے دینے کا طریقہ وہ بعد میں بتائے گا۔ کوشش کرو کہ معلوم ہو جائے وہ کون ہے۔ ویسے دو مرتبہ اسے وہ پہلے بھی پیسے دے چکی ہے۔ ہر مرتبہ کوئی نیا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ تم لوگ چوکس رہنا۔''

ماہم پست قد کی خوبصورت لڑکی تھی۔ وہ ایک ہوٹل میں جا کر بیٹھ گئی۔ باسط ہوٹل کے اندر موجود تھا۔ وقار اور اکبر باہر تھے۔

موبائل پر بیپ ہوئی۔ اس نے ایک نظر اسکرین پر ڈالی اور اٹھ کر واش روم کی جانب چل دی، وہ جاتے جاتے اشارہ کر گئی تھی۔ باسط ایسی جگہ پر موجود تھا کہ واش روم اسے دکھائی دے رہا تھا۔ ماہم کے جانے کے بعد دو خواتین اندر سے باہر آئیں اور تین اندر گئی تھیں۔ پیسے کون لے گئی تھی، وہ کچھ اندازہ نہیں کر سکا۔

''سر ایسے ہم بس اندھیرے میں تیر چلاتے رہیں گے۔'' رات کھانا کھاتے ہوئے وقار منہ بنا کر بولا۔ ''آپ ہمیں ہمارے طریقے سے کام کرنے دیں۔ یہ کیس آپ ہمارے حوالے کر دیں ہم خود ہی کچھ سوچ لیں گے۔'' اکبر اور باسط نے بھی اس کی تائید کی۔

''تم لوگ ابھی ناتجربہ کار ہو۔ اپنے لیے تو مصیبت کھڑی کرو گے ہی ماہم اور قریشی صاحب کے لیے بھی مسائل پیدا کر دو گے۔ نوجوانی میں انسان سیماب صفت ہوتا ہے۔ تحمل کی شدید ترین کمی کا شکار رہتا ہے۔ تم جلد سے جلد کیس حل کرنا چاہتے ہو مگر ایسے کام بہت آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہیں۔'' سلامت مرزا انہیں سمجھاتے ہوئے بولے۔

''انکل آپ کی بات سن کر وہ لطیفہ یاد آ گیا۔'' اکبر زیرِ لب مسکرا کر بولا۔ آہستہ ڈرائیونگ کرتے باپ نے سڑک پار کرتی بوڑھی کو دیکھ کر ایک جھٹکے سے بریک لگائے اور بیٹے سے بولا۔ اب اگر تم گاڑی چلا رہے ہوتے تو اس بوڑھی کو کچل دیتے۔ بیٹے نے یہ سن کر جماہی لی اور بولا۔ ابا جی میں تو اس جگہ سے ایک گھنٹا پہلے گزر چکا ہوتا۔'' اکبر نے لطیفہ سنا کے زبردست قہقہہ لگایا اور مزید بولا۔

''آپ ہم سے کام لینا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی راہ بھی چننے دیں۔ ماہم کو بلائیے ہم اس سے براہِ راست بات کرنا

چاہتے ہیں۔ اس کے بعد ہم کوئی پلان بنائیں گے۔ آپ وہاں بطور تماشائی موجود رہ سکتے ہیں۔ ہم اس بات کا انتظار نہیں کر سکتے کہ وہ کب دوبارہ رابطہ کرے گا۔ اگر آپ ہمیں فری ہینڈ نہیں دیتے تو ہم آپ کے ساتھ کام نہیں کریں گے۔ آپ کا جو دل چاہے کریں۔'' اکبر نے چیخ ہلا ہلا کر تینوں کے شورے میں طے ہونے والی بات سلامت مرزا کے گوش گزار کر دی۔

اگلے دن ہی ماہم ان سے ملنے آ گئی تھی۔ وقار جو پہلے ہی اس سے متاثر تھا، اسے سامنے پا کر چاروں شانے چت ہو گیا۔ اس کی نظریں کوشش کے باوجود اس پر سے نہیں ہٹ رہی تھیں۔

ان سب کا خیال تھا، وہ بات کرتے ہوئے ہچکچائے گی مگر وہ جس کروفر سے آ کر بیٹھی اور انہیں اپنا تعارف کروانے کو کہا تو وہ ہکا بکا رہ گئے۔

''یہ سلسلہ کب سے چل رہا ہے۔'' اکبر جلد ہی مطلب کی بات پر آ گیا۔

''کوئی چار پانچ ماہ پہلے مجھے میرے موبائل پر میری ایک نیوڈ وڈیو اس دھمکی کے ساتھ موصول ہوئی کہ اگر میں نہیں چاہتی کہ یہ کروڑوں انٹرنیٹ یوزرز تک پہنچے تو مجھے اس کی قیمت ادا کرنی چاہیے۔ تب مجھے لگا کہ سلامت انکل سے بات کرنی چاہیے۔ میں نے بابا سے بات کی اور ان کو بلوا لیا۔''

بابا والی بات سن کر چائے کا سپ لیتے باسط کو پھندا لگ گیا۔ وہ دونوں بھی حیران رہ گئے کہ کیسی لڑکی ہے باپ کو بھی یہ بتا دیا۔

''اس بات کا اور کسے معلوم ہے؟'' اکبر نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

''بس میرے فیانسی جانتے ہیں؟'' ماہم نے اطمینان سے ان کے سر پر بم پھوڑا۔

''سارا خاندان تو جانتا ہے پھر آپ کیوں بلیک میل ہو رہی ہیں۔'' وقار نے پوچھا۔

''میں صرف اسے پکڑوانا چاہتی ہوں۔ اس کی ہمت کیسے ہوئی کہ میرے ساتھ یہ سب کرے۔'' وہ غصے سے بولی۔

''یہ وڈیو اس کے ہاتھ لگی کیسے؟'' باسط نے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ ابھی تک کھانس رہا تھا۔

''یہ مجھے نہیں معلوم۔ یہ اس تک کیسے پہنچی۔''

''ماہم میڈم بلیک میلر کے لہجے سے آپ کو کیا لگتا ہے۔ اس کا تعلق کہاں سے ہو سکتا ہے؟ کتنا پڑھا لکھا ہو گا؟'' وقار نے استفسار کیا۔

''بلکہ یوں کریں اسے ابھی فون ملائیں۔'' اکبر کسی خیال کے تحت فوراً بولا۔ ''اسے کہیں کہ آپ امریکا جا رہی ہیں۔ جانے سے پہلے آپ اس مسئلے سے جان چھڑانا چاہتی ہیں۔ اس لیے آپ اس سے ملنا چاہتی ہیں۔ ایسی کوئی بھی... بات کریں۔''

ماہم نے بنا کسی ہچکچاہٹ کے کال ملائی تو دوسری طرف سے فوراً اٹھا لیا گیا۔

''آج میری یاد کیسے آ گئی شہزادی!'' دوسری طرف سے آواز آئی بیک گراؤنڈ میں بے ہنگم میوزک چل رہا تھا۔

''تم جو کوئی بھی ہو، اس سلسلے کو یہیں ختم کر دو۔'' ماہم نے اسے دھمکاتے ہوئے کہا۔

''اگر نہ ختم کروں تو کیا کرو گی۔'' اس نے مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔

''میں امریکا جا رہی ہوں۔ میں چاہتی ہوں اس چیپٹر کو کلوز کر کے جاؤں۔''

''شوق سے امریکا جاؤ۔ ہم تمہارے باپ کو وڈیو بھیج دیں گے اور دگنے پیسے وصول کریں گے۔'' وہ کریہہ ہنسی ہنس کر بولا۔

''تم ایسا کر کے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارو گے۔ ابھی تک ان کو معلوم نہیں مگر جس دن معلوم ہو گیا تم کو پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔'' ماہم نے چلّاتے ہوئے کہا۔

یہ بات سن کر اس نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''مجھے پاتال سے ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں، میں اسی شہر میں رہتا ہوں۔'' جنوبی شہر کے ایک علاقے کا اس نے نام لیا تھا۔ ''اپنے باپ کو وہاں بھیج دینا۔ ویسے کیسے ہو گا تمہارا یہ چیپٹر کلوز۔ ذرا مجھے بھی تو خبردار کرو۔'' اس کا لہجہ مذاق اُڑنے والا تھا۔

''تمہیں جتنے پیسے چاہئیں مجھ سے لے لو مگر مجھے اس بات کی گارنٹی چاہیے کہ تم وڈیو ڈیلیٹ کر دو گے۔'' ماہم بولی۔

''اور میں کیسے دوں گا یہ گارنٹی کیا سوچا ہے تم نے؟'' اس نے طنزیہ انداز میں سوال کیا۔

یہاں ماہم کو چپ ہونا پڑا۔ اسے لاجواب پا کر اس نے ایک قہقہہ بلند کیا۔

''میڈم تم لوگ ایسے کام نہ کیا کرو کہ پچھتانا پڑے۔ لڑکی ذات میں عقل تو ہے نہیں۔ پہلے الٹی سیدھی وڈیوز بناتی ہیں پھر کسی کے ہاتھ تھما دیتی ہیں۔ پیسہ بھی دیتی ہیں۔ عزت بھی نیلام کروا بیٹھتی ہیں۔ ہاں! زیادہ شریف ہو تو خودکشی کر لیتی ہیں۔ ویسے تم مجھے اتنی شریف نہیں لگتیں۔'' اس نے ہنس کر

کہا۔

وقار کو ایک زوردار جھٹکا لگا تھا۔ خودکشی کا لفظ ہتھوڑا بن کر اس کے دماغ پر لگا تھا۔ نادیہ کا پیلاہٹ لیے کفن میں لپٹا چہرہ، ناک اور منہ سے بہتا خون اس کی آنکھوں کے سامنے آ کر ٹھہر گیا تھا۔ بے اختیار اس کا جی متلایا، وہ ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ واش روم کی طرف بڑھا۔

اس کا دل کہہ رہا تھا کہ ضرور کوئی ایسا ہی حادثہ پیش آیا ہوگا جو نادیہ کی خودکشی کی وجہ بنا۔ لمبا تڑنگا وقار سر گھٹنوں میں دیے رو رہا تھا۔ ہنستی مسکراتی نادیہ کسی سے بھی اپنا دکھ اپنی پریشانی بیان نہیں کر سکی۔ اسے کبھی ماہم جیسا اعتماد ہی نہیں دیا گیا تھا۔ وہ ماں کو بھی نہ بتا سکی کہ اسے کیا دکھ لاحق ہے۔ اس کے پاس پیسے نہیں تھے، وہ جانتا تھا اس سے کیا مطالبہ کیا گیا ہوگا۔ ”ہاں! زیادہ شریف ہو تو خودکشی کر لیتی ہیں۔“ یہ جملہ اس کو پاگل کیے دے رہا تھا۔

وقار اور باسط حیرت سے اسے یوں روتا دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اسے چپ کروانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ماہم اور سلامت مرزا بھی پریشان ہوگئے۔

اکبر اور باسط نے ماہم اور اس لڑکے کے مابین ہونے والی گفتگو کی ریکارڈنگ کئی بار سنی۔ وہ جس ٹون میں بات کر رہا تھا یہ شہر کے جنوب میں بسنے والوں کا ہی لہجہ تھا۔ منہ میں گٹکا رکھ کر بات کی گئی تھی۔ وہ بار بار تھوک رہا تھا۔ یہ بات کسی اسنوکر کلب میں کھڑے ہو کر کی گئی تھی۔ آس پاس والوں سے اس نے کوئی بات چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ باسط نے اپنا تجزیہ پیش کیا۔

”ماہم ان کے چنگل میں پھنسی اکیلی لڑکی نہیں ہے سلامت انکل۔“ اکبر بولا۔ ”یہ سب کچھ بہت آرگنائز طریقے سے کیا جا رہا ہے۔“ سلامت مرزا ان سے بہت متاثر تھا مگر اس نے ایسا ظاہر نہیں ہونے دیا۔ یہ سوچ کر وہ افسردہ بھی تھا کہ کیسے کیسے جوان اس ملک میں ضائع ہو جاتے ہیں اور کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔

وقار اس وقت کمرے میں آیا۔ آج اس کے تیور ہی بدلے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر خوف محسوس ہوتا تھا۔

”باسط، عاشر نام کا تمہارا ایک دوست تھا۔ جس کے پاس ہم موبائل لے کر گئے تھے۔“ اس نے آتے ہی کہا۔

”ہاں وہ آج کل کسی آئی ٹی فرم میں ہے۔ کیوں خیر ہے وہ کیسے یاد آ گیا۔“

”تم یوں کرو اس سے ملاقات رکھ لو۔“ وقار جس تیزی سے آیا تھا اسی تیزی سے واپس چلا گیا۔ اس پر وہ اسنوکر کلب ڈھونڈنے کی دھن سوار تھی جہاں سے اس لڑکے نے بات کی تھی۔ فی الحال اس کی کیفیت ایسی تھی کہ وہ اس کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔

شام کو وہ عاشر کے آفس میں بیٹھے تھے۔

”مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے؟“ عاشر جو فون پر چائے کا کہہ رہا تھا وقار کی بے چینی بھانپ گیا۔

”ہاں بھئی پوچھو۔ مگر پہلے یہ بتاؤ مجھے اسنوکر کب سکھاؤ گے۔“ عاشر بے تکلفی سے بولا۔

”پہلے میرے اس سوال کا جواب دو کہ میں ایک وڈیو اپنے موبائل میں بناؤں۔ کسی کو نہ بھجواؤں لیکن یہ پھر بھی کسی کے ہاتھ لگ جائے کیا ایسا ممکن ہے؟“

عاشر نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا۔ ”تم نے صحافت جوائن کر لی ہے یا پولیس میں چلے گئے ہو۔ اس طرح سے سوال تو وہی کرتے ہیں۔“ وہ قہقہہ لگا کر بولا۔ ”مسئلہ کیا ہے؟ یہ بتاؤ۔“

”یار عاشر کوئی مسئلہ نہیں۔ تم پہلے وقار کے سوال کا جواب دو۔“ باسط نے بھویں اچکا کے اور منہ ٹیڑھا کر کے اسے مسئلے کی سنگینی سمجھانا چاہی۔ جسے وہ سمجھ گیا اور بولا۔

”ہاں ایسا ممکن ہے۔ وائی فائی کے ذریعے بہت آسانی سے موبائل سے ڈیٹا چرایا جا سکتا ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ عوامی مقامات پر چور اپنا وائی فائی اوپن کر دیتے ہیں۔ جیسے ہی آپ اس سے کنیکٹ ہوتے ہیں وہ آپ کے موبائل میں گھس جاتے ہیں۔ مختلف موبائل ایپلیکیشنز سے یہی کام لیا جاتا ہے۔“

”اگر میں اپنے موبائل میں وڈیو بناؤں اور پھر اسے ڈیلیٹ کر دوں تو پھر بھی کیا وہ کسی کے ہاتھ لگ سکتی ہے۔“ وقار نے اگلا سوال داغا۔

”یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے اگر آپ اپنا موبائل کسی کو تھما دو اور وہ مٹائی گئی چیزوں کو دوبارہ دریافت کرنے کا ہنر رکھتا ہو۔ آج کل ایسے بہت سے سافٹ ویئر موجود ہیں۔“

وقار نے اپنا موبائل اس کی جانب بڑھایا اور بولا۔

”یار میں نے کچھ وڈیوز بنائی تھیں وہ ڈیلیٹ ہوگئیں تم واپس لا سکتے ہو؟“

”لو بھائی کھودا پہاڑ، نکلا چوہا۔ میں سمجھا کوئی مقالہ لکھ رہے ہو۔ بھائی یہ ہمارا کام نہیں۔ ویسے نیٹ پر ریکوری سافٹ ویئر موجود ہیں مگر وہ اتنے طاقتور نہیں ہیں۔ ایسے سافٹ ویئرز اتنی آسانی سے نہیں ملتے۔ اگر کوئی بہت اہم وڈیوز ہیں تو شاید

تمہاری مدد عامر تیک والے کر سکتے ہیں۔ اس وقت وہ بہت آگے جا رہے ہیں۔“

باسط کا تو سانس رک گیا تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا وقار کن خطوط پر سوچ رہا ہے۔

واپسی پر وقار نے اسے کہا تھا، وہ اسے علینا کے گھر لے چلے۔ باسط نے اس سے کوئی سوال جواب نہیں کیا۔ علینا اس کی دور کی کزن تھی۔

باسط باہر گاڑی میں بیٹھا رہا۔ وقار گھر کے اندر چلا گیا۔ اس کی یوں آمد پر وہ سب حیران ہوئے۔ اس نے ان کی حیرت یہ کہہ کر دو چند کر دی کہ اسے علینا سے تنہائی میں بات کرنی ہے۔ اس کے چہرے پر پھیلی سنجیدگی دیکھ کر علینا کی ماں کے دل میں ہول اٹھ رہے تھے۔

”خالہ آپ پریشان نہ ہوں۔ وہ بات آپ کے سامنے بھی ہو سکتی ہے مگر شاید پھر علینا جواب نہ دے پائے۔ آپ باہر کھڑی رہ کے بات چیت سن سکتی ہیں۔“

علینا کچھ دیر بعد چادر میں لپٹی سمٹی سمٹائی اس کے سامنے موجود تھی۔

”علینا مجھے تم سے نادیہ کے حوالے سے بات کرنی ہے۔ تمہیں یاد ہے اس کے پاس ایک موبائل تھا جو اس نے بہت اچھی قیمت پر کالج میں کسی لڑکی کو بیچ دیا تھا۔ تم اس لڑکی کو جانتی ہو؟“

علینا نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”وقار بھائی میرا اور اس کا ڈیپارٹمنٹ ہی الگ تھا اس لیے مجھے اس بارے میں کچھ نہیں معلوم ہے۔“

”علینا مجھے اس لڑکی کے بارے میں جاننا ہے جس نے موبائل خریدا تھا۔ اس کی ایک سہیلی تھی رانیہ تم اس سے پوچھ کے دیکھو، یا مجھے اس کا کانٹیکٹ نمبر لا دو۔ تم ایک پین اور کاپی لے آؤ۔ میں تمہیں اپنا نمبر لکھ دیتا ہوں۔ میں تمہیں اپنی بہن سمجھ کر تمہارے پاس آیا ہوں۔ کچھ بھی معلوم ہو مجھے فوراً فون کرنا اور اس لڑکی سے ملنے یا بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس صرف اتنا معلوم ہو جائے کہ موبائل کس کو بیچا گیا تھا۔“

وقار کی قیمتی گاڑی میں آمد اور اس طرح کے سوالات ان سب کو پریشان کر گئے۔ وقار کے جاتے ہی علینا کی ماں نے اسے سمجھا دیا کہ وہ اس چکر میں نہیں پڑے گی نجانے مسئلہ کیا ہو۔ دوسری مرتبہ آیا تو وہ خود بات کریں گی۔

وہ مایوس سا ہو کے... گاڑی میں آ بیٹھا۔

”ہاں بھائی! اتنا بھی کیوں پریشان ہے۔ ہو سکتا ہے جو

مسئلہ تجھے پریشان کر رہا ہے اس کا حل میرے پاس ہو۔“ باسط نے تنگ گلی میں گاڑی ہوشیاری سے موڑتے ہوئے کہا۔

”نادیہ کے پاس ایک موبائل تھا۔ جسے ایک لڑکی نے مارکیٹ ریٹ سے کہیں زیادہ پیسے دے کر خرید لیا تھا۔ میں اس وقت اس بات کو اس لڑکی کی بیوقوفی پر محمول کر رہا تھا۔ میرا خیال تھا نادیہ نے اپنی چرب زبانی سے اسے قائل کر لیا ہے مگر اب مجھے کچھ اور شک ہونے لگا ہے۔“

باسط نے ایک دم بریک لگا دیا۔ ”تت... تم... تمہارے کہنے کا مقصد ہے نادیہ کی خودکشی کا سبب وہ موبائل ہے۔“ باسط اسے پھٹی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”مجھے اس لڑکی تک پہنچنا ہے۔ وہ بہت تباہی پھیلا رہی ہے۔ تم سوچو چھ ہزار لڑکیاں وہاں پڑھتی ہیں۔ کتنوں کے موبائل اس نے خریدے ہوں گے۔ یہ عمر کچھ عجیب و غریب کرنے کی ہوتی ہے۔ انسان کے پاس اس عمر میں کیمرا ہو تو وہ اسے ہر طرح سے چلا سکتا ہے۔ کسی بھی طرح استعمال کر سکتا ہے۔ ایسی وڈیوز بنا کر ڈیلیٹ کر دی جاتی ہیں مگر تم خود سن چکے ہو ڈیلیٹ ہو کر بھی یہ ڈیلیٹ نہیں ہوتیں۔“ یہ کہہ کر وقار نے ہونٹوں میں سگریٹ داب لیا۔ وہ بہت دل گرفتہ لگ رہا تھا۔

”علینا کیا کہتی ہے؟“ باسط نے پوچھا۔

”وہ کچھ نہیں جانتی۔ ویسے میں اسے کہہ تو آیا ہوں کہ مجھے اس لڑکی کا معلوم کر کے دے مگر اب سوچتا ہوں غلط کیا۔ کہیں علینا کے لیے مصیبت نہ کھڑی ہو جائے۔“

”جا کر اُسے منع کر دو۔“ باسط گاڑی روکتے ہوئے بولا۔

”نہیں اب مناسب نہیں، اس کی ماں کے تیور کچھ اچھے نہیں تھے۔ مجھے نہیں لگتا وہ اسے ایسا کچھ کرنے دیں گی۔“ وہ باہر کھڑی سن رہی تھیں۔

”ویسے ماہم کو کالج بھیجا جا سکتا ہے، وہ آرام سے اس لڑکی کا معلوم کر لے گی۔“ یہ تجویز دے کر باسط نے اس کے سر سے بوجھ اتار دیا۔

اکبر اور سلامت مرزا جنوبی شہر گئے ہوئے تھے۔ وہ ایریا انہوں نے ٹریس کروا لیا تھا۔ جہاں سے اس لڑکے نے کال کی تھی۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ وہ علاقہ نو گو ایریا ہے۔ سیکیورٹی فورسز اور اجنبی لوگوں کی آمدورفت ممنوع ہے۔ صرف اس صورت میں اس علاقے میں داخل ہوا جا سکتا ہے جب وہاں کا کوئی مقامی آدمی ضمانت لے۔ اب انہیں سمجھ آیا تھا کہ وہ لڑکا اتنے اعتماد سے کیسے بول رہا تھا۔

”انکل دیکھ لیں ایسے علاقے بھی ہمارے ملک میں

موجود ہیں۔" اکبر کو یہ جان کر بہت حیرت ہوئی تھی۔ لاٹاری ٹکٹ کا تو اس نے بہت سنا تھا مگر کسی کو انعام ملتے ہوئے دیکھا نہیں تھا۔ یہ بات اسے معلوم نہیں ہو سکی تھی۔

"یہ ہی ایمان کا قتل ہے۔ حکومت انہیں ختم ہونے نہیں دیتی۔ اس کی پالیسی ہی ایسی رہی۔"

وہ دونوں واپس لوٹ آئے تھے۔

"ماہم آپ نے اپنا کوئی موبائل بیچا یا کسی اور کو دیا۔" وقار جب اس سے ملا تو پہلا سوال یہی کیا تھا۔

"بیچا تو نہیں ایک مرتبہ کوئی سافٹ ویئر کا مسئلہ تھا تو ابرار کہیں سے ٹھیک کروا کے لایا تھا۔"

"آپ فوراً ابرار سے اس جگہ کا معلوم کریں۔"

ایک گھنٹے بعد وہ اس دکان پر کھڑے تھے۔ وہاں کی کرسی پر جو نام سامنے آیا وہ عامر ڈیک کا تھا۔ وہ سارے موبائل ان کو بھجوا دیتے تھے اور وہ مسئلہ حل کر کے واپس دے دیتے تھے۔ وہ انہیں پہنچنے گئے تو وہ ملا کو بولا۔

"تم لوگ خود چلے جاؤ۔ وہ موبائل نہیں لیں گے۔ کسٹمرز کو وہ براہ راست ڈیل نہیں کرتے۔"

"وہ ہمارا مسئلہ ہے جو نے تم لیکشن دلو۔" اکبر نے ہوائی پیسے دیتے ہوئے کہا۔ وہ ملازم جیب کر پیچھے ہٹنے لگا۔

انہوں نے عامر کو فون کیا اور اس کے توسط سے عامر کے شاندار آفس میں چائے پینے کا موقع مل گیا۔

وقار نے اسے بتایا کہ اس کی کچھ ویڈیوز ڈیلیٹ ہوگئی ہیں انہیں ریکور کرنا ہے۔

یہ سن کر عامر نے نفی میں سر ہلایا۔ "کچھ روز ہوتیں تو میں ابھی ریکور کر دیتا۔ وہ بھی اگر آپ نے اس کے بعد مزید ڈیٹا ڈیلیٹ نہ کیا ہو۔ ویڈیوز تو ڈیلیٹ ہونے کے بعد کرپٹ ہو جاتی ہیں۔ وہ اوور رائٹ بھی فوراً ہوتی ہیں۔ اس لیے یہ ممکن نہیں۔ اس کے علاوہ کوئی خدمت میرے لائق ہو تو میں حاضر ہوں۔"

وہ وہاں سے اٹھ آئے تھے۔

عامر انہیں نہایت شاطر اور گھاگ شخص لگا تھا۔

وقار اس کے متعلق مشکوک ہو گیا تھا۔ اب اُس لڑکی تک پہنچنا بہت ضروری تھا جس نے موبائل خریدا تھا۔ سلامت مرزا اس سب میں ماہم کو گھسیٹنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کو احساس ہو گیا تھا کہ بات ان سے اوپر لیول کی ہے۔ وہ اس بلیک میلر تک نہیں پہنچ سکتے۔

وہ تینوں سلامت مرزا کے بدلتے ہوئے رنگ کو دیکھ رہے تھے۔

"انکل مرزا! ہم اس سب سے دور رہنا چاہتے تھے۔ آپ نہیں جانتے کہ ہم کس مشکل سے اس دلدل سے نکلے ہیں۔ آپ کو خیال تھا ہمارے ذریعے آرام سے اس شخص کو پکڑ لیں گے جو آپ کے دوست کی بیٹی کو تنگ کر رہا ہے۔ آپ نے تو شاید یہ بھی نہیں سوچا کہ ہم سے کام لینے کا سوچ لیا ہوگا۔ آپ ایسا کریں نہ کریں۔ آپ کے پاس ہماری ڈوری لگی ہے۔ جب ہم چاہیں گے واپس کھینچ لیں گے۔ ہو سکتا ہے ان لوگوں کو اس کھیل میں پکڑا آپ ہی کے لیے آپ جان گئے ہیں کہ یہ معاملہ خطرناک ہے۔ اختیار کرتا جا رہا ہے۔ ہم اگر عمل کریں گے تو ظاہر ہے آپ کے دامن تک بھی پہنچیں گے۔ یہ بات آپ کو خوفزدہ کر رہی ہے۔ اس لیے اب آپ فرار ہونا چاہ رہے ہیں۔" اکبر نے سلامت مرزا کو گھورتے ہوئے کہا۔

"ہم خود تم سے علیحدہ ہو جاتے ہیں مرزا۔" وقار نے ادب آداب ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس کے بعد تم بھی ہمارے راستے میں آئے تو میں تمہیں راستے سے ہٹانے میں ایک لمحے کو بھی نہیں ہچکچاؤں گا۔" وہ تینوں جانے کو اٹھ کھڑے ہوئے۔

"تم تینوں کہیں نہیں جاؤ گے۔" ماہم کی آواز کمرے میں گونجی۔ "انکل اگر آپ جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں۔ میں نے اتنا جو سہم اس لیے نہیں اٹھایا کہ میں اس شخص کو چھوڑ دوں جس نے میری زندگی اجیرن کر دی۔ مجھے تو کوئی مسئلہ بھی نہیں۔ ہمارے ہاں ان باتوں کی کوئی حیثیت نہیں۔ ڈیڈی کو معلوم ہے۔ ابرار جانتا ہے۔ آپ جانتے ہیں۔ باقی سب بھی جان لیں تو مجھے کیا فرق پڑے گا۔ لیکن اس کے باوجود میں جس ذہنی اذیت سے گزر رہی ہوں آپ اس کا تصور نہیں کر سکتے۔ ان لڑکیوں پر کیا گزر رہی ہوگی جو کسی کو بتا نہیں سکتیں۔ جن کے پاس دو راستے ہیں یا تو ان کے کہنے پر چلیں اور ایک اذیت ناک زندگی گزاریں یا خودکشی کر لیں۔ ہمیں اب پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے۔"

سلامت مرزا نے جس خطرے کو بھانپ لیا تھا وہ اسے الفاظ کی صورت پیش نہیں کر سکتا تھا۔ وہ دور اندیش تھا۔ جانتا تھا اس مافیا کے سامنے ان کی حقیقت پرکاہ کی بھی نہیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا وہ تاریک راہوں میں مارے جائیں مگر وہ انہیں سمجھا نہیں پا رہا تھا۔

اگلے دن وقار کو کسی اجنبی نمبر سے میسج موصول ہوا۔ وہ علینا تھی۔ اس نے نہ صرف اس لڑکی کا نام بلکہ پتا بھی بتا دیا تھا۔ اب آگے کیا کرنا؟ سب سر جوڑے سوچ رہے تھے۔ جب سلامت مرزا کی آواز گونجی۔ "دو دن اس کا تعاقب کرو۔ ایسی لڑکیاں دودھ کی دھلی تو ہوتی نہیں۔ کوئی ایسی بات سامنے

آجائے گی کہ اس کے بعد آگے کا لائحہ عمل ترتیب دینا آسان ہو جائے گا۔"

مشورہ صائب تھا مان لیا گیا۔

دو دن تو کوئی ایسی خاص بات نظر نہیں آئی۔ تیسرے دن انہوں نے انہیں انعام دیا کہ وہ لڑکی کے پیچھے گئی ہے۔ ابھی وہ ایک جانب جانے کے تعاقب میں ان کی گاڑی میں بیٹھ کر جا رہی ہے۔ ان سب کا دماغ گھوم گیا۔ اس کا تعاقب کرنا ہے۔

☆☆☆

اس دن سلامت مرزا بھی ان کے ساتھ تھے۔

"جانتے ہو اب سے تم لوگوں کو کیا کرنا ہے۔" انہیں پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم لوگوں کو عامر کے پاس جانے کا فیصلہ غلط تھا۔ اب تک وہ ہم سب کے بارے میں جان چکے ہوں گے۔ تم فوراً باسط کو وہاں سے نکلنے کو کہو۔" وہ بھرائی آواز میں بولے۔

مگر باسط فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ اکبر اور وقار نے بہت کوشش کی جب مزید دو منٹوں تک اس کا کوئی سراغ نہیں ملا تو دونوں کو دماغ ماؤف ہونے لگا۔

"اس جھونپڑی نما گھر والے لڑکے اور عامر کو آپس میں کوئی تعلق ہے۔ میرا دل کہتا ہے اور اگر وہ باسط ان کو نظر آیا تو ہم کسی صورت اس کو وہاں نہیں چھوڑ سکیں گے۔" وقار نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"پہلے ہمیں ان کا تعاقب کرنے والوں سے نمٹنا ہے۔" وقار نے کہا۔

وہ اب بنگلے کی جانب جا رہے تھے۔ وقار ایک موڑ پر رک گیا۔ گاڑی کو اکبر چلا رہا تھا۔ جیسے ہی تعاقب میں آنے والے موٹر سائیکل سوار قریب آئے اس نے اچھل کر پوری قوت سے ان کو لات دے ماری۔ موٹر سائیکل کا توازن بگڑا وہ گھسٹتا ہوا دور تک چلا گیا۔ پچھلا سوار اٹھ کر قریب ہی گرا تھا جو اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وقار نے اپنا پاؤں پوری قوت سے اس کے منہ پر جمایا۔ وہ ہاتھ لگا کر اور بے ہوش ہوا۔ وہ بھاگ کر دوسرے کے پاس پہنچا اس کا بھی یہی حال تھا۔ اس کے بعد اطمینان سے دونوں کی تلاشی لی۔ ان کی گن اور موبائل قبضے میں لیے اور دوڑتا ہوا گاڑی میں جا بیٹھا۔ اب اس نے عامر کو فون ملایا۔

تھوڑی دیر بعد وہ عامر کے گھر کے باہر کھڑے تھے۔ انہیں پتا چلا تھا کہ اس کی بیوی بچوں کو یرغمال بنا کر باسط کو رہا

آپ سب سے تو ڈیڑھ لاکھ کی ماں کو بتا دیا تھا۔ مگر آپ
سے اس نے ہمارا بیٹا مار دیا اب ہم کیا کریں

کروا جائے یہی ایک طریقہ انہیں سوجھا تھا۔ لیکن وہاں اس نے کمپیوٹر کا خاصہ خود اتار کر پی کر لیا تھا۔ اب وہ انہیں دور دراز کی مصیبت میں پھنس گئے تھے۔

اب ایک آخری حل رہ گیا تھا۔ وقار نے اپنے دوست کو فون کر کے بتا دیا۔

"حسن استاد کہاں گئے ہو؟" اس نے استفسار کیا۔

"حسن وقار صاحب کی گاڑی کہاں ہے؟" حسن نے جوش سے پوچھا۔

"کیا حسن استاد ایک اور کام کے سلسلے میں بیٹھے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ دکان پر پہنچے تھے۔"

"حسن استاد باسط تو جانتے ہو تم کہاں ہو؟ اس کو عیسیٰ ہے اور اس کے متعلق ملتی جلتی شہرت لے گئے ہیں۔ تم اس کا پتا کرو۔" وقار نے کہا۔

"وہ کوئی ماسٹر گریٹ۔ اس کا اصل نام حسن کا تعلق ہو تو ایسی حیثیت ان کی تعاقب حسن نے باسط کا حلیہ بیان کر کے تصدیق چاہی۔

"ہاں استاد وہی ہے۔ یہ پیسے رکھو اور جلد سے جلد معلوم کرو وہ کہاں ہے۔ یہ آدھی رقم ہے۔ دست اطلاع کے بعد باقی رقم بھی مل جائے گی۔"

ہزار ہزار کے دس نوٹ دیکھ کر اس کا منہ کھل گیا تھا۔
"تم فکر نہ کرو اپنے بہت یار دوست ہیں۔ اگر وہاں ہے تو

معلوم ہو جائے گا کہاں ہے۔ مگر اس کی کوئی ضرورت نہیں، رقم جیب میں ڈالتے ڈالتے اچانک اسے یاد آیا کہ مروت بھی کسی چڑیا کا نام ہے، یہ تم رکھو میں ویسے بھی معلوم کرلوں گا۔'' احسن نے کہا۔

''استاد یہ تمہارا حق ہے یہ کوئی معمولی کام نہیں۔ تم یہ کام کرو میں تمہیں خوش کردوں گا۔ بس یہ کام ہونا چاہیے۔''

''تم فکر ہی نہیں کرو وقار بھائی، تم بچپن کے یار ہو، تمہارے لیے جان بھی حاضر ہے۔ دو گھنٹے دو مجھے میں کوشش کروں گا چھڑا کے ہی لے آؤں۔'' روپے کا خمار اس کے سر کو چڑھ گیا تھا۔ ایسی صورت میں انسان بڑبولا ہو جاتا ہے۔ وہ یہاں ... وہاں رابطہ کرنے میں لگ گیا۔

دو گھنٹے بعد اس نے انہیں مردہ آواز میں بتایا کہ ''باسط، زاہد پاپی کے پاس ہے جو جنوبی شہر کے گینگسٹر مشین چڑیا کا چھوٹا بھائی ہے۔ اسے چھڑا کے لانا کارے دارد ہے اس طرف صرف فوج ہی جا سکتی ہے۔ باقی کسی ادارے کی ہمت نہیں اس طرف جائے۔''

''تم مجھے اس کا نمبر دو۔'' وقار بولا۔

''تم زاہد پاپی سے بات کرو گے۔ پاگل ہو گئے ہو۔ کیوں اپنی جان کے دشمن ہو رہے ہو۔ اس شہر میں ہر طرف ان کے بندے پھیلے ہوئے ہیں۔ باسط کو بھول جاؤ۔ مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہے۔ اس کی زندگی ہوئی تو وہ واپس آجائے گا۔ تم اس چکر میں نہیں پڑو۔ وقار بھائی آگ سے نہیں کھیلو۔'' احسن خوفزدہ آواز میں بولا۔

وقار نے اس کی طرف غصے سے دیکھا۔ ''احسن استاد یہ تمہارے باقی کے پیسے ہیں، مجھے اس کا نمبر دو مزید روپیہ چاہیے تو بولو۔''

احسن نے موبائل نکالا اسے ایک نمبر نوٹ کروایا۔ وقار اٹھ کر جانے لگا تو احسن بولا۔ ''تمہیں بابر چوہدری یاد ہے؟''

''کون بابر؟'' وقار حیرت سے بولا۔

''اے وہی بابر چوہدری جس کی ناک کی ہڈی تم نے توڑ دی تھی۔ بعد میں تو تم دونوں کا بڑا یارانہ ہو گیا تھا۔'' احسن نے یاد دلایا۔

''ببر کی بات کر رہے ہو تم۔ اچھا وہ تمہیں اس وقت کیوں یاد آگیا۔ وہ کہاں ہوتا ہے؟'' وقار نے حیرت سے پوچھا۔

''جنوبی شہر کا ایک بندہ ہے اسلم اڑیل، اس سے بابر کے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ اگر کوئی تمہاری مدد کر سکتا ہے تو وہ اسلم اڑیل ہی ہے۔ اس علاقے میں واحد شخص ہے جو زاہد پاپی سے نہیں ڈرتا۔ اس سے بات کر کے دیکھو لیکن یاد رکھنا بھولے سے بھی میرا ذکر نہیں آنا چاہیے۔''

بنگلا انہوں نے چھوڑ دیا تھا اور ایک فلیٹ میں منتقل ہو گئے تھے۔ واپس آکر اکبر نے زاہد کو کال ملائی۔ دوسری طرف سے ہیلو سن کر اس کے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔

یہ وہی لڑکا تھا جس سے ماہم نے بات کی تھی۔ جسے تلاش کرنے وہ جنوبی شہر گئے تھے۔

''زاہد، اکبر بات کر رہا ہوں۔ جس لڑکے کو تمہارے لوگ اٹھا کر لے گئے ہیں وہ میرا دوست ہے۔''

''کون اکبر؟ کون سا لڑکا؟'' زاہد نے نشے میں ڈوبی آواز میں پوچھا۔ اچانک اسے کچھ یاد آیا۔ ''اچھا وہ گھنگریالے بالوں والا لڑکا۔ کیا نام تھا اس کا......''

''باسط نام ہے۔ تم اسے ہمارے حوالے کرو اور بدلے میں جتنی رقم چاہیے لے لو۔'' اکبر نے مضطرب لہجے میں کہا۔

''کلیم! یہ میوزک بند کر کوئی پیسوں کی بات کر رہا ہے۔'' زاہد نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

''پہلے یہ بتاؤ کس ایجنسی کے لیے کام کرتے ہو۔'' زاہد نے نشے میں ڈوبی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''ہم کسی ایجنسی کے لیے کام نہیں کرتے۔'' اکبر نے نرم لہجے میں کہا۔

''تو سلامت مرزا کے ساتھ کیا کر رہے ہو۔ مجھے تم بیوقوف سمجھتے ہو۔ چند گھنٹوں میں تم نے یہ کیسے پتا چلا لیا کہ تمہارا دوست میرے پاس ہے۔'' وہ غرایا۔

''تم یہ بات تسلیم کرو یا نہیں مگر ہمارا کسی ایجنسی سے کوئی تعلق نہیں۔ سلامت مرزا میرے والد کے دوست ہیں۔ ان کی کسی جاننے والی کو کوئی بلیک میل کر رہا تھا تو انہوں نے ہم سے مدد مانگی۔ ہمیں اس بات کا علم نہیں تھا بات اتنی بڑھ جائے گی۔ تم مہربانی کرو اور باسط کو چھوڑ دو۔ ہم اس کھیل سے کنارہ کش ہو جائیں گے۔ باسط کے بدلے تم رقم لے لو اور ہمیں معاف کر دو۔'' اکبر نے بہت عاجزی سے کہا۔ باسط کے اغوا نے انہیں ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ ہر قیمت پر اسے واپس لانا چاہتے تھے۔

''اس کے بدلے کتنی رقم دے سکتے ہو۔'' زاہد کی آواز آئی۔

''تم کتنی چاہتے ہو؟'' اکبر نے پوچھا۔

''تیس لاکھ لے آؤ اور اپنا بندہ لے جاؤ۔ منظور ہے تو آگے بات ہوگی۔'' زاہد نے سرد لہجے میں کہا۔

''منظور ہے۔'' اکبر نے فوراً ہامی بھرلی۔

دوسری طرف کچھ دیر کے لیے سناٹا چھا گیا۔ ''ٹھیک ہے کل حاصل پور گلی کی طرف آجاؤ تمہارا بندہ تمہیں مل جائے گا۔ کوئی چالاکی کی تو اس سمیت تم کو بھی بھون ڈالوں گا۔''

اکبر نے ایک اطمینان بھرا سانس لیا۔ وقار مگر مطمئن نہیں تھا۔ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور تھی۔

حاصل پور گلی جانے کا مطلب موت تھا مگر اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

اچانک وقار کے دماغ میں ایک خیال آیا۔

''اکبر تم اس کو دوبارہ فون ملاؤ اور اسے کہو کہ باسط سے بات کروائے۔ کہہ دینا تم اپنا اطمینان کرنا چاہتے ہو۔''

یہ بات سن کر اکبر کو بھی اوہام نے گھیر لیا۔

اس نے دوبارہ کال ملائی۔ زاہد اس کی بات سن کر آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ عجیب و غریب قسم کے بہانے بنانے لگا۔ تب اکبر سے فون وقار نے چھین لیا۔

''زاہد پاپی اگر میرے دوست کو کچھ ہوا تو تم اپنے دن گن لو۔ تم کو تمہارے بل میں آکر ماروں گا۔'' وقار غصے سے چلایا۔

دوسری طرف زاہد پاپی کا قہقہہ سنائی دیا۔ ''بیٹا یہ شیر کی کچھار ہے۔ اس طرف آنے کا خیال تو وردی والوں کے بھی رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔ تم جیسوں کو تو ہمارے بچے ذبح کر دیتے ہیں۔ تمہارا دوست ٹھیک ہے اگر کل تک تم نے پیسے نہ دیے تو اس کے ٹکڑے کسی کچرے کے ڈھیر سے اکٹھے کر لینا۔''

وقار نے اسی وقت بابر کو کال ملائی۔ پہلے تو وہ پہچان نہیں پایا مگر جب جان گیا تو بہت گرم جوشی سے اس نے وقار سے بات کی۔ اس نے اپنی مدد کا پورا یقین دلایا۔

تھوڑی دیر بعد وہ بابر کے پاس بیٹھے تھے۔

بابر نے اسلم اڑیل کو کال ملائی۔

''اسلم بھائی میرے ایک دوست کو زاہد پاپی کے بندے اٹھا کر لے گئے ہیں۔ اس کے بارے میں معلوم کروانا ہے اور اسے واپس لانا ہے۔''

''بابر ہوش میں تو ہو۔ آج بہکی بہکی باتیں کیوں کر رہے ہو۔'' اسلم نے ڈپٹ کر کہا۔ ''اگر یہ کوئی مذاق نہیں ہے تو جان لو زاہد کا اچھا ٹائم چل رہا ہے۔ اس وقت اس کے خلاف کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ دوست کو بھول جاؤ۔ اس کی زندگی ہوئی تو... خود واپس آجائے گا۔ ورنہ لاش مل جائے گی۔''

''یہ تو تم معلوم کر سکتے ہو، وہ زندہ ہے یا اسے انہوں نے مار ڈالا ہے۔'' بابر نے وقار کے اشارہ کرنے پر کہا۔

''ہاں یہ میں تمہیں کچھ دیر تک معلوم کر کے بتا دوں گا۔'' اسلم نے جواب دیا۔

اس وقت وقار نے اس سے فون مانگا۔ ''اسلم بھائی یہ میرے ایک دوست سے بات کرو۔''

''اسلم بھائی ویسے کوئی زاہد کو اس وقت کتنے پیسوں میں قتل کرنے پر آمادہ ہو جائے گا؟'' یہ سوال کر کے اس نے بابر اور اکبر کو حیران کر دیا۔

''بتایا تو ہے یہ اُس کا وقت ہے۔ وہ بہت اونچا اُڑ رہا ہے۔ فی الحال کچھ نہیں ہو سکتا۔'' اسلم نے جھلاہٹ سے کہا۔

''اگر میں تیس لاکھ روپیہ اس کے سر کی قیمت رکھوں تو کیا خیال ہے وہاں کوئی ایسا نہیں جو یہ کام کر سکے۔'' وقار لہجے کو پُراسرار بنا کر بولا۔

اسلم نے ہنکارا بھرا۔ ''ہاں پھر سوچا جا سکتا ہے لیکن پندرہ لاکھ روپے ایڈوانس دینے ہوں گے۔''

''ابھی تو تم کہہ رہے تھے یہ کام ناممکن ہے۔'' وقار نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''کام میرے لیے ناممکن ہے۔ یہ کام میں نہیں کروں

خاموشی

پوری محفل بات چیت اور بحث و مباحثے کی رزم گاہ بنی ہوئی تھی لیکن ان میں چند ایسے بھی تھے جنہوں نے خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ بولنے والوں نے ان کا مذاق اڑایا۔ ''صاحبان اس محفل میں چند گونگے بھی آگئے ہیں، ان کی خاموشی نے اس باغ و بہار محفل میں قدرے بدمزگی اور بدہیئتی پیدا کر دی ہے۔''

ایک کم گو نے محفل میں پہلی بار زبان کھولی، بولا۔ ''حضرات! ان صاحب کا فرمانا بجا، جواب میں، میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ خاموشی سے خرابیاں کم ہی پیدا ہوتی ہیں اور اگر کبھی پیدا ہو بھی جائیں تو ان کا تدارک آسان ہوتا ہے مگر گفتگو اور زیادہ بولنے سے جو خرابی پیدا ہوتی ہے اس کا تدارک مشکل ہوتا ہے۔'' پھر حاضرین محفل سے سوال کیا۔ ''کیا آپ نے پانی سے بھری ہوئی مشک دیکھی ہے۔''

حاضرین میں سے چند آوازیں بلند ہوئیں۔ ''ہاں دیکھی ہے۔''

اس شخص نے کہا۔ ''تب پھر آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ مشک کا منہ باندھ کر ہی اس کا پانی روکا جاتا ہے۔''

روبینہ حمید...... راولپنڈی

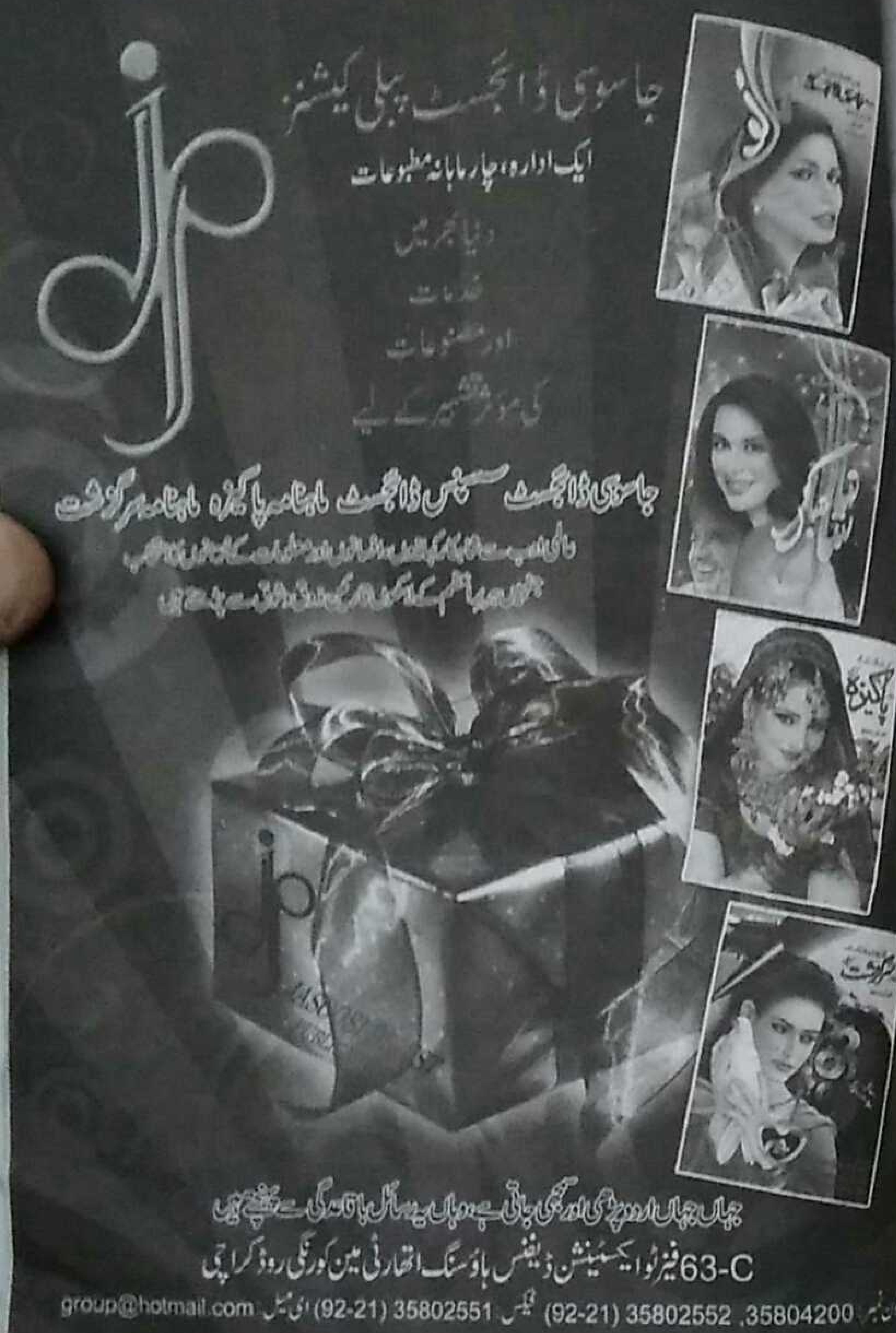

گا تمہارا پیسہ کرے گا۔ تم قیمت بڑھاؤ اس کا بھائی چڑیا ہی اسے مار ڈالے گا۔ پیسے میں بہت طاقت ہے دوست۔"

بابر گومگو کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ وہ اتنی بڑی رقم اسلم کو دینے کے حق میں نہیں تھا نہ ہی وہ ان کے حاصل چوری جانے کے حق میں تھا۔

شام کو بابر نے یہ روح فرسا خبر دی تھی کہ انہوں نے باسط کو قتل کر دیا تھا۔ وقار نے بہت تحمل سے یہ خبر سنی تھی۔

فون بند ہوتے ہی وقار پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ اکبر نے پہلے اسے تسلی دینے کی کوشش کی مگر پھر وہ ایک طرف بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی اتر آئی تھی۔ آنسو نہیں بہہ رہے تھے ورنہ وہ سچ مچ خون کے آنسو ہوتے۔ باسط چار بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ سینہ تان کر چلنے والا، وہ گورا چٹا جوان ایک ایسے راستے پر چلتا ہوا مارا گیا تھا جو اس نے صرف دوستی میں چنا تھا۔

دو دنوں بعد کچرے سے دو کٹی پھٹی لاشیں ملی تھیں۔ ایک اس لڑکی کی تھی جو اس دن عامر کے ساتھ گئی تھی اور جس کا تعاقب کرتے ہوئے باسط ان کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ وہ اس وقت کو پچھتا رہے تھے جب انہوں نے اس کام میں ہاتھ ڈالا تھا۔ باسط کی موت نے ان پر عجیب طرح سے اثر کیا۔ وہ دونوں ہی اس سارے سلسلے سے بیزار ہو گئے تھے۔ ان کی ہمت ٹوٹ گئی تھی۔ وہ ان سے نہیں لڑ سکتے تھے۔ اسلم نے کئی بار اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ اب مزید اس کھیل کو جاری نہیں رکھنا چاہتے تھے۔

لیکن جب ان کا مسلسل پیچھا کیا گیا تو مجبوراً ایک دن وہ بابر کو لے کر اسلم سے ملنے پہنچ گیا۔ تیس لاکھ میں معاملہ طے ہوا تھا۔ پندرہ ایڈوانس دے کر وہ لوٹ آیا۔

اس کے بعد ہر روز وہ اسلم کو فون کرتا اور اسلم اسے مسلسل تسلیاں دے کر خاموش کر دیتا۔

موبائل پر نامعلوم نمبر سے کال آرہی تھی۔ وقار نے فون اٹھایا تو دوسری جانب زاہد پاپی تھا۔

"بہت پر پرزے نکال لیے تو نے، مجھے مارنے کے پیسے دے گا۔ اسلم نے تو تجھے ٹھگ لیا۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ "اب یوں کر اگر اپنی اور دوست کی خیریت چاہتا ہے تو دو دنوں تک پچاس لاکھ کا انتظام کر۔ میں تم دنوں کو معاف کر دوں گا۔ دوسری صورت میں تم لوگوں کو ایک ہفتے کے اندر اندر قتل کروں گا۔"

وقار کا حلق خشک ہو گیا۔

وہ فوراً اکبر کے پاس پہنچا تھا۔ "تم، رمشہ کو لے کر اس ملک سے نکلو۔ امی کو ماموں کے ہاں منتقل کرو۔ اسے اسلم کو دیے گئے پیسوں کا علم ہو گیا ہے۔ وہ پاگل ہو رہا ہے۔ میں اس سے کچھ دنوں کی مہلت لے لوں گا۔"

"تمہارا کیا ہوگا؟" اکبر نے غصے سے کہا۔

"ہمارے محلے میں وہ داخل ہونے کا نہیں سوچ سکتا۔ میرا گھر محفوظ ہے۔ میں کچھ عرصے کے لیے روپوش ہو جاؤں گا۔ تم میری فکر نہیں کرو۔" وقار نے اسے تسلی دی۔

وقار نے منت سماجت کر کے زاہد سے پندرہ دنوں کا وقت لے لیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کم از کم اکبر وہاں سے نکل جائے، اس کے بعد وہ بھی غائب ہو جائے گا۔

ایک ہفتے بعد ٹیلی ویژن پر اس رات چند سیکنڈ کے لیے یہ خبر چلی تھی کہ ہنی مون کے لیے جاتے ہوئے نئے نویلے جوڑے کو دن دہاڑے قتل کر دیا گیا۔

وقار صدمے سے بے سدھ تھا۔ وہ نہ کچھ کھاتا تھا نہ پیتا تھا۔ وہ اس کے بچپن کے یار تھے۔ اٹھارہ سال میں ایسا کوئی دن نہیں تھا، وہ آپس میں ملے نہ ہوں۔ ان کا ایک دوسرے کے لیے ایثار مثالی تھا۔ محبت بے پایاں تھی۔ ہر اچھا برا کام ہو، مل کر کرتے تھے۔ دوستوں کی موت، اپنی بے مائیگی کے احساس نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ ہر وقت وہ عامر اور زاہد کو جہنم واصل کرنے کی پلاننگ کرتا مگر اس کا ہر پلان دیوانے کا خواب تھا۔

زندگی کے پاس بہر حال ایسا فسوں ہے کہ یہ انسان کو اپنی طرف گھسیٹ لاتی ہے۔

گھر والوں کی بہت منت سماجت کے بعد وہ سیکیورٹی فورس میں بھرتی ہو گیا۔ وہ زندگی اس کو راس آ گئی۔ سخت ٹریننگ نے اسے سب کچھ بھلا دیا۔ ہر کورس میں اس کی شمولیت لازم ٹھہری تھی۔ وہ سب .... کچھ بھلا بیٹھا تھا مگر اس دن عامر پر اس کی نظر پڑ گئی جب وہ سی ایم کے ساتھ ایک سیمینار میں گیا تھا۔ مصافحے کے لیے آگے بڑھتے عامر کو اس نے جان بوجھ کر دھکا دیا تھا۔ پہلی دفعہ اس نے کسی کے ساتھ بدتمیزی کی تھی۔ اس کے بعد ماہم چلی آئی۔ زاہد پاپی کو ہر روز ٹی وی پر دیکھنا پڑتا۔ سارے کردار کہانی میں واپس آ گئے تھے۔ اسے دوبارہ اس کھیل کو شروع کرنا پڑا۔ وقت نے اسے تمام ہتھیاروں سے لیس کر کے زاہد پاپی کے مقابلے میں لا کھڑا کیا تھا۔ ایک وقت تھا کہ مایوسی کی کہر نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ یہ دنیا زاہد پاپی جیسوں کے لیے ہے، کوئی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وہ اس سے بھاگتا پھرتا تھا اور اب وہ خود اس کے شکار کے لیے میدان میں تھا۔ مکمل امید اور یقین محکم کے ساتھ وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ زاہد کی

حیثیت اس کے سامنے ایک چوہے سے زیادہ نہیں تھی جسے اس نے بس اپنے بل سے نکالنا تھا۔ اسلم اڑیل جو ہاتھ کٹا کر بھائی اور بیٹا مروا کر ایک کھوکھا چلا رہا تھا، اس نے اسے بابر تک پہنچا دیا تھا۔ جو آج کل بہرا کوف تھا۔

وہ احسن سے ملنے جا رہا تھا جب ان تین دوستوں کو دیکھ کر رک گیا۔ اسے اپنا زمانہ یاد آ رہا تھا۔ بیک ویو مرر پر نظر پڑی تو اس کی آنکھیں نم تھیں۔ ایک مدت بعد اس پر یہ کیفیت طاری ہوئی تھی۔ وہ احسن کے پاس پہنچا جس نے کاروبار بہت بڑھالیا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ اچانک سر تک ہاتھ لے جا کر سلام کیا تو وقار مسکرا دیا۔ سخت ٹریننگ نے اس میں ایک عجیب سی کشش اور رعب بھر دیا تھا۔ احسن جیسا شخص بھی متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکا۔

”کیا احسن استاد اب دور سے سلام کرو گے۔“ آگے بڑھ کر گلے ملتے ہوئے وہ بولا۔

اس پیش قدمی سے وہ بہت خوش ہوا۔ ”وقار بھائی اب آپ بڑے آدمی بن گئے ہو۔“ اس نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔

”میں بڑا آدمی بن گیا ہوں اچھا!“ اس نے شوروم میں کھڑی گاڑیوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

احسن مسکرا دیا۔ ”بس اللہ کی دین ہے۔ وہ گاڑی یاد ہے۔ یہ اسی کی برکت ہے۔“ احسن نے کہا تو وقار بے اختیار ہنس پڑا۔

”احسن استاد میں تمہارے پاس ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔“ جلد ہی وہ مقصد پر آ گیا۔

احسن کائیاں انسان تھا۔ وہ پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔ وقار کی آمد یوں ہی نہیں ہو سکتی۔

”تم یہ بتاؤ کہ تمہارا بابر سے کوئی رابطہ ہے یا نہیں، یہ بات مجھ تک رہے گی۔“

”وقار بھائی اس کا نام بھی نہیں لیتا۔ آج کل ہر طرف ایجنسی کے لوگ موجود ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے وقار کو دیکھا اور کھسیانی ہنسی ہنس دیا۔

”وقار بھائی وہ اب بہرا کوف ہے۔ ڈیڑھ سو قتل کر رکھے ہیں۔ ماسٹر کے خوف سے کلاس میں موت دیتا تھا اب دیکھو مجھے اس کا نام سن کر پسینہ آ رہا ہے۔“ رومال نکال کر اس نے پیشانی سے پسینہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے اس سے رابطہ کرنا ہے، احسن استاد۔“

”کیوں مجھ کو مرواؤ گے وقار بھائی۔ تم فوجی آدمی ہو۔ اس کو معلوم ہو جائے گا میں نے تمہیں اس کا نمبر دیا ہے۔ کام دھندا ٹھپ ہو جائے گا اور ہو سکتا ہے وہ مجھے مار ڈالے۔“

یہ سن کر وقار چائے کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو احسن استاد۔ میں کہیں اور سے حاصل کر لوں گا۔ اس کام کے لیے تمہاری جان جوکھم میں نہیں ڈالوں گا۔“ چائے ختم کر کے اس نے اس پر نفسیاتی حملہ کیا۔

”وقار بھائی! وہ یاروں کا یار ہے۔ بس زاہد پاپی کے ساتھ رہ کر خراب ہو گیا ہے۔ مجھے کچھ نہیں کہے گا۔“ احسن نے خود کو تسلی دی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اسے ایک نمبر تھما دیا۔

”تم بھی یاروں کے یار ہو۔“ وقار نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔ ”جب بھی کام ہو مجھے بتانا۔ کیونکہ ہم بھی......“

”یاروں کے یار ہو۔“ احسن استاد نے قہقہہ لگا کر کہا۔

اب سب سے مشکل مرحلہ درپیش تھا۔ بابر سے بات کرنے سے پہلے اس نے خوب تیاری کی تھی۔ یہ اکبر کا طریقہ تھا۔ اسے وہ بے طرح یاد آیا۔

پہلی ہی کال پر فون اٹھالیا گیا۔

”بابر، وقار بات کر رہا ہوں۔“ اس نے بے تکلفی سے کہا۔

”کون وقار؟“ دوسری طرف سے اس کی کھردری آواز آئی۔

”جاؤ جا کر آئینے میں اپنی ٹیڑھی ناک دیکھو۔ یاد آ جائے گا کون وقار۔“ اس نے ہنس کر کہا۔

دوسری طرف کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔

دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز آئی۔ وہ شاید کہیں اٹھ کر گیا تھا۔

”تمہیں انٹیلیجنس والوں نے میرے پیچھے لگایا ہوگا۔“ بابر نے مشکوک انداز میں کہا۔

”مجھے کسی نے تمہارے پیچھے نہیں لگایا۔ تم میری دلچسپی کی وجہ جانتے ہو۔ زاہد پاپی کو میں جب تک چیر پھاڑ کر قبر میں نہیں پہنچاؤں گا چین سے نہیں بیٹھوں گا۔“

”مجھے یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے؟“ بابر طنزیہ انداز میں بولا۔

”تمہیں یہ بتانے کے لیے فون کیا کہ اس نے اپنے بھائی کو نہیں چھوڑا، تم کس کھیت کی مولی ہو۔ میں ابھی اسے کال کر کے کہوں تم میرے دوست ہو، اس کے سر کی قیمت لے کر تم میرے ساتھ اسلم اڑیل کی جانب گئے تھے۔ تو سوچو وہ تمہارا کیا حال کرے گا۔“

دوسری طرف کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔

”جلد یا بدیر اس کے خلاف ایک بڑا آپریشن لانچ کیا جائے گا۔ تم سمجھدار آدمی ہو جانتے ہو ریاست سے کوئی ٹکر نہیں لے سکتا۔“ وقار نے اسے ڈرانے کے لیے کہا۔

”مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“ بابر نے سرد آواز میں پوچھا۔

”غداری...... اپنے باس سے غداری کرو۔ مجھے اس تک پہنچنے کا راستہ بتاؤ۔“ وقار نے سرد لہجے میں کہا۔

دوسری طرف سے بابر نے قہقہہ لگایا۔ ”میں چاہ کر بھی ایسا نہیں کر سکتا۔ میرا اپنا مفاد اس سے جڑا ہے، وہ میری زندگی کی ضمانت ہے۔ آج پرانے تعلق کی وجہ سے بات کر لی دوبارہ فون کرو گے تو میں اپنے لوگوں کو تم تک پہنچنے کا راستہ بتا دوں گا۔“ یہ کہہ کر بابر نے کال کاٹ دی۔

اگلے دن اسے ایک نامعلوم نمبر سے ایک میسج ملا۔ ایک نام اور نمبر لکھا ہوا تھا۔

واصف چھالیا کے بارے میں اس نے تحقیق کروائی تو معلوم ہوا کہ وہ زاہد پاپی کا کزن ہے اور زاہد اسے پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہا ہے صرف اپنے قبیلے کی وجہ سے وہ بچا ہوا تھا۔

یہ جان کر اس کی آنکھوں میں ایک چمک لہرائی تھی۔ اس نے واصف سے رابطہ کیا تو جیسے بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا تھا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بھی بھلا لگتا ہے۔ وقار کی شکل میں واصف کو تو لائف جیکٹ ہاتھ آ گئی تھی۔

وقار نے اوپر والوں کو اس بات سے آگاہ کیا کہ وہ واصف کو زاہد کے مقابلے میں لانا چاہتا تھا۔ اس کی دلیل تھی کہ فصلوں میں سنڈیاں مارنے کے لیے کسان وہاں مکڑیاں چھوڑ دیتے ہیں۔ انہیں بھی ایسا کرنا چاہیے۔

اس گنجان آبادی میں جہاں سیکڑوں راستے موجود تھے۔ اسلحے کی ترسیل روکنا نہایت مشکل تھا۔ اکا دکا ٹرک ہر ایک دو ماہ میں پکڑے جاتے تھے۔ وقار کی مہربانی سے وہ واصف کو ملنے لگے۔ واصف زور پکڑنے لگا۔ کچھ عرصے میں واصف نے اچھے خاصے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ روز روز کی لڑائیوں نے زاہد پاپی کو کمزور کر دیا تھا۔ وقار نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ کہیں واصف اتنی طاقت نہ حاصل کر لے کہ ان کے قابو سے باہر ہو جائے۔ علاقہ مکین بھی ان روز روز کی لڑائیوں سے تنگ آ چکے تھے۔ ان دنوں زاہد کے لوگ پولیس اور رینجرز سے مقابلے کے لیے گلیوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ جب وہ اپنے ساتھیوں سمیت زاہد کی کمین گاہ کے قریب ایک بلڈنگ پر موجود تھا، اس کے پاس اس کے ہر گارڈ کی مکمل تفصیل موجود تھی۔ کچھ دیر بعد وہ بے آواز اسلحے کی مدد سے لائٹیں گراتے اور ان پر سے پھلانگتے زاہد کے کمرے کے سامنے موجود تھے۔

جب دروازہ توڑا گیا تو وہ ایک ہاتھ میں سگریٹ اور دوسرے میں وہسکی کا گلاس تھامے بت بنا بیٹھا تھا۔ وہ لاغر جان والا زاہد پاپی سامنے رکھا پستول اٹھانے کی جرأت بھی نہیں کر سکا تھا۔ وقار کا ارادہ تھا اس سے سوال جواب کرے گا۔ اسے یاد دلائے گا کہ اس نے کہا تھا کہ تمہیں تمہارے بل میں گھس کر ماروں گا مگر اسے اس سے اتنی کراہت محسوس ہوئی کہ وہ کچھ بول نہ پایا۔ وہ اسے اذیت ناک موت مارنا چاہتا تھا، وہ بھی نہ کر سکا بس دو گولیاں اس کے سینے میں اتار دیں۔

اس وقت وہ انکوائری بھگت رہا تھا۔ اس پر الزام تھا کہ اس نے زاہد پاپی کو مار ڈالا حالانکہ اسے زندہ پکڑا جا سکتا تھا۔ اس نے اعتراف کر لیا کہ پرانی دشمنی کی وجہ سے اس نے ایسا کیا۔ اس نے آپریشن میں حصہ لینے کی خواہش کا اظہار بھی اسی لیے کیا تھا۔

عامر نے دھکا کھانے کے بعد وقار کے بارے میں جب سن گن لی تو پہچان گیا وہ کون ہے۔ یہ جاننے کے بعد...... وہ خوفزدہ ہو گیا تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ وہ زاہد کے خلاف آپریشن میں حصہ لے رہا ہے تو اسے اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ وہ اپنا پورا سیٹ اپ سمیٹ کر بھاگنا چاہ رہا تھا مگر اس کے گمان سے پہلے وقار، زاہد تک پہنچ گیا۔ زاہد پاپی کے پاس سے کچھ ایسے ثبوت ملے تھے جو اس بات کو ظاہر کرتے تھے کہ ان دونوں کے آپس میں گہرے مراسم تھے۔ یہ دیکھ کر بڑوں کے کانوں پر جوں رینگی تھی۔ اس کے خلاف تفتیش کا آغاز ہو گیا تھا۔ اس کے خیر خواہوں نے اسے ملک سے بھاگنے کا مشورہ دیا تھا۔

رات کو ٹی وی پر ایک منٹ کی خبر چلی تھی جس میں ائرپورٹ جاتے ہوئے معروف صنعت کار اور مشہور زمانہ عامر ٹیک لمیٹڈ کے بانی کو قتل کر دیا گیا تھا۔

اس کام کے لیے وقار کو زیادہ تگ و دو نہیں کرنی پڑی تھی۔ اس نے واصف کو ایک فون کیا تھا جو ہمیشہ کہتا تھا کہ وہ اس کے احسانات کا بدلہ اتارنا چاہتا ہے۔

زاہد کی موت کے بعد کچھ عرصے تک اس علاقے کو توجہ ملی۔ کچھ سڑکیں پکی ہوئیں۔ اسکولوں میں رنگ روغن ہوا۔ کھیلوں کے ایک دو مقابلے ہوئے اور پھر انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔

اس وقت وہ ہاشم کے ساتھ ننگے پاؤں ساحل کی ریت پر چہل قدمی کر رہا تھا۔ قامت کا تفاوت انہیں لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا رہا تھا مگر وہ دونوں ایک دوسرے میں اتنے مگن تھے کہ بھرا پڑا ساحل انہیں خالی لگ رہا تھا۔ آج اس کی چھٹی کا آخری دن تھا۔ کل سے پھر سی ایم کا سایہ بننا تھا۔

آخری چال

اسما قادری

بعض اوقات اچھے جیون... اچھا وجود... پُرلطف موسم... اور اچھا ماحول اس قدر مغلوب کردیتا ہے کہ انسان اسے اپنی زندگی کے دائرے سے باہر نکلنے نہیں دیتا... ایک ایسی ہی لڑکی کی خوش قسمتی کہ اسے اچانک ہی اچھا گھر... اچھا شوہر مل گیا... مگر اچھا وقت جس کی ہر شخص کو زیادہ سے زیادہ چاہ ہوتی ہے... اس کے پُرسکون دنوں پر غالب نہ رہا... زندگی کی اونچی نیچی رہ گزر پرنت نئے موڑ سے نبردآزما کرداروں کی کمزوریاں... کج فہمیاں... اور دلوں میں جنم لینے والی کدورتیں... جو رفتہ رفتہ اس کی سانسوں کو قید کررہی تھیں... اسے کائنات کی خوب صورتی سے دور لے جانے کا بندوبست کررہی تھیں...

ان سازشوں کا سنسنی خیز احوال جو نقش برآب ثابت ہوئیں......

''تم مان کیوں نہیں لیتے سفیر؟ تمہیں میری بات ماننی پڑے گی کیونکہ میری بات مان لینے میں ہی تمام مسائل کا حل موجود ہے۔'' ناشتے کی میز پر آج بہت دنوں بعد فرحین سہیل یعنی اس کی والدہ موجود تھیں اور کیوں موجود تھیں، وہ ان کی گفتگو سے ہی ظاہر تھا۔

''میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ میں آپ کی تجویز پر غور کررہا ہوں۔ جب اچھی طرح غور کرلوں گا تو آپ کو بتا دوں گا۔'' فرحین کا لہجہ جتنا تند و تیز تھا، سفیر نے انہیں اتنی ہی نرمی سے جواب دیا تھا۔ یہ اس کی شخصیت کی بڑی خوبی تھی کہ وہ کبھی جلدی غصے میں نہیں آتا تھا اور سامنے والے کی گرمی کے باوجود اپنا دماغ ٹھنڈا رکھتا تھا۔

''غور...... غور...... غور...... میں تو یہ لفظ سن سن کر تھک گئی ہوں۔ حالات تیزی سے خراب ہورہے ہیں اور پچھلے دو مہینوں سے تم نے اسی ایک لفظ کی رٹ لگائی ہوئی ہے۔ آخر تم کب کوئی فیصلہ کرو گے؟'' اس کے جواب پر انہوں نے پہلے سے زیادہ غصے کا اظہار کیا۔

''یہ کوئی معمولی فیصلہ نہیں ہے ماما! میرے سامنے پوری زندگی کا سوال کھڑا ہے۔ میں کیسے اتنی آسانی سے کوئی فیصلہ کرسکتا ہوں۔'' اس نے انہیں رسان سے سمجھانے کی کوشش کی لیکن حقیقتاً وہ اندر سے بہت اُلجھ چکا تھا اس لیے اس کا ناشتا حرام ہوگیا اور اس نے اپنے سامنے رکھا آملیٹ ادھ کھایا ہی چھوڑ دیا اور ٹی پاٹ سے اپنے لیے چائے انڈیلنے لگا۔

اسکول یونیفارم میں ملبوس نویں جماعت میں زیر تعلیم اس کی بہن فریحہ نے یہ منظر دیکھا تو اسے افسوس ہوا لیکن وہ ماما سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ انہیں ان کے رویے پر ٹوکنے کا مطلب تھا، ان کے غصے کو مزید بڑھانا اور وہ اس کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ ویسے بھی وہ گھر میں سب سے چھوٹی تھی اور اسے ہمیشہ یہی سمجھایا گیا تھا کہ بچے بڑوں کے معاملات میں دخل نہیں دیتے۔ فریحہ کی ساتھ والی کرسی پر سفیر سے تین

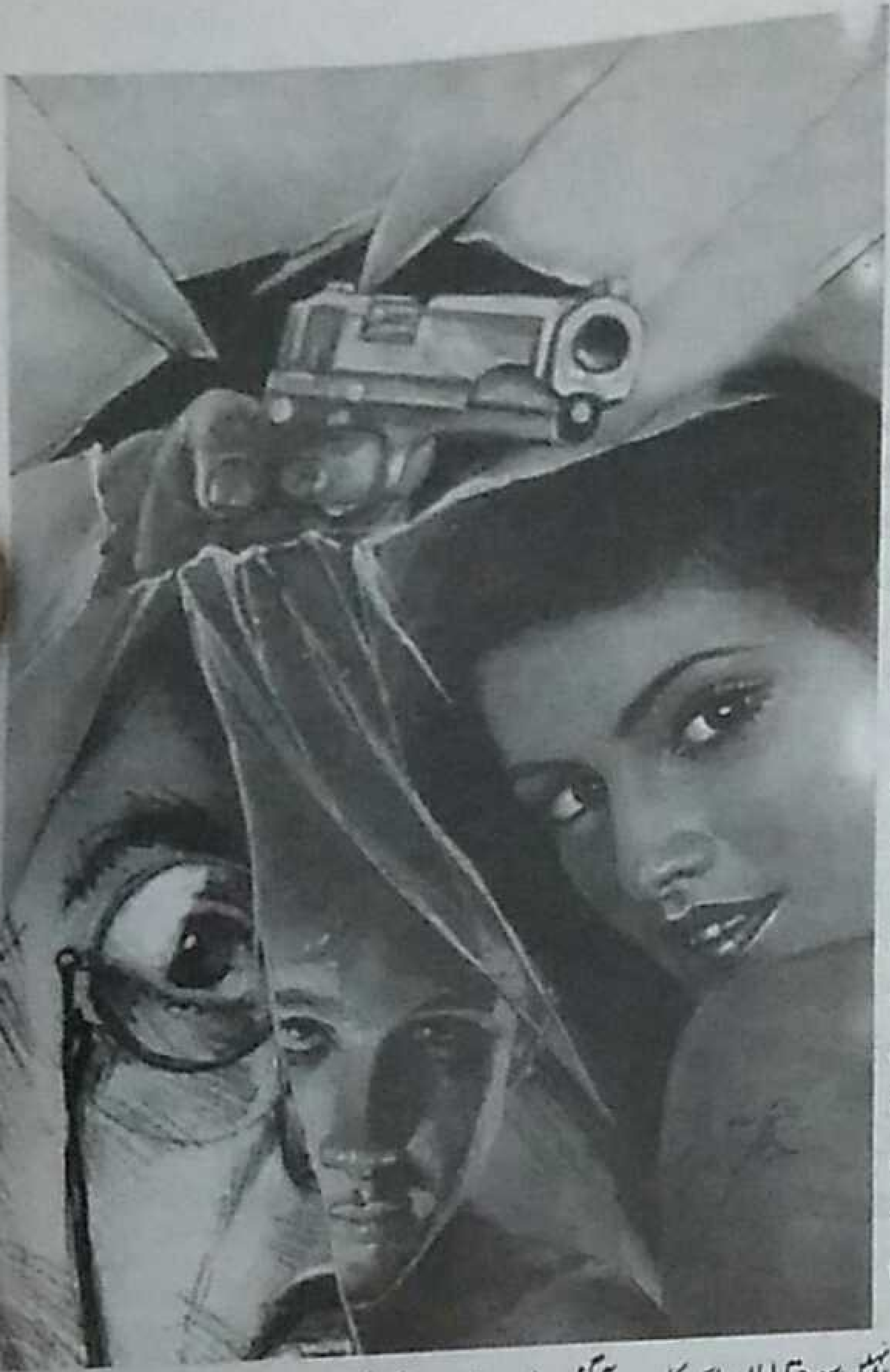

سال چھوٹا بصیر براجمان تھا لیکن کانوں میں اُڑسے ہینڈ فری اور نظر کے سامنے موجود اسمارٹ فون کی اسکرین نے اسے اس منظر میں موجود ہوتے ہوئے بھی منظر سے غائب کردیا تھا۔ وہ صرف اس حد تک وہاں موجود تھا کہ ناشتے کی میز پر موجود مختلف لوازمات وقفے وقفے سے اس کے معدے میں منتقل ہوتے جارہے تھے۔ ماں اور بھائی کے درمیان کیا بحث چھڑی ہے، اس سے اسے قطعی کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ ایسی ہی لاابالی طبیعت کا مالک تھا جسے اپنی تعلیم اور ذاتی سرگرمیوں کے علاوہ کسی چیز سے غرض نہیں تھی۔ شاید اسی وجہ سے وہ سفیر سے زیادہ بہتر طالب علم تھا اور ہمیشہ شاندار نتائج دیتا تھا۔

''تم صرف اپنی زندگی کے بارے میں کیوں سوچتے ہو، ہمارے بارے میں کیوں نہیں سوچتے۔ حالات اگر یونہی چلتے رہے تو مجھے ڈر ہے کہ ہم کسی دن سڑک پر نہ آجائیں۔'' فرحین نے گویا اسے جذباتی طور پر بلیک میل کرنے کی کوشش کی۔

''میں صرف اپنے بارے میں نہیں سوچتا ماما اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں نے اپنا ہائر اسٹڈیز کے لیے امریکا جانے کا پروگرام صرف اس لیے کینسل کردیا کہ مجھے لگا کہ میری یہاں زیادہ ضرورت ہے۔ رہی حالات کی بات تو وہ بھی اتنے خراب نہیں ہیں۔ آپ بتائیں کہ وہ کون سے اخراجات ہیں جو پورے نہیں ہورہے؟ سب کچھ ٹھیک ہی تو چل رہا ہے۔'' اسے ان کا الزام اچھا نہیں لگا تھا پھر بھی اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

''یہ صرف تمہارا خیال ہے کہ سب ٹھیک چل رہا ہے لیکن سب ٹھیک نہیں ہے۔ کل میں مسز اشفاق کے ساتھ جیولر کے پاس گئی تھی۔ وہاں مجھے ایک ڈائمنڈ رنگ پسند آگئی۔ میں نے اس رنگ کو خریدنے کے لیے جب اپنے ڈیبٹ کارڈ کے ذریعے ادائیگی کرنے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ میرے اکاؤنٹ میں اتنی رقم ہی نہیں ہے۔ تم اندازہ نہیں کرسکتے کہ مجھے مسز اشفاق کے سامنے کتنی بے عزتی محسوس ہوئی۔ ایک ڈائمنڈ رنگ...... صرف ایک معمولی سی ڈائمنڈ رنگ تھی جو میں نہیں خرید سکی۔'' یہ بتاتے ہوئے انہوں نے یوں مٹھیاں بھینچیں جیسے اب بھی اس بے عزتی کو محسوس کررہی ہوں۔

''آپ کے پاس پہلے ہی اتنی جیولری موجود ہے پھر آپ کو وہ رنگ خریدنے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی؟'' وہ حیران تھا کہ بیوگی کے صرف پانچ ماہ بعد جبکہ وہ جانتی تھیں کہ

کاروبار کی کیا حالت ہے، انہیں اس قسم کی فضول خریداری کا خیال بھی کیسے آیا تھا۔

''بات ضرورت نہیں، پسند کی تھی۔ مجھے وہ رِنگ پسند آئی تھی تو اسے میرے پاس ہونا چاہیے تھا لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ تم ماں کے فرائض کی طرف سے اتنی غفلت برت رہے ہو کہ تمہیں اس بات کا بھی خیال نہیں ہے کہ میرے اکاؤنٹ میں پابندی سے رقم ٹرانسفر کرواتے رہو۔'' اس بار انہوں نے اس کی نااہلی اور غیر ذمے داری کا احساس دلایا۔

''میں نے رقم ٹرانسفر کروائی تھی لیکن بہرحال وہ اتنی نہیں تھی کہ جتنی ڈیڈی آپ کو دیتے رہے ہیں۔ آپ جانتی ہیں کہ بزنس اس حالت میں نہیں ہے جس حالت میں ماضی میں کبھی ہوا کرتا تھا۔'' اس نے انہیں حالات کا احساس دلانے کی کوشش کی۔

''بزنس کو واپس اسی حالت میں لانے کے لیے ہی میں نے تمہیں ایک اچھا مشورہ دیا تھا لیکن تم میری بات پر کان ہی نہیں دھر رہے ہو۔'' انہوں نے اس کی بات تو کیا ہی سمجھنی تھی، الٹا دوبارہ اسی موضوع پر آگئیں جس سے اسے دلچسپی نہیں تھی۔

''اس پر ہم پھر کبھی بات کریں گے۔ فی الحال مجھے دیر ہو رہی ہے۔ اس لیے چلتا ہوں، اللہ حافظ۔'' باقی ناشتے کی طرح اس کی چائے بھی ادھوری ہی رہ گئی اور وہ ان سے مزید بحث میں اُلجھنے کے بجائے میز پر سے ہی اٹھ گیا۔ اس کے یوں اٹھ کر جانے پر پیچھے فرحین دھیمی آواز میں بڑبڑاتی رہ گئیں۔

☆☆☆

وہ گھر سے نکلا تو اس کا ذہن بُری طرح منتشر تھا۔ ماما کے روز روز کے مطالبے نے اسے اُلجھا کر رکھ دیا تھا۔ پہلے ہی وہ کم اُلجھنوں اور مسائل کا شکار نہیں تھا۔ ڈیڈی کے اچانک انتقال نے سب کچھ الٹ کر رکھ دیا تھا۔ وہ جو ایم بی اے کرنے کے بعد مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے ملک سے باہر جانے کا ارادہ رکھتا تھا...... بڑا بیٹا ہونے کی وجہ سے فیملی اور کاروبار کو سنبھالنے کی ذمے داری اٹھانے پر مجبور ہو گیا۔ ایک طرف اس کی ناتجربہ کاری تھی تو دوسری طرف بگڑتے ہوئے کاروباری حالات...... وہ تمام تر کوششوں اور ترکیبوں کے باوجود سب کچھ ٹھیک کرنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ ایک فیکٹری تقریباً بند ہو گئی تھی اور دوسری کے حالات بھی زیادہ اچھے نہیں تھے۔ ان خراب مالی حالات کا اثر لازماً اس شاہانہ گھریلو بجٹ پر پڑا تھا جس کی فرحین شوہر کی زندگی سے عادی رہی تھیں اس لیے صرف چند ماہ میں ہی وہ بُری طرح گھبرا گئیں اور اپنی شاہانہ زندگی دوبارہ حاصل کرنے کے لیے وہ اس پر زور دے رہی تھیں کہ وہ ان کی بہن کی بیٹی سویرا سے شادی کر لے۔

سویرا اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی ہونے کی وجہ سے ان کی جائداد کی تنہا وارث تھی۔ اس کی شادی سفیر سے ہوتی تو اس کی دولت بھی خود بخود اس کے پاس آجاتی لیکن سفیر دو وجوہ کی بنا پر ماما کا یہ مشورہ ماننے سے کترا رہا تھا۔ ایک تو یہ کہ سویرا صرف نام کی سویرا تھی ورنہ اس پر تو شبِ دیجور کی پھبتی ہی سوجھتی تھی۔ سفیر فطرتاً حسن پرست تھا اور خود اسے بھی اللہ نے بہترین شکل وصورت اور قد کاٹھ سے نوازا تھا۔ اس لیے وہ سویرا کو اپنی شریکِ حیات بنانے کے خیال سے ہی گھبرا جاتا تھا۔ اگر کسی طرح وہ یہ کڑوا گھونٹ پی بھی لیتا تو سویرا کی بدمزاجی کا کیا کرتا۔ اسے اپنی دولت پر غرور تھا اور اپنی کم روئی کے باوجود کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ سفیر کو اندازہ تھا کہ اس کی جس سے بھی شادی ہوئی، وہ اپنی دولت کے غرور میں اسے اپنا غلام بنا کے رکھنے کی کوشش کرے گی۔ وہ اتنی بُری زندگی کا تصور نہیں کر سکتا تھا اس لیے مسلسل ماں کو ٹال رہا تھا۔ وہ ان کی اس دلیل کو نہیں مان سکتا تھا کہ شادی کے بعد ہر عورت میں تبدیلی آجاتی ہے اور سویرا بھی بدل جائے گی، اگر وہ اسے پیار ومحبت سے ہینڈل کرے گا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ یہ نہیں کر سکتا۔ جس لڑکی کو دیکھ کر معمولی سی بھی خوشگواریت کا احساس نہیں ہوتا تھا اسے بھلا پیار ومحبت سے کیسے نوازا جا سکتا تھا۔ اسے سویرا اپنے مسائل کے آخری حل کی صورت میں بھی قبول نہیں تھی۔

''نو نیور...... میں ماما کی یہ بات کبھی نہیں مان سکتا۔''

اپنے پریشان خیالوں میں کھویا ہوا وہ زیرلب بڑبڑایا اور تیزی سے موڑ کاٹا۔ موڑ سے ذرا آگے ایک لڑکی سڑک پار کر رہی تھی۔ اس نے اسے دیکھ لیا اور تیزی سے بریک لگانے کی کوشش کی لیکن بریک لگاتے لگاتے بھی گاڑی اسے ہلکے سے چھو گئی اور وہ دھکا لگنے سے ذرا دور جا کر گری۔

''سوری، آئی ایم ویری سوری مس۔ آپ کو زیادہ چوٹ تو نہیں لگی؟'' وہ پھرتی سے گاڑی سے نکل کر سڑک پر گری دھان پان سی لڑکی کی طرف بھاگا اور اسے سہارا دے کر اٹھانے کی کوشش کی۔ وہ دوسرے رخ پر گری تھی اس لیے وہ ابھی تک اس کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا۔ اس کے

سہارے سے وہ اٹھ کر بیٹھی تو اس کا رخ روشن اس کے سامنے آگیا اور وہ بے خود سا اسے تکتا رہ گیا۔ اتنا سادہ اور معصوم حسن اس نے اس سے پہلے کب اتنے قریب سے دیکھا تھا۔ اب دیکھ لیا تھا تو ہر طرف سے بے خبر ہو کر اسے تکے جا رہا تھا۔

''آپ سڑک کو اپنی جاگیر سمجھ کر گاڑی چلا رہے تھے یا آپ کی آئی سائٹ کمزور ہے جو آپ کو میں نظر نہیں آئی اور اپنی گاڑی مجھ پر چڑھا دی۔'' لڑکی کو اس کے یوں تکنے پر طیش آیا اور غصے سے بولنے کے بعد کراہنے لگی۔ سفیر کو اس کے طیش سے زیادہ کراہ نے ہوش دلایا اور وہ ندامت سے بولا۔

''سوری مس! چلیں میں آپ کو کسی اسپتال لے چلتا ہوں۔''

''میرا دماغ خراب نہیں ہے جو میں آپ کے ساتھ کہیں جاؤں۔'' بظاہر وہ ترخ کر بولی لیکن سفیر نے اس کے لہجے کی گھبراہٹ محسوس کر لی۔ اپنے لباس اور انداز سے وہ کسی مڈل کلاس گھرانے کی لڑکی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ اس قسم کی لڑکیاں بڑی محتاط طبیعت کی مالک ہوتی ہیں۔ اس نے بھی سفیر کی اسپتال پہنچانے کی پیشکش کو اس لیے رد کر دیا تھا کہ کہیں وہ اس بہانے اسے کہیں اور نہ لے جائے۔

''ٹھیک ہے نہ چلیں اسپتال لیکن سامنے اس فیکٹری تک تو چل سکتی ہیں۔ میں اس فیکٹری کا مالک ہوں۔ میری فیکٹری میں ورکرز کی سہولت کے لیے ایک ڈاکٹر ہر وقت ڈیوٹی پر رہتا ہے۔ آپ اسے دکھا لیجیے گا۔ وہ آپ کے زخموں کی ڈریسنگ کر کے کوئی پین کلر وغیرہ دے دے گا۔'' اس نے لڑکی کی چھل جانے والی کہنی اور اس سے رستا خون دیکھ لیا تھا اس لیے اسے ایک دوسری پیشکش کی۔ اس پیشکش پر اس کے چہرے پر ذرا آمادگی کے تاثرات نظر آئے۔

''آپ جائیں، میں پیدل آجاؤں گی۔'' ذرا سے تذبذب کے بعد اس نے جواب دیا تو سفیر شانے اچکاتا ہوا اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ وہ بھی سڑک پر گری اپنی فائل اٹھا کر کھڑی ہو چکی تھی۔ یہ سارا فیکٹری ایریا تھا اس لیے سڑک پر بہت کم گاڑیاں نظر آتی تھیں۔ رش صرف شفٹ شروع ہونے اور ختم ہونے پر ہی ہوتا تھا۔ اتفاق سے اس کے لڑکی کو ٹکر مارنے اور اس سے گفتگو کرنے کے دوران میں ایک بھی گاڑی نہیں گزری تھی۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھنے سے قبل ایک بار پھر اشارے سے لڑکی کو اپنی فیکٹری دکھائی جس پر اس نے سر کو ہلکا سا خم کیا اور قدم آگے بڑھائے۔ سفیر کو یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ وہ ہلکا سا لنگڑا کر چل رہی ہے۔ گرنے سے یقیناً اس کی ٹانگ پر بھی چوٹ لگی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ دوبارہ اسے گاڑی میں بیٹھنے کی پیشکش کرے لیکن یقین تھا کہ وہ نہیں مانے گی اس لیے رک گیا۔ گیٹ پر موجود چوکیدار کو لڑکی کے بارے میں ہدایت دے کر وہ اپنے آفس میں آیا تب بھی اس کی حسین صورت نگاہوں میں تھی۔

''ربّا تیری قدرت کے رنگ انوکھے۔ کہاں سویرا جیسی چمارن لگنے والی کو تخت پر بٹھا رکھا ہے اور کہاں ایسی شہزادیوں جیسی صورت والی سڑکوں پر پیدل پھر رہی ہے۔'' دل ہی دل میں اللہ سے شکوے کے انداز میں کہتے ہوئے وہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ ابھی بیس پچیس منٹ ہی گزرے تھے کہ اس کی سیکریٹری نے اسے آگاہ کیا کہ مس علیزہ ڈریسنگ سے فارغ ہو گئی ہیں اور اس کی ہدایت کے مطابق انہیں اس سے ملاقات کے لیے یہاں بلوا لیا گیا ہے۔ اس وقت اسے...... پتا چلا کہ اس لڑکی کا نام علیزہ ہے۔ اس نے سیکریٹری کو اسے اندر بھیجنے کی اجازت دیتے ہوئے اچھی سی چائے بھجوانے کی ہدایت بھی کر دی۔ وہ دستک دے کر اس کے آفس میں داخل ہوئی اور جھجکتی ہوئی اس کے اشارے پر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی فائل اب بھی اس کے سینے سے لگی ہوئی تھی۔ سفیر دھیرے سے مسکرایا اور اپنے مخصوص نرم لہجے میں اس سے گفتگو کا آغاز کیا۔ ذرا دیر میں وہ اس کی تعلیم، رہائش اور فیملی ممبرز کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کرنے کے علاوہ یہ بھی جان چکا تھا کہ وہ ملازمت کی تلاش میں تھی اور کسی جاننے والے کے توسط سے ایک قریبی فیکٹری میں انٹرویو دینے آئی تھی۔

''آپ ملازمت مجبوراً کرنا چاہتی ہیں یا شوقیہ؟'' سفیر نے یونہی اس سے پوچھ ڈالا۔

''نہ مجبوراً کرنا چاہتی ہوں اور نہ شوقیہ۔ ہاں ضرورتاً کہہ سکتے ہیں۔'' اس نے اعتماد سے اس کے سوال کا جواب دیا۔

''مطلب......؟'' وہ اس جواب پر اُلجھا۔

''مطلب صاف ہے کہ مجھے جاب کرنے کا کوئی بہت زیادہ شوق نہیں ہے اور نہ ہی میرے گھر میں فاقے آرہے ہیں کہ میں لازماً کہیں جاب کروں لیکن ہم جیسے گھرانوں میں

یہ ہوتا ہے کہ جب لڑکیاں اپنی تعلیم سے فارغ ہو کر کسی اچھے رشتے کے انتظار میں بیٹھی ہوتی ہیں تو سوچتی ہیں وقت ضائع کرنے کے بجائے چار پیسے ہی کمالیں۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اپنی چند چھوٹی موٹی خواہشیں پوری کرنے کا موقع مل جاتا ہے اور جہیز کے آئٹم میں بھی دو چار اچھی چیزوں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ مجھے اسکول کی جاب پسند نہیں ہے اس لیے کسی فیکٹری میں جاب کے لیے ٹرائی کرنے نکلی تھی۔'' اس نے نہایت صاف گوئی سے اپنی بات کی وضاحت کی تو سفیر ہنس دیا اور پھر اس کی فائل لے کر اس کی سی وی دیکھنے لگا۔ اس نے گریجویشن کیا ہوا تھا اور کمپیوٹر اور ٹائپنگ وغیرہ کے چند شارٹ کورسز بھی کر رکھے تھے۔

''میری سیکریٹری کی اگلے ماہ شادی ہو رہی ہے اور وہ دو ہفتوں بعد یہ جاب چھوڑ کر جانے والی ہے۔ اگر تم چاہو تو اس کی جگہ لے سکتی ہو۔'' سفیر نے اسے پیشکش کی۔

''سیکریٹری کی جاب...... نہیں، یہ مجھے سوٹ نہیں کرے گی۔ مجھے اپنے گھر سے جاب کی جگہ کے علاوہ کہیں جانے کی اجازت نہیں مل سکتی اور سنا ہے سیکریٹری کو باس کے ساتھ ہر جگہ جانا پڑتا ہے۔'' اس نے فوراً انکار کر دیا تو سفیر ہنس پڑا اور بولا۔

''تمہارے ذہن میں شاید ڈراموں، فلموں اور ناولوں میں بیان کردہ سیکریٹری کا تصور ہے جسے باس اپنے کاروباری فائدے کے لیے بھی استعمال کرتا ہے اور خود بھی اس سے فلرٹ کرتا رہتا ہے لیکن یہاں ایسا کوئی چکر نہیں ہے۔ میں اپنی سیکریٹری سے صرف آفس ورک لیتا ہوں اور اسے میرا زیادہ سے زیادہ اتنا خیال رکھنا ہوتا ہے کہ مجھے میرے روزانہ کے شیڈول سے آگاہ رکھے۔ تم چاہو تو میری موجودہ سیکریٹری مس سائرہ سے اس بارے میں تصدیق کر سکتی ہو۔ وہ تمہیں صحیح سے گائڈ کر دیں گی پھر تم فیصلہ کر لینا کہ تمہارے لیے یہ جاب ٹھیک رہے گی یا نہیں۔'' اس نے کھلے دل سے علیزہ کو پیشکش کی تو وہ نیم آمادہ نظر آنے لگی۔ پون گھنٹے بعد جب وہ فیکٹری سے رخصت ہو رہی تھی تو مکمل طور پر آمادہ تھی اور اگلے دن سے ہی جوائن کرنے والی تھی تاکہ مس سائرہ کی پندرہ دن کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر کام کو اچھی طرح سمجھ لے۔

☆☆☆

علیزہ کو سفیر کی فیکٹری میں ملازمت کرتے ہوئے دس دن ہو گئے تھے۔ ان دس دنوں میں وہ ماحول سے مطمئن ہو گئی تھی اور سائرہ کے تعاون سے تیزی سے کام سیکھ رہی تھی۔ سفیر سے بھی روزانہ مختصر سی ملاقات ہو جاتی تھی جس میں سلام دعا اور کام سے متعلق ایک دو جملوں کے سوا کوئی ایسی بات نہیں ہوتی تھی جو وہ سفیر کے کردار پر شک کر سکے۔ مس سائرہ نے بھی اسے اس سلسلے میں تسلی دی تھی اور یقین دلایا تھا کہ باس شریف اور اپنے کام سے کام رکھنے والا شخص ہے۔ یوں وہ اس ماحول میں اچھی خاصی ایڈجسٹ ہو گئی تھی۔ آفس میں اس کا گیارھواں دن بھی خوش گوار انداز میں شروع ہوا تھا کہ اچانک ہی وہ واقعہ پیش آ گیا۔ وہ تقریباً پینتیس سالہ دبلا پتلا اور گہری سانولی رنگت کا شخص تھا جس نے گول شیشوں کی عینک لگا رکھی تھی۔ وہ چوکیدار کے روکتے روکتے بھی کمرے میں گھس آیا۔ چوکیدار نے اس کا گریبان پکڑ کر اسے باہر گھسیٹنے کی کوشش کی تو وہ زور زور سے چیخنے کے ساتھ ساتھ سائرہ کو پکار کر دہائیاں دینے لگا۔

''اسے چھوڑ دو افضل اور تم باہر جاؤ۔ میں اس سے بات کرتی ہوں۔'' اس شخص کی دہائیوں پر سائرہ کا دل پسیج گیا اور اس نے افضل کو حکم دیا۔ علیزہ کو یہ سارا معاملہ سرے سے سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا اس لیے وہ پریشانی سے سب دیکھتی رہی۔

''کیا بات ہے رشید، تم کیوں یہاں آئے ہو؟ تمہیں باس نے منع کیا تھا ناکہ آئندہ یہاں قدم نہیں رکھنا۔'' چوکیدار چلا گیا تو سائرہ قدرے سخت لہجے میں اس شخص سے مخاطب ہوئی۔

''آپ میری تین مہینے کی تنخواہ دلوا دو، میں وعدہ کرتا ہوں کہ کبھی یہاں آ کر تھوکوں گا بھی نہیں۔'' رشید نے کڑوے لہجے میں جواب دیا۔

''تم جانتے ہو کہ تمہیں کوئی تنخواہ نہیں ملے گی پھر بھی ہر دوسرے دن آ جاتے ہو۔ بھول جاؤ ان پیسوں کو اور کہیں اور نوکری ڈھونڈنے کی کوشش کرو۔'' سائرہ نے لہجے کو قدرے نرم کر کے اسے جواب دیا۔

''کیسے بھول جاؤں اپنے خون پسینے کی کمائی کو۔ مجھے پیسوں کی ضرورت ہے۔ تمہیں ہر حال میں سیٹھ سے مجھے رقم دلوانی ہو گی۔'' اس کا لہجہ بگڑ گیا۔

''میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتی۔ اگر تمہیں بہت ضرورت ہے تو لو یہ کچھ رقم رکھ لو۔'' سائرہ نے اپنے پرس سے چند سرخ نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔

''مجھے بھیک نہیں، اپنی محنت کے پیسے چاہئیں۔'' وہ

حلق کے بل دہاڑا تو سائرہ کو بھی غصہ آ گیا اور تیز لہجے میں بولی۔

''تم ہمدردی کے لائق ہی نہیں ہو، میں ابھی چوکیدار کو بلا کر تمہیں یہاں سے نکلواتی ہوں۔''

''خبردار جو ایسی کوئی حرکت کی۔ میں تمہیں گولی مار دوں گا۔'' وہ وحشت زدہ لہجے میں بولا اور پھرتی سے اپنے نیفے میں اڑسا پستول باہر نکال لیا۔ پستول کو دیکھ کر دونوں لڑکیوں کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ ان کی چیخوں کو سن کر باہر موجود چوکیدار نے جلدی سے اندر جھانکا لیکن اس دوران رشید، سائرہ کے سر پر پہنچ چکا تھا اور اس کی کنپٹی سے پستول کی نال لگا دی تھی۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ اگر ایک قدم بھی اندر رکھا تو اسے گولی مار دوں گا۔'' اس کی دھمکی ایسی تھی کہ چوکیدار کو فوراً پیچھے ہٹنے پڑا۔

''یہ تم ٹھیک نہیں کر رہے ہو رشید۔ یہ سب کر کے تمہیں کچھ حاصل نہیں ہو گا۔''

سائرہ نے لرزتی ہوئی آواز میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ علیزہ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ویسے ہی لرز رہی تھی۔ وہ ایک عام سی ڈرپوک لڑکی تھی جو چھپکلی دیکھ کر بھی چیخیں مارنے لگتی تھی اور یہاں تو ایک شخص پستول بدست اُن کے سروں پر کھڑا تھا۔ اس کے عزائم بھی خاصے جارحانہ تھے۔

''مجھے کچھ حاصل نہیں ہوا تو میں بہت تباہی مچاؤں گا۔ تم سیٹھ کو فون کرو اور اسے بتاؤ کہ میں نے تمہیں یرغمال بنا رکھا ہے۔ اب میں صرف اپنی تین ماہ کی تنخواہ ہی نہیں ہرجانے کے طور پر دو لاکھ روپے مزید لوں گا۔'' اس نے سائرہ کے سمجھانے کا کوئی اثر نہیں لیا اور اسے حکم دینے لگا۔ سائرہ نے پہلے تو مزید کچھ کہنے کے لیے لب کھولے پھر اپنا ارادہ ملتوی کر کے میز پر پڑے موبائل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اسی پل موبائل بجنے لگا۔

''باس کی کال آ رہی ہے۔'' سائرہ نے آہستہ سے آگاہ کیا۔

''اسے اس کے چمچوں نے اطلاع دے دی ہو گی۔ تم فون کا اسپیکر کھول کر کال ریسیو کر لو۔'' رشید استہزائیہ انداز میں ہنسا اور اسے حکم دیا۔ سائرہ نے اس کے حکم پر عمل کیا۔

''ہیلو سائرہ! تم لوگ ٹھیک تو ہو۔ وہاں کیا ہو رہا ہے؟'' اسپیکر سے سفیر کی پریشان کن آواز ابھری۔

''ہم اب تک ٹھیک ہیں سر لیکن رشید کے تیور دیکھتے ہوئے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کب تک ٹھیک رہیں گے۔'' سائرہ نے اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔

''کیا چاہتا ہے وہ؟'' سفیر نے دریافت کیا۔

''اپنی تین ماہ کی تنخواہ کے علاوہ مزید دو لاکھ روپے۔''

''اسے بتاؤ کہ اسے اپنی اس حرکت کے خطرناک نتائج بھگتنا پڑیں گے۔'' سفیر کی غراہٹ اسپیکر سے ابھری۔

''مجھے کچھ بھی بتانے سے بہتر ہے کہ تم میرے مطالبات مان لو... مجھ پر اس وقت خون سوار ہے اور میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔'' رشید درمیان میں بول پڑا اور سفیر سے بھی زیادہ سنگین لہجے میں اسے دھمکی دی۔

''ان لڑکیوں کو ذرہ بھر بھی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے رشید ورنہ تم تو کیا تمہاری نسلیں بھی اس کا نتیجہ بھگتیں گی۔'' سفیر نے اسے دھمکایا۔

''میری بات مان لو۔ کچھ نہیں ہو گا ان لڑکیوں کو۔'' بغیر کمانی والی موٹے موٹے گول شیشوں والی عینک سے جھانکتی اصل سے بڑی دکھائی دینے والی اس کی آنکھوں میں وحشت سی تھی۔

''میں دیکھتا ہوں کہ کیا ہو سکتا ہے۔ مجھے تھوڑا سا وقت دو۔'' آخرکار سفیر کے لہجے میں وہی نرمی لوٹ آئی جو اس کی شخصیت کا خاصہ تھی۔

''میں تمہیں اپنے خلاف چالیں چلنے کے لیے زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔'' وہ بگڑا۔

''میں بہت زیادہ وقت نہیں مانگ رہا ہوں۔ بس تھوڑا سا وقت چاہیے مجھے۔ میں فیکٹری سے بہت دور ہوں۔ مجھے اتنی مہلت دو کہ میں وہاں پہنچ سکوں۔'' سفیر اب اس کے ساتھ مکمل تعاون کے موڈ میں نظر آ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے ایک گھنٹا ہے تمہارے پاس۔ ایک گھنٹے بعد میں بغیر کوئی وارننگ دیے ان میں سے ایک لڑکی کو گولی مار دوں گا۔'' اس نے سفیر کو دھمکی دی تو جہاں سائرہ کے چہرے کا رنگ بدلا وہیں علیزہ بھی خوف سے زرد پڑ گئی۔

''ایسی کوئی حماقت نہیں کرنا رشید۔ تم نے قتل و غارت کی تو خود بھی پھانسی کے پھندے پر لٹکنا پڑے گا۔'' سفیر نے اسے سمجھایا۔

''مجھے نصیحتیں کرنا چھوڑو سیٹھ اور خود ان کی زندگیاں بچانے کی فکر کرو۔'' اس نے جیسے سفیر کی بے بسی سے لطف اٹھایا۔

''میں بس ابھی آرہا ہوں۔'' سفیر نے اسے جواب دے کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ اب وہاں پستول تانے رشید کھڑا تھا اور دونوں سہمی ہوئی لڑکیاں جن کے چہروں سے ہی ان کی حالت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ علیزہ کی حالت خاص طور پر زیادہ خراب محسوس ہو رہی تھی اور وہ یوں رک رک کر سانس لے رہی تھی جیسے اسے سانس لینے میں دشواری پیش آرہی ہو۔ دروازے کے اس پار اب چوکیدار کے علاوہ بھی کئی لوگوں کی موجودگی محسوس ہو رہی تھی۔ یقیناً فیکٹری کے دیگر ملازمین کو بھی صورتِ حال کی خبر ہو گئی تھی اور وہ تجسس کے تحت وہاں جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ان کے آپس میں باتیں کرنے کی دھیمی دھیمی آوازیں یہاں تک آرہی تھیں۔

تناؤ زدہ اس کیفیت میں تقریباً پچیس منٹ مزید گزر گئے تو ایک بار پھر سائرہ کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ حسبِ توقع اسکرین پر سفیر کا نام آرہا تھا۔ سائرہ نے رشید کے اشارے پر کال ریسیو کر کے اسپیکر کھول دیا۔

''ہیلو رشید! دونوں لڑکیوں کو چھوڑ دو۔ میں تمہاری تنخواہ کے علاوہ مزید دو لاکھ روپے کا چیک بھی تیار کر رہا ہوں۔ تم مجھ سے چیک لو اور فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔'' سفیر کو معلوم تھا کہ رشید اس کی آواز سن رہا ہوگا اس لیے براہِ راست اسے مخاطب کر کے بولا۔ اس کی بات سن کر رشید نے قہقہہ لگایا اور طنزیہ لہجے میں بولا۔

''تم مجھے جتنا بے وقوف سمجھ رہے ہو، میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں سیٹھ! مجھے چیک نہیں کیش چاہیے اور وہ بھی پانچ منٹ کے اندر۔ مجھ سے کیش نہ ہونے کا رونا بھی نہیں رونا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اتنی سی رقم تمہارے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے جیسا تم چاہو۔'' سفیر نے اس سے کوئی بحث نہیں کی اور فوراً ہی اس کا مطالبہ مان کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ ٹھیک پانچ منٹ بعد دروازے پر دستک دے کر اسے اطلاع دی گئی کہ رقم کا پیکٹ تیار ہے، وہ وصول کر لے۔

''پیکٹ کو دروازے کے سامنے رکھ کر سب لوگ ہٹ جاؤ۔ مجھے یہاں سے باہر مین گیٹ تک کے راستے پر ایک شخص بھی نہیں نظر آنا چاہیے۔'' اس نے سخت لہجے میں ہدایات دیں۔

''ٹھیک ہے، ہم جا رہے ہیں۔ دو منٹ بعد تم کسی کو بھی نہیں دیکھو گے۔'' باہر سے اسے یقین دہانی کروائی گئی پھر قدموں اور انسانی سرگوشیوں کی آوازیں تیزی سے معدوم ہونے لگیں۔ دو منٹ کے اندر اندر باہر سناٹا محسوس ہونے لگا۔

''تم دونوں اپنی جگہ سے کھڑی ہو جاؤ اور دروازے کی طرف بڑھو۔'' رشید نے پستول لہراتے ہوئے ان دونوں کو حکم دیا تو چار و ناچار انہیں اس کی ہدایت پر عمل کرنا پڑا۔

''تم دروازہ کھول کر پیکٹ میرے حوالے کرو مس سائرہ پھر ہم آگے چلیں گے۔'' اس نے سائرہ کو حکم دیا جس پر اس نے خاموشی سے عمل کیا۔ رشید نے اس سے پیکٹ وصول کر کے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔

''اب تو تمہیں رقم مل گئی ہے پھر ہمیں کیوں نہیں بخش رہے۔ ہمیں یہیں رہنے دو اور تم یہاں سے بھاگ جاؤ۔'' سائرہ، علیزہ کے مقابلے میں اپنے حواس کو قابو میں رکھے ہوئے تھی اس لیے رشید سے اتنی بات کر گئی۔

''تمہیں چھوڑ کر باہر نکلوں گا تو یہ لوگ مجھے راستے میں ہی چھاپ لیں گے۔ یہاں سے صحیح سلامت نکلنے کے لیے مجھے تم لوگوں کی ڈھال چاہیے۔'' رشید نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا تو سائرہ مزید اصرار نہیں کر سکی اور علیزہ کا۔۔۔سرد ہو جانے والا ہاتھ تھام کر باہر کی طرف بڑھی۔ علیزہ کی ابتر ہوتی حالت اس سے پوشیدہ نہیں تھی اس لیے اس نے اسے سہارا دینے کی کوشش کی تھی۔ علیزہ کپکپاتی ٹانگوں سے سائرہ کے ساتھ آگے بڑھتی رہی۔ برآمدے میں حسبِ ہدایت کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ باہر کھلے حصے میں پہنچنے پر بھی ان کا کسی سے سامنا نہیں ہوا۔ صرف گیٹ پر موجود چوکیدار وہ واحد انسان تھا جو اس وقت انہیں نظر آرہا تھا۔ وہ لوگ آہستہ آہستہ گیٹ کی طرف بڑھنے لگے۔ اچھے خاصے وسیع کھلے حصے میں صرف چند گاڑیاں ہی کھڑی ہوئی تھیں اور زیادہ تر حصے میں کیاریاں اور آرائشی گملے موجود تھے۔ سفیر، منیجر اور ایڈمن کے چند خاص افراد کے علاوہ فیکٹری کے دیگر ملازمین کو اپنی سواریاں جن میں اکثریت موٹر سائیکل سواروں کی تھی، اندر لانے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ اپنی سواریاں اپنی ذمے داری پر فیکٹری کے احاطے کے ساتھ خالی قطعہ پر کھڑی کرتے تھے۔

ہتھیار بردار چوکیدار کی موجودگی کے باعث رشید گیٹ کے قریب پہنچتے پہنچتے مزید چوکنا ہو گیا تھا لیکن چوکیدار نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا اور ان تینوں کو خاموشی سے باہر جانے دیا۔ باہر نکل کر رشید ان دونوں کو اپنے پستول کی زد میں لیے لیے تیزی سے ایک موٹر سائیکل

کی طرف بڑھا اور جیب سے چابی نکال کر اس کے اگنیشن میں لگاتے ہوئے اس پر سوار ہوا اس وقت بھی اس کا پستول اس کے ہاتھ میں ہی تھا لیکن اب وہ اسے دونوں لڑکیوں کے اوپر تانے رکھنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اسے نوٹوں کے پیکٹ کو سنبھالنے کے علاوہ موٹر سائیکل کے ہینڈل کو بھی سنبھالنا تھا اور یہی وہ موقع تھا جس کی ایک سائڈ پر کھڑی سیاہ شیشوں والی گاڑی کے اندر موجود افراد کو تلاش تھی۔ کھڑکی کا شیشہ تھوڑا سا نیچے ہوا اور اس میں سے ایک ہاتھ نے باہر نکل کر رشید کی طرف فائر کیا۔ گولی اس کے بازو میں لگی اور وہ بھیانک چیخ مارتا ہوا موٹر سائیکل سمیت زمین پر آرہا۔ گرنے سے اس کی عینک آنکھوں سے ہٹ گئی تھی لیکن عینک کے ساتھ منسلک زنجیر نے اسے رشید کی گردن سے لٹکا رکھا تھا۔ فوراً ہی فضا میں پولیس کی گاڑی کا سائرن گونجا اور دیکھتے ہی دیکھتے وردی والوں نے زمین پر تڑپتے رشید کو چھاپ لیا۔ دوسری طرف سائرہ، علیزہ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی جو رشید کے بازو سے خون نکلتے دیکھ کر ہی گھٹنوں کے بل زمین پر گر گئی تھی اور اپنا گلا پکڑے یوں منہ کھولے ہوئے تھی جیسے اسے سانس نہ آرہی ہو۔ سیاہ شیشوں والی گاڑی سے برآمد ہونے والے سفیر نے یہ منظر دیکھا تو فوراً چلا کر ایمبولینس کو پکارا۔ چند لمحوں میں ہی علیزہ کو ایک ایمبولینس میں منتقل کیا جا چکا تھا اور منہ پر آکسیجن ماسک لگا کر تیزی سے اسپتال روانہ کر دیا گیا تھا۔

☆☆☆

اس حادثے کے پانچویں دن علیزہ ایک بار پھر اپنی ملازمت پر موجود تھی۔ اس کے گھر والوں نے سفیر کی بہت سی یقین دہانیوں کے بعد اسے ملازمت پر واپس جانے کی اجازت دی تھی۔ سفیر اس کے اسپتال سے گھر منتقل ہونے کے بعد بھی اس کی خبر گیری کرتا رہا تھا۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ علیزہ استھما کی مریضہ ہے جسے الرجی پیدا کرنے والے عوامل کے علاوہ شدید ٹینشن کی صورت میں بھی دورہ پڑ جاتا تھا۔ اس روز اس کے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا لیکن سفیر کی بروقت کارروائی نے اس کی جان بچالی تھی۔ میڈیا کے ذریعے علیزہ اور اس کے گھر والوں کو رشید کے بارے میں بھی تفصیلات کا علم ہو گیا تھا۔ اسے فیکٹری میں کسی قیمتی شے کی خرابی کے الزام میں ملازمت سے نکال کر اس کی تنخواہ ہرجانے کے طور پر ضبط کی گئی تھی لیکن وہ اپنا قصور ماننے کے بجائے جارحیت پر اتر آیا تھا۔

رشید کی بیوی نے اپنے بیان میں بتایا تھا کہ رشید فطرتاً جارح مزاج اور قدرے غیر متوازن شخصیت کا مالک ہے اس لیے ایسی حرکت کر بیٹھا اس نے سفیر سے رشید کے لیے معافی کی درخواست بھی کی تھی جس کے جواب میں سفیر نے کہا تھا کہ اسے رشید سے کوئی ذاتی عناد نہیں ہے اور اس کی فیملی کی خاطر وہ پولیس ڈپارٹمنٹ سے درخواست کرتا ہے کہ رشید کے لیے قانون میں جتنی لچک پیدا کی جا سکتی ہے، کی جائے۔ علیزہ کو سفیر کا یہ جواب اچھا لگا تھا اور ساتھ ہی اپنی اتنی خبر گیری کرنا بھی بہت بھایا تھا۔ دولت، وجاہت اور اخلاق کا ایسا امتزاج اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سفیر نے اس واقعے میں اپنی ذہانت اور مہارت کا بھی ثبوت دیا تھا۔ واقعے والے روز رشید سے بات کرتے ہوئے وہ فیکٹری سے بہت قریب تھا لیکن جان بوجھ کر اپنے دور ہونے کا ذکر کیا اور نہایت تیزی سے منصوبہ بناتے ہوئے پولیس سے رابطہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ایک دوست سے اس کی ٹنٹڈ گلاسز والی گاڑی بھی فوری طور پر منگوالی۔ اسے پولیس کے محکمے کی کارکردگی پر مکمل بھروسا نہیں تھا۔ وہ لوگ اس کے خدشات کے مطابق چند سیکنڈ تاخیر سے ہی پہنچے تھے اس لیے اسے خود رشید کے خلاف کارروائی کا آغاز کرنا پڑا تھا۔ وہ بہت اچھا شوٹر تھا اور یہ اس نے ثابت کر دیا تھا۔ کسی انہونی کے خدشے کے تحت پیشگی ایمبولینس بھی اسی نے منگوائی تھی جو علیزہ کی زندگی بچانے کا ایک ذریعہ بنی اور یوں اب علیزہ ایک بار پھر اپنی ملازمت پر موجود تھی۔ اس کی دوبارہ جوائننگ کا پہلا دن سائرہ کی ملازمت کا آخری دن تھا لیکن بعد کے دنوں میں بھی اسے کام سنبھالنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔

سفیر بہت نرم مزاج اور تعاون کرنے والا باس تھا اور کسی غلطی پر بھی اس کے ساتھ سخت رویّہ اختیار نہیں کرتا تھا۔ سفیر کی خصوصیات کی وجہ سے وہ تیزی سے اس سے متاثر ہو رہی تھی لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ سفیر خود بھی اس کی سادگی اور حسن سے متاثر ہو چکا ہے۔ جب سفیر نے اسے پرپوز کیا تو وہ دنگ رہ گئی لیکن پھر اسے اپنی خوش قسمتی پر رشک آنے لگا۔ اس نے سفیر کو اجازت دے دی کہ وہ اس سلسلے میں اس کے والدین سے بات کرنے کے لیے اپنی والدہ کو بھیج دے۔ سفیر کی والدہ رشتہ لے کر علیزہ کے گھر گئیں تو ان کی ایک ایک ادا سے ظاہر تھا کہ وہ بیٹے کے مجبور کرنے پر وہاں آئی ہیں۔ سفیر اس سلسلے میں پہلے ہی علیزہ

کے گھر والوں کو سمجھا بجھا نہ چکا ہوتا تو وہ لوگ اس رشتے کو قبول کرتے ہوئے جھجکتے لیکن علیزہ کے ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی چند ملاقاتوں میں سفیر کے گرویدہ ہو چکے تھے اس لیے اس کی والدہ کے رویے کے باوجود رشتے کے لیے ہامی بھرلی اور پھر سفیر نے ایسا چکر چلایا کہ جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ والا معاملہ پیش آیا۔ علیزہ نے صرف ایک بار اس سے اتنی عجلت پر اعتراض کیا تھا تو اس نے بتایا تھا کہ اس کی والدہ اس کی خالہ زاد سے اس کی شادی کرنا چاہتی ہیں اس لیے وہ نہیں چاہتا تھا کہ منگنی سے شادی کے دورانیے کو طول دے کر انہیں اس کا اور علیزہ کا رشتہ ختم کرنے کا کوئی موقع فراہم کیا جائے۔ علیزہ کو اس کی بات سمجھ آگئی اور اس نے اپنے گھر والوں کو بھی سمجھادی۔ یوں وہ جو سیکریٹری بن کر آئی تھی، مختصر عرصے میں سفیر کی بیوی بن گئی۔ اس سلسلے میں اسے لوگوں کی چند سخت اور طنزیہ باتیں بھی سننی پڑی تھیں لیکن اس نے ان باتوں کو اس لیے دل پر نہیں لیا کہ سفیر کی بے تحاشا محبت اس کے ساتھ تھی۔

سسرال میں اس کی ساس کا رویہ بھی اس کے ساتھ بہت ہتک آمیز تھا لیکن وہ انہیں بھی سفیر کی خاطر خوش اسلوبی سے جھیل رہی تھی۔ دیور اور نند اس ساری صورتِ حال میں غیر جانبدار بلکہ کافی حد تک لاتعلق فریق کا کردار ادا کر رہے تھے، اسے ان سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ سمجھ سکتی تھی کہ وہ اس کی خاطر اپنی ماں کے خلاف نہیں بول سکتے چنانچہ اس کے لیے اتنا ہی بہت تھا کہ وہ اس کے خلاف بھی کچھ نہیں بولتے تھے۔ شادی کے ہفتے بھر بعد ہی سفیر کی خواہش پر وہ دوبارہ اپنی ملازمت پر آگئی تھی اس لیے گھر کے ماحول سے اس پر بہت زیادہ فرق بھی نہیں پڑتا تھا۔ سارا دن فیکٹری میں گزارنے کے بعد وہ لوگ شام کے دو ڈھائی گھنٹے ہی گھر پر گزارتے تھے پھر سفیر اسے لے کر کہیں نہ کہیں گھومنے پھرنے نکل جاتا تھا۔ ہنی مون کے لیے سفیر نے اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ کچھ عرصے بعد پروگرام بنائے گا۔ علیزہ کو اس کی زیادہ پروا بھی نہیں تھی۔ وہ جس ماحول سے آئی تھی وہاں ہنی مون وغیرہ کے چوچلوں کا کوئی تصور ہی نہیں تھا بلکہ اپنے میکے کے ماحول کے اعتبار سے تو وہ خود کو نہایت خوش قسمت ہی تصور کرتی تھی کہ اسے اپنے شوہر کی اتنی توجہ اور محبت حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی مکمل آزادی ہے کہ وہ روزانہ اس کے ساتھ گھومنے نکل جاتی ہے ورنہ اس کے اپنے خاندان میں تو اس بات کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ اس بات سے بھی خوش رہتی تھی کہ اپنی ملازمت کو جاری رکھنے کے باعث اسے زیادہ سے زیادہ وقت سفیر کے ساتھ گزارنے کا موقع مل جاتا تھا۔ اب تو سفیر فیکٹری سے باہر جاتے ہوئے بھی اسے اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ اس عرصے میں اسے استھما کی تکلیف بھی صرف ایک بار اس وقت ہوئی تھی جب وہ اتفاقاً ڈائنگ ڈپارٹ میں چلی گئی تھی اور وہاں کیمیکلز اور کلرز وغیرہ کی بُو سے اس کی طبیعت بگڑ گئی تھی۔ اس دن کے بعد سفیر نے اسے پابند کر دیا تھا کہ وہ فیکٹری میں صرف اپنے دفتر تک محدود رہے گی۔ وہ خوشی سے اس حکم کی تعمیل کر رہی تھی اور اس وقت بھی دفتر میں بیٹھی اپنا کام کر رہی تھی کہ سفیر جو کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا، واپس آگیا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ فائلیں موجود تھیں جو اس نے علیزہ کی میز پر رکھیں اور خود کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔

''اچھی سی کافی تو پلواؤ تاکہ ذرا فریش ہو جاؤں۔''

علیزہ نے فوراً انٹرکام پر کافی کے لیے کہا اور پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہیں۔ کیا کہیں دور گئے ہوئے تھے؟''

''یہی سمجھ لو۔ سارا وقت اِدھر سے اُدھر گاڑی دوڑانے اور لوگوں سے سر کھپانے میں گزرا ہے اس لیے بُری طرح تھک گیا ہوں لیکن اچھی بات یہ ہے کہ ایک بڑا اہم کام نمٹ گیا ہے۔ یہ لو، یہ دیکھو میں نے تمہاری بیمہ پالیسی تیار کروالی ہے۔'' بولتے بولتے اس نے ایک فائل اٹھا کر علیزہ کی طرف بڑھائی۔ علیزہ نے فائل تھام لی اور سنجیدگی سے اس کا مطالعہ کرنے لگی۔ مطالعہ کرنے کے بعد اس نے فائل بند کی تو مزید سنجیدہ بلکہ قدرے ہراساں تھی۔ سفیر نے فوراً ہی اس کا موڈ بھانپ لیا اور قدرے تشویش سے پوچھنے لگا۔

''کیا ہوا؟ تم کچھ پریشان نظر آ رہی ہو۔'' جواب میں وہ کچھ دیر خاموشی سے یوں اس کی طرف دیکھتی رہی کہ جیسے تذبذب کا شکار ہو کہ آیا اس کے سوال کا جواب دے یا نہ دے پھر بالآخر وہ نتیجے پر پہنچ گئی اور قدرے جھجکتے ہوئے اپنی بات کا آغاز کرتے ہوئے بولی۔

''آپ میری بات کا بُرا مت مانیے گا بس اس پالیسی کو دیکھ کر میرے دل میں ایک عجیب سا خیال آ گیا تھا جس نے مجھے پریشان کر دیا۔''

''کیسا خیال......؟ تم کھل کر مجھے بتاؤ۔ ہم دونوں

میاں بیوی ہیں اور میں اس بات کا قائل نہیں ہوں کہ میاں بیوی کے درمیان کوئی بات کرنے میں کسی قسم کی جھجک حائل ہو۔ تمہیں جو کہنا ہے کہو اور یہ مت سوچو کہ مجھے کچھ بُرا لگے گا۔'' سفیر نے اسے حوصلہ دیا تو اس نے اپنے ذہن میں آنے والے خیال کا اظہار کر دیا اور بولی۔

''میں نے بہت سی ایسی کہانیاں پڑھی ہیں کہ جس میں یہ سچویشن ہوتی ہے کہ امیر شخص کسی غریب لڑکی سے اس لیے شادی کر لیتا ہے کہ بعد میں اسے قتل کر کے اس کے بیمے کی بھاری رقم حاصل کر لے گا۔ میں اتنے دنوں سے آپ کے ساتھ کام کر رہی ہوں اس لیے یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ کے بزنس کی حالت اتنی اچھی نہیں ہے اور اس فیکٹری کے علاوہ جو دوسری فیکٹری ہے، وہ تو بند ہی پڑی ہوئی ہے اس لیے مجھے خیال آیا کہ شاید......''

''کہ شاید میں تمہیں قتل کرنے کے بعد تمہارے بیمے کی رقم سے اپنا نقصان پورا کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے خود ہی علیزہ کا ادھورا جملہ مکمل کیا اور بات کے اختتام پر ایک قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

''تم میرے اندازے کے مطابق سچ مچ بہت سیدھی ہو علیزہ! تمہیں دنیا کا کچھ پتا نہیں ہے اور دنیا کو کہانیوں کی نظر سے دیکھتی ہو، ارے بابا یہ جو اتنا بھاری انشورنس دینے والے ہوتے ہیں وہ ایسے ہی اتنی آسانی سے کسی کو رقم نہیں پکڑا دیتے ہیں۔ پوری پوری تحقیق ہوتی ہے ان کی طرف سے۔ قتل وغیرہ کو پکڑنا ان کے لیے ذرا بھی مشکل نہیں ہوتا اور میں اتنا احمق نہیں ہوں کہ تمہیں قتل کر کے خود پھانسی پر چڑھ جاؤں۔ میں محنت پر یقین رکھنے والا آدمی ہوں اور تمہیں ایک بار پھر اپنا کاروبار اوپر اٹھا کر دکھاؤں گا۔ یہ جھوٹ نہیں کہ مجھے اس کام کے لیے رقم کی ضرورت ہے لیکن وہ رقم میں تمہیں قتل کر کے نہیں بلکہ کسی اور ذریعے سے حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور آج اس سلسلے میں بھی مجھے کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ میں ایک بڑا قرضہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔'' اس نے ایک فائل کھول کر علیزہ کے سامنے رکھی جس میں قرض کی رقم، سود کی شرح، ادائیگی کا طریقہ کار اور مدت سمیت بہت سی تفصیلات درج تھیں۔ علیزہ نے سرسری طور پر یہ سب پڑھا اور شرمندہ نظر آنے لگی۔

''تمہاری تسلی کے لیے میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ میں نے اپنی بیمہ پالیسی کا وارث تمہیں نامزد کر دیا ہے اس لیے اگر چاہو تو تم بھی مجھے قتل کر کے کافی بڑی رقم حاصل کر سکتی ہو۔'' سفیر نے شوخ لہجے میں کہتے ہوئے ایک اور فائل کھول کر اس کی طرف بڑھائی۔

''پلیز بس کر دیں مجھے شرمندہ کرنا۔ میرے دل میں ویسے ہی ایک وہم آ گیا تھا۔'' علیزہ فائل لے کر دیکھنے کے بجائے شرمندہ سے لہجے میں صفائی پیش کرنے والے انداز میں بولی۔

''آئندہ میری محبت پر شک نہیں کرنا علیزہ۔ میں نے مخالفتیں مول لے کر تمہیں اپنایا ہے۔ اگر تم ہی میری محبت کا اعتبار نہیں کرو گی تو میں کیا کروں گا۔'' اس بار سفیر کا لہجہ جذباتی تھا۔

''آئی ایم سوری سفیر! آئندہ میں کبھی آپ کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گی۔ بس یہ میری پہلی اور آخری غلطی تھی آئندہ آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔'' علیزہ نے دل کی گہرائیوں سے اسے یقین دہانی کروائی تو وہ کھل کر مسکرا دیا۔

☆☆☆

''آج نینی نے ہم سب کو ڈنر پر بلایا ہے۔ تم دونوں آفس سے آتے ہی آوارہ گردی کے لیے نہ نکل جاؤ اس لیے ابھی سے بتا رہی ہوں اور ہاں لڑکی...... تم ذرا ڈھنگ سے ڈریس اَپ ہونا۔ نینی کے گھر کے سرونٹس بھی تم سے اچھے حلیے میں رہتے ہیں، کہیں اپنی ڈریسنگ سے وہاں مجھے شرمندہ نہ کروا دینا۔'' وہ دونوں آفس جانے سے قبل ناشتا کر رہے تھے کہ فرحین خلافِ معمول وہاں چلی آئیں اور اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ ہدایات بھی جاری کیں۔

''اوکے مام۔ ڈونٹ یو وری۔ ہم وقت پر تیار ہو جائیں گے۔'' علیزہ تو ان کے حقارت آمیز لہجے کی وجہ سے کوئی جواب دینے سے قاصر تھی چنانچہ سفیر ہی نے انہیں جواب دیا۔

''اور ہاں، وہاں جا کر سویرا کے سامنے اپنی بیگم کے زیادہ لاڈ اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بچی عرصے سے اپنے نام کے ساتھ تمہارا نام سن رہی تھی۔ تمہارے اس طرح شادی کر لینے پر وہ پہلے ہی کافی ڈسٹرب ہے۔ تمہاری کسی حرکت سے اسے مزید دکھ نہیں پہنچنا چاہیے۔'' وہ واپس جاتے جاتے ایک اور ہدایت جاری کر گئیں تو سفیر بے بسی سے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ شام کو بہر حال وہ اور علیزہ حسبِ ہدایت تیار تھے۔ نینی آنٹی کے گھر ان کا رسمی انداز میں

استقبال ہوا اور کھانا بھی نپے تلے انداز میں کھایا گیا۔ شاہد انکل کی موجودگی میں سبین آنٹی کے گھر میں ہمیشہ ایسا ہی ماحول ہوتا تھا۔

’’تم لوگ چاہو تو باہر سوئمنگ پول پر چلے جاؤ۔ ہم بڑے یہیں بیٹھ کر آپس میں باتیں کرتے ہیں۔‘‘ کھانے کے بعد سبین آنٹی نے حسبِ معمول وہی جملہ ادا کیا جو وہ انکل کی موجودگی میں ہمیشہ ادا کرتی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کے شوہر کا مزاج ایسا ہے کہ ان کی موجودگی میں کوئی کھل کر ہنس بول نہیں سکتا اس لیے ان لوگوں کو منظر سے ہٹا کر لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کر دیتی تھیں۔ اس وقت بھی انہوں نے ایسا ہی کیا تھا۔ سفیر، علیزہ اور سویرا ان کی ہدایت پر باہر آ گئے۔ آنٹی کا لان بہت خوب صورت تھا اور سوئمنگ پول کا تو جواب ہی نہیں تھا۔ علیزہ تو حقیقتاً اسکرین سے ہٹ کر پہلی بار ایسی کوئی چیز دیکھ رہی تھی اس لیے وہ مبہوت رہ گئی۔ سفیر اسے اپنے ساتھ لے کر سوئمنگ پول کے کنارے ٹہلنے لگا جبکہ سویرا نے ایک کرسی سنبھال لی۔ وہ اپنی ماں کے کہنے پر ان لوگوں کے ساتھ آ تو گئی تھی لیکن اس کا موڈ اچھا نہیں تھا اور خود کو ان لوگوں سے بے نیاز ظاہر کرنے کے لیے موبائل پر مصروف تھی۔

’’بہت روڈ ہے آپ کی کزن۔‘‘ علیزہ نے تبصرہ کیا۔

’’دولت نے دماغ خراب کر رکھا ہے اس لیے کسی کو کچھ نہیں سمجھتی۔ تم سے تو جیلس بھی ہے کہ میں نے اسے رد کر کے تمہیں اپنایا ہے۔ اس سے ذرا محتاط ہی رہنا ذرا منتقم مزاج لڑکی ہے۔‘‘ سفیر نے اسے ہوشیار کیا۔

’’میرا اس سے کیا لینا دینا ہے۔ آپ کی خاطر ہی یہاں آئی ہوں۔ ویسے یہاں کے مکینوں سے مل کر اچھا لگا ہو یا نہیں مکان میں آنا اچھا لگا ہے۔ بہت خوب صورتی ہے یہاں۔‘‘ بات کرتے کرتے وہ موضوع بدل گئی اور دلچسپی سے پانی پر بکھری رنگ برنگی روشنیوں کو دیکھنے لگی۔

’’سارا پیسے کا کمال ہے۔ شاہد انکل کا بزنس ہمیشہ ہی ڈیڈی سے اوپر رہا ہے اس لیے وہ ہر معاملے میں دل کھول کر پیسا خرچ کرتے ہیں۔ بس مزاجاً ذرا اسٹرِل ہیں اور ہم آنٹی کی وجہ سے انہیں برداشت کر لیتے ہیں۔ خیر تم یہاں کی خوب صورتی انجوائے کرو میں ذرا واش روم سے ہو کر آتا ہوں۔‘‘ سفیر ذرا عجلت میں وہاں سے چلا گیا اور علیزہ تنہا ہی ٹہلنے لگی۔ چند منٹ بعد سفیر واپس آیا تو عجیب منظر سامنے تھا، علیزہ سوئمنگ پول میں ڈبکیاں کھا رہی تھی اور سویرا بھی پول میں موجود تھی۔ اس نے دیکھا کہ سویرا، علیزہ کے بال مٹھی میں جکڑے ہوئے تھی۔ علیزہ کی غیر ہوتی حالت کو اس نے فاصلے سے بھی محسوس کیا اور اس کے لیے مزید اپنی جگہ پر کھڑا رہنا ممکن نہیں رہا۔ اپنے قیمتی سوٹ کی پروا کیے بغیر اس نے بھی سوئمنگ پول میں چھلانگ لگا دی اور ان دونوں کے قریب پہنچ کر سویرا کو ایک جھٹکے سے علیزہ سے الگ کیا۔ اسے قریب دیکھ کر سویرا نے خود بھی علیزہ کے بال چھوڑ دیے اور سوئمنگ پول سے باہر نکل گئی۔ پیچھے ہی سفیر بھی علیزہ کو لے کر باہر نکلا اور اسے ماربل کے فرش پر لٹا کر کینہ توز نظروں سے سویرا کو گھورنے لگا۔ وہ اس کی نظروں سے بے نیاز سر جھٹک جھٹک کر بالوں سے بہہ کر آنے والے پانی کو اپنی آنکھوں میں جانے سے روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سفیر کو اس پر اتنی شدت سے غصہ آیا کہ دل چاہا اس کا گلا دبا دے لیکن برداشت کر گیا اور مٹھیاں بھینچ کر اپنے غصے کو قابو میں کرتے ہوئے بولا۔

’’یہ تم کیا کر رہی تھیں سویرا؟ کیا تم علیزہ کو سوئمنگ پول میں ڈبو کر مارنے کی کوشش کر رہی تھیں؟‘‘

’’فضول باتیں مت کرو۔ یہ پول میں گر گئی تھی۔ شاید ڈوب کر مر بھی جاتی لیکن شکر کرو کہ میری نظر پڑ گئی اور میں اسے بچانے کے لیے خود پول میں کود گئی۔‘‘ سویرا نے اپنے بالوں سے پانی جھٹکتے ہوئے نخوت سے جواب دیا تو سفیر کو وہ ہمیشہ سے زیادہ بدصورت لگی، وہ چلا کر بولا۔

’’تم جھوٹ بول رہی ہو۔ میں نے دور سے دیکھا تھا تم لاتیں مار مار کر اسے خود سے دور کر رہی تھیں تاکہ یہ ڈوب کر مر جائے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ میں عین وقت پر یہاں پہنچ گیا ورنہ اب تک تم اسے مار چکی ہوتیں۔‘‘

’’پہنچ ہی گئے ہو تو اسے اسپتال لے جاؤ۔ مجھے لگ رہا ہے کہ اس کے پھیپھڑوں میں کافی پانی چلا گیا ہے اور یہ سانس لینے میں مشکل محسوس کر رہی ہے۔ بعد میں چاہو تو تم مجھ پر اقدامِ قتل کی ایف آئی آر کٹوا دینا۔‘‘ علیزہ ابھی تک فرش پر پڑی ہوئی تھی اور وہ سویرا کے ساتھ بحث میں الجھا ہوا تھا۔ سویرا ہی نے چبا چبا کر بولتے ہوئے اسے علیزہ کی حالت کا احساس دلایا تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

’’تمہیں اپنی یہ حرکت بہت مہنگی پڑے گی۔‘‘ سفیر نے اسے دھمکی دی اور علیزہ کو اپنی بانہوں میں اٹھا لیا۔ کچھ ملازمین اس عرصے میں آوازیں سن کر قریب آ گئے تھے۔ ان میں سے کسی نے دخل اندازی تو نہیں کی لیکن سویرا کو

مشکوک نظروں سے ضرور دیکھا۔ اپنی چڑچڑی اور بدمزاج مالکن سے وہ کسی بھی عمل کی توقع کر سکتے تھے۔

☆☆☆

علیزہ کو سنبھلنے میں کافی وقت لگا تھا۔ حقیقتاً وہ موت کے منہ سے واپس آئی تھی۔ وہ استھما کی مریض تھی اور اس کے لیے پانی میں ڈوبنے کا تجربہ بہت ہی تکلیف دہ ثابت ہوا تھا۔ جان بچ جانے کے بعد بھی وہ کافی عرصے شاکڈ رہی تھی۔ سفیر نے اس کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کے بارے میں اس سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اسے کچھ بھی ڈھنگ سے یاد نہیں تھا۔ وہ نہیں بتا سکی تھی کہ وہ پاؤں پھسلنے سے پول میں گری تھی یا اسے کسی نے دھکا دیا تھا۔ ایسے میں سفیر، سویرا کے خلاف ایف آئی آر کٹواتا تو کس بنیاد پر۔ وہ صرف ماما کے سامنے ہی سویرا کی شکایت کر کے رہ گیا لیکن انہوں نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی بھانجی کے خلاف کچھ سننے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ الٹا انہوں نے علیزہ کے خلاف ہی زہر اگلا تھا کہ ایک تو وہ نیچ خاندان کی لڑکی کو بیاہ لایا ہے اوپر سے لڑکی بھی روگی ہے۔ انہوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ علیزہ کو اس کے بیڈ روم کے علاوہ گھر کے کسی اور حصے میں برداشت نہیں کریں گی کہ مبادا اس کا مرض انہیں یا ان کے دوسرے دونوں بچوں کو نہ لگ جائے۔ اس پابندی کے خلاف وہ کوئی دلیل بھی سننے کے لیے تیار نہیں تھیں اس لیے اسپتال سے واپس آنے کے بعد علیزہ اپنے کمرے تک محدود رہنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ یہ صورتِ حال اس کی طبیعت کے لیے اور نقصان دہ تھی۔ چنانچہ سفیر نے اپنے پاس وقت کی کمی کے باوجود چند دن کہیں تفریح کے لیے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ واپس آنے تک علیزہ کی طبیعت سنبھل جاتی تو وہ دوبارہ اپنی ملازمت اختیار کر لیتی اور ایک کمرے تک محدود رہنے والی پابندی کا زیادہ احساس نہ ہو پاتا۔ چار روزہ اس تفریحی دورے کو صرف لاہور اور اسلام آباد تک محدود رکھا گیا تھا۔ پہلے وہ لوگ ہوائی جہاز کے ذریعے سیدھے اسلام آباد پہنچے اور سفیر نے اسے اسلام آباد کے ہر قابلِ ذکر مقام پر خوب گھمایا پھرایا۔ شاپنگ کے معاملے میں بھی کنجوسی نہیں دکھائی اور علیزہ کے منع کرنے کے باوجود کافی چیزیں دلا دیں۔

’’کیا ضرورت ہے اتنی فضول خرچی کی۔ پہلے ہی آپ کا کاروبار خسارے میں ہے اور آپ پر قرض کا اتنا بوجھ ہو گیا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ مجھے خوش کرنے کے

لیے خود کو مزید زیرِ بار کریں۔ میں چیزوں کے پیچھے بھاگنے والی لڑکی نہیں ہوں۔ میرے خوش رہنے کے لیے آپ کی محبت ہی کافی ہے۔‘‘ اس نے اسے ایک قیمتی جیولری سیٹ دلوایا تو وہ اس پر خفا ہوتے ہوئے بولنے لگی۔ سفیر اس کی اس ادا پر مسکرایا اور اس کی ایک لٹ کو کھینچتے ہوئے بولا۔

’’میں جانتا ہوں کہ تم کتنی سادہ مزاج لڑکی ہو لیکن میں اپنے دل کا کیا کروں جو دنیا کی ہر نعمت تمہارے سامنے ڈھیر کر دینے کو مچلتا رہتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ تم اتنی خوب صورت ہو کہ دنیا کی ہر خوب صورت شے پر تم سے زیادہ کسی کا حق نہیں بنتا۔‘‘

’’یہ سارا آپ کی نظروں کا کمال ہے ورنہ مجھ جیسی تو بہت لڑکیاں ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی مجھے خود پر رشک آنے لگتا ہے کہ اللہ نے میرا نصیب کتنا اچھا بنایا ہے کہ مجھے آپ جیسا شریکِ حیات عطا کر دیا۔ اپنی اس خوش نصیبی کے لیے میں روزانہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی شکر ادا کرتی ہوں۔‘‘ سفیر کی بات سن کر اس نے خود سپردگی کی کیفیت میں اپنا سر اس کے سینے سے ٹکا لیا اور دھیرے دھیرے بولنے لگی۔ سفیر اس کی بات سن کر حسبِ عادت دھیرے سے مسکرایا اور بولا۔

’’تمہارے خوش نصیب ہونے کا تو مجھے خود بھی یقین ہے کیونکہ تمہاری اس خوش نصیبی نے میری زندگی پر بھی اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا ہے اور میرے کاروبار کی گرتی ساکھ تیزی سے سنبھلنے لگی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ ایک آدھ سال میں سب کچھ بالکل ٹھیک ہو جائے گا پھر میں تمہیں پورے پاکستان کی سیر کروانے کے ساتھ ساتھ پاکستان سے باہر بھی گھمانے لے جاؤں گا۔‘‘

’’اللہ آپ کا ہر خواب پورا کرے۔ میں تو بس آپ کی خوشی میں خوش ہوں۔‘‘ علیزہ کا جواب اس کی توقع کے مطابق تھا چنانچہ وہ شریر انداز میں مسکرایا اور اس کے گرد بانہوں کا گھیرا تنگ کر دیا۔

اسلام آباد میں تقریباً ڈیڑھ دن گزارنے کے بعد وہ لوگ سڑک کے راستے لاہور پہنچے۔ لاہور کا موسم اسلام آباد کی طرح خوش گوار تو نہیں تھا لیکن تاریخی عمارات کی سیر اور سفیر کی سنگت نے علیزہ کے لیے یہاں کے قیام کو بھی خوش گوار بنا دیا۔ وہ دونوں سارا دن ایک دوسرے میں گم اس بڑے سے شہر میں گھومتے رہتے جسے پاکستان کا دل کہا جاتا ہے۔ گھومنے پھرنے کی اس مصروفیت میں فرصت کے چند لمحات بھی میسر آتے تو علیزہ فوراً اپنے گھر فون کرتی اور بچوں

اور بھابی کو ایک ایک تفصیل سے آگاہ کرتی۔ وہ اس کی خوش قسمتی پر رشک کا اظہار کرتیں تو اس کی سرشاری مزید بڑھ جاتی۔ سفیر اس کے اس عمل سے واقف تھا لیکن اس نے کبھی اس معاملے میں دخل اندازی نہیں کی تھی۔ وہ اسے خوش دیکھ کر خود بھی خوش ہوتا تھا بلکہ اس کی خوشی کو اپنی کامیابی تصور کرتا تھا۔ اب بھی وہ صرف اس کی خاطر ایک ریڑھی پر کھڑا اس کے لیے بھٹے خرید رہا تھا اور دور ہی سے علیزہ کو موبائل پر مسکرا مسکرا کر بات کرتے ہوئے دیکھ کر اندازہ لگا رہا تھا کہ وہ کس سے اور کیا گفتگو کر رہی ہوگی۔ گرم گرم بھٹے لے کر وہ اس کے قریب پہنچا تو اس کے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ علیزہ اس کو قریب دیکھ کر بات ختم کرتے ہوئے بولی۔

''اچھا بھابی پھر کسی وقت دوبارہ فون کروں گی۔ سفیر میرے لیے بھٹے لے کر آئے ہیں ذرا پہلے ان سے انصاف کرلوں۔''

''تم کیا اپنی بھابی کو جلانے کے لیے ہر وقت ان کے کان کھاتی رہتی ہو؟'' سفیر نے ایک بھٹا اسے تھماتے ہوئے شریر انداز میں پوچھا۔

''جی نہیں، میری بھابی ایسی نہیں ہیں کہ مجھ سے جیلس ہوں۔ میں تو ان سے سب کچھ اس لیے شیئر کرتی ہوں کہ وہ میری خوشی میں خوش ہوتی ہیں۔'' اس نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دے کر بالوں کو پیچھے کیا اور معصوم و بے نیاز انداز میں اس کی بات کا جواب دیا تو وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ واقعی بہت خوب صورت اور معصوم تھی اور کبھی کبھی وہ اپنے اندر بے چینی محسوس کرنے لگتا تھا۔

''مجھے ایسے گھور گھور کر کیا دیکھ رہے ہیں۔ بھٹا کھائیں نا۔'' اس کے ایک ٹک دیکھنے پر وہ تھوڑی سی پزل ہوئی اور اسے مشورہ دینے کے انداز میں ٹوکا۔

''کھا رہا ہوں بابا! ویسے تمہارے ساتھ رہ کر میں نے ان دنوں جو الم غلم چیزیں کھائیں ہیں ان کے بارے میں اگر میری ماما کو پتا چل جائے تو صدمے سے انہیں ہارٹ اٹیک ہی ہو جائے۔ وہ بہت اسٹیٹس کانشس ہیں اور اس طرح ریڑھی اور فٹ پاتھ سے کوئی چیز لے کر کھانے کا ان کے پاس کوئی تصور ہی نہیں ہے۔'' اس نے بھٹے کے چند دانے دانتوں سے کترے اور اسے بتانے لگا۔

''اب آپ انہیں بتایئے گا کہ اس طرح کھانے پینے میں کتنا لطف آتا ہے تو شاید وہ بھی ان چیزوں کو ٹرائی کر کے دیکھ لیں۔'' علیزہ نے شریر سے انداز میں اس کی بات کا جواب دیا۔

''معاف کرو بابا! وہ تو سن کر ہی میرا حشر کر دیں گی کہ میں اس طرح کی حرکتیں کر کے ان کی تربیت کو خاک میں ملا رہا ہوں۔'' سفیر نے کانوں کو ہاتھ لگایا تو وہ ہنس دی۔ یوں ہی ہنستے مسکراتے انہوں نے اپنا اپنا بھٹہ ختم کیا اور وہاں سے اٹھ کر پیدل ہی چل پڑے۔

''سفیر گولا گنڈا، پلیز مجھے گولا گنڈا کھانا ہے۔'' وہ کچھ دور ہی گئے تھے کہ علیزہ نے اس کا شانہ ہلا کر بچوں کے سے انداز میں اس سے فرمائش کی اور ساتھ ہی سڑک کی دوسری طرف کھڑے گولے گنڈے والے کی طرف اشارہ بھی کیا۔

''اوکے، آؤ چلو لیتے ہیں۔'' سفیر حسب معمول اس کی فرمائش پوری کرنے کے لیے تیار ہو گیا اور گولا گنڈے کے ٹھیلے تک جانے کے لیے سڑک پر قدم رکھا اور اس وقت دائیں جانب سے ایک تیز رفتار جیپ دوڑتی ہوئی اسی طرف آ رہی تھی، سفیر تیزی سے بھاگ کر دوسری طرف پہنچ گیا۔ علیزہ جو اس کے پیچھے لپکی تھی نہ تو اس برق رفتار جیپ کو دیکھ سکی اور نہ ہی سفیر کی رفتار کا ساتھ دے سکی۔ نتیجتاً جیپ والے کے بریک لگاتے لگاتے بھی وہ اس کی زد میں آ گئی۔ ایک دم ہی وہاں شور و غل مچ گیا۔ سفیر جو سڑک کی دوسری طرف پہنچ چکا تھا۔ شور کی آواز سن کر پلٹا اور علیزہ کو سڑک پر پڑے دیکھ کر فوراً ہی ساری صورتِ حال سمجھ گیا۔ اس نے پہلے سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے علیزہ تک کا فاصلہ طے کیا۔ اس دوران جیپ والا جیپ سے باہر آ چکا تھا اور دوسری گاڑیوں کے سواروں سمیت کئی راہ گیر بھی رک کر صورتِ حال جاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ سفیر نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جیپ ڈرائیور کا گریبان پکڑ لیا اور اس پر تابڑ توڑ مکے برسانے لگا۔ جیپ والا دہائیاں ہی دیتا رہ گیا کہ میرا کوئی قصور نہیں ہے خاتون خود ہی اچانک سڑک پر آ گئی تھیں لیکن سفیر پر تو گویا جنون سوار ہو گیا تھا۔ وہ کسی کی کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ مجبوراً جیپ والا بھی اپنے دفاع میں ہاتھ پاؤں چلانے لگا اور اس نے بھی سفیر کو چند سخت ضربیں لگائیں۔ تماشا دیکھتا ہجوم اگر دخل اندازی نہ کرتا تو وہ دونوں ایک دوسرے کو خونم خون کر ڈالتے۔ ایک اور اچھی بات یہ ہوئی کہ پولیس کی ایک موبائل بھی موقع پر پہنچ گئی۔ پولیس والوں نے ہی ایمبولینس کو کال کیا اور سڑک پر خون میں لت پت پڑی علیزہ کو فوری طور پر اسپتال منتقل کیا گیا۔

پُراثر تحریروں اور رنگارنگ سلسلوں سے سجا اکتوبر 2018ء کا دلفریب شمارہ

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

تیزی سے بڑھتے ...... رفعت سراج اور شیریں حیدر کے خوب صورت ناول

حیا بخاری نے عیاں کیے تلخ حقائق ...... محبت لفظ ہے لیکن میں

اچھوتا منی ناول ...... صفہ ...... دردانہ نوشین کی علمی تحقیق کا نچوڑ

ناہید سلطانہ اختر، شمیم فضل خالق، ایمل رضا، غزالہ فرخ کی خصوصی تحریریں

شمع ہدایت کے سلسلے میں ...... اختر شجاعت کی پُربصیرت تحریر ...... امانت اور دیانت کے موضوع پر

قلمی ستاروں اور پاکیزہ

قاری بہنوں کی محفل عید ملن کا دلکش احوال

زہرہ جنید کے قلم سے

عورت کہانی میں پڑھیے فرحین اظفر کی ایک اور خوب صورت تحریر

اس کے علاوہ

نگہت اعظمی، ہما بیگ، شمائلہ دلعباد، نیر فہیم خان، طیبہ عنصر مغل، منعم ملک، عظمیٰ اختیار و دیگر رائٹرز کی کہانیاں

اس کے ساتھ، ساتھ مثبت معلومات و تفریحی عناصر سے پُر مزیدار مستقل سلسلے صرف آپ کی خوش ذوقی کی نذر

سڑک پر گرنے سے علیزہ کے سر پر چوٹ آئی تھی اور اس کا کافی خون بہہ گیا تھا لیکن بہرحال بچت ہوگئی اور وہ ایک بار پھر موت کو شکست دے کر سفیر کے ساتھ زندگی جینے کے لیے لوٹ آئی۔ اس حادثے کی وجہ سے سفیر کو لاہور میں اپنا قیام بڑھانا پڑا تھا۔ اس نے علیزہ کے گھر والوں کو پریشانی سے بچانے کے لیے اس حادثے کی اطلاع نہیں دی تھی اور خود ہی اس کی دیکھ بھال میں مصروف رہا تھا۔ وہ اس طرح علیزہ کا خیال رکھ رہا تھا جیسے وہ کانچ کی بنی ہوئی ہو۔

''بس بھی اب مجھ سے نہیں پیا جا رہا۔'' اس وقت بھی وہ اسے اپنے بازو کے سہارے بٹھا کر جوس پلا رہا تھا جب علیزہ نے ایک ہاتھ سے گلاس کو پرے کرتے ہوئے مزید جوس پینے سے انکار کر دیا۔

''تھوڑا سا اور پی لو نا۔ تم نے تو آدھا گلاس بھی نہیں پیا۔'' سفیر نے اصرار کیا۔

''نہیں بالکل بھی گنجائش نہیں ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو آپ نے اتنے سارے پھل کھلائے تھے۔'' علیزہ نے انکار کیا۔

''ری کور کرنے کے لیے اچھی خوراک تو لینی پڑے گی محترمہ! اتنا ڈھیر سارا خون بہا ہے تمہارا۔ میرے ذہن میں تو جب بھی وہ منظر آتا ہے، میں کانپ کر رہ جاتا ہوں۔ میرا بس چلتا تو میں اس جیپ والے کو پھانسی پر لٹکا دیتا۔'' سفیر نے ایک بار پھر اس بات کو دہرایا جو پہلے بھی کئی بار کہہ چکا تھا۔

''اب جانے بھی دیں۔ غلطی میری ہی تھی کہ میں اندھا دھند آپ کے پیچھے بھاگ پڑی تھی۔ لوگوں نے بھی گواہی دی ہے کہ غلطی جیپ والے سے زیادہ میری ہے لیکن آپ نے کیا جذباتی حرکت کی۔ وہیں سڑک پر اس سے مار پیٹ کرنے کھڑے ہوگئے اور خوامخواہ خود بھی چوٹ کھائی۔'' علیزہ نے اس کی آنکھ کے قریب آنے والے نیل کے ذرا ہلکا پڑ جانے والے نشان کو اپنی انگلی کی پور سے نرمی سے چھوا۔

''میں تمہارے معاملے میں بہت جذباتی ہوں۔ کوئی تمہیں نقصان پہنچائے، میں یہ بات برداشت کر نہیں سکتا۔'' سفیر نے اعتراف کیا تو علیزہ کو یاد آگیا کہ جب وہ اس کی آنٹی کے گھر ڈنر پر گئے تھے اور وہ سوئمنگ پول میں گر کر ڈوبتے ڈوبتے بچی تھی تو اس وقت بھی وہ اپنی کزن سویرا پر چڑھ دوڑا تھا۔

''مجھے اتنا مت چاہیں سفیر! کبھی کبھی مجھے آپ کی اتنی محبت سے خوف آنے لگتا ہے۔'' وہ بے ساختہ ہی اسے ٹوک بیٹھی۔

''تمہیں نہ چاہوں تو کسے چاہوں۔ ابھی میری چاہت سے گھبرا رہی ہو اور اگر جو میں کسی اور عورت کی طرف متوجہ ہوگیا تو پھر مجھ سے لڑائی کرو گی۔'' وہ ذرا بھی سنجیدہ نہ ہوا۔

''اب میں نے یہ بھی نہیں کہا کہ آپ میری جگہ کسی اور کو چاہنے لگیں۔ ایسا کچھ کیا تو آپ کی اور اپنی جان ایک کر دوں گی۔'' وہ فوراً دھمکی پر اتر آئی۔

''بس تو پھر مجھے خود کو چاہنے دو۔ میرے پاس محبت کا اتنا ڈھیر سارا خزانہ ہے کہ مجھے لگتا ہے کہ میں تم پر دن رات بھی لٹاتا رہوں تو میری زندگی ختم ہو جائے گی لیکن یہ خزانہ ختم نہیں ہوگا۔'' وہ جذباتی ہوگیا۔

''مرنے مرانے کی باتیں مت کریں، مجھے ڈر لگتا ہے۔ ابھی تو ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ زندگی شروع کی ہے، ابھی سے مرنے کی باتیں کرنا ٹھیک نہیں ہے۔'' علیزہ ہمیشہ کی طرح اس کے جذبات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور خود بھی جذباتی ہوگئی۔

''او کے نہیں کرتا لیکن جینا ہے تو کھانا پینا بھی پڑے گا۔ لو تم یہ جوس پی کر ختم کرو۔'' سفیر گھما پھرا کر بات کو وہیں لے آیا جہاں سے شروع ہوئی تھی۔ اس بار علیزہ اسے انکار نہیں کر سکی اور نہ چاہتے ہوئے بھی گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔

☆☆☆

کمرے میں نائٹ بلب کی مدھم سبز روشنی پھیلی ہوئی تھی اور اے سی کی خنکی نے ایسی خوش گواریت پیدا کر دی تھی کہ بندہ سوئے تو مدہوش ہی ہو جائے۔ علیزہ بھی مدہوشی کی نیند سو رہی تھی لیکن ایک زوردار چھناکے کی آواز نے اسے نیند سے جاگنے پر مجبور کر دیا۔ آنکھ کھلی تو اس نے دو مردانہ چہروں کو اپنے سامنے دیکھا۔ دونوں چہرے اتنی نزدیک تھے کہ آپس میں گڈمڈ ہوئے جا رہے تھے لیکن پھر بھی اس نے ان دونوں چہروں کو شناخت کر لیا۔ پختہ عمر کا سانولا چہرہ بغیر کمانی کی گول شیشوں والی عینک اور بڑی بڑی وحشت زدہ آنکھوں کی وجہ سے اس کی یادداشت میں زیادہ اچھی طرح محفوظ تھا۔ چنانچہ اس چہرے کو اس نے پہلے شناخت کیا۔ وہ سفیر کی کمپنی سے نکالے گئے ملازم رشید کا چہرہ تھا اور اس وقت وہ اس کے چہرے کا صرف نصف حصہ ہی دیکھ پا رہی

تھی۔ آدھے چہرے پر دکھائی دینے والی اس کی واحد آنکھ میں بے پناہ غصہ تھا اور علیزہ صاف محسوس کر رہی تھی کہ اس غصے کی وجہ یہ ہے کہ وہ سفیر کی بیوی ہے۔ وہ جو کدورت سفیر کے لیے اپنے دل میں رکھتا ہے وہی اس کے لیے بھی محسوس کر رہا ہے۔ رشید کے چہرے کے ساتھ مدغم ہوتا دوسرا چہرہ وہ قدرے تاخیر سے شناخت کر پائی لیکن بہرحال اسے بھی شناخت کر لیا۔ یہ ایک نوجوان آدمی کا چہرہ تھا اور اس نے اس چہرے کو صرف ایک پل کے لیے ہی دیکھا تھا اسی لیے فوری طور پر شناخت نہیں کر پائی تھی۔ سنہرے بالوں اور صاف رنگت والا یہ شخص وہ جیپ ڈرائیور تھا جس کی جیپ سے اس کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ اس کی خوب صورت براؤن آنکھوں میں بھی علیزہ کے لیے عناد تھا۔ علیزہ اس عناد کی وجہ بھی سمجھ سکتی تھی۔ علیزہ کی غلطی کی وجہ سے وہ خواہ مخواہ ایک ایکسیڈنٹ کے کیس میں پھنس گیا تھا اور بے قصور ہوتے ہوئے بھی اسے سفیر کی ٹھیک ٹھاک مار کھانی پڑی تھی۔ بے شک اس نے بھی جواب میں سفیر کو دو چار ہاتھ لگائے تھے لیکن ایک تو سفیر شدید غصے میں تھا دوسرے اسے مارشل آرٹ کی بھی تھوڑی سی شد بد تھی۔ اس لیے اس نے نوجوان کی زیادہ درگت بنا ڈالی تھی۔

ان دونوں افراد کے مدغم چہرے اتنے نزدیک دیکھ کر علیزہ خوف سے گنگ ہوگئی۔ اسے یہی خیال آیا کہ وہ دونوں آپس میں یکجا ہو کر اس سے بدلہ لینے آئے ہیں۔ اس نے سوچا کہ سفیر کو اپنی مدد کے لیے پکارے لیکن اس کے حلق سے آواز ہی نہیں نکل سکی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ دونوں چہرے ہوا میں تحلیل ہوگئے۔ ان چہروں کے غائب ہو جانے پر اس کا خوف قدرے کم ہوا تو اسے یاد آیا کہ اس کی آنکھ چھناکے کی آواز سے کھلی تھی۔ ایسا چھناکا جو شیشہ ٹوٹنے پر ہوتا ہے۔ شیشے کا خیال آتے ہی اس کی نظر سیدھی کھڑکی کی طرف گئی اور یہ دیکھ کر اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا کہ کھڑکی کے شیشے کا کچھ حصہ درمیان سے ٹوٹ کر گر گیا ہے اور باقی رہ جانے والا شیشہ بھی اس بری طرح تڑخا ہوا ہے کہ ہر ٹکڑے نے بڑے پھل کے نوک دار خنجر کی سی شکل اختیار کر لی ہے۔ سب سے خوفناک بات یہ تھی کہ شیشے کے درمیان سے ٹوٹے ہوئے حصے میں ایک پسٹل تھامے ہوئے خون آلود ہاتھ دکھائی دے رہا تھا۔ ہاتھ سے خون کی بوندیں بہہ بہہ کر کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے پر ٹپک رہی تھیں لیکن زخمی ہونے کے باوجود اس ہاتھ میں کوئی لرزش نہیں تھی اور اس میں موجود پسٹل کا رخ واضح طور پر علیزہ ہی کی طرف تھا۔ علیزہ کے دیکھتے ہی دیکھتے اس ہاتھ کی پہلی انگلی نے ٹریگر دبایا اور ایک زوردار دھماکے کے ساتھ پسٹل سے گولی نکل کر اس کی طرف آئی۔ شدید ترین تکلیف کے احساس کے تحت اس نے اپنے دائیں پہلو پر ہاتھ رکھ کر چیخ ماری اور پھر تڑپ تڑپ کر چیخیں مارتی ہی چلی گئی۔ اس کی چیخوں کی آواز پر سویا ہوا سفیر ہڑبڑا کر جاگ گیا اور اس نے اپنے اطراف میں کئی آوازیں سنیں۔ ان آوازوں میں سے سب سے واضح آواز سفیر کی تھی جو اس کے چہرے کے قریب سے جھکتے ہوئے اس سے چیخنے کا سبب پوچھ رہا تھا۔ ہاتھ سے اپنا دایاں پہلو دباتے ہوئے ہی اسے اس حقیقت کا ادراک ہوا کہ اب تک وہ جو کچھ دیکھتی رہی ہے وہ صرف ایک خواب تھا۔ وہاں موجود افراد میں نہ تو جیپ ڈرائیور کا چہرہ موجود تھا اور نہ ہی رشید کا۔ یہاں تک کہ کھڑکی کا شیشہ بھی پوری طرح سلامت تھا لیکن پھر...... پھر وہ کیا تھا جو اس کے پہلو میں حشر برپا کیے ہوئے تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ کسی نے وہاں انگارے سے بھر دیے ہوں۔

''بچھو...... وہ دیکھو بچھو ہے۔'' اسی پل ایک میل نرس چیخی اور بیڈ سے تیزی سے دیوار کی طرف جاتے بچھو کی طرف اشارہ کیا۔ فوراً ہی کوئی اسے مارنے کے لیے دوڑا۔

''مریض کو آئی سی یو میں شفٹ کرو۔ ہری اپ۔ اسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہے۔'' وہ اسٹاف کا ہی کوئی فرد تھا جسے اصل صورتِ حال کا اندازہ ہوا تھا اور اس نے چیخ کر یہ ہدایت جاری کی تھی۔ اس ہدایت کے جاری ہوتے ہی وہاں ایمرجنسی کی صورتِ حال پیدا ہوگئی۔ کسی نے فوراً ہی علیزہ کو تھامے بیٹھے سفیر کو ہٹا کر ایک طرف کیا اور لمحوں میں وہ آئی سی یو میں منتقل کر دی گئی۔ یہ پوری توجہ اور مہارت سے دیا گیا ٹریٹمنٹ تھا یا اللہ کی مہربانی کہ علیزہ کی زندگی بچالی گئی۔ اس جاں گسل وقت سے گزر کر پوری طرح ہوش میں آنے میں اسے بہت دیر لگی اور اسپتال کے عملے نے سکون کا سانس لیا کیونکہ اس عرصے میں سفیر نے ان کا ناک میں دم کر کے رکھ دیا تھا اور بُری طرح چیختا چلاتا رہا تھا کہ اسپتال میں بچھو آیا تو کہاں سے؟ اور اس سوال پر اسپتال انتظامیہ بغلیں جھانکنے پر مجبور تھی۔

سفیر کو بچھو کی دریافت کے فوراً بعد ہی یہ بات پتا چل گئی تھی کہ وہ ایک نہایت زہریلا بچھو تھا۔ اگر علیزہ کو فوری طبی امداد نہ ملتی تو اس کی موت بھی واقع ہو سکتی تھی۔ لوگوں کی

باتوں سے اسے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی تھی کہ اس سے قبل بھی دو تین بار اسپتال کے گارڈن میں بچھو دیکھے جا چکے ہیں لیکن خوش قسمتی سے کوئی حادثہ پیش نہیں آیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ نہ صرف بچھو نے گارڈن سے اسپتال کے ایک کمرے تک رسائی حاصل کر لی تھی بلکہ کسی مریضہ کو ڈنک بھی مار دیا تھا۔ سفیر انتظامیہ کو اس غفلت کے لیے ہرگز بھی بخشنے کے لیے تیار نہیں تھا اور اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اس معاملے کو عدالت میں لے جانے کے ساتھ ساتھ میڈیا پر بھی اٹھائے گا۔

میڈیا پر خبر آجانے کا مطلب تھا، اسپتال کی بدنامی اور مریضوں سے علاج کے نام پر ڈھیروں روپیہ بٹورنے والا وہ مہنگا اسپتال اس بدنامی کو افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ انہوں نے بدنامی سے بچنے کے لیے سفیر سے مذاکرات شروع کیے اور آخرکار معاملہ ان دو شرائط پر آکر طے پایا کہ اول اسپتال انتظامیہ سنجیدگی سے گارڈن سے نکلنے والے بچھوؤں کے سدِباب کے لیے اقدامات کرے گی۔ دوم علیزہ کے علاج پر ہونے والے کُل اخراجات معاف کرنے کے علاوہ انتظامیہ کی طرف سے اسے پہنچنے والی تکلیف کا ہرجانہ بھی ادا کیا جائے گا۔ علیزہ کو ان باتوں کا علم تھا لیکن اس نے سارا معاملہ سفیر پر ہی چھوڑ رکھا تھا۔ ہرجانے کی رقم بھی اس نے سفیر کے حوالے کر دی تھی۔ سفیر اس پر اس کی ضروریات سے بہت زیادہ خرچ کرتا تھا اور اسے کسی ایسی چیز کی حاجت نہیں تھی جس کے لیے رقم کی ضرورت ہوتی۔ وہ تو اسی پر خوش تھی کہ اللہ نے اس کی زندگی بچا لی۔ ان دنوں یوں بھی اسے کوئی شے زندگی سے زیادہ پیاری نہیں لگتی تھی کیونکہ اس زندگی میں سفیر اس کا ساتھی تھا اور سفیر کی محبت اس کے لیے ہفت اقلیم سے بڑھ کر تھی۔ وہ اس کے ساتھ اس قدر خوش تھی کہ ان دنوں زندگی میں در آنے والی تکلیفوں کو بھی خوش دلی سے برداشت کر رہی تھی۔ شاید یہ جینے کی بے پناہ امنگ ہی تھی جو ہر بار اسے موت کے منہ سے باہر نکال لاتی تھی اور وہ کسی کو بھی اپنے ابتر حالات سے آگاہ کرنے کے بجائے صرف خوشیوں کے قصے سنانے میں راحت محسوس کرتی تھی۔ سفیر کی محبت کے سائے میں اس کے لیے زندگی راحت ہی راحت تھی۔

☆☆☆

علیزہ کے ساتھ پیش آنے والے حادثات کی وجہ سے ان کا لاہور میں قیام طے شدہ مدت کے مقابلے میں بڑھ گیا تھا اور اس عرصے میں فرحین فون کر کر کے سفیر کی جان کھاتی رہی تھیں۔ انہیں شکایت تھی کہ اپنی بیوی کے ناز اٹھانے کے چکر میں وہ بزنس کی طرف سے بے پروائی برت رہا ہے۔ سفیر نے انہیں حالات سے آگاہ کر دیا تھا تب بھی وہ کچھ ماننے پر راضی نہیں تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ اس کی طبیعت مکمل ٹھیک ہونے سے قبل ہی واپس آگئے اور آتے کے ساتھ علیزہ نے سفیر کے ساتھ فیکٹری جوائن کر لی۔ فیکٹری جوائن کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ دوسری صورت میں اسے گھر پر رہ کر قیدِ تنہائی بھگتنی پڑتی جو کہ ایک تکلیف دہ امر تھا۔ سفیر اسے زیادہ میکے جانے کی اجازت بھی نہیں دیتا تھا کہ بقول اس کے اس کا علیزہ کے بغیر دل نہیں لگتا تھا چنانچہ اس کے پاس یہی چارہ رہ گیا تھا کہ وہ اپنی ملازمت پر واپس چلی جائے اور اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ ویسے بھی اب ملازمت کوئی ملازمت نہیں رہ گئی تھی۔ وہ سفیر سیٹھ کی بیوی تھی اور مالکن کی طرح حکم چلا سکتی تھی۔

اس نے اسٹاف میں سے ایک لڑکی کو اپنی مدد کے لیے مقرر کر لیا تھا اور وہ لڑکی اس کے حصے کا زیادہ تر کام نمٹا دیتی تھی۔ لڑکی سے کام لینا ایک طرح سے اس کی مجبوری بھی تھی کہ سر کی چوٹ نے اسے خاصا متاثر کیا تھا اور ذرا سا بھی زیادہ کام کرنے کی صورت میں اس کے سر میں درد ہونے لگتا تھا۔ دوسرا مسئلہ کمزوری کا بھی تھا۔ خون کی کمی کے باعث وہ پہلے جتنی مستعد اور فعال نہیں رہی تھی اور وقت بے وقت اسے چکر آنے لگتے تھے۔ سفیر اگرچہ آج کل خاصا مصروف رہنے لگا تھا پھر بھی اس کا خیال رکھنے کی کوشش کرتا تھا اور اکثر اسے کھانے پینے اور آرام سے متعلق ہدایات دیتا رہتا تھا۔ علیزہ ان دونوں ہدایات پر عمل نہیں کر پاتی تھی کہ کھانے پینے کی وہ شروع ہی سے چور تھی اور آرام کا موقع کم ہی ملتا تھا۔ دن بھر فیکٹری اور پھر شام و رات میں سفیر کے ساتھ مصروف رہنے کی وجہ سے اس کے پاس بھرپور آرام کرنے کی فرصت نہیں ہوتی تھی۔ وہ ذرا تھکی تھکی سی نظر آتی تھی۔ آج بھی اس کی ایسی ہی کیفیت تھی۔ سفیر نے اسے رات بہت دیر تک جگائے رکھا تھا اور وہ ادھوری نیند کے ساتھ فیکٹری آگئی تھی چنانچہ اپنی مددگار لڑکی کو چند ہدایات دے کر اس چھوٹے سے کمرے میں آگئی تھی جہاں آرام دہ بیڈ اور دوسری چند سہولیات کے ساتھ کوئی شخص چند گھنٹے آرام کر سکتا تھا۔

سفیر نے اسے بتایا تھا کہ اس کے والد کاروبار کو بہت

وقت اور توجہ دیتے تھے اور ضرورت محسوس ہونے پر کبھی کبھار رات فیکٹری میں بھی رک جاتے تھے اسی لیے انہوں نے وہاں یہ کمرا بنا رکھا تھا۔ علیزہ نے کمرے کا دروازہ بند کر کے اسے سی کھولا اور نرم بستر پر گر سی گئی۔ کمرا ساؤنڈ پروف ہونے کی وجہ سے یہاں فیکٹری کا شور محسوس نہیں ہو رہا تھا اور بڑا پُرسکون سا ماحول تھا۔ جلد ہی وہ نیند کی وادی میں اتر گئی۔ سوتے ہوئے اسے لگا بھی کہ شاید کوئی کمرے میں آیا ہے لیکن اس نے نیند کے غلبے کے باعث اپنے اس احساس کو اہمیت نہیں دی اور مزے سے سوتی رہی۔ نیند کی اس کیفیت سے اسے دم گھٹنے کے احساس نے نکالا۔ وہ گھبرا کر بستر پر اٹھ بیٹھی۔ کوئی تیز بُو تھی جو اس کے نتھنوں اور حلق میں گھسی جا رہی تھی اور اسے سانس لینا مشکل ہو گیا تھا۔ گہری نیند سے جاگنے کے باعث اس کے حواس یوں بھی پوری طرح چوکس نہیں تھے۔ اوپر سے اس بُو نے اس کی مت مار دی تھی جس کی وجہ سے وہ سانس بھی نہیں لے پا رہی تھی۔ صاف ہوا میں سانس لینے کی شدید خواہش و ضرورت کے تحت وہ کسی نہ کسی طرح بستر سے اتر کر دروازے کی طرف لپکی اور اس کا لاک کھولنے کی کوشش کی لیکن اسے اپنی اس کوشش میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ دو تین بار کوشش کرنے پر بھی ناکامی کا منہ دیکھنے پر اس نے دیوانہ وار دروازہ پیٹنا شروع کر دیا لیکن یہ ترکیب بھی بیکار گئی کہ ساؤنڈ پروف کمرے سے کوئی آواز باہر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ تھوڑی بہت آواز باہر نکلتی بھی تو اسے کون سنتا کہ اس ریٹائرنگ روم کا دروازہ سفیر کے دفتر میں کھلتا تھا اور سفیر اپنے دفتر میں موجود نہیں تھا۔ سفیر کا دفتر بھی ساؤنڈ پروف تھا اور یہ بہت مشکل بات تھی کہ اس کے دروازہ پیٹنے کی آوازیں دفتر سے نکل کر سیکریٹری کے لیے مخصوص کمرے تک پہنچ پاتیں۔

ایک تو حواس کو مختل کرتی بُو اس پر یہاں قید ہو جانے کی ٹینشن...... ان دونوں عوامل نے مل کر بہت تیزی سے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا اور اس کی استھما کی تکلیف بڑی شدت سے حملہ آور ہو گئی۔ کسی بیرونی مدد کی طرف سے مایوس ہو کر اس نے اپنے ہینڈ بیگ کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ اس کے خیال کے مطابق اس نے بیگ بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھا تھا لیکن اب وہاں اسے کوئی بیگ نظر نہیں آ رہا تھا۔ بیگ میں اس کا موبائل اور اِن ہیلر دونوں موجود تھے اور اسے اپنی جان بچانے کے لیے ان دونوں چیزوں کی اشد ضرورت تھی لیکن بیگ ہی موجود نہیں تھا تو وہ کیا کرتی۔ لحظہ بہ لحظہ اکھڑتی سانسیں اسے مزید گھبراہٹ میں مبتلا کر رہی تھیں۔ یہ جان بچانے کی جبلی خواہش تھی یا اس کی زبردست قوتِ ارادی کہ ان حالات میں بھی اسے ایک راہ دکھائی دے ہی گئی۔ اس نے اپنی تمام تر توانائی کو یکجا کیا اور وہاں رکھی لکڑی کی ایک مضبوط کرسی کو اٹھا کر پوری قوت سے شیشے کی کھڑکی پر دے مارا۔ پہلی ضرب ہی اتنی زبردست تھی کہ شیشہ ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ ٹوٹے ہوئے شیشے سے وہ باہر نہیں نکل سکتی تھی کہ دوسری طرف لوہے کی مضبوط گرل لگی ہوئی تھی لیکن شیشہ ٹوٹنے کے دو فائدے ہوئے تھے۔ پہلا یہ کہ تازہ ہوا... اندر آنے لگی تھی جس سے اسے سانس لینے میں تھوڑی سی مدد ملی تھی دوسرے شیشہ ٹوٹنے کی آواز کی وجہ سے پارکنگ میں کھڑی گاڑیاں صاف کرتے ایک شخص کی توجہ اس طرف مبذول ہو گئی۔ وہ شخص دوڑ کر کھڑکی کے قریب آیا تو کھینچ کھینچ کر سانس لینے کی کوشش کرتی علیزہ تو کچھ نہیں کہہ سکی لیکن اس شخص کو صورتِ حال کا اندازہ ہو گیا اور وہ تیزی سے حرکت میں آگیا۔ فوری طور پر کمرے کے خراب ہو جانے والے لاک کو توڑ کر علیزہ کو باہر نکالا گیا۔ اس کا ہینڈ بیگ سفیر کے دفتر میں سامنے میز پر ہی پڑا ہوا تھا۔ اس کی مددگار لڑکی نے بیگ سے اِن ہیلر نکال کر اسے فوری طبی امداد دینے کی کوشش کی اور ساتھ ہی اسے اسپتال منتقل کرنے کا انتظام بھی کیا جانے لگا۔ سفیر کو جب اس واقعے کی اطلاع دی گئی تو وہ اسپتال روانہ کی جا چکی تھی۔ وہ سیدھا اسپتال پہنچا۔ علیزہ آئی سی یو میں تھی اور زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی تھی۔ بے چین و بے قرار سفیر جلے پیر کی بلی کی طرح آئی سی یو کے سامنے ٹہلتا رہا۔ اندر سے جب بھی کوئی اسٹاف ممبر باہر نکلتا وہ اسے روک کر بے تابی سے علیزہ کے بارے میں پوچھتا۔ علیزہ کے گھر والوں کو بھی اس واقعے کی اطلاع مل گئی تھی اور وہ لوگ بھی اسپتال پہنچ گئے تھے۔ ان لوگوں کے سوالات کے جواب میں سفیر نے انہیں بتایا۔

''میں آج زیادہ تر وقت فیکٹری سے باہر ہی رہا۔ تھوڑی دیر کے لیے ایک فائل لینے کے لیے اپنے آفس آیا تو پتا چلا علیزہ اندر ریٹائرنگ روم میں آرام کر رہی ہے میں نے اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا اور جو فائل لینے آیا تھا، اسے لے کر دوبارہ فیکٹری سے نکل گیا۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ بات نہیں رہی تھی کہ ریٹائرنگ روم کے دروازے کا لاک کچھ مسئلہ کر رہا ہے اور یہ ذرا سی غفلت ہی

علیزہ کے لیے مصیبت بن گئی۔ وہاں بیڈ کے نیچے ایک کیمیکل کا ڈبا پتا نہیں کب سے پڑا ہوا تھا۔ شاید علیزہ ہی کا پیر وغیرہ لگنے سے ڈبا لڑھک گیا اور ڈھکن لوز ہونے پر کیمیکل باہر بہنے لگا۔ کیمیکل کی بُو بند کمرے میں علیزہ کے لیے بے حد مہلک ثابت ہوئی۔ بس آپ لوگ دعا کریں کہ وہ بچ جائے ورنہ میں خود کو کبھی بھی معاف نہیں کر سکوں گا۔'' اپنی بات کے اختتام پر سفیر رو پڑا۔

''حوصلے سے کام لو بیٹا! جو کچھ ہوا، وہ اتفاق تھا۔ تم نے دانستہ ایسا کچھ نہیں کیا جس پر تمہیں شرمندگی ہو۔ علیزہ انشاءاللہ جلد ٹھیک ہو جائے گی اور تم دونوں ایک بار پھر ایک ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزارو گے۔'' علیزہ کے والد جو خود بھی بے حد افسردہ اور پریشان دکھائی دے رہے تھے، اسے گلے لگا کر دلاسا دینے لگے۔

''اللہ آپ کی دعا قبول کرے لیکن میرے دل میں ڈر بیٹھ گیا ہے۔ کچھ سمجھ نہیں آتی کہ علیزہ کے ساتھ بار بار ایسے حادثات کیوں پیش آ رہے ہیں۔'' وہ بے حد مضمحل نظر آ رہا تھا۔

''سارا حاسدوں کی بدنظری کا کمال ہے بھیا! یہاں کوئی ہنسی خوشی رہے تو دنیا والوں سے برداشت نہیں ہوتا۔ علیزہ کی اتنی اچھی جگہ شادی ہونے سے تو بہت سوں کے سینے پر سانپ لوٹ گئے تھے کوئی بھروسا نہیں کہ کسی حاسد نے تعویذ گنڈے یا سفلی عمل ہی نہ کروا دیا ہو۔ میری مانو تو اپنا اور علیزہ کا صدقہ دو۔ صدقہ بہت سی بلاؤں کو ٹال دیتا ہے۔'' یہ علیزہ کی بھابی تھیں جو بڑے خلوص سے اسے مشورہ دے رہی تھیں۔ اسے ان کے مشورے پر عمل کرنا نہایت مناسب معلوم ہوا اور اسی وقت کسی کو فون کر کے صدقے کے بکرے لانے کے لیے ہدایات دینے لگا جس وقت اسے یہ اطلاع دی گئی کہ صدقے کے بکرے ذبح کیے جا چکے ہیں، اس سے اگلے ہی لمحے ڈاکٹر نے اسے علیزہ کی زندگی بچ جانے کی خبر سنائی۔

''میں نے کہا تھا نا کہ صدقہ بلاؤں کو ٹال دیتا ہے۔'' علیزہ کی بھابی نے فخر سے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ مسکرا دیا۔ مشکل ترین حالات میں بھی مسکراہٹ کو ہونٹوں سے جدا نہ ہونے دینا ہی تو اس کا سب سے بڑا فن تھا۔

☆☆☆

''کیسی ہو علیزہ؟'' علیزہ کی امی کے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا وہ اس کو محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ علیزہ اسپتال سے چھٹی ہونے کے بعد اپنے گھر والوں کے ساتھ میکے چلی گئی تھی اور سفیر اسے نہیں روک سکا تھا کیونکہ علیزہ کا موقف مضبوط تھا۔ اسے کچھ دن آرام اور ذہنی سکون کی ضرورت تھی اور یہ دونوں چیزیں بیک وقت اسے سسرال میں میسر نہیں آ سکتی تھیں۔ گھر پر رہ کر آرام کرتی تو سسرال والوں کی بے رخی اور بے حسی کڑھنے پر مجبور کر کے ذہنی سکون درہم برہم کرتی رہتی۔ ذہنی سکون کی خاطر سفیر کے ساتھ فیکٹری جاتی تو آرام سے محروم رہتی اس لیے بہتر یہی تھا کہ وہ کچھ دن اپنے میکے میں رک جائے۔ سفیر نے اس کے سامنے اس امر کا اظہار کیا تھا کہ اسے علیزہ کا میکے میں رہنا یا دوسرے الفاظ میں خود سے دور رہنا اچھا نہیں لگ رہا ہے لیکن علیزہ نے اسے سمجھا بجھا کر منا لیا تھا۔ ساتھ ہی یہ پیشکش بھی کی تھی کہ وہ جب چاہے اس سے ملنے آ سکتا ہے اس کے گھر والے اسے سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔ اس پیشکش کے جواب میں سفیر روزانہ تو نہیں لیکن ہر دوسرے تیسرے دن علیزہ کے میکے چکر لگا لیتا تھا جہاں اس کی خوب آؤ بھگت بھی کی جاتی تھی اور میاں بیوی کو تنہائی کا موقع بھی فراہم کر دیا جاتا تھا۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ سفیر کو نہایت پُرتکلف چائے پلوانے کے بعد سب ایک ایک کر کے کسی نہ کسی بہانے وہاں سے اٹھ گئے تھے۔ تنہائی ملتے ہی سفیر کو علیزہ سے کھل کر بات کرنے کا موقع مل جاتا تھا چنانچہ اب بھی اس نے اس کی خیریت پوچھتے پوچھتے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں لیکن مجھے آپ ٹھیک نہیں لگ رہے۔ آپ کا ہاتھ کافی گرم ہو رہا ہے، کہیں آپ کو بخار تو نہیں ہے۔'' علیزہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے تشویش سے پوچھا۔

''جس کی محبوب بیوی پورے پندرہ دن اس سے دور ہو وہ بھلا ٹھیک کیسے ہو سکتا ہے۔ تمہاری جدائی نے مجھے بہت اداس کر دیا ہے۔'' سفیر نے بڑی لگاوٹ سے وہی جواب دیا جس کی علیزہ اس سے توقع کر رہی تھی۔ وہ جب یہاں آتا تھا کسی نہ کسی بہانے اسے اپنے ساتھ چلنے کے لیے راضی کرنے کی کوشش کرتا تھا لیکن علیزہ محسوس کر رہی تھی کہ فی الحال اس کا میکے میں رہنا ہی مناسب ہے اس لیے ہر بار اسے ٹال دیتی تھی۔ سفیر کے ساتھ شادی کے بعد اسے پے در پے کئی حادثات کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن آخری پیش آنے والے واقعے نے تو گویا اسے مرجھا کر رکھ دیا تھا۔ وہ خود کو

اس فیز سے نکالنے کے لیے وقت لینے پر مجبور ہو گئی تھی لیکن سفیر کی حالت سے لگ رہا تھا کہ اب وہ اسے مزید وقت نہیں دے سکتا۔

''پندرہ دن کتنے طویل ہوتے ہیں، یہ میں نے زندگی میں پہلی بار جانا ہے۔ ان پندرہ دنوں کا ایک ایک لمحہ میں نے تمہیں بُری طرح مس کیا ہے۔ لگتا ہے کہ اب اگر میں مزید تم سے دور رہا تو مجھے کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔'' وہ صرف زبان سے ہی نہیں کہہ رہا تھا، اس کے چہرے کے تاثرات سے بھی ظاہر تھا کہ وہ بہت ڈسٹرب ہے۔

''ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟ مجھے لگتا ہے کہ بخار کی وجہ سے زیادہ پریشان ہیں۔'' علیزہ نے اسے ٹوکا۔

''یہ بخار وخار کچھ نہیں ہے۔ تم ساتھ ہوگی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' اس نے جواب دیا۔

''اگر ایسی بات ہے تو میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔ بس دو منٹ ٹھہریں، میں امی کو بتا کر آتی ہوں۔'' حسب توقع وہ اچھی بیویوں کی طرح اسے بیمار دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی۔ اس کی رضامندی پا کر سفیر پہلی بار کھل کر مسکرایا۔ وہ سچ مچ بہت ڈپریشن کا شکار تھا اور چاہتا تھا کہ علیزہ اس کے ساتھ گھر چلے۔ علیزہ راضی ہو گئی تھی تو وہ اپنے دل میں خوشی محسوس کر رہا تھا۔ علیزہ کے گھر والوں نے بھی میاں بیوی کے معاملے میں دخل نہیں دیا اور خوشی خوشی ان دونوں کو رخصت کر دیا۔ گھر پہنچ کر اس کا سب سے پہلے اپنی ساس سے سامنا ہوا لیکن وہ رخ موڑ کر نکل گئیں۔ انہیں اپنی یہ غریب بہو اتنی ناپسند تھی کہ انہوں نے اس عرصے میں ایک بار بھی اس کی خیریت دریافت کرنا پسند نہیں کیا تھا۔ اب بھی ان کا انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہی ہوں کہ تم جیو یا مرو مجھے تم سے کوئی مطلب نہیں ہے۔

''ماما کے سلوک کا بُرا مت ماننا۔ وہ ذرا ضدی مزاج کی ہیں۔ آج تک اس بات کو معاف نہیں کر سکی ہیں کہ میں نے ان کی امیر وکبیر بھانجی کو رد کر کے تم سے شادی کر لی۔'' سفیر نے اس کا ہاتھ تھام کر ہمیشہ کی طرح ماما کے سلوک کی وضاحت دی۔

''مجھے آپ کی ماما سے کوئی شکایت نہیں ہے سفیر! وہ... کم از کم منافقت کرنے والوں سے بہتر ہیں اور میرے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتی ہیں جیسے جذبات میرے لیے اپنے دل میں رکھتی ہیں۔'' علیزہ نے بڑی بُردباری سے اس کی بات کا جواب دیا۔

''اور یہ منافقت کرنے والے لوگ کون ہیں؟'' سفیر نے اس سے پوچھا۔

''آپ یہ ساری باتیں چھوڑیں اور مجھے بتائیں کہ آپ نے کوئی دوا وغیرہ بھی لی یا نہیں؟ آپ کو اچھا خاصا بخار ہے۔ میرے خیال میں تو آپ کو کسی ڈاکٹر سے چیک اپ کروانا چاہیے تھا۔'' علیزہ نے اس کا سوال ٹال کر اس سے اس کے متعلق بات کی۔

''ٹھیک ہو جاؤں گا یار! اکیلے رہ رہ کر ڈپریشن کا شکار ہو گیا تھا۔ اب تم آ گئی ہو تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' سفیر نے اس کے مشورے کو زیادہ اہمیت نہیں دی پھر بھی اس نے انٹرکام پر گھریلو ملازم کو حکم دیا کہ صاحب کو بہت تیز بخار ہو رہا ہے، ان کے لیے بخار کی گولیاں اور چائے لے آؤ۔ ملازم نے فوراً حکم کی تعمیل کر دی۔ علیزہ نے اصرار کر کے اسے دوا کھلائی اور آرام کا مشورہ دیا۔ اس کے مشورے پر سفیر آرام کرنے لیٹا ہی تھا کہ اس کا موبائل بجنے لگا۔ سفیر نے اسکرین پر آنے والا نمبر دیکھا تو اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی اور اس نے یوں کال ریسیو کی جیسے بہت مجبوری کی حالت میں ایسا کر رہا ہو۔

''ہیلو دلاور! کیسے ہو؟'' وہ بولا تو اس کے منہ سے آواز بھی مری مری سی نکلی۔

''بس کوشش کر رہا ہوں۔ جلد تمہاری رقم کا انتظام ہو جائے گا۔ تم مجھے تھوڑی سی مہلت اور دے دو۔'' سفیر نرم لہجے میں بات کرنے کا عادی تھا لیکن اتنے گھگیائے ہوئے انداز میں بات کرتا وہ اسے پہلی بار دیکھ رہی تھی۔

''دھمکیاں مت دو۔ میں نے کہا ہے نا کہ میں تمہاری رقم واپس کر دوں گا بس مجھے تھوڑی سی مہلت اور چاہیے۔'' علیزہ صرف ایک طرف کی گفتگو سن رہی تھی پھر بھی اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ کیا مسئلہ چل رہا ہے۔ سفیر نے مزید چند ایسے ہی جملوں کے تبادلے کے بعد فون بند کیا تو وہ اس سے کال کے بارے میں استفسار کرنے لگی۔

''میں نے جس بندے سے فیکٹری میں لگانے کے لیے رقم قرض لی تھی، اس کا فون تھا۔ اس کی دی ہوئی مہلت ختم ہو چکی ہے اور بار بار فون کر کے تقاضے کر رہا ہے لیکن میرے پاس کچھ ہے ہی نہیں تو کیا دوں؟'' اس نے اپنا سر تھام لیا۔

''بہتری کی کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔ آپ اتنی ٹینشن نہ لیں۔ مجھے لگتا ہے ٹینشن ہی کی وجہ سے آپ کی

طبیعت خراب ہو رہی ہے۔'' علیزہ نے اسے سمجھایا تو اس نے کوئی جواب دیے بغیر کروٹ بدل کر آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ یعنی پریشانی کچھ زیادہ ہی تھی۔ علیزہ نے بھی اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا اور کچھ سوچتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کا رخ اپنے دیور کے کمرے کی طرف تھا۔ دروازے پر دستک کے جواب میں اجازت ملنے پر وہ کمرے میں داخل ہوئی تو بصیر اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''آپ......'' حیرت کے اظہار میں وہ باقاعدہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

''آپ شاید اپنا کوئی اسائنمنٹ وغیرہ بنا رہے تھے لیکن مجھے بھی ایک بہت ضروری بات کرنی ہے اس لیے میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔'' علیزہ نے کمپیوٹر کی روشن اسکرین کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا۔

''نو پرابلم۔ آپ فرمائیے آپ کو مجھ سے کیا بات کرنی ہے۔'' بصیر نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اخلاق سے جواب دیا۔ لیکن حیران بہرحال وہ ابھی بھی نظر آ رہا تھا۔

''میں آپ سے یہ بات اس لیے کر رہی ہوں کہ آپ سفیر کے بھائی ہیں اور بہتر طور پر ان پرابلمز کو سمجھ سکتے ہیں جنہیں سفیر فیس کر رہے ہیں۔ یقیناً آپ کے علم میں ہوگا کہ بزنس کے حالات بہت خراب ہیں اور فیکٹری مسلسل نقصان میں جا رہی ہے۔ گرتی ہوئی ساکھ کو سنبھالا دینے کے لیے سفیر نے کسی سے قرض لیا تھا لیکن اس کا بھی فائدہ نہیں ہوا اور الٹا وہ قرض کے بوجھ تلے دب کر مزید پریشان ہو گئے ہیں۔ ان کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ شاید ڈپریشن کی وجہ سے تیز بخار ہو گیا ہے لیکن میرے کہنے کے باوجود وہ ڈاکٹر کے پاس نہیں گئے اور گھر پر ہی میڈیسن لے کر سو گئے ہیں۔ میرے لیے زیادہ تشویش کی بات یہ ہے کہ ابھی ان کے پاس کسی کا فون آیا تھا اور وہ شخص انہیں قرض کی رقم واپس نہ کرنے کی صورت میں سنگین نتائج بھگتنے کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ میں نے سوچا یہ سب آپ سے شیئر کروں تاکہ آپ اس کرائسس میں اپنے بھائی کے ساتھ کھڑے ہو کر انہیں کچھ حوصلہ دے سکیں۔'' وہ دھیمی آواز میں اسے سب کچھ بتاتی چلی گئی۔

''یہ صورت حال تو واقعی بہت پریشان کن ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں ان حالات میں کس طرح بھائی کی مدد کر سکتا ہوں۔ میں اسٹوڈنٹ ہوں اور اپنے اخراجات کے لیے ان ہی پر انحصار کرتا ہوں۔ مجھے بزنس کی سوجھ بوجھ بھی نہیں ہے اور غنڈے بدمعاشوں سے نمٹنے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتا۔'' بصیر نے حسب عادت صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

''یہ باتیں تو میں بھی سمجھتی ہوں لیکن آپ کم از کم اپنے بھائی کو مورل سپورٹ تو دے سکتے ہیں۔ اس سے آگے بڑھ کر کچھ کرنا چاہیں تو یہ بھی کر سکتے ہیں کہ ماما کو اس بات پر راضی کریں کہ وہ ثمین آنٹی اور سویرا سے بات کر کے ان لوگوں سے کچھ رقم قرض لے لیں۔ ناراضگی اپنی جگہ لیکن ماما کا ان سے خونی رشتہ ہے اور ماما بہن اور بھانجی سے اپنی پرابلم شیئر کریں گی تو ان کے دل نرم پڑ ہی جائیں گے۔'' اس نے بصیر کو مشورہ دیا۔

''ماما کبھی یہ بات نہیں مانیں گی۔ وہ ضدی مزاج کی ہیں اور سفیر بھائی ان کی بات نہ مان کر انہیں خود سے ناراض کر چکے ہیں۔'' بصیر نے سر کو نفی میں جنبش دیتے ہوئے اس کے مشورے سے اختلاف کیا۔

''میرے ذہن میں تو بس یہی ایک ترکیب تھی۔ اگر آپ اس مسئلے کا کوئی اور حل سوچ سکتے ہیں تو سوچیں بلکہ میرے خیال میں ماما سے بھی اس پریشانی کو شیئر کریں۔ میں سفیر کی طرف سے بہت اپ سیٹ ہوں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ ان حالات میں خود انہیں ہی کچھ نہ ہو جائے۔'' اس نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔

''اوکے، میں کوشش کرتا ہوں کہ ماما سے صبح اس سلسلے میں بات کروں۔'' بصیر بھی بھائی کی پریشانی کے بارے میں جان کر فطری طور پر پریشان ہو گیا تھا اس لیے اس نے علیزہ کو یقین دہانی کروائی۔ اس کی یقین دہانی کے بعد علیزہ قدرے مطمئن اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔ سفیر ابھی تک پہلے والے انداز میں ہی آنکھوں پر بازو رکھے سو رہا تھا۔ علیزہ بھی خاموشی سے بستر کے دوسرے سرے پر لیٹ گئی۔

☆☆☆

''تمہیں وہ رقم مجھے واپس کرنی ہوگی علیزہ! اس رقم پر تمہارا کوئی حق نہیں ہے اور میں اتنی آسانی سے تمہیں اتنی بڑی رقم ہرگز بھی ہڑپ نہیں کرنے دوں گی۔'' فرحین منہ سے کف اڑاتی اس کے سامنے کھڑی تھیں اور بہت کڑے لہجے میں اس سے بات کر رہی تھیں۔

''اگر میرا اس رقم پر حق نہیں ہوتا تو وہ مجھے ملتی ہی کیوں؟ سفیر نے خود مجھے یہ حق دیا تھا اور آپ اچھی طرح

جانتی ہیں کہ قانوناً آپ ایسا کوئی حق نہیں رکھتیں کہ مجھ سے اس رقم کا معمولی سا حصہ بھی حاصل کر سکیں۔'' علیزہ کا لہجہ ان کے مقابلے میں بہت نرم تھا۔ گفتگو کا یہ انداز اس نے سفیر سے ہی سیکھا تھا جو بُرے حالات میں بھی اپنے لہجے کو بگڑنے نہیں دیتا تھا یا دوسرے الفاظ میں اسے یہ صلاحیت حاصل تھی کہ حالات کے مطابق جس لب و لہجے میں چاہے، گفتگو کر سکے۔

''زیادہ اسمارٹ بننے کی کوشش مت کرو۔ تم نے اگر وہ رقم میرے حوالے نہیں کی تو تمہیں اس کے سنگین نتائج بھگتنے پڑیں گے۔'' اس کے اتنے اطمینان سے جواب دینے پر فرحین کو آگ لگ گئی اور وہ حلق کے بل غرائیں۔

''میرے خیال میں مجھے پولیس اسٹیشن میں رپورٹ کروانی پڑے گی کہ مجھے آپ سے اپنی جان کا خطرہ ہے۔ آپ مسلسل مجھے دھمکیاں دے کر ہراساں کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔'' اس کا لہجہ نرم ہی رہا لیکن آنکھوں سے ایسی سختی جھلکی کہ فرحین جیسی دبنگ خاتون نے بھی اپنے وجود میں سنسناہٹ سی محسوس کی اور وہ خود بخود اپنا لہجہ بدلنے پر مجبور ہو گئیں۔

''تم جانتی ہو علیزہ کہ اس وقت ہمیں اس رقم کی کتنی زیادہ ضرورت ہے۔ سفیر نے جس شخص سے قرض لیا تھا، وہ بہت خطرناک آدمی ہے اور ان حالات میں بھی ہمارے ساتھ کوئی رعایت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس نے مجھ سے صاف کہہ دیا ہے کہ اگر ہم نے فوری طور پر اس کی رقم واپس نہیں کی تو وہ انتقاماً میرے بچوں کو بھی قتل کر سکتا ہے۔'' ان کا لہجہ قدرے ملتجیانہ ہو چلا تھا۔ ایک پل کو علیزہ کا دل بھی نرم پڑا لیکن پھر اس نے خود پر سخت خول چڑھایا اور بے نیازی سے بولی۔

''یہ آپ کا مسئلہ ہے کہ آپ اس شخص سے کیسے نمٹتی ہیں۔ میں زیادہ سے زیادہ آپ کو یہ مشورہ دے سکتی ہوں کہ فیکٹری اور کوٹھی سیل کر کے قرض کی رقم واپس کر دیں کیونکہ جان ہے تو جہان ہے اور ایک ماں کو ہر شے سے بڑھ کر اپنی اولاد کی فکر ہونی چاہیے۔ بصیر کی تعلیم مکمل ہونے والی ہے۔ تعلیم مکمل کر کے اسے کسی مناسب جگہ جاب مل جائے گی۔ آپ کوئی فلیٹ یا چھوٹا سا گھر کرائے پر لے کر وہاں رہ لیجیے گا۔ تین افراد کے لیے کوئی بہت زیادہ جگہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ اپنی پچھلی زندگی کی عیاشیوں کو بھول کر حالات سے کمپرومائز کرنے کی کوشش کریں گی تو بصیر کی تنخواہ میں گھر چلانا سیکھ ہی جائیں گی۔'' وہ جوں جوں بول رہی تھی، فرحین کا چہرہ سرخ سے سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ آخرکار وہ پھٹ پڑیں اور چیخ کر بولیں۔

''تم نہایت کمینی اور ذلیل عورت ہو۔ میرا بیٹا بے وقوف تھا جو تم جیسے نیچ خاندان کی لڑکی سے ناتا جوڑ بیٹھا اور آج ہم اس کی اس غلطی کو بھگت رہے ہیں۔''

''آپ کا بیٹا کیسا تھا، یہ مجھ سے بڑھ کر کوئی نہیں جانتا لیکن فی الحال آپ اس بات کو سمجھیں کہ آپ اس وقت میرے گھر میں کھڑی ہیں اور میں آپ کو ہرگز بھی اجازت نہیں دے سکتی کہ آپ میرے ساتھ اس لہجے اور الفاظ میں گفتگو کریں۔'' علیزہ کے چہرے پر سختی چھا گئی اور اس نے انگلی اٹھا کر انہیں تنبیہ کی۔

''میرا جو دل چاہے گا، میں بولوں گی۔ تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔'' فرحین کی حالت سے لگتا تھا کہ شدید غصے میں وہ اپنا ذہنی توازن کھونے لگی ہیں۔

''میں فوری طور پر دو کام کر سکتی ہوں۔ اول یہ کہ پولیس کو فون کروں اور بتاؤں کہ ایک عورت میرے گھر میں گھس کر مجھے ہراساں کرنے اور لوٹنے کی کوشش کر رہی ہے ایسی صورت میں آپ گرفتار ہو کر تھانے پہنچ سکتی ہیں۔ میرے پاس دوسرا آسان حل یہ بھی ہے کہ میں دروازے تک جا کر اپنے محلے والوں کو آواز لگاؤں اور ان سے درخواست کروں کہ اس بدتمیز عورت کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیں۔ ہمارے جیسے محلوں کے لوگ بلا جھجک ایک دوسرے کی ہر طرح کی مدد کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں اس لیے کوئی میری بات نہیں ٹالے گا۔ اب آپ بتائیں کہ آپ اپنی بے عزتی کروانے کا کونسا طریقہ پسند فرمائیں گی؟'' اس بار علیزہ کے لہجے میں ایسی کاٹ تھی کہ فرحین کو وہاں سے چلا جانا ہی مناسب لگا اور وہ بکتی جھکتی اسے مغلظات بکتی باہر نکل گئیں۔

''یہ تم نے خود کو کس جنجال میں پھنسا لیا ہے علیزہ بیٹا! مجھے تو ان خاتون سے ڈر لگ رہا ہے۔'' ڈرائنگ روم کے دروازے کے ساتھ لگ کر ساری گفتگو سنتی علیزہ کی امی ان کے جاتے ہی اندر آ گئیں اور اس کے سامنے اپنی پریشانی کا اظہار کرنے لگیں۔

''وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں امی! وہ صرف اپنی جھنجلاہٹ نکال رہی تھیں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔'' علیزہ نے انہیں تسلی دی اور ڈرائنگ روم سے نکل کر اپنے کمرے

میں چلی گئی جو شادی سے پہلے..... اس کے اور اس کی بہن کے لیے مخصوص تھا۔ بہن اس وقت کالج گئی ہوئی تھی اس لیے اس نے اطمینان سے اپنا موبائل نکالا اور ایک نمبر ڈائل کیا۔ فوراً ہی اس کی کال ریسیو کر لی گئی۔

''آپ کے پاس بینک سے میسج آگیا ہوگا جمال بھائی۔ میں نے رقم آپ کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دی ہے۔ امید ہے اتنی بڑی رقم پا کر آپ جو کچھ ہوا اسے آسانی سے بھول جائیں گے۔'' اس نے کسی تمہید کے بغیر وہ کہنا شروع کر دیا جو کہنے کے لیے فون کیا تھا۔

''مجھے یہ سب بالکل بھی اچھا نہیں لگا علیزہ! میں اس معاملے میں خود کو مجرم محسوس کر رہا ہوں۔'' جمال نے دھیمی آواز میں اپنے احساسات کا اظہار کیا۔

''میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا جمال بھائی۔ جو کچھ ہوا وہ شاید اسی طرح ہونا طے تھا۔ آپ ٹینشن مت لیں اور لائف انجوائے کریں۔'' اس نے انہیں مشورہ دیا اور یہ کہہ کر سلسلہ منقطع کرنے کے بعد آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ آئینے میں نظر آنے والے اس کے نین نقش وہی تھے لیکن وہ..... اس علیزہ سے بالکل مختلف دکھائی دے رہی تھی جو چند ماہ قبل سفیر کمیل کی زندگی میں شامل ہوئی تھی۔ علیزہ احسان سے علیزہ سفیر اور پھر سفیر کمیل کی بیوہ بننے تک وہ بہت تیزی سے بہت سی تبدیلیوں سے گزری تھی اور اس کے لیے خود اپنا وجود اجنبی ہو گیا تھا۔ شاید ایسا ہر اس شخص کے ساتھ ہوتا ہے جو محبت کے نام پر دھوکے کی تکلیف سے گزرتا ہے۔ ہاں یہ ایک کڑوا سچ تھا۔ سفیر نے اسے محبت کے نام پر دھوکا دیا تھا۔ حقیقت میں وہ ویسا انسان تھا ہی نہیں جیسا کہ بظاہر نظر آتا تھا۔ اسے انسانوں کو اپنی ضرورت کے حساب سے استعمال کرنے کی عادت تھی اور ایسا اس نے علیزہ سمیت بہت سے لوگوں کے ساتھ کیا تھا۔ علیزہ سے اس کی شادی کی وجہ وہی بیمہ پالیسی تھی جس پر علیزہ نے پہلی بار ہی شک کا اظہار کیا تھا لیکن سفیر نے بہت چالاکی سے اسے قائل کر لیا تھا کہ وہ غلط زاویے سے سوچ رہی ہے لیکن وہ غلط نہیں سوچ رہی تھی۔ سفیر نے اس کی استھما کی بیماری سے فائدہ اٹھانے کا سوچ کر ہی اس سے شادی کی تھی۔ شاید وہ سمجھتا تھا کہ اس طرح کے مرض کا شکار لڑکی کی موت کو حادثاتی رنگ دینا آسان رہے گا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے سویرا کے گھر سوئمنگ پول پر پیش آنے والے حادثے کے بعد سویرا سے لڑنے جھگڑنے میں وقت برباد کرنے کی کوشش کی تھی کہ تاخیر سے اسپتال لے جانے کی صورت میں علیزہ کی زندگی بچنے کے امکانات کم سے کم ہو جائیں لیکن سویرا نے اس کی یہ کوشش ناکام بنا دی تھی اور سفیر کو مجبور کیا تھا کہ وہ جلد از جلد علیزہ کو اسپتال لے جائے۔

علیزہ کے اسپتال سے آنے کے بعد وہ ایک بار اس سے ملنے بھی آئی تھی اور اس نے اسے بہت عجیب بات بتائی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ ملازمین کو سوئمنگ پول کے اس کنارے پر جہاں وہ اور سفیر ٹہل رہے تھے، تیل گرا ہوا ملا تھا اور قوی امکان تھا کہ اس تیل پر پیر پھسلنے کے باعث ہی علیزہ سوئمنگ پول میں گر گئی تھی۔ وہاں تیل کس نے گرایا تھا یہ سویرا نہیں بتا سکی تھی لیکن اس نے اتنا ضرور کہا تھا کہ میں سازشی ذہن کی لڑکی نہیں ہوں۔ مجھے جس کے خلاف جو کرنا ہو، کھل کر کرتی ہوں اس لیے تم یہ خیال دل سے نکال دو کہ میں نے تمہیں سوئمنگ پول میں ڈبو کر مارنے کی کوشش کی ہوگی۔

اس وقت علیزہ نے اس کی وضاحت کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ ہاں اتنا ضرور ہوا تھا کہ اس ہفتے سفیر کے کپڑے لانڈری کے لیے دیتے ہوئے وہ اس کی پینٹ پر جیب کے قریب تیل کے دھبے دیکھ کر ذرا چونک گئی تھی لیکن شک اس لیے نہیں کر سکی تھی کہ ان دنوں سفیر اس پر اپنی بے تحاشا محبت لٹا رہا تھا۔ لاہور میں پیش آنے والے ٹریفک حادثے کو بھی اس نے ایک اتفاق کے کھاتے میں ڈال دیا تھا لیکن اسے سفیر کی بے پروائی عجیب لگی تھی کہ وہ اسے اپنے ساتھ آنے کا کہہ کر خود تیزی سے بھاگ کر سڑک کراس کر گیا تھا اور وہ اس پر اندھے اعتماد کے باعث اس کے پیچھے یوں چل پڑی تھی کہ اس نے سڑک پر آتی تیز رفتار جیپ کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ اس حادثے کے بعد بھی سفیر نے اسے فوری طور پر اسپتال لے جانے کی کوشش کرنے کے بجائے جیپ ڈرائیور سے مارکٹائی کرنے میں وقت ضائع کرنے کو ترجیح دی تھی لیکن وہ ایک بار پھر خوش نصیب ثابت ہوئی تھی کہ پولیس کی موقع پر آمد اور ایمبولینس کے بروقت انتظام کے باعث اسپتال پہنچا دی گئی اور ایک بار پھر زندگی کی بازی جیت گئی۔ اس وقت بھی سفیر نے اس کا بہت خیال رکھا اور اس پر یوں ظاہر کیا کہ اس کے لیے اس سے بڑھ کر کچھ بھی قیمتی نہیں ہے۔ اسپتال میں ہی بچھو والا واقعہ پیش آیا وہ بھی یقیناً سفیر کی پلاننگ تھی لیکن وہ پھر دھوکا کھا گئی اور اب جانا کہ وہ واقعی اس کے لیے قیمتی تھی لیکن زندہ کے بجائے مردہ حالت میں تاکہ وہ اس کی بیمہ پالیسی کی خطیر رقم حاصل کر

سکے۔ اس نے جو قرض لیا تھا، اس کی ادائیگی کے لیے اسے رقم کی اشد ضرورت تھی اسی لیے اس نے زیادہ جلدی اور قدرے بے احتیاطی سے کیا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ جب وہ ریٹائرنگ روم میں سو رہی تھی تو اس نے وہاں کسی کی آمد کو محسوس کیا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس تک وہ خوشبو بھی پہنچی تھی جو سفیر استعمال کرتا تھا لیکن اس وقت وہ نیند کے غلبے میں تھی اس لیے آنکھ کھول کر نہیں دیکھ سکی تھی اور یہ ذرا سی کاہلی اسے موت کے دہانے تک لے گئی تھی۔ تیز بو والے کیمیکل کے ڈبے کا لڑھکنا، اس کے پرس کا ریٹائرنگ روم سے ہٹ کر سفیر کے آفس کی میز پر پایا جانا اور لاک کا خراب ہونا محض اتفاقات نہیں تھے بلکہ سفیر نے صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ لاک کے خراب ہونے اور کیمیکل کے ڈبے کے لڑھکنے کو وہ اتفاق مان بھی لیتی لیکن اپنے پرس کے بارے میں اسے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ اسے اپنے ساتھ ہی روم میں لے گئی تھی اور پرس کو وہاں سے صرف اس لیے ہٹا دیا گیا تھا کہ دم گھٹنے کی صورت میں نہ تو وہ اِن ہیلر استعمال کر سکے اور نہ ہی موبائل فون استعمال کر کے کسی کو اپنی مدد کے لیے بلا سکے۔

اس حادثے کے بعد اس نے اپنے دل میں پہلی بار سفیر کے خلاف مضبوط شک کو محسوس کیا تھا اسی لیے اسپتال سے فارغ ہونے کے بعد اس کے ساتھ جانے کے بجائے اپنے میکے چلی گئی تھی۔ میکے میں قیام کے عرصے میں اس نے آفس میں اپنی مددگار کے طور پر کام کرنے والی لڑکی سے ملاقات کی تھی اور اس سے یہ بات اگلوانے میں کامیاب ہو گئی تھی کہ اگرچہ سفیر نے بہانے سے اسے اس کی سیٹ سے ہٹا کر باہر بھیج دیا تھا لیکن وہ دیکھ چکی تھی کہ سفیر کیمیکل کا ڈبا اندر لے گیا ہے۔ اس نے علیزہ سے التجا کی تھی کہ اس نے یہ بات صرف انسانیت کے ناتے اسے بتائی ہے لیکن وہ اس پر رحم کرے اور سفیر کے علم میں کبھی نہ آنے دے کہ علیزہ کو یہ بات اس سے معلوم ہوئی ہے۔ اس صورت میں وہ سفیر کے انتقام کا نشانہ بھی بن سکتی تھی۔ اسی موقع پر اس نے علیزہ کو یہ بات بھی بتائی تھی کہ رشید نامی جس شخص نے اسے اور سائرہ کو یرغمال بنا کر اپنی رقم حاصل کرنے کی کوشش کی تھی، اس کو سفیر نے اس کی کسی غلطی کے بجائے اس وجہ سے ملازمت سے فارغ کیا تھا کہ رشید کھلے عام یہ بات کہتا پھرتا تھا کہ اس فیکٹری میں پروڈکٹس کی تیاری کے لیے جو کیمیکل استعمال کیا جارہا ہے، وہ ممنوع ہے اور پروڈکٹ تیار کرنے والے ورکرز کی صحت کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ بعد میں رشید اپنے حالات سے پریشان ہو کر ایک غلط حرکت کر بیٹھا تھا لیکن سفیر نے اسے اپنی چالاکی کے باعث بُری طرح پھنسا دیا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی بیوی کو بھی اپنا بیان دینے پر مجبور کر دیا تھا کہ رشید رشوت میں ملوث ہو گیا تھا۔ سفیر کی طرف سے تعلقات اور رشوت کے استعمال نے رشید کی مشکلات کو مزید بڑھا دیا تھا اور وہ بے چارہ اتنے مہینے گزر جانے کے بعد بھی ہنوز سلاخوں کے پیچھے تھا اور اس کے بیوی بچے بے حال ہو رہے تھے۔

وہ لڑکی نہیں چاہتی تھی کہ علیزہ کو ایک سچ بتانے کی صورت میں اسے بھی رشید جیسی کسی صورتِ حال سے گزرنا پڑے اس لیے اس نے علیزہ سے اپنا نام سامنے نہ لانے کی خصوصی درخواست کی تھی۔ علیزہ نے اسے مکمل یقین دہانی کروائی تھی کہ اس پر کوئی آنچ نہیں آنے دے گی۔ اس ملاقات کے بعد اس کے ذہن سے سارے شکوک و شبہات دور ہو گئے تھے۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ سفیر کی بیوی کی حیثیت سے اس کی زندگی مسلسل خطرے میں ہے۔ یہ ضروری بھی نہیں کہ ہر بار وہ اپنی خوش قسمتی کے باعث بچ جائے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ اس رشتے کو ختم کرنے کے لیے کسی کے سامنے کوئی جواز نہیں پیش کر سکتی تھی نہ ہی اس میں اتنا حوصلہ تھا کہ وہ چند ماہ بعد ہی اپنی شادی ختم کر کے ان لوگوں کو خود پر ہنسنے کا موقع دیتی جو اب تک اس کی خوش قسمتی پر حسد میں مبتلا تھے۔ اس حسد میں اس کے کردار پر انگلیاں اٹھانے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ معاشرے کے جس طبقے سے تعلق رکھتی ہے، وہاں طلاق یافتہ عورت کو کن نظروں سے دیکھا جاتا ہے اور کس کس طرح ایسی عورت کی کردار کشی کی جاتی ہے۔ اسے زندگی میں اپنے لیے ابتری اور قابلِ رحم کردار قبول نہیں تھا چنانچہ وہ اس مسئلے کا حل سوچنے لگی اور جلد ہی اس کے ذہن میں اپنے کزن جمال بھائی کا نام آگیا۔ جمال بھائی حیاتیات کے شعبے سے تعلق رکھتے تھے اور ایک ایسے ادارے میں ملازمت کرتے تھے جہاں مختلف مائیکروبس وغیرہ پر ریسرچ کی جاتی تھی۔ اس حوالے سے وہ علیزہ کو بعض دلچسپ باتیں بھی بتاتے رہتے تھے۔ علیزہ کو یاد تھا کہ انہوں نے ایک ایسے جرثومے کا ذکر کیا تھا جو اگر انسانی جسم میں داخل ہو جائے تو اپنی لائف سائیکل مکمل کر کے سیدھا انسان کے اعصابی نظام پر حملہ کرتا ہے اور واقع ہونے والی موت کو برین ہیمرج کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے۔ وہ

جانتی تھی کہ جمال بھائی اسے پسند کرتے تھے اور بہت سے لوگوں کی طرح اس کے امیدوار تھے اس لیے اس نے ان کے جذبات سے فائدہ اٹھانے کی ٹھانی اور اپنے ساتھ سفیر کے مظالم کی داستان سنا کر انہیں اس بات پر راضی کرلیا کہ وہ ایسے شخص سے نجات حاصل کرنے میں اس کی مدد کریں۔ ان کی طرف سے ملنے والے طلاق کے مشورے کو اس نے یہ کہہ کر رد کر دیا تھا کہ اول تو سفیر جیسے بااختیار و دولت مند شخص سے طلاق لینا کوئی آسان بات نہیں دوسرے اگر وہ طلاق لینے میں کامیاب ہو بھی گئی تو اس کے انتقام کا نشانہ بن جائے گی۔ سفیر سے کوئی بعید نہیں تھی کہ وہ اسے قتل کروا دیتا یا اس کے منہ پر تیزاب پھنکوا کر کسی لائق نہیں رہنے دیتا۔

آخر کار جمال بھائی اس کے ساتھ تعاون پر راضی ہو گئے اور لیبارٹری سے مخصوص جرثومے لا کر اس کے حوالے کر دیے تھے۔ مشروب کے ذریعے ان جرثوموں کی سفیر کے جسم میں منتقلی علیزہ کے لیے ذرا بھی دشوار ثابت نہیں ہوئی تھی۔ حسب توقع ایک ہفتے بعد ہی سفیر کے اندر وہ علامات بھی ظاہر ہو گئی تھیں جن کا جمال بھائی نے اس سے ذکر کیا تھا۔ اس موقع پر اس نے سفیر کے ساتھ اس کے گھر جانے میں کوئی حرج نہیں سمجھا تھا اور وہاں جا کر بصیر سے خصوصیت سے وہ گفتگو کی تھی جس سے ظاہر ہوتا کہ سفیر ان دنوں زبردست اعصابی دباؤ کا شکار ہے۔ اس کی یہ گفتگو بہت کارگر ثابت ہوئی تھی۔ اگلے دن جب سفیر دماغ کی رگ پھٹ جانے کے باعث موت کا شکار ہو گیا تھا تو یہی سمجھا گیا تھا کہ شدید ذہنی دباؤ نے اسے اس انجام تک پہنچایا ہے۔ اس موقع پر علیزہ کو ایک نوجوان بیوہ کا کردار ادا کرنے کے لیے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی تھی کہ اسے سچ مچ صدمہ پہنچا تھا۔ وہ یہ سوچ کر سہم گئی تھی کہ اس نے ایک انسان کو قتل کر دیا ہے۔ بے شک اس نے یہ قتل سیلف ڈیفنس میں کیا تھا لیکن قتل تو بہر حال قتل تھا اور اپنے قاتل ہونے کے احساس نے اس کی حالت ابتر کر دی تھی۔

اس کی ساس فرحین کو اس کی ابتر حالت پر بھی رحم نہیں آیا تھا۔ وہ جاہل عورتوں کی طرح اپنے بیٹے کی موت کا ذمے دار اسے ٹھہراتی رہی تھیں۔ علیزہ کو ان کے اس الزام پر بھی اعتراض نہیں تھا کہ کوئی جانے نہ جانے وہ جانتی تھی کہ یہ الزام ایک طرح سے درست ہی ہے لیکن اس کی ساس نے انتہا کر دی تھی اور سفیر کا جنازہ اٹھنے سے قبل ہی اسے دھکے دے کر اپنے گھر سے نکال دیا تھا۔

علیزہ کے والدین اور دیگر عزیز و اقارب بہت دکھی دل کے ساتھ اسے اپنے ساتھ گھر لے آئے تھے۔ اس دن کے بعد سے ہر ایک اسے ہتھیلی کا چھالا بنائے اس کی دل جوئی میں مصروف تھا۔ ہر ایک کے دل میں اس کے لیے ہمدردی اور رحم کے جذبات تھے۔ یہ بات علیزہ کے لیے باعث اطمینان تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اگر وہ بیوہ کے بجائے مطلقہ کی حیثیت سے میکے لوٹی ہوتی تو صورت حال بالکل مختلف ہوتی۔ سفیر کی موت کے کچھ عرصے بعد قانونی کارروائی مکمل کر کے اسے وارث کی حیثیت سے سفیر کے بیمے کی خطیر رقم کا چیک مل گیا تھا۔ اس چیک کے ملنے کے بعد اس کے پاس پہلا فون جمال کا آیا تھا اور اس نے شک کا اظہار کیا تھا کہ علیزہ نے بیمے کی رقم کے حصول کے لیے چالاکی سے اپنے شوہر کو ہلاک کیا تھا اور انہیں اس کے مظالم کی جھوٹی داستان سنائی تھی۔ ورنہ ہر ایک تو یہی کہتا تھا کہ سفیر سہیل، علیزہ سے بے حد محبت کرتا تھا۔

علیزہ نے یہ الزام سن کر کوئی وضاحت پیش کرنے کے بجائے صرف اتنا کہا تھا کہ ''اگر میں قاتل ہوں تو آپ نے سہولت کار کا کردار ادا کیا ہے۔ آپ نے میرے خلاف کہیں زبان کھولی تو خود بھی بری طرح پھنس جائیں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ اپنے تعاون کی مناسب قیمت لیں اور ہمیشہ کے لیے زبان بند کرلیں۔''

جمال کو اس کی بات سمجھ آگئی تھی یوں یہ مصیبت اس کے سر سے ٹل گئی تھی لیکن اب فرحین اس کے گلے پڑنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ایک دفعہ تو اس کے دل میں خیال آیا بھی تھا کہ وہ سفیر کے خون بہا کے طور پر انہیں رقم دے۔ لیکن ان کی فرعونیت نے اسے اپنے ہی خیال کو رد کر دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کتنا بھی شور مچالیں، اس سے رقم حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی تھیں۔ کامیاب وہ خود کو بھی نہیں سمجھتی تھی کہ اس نے محبت کی بازی ہار کر زندگی کی بازی جیتی تھی لیکن وہ ایک چالباز کے ہاتھوں زندگی کی بازی ہاری بھی تو کیوں؟ سفیر بازی اپنے ہاتھ میں کرنے کے لیے جتنی چالیں چل سکتا تھا اس نے چلی تھیں لیکن یہ اور بات تھی کہ بازی علیزہ کے ہاتھ میں رہی تھی اور اس کی واحد اور آخری چال ہی کارگر ثابت ہوئی تھی۔ موت اور زندگی کی جنگ میں کارگر چال چلنے والا ہی کامیاب قرار پاتا ہے..... سو آج وہ کامیاب اور فاتح تھی۔